اپریل تا ستمبر 2021

فیضانِ ادب (سہ ماہی)

ایک بین الاقوامی علمی، ادبی اور تحقیقی جریدہ

جلد نمبر: 6 شمارہ: 2-3



"پروفیسر مظفر حنفی نمبر"



مدیر
فیضان حیدر

ادارۂ تحقیقات اردو و فارسی، پورہ معروف، کرتھی جعفر پور، مئو، یو. پی. 275305

فیضانِ ادب (سہ ماہی)
اپریل تا ستمبر 2021ء
فیضان حیدر

RNI: UP/URD/2018/74924 ISSN: 2456-4001

Quarterly

FAIZAN-E-ADAB

An International Refereed Research Value Journal

Vol. VI, Issue: II & III, April to September 2021



For latest Issues of FAIZAN-E-ADAB visti at www.uprorg.in

Editor
FAIZAN HAIDER

Printed, published and owned by FAIZAN HAIDER and printed at Scrino Printers, Farooqui Katra, Maunath Bhanjan 275101 and published at Purana Pura,Pura Maroof, Kurthi Jafarpur, Mau U.P. 275305

سہ ماہی

فیضانِ ادب

ایک بین الاقوامی علمی، ادبی اور تحقیقی جریدہ

جلد نمبر 6 شمارہ 2-3

اپریل تا ستمبر 2021ء

مدیر

فیضان حیدر

ادارۂ تحقیقات اردو و فارسی، پورہ معروف، کرتھی جعفر پور، مئو، یو۔پی 275305

Quarterly

FAIZAN-E-ADAB

An International Refereed Research Value Journal

Vol. VI, Issue: II & III, Apr. to Sept. 2021

ISSN: 2456-4001

Website: www.uprorg.in

قیمت: فی شمارہ ۱۵۰/روپے ◻ سالانہ ۵۰۰/روپے ◻ اس شمارے کی قیمت ۵۰۰/روپے

مجلے کی سالانہ خریداری کے لیے www.uprorg.in پر لاگ اِن کریں اور ممبر شپ لیں۔ تخلیقات اور مضامین faizaneadab@gmail.com پر روانہ کریں۔

آن لائن رقم ٹرانسفر کرنے کی تفصیل:
Name: Faizan Haider, Account No. 33588077649, State Bank of India, Branch: Maunath Bhanjan, IFSC: SBIN0001671

☆ مقالہ نگاروں کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔
☆ مقالوں کی ایڈیٹنگ میں ادارہ آزاد ہے۔
☆ 'فیضان ادب' کے مکمل حوالے کے ساتھ مضامین یا اقتباسات نقل کیے جا سکتے ہیں۔
☆ تمام تر قانونی چارہ جوئی صرف مئو کی عدالت میں ہی ممکن ہے۔

فہرست

اداریہ

پروفیسر مظفر حنفی کی ذات جامع صفات تھی۔ وہ ایک دیدہ ور محقق و ناقد، بہترین افسانہ نگار، ماہر مترجم اور بے مثل شاعر کی حیثیت سے اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ تقریباً چھ دہائیوں تک شعر و ادب کی خدمت میں مصروف و منہمک رہے۔ ان کا نام ان مشاہیر شعر و ادب میں ہے جنھوں نے تاریخ ساز کارنامے انجام دے کر اردو کے ادبی سرمایے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

مظفر حنفی نے ادب کی مختلف اصناف سے وابستگی اختیار کی اور اپنی پختگی، علمیت اور قادر الکلامی سے بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ دیگر علمی و ادبی خدمات سے قطع نظر صرف ان کی شاعری کی لفظیات، جمالیات، اسلوبیات اور افکار و نظریات پر ہی اگر مضامین اور کتابیں قلم بند کی جائیں تو ان کا ایک تاج محل تیار ہو جائے گا۔ عصری سماجی و سیاسی ماحول کے تناظر میں اگر ان کے فکر و فن پر نظر ڈالی جائے تو بھی ان کی شاعری کی معنویت برقرار رہے گی۔ کیوں کہ وہ ایک عبقری شخصیت کے حامل تھے جنھوں نے صرف روایت کو ہی اپنی شاعری کا موضوع نہیں بنایا بلکہ آج کی پُر پیچ زندگی جن نت نئے مسائل سے دوچار ہے، اس کا بیان بھی اس خوش اسلوبی سے کیا کہ سوشلزم اور فاشزم کے پردے بے نقاب ہوتے چلے گئے۔ انھوں نے ایک ایسا اسلوب اور لہجہ اختیار کیا ہے جہاں ندرت اور جدت کے ساتھ معنوی رکھ رکھاؤ بھی موجود ہے۔ خیالی، فکری اور لسانی سطح پر انھوں نے اردو شاعری میں جو امکانات پیدا کیے ہیں وہ شعری دنیا میں ان کو ممتاز مقام دلانے کے لیے کافی ہیں۔

اب ان کے شعری اختصاص کے ساتھ ان کی شاعری میں پائے جانے والے ان پہلوؤں کی نشان دہی کی جانی چاہیے جن سے ان کے ہم عصر یا ان کے بعد کے شعرا متاثر ہوئے، بلکہ اب ان کے بعد شعر و ادب پر ان کے اثرات پر گفتگو ہونی چاہیے۔ کیوں کہ ان کی شاعری میں حیات و کائنات کی وسیع بساط سمٹی ہوئی ہے۔ اس سے نہ صرف مظفر حنفی کی شعری تخلیقات کی افہام و تفہیم کی راہیں استوار ہوں گی بلکہ مظفر شناسی کے آئندہ کے امکانات بھی روشن ہوں گے۔

۲۰۱۸ء میں ادارۂ تحقیقات اردو و فارسی نے پروفیسر نیر مسعود پر ایک ضخیم نمبر شائع کیا تھا جس کی علمی و

ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ اس کے بعد کئی شماروں میں مختلف علمی و ادبی شخصیات سے متعلق گوشے شائع کیے گئے۔ اب فیضان ادب کا مظفر حنفی پر بھی خصوصی شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

مظفر حنفی جیسی مختلف الجہات شخصیت کا دنیا سے گزر جانا نہ صرف ہم خادمانِ علم و ادب کے لیے صدمۂ جاں کاہ ہے بلکہ پوری ادبی دنیا کے لیے باعث رنج و الم ہے۔ اس لیے خیال پیدا ہوا کہ رسالے کے جنوری تا مارچ کے شمارے میں ان کی حیات اور علمی خدمات پر مشتمل گوشہ شائع کیا جائے۔ زہے نصیب کہ اسی دوران ان کے بیٹے انجینئر فیروز مظفر سے میری شناسائی ہوئی۔ ان سے حقیر نے اس کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے بھی میری اس خواہش کا پورا پورا پاس و لحاظ رکھا اور ہر ممکن تعاون کی حامی بھر دی۔ اس سے میرے خیال کو تقویت ملی۔ اس عرصے میں اپنے اساتذہ، دوستوں اور اہل قلم حضرات سے ان پر مضامین لکھواتا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مظفر حنفی کی حیات و خدمات سے متعلق وافر ذخیرہ جمع ہو گیا۔ پھر ان مضامین کے انتخاب و ترتیب کا مسئلہ درپیش ہوا۔ کیوں کہ تقریباً اتنے مضامین جمع ہو گئے کہ سب کو اس نمبر میں شامل کرنا مشکل ہو گیا۔ پھر بھی تمام اہم مضامین کو شامل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ البتہ جن حضرات کے مضامین اس میں جگہ نہیں پا سکے ان سے معذرت کی جاتی ہے، کیوں کہ رسالے کے صفحات کے ساتھ ساتھ ادارے کے وسائل بھی محدود ہیں۔

اس خصوصی اشاعت میں حیات، شخصیت اور علمی جہات؛ شاعری؛ غزل؛ نظم؛ رباعی؛ تحقیق و تنقید؛ افسانہ؛ مکتوب؛ سفر نامہ؛ ترجمہ؛ ادبِ اطفال؛ تقابلی مطالعہ؛ مصاحبہ؛ نظمیں؛ قطعاتِ تاریخ اور غیر مطبوعہ غزلیں جیسے عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ ایک دو عناوین کو چھوڑ کر تقریباً تمام عنوانات کے تحت بھرپور مواد پیش کیا گیا ہے۔

اب میں اس کے مواد، محتویٰ اور اندازِ پیش کش پر کچھ نہیں کہوں گا۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ مظفر شناسی کی ایک ادنیٰ سی کوشش ہے اور مواد کے اعتبار سے بھی مظفر حنفی پر اب تک جتنی کتابیں یا رسالوں میں گوشے وغیرہ شائع کیے گئے ہیں ان سے زیادہ وقیع اور جامع ہے، ساتھ ہی اس کے مواد میں تنوع اور ہمہ گیری بھی ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف کر لینے میں کوئی سبکی نہیں کہ میں بھی انسان ہوں، اور انسان خطا اور نسیان کا آمیزہ ہے، اس لیے مجھ سے بھی مضامین کے انتخاب و ترتیب میں یقیناً بھول چوک ہوئی ہوگی۔ میں اپنی کوشش میں کتنا کامیاب و کامران رہا اس کا فیصلہ قارئین مطالعے کے بعد ہی کریں گے۔ مجھے آپ کے گراں قدر مشوروں اور قیمتی آرا کا شدت سے انتظار رہے گا۔ آخر میں ان تمام مخیر حضرات کا تہ دل سے شکر گزار ہوں جنھوں نے دامے، درمے، سخنے میرا تعاون کیا۔

فیضان حیدر (معروفی)

پروفیسر سید حسن عباس
صدر شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی

تاثرات

مُشک آن است کہ۔۔۔

پروفیسر مظفر حنفی (یکم اپریل ۱۹۳۶ء۔ ۱۰/اکتوبر ۲۰۲۰ء) اردو کی ایسی صدا بہار شخصیت کے طور پر جانے جاتے ہیں جن کی زندگی نارسائیوں کے ساتھ آگے بڑھی، مگر انھوں نے کبھی بھی تحقیق وتخلیق اور مطالعہ سے دست کشی اختیار نہیں کی اور اپنی محنت وجاں فشانی سے ہر صنف سخن میں نقش ہائے رنگارنگ کے ڈھیروں نمونے پیش کر دیئے۔ اسی طرح نثر کے میدان میں بھی وہ بند نہ تھے بلکہ فکر وخیال کے طرح ہائے نو سے انھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ اردو کے نثری ادب کا دامن بھر دیا۔

ان کی شاعری قدیم وجدید کا خوب صورت آمیزہ ہے اور ان کی نثر چاہے وہ افسانہ ہو یا ادبِ اطفال، مصاحبے ہوں یا مباحثے ومذاکرے خالص تحقیقی اور علمی معاملات ہوں یا وضاحتی کتابیات، ہر جگہ مظفر حنفی صاحب منفرد نظر آتے ہیں۔ اپنے استاد شادؔ عارفی کے لیے جس جی جان سے خدمات انجام دی ہیں وہ بھی بے مثال ہے۔ ورنہ سب کچھ ہونے کے باوجود یعنی فکر ونظر اور تخیل کی سروسامانی کے باوجود شاد عارفی کی ادبی دنیا میں شناخت کا مسئلہ، مسئلہ ہی رہ جاتا اگر مظفر حنفی صاحب نے انھیں موضوع گفتگو نہ بنایا ہوتا۔ اس سلسلے میں ان کے وہ سینکڑوں صفحات بطور یادگار شادؔ عارفی کی شاعرانہ قدر وقیمت کا احساس دلانے کے لیے کافی ہیں۔

وہ جتنے سادہ مگر پیارے انسان تھے، اس سے بھی ان کی شخصیت کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ مجھے ان کے دولت کدے پر کئی بار ملاقات وگفتگو کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ ہمیشہ انھیں علمی وادبی کاموں میں مصروف پایا۔ گفتگو اتنی شائستہ اور شریفانہ ہوتی تھی کہ کبھی یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ کسی بڑی ادبی شخصیت سے روبرو ہوں۔ عام طور پر اردو کی موجودہ صورت حال یا نئے ادبی رجحانات موضوع گفتگو ہوتے۔ وہ اپنی علمی وادبی خدمات کو بھی کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے اور اسے اپنے قارئین یا شائقین ادب کی مہربانی سے تعبیر کرتے تھے کہ اگر آپ لوگ حوصلہ نہ بڑھائیں اور میری کاوشوں کو اہمیت نہ دیں یا بہ نظر استحسان نہ دیکھیں تو میں کیا اور میرے کام کیا؟ لیکن حق تو یہ ہے کہ پروفیسر مظفر حنفی کے علمی وادبی کاموں کا شمار آسان نہیں۔ اگر چہ ان کی شخصیت اور علمی و ادبی کارناموں کا جائزہ بصورت تحقیقی مقالہ لیا گیا ہے مگر جب بھی اور جس پیمانے پر بھی اس قسم کے کام ان کے

حوالے سے کیے جاتے رہیں گے، ایک آنچ کی کسر ضرور باقی رہے گی۔ کیوں کہ کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے ان کے کاموں کا احصا آسان نہیں۔ جسے 'ہرفن مولا' کہا جائے وہ تھے حنفی صاحب۔

شاعری کے میدان میں درجن بھر سے زیادہ شعری مجموعے، افسانے میں بھی کئی مجموعے، ادبِ اطفال کے حوالے سے بات کی جائے تو اس میں بھی ان کے کئی مجموعے دامن دل کھینچتے ہیں۔ ان پر تحقیقی کام کرنے والا حیران و پریشان نظر آتا ہے کہ بات کہاں سے شروع کرے اور کہاں ختم کرے۔ انٹرویو کے بھی کئی مجموعے ہیں۔ تحقیق وتنقید اور ترتیب وتدوین کے میدانوں میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں بلکہ کتنوں سے آگے نظر آتے ہیں۔ سفرنامہ اور ترجموں نے بھی لوگوں کو ان کی تحریریں پڑھنے پر مجبور کیا ہے۔

'وضاحتی کتابیات' ایک ایسا موضوع ہے جس پر حنفی صاحب نے پہلے پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ساتھ مل کر کام کیا اور بعد میں اس کام کو خود آگے بڑھایا، ان کو یاد رکھے جانے کے لیے کافی ہے۔ یہ کام جتنی یک سوئی، لگن اور محنت کا متقاضی ہے، اس سے عہدہ برآ ہونا ہر کس وناکس کا کام نہیں۔ اس نے ان کو یکتائے روزگار بنا دیا۔

ان کے علمی وادبی کارناموں کی داد ان کے معاصرین اور بزرگوں نے بھی دل کھول کر دی ہے۔ ان کی شعری خدمات ہوں یا نثری کارنامے، سب کا مطمحِ نظر انسان سازی اور انسانیت کا فروغ ہے۔ وہ جس سادگی سے زندگی گزار گئے، وہ سادگی، صفائی اور سب سے بڑھ کر سچائی ان کی تخلیقات میں نمایاں ہیں۔ ادب کے خدمت گاروں میں وہ اپنی اسی سادگی، صفائی اور سچائی کی بدولت ہمیشہ زندہ رہیں گے اور یاد کئے جاتے رہیں گے۔

'فیضانِ ادب' کے مظفر حنفی مرحوم پر خصوصی شمارے کے لیے میں اس کے مالک ومدیر ڈاکٹر فیضان حیدر کے حوصلوں کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ایک گنجان تخلیقاتی وتصنیفاتی شخصیت پر کوئی خاص شمارہ ترتیب دینا اور لکھنے والوں کو قلم اٹھانے پر مجبور کرنا، ان ہی کا کام تھا ورنہ سچ پوچھیے تو مظفر حنفی صاحب جیسی کثیر التصانیف اور ہشت پہلو شخصیت کو موضوع گفتگو بنانا کوئی آسان کام نہیں لیکن وہ کر بیٹھے۔ یہی حوصلہ قابل تعریف ہے۔

مظفر حنفی صاحب کے بڑے صاحبزادے انجینئر فیروز مظفر صاحب بھی قابل مبارک باد ہیں کہ وہ جس طرح اپنے والد محترم کی علمی خدمات کو ادبی دنیا کے سامنے پیش کرنے کی سعی فرما رہے ہیں اُن لوگوں کے لیے درسِ عبرت ہے جو اپنے بزرگوں کے آثار کسی کو دکھانے یا اُن پر کسی کو کام کرنے کے مواقع فراہم کرنے کے بجائے، دل وجان لگا کر، بلکہ سینے سے لگا کر محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں جب کہ ہونا تو یہ چاہیے کہ اُس شخص کی علمی کارگزاریوں کی تفصیلات کی نشر واشاعت کو مدنظر رکھا جاتا تا کہ علمی وادبی میدان میں اُس شخص نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، وہ نہ صرف منظر عام پر آئیں بلکہ اس سے استفادے کی راہ بھی آسان ہو جو بہ ہر طور اردو زبان وادب کے باب میں اضافہ ہی متصور کیے جائیں گے۔ ○

سید حسن عباس
(۳/ستمبر ۲۰۲۱ء)

حیات، شخصیت اور علمی جہات

انجینئر فیروز مظفر
ڈی۔۴۰، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی۔۲۵، رابطہ نمبر:9717788387

مظفر حنفی کے حالات اور کارناموں پر ایک نظر

اصل نام:	محمد ابوالمظفر	**قلمی نام:**	مظفر حنفی
والد:	عبدالقدوس صدیقی	**والدہ:**	سیدہ خاتون فاطمہ
دادا:	عبدالشکور صدیقی	**دادی:**	زیب النسا
نانا:	میر ولایت حسین	**نانی:**	سیدہ نثار فاطمہ

۱۹۳۶ء: (یکم اپریل): کھنڈوا (مدھیہ پردیش) میں جنم لیا جہاں ان کے والد میونسپل اسکول میں بحیثیت استاد ملازم تھے۔ مکان بدھوارا بازار میں تھا۔ ان سے بڑی دو بہنوں کے نام ہیں عزیز فاطمہ اور شفیق فاطمہ جن کی وفات ہو چکی ہے۔ چھوٹی بہن کا نام انیس فاطمہ ہے (جو کان پور میں سید بشارت حسین کو بیاہی گئیں) اور ان کی بھی وفات ہو چکی ہے۔

۱۹۴۰ء: مین اردو اسکول کھنڈوا میں پہلی کلاس میں داخلہ۔ استاد احمد خان تھے، اس زمانے کے دوستوں میں حیات خان اور اختری بیگم کے نام یاد آتے ہیں۔

۱۹۴۱ء: والدہ اور تینوں بہنوں کے ساتھ ایرایاں (ضلع فتح پور) منتقل ہو گئے، جو ان کا ننہال ہے، وہاں تیسری اور چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ پرگنے میں اول آئے۔ اسکول میں استاد زوار حسین تھے، للّی میاں نے کلام پاک کے چند پارے پڑھائے۔ دوستوں میں ایک نام بقرعیدو کا یاد رہ گیا ہے۔

۱۹۴۳ء: ہسوہ (فتح پور، یوپی) کے آبائی مکان میں خاندان کے ساتھ سکونت اختیار کی۔ ورنا کیولر مڈل اسکول کی پانچویں جماعت میں داخلہ ملا، اساتذہ میں مولوی شبراتی اور پنڈت ستیہ نرائن شامل تھے اور دوستوں میں معین الدین جگنو، محمود حسن، شریف الحسن، فرقان علی اور کپور سنگھ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

۱۹۴۶ء: ورنا کیولر مڈل اسکول کی ساتویں جماعت اول درجے میں پاس کی اور بورڈ کی میرٹ لسٹ میں جگہ پائی جو اس زمانے کا اہم تعلیمی اعزاز تھا۔ بعد ازاں پھر کھنڈوا لے جائے گئے جہاں عبدالشکور ہیڈ ماسٹر

مین اردو اسکول نے انھیں ابتدائی انگریزی کے درس دیئے۔ قیام تایازاد بھائی سیٹھ مظہر الدین کے ہاں رہا۔

۱۹۴۷ء: ایم ایم اینگلو مڈل اسکول کھنڈوا میں ساتویں کلاس میں داخلہ ملا، ڈبیٹنگ سوسائٹی کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ استادوں میں احسان الحمید نے بہت ہمت افزائی کی۔ دوستوں میں حکیم قریشی، محمد فاروق اور سلطان احمد خاص تھے۔

۱۹۴۸ء: اینگلو مڈل اسکول کا امتحان (آٹھویں کلاس) درجہ اول میں پاس کیا اور ضلع کے تمام اردو ہندی، مراٹھی مڈل اسکولوں میں پہلی پوزیشن پائی۔ کلکٹر نماڑ کے ہاتھوں بی بی سونی پرائز حاصل کیا۔ اس برس سے بچوں کے چھوٹے چھوٹے چٹکلوں پر مشتمل کہانیاں لکھنی شروع کیں۔

۱۹۴۹ء: سبھاش ہائی اسکول کھنڈوا میں نویں جماعت میں داخلہ لیا۔ اردو تعلیم کا سلسلہ یکسر منقطع ہوگیا، لیکن اردو کتابیں پڑھنے کا شوق انتہا کو پہنچ گیا۔ نویں سے گیارہویں کلاس تک کے بہترین دوستوں میں رام کرشن جوشی، مدن لال سیٹھی، رضا حسن وغیرہ شامل تھے۔ اساتذہ میں سکر گائے صاحب اور مودی صاحب سے زیادہ متاثر ہوئے۔

۱۹۵۲ء: سکنڈری ایجوکیشن بورڈ ناگپور سے ہائر سکنڈری سرٹیفکیٹ امتحان سکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ مضامین تھے: ہندی، انگریزی، ریاضی، جغرافیہ اور سائنس۔ ذریعۂ تعلیم سرتاسر ہندی رہا جس سے پہلی بار سابقہ پڑا تھا۔ اس دوران تایازاد بھائی مسلسل ان کی تعلیم کے خلاف رہے۔ وہ انھیں اپنے بڑے کاروبار میں شریک کرنا چاہتے تھے۔ اسی سال مظفر حنفی جامعہ اردو (علی گڑھ) کے امتحان ادیب ماہر میں درجہ اول سے کامیاب ہوئے۔

۱۹۵۳ء: چوں کہ مظہر الدین کا شدید اصرار تھا کہ وہ تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیں اور کاروبار سنبھالیں اس لیے مظفر حنفی کو ان کے والد صاحب نے ہسوہ بلا لیا اور وہ فتح پور گورنمنٹ کالج میں انٹر سائنس میں داخل ہو گئے۔ اسی سال ان کا پہلا افسانہ شائع ہوا۔ سال کے آخر میں انھیں ایئر فورس کے مقابلہ جاتی امتحان میں شرکت کے لیے کان پور طلب کیا گیا۔ امتحان میں نمایاں کامیابی کے باوجود انھیں میڈیکل ٹسٹ میں روک لیا گیا۔ بچوں کی کتاب 'بندروں کا مشاعرہ' چھپی۔

۱۹۵۴ء: کان پور میں مقیم رہ کر ٹیوشن کرتے اور ملازمت کی تلاش میں رہتے۔ سخت تنگ دستی میں بسر ہوئی۔ فصیح اختر، امراؤ، خورشید احمد پرویز دوستوں میں تھے۔ ہندو پاک کے رسالوں میں زیادہ تر افسانے اور کبھی کبھار غزلیں شائع ہوتی رہیں۔ نسیم بک ڈپو، لکھنؤ سے ان کا پہلا ناول چھپا جو انگریزی سے ماخوذ تھا۔

۱۹۵۵ء: اواخر فروری میں بھوپال چلے گئے جہاں پہنچتے ہی ان کا تمام اثاثہ چوری ہوگیا۔ اپریل میں ریاست بھوپال کے محکمۂ تعلیمات میں ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ تقرر لاڑکوئی ضلع سیہور کے مڈل اسکول میں ہوا۔ قیام اپنے والد کے دوست سید باسط حسین رینج افسر کے ساتھ رہا، دوستوں میں بخشش عباس،

بن ویر سنگھ چاتک، قاضی محمد اویس، آنند کرشن وغیرہ شامل تھے۔

۱۹۵۶ء: ادیب ماہر کی بنیاد پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انٹر میڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ ان کے دو اور ناول نسیم بک ڈپو، لکھنؤ نے شائع کیے۔ یہ انگریزی سے ماخوذ تھے۔

۱۹۵۷ء: جامعہ اردو کے امتحان ادیب کامل میں درجہ اول میں کامیابی حاصل کی۔

۱۹۵۸ء: لاڑکوئی سے پپلیا خاص تبادلہ کر دیا گیا۔ یہ ریاست بھوپال کے رائسین ضلع کا ایک کوردہ مقام تھا، چند ماہ بعد ہی مظہر بھائی نے انھیں بہ اصرار کھنڈوا بلا لیا۔ وہاں کاروبار میں بہت نقصان ہو رہا تھا۔ کھنڈوا میں حسن رضا، حسن بشیر، قاضی انصار، علی احمد قریشی، منشی جلیس، ناصر حسین اور دیگر احباب کے تعاون سے انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کی اور نیشنل لائبریری جاری کی۔

۱۹۵۹ء: ماہنامہ 'نئے چراغ' (کھنڈوا) جاری کیا۔ مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے اس کے چودہ شمارے منظر عام پر لائے۔ حسن بشیر اور حسن رضا وغیرہ معاون مدیر تھے۔ اس سلسلے میں دیگر اہلِ قلم کے ساتھ شاد عارفی سے بھی مراسلت کا سلسلہ قائم ہوا۔ اس وقت تک خود کو منظر حنفی ہسوی لکھتے تھے۔ ۹ رنومبر ۱۹۵۹ء کو ان کی شادی کڑہ (الہ آباد) کے سید محمد احمد کاظمی کی اکلوتی بیٹی عاصمہ خاتون سے ہوئی۔ خوشدامن کا نام سیدہ حشمت النسا تھا۔ اکلوتے برادر نسبتی ظہور احمد کاظمی ریٹائر ہو کر کراچی چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔ اسی سال کھنڈوا میں اردو بوائز اسکول کے قیام کی کامیاب تحریک چلائی۔

۱۹۶۰ء: اپریل میں محکمۂ جنگلات مدھیہ پردیش میں ملازمت کر لی۔ ایس ڈی او کے پیش کار مقرر ہوئے۔ سیہور میں ہیڈ کوارٹر تھا۔ زیادہ تر گھنے جنگلوں میں دورے پر رہنا پڑتا تھا۔

۱۹۶۱ء: اہلیہ، والدہ، چھوٹی بہن اور بہنوئی (محمد یعقوب مرحوم) کو سیہور بلا لیا۔ سیہور کے دوستوں میں نجیب رامش، ایم سی گپتا، یعقوب سلیم قابلِ ذکر ہیں۔

۱۹۶۲ء: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بطور پرائیویٹ امیدوار بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ شاعری میں شاد عارفی کی شاگردی اختیار کی۔ ان کے مشورے پر نام کے ساتھ عارفی کا سابقہ بھی شامل کیا لیکن استاد ہی کو بعد میں دو دو اضافتیں اچھی نہیں لگیں اور ان کے مشورے پر دوبارہ صرف مظفر حنفی لکھنے لگے۔ ہسوہ کا آبائی مکان از سر نو پختہ تعمیر کرایا۔ ۵ رمئی کو پہلا بیٹا فیروز پیدا ہوا۔

۱۹۶۳ء: ہسوہ سے چھوٹی بہن انیس فاطمہ کی فتح پور کے سید بشارت حسین کے ساتھ شادی کا بندوبست کیا۔ اسی برس سیہور سے ان کا تبادلہ بھوپال ہوگیا جہاں ۴ ررتھ خانہ اسٹریٹ میں بڑی بہن، بھانجے اشفاق، اہلیہ، خوشدامن اور فیروز کے ساتھ قیام رہا۔ اس اثنا میں کوثر چاند پوری، شفا گوالیاری، واحد پریمی، عشرت قادری، فضل تابش، رفعت الحسینی، تاج بھوپالی، شعری بھوپالی، وکیل بھوپالی وغیرہ سے مراسم اور دوستیاں بڑھیں۔

۱۹۶۴ء: ۸؍فروری کو رام پور میں کسمپرسی کے عالم میں شاؔد عارفی کا انتقال ہوگیا جس کا بہت گہرا اثر لیا اور موصوف کے سلسلے میں تنقیدی مضامین کے مجموعے نیز ان کے کلام کی اشاعت پر کمر بستہ ہوئے۔ ۵؍مئی کو دوسرے بیٹے پرویز کی ولادت۔

۱۹۶۵ء: تبادلے پر پھر سیہور گئے۔ ۴؍جون کو ہسوہ میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا اور اس کے چند دن بعد سہارن پور میں خوشدامن چل بسیں۔ اسی سال ۱۳؍دسمبر کو ان کا تیسرا بیٹا سہیل پیدا ہوا۔ ریڈیو بھوپال پر پہلا پروگرام ملا۔ ڈاکٹر حیدر شاہین، امتیاز حسین، محبوب دیوان، وجے سنگھ رانا وغیرہ سے نزدیکی تعلقات رہے۔

۱۹۶۶ء: ۲۸؍مارچ کو سیہور میں ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ اس دوران بھوپالی پھاٹک پر کرائے کے مکان میں مقیم رہے۔ سال کے آخر میں یہ مکان تبدیل کر کے وہ پرانی نظامت کے قریب میواتی پورہ میں ایک بڑے مکان میں منتقل ہوگئے، جہاں اپنے کنبے کے ساتھ اگلے آٹھ برس تک مقیم رہے۔ اس اثنا میں مشتاق افغانی، مقصود حسن، ڈاکٹر عبدالودود، عباس علوی اور محمود عمر کے خاندانوں سے گھریلو مراسم ہوگئے۔ میاں سلطان محمد خان سے بھی قربت رہی۔ انجمن ترقی اردو کی مقامی شاخ کے صدر اور ضلع ساہتیہ کمیٹی میں اردو کے نمائندے منتخب ہوئے۔

۱۹۶۷ء: ۲۷؍جون کو چوتھے بیٹے فضیل کی ولادت ہوئی۔ شاؔد عارفی کے مضامین اور شعری نگارشات رسالوں سے یکجا کر کے نثر و غزل دستہ مرتب اور شائع کیا۔ مختلف ناقدین سے گزشتہ تین برسوں میں شاؔد مرحوم پر جو مضامین لکھوائے تھے انھیں مرتب کر کے مکاتیب شاؔد کے ساتھ 'ایک تھا شاعر' کے نام سے نسیم بک ڈپو، لکھنؤ سے شائع کرایا۔ شب خون کتاب گھر نے الہ آباد سے ان کی نئی غزلوں کا مجموعہ 'پانی کی زبان' شائع کیا جو ہندوستان میں جدید غزل کا پہلا مطبوعہ مجموعہ تھا۔ مرکز ادب بھوپال نے ان کے افسانوں کا مجموعہ 'اینٹ کا جواب' چھاپا۔

۱۹۶۸ء: سیہور سے نزدیک بیل کھیڑا میں کاشت کاری کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کے ابتدائی کلام کا مجموعہ 'تیکھی غزلیں' فن کدہ، سیہور نے شائع کیا اور طویل طنزیہ نظم 'عکس ریز' کتاب پبلشرز لکھنؤ نے چھاپی۔

۱۹۶۹ء: اس دوران دوبارا ان کا تبادلہ کیا گیا لیکن انھوں نے ترقی پا کر باہر جانے سے انکار کر دیا۔ اب انھوں نے جنگلات کی ملازمت ترک کرنے کا ارادہ کر لیا۔ گورنمنٹ کالج سیہور میں ایل ایل بی اور سیفیہ کالج بھوپال میں ایم۔ اے اردو میں داخلہ۔ افسانوں کا مجموعہ 'دو غنڈے' نصرت پبلشرز، لکھنؤ نے شائع کیا۔ یوپی اردو اکادمی نے اس پر انعام دیا۔

۱۹۷۰ء: اکاؤنٹینٹ کی حیثیت سے ترقی۔ فن کدہ سیہور سے ان کے افسانوں کا مجموعہ 'دیدۂ حیراں' منظر عام پر آیا۔

۱۹۷۱ء: ایم۔ اے (اردو) میں فرسٹ ڈویژن سے کامیاب۔ برکت اللہ یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن۔

۲۹؍اگست کو پانچویں بیٹے عرفان کی پیدائش۔ رسائل سے تلاش کر کے ان کا مرتب کردہ شاد عارفی کی نظموں کا مجموعہ 'شوخیٔ تحریر' نسیم بک ڈپو لکھنؤ کے وسیلے سے منظر عام پر آیا۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی نگرانی میں بھوپال یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کے لیے شاؔد عارفی کے فن اور شخصیت پر تحقیق کے لیے بے حد کدوکاوش کے بعد رجسٹریشن ہوا۔

۱۹۷۲ء: گورنمنٹ کالج سیہور کے پچاس سے زائد امیدواروں میں تنہا مظفر حنفی ایل ایل بی فائنل کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔

۱۹۷۳ء: سال بھر میں تحقیقی مقالہ مکمل کر کے خصوصی اجازت سے یونیورسٹی میں داخل کیا۔ شاؔد عارفی کے رنگ میں کہی گئی غزلوں کا مجموعہ 'صریر خامہ' شائع ہوا جسے اتر پردیش اردو اکادمی سے انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔

۱۹۷۴ء: برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی، اس یونیورسٹی سے پہلی ڈاکٹریٹ، نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ دہلی میں اسسٹنٹ پروڈکشن افسر (اردو) کی حیثیت سے تقرر اور دہلی منتقل ہوگئے۔ ۲۲؍اگست کو چھٹا بیٹا رومی پیدا ہوا اور چالیس دن بعد رحلت کر گیا۔ قیام کونسل کے فلیٹ (۱۵۶۔سی، ایم ایم ٹی سی کالونی، مالویہ نگر) میں رہا۔ شعری مجموعہ 'دیپک راگ' (یوپی اردو اکادمی سے انعام یافتہ) اور شاؔد عارفی کی غزلیں زیورِ طبع سے آراستہ۔ مجتبیٰ حسین، عبداللہ کمال، عبدالوحید، فکر تونسوی، مخمور سعیدی اور اظہار اثر وغیرہ سے قربت رہی۔

۱۹۷۵ء: حکومت ہند کی مالی اعانت سے ان کا مرتب کردہ کلیات شاد عارفی اشاعت پذیر ہوا۔ نیشنل اکادمی نے ان کے ترجمہ کردہ گلگ مجمع الجزائر (الیگزینڈر سولنتسین) کی جلد اول شائع کی۔ NCERT کی اردو مطبوعات کی قیمتیں بہت زیادہ تھیں، ان کی ان تھک جدوجہد کے نتیجے میں اردو، ہندی اور انگریزی کی کتابوں کو یکساں قیمت پر شائع کرنے کا فیصلہ ہوا۔

۱۹۷۶ء: ۱۲؍فروری کو بحیثیت لکچرر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شعبۂ اردو میں تقرر۔ علاوہ ازیں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی ایسوسی ایٹ شپ کے لیے کلیات میر پر تحقیقی کام کرنے کو منتخب کیا گیا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ساتھ 'وضاحتی کتابیات' پروجیکٹ کا آغاز، ان کی مترجمہ کتاب 'سخاروف نے کہا' شائع ہوئی، مالویہ نگر سے منتقل ہو کر (۳۴۲۔ بٹلہ ہاؤس) جامعہ نگر میں سکونت اختیار کی۔

۱۹۷۷ء: نیشنل بک ٹرسٹ نے ان کے ترجمہ کردہ 'گجراتی کے یک بابی ڈرامے' شائع کیے۔ جامعہ کی فیکلٹی آف ہیومنٹیز کے ممبر منتخب ہوئے۔ بھوپال اور ہسوہ فتح پور کے کھیت اور مکان فروخت کر کے بٹلہ ہاؤس میں (مکان نمبر ۳۵۸، موجودہ D-۴۰) خریدا۔

۱۹۷۸ء: ذاتی مکان کا قبضہ ملنے پر اس میں منتقل ہوگئے۔ مکتبہ جامعہ نے ان کا تحقیقی مقالہ 'شاؔد عارفی:

شخصیت اور فن' شائع کیا جسے یوپی اردو اکادمی سے انعام ملا۔ مکتبہ خضر راہ کانپور سے تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'نقد ریزے' منظرِ عام پر آیا۔ گلاگ مجمع الجزائر (دوسری جلد) کا ترجمہ نیشنل اکادمی نے چھاپا۔ ٹیلی ویژن پر پہلا پروگرام شہریار اور نارنگ نے انٹرویولیا۔

<u>۱۹۷۹ء:</u> انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی نے کلام کا انتخاب 'یم بہ یم' اپنے مخصوص اشاعتی پروگرام کے تحت چھاپا اسے یوپی اور آندھرا پردیش اردو اکادمیوں سے انعام ملے۔

<u>۱۹۸۰ء:</u> وضاحتی کتابیات (بہ اشتراک پروفیسر نارنگ) کی پہلی جلد ترقی اردو بورڈ سے منظرِ عام پر آئی۔ بہار اردو اکادمی سے انعام حاصل کیا۔ شعری مجموعہ 'طلسم حرف' الہ آباد سے شب خون کتاب گھر نے شائع کیا۔ اسے مغربی بنگال اردو اکادمی نے انعام کا مستحق قرار دیا۔ نیشنل بک ٹرسٹ دہلی نے اڑیا افسانے (ترجمہ) زیورِ طبع سے آراستہ کیے۔

<u>۱۹۸۱ء:</u> مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی مالی معاونت سے غزلوں کا مجموعہ 'کھل جا سم سم' شائع ہوا جسے یوپی اردو اکادمی، کلچرل اکادمی (گیا) اور کل ہند میرا اکادمی (لکھنؤ) نے انعامات سے نوازا۔ 'بیداری' (مترجمہ ناول) نیشنل بک ٹرسٹ (دہلی) نے چھاپا اور مغربی بنگال اردو اکادمی نے اس پر انعام دیا۔ 'گلاگ مجمع الجزائر' (جلد سوم) شائع ہوئی اور اس نے بہار اردو اکادمی سے انعام پایا۔

<u>۱۹۸۲ء:</u> تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ 'جہات و جستجو' شائع ہوا جسے مغربی بنگال اردو اکادمی سے انعام دیا گیا۔ ۱۰رمئی کو ان کے ہاں پہلی بیٹی (صبا تسنیم) پیدا ہوئی۔

<u>۱۹۸۳ء:</u> مکتبہ جامعہ نے ان کی قلم بند کردہ بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ 'نیلا ہیرا' شائع کیا (بعد ازاں اس کے متعدد ایڈیشن چھپے) دہلی، بہار اور یوپی کی اردو اکادمیوں نے انعامات دیئے۔

<u>۱۹۸۴ء:</u> فروری میں شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ریڈر ہو گئے۔ 'وضاحتی کتابیات' (جلد دوم) ترقی اردو بیورو سے شائع ہوئی اور مغربی بنگال اردو اکادمی سے انعام حاصل کیا۔ ساہتیہ اکادمی دہلی نے 'بھارتیندو ہریش چندر' کا ترجمہ چھاپا۔ محبوب راہی کو 'مظفر حنفی: حیات شخصیت اور کارنامے' (تحقیقی مقالے) پر ناگ پور سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی۔

<u>۱۹۸۵ء:</u> ان کے اور دیگر اہلِ قلم کے تبصروں پر مشتمل ان ہی کا مرتب کردہ مجموعہ 'جائزے' مکتبہ جامعہ دہلی نے چھاپا اور 'جدیدیت: تجزیہ و تفہیم' (مرتبہ) نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کی۔ نیشنل کونسل آف چائلڈ ایجوکیشن دہلی نے اردو اہلِ قلم میں سے انھیں قومی ایوارڈ کا مستحق قرار دیا۔

<u>۱۹۸۶ء:</u> مکتبہ جامعہ سے 'پردہ سخن کا' (مجموعۂ کلام) کی اشاعت۔ یوپی اور دہلی اردو اکادمی سے اس پر سال کی بہترین کتاب کا انعام۔ ۱۳راگست کو منجھلے بہنوئی (محمد یعقوب) کا انتقال۔

<u>۱۹۸۷ء:</u> دہلی اردو اکادمی کی اعانت سے مجموعہ مضامین 'تنقیدی ابعاد' کی اشاعت۔

<u>۱۹۸۸ء:</u> بڑے بیٹے فیروز کی شادی چھوٹی بہن کی بیٹی صدف گلزار کے ساتھ ۹رجون کو ہوئی۔ ساہتیہ اکادمی (دہلی) سے 'بنکم چندر چٹر جی' (ترجمہ) اشاعت پذیر۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ان کی نگرانی میں قلم بند کردہ تحقیقی مقالوں پر شمع افروز زیدی اور خوشحال زیدی کو ڈاکٹریٹ تفویض کی۔ (آگے چل کر اسی یونیورسٹی سے خالد محمود اور ممتاز الحق نے ان کی رہنمائی میں تحقیقی مقالے لکھے اور پی ایچ۔ ڈی کی اسناد حاصل کیں) جامعہ ملیہ میں ملازمت کے دوران گوپی چند نارنگ، عنوان چشتی، شمیم حنفی، صغرا مہدی وغیرہ کے ساتھ قریبی تعلقات۔ مغربی بنگال اردو اکادمی نے مجموعی خدمات کے اعتراف میں کل ہند پرویز شاہدی ایوارڈ سے نوازا۔

<u>۱۹۸۹ء:</u> جون میں کلکتہ یونیورسٹی کی پیش کش پر ستمبر میں اقبال چیئر پر بحیثیت پروفیسر تقرر قبول کر کے کلکتہ منتقل ہو گئے۔ عاصمہ مظفر، صبا اور فضیل ساتھ آئے۔ یونیورسٹی کے کانکر گاچھی میں واقع فلیٹ میں سکونت، کلکتہ یونیورسٹی کی فیکلٹی آف آرٹس اینڈ کامرس کے ممبر اور کل ہند انجمن اساتذہ اردو، جامعات ہند کے پریسیڈیم کے رکن مقرر ہوئے۔ کلکتہ دوردرشن سے (منور رانا کا لیا ہوا) انٹرویو ٹیلی کاسٹ ہوا۔ 'انشا' (کلکتہ) میں گوشۂ مظفر حنفی چھپا۔

<u>۱۹۹۰ء:</u> دہلی اردو اکادمی سے 'آزادی کے بعد اردو طنز و مزاح (مرتبہ) منظرِ عام پر آئی۔ مغربی بنگال اردو اکادمی سے انعام ملا۔ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نے حسرت موہانی، پر 'مونوگراف' چھاپا جس نے دہلی اردو اکادمی سے پہلا انعام حاصل کیا۔ کئی زبانوں میں ترجمہ۔

<u>۱۹۹۱ء:</u> فخر الدین علی احمد کمیٹی کی مالی اعانت سے 'ادبی فیچر اور تقریریں' کی اشاعت۔ ۲۴ستمبر کو بڑی بہن شفیق فاطمہ کی رحلت، دوردرشن سری نگر سے سوانح اور فن پر خصوصی فیچر۔

<u>۱۹۹۳ء:</u> فروری میں پرویز مظفر بغرض ملازمت برطانیہ چلا گیا۔ انجمن روح ادب (الہ آباد) کی فرمائش پر ۶۹۳رشعرا کے کلام پر مشتمل اردو غزل کا پچاس سالہ انتخاب 'روحِ غزل' مرتب کیا۔ شعبۂ اردو کلکتہ یونیورسٹی کے صدر مقرر ہوئے۔

<u>۱۹۹۴ء:</u> فخر الدین علی احمد کمیٹی کے تعاون سے مجموعۂ مضامین 'باتیں ادب کی' شائع کیا۔ بہار اردو اکادمی سے انعام پایا۔ ۲۸رجون کو سہیل کی شادی بڑی بہن کی بیٹی زرّیں کے ساتھ کی۔ پی ایچ۔ ڈی کمیٹی (اردو) کے کنوینر مقرر ہوئے۔

<u>۱۹۹۵ء:</u> بڑی بہن عزیز فاطمہ ۲۷رجون کو بھوپال میں وفات پا گئیں۔ اوراق (لاہور) میں فن اور سوانح حیات پر خصوصی گوشہ چھپا۔ جاوید ارشد نے ان کی نگرانی میں تیار کردہ مقالے پر کلکتہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ کلکتہ ریڈیو اسٹیشن کی پروگرام ایڈوائزری کمیٹی کے رکن نامزد ہوئے۔

۱۹۹۶ء: یکم اپریل کو رسمی ریٹائرمنٹ کے بعد کلکتہ یونیورسٹی سے مزید پانچ برس کے لیے ملازمت میں توسیع (Re-employment)، انٹرنیشنل فرینڈ شپ اینڈ فرٹرنیٹی ایوارڈ، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، دہلی نے 'وضاحتی کتابیات' (جلد سوم) شائع کی۔ یو پی اردو اکادمی سے انعام ملا۔ ساہتیہ اکادمی دہلی نے 'محمد حسین آزاد' (مونوگراف) چھاپا۔ مغربی بنگال اردو اکادمی سے انعام پایا۔

۱۹۹۷ء: دسواں شعری مجموعہ 'یا اخی' شائع ہوا۔ صبا اور عاصمہ کے ساتھ انگلینڈ گئے۔ لندن یونیورسٹی میں اعزاز۔ بی بی سی سے انٹرویو۔ 'صدا' نے ماہر اقبالیات کی لوح طلائی پیش کی۔ ہندوستان آ کر فضیل کی شادی سیہور (بھوپال) میں نزہت درّشہوار کے ساتھ کی۔ آزادی کی پچاس سالہ تقریبات کے دوران انڈو برما پٹرولیم لمیٹڈ کے خصوصی انعام سے سرفراز۔ دہلی دوردرشن سے سوانح اور انٹرویو ٹیلی کاسٹ۔ آکاش وانی دہلی کے ایکسٹرنل ڈویژن سے انٹرویو نشر ہوا۔

۲۰۰۰ء: NBT سے 'حسرت موہانی' کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ 'وضاحتی کتابیات' کی تمام جلدیں تیار کر کے NCPUL کے حوالے کیں۔ 'شاد عارفی: فن اور فن کار' شائع ہوئی۔

۲۰۰۱ء: دس ستمبر کو کلکتہ سے دہلی منتقلی۔ تمام کتابیں اور رسائل اردو اکادمی مغربی بنگال اور دیگر اداروں کو دیں۔ دہلی میں مکان کی توسیع اور دھوج (ہریانہ) میں مرغی فارم شروع کیا۔ 'ہاتھ اوپر کیے'، 'لاگ لپیٹ کے بغیر' اور انتخاب 'پرچم گرد باد' شائع ہوئے۔ دہلی اردو اکادمی کا 'شاد عارفی: فن اور فن کار' پر انعام۔ بہار اردو اکادمی نے 'محمد حسین آزاد' پر انعام دیا۔

۲۰۰۲ء: 'وضاحتی کتابیات' کے ۸؍دفتر شائع ہوئے۔ ان کی نگرانی میں کام کرنے والے ریسرچ اسکالروں شکیل اختر، شکیل احمد خان، نصرت جہاں، رخسانہ مراد، افضال عاقل، وہاب پردیسی اور اظہر عالم کو کلکتہ یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں تفویض ہوئیں۔ ہندی اکادمی دہلی کی اعانت سے ہندی میں 'مظفر کی غزلیں' شائع ہوئی۔ عرفان مظفر (چھوٹے بیٹے) کی خورشید فاطمہ کے ساتھ شادی ہوئی۔

۲۰۰۳ء: دہلی اردو اکادمی کا شعری خدمات پر ریاستی انعام۔ حیدرآباد، کلکتہ اور ناگپور کے مشاعروں اور سیمناروں میں شرکت کی۔ اقبال ادبی مرکز بھوپال میں خطبہ دیا۔ NBT سے 'حسرت موہانی' کا انگریزی ایڈیشن شائع ہوا۔

۲۰۰۴ء: جولائی، اگست میں پاکستان کا سفر کیا، کراچی اور لاہور میں تقریباً بتیس استقبالیہ جلسے ہوئے۔ ڈھائی ماہ قیام کرنے کے بعد واپسی ہوئی۔ وہاں کئی یونیورسٹیوں، انجمن ترقی اردو، کراچی پریس کلب، انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں تقریریں، بارہ معروف اخبارات و رسائل میں انٹرویو چھپے۔ NCPUL سے 'وضاحتی کتابیات' کے ۵؍مزید دفتر شائع ہوئے۔ جموں کلچرل اکادمی کے مشاعرے میں صدارت کی۔

ETV اور لکھنؤ کے مشاعرے کی صدارت کی۔ کھنڈوا، ناگ پور، بھوپال، کلکتہ کے مشاعرے اور سیمناروں کی صدارت، دہلی اردو اکادمی کے جلسے کی صدارت، اجین میں مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے سیمنار میں خطبہ صدارت، ایم پی اردو اکادمی بھوپال نے 'آگ مصروف ہے' شعری مجموعہ شائع کیا۔

۲۰۰۵ء: بچوں کی شاعری کا مجموعہ 'کھیل کھیل میں' قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان (دہلی) کی مالی اعانت سے شائع ہوا۔ میرٹھ یونیورسٹی میں امتیاز علی عرشی سیمنار کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ پیش کیا اور امتیاز علی عرشی کے شعری مجموعے کی رسم اجرا انجام دی۔ ہریانہ اردو اکادمی (چنڈی گڑھ) کے ساحر لدھیانوی سیمنار کے افتتاحی اجلاس اور مشاعرے کی صدارت کی۔ بھارت بھون (بھوپال) میں اردو شاعری کی نمائندگی۔ ہندوستانی سفارت خانہ کی دعوت پر جدہ، مدینہ منورہ اور ریاض میں مشاعروں اور سیمنار میں شرکت۔ دوبارہ عمرے کی سعادت نصیب ہوئی۔ دسمبر میں بیٹی صبا تسنیم کی شادی نجیب آباد کے ڈاکٹر سید خالد احمد سے ہوئی۔ (جو دہلی میں پریکٹس کرتے ہیں۔)

۲۰۰۶ء: 'روشنائی' کے ۲۵ ویں شمارے نے خراجِ تحسین کے تحت گوشہ شائع کیا۔ 'سفیر اردو' نے 'مظفر حنفی نمبر' شائع کیا۔ 'مژگاں' نے بہت خوب صورت 'مظفر حنفی نمبر' اور کتابی سلسلہ کے تحت 'مظفر حنفی: فن اور فن کار' شائع کی۔ 'صدائے اردو' نے 'مظفر حنفی نمبر' شائع کیا۔ کوی بھارتی ۴ میں اردو ادب کی نمائندگی کی۔ قومی زبان کراچی (جلد ۷۶، شمارہ ۸) نے پاکستان کے سفر کی تفصیل چھاپی۔ پاکستان کے عالمی مشاعرے میں شرکت کی۔ 'جنگ' کراچی کلب فروغِ امن و صحت لانڈھی ٹاؤن کے مشاعرے کی صدارت۔ انجمن ترقی اردو برمنگھم میں شرکت۔ حسرت موہانی ہندی میں NBT نے شائع کی۔ 'وضاحتی کتابیات' پر اردو اکادمی دہلی سے انعام۔ عالمی اردو کانفرنس حیدرآباد کے مشاعرے کی صدارت۔ انٹرنیشنل مشاعرہ یو کے کی صدارت۔ تنظیم اردو لوٹن کی کانفرنس کی صدارت۔ لندن میں رامائن سیمنار کی صدارت اور اردو میں رامائن پر مقالہ پڑھا۔ لیور پول میں مشاعرے کی صدارت۔ 'اردو انجمن برلن' کی دسویں سالگرہ میں صدارت۔ پونا میں 'اسباق' کے جلسہ میں صدارت۔

۲۰۰۷ء: 'غزلیات میر حسن' نگار کراچی پاکستان سے شائع ہوئی۔ 'ہندوستان اردو میں' شائع ہوئی۔ انٹرویو کا مجموعہ 'سوالوں کے حصار میں' شائع ہوا۔ ترکی زبان میں غزلوں کا ترجمہ شائع ہوا۔ 'شاعر' ممبئی نے اگست کے شمارے میں گوشہ شائع کیا۔ The postcolonical Journal of India Discourse نے انگلش میں نظمیں شائع کیں اور بریف نوٹ لکھا۔ فروری میں انجمن محبانِ اردو قطر کے مشاعرے کی صدارت کی۔ ملک بک ڈپو نے 'بندروں کا مشاعرہ' کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔ 'چٹخارے' شائع ہوئی۔ 'نرسی کے گیت' شائع ہوئی۔ کھنڈوا میں وقارِ ادب ایوارڈ دیا گیا۔ چنڈی گڑھ کے مشاعرے کی صدارت۔ 'نیلا ہیرا' پر یو پی اردو اکادمی کا انعام۔ حلبل طوراق نے International Night Poetry کے لیے ترکی بلایا لیکن مصروفیت کی

وجہ سے نہیں گئے۔مسلم انسٹی ٹیوٹ کلکتہ ایک شام اِثبات و نفی کے نام کے پروگرام کی صدارت۔

۲۰۰۸ء: اردو اکادمی دہلی نے کتاب 'ہندوستان اردو میں' کو انعام سے نوازا۔ہندوستانی پرچار سبھا ممبئی کے مشاعرے میں شرکت کی۔Contemporary Vibs نے 'مظفر حنفی کا گوشہ' شائع کیا۔دہلی اردو اکادمی نے مجموعی ادبی خدمات پر 'دتا تریہ کیفی ایوارڈ' دیا۔اُدے پور میں لٹل تھیسپین نے کہانیاں 'عشق پر زور' اور 'بجیا تم کیوں روتی ہو' اسٹیج کیا۔کل ہند اردو ادبی کانفرنس شولا پور کے مشاعرے کی صدارت اور پہلا انعام مجموعی ادبی خدمات پر۔دہلی اردو اکادمی کے 'ترقی پسند ادب ایک محاکمہ' کی صدارت کی۔

۲۰۰۹ء: 'جدید اردو' (جرمنی) نے گوشہ شائع کیا۔سیفی سرونجی نے 'انتساب' کا مظفر حنفی نمبر اور کتاب 'مظفر حنفی شخصیت اور فن' شائع کی۔دہلی اردو اکادمی سے مونوگراف میر تقی میرؔ شائع ہوا۔اکتوبر میں یوم سرسید کے مشاعرے بحرین کی صدارت کی۔ملک ڈپو نے 'نیلا ہیرا' شائع کی۔'چہار سو' راولپنڈی نے 'مظفر حنفی نمبر' شائع کیا۔کاروانِ ادب بھوپال نے اردو تعلیمی سیمینار میں انعام دیا۔مولانا آزاد کالج کے انسپکشن ٹیم برائے ایم۔اے میں شرکت۔دہلی اردو اکادمی کے اساتذہ کے مشاعرے کی صدارت۔پاکستان ایسوسی ایشن دبئی نے مظفر حنفی کے ساتھ ایک شام کا انعقاد کیا۔

۲۰۱۰ء: 'مضامین تازہ' کتاب شائع ہوئی۔جشن دلّی کے مشاعرے کی صدارت لٹل تھیسپین کلکتہ کی میگزین اور ڈراما فیسٹول کا اناگریشن کیا۔کھتا کولاج اتسو میں صدارت، اور دو کہانیاں اسٹیج کی گئیں۔اُردو دنیا جرمنی نے 'مظفر حنفی کا گوشہ' شائع کیا۔خوشبو ایجوکیشنل اینڈ کلچرل سوسائٹی بھوپال نے فخر خوشبو ایوارڈ اور سپاس نامہ پیش کیا۔خوشبو کے مشاعرے کی صدارت۔پرسار بھارتی میں ایکسپرٹ کی حیثیت سے شرکت۔انتساب پبلی کیشن کے پروگرام کی صدارت۔شکیل احمد کے مجموعے کا اجرا کیا۔ابن صفی سیمینار کی صدارت۔بزم گرامی کھنڈوا نے سپاس نامہ پیش کیا۔شہید آصف شہمیری راشٹریہ سمان 'شاعر ہند' کا خطاب۔بارسی ٹاکلی میں غلام نبی آزاد کالج میں جلسہ اعزازیہ۔'یہ پیغام چمن' اخبار کا اجرا اور انعام۔

۲۰۱۱ء: موضوعاتی اشعار کا انتخاب 'ہیرے ایک ڈال' کے نام سے شائع ہوا۔'بیسویں صدی' نے دسمبر کے شمارہ میں بہت اچھا گوشہ شائع کیا۔مکتبہ جامعہ اور NCPUL سے 'جہات و جستجو' کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔

۲۰۱۲ء: 'کتاب شماری' شائع ہوئی۔'میر تقی میرؔ' (مونوگراف) کا تیسرا ایڈیشن چھپا۔رحمانی پبلی کیشنز مالیگاؤں نے کتاب 'حلوہ چور' شائع کی۔حسرت موہانی (ہندی) کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔'حاضر جوابیاں' انقلاب میں شائع ہوئیں۔کرناٹک اردو اکادمی نے مظفر حنفی سیمینار اور انعام دیا۔سپاس نامہ پیش کیا۔

۲۰۱۳ء: بہار اردو اکادمی نے 'ہیرے ایک ڈال' پر عبدالغفور شہباز ایوارڈ سے نوازا۔کلیات دو جلدوں میں شائع ہوئی اور محبوب راہیؔ نے خطوط کا مجموعہ شائع کیا۔انگلش میں غزلوں کا ٹرانسلیشن شائع ہوا۔سفیر اردو نے

اکتوبر ۱۲ سے ستمبر ۲۰۱۳ء کا شمارہ 'مظفر حنفی نمبر' کے طور پر شائع کیا۔'انٹرویو' اور 'حاضر جوابیاں' کتاب 'گفتگو دو بہ دو' کے نام سے شائع ہوئی۔یوپی اردو اکادمی سے 'تیزاب میں تیرتے پھول' کو انعام دیا۔کل ہند اردو ادبی کانفرنس شولا پور نے مجموعی خدمات کا انعام دیا اور سپاس نامہ پیش کیا۔ہنسی واہنی الہ آباد نے کیفی اعظمی ایوارڈ سے نوازا۔

۲۰۱۴ء: 'مظفر حنفی: حیات و جہات' شائع ہوئی۔غزلوں کا انتخاب دہلی اردو اکادمی کی مدد سے شائع کیا۔مضامین کی کتاب 'تنقیدی نگارشات' شائع ہوئی۔'پرواز' کا 'شاد عارفی نمبر' شائع کرایا۔'حسرت موہانی' کا چوتھا ایڈیشن چھپا۔دہلی اردو اکادمی سے کتاب 'گفتگو دو بہ دو' پر انعام ملا۔یوپی اکادمی سے انعام ملا۔زی سلام مشاعرے کی صدارت کی اور بنارس ہندو یونیورسٹی میں خطبہ 'اردو غزل ماضی اور حال' پیش کیا۔

۲۰۱۵ء: 'منتخبات شادؔ عارفی'، 'مکاتیب و مضامین شاد عارفی' شائع ہوئی۔شاد عارفی پر بہت رسالوں کے نمبر اور گوشے شائع کروائے۔'بھولی بسری کہانیاں' شائع ہوئی۔

۲۰۱۶ء: کلیات شادؔ عارفی یوپی اردو اکادمی سے شائع ہوئی اور NCPUL سے شاد عارفی پر مونوگراف شائع ہوا۔'چنیدہ' کو بہار اردو اکادمی سے انعام۔محفلِ صنم نے مجموعی خدمات کے اعتراف میں داغ لائیو ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ پیش کیا۔

۲۰۱۷ء: اندور میں شب سخن کے مشاعرے کی صدارت کی اور انعامات تقسیم کیے۔شادؔ عارفی پر یوپی اردو اکادمی سے انعام ملا۔دہلی اردو اکادمی سے شاد عارفی پر انعام۔یوکے کا سفر جہاں برمنگھم میں کئی پروگرام میں شرکت۔واپسی پر ۳؍ماہ مسقط میں قیام کیا۔وہاں بھی دو تین مشاعروں میں شرکت کی۔

۲۰۱۸ء: ہندی میں غزل دھارا کتاب دیکشت دنکوری نے انجمن فروغ اردو اور غزل کمبھ سے شائع کی۔غزل کمبھ میں کتاب تقسیم کی۔ادب اطفال کی کلیات 'بول میری مینا' شائع ہوئی۔کتاب 'سالکؔ لکھنوی' یوپی اردو اکادمی نے شائع کی۔سعودی عرب (ریاض جبیل، دمام، جدہ) میں کئی مشاعروں میں شرکت اور عمرہ ادا کیا۔واپسی پر جہاز میں طبیعت خراب ہوگئی۔(آخری مشاعرہ)

۲۰۱۹ء: کتاب 'چندا ماموں' اور کتاب 'کچھ انٹرویو' شائع ہوئی۔نومبر میں مدھیہ پردیش شاسن نے شکھر سمان دیا۔دہلی اردو اکادمی سے شاد عارفی پر انعام۔سب رنگ ساہتیک سانسکرت ایوم کلا سمیتی اور حلقۂ اربابِ ادب بھوپال نے سپاس نامہ پیش کیا۔

۲۰۲۰ء: کورنا کی وجہ سے گھر پر ہی رہے۔Khan Eye TV پاکستان نے عدنان قدسی سے انٹرویو ٹیلی کاسٹ کروائی۔ETV بھارت نے سی اے اے اور این آر سی کے موضوع پر اور جنم دن کی مناسبت سے انٹرویو کیا اور ۱۰؍اکتوبر کو اللہ کو پیارے ہوگئے۔بٹلہ ہاؤس قبرستان میں عشا کے بعد تدفین عمل میں آئی۔

○○○

پروفیسر شمیم حنفی
دہلی

طوفان سا اک دستِ ہنر میں سمٹ آیا

۱۹۶۵ء کو گزرے یوں تو تقریباً آدھی صدی کا لمبا عرصہ ہونے کو آیا، مگر مظفر صاحب ذرا بھی نہیں بدلے۔ ان سے پہلی ملاقات تو ۱۹۷۶ء میں ہوئی مگر جان پہچان کا سلسلہ اس سے گیارہ برس پہلے شروع ہو چکا تھا۔ وہ سیہور (مدھیہ پردیش) میں رہتے تھے اور میں نے اندور کو اپنا ٹھکانا بنا لیا تھا۔ وہاں پہنچنے کے کچھ ہی دنوں بعد ایک روز مظفر صاحب کا خط ملا۔ اس علاقے میں عمیق حنفی کے بعد وہ دوسرے ادیب تھے جن کا نام اور کلام سرحد کے دونوں طرف چھپتا رہتا تھا۔ عمیق صاحب کے ساتھ تو خیر روز کی ملاقات ایک معمول بن گئی کیوں کہ وہ بھی اندور میں تھے اور ان کا قیام ہمارے گھر سے کوئی پندرہ منٹ کے فاصلے پر ریڈیو کالونی میں تھا، مگر اندور سے سیہور کے فاصلے کو پار کرنے میں دس گیارہ سال گزر گئے۔

۱۹۷۶ء میں ہم دونوں دلّی آن بسے۔ شعبہ ایک، علاقہ اور ادارہ ایک، روزمرہ کی مصروفیتیں بھی ایک جیسی۔ لیکن پچھلے لگ بھگ چالیس برسوں سے، مظفر صاحب کی زندگی کے چلن اور انداز و اطوار میں کوئی تبدیلی نظر نہ آئی۔ میں نے اپنے کسی شاعر دوست کو اتنا منظم، اپنے مشاغل کا اتنا پابند، اتنا مربوط اور سلیقہ مند نہیں دیکھا۔ بظاہر ان میں شاعروں جیسی کوئی بات، کوئی بے قاعدگی نہیں۔ وہ ایک انتہائی ذمہ دار انسان کی زندگی گزارتے آئے ہیں اور ان کی اس روش میں کبھی فرق نہیں آیا۔ شاید اسی لیے دنیوی کامرانیوں کی حصولیابی کے ساتھ ساتھ نثر و نظم کے میدان میں مظفر صاحب نے جتنا کچھ کر ڈالا ہے کئی لوگ مل کر بھی نہیں کر سکتے۔ ان کی طبیعت میں ریاضت کے علاوہ باقاعدگی کا وہ عنصر بھی بہت نمایاں ہے جسے میرؔاجی نے ادیب یا لکھاری ہونے کی بنیادی شرط قرار دیا تھا، یعنی ایسا شخص جس کے لیے 'لکھنا' روزمرہ زندگی کا معمول بن چکا ہو۔

مظفر صاحب نے نثر اور نظم کی بہت سی صنفوں میں ایک ساتھ اپنے اظہار کی راہ نکالی ہے۔ تحقیق، تنقید، کالم نویسی، جائزے، تبصرے، فکشن، ترجمہ، مگر ان کی شناخت کا ذریعہ، بہرحال ان کی شاعری کو قرار دیا جاتا ہے۔ یہاں اس واقعے کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ مظفر صاحب نے اپنی شاعری کی ترکیب میں ان اجزا

سے بھی برابر کا کام لیا ہے جو بالعموم نثر سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ وہ نثر کی تعمیر کرنے والے بظاہر 'کاروباری' یا عملی (Functional) عناصر کو اپنی شاعری سے کبھی خارج نہیں کرتے۔ یوں بھی طنز، حاشیہ آرائی اور کسی انسانی تجربے یا صورت حال کی عقلی اور منطقی تعبیر اور تعینِ قدر کے عمل میں طرزِ احساس اور تفکّر کا نثری انداز کسی نہ کسی مرحلے میں خود بہ خود شامل ہو ہی جاتا ہے اور مظفر صاحب کی شاعری اپنی نوعیت اور سرشت کے اعتبار سے صرف حسّی اور اعصابی تجربے کی شاعری نہیں ہے۔ اس کا مجموعی سیاق مظفر صاحب کے تہذیبی، معاشرتی اور اجتماعی تصورات کے واسطے سے مرتب ہوتا ہے۔ ان کے حصے میں اپنے ماحول کی نگہبانی کا فریضہ بھی آیا ہے۔

دراصل اس رویے نے مظفر صاحب کی شاعری میں معاصر زندگی، ماحول، واردات اور ذہنی وجذباتی کیفیتوں سے مناسبت پیدا کی ہے۔ مزاجاً وہ کلاسیکی مذاق رکھنے والے ہیں اور اپنے پیشے کی ضرورتوں (معلمی کے منصب) سے قطع نظر، اپنی تربیت اور طبیعت کے اعتبار سے بھی، ادب کی کلاسیکی روایت، پرانے اور آزمودہ اسالیب سے ان کا شغف بہت نمایاں ہے۔ کلاسیکی شاعری کے مانوس رنگوں، لہجوں اور لسانی مضمرات کی آگہی کی سطح ان کے یہاں اتنی ہی نمایاں ہے جتنی کہ خلیل الرحمن اعظمی، حسن نعیم، ظفر اقبال اور عرفان صدیقی جیسے شاعروں کے کلام میں۔ لیکن جو بات انھیں اپنے عہد کے دوسرے نو کلاسیکی، شاعروں سے الگ کرتی ہے، وہ سماجی برہمی، طنز اور تناؤ کی نوکیلی کیفیتیں ہیں۔ یہی کیفیتیں یگانہ اور شادؔ عارفی کے تشخص اور ان کے اپنے ماحول میں ان کے روایتی معاصرین، اصغر، فانی، حسرت، جگر اور فراق سے ان کے اختلاف اور امتیاز کا سبب بنیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی بہت اہم ہے کہ یگانہ اور شادؔ عارفی کی حسیت کے اسی پہلو نے انھیں اپنے بعد کے دور اور ایک بدلتی ہوئی حسیت کے ترجمان کہے جانے والے شاعروں کے لیے اپنے روایتی ہم عصروں کے مقابلے میں یگانہ اور شاد عارفی کا دھاردار، کھردرا اور کھرا اسلوب روایتی اور قدیم شعریات سے زیادہ مطابقت اور مناسبت، اس شعریات سے رکھتا ہے جو ایک نئے اجتماعی کلچر کی تہ سے نمودار ہو رہی تھی۔ یہ شعریات ہمارے احساسات کو تھپکیاں دینے کے بجائے ان میں ایک ہیجان، تناؤ اور بے اطمینانی کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ یگانہ اور شاد کی شاعری کا اسلوب اور اس کا فکری، جذباتی مزاج اردو کی غزلیہ شاعری کے مرکزی دھارے سے مختلف، کہیں کہیں تو متضاد بھی تھا۔ ایک حد تک اس کے نامانوس اور پریشان کرنے والے اسلوب کی وجہ سے اسے قبول کرنے میں بہتوں کو دشواری ہوتی تھی اور کسی نئی غذا یا نئے تجربے کی طرح شعر کا رسمی اور روایتی ذوق رکھنے والا خود کو تیار کیے بغیر اسے اختیار کرنے سے گھبراتا تھا۔ یہ دونوں کافی عرصے تک اردو شاعری کے عام ماحول میں ایک اجنبی کے طور پر دیکھے جاتے رہے۔ ان کے اسلوب میں ایک بے ارادہ نثریت اور ایک طرح کی انفرادی منطقیت کا عمل دخل بھی نظر آتا تھا جسے شعر میں برتنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی۔ پیرایۂ اظہار کے لحاظ سے یہاں مضامین، تصورات اور لفظوں کے ساتھ ساتھ لہجے کو بھی ایک خاص حیثیت حاصل تھی، بلکہ حقیقت

تو یہ ہے کہ اس شاعری کا پورا مزاج ہی اس کے لہجے اور آہنگ سے متعین ہوتا تھا۔

مظفر صاحب نے یگانہ اور شاد سے قطع نظر اردو کی شعری روایت کے مرکزی دھارے اور مانوس اظہار واسلوب سے وابستہ شاعروں کا کلام بھی بہت توجہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ان میں بیرونی عناصر کو جذب کرنے اور آزمودہ اسالیب سے اخذ اور استفادہ کرنے کی صلاحیت بھی غیر معمولی ہے۔ان کی شاعری میں تیکھی غزلوں سے لے کر آج تک کی شاعری کا انداز واسلوب اسی لیے پڑھنے والے کے لیے کسی انہونے واقعے کی صورت رونما نہیں ہوتا۔صاف پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے فطری تخلیقی اعتماد کے ساتھ اپنے پیش رووٗں کے قائم کردہ معیاروں اور ان کی پسندیدہ تخلیقی قدروں کو، بہت سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے۔اپنے راستے کا انتخاب اور تعین اپنی آمادگی اور رضامندی کے بعد کیا ہے۔کسی رنگ کو محض جبراً یا زمانے کے رنگ میں رنگ ملانے کی کمزور عادت کے تحت اختیار نہیں کیا ہے۔مظفر صاحب کی لفظیات سے زیادہ زبان و بیان کے عام مذاق کی طرف ان کے انتخابی رویے نے ان کے انفرادی مزاج اور مذاق کی تربیت کی ہے اور یہ طفیل بھی اسی انتخابی رویے کا ہے کہ ان کے پُرانے اور نئے کلام میں ان کے امتیاز، انفرادیت اور تشخص کے عناصر یکساں طاقت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ وہ اپنی روایت اور ماضی سے نہ تو بے سبب متصادم ہوتے ہیں، نہ نئے تجربوں اور رویوں سے خواہ مخواہ مرعوب ہوتے ہیں۔ان کے تخلیقی کیریئر میں، جو خاصا طویل ہے، انتشار اور ابتری یا ناہمواری کا کوئی نشان جو نظر نہیں آتا تو اسی لیے کہ مظفر صاحب کا پورا سفر ان کی اپنی مرضی، اپنی پسند اور اپنے انتخاب کا تابع رہا ہے۔

ان کے مزاج کو سب سے زیادہ مناسبت شاؔد عارفی سے تھی اور شاد کی انفرادیت اور امتیازات کی تعمیر و تشکیل میں بھی سب سے زیادہ سرگرم، موثر اور فعال رول دراصل اسی عنصر نے ادا کیا ہے۔ان مرحوم نے بھی اپنا سارا سفر اپنی آمادگی اور انتخاب کے سائے میں طے کیا تھا۔انھوں نے سخت آزمائشوں سے بھری ہوئی زندگی گزاری، مگر اپنی سی گزاری، اور دنیا سے کسی طرح کی دست گیری کے طالب نہیں ہوئے۔ ایسا نہ ہوتا تو گرد و پیش کی زندگی کے فرسودہ چلن نے ان کی انفرادیت پر غلبہ حاصل کر لیا ہوتا اور ان کی شاعری اس تیکھے پن، تیزی اور تشخص کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی جس نے انھیں نئی حسیت کے بہت سے ترجمانوں کے لیے قابل قبول ٹھہرایا تھا۔

شاد عارفی کے کلام میں ایک ناموافق ماحول کی سخت گیری اور احتساب کے باوجود اپنی انفرادیت پر اصرار اور ہجوم میں اپنے چہرے کی تلاش اور تحفظ کا عنصر، اسی لیے ایک مستقل اور پائیدار قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔شاد کی موت پر مظفر صاحب کا شخصی مرثیہ، شاؔد کی صعوبتوں سے معمور زندگی کے ساتھ ساتھ خود مظفر صاحب کی ذہنی اور تخلیقی شخصیت کا شناس نامہ بھی ہے۔اس نظم کو مظفر صاحب کے شخصی ملال کی عکاسی کے علاوہ ایک ذاتی اخلاقی منشور کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

یوں بھی مظفر حنفی کی شاعری میں زندگی اور شخصیت کی اخلاقی جہات کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ ہمارے

عہد کے ایک دانشور ادیب (ہیرالڈ پینٹر) نے نوبل انعام قبول کرتے وقت اپنی تقریر میں کہا تھا کہ وہ وقت آ گیا ہے جب ادب کی تخلیق کرنے والے کو ادب اور اخلاق، سیاست اور اخلاق، روزمرہ زندگی اور اخلاق کے ناگزیر رشتے پر تھکے بغیر گفتگو کرتے رہنا چاہیے۔ ہمارا وقت مادّی اعتبار سے جتنا ثروت مند نظر آتا ہے، اخلاقی سطح پر اتنا ہی قلاش اور حاجت مند بھی ہے اور تو اور علوم، ادبیات اور آرٹ کی دنیا میں بھی اخلاقی اساس سے محرومی کا احساس بہت دبا ہوا ہے اور اس کمی کا اظہار ہمارے ادیب بھی کم کم ہی کرتے ہیں۔کرتے بھی ہیں تو محض ایک پوز کے طور پر۔اسی لیے ان کی آواز دم خم سے بالعموم خالی محسوس ہوتی ہے۔مظفر صاحب کے اشعار میں تخلیقی اظہار کی اخلاقی قدر اور معنویت کا عنصر نہ صرف یہ کہ ایک حادی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے، اس میں خلوص اور سچائی کا تاثر بھی بہت طاقتور ہے۔لہٰذا شعر گوئی ان کے لیے نہ تو برائے تفریح ہے، نہ صرف عادت کا جبر۔ان کے یہاں اس سے ایک اخلاقی فریضے کی ادائیگی بھی ہوتی ہے اور اپنے ماحول میں، واقعات میں، اشخاص میں، تجربوں میں انھیں جہاں کہیں بھی ناہمواری، نقص اور بدہیئتی دکھائی دیتی ہے، وہ اس پر اپنے ردِّعمل کے اظہار سے باز نہیں رہتے۔ان کے کلام سے سوؔدا کے جیسا غم وغصہ اور اشتعال تو پیدا نہیں ہوتا، لیکن اپنے دل کی بات پر وہ کسی طرح کی مصلحت، منافقت اور مجبوری کا پردہ بھی نہیں آنے دیتے۔ اپنی بات وہ دوٹوک انداز میں کہتے ہیں اور عام طور پر استعارے، علامت اور ابہام کے بغیر کہتے ہیں۔شاید اسی وجہ سے مظفر صاحب کی شاعری میں تخلیقیت پر تفکر کا طور غالب آ گیا ہے۔ان کے اشعار سے، اس پریشاں ساماں عہد کی فکری ابتری اور اخلاقی بے سروسامانی کا پورا خاکہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔مضمون بندی کا عمل بھی ان کے یہاں اسی رویے کا پابند ہے جس کی نشاندہی میر مہدی مجروؔح کے اس شعر سے ہوتی ہے کہ۔

لکھ وہ مضمون جو ہو نفع رسانِ عالم
روز بے کار لکیریں یونہی کاغذ پہ نہ کھینچ

یہاں اس حقیقت کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ مظفر حنفی کی شاعری کسی بیرونی دستورالعمل کی تابع نہیں ہے۔ اپنے گہرے سماجی اور انسانی سروکاروں کے باوجود مظفر صاحب کی شاعری کا عمومی میلان ان کی اپنی طبیعت کا پروردہ ہے اور ان کی بے ساختہ، اسی کے ساتھ ساتھ انتہائی منظم اور تربیت یافتہ تخلیقی شخصیت کا اظہار۔اپنے کلیات میں انھوں نے منظوم سماجی تبصرے یا بچوں کے لیے کہی جانے والی نظمیں جو شامل کر دی ہیں تو اس لیے کہ ہر کلیات کے کچھ ناگزیر تقاضے بھی ہوتے ہیں۔ سب سے خوش آئند بات یہ ہے کہ تجربوں اور خیالوں کی پختگی اور سن رسیدگی کے باوصف مظفر صاحب کے یہاں کہنگی اور تھکن کے آثار نہ ہونے کے برابر ہیں اور وہ اپنے پرانے جوش اور وفور کے ساتھ شعر کہے جا رہے ہیں۔ بے تکلف شعر کہنے کی ایک روایت بھی ہماری ادبی تاریخ کا حصہ رہی ہے۔اس روایت کی تشکیل میں زبان و بیان پر گرفت، لہجے اور آہنگ کو برتنے

میں مشاقی اور اپنی زندگی اور زمانے کی طرف آگہی اور حساسیت کا رویہ ضروری ہے۔ اس حساب سے دیکھا جائے تو مظفر صاحب ہمارے موجودہ ادبی معاشرے میں بڑی حد تک اکیلے اور بے مثال کہے جا سکتے ہیں۔ ان کے ابتدائی دور کی ایک غزل کے کچھ شعر ہیں:

پارساؤں میں نہیں ہوں، مجھے پینی بھی نہیں
اس لیے میں نے کسی ہاتھ سے چھینی بھی نہیں
مجھ پہ ٹوٹی ہے جو آفت مری پروردہ ہے
آسمانی بھی نہیں اور زمینی بھی نہیں

یہ سارا خمیازہ بہر حال اکیلے پن کے سفر کا ہے اور مظفر صاحب پوری طمانیت کے ساتھ بہت سی منزلیں سر کر لینے کے بعد بھی اس پُرانے راستے پر سرگرم سفر ہیں۔ یہ سفر اسی طرح جاری رہے گا۔

OOO

’’مظفر کے اشعار میں نئی زبان کا چٹخارہ ہی نہیں ہمارے آپ کے بہت سے ایسے تجربات ہیں جو ان کے طنزیہ شعروں کا تیزابی عنصر بن گئے ہیں۔ ایک قلندرانہ آوارگی ہے، ایک پھکڑ پن ہے، ایک حاضر جوابی کا سا ردِّ عمل ہے۔ بازار اور بے تکلف احباب کی محفل کی گرمی، خلوص میں تپ کر حرارت و حرکت سے بھرپور زبان کا جادو ہے اور ’ترسیل کی کامیابی کا طربیۂ ہے۔ مظفر کے یہاں پاس روایت ہے لیکن وہ ’روایت پرست‘ نہیں ہیں...... عصری حسیت اور ذات کے حوالے سے اپنے تجربے کا اظہار ہے لیکن وہ ’جدیدیے‘ نہیں ہیں۔ اس طرح وہ اپنا انفرادی رنگ و آہنگ قائم کر کے یگانہ اور شاد عارفی کے سلسلے کے تیسرے اچھے اور اہم شاعر کے روپ میں سامنے آئے ہیں اور ہمیں شاعری کے ایک نئے ذائقے سے آشنا کرتے ہیں جسے نہ میٹھا کہا جا سکتا ہے، نہ سیٹھا، نہ کھارا، نہ کڑوا، نہ کھٹا، نہ پھیکا۔ روایت کا احترام کرنے والا کوئی شاعر شعور و ابلاغ کی سطح پر عصری حسیت اور نجی تجربے کو شعری صورت دینے میں مظفر سے بہتر طریقے پر زبان کو شاید ہی برت سکے۔‘‘ **(عمیق حنفی)**

ڈاکٹر خلیل مشیر احمد صدیقی
اندور

مظفر حنفی کی شخصیت کے کچھ اہم پہلو

پروفیسر مظفر حنفی کی شعری اور نثری خدمات سے اردو ادب کا ہر طالب علم آگاہ ہے۔ وہ شعر و ادب کی تخلیق میں کم از کم ساڑھے پانچ دہائیوں سے مصروف ہیں۔ وہ ایک ہمہ جہت فن کار ہیں اور طالب علمی کے زمانے سے نظم و نثر کی خدمت کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر مظفر حنفی کا نام تاریخ ادب میں چونکا دینے والا نام ہے۔ انھوں نے متعدد اصناف ادب پر کام کیا اور کئی علمی و ادبی نمونے پیش کیے ہیں۔ گو کہ اس عہد میں کئی مشاہیر ادب ہیں جنھوں نے تاریخ ساز کارنامے انجام دیے ہیں اور اردو ادب کو مالا مال کیا ہے۔ اسی طرح صوبہ مدھیہ پردیش میں جن اہلِ قلم نے اردو زبان و ادب کی توسیع و ترقی میں حصّہ لیا، ان میں مظفر حنفی کا نام اہم ہے۔

مدھیہ پردیش کی ادبی و شعری تربیت میں نشو و نما پانے والے محمد ابوالمظفر ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ اردو ادب کی دنیا میں مظفر حنفی کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا شمار اردو شعر و ادب کے منفرد لب و لہجہ رکھنے والے صفِ اوّل کے اہلِ قلم میں ہوتا ہے۔

وہ ایک ممتاز شاعر اور معروف نثر نگار ہیں۔ ان کے مضامین ملک کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ اسی طرح ان کی درجنوں کتب زیورِ اشاعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئیں۔ ڈاکٹر مظفر حنفی ایک موقر و معتبر شاعر و ادیب ہیں۔ ان کے تخلیقی عمل میں ترقی پسندی اور جدیدیت کے عناصر دیکھے جا سکتے ہیں۔ علم و ادب کے ہر میدان میں ان کی پختگی، علمیت، قادر الکلامی کا زور دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کی مختلف تصانیف شعر و ادب کی متعدد جہتوں کی نقاب کشائی کرتی ہیں اور شائقین ادب سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ مظفر حنفی شعر و ادب کے ہر میدان میں ایک ماہر فن کار کی طرح اپنی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو منعکس کر چکے ہیں۔ تصنیف و تالیف کی بات ہو یا تعلیم و تدریس کا معاملہ، شعر و ادب کی محفل ہو یا رسائل کی دنیا میں قلمی تعاون، مظفر حنفی ہر آزمائش میں پورے اترتے ہیں۔

وہ ایک ماہرِ فن کار کی طرح جہاں بینی، انسان فہمی میں ایک خاموش تماشائی نہیں ہیں، ان کا قلم انسانی اور سماجی چہروں کو بے نقاب کرنے میں تیر و تلوار کا کام کرتا ہے۔ کائنات کے مختلف مظاہر اور انسانی زندگی کے گوناگوں حالات جہاں لطف و بےکیفی کے مظہر ہیں وہیں حوصلہ اور بے اختیاری کی مختلف نوعیتیں بھی ہیں۔ یہ تمام صورتیں ان کے نثری اور شعری کارناموں میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ جس طرح ہر شے چمکدار یا قابلِ کشش نہیں ہوتی، اسی طرح ہر شے نظر کا فریب بھی نہیں۔ زندگی جس طرح اضمحلال یا تھکن یا خلفشار یا اضطراب کا نام ہی نہیں بلکہ اس میں لطف و سرور کے سامانِ عیش بھی ہیں۔ اسی طرح زندگی کے لیے تگ و تاز اور جد و جہد بھی ضروری ہے تاکہ حیاتِ انسانی کا نور قائم رہ سکے۔ ان حقائق کی جستجو میں ان کا قلم منہمک ہے۔ وہ ہر ادبی تحریک سے واقف ہیں۔ ان کے یہاں نہ ترقی پسندی کی دیوانگی ہے اور نہ جدیدیت کی جنوں خیزی۔ انھوں نے اپنے فن میں انفرادیت رکھی ہے۔ وہ ایک سچے آرٹسٹ کی طرح حقیقی مشاہدات و تجربات کی آنچ میں تپ کر سماج و معاشرے کی زبوں حالی اور انسانی خلش کی نیرنگیوں کو اپنی تخلیقیت کے وسیلے سے بیان کرتے ہیں۔ اس طرح کائنات کی ہر سچائی ان کے شعری و نثری تجربے میں شامل نظر آتی ہے۔

مظفر حنفی کی نظم و نثر یا شعر و ادب کے مطالعہ سے علم ہوتا ہے کہ اُن تخلیقات کے خالق کو مضمون و خیال اور زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ انھوں نے اپنی شعری و نثری تخلیقات کو فرسودیت، سطحیت، کہنگی سے آزاد رکھا ہے۔ دل نشیں خیالات، دلآویز زبان و بیان کے سہارے ہر فن پارے کو اپنے مخصوص انداز اور منفرد لب و لہجہ کے ساتھ پیش کیا ہے جس کے باعث ہر خیال جدّت و ندرت کا غماز ہے۔

کوئی بھی تخلیق سماج و معاشرے کی ترجمانی کے بغیر مکمل نہیں کہی جا سکتی۔ ڈاکٹر مظفر حنفی نے سماجی حقائق کو پیشِ نظر رکھ کر معاشرے اور سماج کی مختلف بحرانی صورتوں کو اپنی تخلیقات کا جامہ پہنایا ہے۔ غم و یاس، امید و آس کے گوناگوں پہلو بھی ہماری زندگی کی سچائی میں شامل ہیں جن سے عہدہ برآ ہونا بھی ناممکن ہے۔ ایک کامیاب فن کار ان حقائق سے پہلو تہی نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ ایک سچے فن کار کو زندگی کے قرینوں اور وسائل کی تلاش رہتی ہے تاکہ زندگی کامیاب و کامران ہو، مگر ایک کامیاب زندگی جہدِ مسلسل کے بغیر ممکن نہیں۔

ایک حساس و مخلص ادیب و شاعر، مالی و روحانی شکست، محبت و شرافت کی بے چارگی، اعلیٰ اقدار کی پامالی، انسان و سماج کی خستہ حالی، نئی نسل کی غیر ذمہ دارانہ روش، دوست و احباب کا غیر مخلصانہ رویّہ، عزیزوں اور قرابت داروں کا بُغض، کس طرح برداشت کر سکتا ہے۔ ایسے ناسازگار حالات میں گہرا شعور رکھنے والے فن کار کا جو حال ہوتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ڈاکٹر مظفر حنفی نے ناگفتہ بہ حالات و روابط پر کہیں کھل کر تو کہیں رمز و کنایہ کے سہارے اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان کے یہاں رمز و اشارے کی زبان بھی بڑی معنی خیز ہے۔

غزل اردو کی مقبول صنفِ سخن ہے۔ اردو غزل کی تاریخ میں کئی منفرد غزل گو شعرا نظر آتے ہیں جنھوں

نے عشق و محبت کو دل نشیں اور دلآویز زبان و بیان کے سہارے اس طرح پیش کیا کہ ہر خیال عروسِ نو کی طرح دیدہ و دل پر چھا جاتا ہے۔ غزل عام طور پر رمز و کنایہ یا اختصار و اشارے کی زبان ہے۔ اس میں روایت کا رنگ و روغن، عشق کی چاشنی کے باعث زندۂ جاوید رہا ہے۔ ساتھ ہی نزاکت و لطافت، شیرینی و حلاوت اور رنگِ تغزل کا حسن غزل میں شعری مسرت کا باعث ہوتا ہے۔ مگر وقت کے تغیر کے ساتھ ساتھ اب حیات و کائنات کے مختلف یا گوناگوں پہلو بھی داخلِ غزل ہیں کیوں کہ غزل عام طور پر رمز و کنایہ یا اختصار و اشارے کی شعری زبان ہے۔ دوسرے انسانی معاملات کی زبوں حالی کو بھی اگر دامنِ غزل میں سمیٹا جائے تو غزل میں موضوع کی وسعت کے ساتھ اس کا وقار بھی مزید بڑھ جاتا ہے اور غزل نجی کیف و مسرت کے ساتھ عالمی دکھ سکھ کی ترجمان ہو کر گہرے تاثر کی حامل ہو جاتی ہے۔

مظفر حنفی کی شعری تخلیقات کو حیات و کائنات کے وسیع و بسیط منظر نامے کو ذہن میں رکھ کر دیکھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اردو کے شعری ادب میں منفرد لب و لہجہ پیدا کر کے اردو کے صفِ اول کے شعرا میں اپنی پہچان درج کی اور تاریخ ساز شعری مجموعے پیش کیے۔ اردو کے شعری ادب کو نئی سوچ، نیا پہلو اور نیا وقار عطا کیا اور شعری فکر اور فن شاعری کو جو راہ دکھائی وہ لسانی، خیالی یا فکری عناصر کے باعث اختراعی قوتوں کی حامل ہے۔

مظفر حنفی کا شعری نظام ہر شاعرانہ تغیر سے آگاہی رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں جدید لب و لہجہ کے ساتھ جدید فکر و نظر کی کمی نہیں ہے۔ انھوں نے اردو شاعری میں ہونے والی تمام تبدیلیوں کو محسوس ہی نہیں کیا، بلکہ اپنی شاعری میں، پرکھا اور اپنی شاعرانہ انفرادیت بھی قائم کی۔ بہرکیف مظفر حنفی کی شاعری کے مطالعہ سے علم ہوتا ہے کہ وہ شعری ادب کی مختلف سمتوں، سبھی تحریکوں، تجربوں، بندشوں، تبدیلیوں اور مختلف راہوں سے آگاہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں روایت و تقلید، ترقی پسندی و جدّت یا جدیدیت کے تمام عناصر موجود ہیں۔ یہ ان کی ذہانت اور فکری تجسس ہے کہ وہ اپنے ہر خیال کو نہایت چابک دستی سے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ تمام علامتی اور استعاراتی نظامِ معنی و مفہوم کی گہرائیوں سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔

ان کے یہاں خیال کی ندرت و جدت، الفاظ و معانی کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ ہلکا طنز و مزاح بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ ایک مخصوص طرز و لہجہ کے شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے شعری تجربات کا اظہار نئی غزل کی مخصوص شعریت اور نئے لفظوں کی خصوصی ساخت کے ذریعہ کیا ہے۔ نئے دور میں ادب و معاشرے کے نئے دائرے حباب کے مانند ہیں۔ فکرِ شعر کی نزاکت کے ساتھ، انھیں صحیح سلامت پیش کرنا کمالِ شاعری ہے۔ بقول مظفر حنفی؎

نازک ہے فن شعر مگر طرز نو کے ساتھ   ہم اس حباب کو بھی سلامت اٹھائیں گے

علامتوں کے سہارے شعری معنویت بھی قابل دید ہے:

بلندی سے ہمیشہ ایک ہی پیغام آتا ہے   ستارے نوچ لینا، تتلیوں کے پر جلا دینا

چھتوں سے ستارے ٹپکنے لگے
ہری گھاس دیوار پر چڑھ گئی

ہمسائے کے اچھے نہیں آثار خبردار!
دیوار سے کہنے لگی دیوار خبردار!

اقامت شہر میں دل گاؤں میں ہے
بہر صورت مسافر چھاؤں میں ہے

مظفرحنفی کے یہاں نئی معنویت، نئے الفاظ اور نئے لفظی آئینوں کی کمی نہیں ہے۔ان کا شعری سرمایہ، نئی شعری معنویت کا اتھاہ سمندر ہے جس کے لیے ایک بڑے مقالہ کی ضرورت ہے۔میں یہاں، شاعر کے شعری محاسن کی وضاحت کے لیے چند اشعار پر اکتفا کرتا ہوں۔ملاحظہ ہوں:

ہر سمت نیا حرملہ ہر سمت نیا تیر
پانی کی تمنا ہے تو حلقوم پہ کھا تیر

مجھ کو ہونے کا یہ احساس نہ جینے دے گا
سوئی کی نوک پہ ہر سمت گھماتا ہے مجھے

خون تیشہ باز کے سر سے ٹپکنا شرط ہے
دودھ خود ہی سامنے آئے گا پتھر کاٹ کر

ہاتھ میں کاغذ، حساب دوستاں اترا ہوا
اور خنجر عین دل کے درمیاں اترا ہوا

مظفرحنفی نے اپنی فنی بصیرت کے شعری چراغ کو اس طرح روشن کیا کہ شعری ادب نئی بصیرتوں کے ساتھ جگمگا اٹھا۔انھوں نے اپنے فن کے تخلیقی جوہر کو فکر ونظر سے جلا بخشی اور شاعری کو وہ بلندی عطا کی جہاں کلام فکر وفن کی مثال بن جاتا ہے۔ان کی شاعری نئے موضوعات، اچھوتی فکر اور الفاظِ نو کی تنظیم وتشہیر کی آئینہ دار ہے۔

پروفیسر مظفرحنفی کے شعری مجموعوں کا مطالعہ مشکل نہیں تو آسان بھی نہیں کیوں کہ یہ مختلف اوقات میں لکھے گئے مجموعے ہیں اور متعدد ہیں۔ایک مختصر مضمون میں ان مجموعوں کی تمام خوبیوں پر روشنی ڈالنا اور مثالی اشعار نقل کرنا محال ہے۔لہٰذا کچھ مزید شعری خوبیاں پیش خدمت ہیں۔

سرسری مطالعہ کی روشنی میں شاعر کی شعر گوئی کی صداقت، صلاحیت اور فنی بصیرت کا علم ہوتا ہے۔ان کے اشعار تازہ، شگفتہ اور تخلیقی قوت کا پتہ دیتے ہیں۔عام اور آسان الفاظ کو شاعر کی فکر نے اس طرح چھوا کہ لفظ کی قدر و قیمت میں اضافہ ہی نہیں ہوا بلکہ گہری معنویت کا سیلاب امنڈ آیا۔یہ شعری خوبیاں ایک تازہ کار اور خلاقانہ ذہن رکھنے والے شاعر کے لیے کوئی نئی بات نہیں۔مظفرحنفی کا شعری ذہن رنگ برنگے پھول کھلاتا ہوا نظر آتا ہے جن کی خوشبو سے شعری گلزار معطر ہے، جن میں منفرد رنگ وبو ہے، جو نئے شعری گلستانوں کو دعوت فکر عطا کرتے ہیں۔

مظفرحنفی کی نثر کی مختلف صورتیں ہیں، فکشن نگاری کے مختلف رنگ سے لے کر تنقید وتحقیق تک ان کا قلم کچھ نیا کر دکھانا چاہتا ہے۔کبھی وہ جاسوسی ناولوں کو طبع زاد دکھانے کے درپے نظر آتے ہیں، تو کبھی بزم اطفال میں بچوں کی خوب صورت کہانیوں کے تانے بانے بنتے ہیں۔بچوں کو رجھانے کے لیے شاعری بھی کرتے ہیں۔تنقیدی میدان میں قدم رکھتے ہیں تو اپنے تاثر کا گہرا رنگ چھوڑتے ہیں۔ان کے مضامین کے کئی مجموعے شائع

ہو چکے ہیں جن میں تنقید وتحقیق کی دیانت داری، فکر ونظر کی گہرائی، علمی بصیرت کے چراغ روشن نظر آتے ہیں۔کم وبیش ان کی ہر تحریر متوازن اور تخلیقی نوعیت کی حامل ہوتی ہے اور تنقید وتحقیق کے معیار کو چھوتی نظر آتی ہے۔نظم ونثر کا یہ سلیقہ عمیق مطالعہ اور گہرے شغف کے بغیر ناممکن ہے۔ان کے ادبی مطالعہ کی بصیرت وآگاہی کے باعث مختلف ذائقوں کی جانچ اور پرکھ کا رنگ وروغن ان کے تخلیقی عمل میں دیکھا جاسکتا ہے۔

مظفرحنفی کے ہر نثری مجموعے میں مضامین درجن دو درجن سے کم نہیں ہوتے۔ان میں بیشتر تنقید وتحقیق کے عناصر لیے ہوتے ہیں۔نئے موضوعات کے حوالے سے کئی نجی اور ذاتی رودادیں یا ذاتی ملاقاتیں یا صحبتیں، یا مختلف یادداشتیں بھی ان کے ادبی مباحث میں شامل ہوجاتی ہیں جو ادبی تاریخ میں کافی اہم ہونے کے باعث تاریخ ساز پہلو رکھتی ہیں۔

مطالعے کی روشنی میں افکارِ نو کی توسیع وتلاش میں ان کی تحریر کے اچھے نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔یہ تحریریں بحث کی دیانت داری، قلمی گرفت اور علمی بصیرت کے باعث تخلیقی قوت کی مالک بن جاتی ہیں اور یہ مضامین اپنی نوعیت کے اعتبار سے تحقیق وتنقید کے رشتوں کو استوار کرتے نظر آتے ہیں۔

ابھی چند سال قبل ڈاکٹر مظفرحنفی کا مجموعہ 'مضامین تازہ' کے عنوان سے شائع ہوا۔نظر سے گزرا۔اس میں تقریباً ڈیڑھ درجن سے زائد مضامین شامل ہیں۔ہر مضمون علم وادب کی نئی جہات پر روشنی ڈالتا ہے۔اس مجموعے کے ہر مضمون سے متعلق موضوع پر روشنی ڈالنا محال ہے تاہم ان مضامین کے مطالعہ سے علم ہوتا ہے کہ وہ صاف گو ہیں، ادبی تاریخ پر ان کی گہری نظر ہے، علمائے وقت سے قربتوں کے باعث کچھ اہم یادداشتیں ادبی اہمیت رکھتی ہیں۔خود مصنف کے ادبی مراحل کے کچھ تاریخی پہلو بھی اہم ہیں۔اردو شعر وادب کے مختلف موڑ، نئے پہلو، ادبی قدروں کی اہمیت، تحقیق وتنقید کی نوعیت و اہمیت، اردو فکشن نگاری کا نیا موڑ بصورت قرۃ العین حیدر کے علاوہ ڈھیر سے ادبی موضوعات ہیں، جنھیں زیر بحث لاکر وہ نئے زاویۂ فکر ونظر کی دعوت دیتے ہیں تاکہ علم وادب نئی راہوں پر گامزن رہ کر علمی وادبی بلندیوں کو چھوئے۔اس ادبی احساس کی پیروی یا رہبری میں ان کا ادبی اور علمی وقار سدا قائم رہتا ہے۔ان کی تحریروں کا متوازن انداز اس بات کو واضح کرتا ہے کہ وہ ایک مضبوط و مدلل طرزِ تحریر کے مالک ہیں۔ان کی فکر ونظر میں مطالعہ کی گہرائی ہے۔غیر متعلق گفتگو، یا لفظوں کی جادوگری کرنا ان کا شیوہ نہیں۔تحقیق وتنقید کا انداز سہل، ایماندارانہ ہے۔وہ ہر موضوع بحث پر مطالعہ کی گہرائی کے ساتھ سنجیدہ غور وفکر پر عمل پیرا نظر آتے ہیں۔ان کی تحریروں کے مطالعہ سے علم ہوتا ہے کہ وہ ادب کے کچھ پوشیدہ امور کو منظر عام پر لانے کے ساتھ ساتھ نئے زاویۂ فکر اور نقد ونظر کی نئی راہیں بھی ہموار کرتے ہیں۔ان کا قلم جدید وقدیم شعر وادب کے مطالعہ کے لیے نئی راہیں کھولتا اور نئے زاویۂ فکر کی دعوت دیتا ہے۔

ادب کے قاری کو غور وفکر کے ساتھ کچھ اختلافی امور یا نظریات بھی لاحق ہوسکتے ہیں کیوں کہ غور وفکر کے

دائرے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ نقد و نظر میں ذاتی پسند و ناپسند کے معاملات داخل ہونے کے باعث اختلاف رائے ممکن ہے۔ خصوصاً خود پرستی، خود فہمی، خود ستائی کے اس دور میں جہاں گروہ بندی، دوست پرستی اور استاد نوازی عام ہو وہاں نقد و نظر کی ایماندارانہ توقعات پر پانی پھرتا دکھائی دیتا ہے۔ ساتھ ہی مقامیت، صوبائیت، دہلویت، لکھنویت اور دکنیت جیسے فخریہ امتیازات سے اوپر اٹھ کر سوچنا چاہیے۔ جہاں تک مجھے علم ہے مظفر حنفی نے کسی مقام یا صوبہ سے جڑ کر اپنی شناخت قائم نہیں کی۔ وہ ادب اور تدریس ادب سے جڑے رہے اور یہی ان کی پہچان بنی۔

انصاف پسند، دیانت دار صاحبِ نظر نقاد ہر اعتبار سے اعتدال پسند، متوازن، غیر جانب دار رہ کر فیصلے صادر کرتا ہے۔ اس کا فیصلہ حق بجانب ہوتا ہے۔ وہ کسی فن پارے پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنی علمی وسعت یا مطالعہ کا اعتماد و وقار سطر بہ سطر بحال ہی نہیں کرتا بلکہ کسی حقدار کو زیر و زبر کیے بغیر اس کا علمی یا ادبی مقام متعین کرتا ہے۔ مظفر حنفی کی تحریروں میں نقد و نظر کا اعتماد و وقار بحال رہتا ہے ساتھ ہی نئے زاویوں اور نئی سمتوں کی راہیں بھی ہموار ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ انھوں نے تحقیق کے میدان میں بھی نئے پہلو روشن کیے ہیں کہ شعر و ادب پر مزید کام کیا جا سکتا ہے۔

نثر میں مظفر حنفی کے متذکرہ مجموعہ کے علاوہ کئی دوسرے تحقیقی و تنقیدی کارنامے ہیں۔ ان میں 'نقد ریزے (۱۹۷۸ء)'، 'جہات و جستجو (۱۹۸۲ء)'، 'تنقیدی ابعاد (۱۹۸۷ء)'، 'غزلیاتِ میر حسن (۱۹۹۲ء)'، 'باتیں ادب کی (۱۹۹۴ء)'، 'حسرتؔ موہانی (۲۰۰۱ء)'، 'لاگ لپیٹ کے بغیر (۲۰۰۱ء)'، 'محمد حسین آزاد (۱۹۹۴ء)'، 'ادبی فیچر اور تنقیدیں (۱۹۹۲ء)'، 'شاد عارفی: ایک مطالعہ'، 'شاد عارفی: شخصیت اور فن' اہم اور مقبول ہیں۔ ان کتب کے علاوہ تصنیف و تالیف، تحقیق و تنقید سے متعلق کئی اور اہم کارنامے ہیں جن کی فضیلت سے ہر اہل علم آگاہ ہے۔

غرض یہ تمام تصانیف تنقید و تحقیق ادب کے لازوال کارنامے ہیں جو مظفر حنفی کے ادبی وقار و مقام میں اضافہ کا باعث ہیں۔ وہ اپنے مطالعہ کی وسعت اور ذہانت کے باعث اردو ادب کے معتبر نقاد اور مستند ادیب و شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی وقیع تحریروں سے اردو ادب میں گراں مایہ اضافے کیے ہیں۔ اگر ادب کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو آزادی کے بعد عصری ادبی مسائل اور تہذیبی و ثقافتی روایت اور انسانی اقدار پر بہت سے اہل قلم نے کام کیا ہے۔ بے شمار اصلاحی، تحقیقی اور تنقیدی تخلیقات اور مقالے شائع ہوئے ہیں۔ رسائل اور جرائد نکلے ہیں۔ مختلف گراں مایہ تصانیف منظر عام پر آئی ہیں۔ ڈاکٹر مظفر حنفی کا قلم کبھی خاموش نہیں رہا۔ ان کی علمی بصیرت اور وسعت کے مختلف نمونے ملک کے مقتدر رسائل میں ہی شائع نہیں ہوئے بلکہ درجنوں کتابیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئیں جو ان کی علمی و ادبی بصیرت کی غماز ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ مظفر حنفی کا علمی و ادبی سفر طالب علمی کے زمانے سے نوکری کے ساتھ جاری رہا۔ پوسٹ

گریجویشن سے پی ایچ۔ ڈی تک وہ مختلف عہدوں کے ساتھ یونیورسٹی کے اعلیٰ عہدوں تک لکھتے، پڑھتے اور پڑھاتے رہے اور ملک کے مشہور اساتذہ اور قلم کاروں میں نام حاصل کیا۔ درس و تدریس کے جادہ پر قدم رکھنے سے قبل وہ اپنی علمی و ادبی بصیرت اور غیر معمولی تخلیقی قوت کے باعث ایک ذہین شاعر و ادیب کا مقام حاصل کر چکے تھے۔ ملک کے کئی مقبول رسالوں میں ان کی شعری و نثری تخلیقات منظر عام پر آ چکی تھیں۔ ادھر جب صحافت کا ذوق پیدا ہوا تو شہر کھنڈوہ سے رسالہ 'نئے چراغ' جاری کیا۔

غرض ملازمت کی مختلف نوعیتوں کے ساتھ علمی و ادبی سرگرمیوں میں مصروف رہ کر شعر و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ ادبی ادراک اور تخلیقی شعور کے باعث انھوں نے تاریخ ادب میں اپنی پہچان قائم کی۔ ادھر تدریس ادب میں بھی انھوں نے اپنی لیاقت، فراست، صلاحیت اور ریاضت کے باعث نام حاصل کیا۔ یہاں تک کہ کلکتہ یونیورسٹی میں 'اقبال چیئر' پر فائز ہو کر اردو کے مشہور اساتذہ میں نام کمایا۔

اردو ادب کی تاریخ میں ایسے اہلِ قلم کم ہیں جو ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں یا ادبی وقار کے باعث لائقِ ستائش ہیں۔ ڈاکٹر مظفر حنفی ہمہ جہت شخصیت رکھتے ہیں۔ وہ اردو کے عہد ساز محقق و نقاد ہیں، فکشن نگاری میں ماہر ہیں۔ بچوں کی ادبی دنیا کے سیّاح ہیں۔ صحافت کے میدان سے بھی آشنا ہیں۔ ذہین استاد ہونے کے ساتھ صاحبِ قلم دانشور، شاعر اور ادیب ہیں۔ غرض وہ ادب کی ایک ہمہ گیر شخصیت ہیں۔ ان کی ادبی تخلیقات متنوع ہیں۔ ان کا ادبی میدان وسیع ہے۔ مختلف اصناف ادب پر ان کا قلم بے تکان رواں دواں رہا ہے۔ ان کی ہر کاوش نظم و نثر کی خدمت میں مصروف رہی ہے۔ ان کی تحریریں واضح پیرایۂ اظہار کے باعث عام فہم و سلیس ہیں۔ جملوں اور فقروں کی ساخت دل نشیں ہے۔ اظہار بیان میں شگفتگی و تازگی کے ساتھ معنوی حسن اور طنز و مزاح کی چاشنی ہے۔

گو کہ مظفر حنفی کی ادبی حیثیتیں مختلف ہیں مگر شاعری اور نثر نگاری میں وہ آپ اپنی مثال ہیں۔ کئی شعری اور نثری کارنامے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ شعر و ادب میں وہ ایک الگ پہچان کے مالک ہیں۔ ناول نگاری، افسانہ نویسی اور ڈراما نگاری ان کی فکشن نگاری کے اہم ستون رہے ہیں۔ اولاً مظفر حنفی نے ناول نگاری کی طرف توجہ دی۔ جاسوسی ناول کے طرز کو پسند کیا، کئی مشاہیر ناول نگاروں کا مطالعہ کیا۔ انگریزی جاسوسی ناولوں سے استفادہ ہی نہیں کیا بلکہ ترجموں کے ذریعہ اردو ادب کو مالا مال کیا۔ ان کا مقبول ناول 'چوروں کا قاتل' ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد نسیم بک ڈپو، لکھنؤ نے 'دوسری سازش' ۱۹۵۹ء، 'پراسرار قتل' ۱۹۵۵ء، اور 'شرلاک ہومز ہندوستان میں' ۱۹۵۶ء میں شائع کیے۔ مظفر حنفی ایک ماہر ناول نگار کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ وہ ناولوں کی ساخت اور خوبیوں سے آگاہ ہیں۔ انھوں نے ان جاسوسی ناولوں کے تراجم ایک ماہر ناول نگار کی طرح کیے اور کہیں ترجمے کی بو نہیں آنے دی۔ یہاں تک کہ ان کا ہر ناول طبع زاد معلوم ہونے لگا۔

مظفر حنفی کو ناولوں کی ساخت اور اس کی خوبیوں سے گہری واقفیت ہے۔ انھوں نے ان ناولوں کے تراجم ایک ماہر ناول نگار کی طرح کیے ہیں۔ ان ناولوں میں کہیں زبان و بیان یا ماحول کی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ ناول مظفر حنفی کے طبع زاد معلوم ہوتے ہیں، کیوں کہ انھوں نے ناولوں کے کردار اور اس کے مختلف گوشوں کو ہندوستانی رنگ عطا کیا ہے تا کہ ترجموں میں ماحول اور زبان کی اجنبیت محسوس نہ ہو۔ قدرت نے مظفر حنفی کو ناول نگاری کی فطری صلاحیت عطا کی ہے۔ یہ ان کی تخلیقی قوت ہی کا نتیجہ ہے کہ ان کا متذکرہ ہر ناول طبع زاد معلوم ہوتا ہے۔ مظفر حنفی اپنی اس تخلیقی قوت کے لیے فکشن کی تاریخ میں سدا یاد رکھے جائیں گے۔

مظفر حنفی کو یک بابی ڈراموں سے بھی گہرا لگاؤ رہا ہے۔ انھوں نے گجراتی زبان کے کچھ مشہور یک بابی ڈرامے ترجموں کے ذریعہ اردو میں داخل کیے۔ یہ ڈرامے بھی مظفر حنفی کی فنی مہارت کو واضح کرتے ہیں جس کے باعث یہ تراجم کم اور طبع زاد زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔

بچوں کے ادب کے حوالے سے بھی مظفر حنفی کا نام اہم ہے۔ انھوں نے بچوں کے لیے اچھی نظمیں اور خوب صورت کہانیاں لکھیں۔ بچوں کے ادب سے متعلق ان کی چار مقبول اور اہم کتب 'نیلا ہیرا'، 'کھیل کھیل میں'، 'چٹخارے' اور 'بندروں کا مشاعرہ' ۱۹۵۳ء سے ۲۰۰۴ء کے درمیان منظر عام پر آئیں جو بزم اطفال میں بہت مقبول ہوئیں اور مظفر حنفی کا نام بچوں کے ادب میں نمایاں کام کرنے والوں کی فہرست میں شامل ہوا۔ قومی کونسل آف چائلڈ ایجوکیشنل دہلی اور اتر پردیش و بہار کی اکادمیوں نے بھی اعزازات و انعامات سے نوازا۔

بچوں سے متعلق متذکرہ کتب بے حد دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ بچوں کی اصلاح و تربیت میں ان تخلیقات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یوں تو وقتاً فوقتاً ہمارے اہلِ قلم نے بچوں کی علمی، تعلیمی اور تربیتی ترقی کے لیے کام کیا ہے لیکن ہر عہد میں بچوں کے ادب پر لکھنے والوں کی کمی محسوس کی جاتی رہی ہے۔ پھر بھی مستقبل امید افزا ہے۔

مظفر حنفی نے جب افسانوی دنیا میں قدم رکھا تو وہاں بھی انھوں نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔ رنگا رنگ افسانے لکھے۔ معاشرے کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا۔ حیات و کائنات کے پیچیدہ مسائل، انسانی رشتوں، سماجی و سیاسی، اقتصادی الجھنوں، نفسیاتی خلشوں اور جنسی کجرویوں کو ہی بے نقاب نہیں کیا بلکہ ہر سماجی مسئلہ کو خوب صورت افسانوی رنگ دے کر درجنوں افسانے لکھے۔ انھوں نے اپنی انفرادیت قائم رکھی اور اردو کے افسانوی ادب میں ایک الگ پہچان بنائی۔ ان کے افسانے ملک کے مقبول رسالوں میں کم و بیش پندرہ برس تک شائع ہوتے رہے۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'اینٹ کا جواب' مرکز ادب، بھوپال سے شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کے افسانوں کے دو مجموعے 'دیدۂ حیراں' اور 'دو غنڈے' ۷۰-۱۹۶۹ء کے درمیان شائع ہوئے۔ اوّل الذکر کو فن کدہ سیہور نے اور مجموعۂ ثانی کو نصرت پبلشرز، لکھنؤ نے شائع کیا۔

ایک بڑے فن کار کے یہاں افسانوں کی ہیئت و تکنیک کی منفرد صورتیں ہوتی ہیں جن کے باعث کہانیاں زبان و بیان کے اعتبار سے بیانیہ، تجریدی اور علامتی رنگ و روغن لیے ہوتی ہیں۔ یہی انفرادی صورت مظفر حنفی کی کہانیوں میں نظر آتی ہے۔ دوسری زبانوں کے مطالعہ کے باعث بھی ان کی کہانیوں میں ہیئت و تکنیک کے اچھے تجربے موجود ہیں۔ ان کے یہاں زبان و بیان کی گرفت بھی لاجواب ہے۔ وسعتِ فکر اور مشاہدہ کی گہرائی نے کہانیوں کو دلچسپ اور فکر انگیز بنا دیا ہے۔ وہ تجربات و مشاہدات کو کہانی کی گرفت میں اس طرح لاتے ہیں کہ قاری پڑھتے وقت کہیں بوریت محسوس نہیں کرتا اور نہ اس کا جی اچاٹ ہوتا ہے۔ وہ بے تکان کہانی پڑھنے میں مصروف رہتا ہے۔ کہانی میں اس کا تجسس برقرار رہتا ہے۔ ادھر ان کے اثر دار چھوٹے بڑے جملے اور فقرے ذہن و دماغ کی گرد جھاڑتے نظر آتے ہیں۔ نفسیاتی اور حسین پہلوؤں کو بھی وہ ایک مخصوص معیار تک لانے اور دامنِ تہذیب آلودہ ہونے سے محفوظ رکھنے کی کاوش کرتے نظر آتے ہیں۔ پروفیسر مظفر حنفی ایک ذہین و ذکی انسان ہیں۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ان کی گہری نظر ہے۔ وہ انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں سے بخوبی واقف ہیں۔

وہ انسانی زندگی اور اس سے متعلقہ سماجی مسائل کو سوچ سمجھ کر کہانی کا رنگ دیتے ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کے حقائق افسانے کے فن میں ڈھل کر بے حد حسین ہو جاتے ہیں۔ ان کی اس خوبی کی اصل وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے عہد کے تغیر پذیر حالات اور معتبر واقعات کو شدت کے ساتھ محسوس ہی نہیں کیا بلکہ اپنی فنّی بصیرت کے حوالے سے کہانی کا تانا بانا بُنا اور افسانے کے فن کو بلند کیا۔ عام طور پر افسانوں کا رنگ و روغن یا تعمیر فکر کی دو سطحیں ہوتی ہیں۔ رومانی یا غیر رومانی، متحیر کرنے والے واقعات یا عام واقعات۔ سب ہی معاملات فن کار کی سوچ اور فکر کے سہارے قلم بند ہوتے ہیں جو عام نظر سے پوشیدہ ہوتے ہیں اور قاری کو متحیر کرتے ہیں۔ یہاں افسانہ نگار کا یہی کمال ہوتا ہے کہ وہ فکر کی ایک ایسی دنیا تعمیر کرتا ہے کہ قاری کہانی کے اختتام پر غور و خوض یا فکری احساسات کی ایک ایسی دنیا تعمیر کرتا ہے کہ جہاں محض نفسِ طبع ہی نہیں بلکہ ہیجاناتِ حیات کا تحیر بھی غالب ہوتا ہے۔ مظفر حنفی کے افسانوی فن کی امتیازی خوبیوں کی وضاحت پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے، کیوں کہ ایک مختصر سے مقالہ میں ہر کہانی کا تجزیہ یا مختلف شعری تخلیقات یا ادبی نگارشات کا الگ الگ جائزہ لینا ناممکن ہے۔ جس طرح ان کی کہانیاں متنوع موضوعات کی حامل ہیں، اسی طرح ان کی شعری تخلیقات اور نثری نگارشات متنوع موضوعات پر محیط ہیں۔ بہر کیف ان کی نظم و نثر میں زندگی اور ادب کے گونا گوں پہلو موجود ہیں۔

مختصر یہ کہ ان کا قلم رنگا رنگ موضوعات کی عقدہ کشائی کرتا ہے۔ ان کی تحریریں مدلّل ہوتی ہیں۔ ان میں علمیت، فکر کی گہرائی اور سنجیدگی ہوتی ہے جو نئے ادبی گوشوں کو کھولنے کی دعوت دیتی ہے۔ ادبی امور پر غور و فکر کے لیے میدان ہموار کرتی ہے۔ تحقیق و تنقید کے لیے راہیں کھولتی ہے۔

OOO

سعید احمد سلطان

قلم وقرطاس کی پیاس

شہرتِ عام، بقائے دوام کا دریچہ اُنھی پر کُھلتا ہے جو جہدِ مسلسل کو شعلہ صد رنگ بنا کر متعین منزلوں کے مسافر بنے رہتے ہیں۔ دستِ قدرت ایسے ہی افراد پر ہمیشہ سائبان بنائے رکھتا ہے۔ یہ دراصل خلوص، سچائی اور محنت کی عادت کا ثمر ہوتا ہے۔ اُنھوں (مظفر حنفی) نے بھی خلوص اور سچائی کے ساتھ محنت کی عادت اختیار کیے رکھی۔ سوچنے، کھوجنے اور پرکھنے کی روایت شعار کیے رکھی۔ حرف ولفظ ومعانی سے ربط ضبط بڑھا کر، قلم اور قرطاس کا آئینہ خانہ سجا کر زندگی کے سارے رنگوں، رواجوں، ریتوں، روایتوں، رویوں، رعنائیوں کو عکس کرتے رہے۔ اب یوں ہے کہ ان کے تراشے ہوئے سارے انداز اپنا اعجاز دکھاتے ہوئے ہر دیکھنے والی آنکھ کو اپنے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ سارے رنگ ہر سوچنے والے کو اپنے محسوس ہوتے ہیں۔ اُن کے قلم کا کمال یہ ہے کہ ایک تاریخ مرتب ہو گئی ہے۔ سو سے زائد تخلیقی، تحقیقی، تنقیدی، ادبی کتابیں اور شعری مجموعے اُن کا اثاثۂ فکر اور سرمایۂ جاں ہیں۔ شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں ایسے ہُنر کار اگر بلند ایوان پر متمکن نہیں ہوں گے تو اور کون ہوگا؟ کہتے ہیں ۔

ہر ایک نوکِ پلک پر شرر لگائے ہوئے　　چلا کیا میں نظر چاند پر لگائے ہوئے

جن کی نظریں بلندیوں پر ہوں، وہ بلند مقام حاصل کر ہی لیتے ہیں۔ اگرچہ صورت یہ بھی ہوسکتی ہے جو بے ساختہ اظہار ہوئی ہے ۔

اِدھر بھی دیکھ کہ ہم موج موج بہتے ہیں　　شکستہ کشتی کے تختے پہ سر لگائے ہوئے

زندگی گزارنے اور کرنے کو وہ سہولتیں تو میسر ہی نہیں ہیں جن کی بدولت روش روش گلاب کھلتے ہیں، مگر یہ اُن کا عزم ہے جو اُنھیں مسلسل بہترین کے حصول کے سفر پر آمادہ رکھے ہوئے تھا۔ تمہید طویل ہوگئی۔ یہ ذکر اُس ہمہ جہت شخصیت کا ہے جو یکم اپریل ۱۹۳۶ء کو متحدہ ہندوستان کے شہر کھنڈوا (مدھیہ پردیش) میں پیدا ہوئی۔ نام محمد ابوالمظفر رکھا گیا اور تخلص تخلیقی سفر پر روانہ ہونے پر حنفی تجویز ہوا۔ یعنی یہ قصہ ممتاز شاعر، نقاد،

مترجم، محقق اور افسانہ نگار محترم المقام سید مظفر حنفی کا ہے۔ میرا اُن سے پہلا تعارف جناب احمد زین الدین کے سہ ماہی جریدے 'روشنائی' کے اُس گوشے کے وسیلے سے ہوا تھا جس میں اُن کی شخصیت، فن اور فکری سفر کے حوالے سے تحریریں شامل کی گئی تھیں۔

سید مظفر حنفی سال ۱۹۶۰ء میں مدھیہ پردیش کے محکمۂ جنگلات میں ملازم ہوکر بھوپال منتقل ہو گئے۔ دورانِ ملازمت ہی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے کیا، بھوپال یونیورسٹی سے ایم اے، ایل ایل بی اور پی ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ 'شاؔد عارفی: شخصیت اور فن' اُن کے مقالے کا عنوان تھا۔ شاؔد عارفی کے روبرو ہی انھوں نے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا، سو اُستادِ سُخن کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا یہی طریقہ اختیار کیا۔ سال ۱۹۷۶ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو میں ریڈر کی حیثیت سے تدریسی فرائض نبھانے لگے۔ ۱۹۸۹ء میں کلکتہ یونیورسٹی نے اُنھیں اقبال چیئر پروفیسر کی حیثیت سے منصب سنبھالنے کی دعوت دی۔ وہیں سے سال ۲۰۰۱ء میں فرائضِ منصبی سے سبک دوش ہوکر مکمل طور پر قرطاس وقلم سے جُڑ گئے۔

سید مظفر حنفی کا شعری، نثری، تحقیقی، تنقیدی اور ترجمہ نگاری کا سفر ایک والہانہ لگاؤ کے ساتھ مسلسل بہاؤ میں رہا۔ جب انھوں نے پہلا حرف لکھنا سیکھا تب سے ہی تسلسل کے ساتھ آگے بڑھتے رہنے کا ارادہ مستحکم کرلیا تھا۔ مستحکم ارادے ہی پختہ وعدوں کی تکمیل میں کام آتے، ساتھ نبھاتے ہیں۔ انھیں بھی زندگی کے ہر موڑ، ہر مقام پر خوش الہام خوابوں نے گُلاب رنگ تعبیروں تک پہنچنے کی راہ دکھائی۔ پختہ ارادوں اور خود سے کیے وعدوں نے اُن مشکل، خارخار اور موڑ مُڑتی راہوں پر چلنے کا حوصلہ بخشے رکھا۔ وہ ہر پڑاؤ پر باوقار انداز میں خیمہ زن ہوکر تحقیق، تنقید، تخلیق کے چراغ جلاتے، کہانیاں کہتے، شعر لکھتے، نظمیں تراشتے رہے۔ اجنبی دیسوں کی زبانوں سے ربط ضبط بڑھا کر انھیں حلقہ بگوش اردو کرتے رہے۔

سیّد مظفر حنفی کی فکر کی منظوم کہانی بے شمار رنگوں میں تحلیل ہوکر خاصی طویل بن گئی ہے جس کی تحویل میں زندگی کے سارے زاویے، ذائقے اور زرد انے شامل ہیں۔ 'پانی کی زبان' سے 'تیکھی غزلیں' بیان، دل دریچوں میں بے شمار جذبے 'عکس ریز' ہوکر روبرو آئے تو 'صریرِ خامہ' نے 'دیپک راگ' کی لہر کو یک بہ یک 'یم بہ یم' بنا دیا۔ تب 'طلسمِ حرف'، 'کُھل جا سِم سِم' پکارتا ہوا 'پردہ سُخن کا' بنا تو ہر سمت سے 'یا اَخی' کی صدا بلند ہوئی۔ وقت نے 'ہاتھ اوپر کیے'، 'پرچمِ گرد باد' سنبھالا، اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، 'ہیرے ایک ڈال کے دیکھے' اور کہا 'آگ مصروف ہے'۔ یہ خبر تھی، خبر خیر بھی سناتی ہے، خرابی بھی لاتی ہے، یہ وقت پر منحصر ہے کہ کیا ملتا ہے۔ مگر حقیقت یہ بھی ہے کہ آگ گرم جوشی لاتی، دل کی حرارت زندگی کی شرارت کا عکس و آئینہ بن کر جلوے دکھاتی، الاؤ بھڑکاتی، روشنیاں بڑھاتی، پھیلتی ہی چلی جاتی ہے۔ آگ کے اس الاؤ میں چاہت واپنائیت کی گرم جوشی شامل رہ کر دلوں کو قریب لاتی رہتی ہے، جادو جگاتی رہتی ہے۔ سید مظفر حنفی کے ہاں بھی غزل ونظم کی صورت میں یہی انگارے اور شرارے ملتے ہیں

جو ستارے بنتے اور رستہ بھی دکھاتے ہیں اور زندگی کے مختلف جذبوں، کیفیتوں، صورتوں کو حرف وصوت کا آہنگ دے کر سماعتوں کو سناتے رہتے ہیں۔

یہ ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو پرت در پرت حیات کو کہانی کاری کے ہُنر میں آمیز کر کے دلچسپی بڑھانا اور سوچ کے دریچے روشن کرنا ہے تا کہ کہیں مشکلات سدِّ راہ بنیں تو حوصلہ ہارنے کی بجائے ولولہ جگا کر انھیں دور کیا جا سکے۔ بات اکثر بچوں سے شروع ہوتی، جوانوں تک پہنچتی اور بزرگوں پر آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ سیّد مظفر حنفی بھی پریوں کے پروں سے بچوں کے شعور کو ہوا دیتے، حسن وحقیقت کا چراغ جلا کر نوجوانوں کو بہلاتے، راہ دکھاتے اور دانش وفراست کے گلستاں سجا کر بزرگوں سے داد سمیٹتے ہیں۔

اسرار ہائے حیات کو رنگِ ثبات دینے کے لیے، پرت در پرت رازوں کی حقیقت تک رسائی کے لیے تحقیق وجستجو کی رہ گزر چُنی جاتی ہے، سید مظفر حنفی کی جستجو پسند فکر تحقیق کی اوگھٹ گھاٹیوں میں اُترتی اور سچائیوں کی خبر لاتی ہے۔ اُن کی سوہنی، من موہنی سچائیوں کا شمار مسلسل قطار کی صورت میں سفر کرتا سو کا سنگِ میل عبور کر چکا ہے اور جو ابھی منظر عام پر نہیں آیا وہ اس سے الگ ہے۔

سنیے! معنویت کی محبت سے آراستہ اشعار کہنے کا سلیقہ ہر ایک کے بس میں کہاں! پُرخلوص، سچی اور طویل ریاضت کی رفاقت اِس پڑاؤ پر پہنچاتی ہے۔ ریاضت کے سائبان تلے روز وشب نہ گزارے ہوں تو خیال میں تنویر، بات میں تاثیر، سراپا دکھانے سے گریز کرتی ہے، اور یہ بات منظوم کلام تک محدود نہیں، منثور اثاثہ بھی اپنی قدر وقیمت افزوں کرنے کے لیے اسی عنصر کا تقاضا کرتا ہے۔ کہانی کاری سے لے کر تحقیقی وتنقیدی روش بھی ریاضت کی نوازش کی طلب گار رہتی ہے۔ اور ہاں سفر میں مشکلات بھی تو سدِ راہ بننے کی رِیت اپنائے رکھتی ہیں، مگر ہمتی اور حوصلہ مند لوگ مشکلات کو کم کم خاطر میں لاتے ہیں اور ڈنکے کی چوٹ پر اپنی فتح کا اعلان کرتے ہیں، ہاں اپنی بپتی دوسروں تک بھی ضرور پہنچاتے ہیں۔ سید مظفر حنفی نے بھی اپنی کہانی ہمیں سنائی ہے۔

تمھیں کیسے بتاؤں چاندنی پر شعر کہتا ہوں
تو ظلمت آ کے میرے بام ودر میں بیٹھ جاتی ہے

ہجر شکار لمحوں کی کسک دیکھیے۔

یہ بھی تو چلتی سانسوں کا فسانہ ہے
دل بہلانے کا یہ ایک بہانہ ہے
آپ دریا کے ساتھ جاتے ہیں
اور وہ لوٹ کر نہ آیا تو؟

ہاں یہاں مرزا اسداللہ خاں غالب یاد آئے۔

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

بسا اوقات دکھوں کی برکھا بدن میں آگ بھی لگاتی ہے، ذہن بھی گرماتی ہے اور دل اول فول بکنے کو

بے تاب ہو جاتا ہے۔ مگر مظفر حنفی صاحب اس سے گُریز کی ریت سکھاتے ہیں۔

اُسے نہ یاد کیجیے تپے ہوئے دماغ سے
گلاب کی نمی نہ دور کیجیے چراغ سے

محاورے کے باکمال استعمال کے ساتھ سادگی اور سہل ممتنع کی مثال ملاحظہ ہو۔

ان سے جب نیناں لڑ گئے
لینے کے دینے پڑ گئے

طنز کی تیکھی لہر بھی کہیں کہیں ان کے اشعار میں جگہ بناتی ہے، مقصد ناروا رویوں کی نشاندہی ہے۔

جی ہاں میں نے بھی دیکھا تھا
اُس کا کوئی دوش نہیں ہے
جب شعلوں کا ناچ ہوا تھا
کافی دور کھڑا تھا پانی

گویا فیصلہ کن کام کرنے والے ہی تماشہ دیکھنے میں مگن رہتے ہیں۔ اس میں بھی تو اُن کا مفاد ہوتا ہے۔ اس کہانی کا تسلسل یہ بھی تو ہے۔

شکریہ ریشمی دلاسے کا
تیر تو آپ نے بھی مارا تھا

کیا یاد دلایا......

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

دوسری جانب محبت کا پھیلاؤ اپنے گھیراؤ میں لیتا ہے تو بے اختیار اِک والہانہ پُکار اپنا اظہار کرتی ہے۔

مری نگاہ مرے عکس کو ترستی ہے
ہر آئینے میں وہی مہربان بیٹھ گیا
یہ سر پہ گھٹا چھائی ہوئی ہے کہ تری یاد
سایہ سا کوئی راہ میں جاتا ہے کہ میں ہوں
جز نامِ خدا کچھ بھی سنائی نہیں دیتا
اب اُس کے سوا کوئی دکھائی نہیں دیتا

مثالیں بے شمار ہیں، روبرو آنے کو بے قرار ہیں، مگر وقت کا تقاضا اختصار ہے۔

بس کہہ دیا کہ ہم نہ چلیں گے کسی کے ساتھ
پیچھے پلٹ کے دیکھ رہا ہے زمانہ کیوں؟

سنیے! جب اُداسی چارسُو بسیرا لگاتی پھر رہی ہو تو آنکھوں سے نکلتی آنسوؤں کی روانی قابلِ دید ہوتی ہے جو یہ خبر سناتی ہے کہ۔

جنگل میں اس طرح کی اداسی کبھی نہ تھی
اے کارواں ٹھہر کوئی ساتھی بچھڑ گیا

یہ تازہ واردات ہے جس نے دل کی کائنات کو اداسیوں سے بھر دیا ہے۔ وہ جو محفلوں کی جان، مشاعروں کی پہچان، حرف ولفظ ومعانی کا مان تھے، اپنی ذات میں ایک انجمن ایک منفرد دبستان تھے، سب کو داغِ مفارقت دے کر ۱۰ اکتوبر ۲۰۲۰ء کو خاک اوڑھ کر سو گئے، اپنے رب کے ہو گئے۔ اس کارگہِ ہستی میں بے شمار افراد نام ونمود کی قیود سے آزاد رہنے پر مجبور ہوتے ہیں، شاید حالات وواقعات انھیں اپنی ذات تک محدود رکھتے ہیں، مگر وہ لوگ جو جذب وجنوں سے آراستہ رہتے ہوئے ہمت اور حوصلے کی انگلی پکڑ کر آگے بڑھنے

کا عزم لیے بلند نگاہی کی سربراہی میں سفر جاری رکھتے ہیں تاریخ ان کو شہرت وعظمت کے روشن ایوانوں میں لا بٹھاتی ہے۔ سید مظفر حنفی بھی اُنہی قلیل شخصیات کی فہرست میں نمایاں حیثیت رکھنے والے وہی ہنر کار تھے جن کی آئینہ گری سے معاشرے نے اپنا چہرہ سارے زاویوں سے دیکھا، جانچا پرکھا اور سُدھار کی خاطر اقرار بھی باندھا۔ اللہ رب العزت سید مظفر حنفی کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس کی تمام نعمتوں سے نوازے۔

ع: ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

○○○

''مظفر حنفی کو بات کہنے کا ڈھب آتا ہے اور افسانے کی تخلیق کے سارے لوازم معلوم ہیں۔ کون سی بات قاری سے کس وقت کہنا ہوگی، کون سی چھپا کر رکھنا ہوگی اور صرف آخری سطر میں مٹھی کھول دینا ہوگی۔ حالاں کہ آج کل کا قاری بہت ہوشیار ہو چلا ہے۔ اکثر اوقات افسانہ ختم ہونے سے پہلے ہی اس کا انجام معلوم کر لیتا ہے مگر مظفر حنفی، مصنف اور قاری کی اس شطرنجی لڑائی میں اکثر و بیشتر اپنے قاری کو مات دے جاتے ہیں۔ بالخصوص 'الماس کا محبوب' کا انجام مصنف کی فن شناسی اور تخلیق کاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ ان افسانوں میں ظلم کوئی حادثہ نہیں ہے۔ روزمرہ کی حقیقت ہے۔ مصنف اس ظلم پر خود چونکتا ہے نہ پڑھنے والے کو چونکاتا ہے۔ ظلم، افلاس، بے کاری، ناامیدی، قحط سالی، دھوکا، فریب، جعلسازی جیسے موجودہ زندگی کے شب و روز ہوں۔ ان کا وجود اتنا ہی ناگریز ہے جتنا ماہ و سال کا چکر۔ مصنف کہیں پر احتجاج کرتا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔ یہی اس کی فن کاری کی دلیل ہے کہ احتجاج نہ کرتے ہوئے بھی پورا افسانہ بولتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اسی احتجاج کی داستان جس کا سارے فسانے میں ذکر نہیں۔ بات کہنے کا یہ بھی ایک انداز ہے اور بہت مشکل ہے یعنی یوں کہ ہونٹ سی لیے جائیں اور آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہ ٹپکے لیکن افسانے کے آخر میں قاری دل مسوس کر رہ جائے۔ ایک اُداس کیفیت محسوس کرنے کے بعد تشنگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ کچھ اور کہا ہوتا۔ زیادہ کھل کر کہا ہوتا، مگر اسی تشنگی پر ہے افسانے کا مدار، سیری نہ ہوتو دوسرے مجموعے کا انتظار بھی ہوگا۔ لگتا ہے کہ مصنف نے اس زندگی کو خود جھیلا ہے۔ اس زندگی کے بیچ میں بیٹھ کر یہ افسانے لکھے ہیں، کسی اوپر کے ٹیلے پر بیٹھ کر نیچے بہنے والی زندگی کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ صرف اس کا خامہ خوں چکاں نہیں ہوا ہے۔ اس کی انگلیوں کی پوروں سے یہ لہو بہا ہے۔ خود اس کا دل جھلسا ہے۔ ممکن ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہو مگر زندگی پر حنفی کی بے تکان گرفت کچھ یہی کہتی ہے۔ مظفر حنفی نے اندھیرے کنوئیں میں ڈول نہیں ڈالے ہیں۔ لاشعور کی بھول بھلیوں میں گم نہیں ہوا ہے۔ حد سے بڑھی ہوئی دروں بینی کا شکار نہیں ہوا ہے۔ تجزیاتی ٹامک ٹوئیوں میں الجھ کر نہیں رہ گیا ہے۔ وہ زبان و بیان کے الجھاوے دے دے کر زندگی سے آنکھیں چرانے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ آنکھیں چار کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ایک عجیب لاپروا تیقن کے ساتھ۔'' **(کرشن چندر)**

نصرت ظہیر
نئی دہلی

ایک معذرت نامہ مظفر صاحب کی نذر

جب بھی کسی بڑے ادیب کو خراج تحسین ادا کرنے کے لیے مجھ جیسا ادنیٰ ادیب قلم اٹھاتا ہے تو مضمون بالعموم اس بات سے شروع کرتا ہے کہ ممدوح و موصوف سے اس کا ذاتی تعلق کیا ہے، کیوں ہے، کب سے انھیں جانتا ہے اور اس حربے سے وہ اپنے بارے میں سب کچھ بیان کر ڈالتا ہے۔ اس حساب سے اگر میں مظفر حنفی صاحب پر کوئی مضمون لکھوں تو وہ کچھ اس قسم کا ہوگا۔

ملک کے سب سے بڑے ادیبوں میں سرفہرست شمار کیے جانے والے ادیب، محقق، ناقد اور شاعر جناب مظفر حنفی صاحب کو میں تب سے جانتا ہوں جب وہ ہمارے محلے میں رہتے تھے اور ہمارے پڑوسی تھے۔ میں نے ان دنوں بے حد امتیازی نمبروں سے انٹر پاس کر لیا تھا اور سائنس میں گریجویشن کی تیاری کر رہا تھا۔ اس سے پہلے ہائی اسکول میں بھی میں نے اسکول میں ٹاپ کیا تھا۔ ان ہی دنوں ایک روز کلاس میں بیٹھے بیٹھے مجھے شاعری کا شوق ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ ایک لمبی سی غزل کہہ ڈالی۔ دوستوں کو غزل سنائی تو وہ دنگ رہ گئے۔ اس سے میرا حوصلہ بڑھا اور میں باقاعدگی سے غزلیں کہنے لگا۔ میں روزانہ پانچ وقت کی نماز پڑھتا اور چھ غزلیں کہہ دیتا۔ اسی دوران ایک مرتبہ میں نے مظفر حنفی صاحب کو مسجد میں دیکھا تو وہ بھی نماز پڑھ رہے تھے۔ چند مہینوں میں ہی میری موٹی سی رف ورک کی کاپی غزلوں سے بھر گئی اور میں بازار سے ایک اور رف کاپی خرید لایا۔ راستے میں مظفر حنفی صاحب کہیں جاتے ہوئے دکھائی دیئے تو میں نے انھیں سلام کیا جس کا انھوں نے خندہ پیشانی سے جواب دیا۔ آخر جب میں دو رف کاپیاں غزلوں سے بھر چکا تو مجھے خیال آیا اب شعری نشستوں میں شرکت کرنی چاہیے۔ مقامی شعرا میری غزلوں پر خوب داد دیتے، اور کہتے کہ واہ میاں خوب ترقی کر رہے ہو، ایک دن ضرور والد کا نام روشن کرو گے۔ مگر عجیب بات ہے۔ شعری مجلسوں میں مجھے کوئی مدعو نہیں کرتا تھا۔ آخر میں نے خود ہی ایک ادبی انجمن بنا ڈالی اور اس کی ادبی نشستوں کا سلسلہ شروع کر دیا جن میں چائے اور نمکین سے شعرا کی خوب تواضع کی جاتی اور دیر رات تک پورا گھر داد و تحسین کے شور سے گونجتا رہتا تھا۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ ایک مرتبہ مظفر حنفی صاحب بھی شعری

نشست میں تشریف لائے مگر کچھ ہی دیر بعد طبیعت ناساز ہونے کی بنا پر معذرت کر کے رخصت ہو گئے۔ چند سال بعد میرا شعری مجموعہ ایک اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوا تو ادب کی دنیا میں اسے خوب ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور چند ہی دنوں میں اس ضخیم مجموعے کی تمام کا پیاں تقسیم ہو گئیں۔ کئی مقامی اخباروں نے اس پر شاندار تبصرے بھی شائع کیے۔ اس دوران مظفر صاحب کا تبادلہ کسی دوسرے شہر میں ہو چکا تھا۔ ادھر میرا تخلیقی سفر جاری رہا اور...... غرض اسی طرح کئی صفحے اپنے کارناموں پر روشنی ڈال ڈال کر سیاہ کرنے کے بعد مضمون کو یوں ختم کرتا...... اُس سال جب مجھے اردو اکادمی نے ایوارڈ دیا اور اس کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی تو مجھے دور دور سے مبارک باد کے سینکڑوں خطوط موصول ہوئے اور کسی نے مجھے بتایا کہ مظفر حنفی صاحب دہلی واپس آ گئے ہیں۔ اس دوران میری نصف درجن کتابیں مختلف موضوعات پر چھپ چکی تھیں جن پر کسی نہ کسی اردو اکادمی نے سال کی بہترین کتاب کا ایوارڈ ضرور دیا تھا۔ بلکہ ایک اکادمی نے تو بھول سے ایک ہی کتاب پر دو مرتبہ ایوارڈ دے ڈالا، مختصر یہ کہ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مظفر حنفی صاحب ملک کے سب سے بڑے، نقاد، محقق اور شاعر نہیں تو ایک بڑے ادیب ضرور ہیں اور اردو کے اچھے ادیبوں کی کسی نہ کسی فہرست میں ان کا نام ضرور شامل ہو کر رہے گا۔

یقین کیجیے اس مضمون میں پہلے جملے کے ابتدائی حصے کے علاوہ ایک بات بھی درست نہیں ہے۔ اس کے باوجود جو بھی پڑھے گا اس پر یقین کر لے گا کیوں کہ اردو والے ایسے ہی ہیں۔

ایک طریقہ توصیفی مضمون لکھنے کا یہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے:

مظفر صاحب ہر لحاظ سے اردو کے ایک پڑھے لکھے ادیب ہیں، جس کا ثبوت یہ ہے کہ جب میری پہلی ملاقات ان سے ہوئی تو انھوں نے دیکھتے ہی مجھے گلے لگا لیا اور کہنے لگے کہ واہ میاں! آج کل خوب لکھ رہے ہو۔ یقین کرو میں تمہارا کوئی مضمون پڑھے بغیر نہیں چھوڑتا۔ طنز و مزاح کی بات تو جانے دو، سنجیدہ ادب میں بھی کوئی آج کل اتنی عمدہ اور قہقہہ آفریں نثر نہیں لکھ رہا ہے۔

اس کے بعد اپنے مضامین اور نئی کتابوں کا تفصیلی ذکر کرتے کرتے مصنف کو ایک بار پھر ممدوح کی یاد آئے گی اور وہ لکھے گا...... سچ تو یہ ہے کہ مظفر صاحب نے اردو تنقید کو جس مقام پر پہنچا دیا ہے، کوئی دوسرا انگریزی تنقید کو بھی اس مقام پر نہیں پہنچا سکتا۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے اپنے خیال کا اظہار کیا تو کہنے لگے کہ سچ بات تو یہ ہے میاں نصرت ظہیر کہ اس کا سارا کریڈٹ بھی تمھی کو جاتا ہے۔ میں نے حیرت سے پوچھا بھلا وہ کیسے؟ میں تو انگریزی کی الف بے تے بھی نہیں جانتا اور اردو تنقید میں پہلے ہی میرا ہاتھ تنگ ہے۔ اس پر وہ مسکرائے اور کہنے لگے، میاں اتنی کسر نفسی ٹھیک نہیں، مجھے خوب معلوم ہے کہ ساہتیہ اکادمی تمھیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے پر ترجمے کا ایوارڈ دے چکی ہے۔ رہی تنقید تو سچ یہ ہے کہ جو تنقیدی بصیرت تمہارے مضامین میں پائی جاتی ہے وہ اگر پہلے میرے مطالعے میں آ گئی ہوتی تو یقیناً احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا اور کبھی کوئی ڈھنگ کا تنقیدی کام نہ کر

پاتا۔ سارا کام تو تم پہلے ہی کر چکے ہو...... یہاں مصنف دو تین صفحے اپنی شان میں اور تحریر کرے گا جس کے بعد اسے پھر مظفر صاحب کی یاد آئے گی اور وہ لکھے گا...... حنفی صاحب کا علمی اور ادبی شعور تو بلند ہے ہی ذاتی طور پر بھی وہ بڑے قرینے کے آدمی ہیں۔ ایک بار میرے لباس کو غور سے دیکھنے کے بعد کہنے لگے، واہ کیا جامہ زیبی ہے۔ نیلی پتلون پر سرخ کوٹ اور میچنگ ٹائی۔ کوئی اور پہنتا تو دیکھنے میں دہلی پولیس کا چلتا پھرتا سائن بورڈ لگتا، مگر یہ تمہاری جامہ زیبی ہے کہ اس لباس پر بھی تمہاری نفاست اور حسنِ انتخاب کی داد دینا پڑتی ہے۔ اسی طرح مظفر صاحب اخلاقی بلندی، شائستگی اور شرافت کے معاملے میں باقی ادیبوں سے برتر ہیں چنانچہ ایک مرتبہ انھوں نے کئی ادیبوں کی موجودگی میں برسر عام کہا کہ میاں نصرت، تمہاری نثر واقعی لاجواب ہے اور میں ہر ہفتے بے چینی سے تمہارے کالم کا انتظار کیا کرتا ہوں۔ جس ہفتے تم کالم نہیں لکھتے یا اخبار والا کوتاہی کر جاتا ہے تو وہ سارا ہفتہ عجیب بے خودی اور ہشیاری میں گزرتا ہے کہ نہ دن کو سو پاتا ہوں نہ رات کو جاگ سکتا ہوں اور یوں ہفتے کا سارا معمول بدل جاتا ہے۔ یہ سن کر وہاں موجود ادبا کے چہرے حسد سے فق ہو گئے اور ایک ادیب تو جل کر دور جا بیٹھا، وغیرہ وغیرہ۔ یعنی بار بار مظفر حنفی صاحب کا ذکر کرو اور ہر بار ان سے اپنی تعریف میں دو تین جملے کہلواتے چلو، جس کے بعد مضمون اس طور پر ختم ہو گا کہ...... قصہ مختصر یہ کہ مظفر صاحب علم و فن کا سمندر ہیں اور ان کی تخلیقی و تنقیدی بصیرت ایک ایسا آئینہ ہے جس میں مجھ حقیر فقیر کو بھی اپنی تصویر خود سے بہتر نظر آتی ہے۔ خدا کرے ان کا سایہ ہمارے سروں پر یوں ہی ہمیشہ قائم رہے اور حاسدوں کا منھ کالا ہو۔ آمین، ثم آمین۔

میری مشکل یہ ہے کہ مظفر صاحب پر میں مذکورہ بالا انداز کا کوئی مضمون نہیں لکھ سکتا جس کی وجہ یہ ہے کہ نہ تو وہ میرے پڑوسی رہ چکے ہیں، نہ میں نے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ امتیازی نمبروں سے پاس کیا، یہاں تک کہ کسی اردو اکادمی سے بھی مجھے مالی مدد نہیں ملی اور میری کتابوں کی تعداد بھی نصف درجن تک نہیں پہنچی۔ علاوہ ازیں میری جامہ زیبی اور کالم نویسی پر بھی مظفر صاحب نے کبھی کچھ نہیں کہا، ہمیشہ خاموشی اختیار کی کہ جہل کا سب سے بلیغ و پُرمعنی جواب عموماً یہی ہوتا ہے۔

مظفر حنفی صاحب کے نام سے میں تب سے واقف ہوں جب انھیں مظفر خ ف ی پڑھا کرتا تھا۔ آخر جب میری اردو کچھ ٹھیک ہوئی اور املا کسی قدر بہتر ہوا تب پتہ چلا خفی تو دراصل حنفی ہے۔ بڑا غصہ آیا رسم الخط پر۔ ذرا سا ایک شوشہ چھوٹ جائے تو آدمی جانے کہاں سے کہاں جا پہنچے۔ اس کے بہت عرصے بعد مظفر صاحب سے میری پہلی ملاقات سہارنپور کی ڈسٹرکٹ جیل پر ہوئی اور شکر ہے کہ جیل کی حدود سے باہر آزاد اور کھلی فضا میں ہوئی۔ یہ کوئی پینتیس برس پہلے کی بات ہے۔ سہ پہر کا وقت تھا اور ہم لوگ جیل کے مین گیٹ کے باہر کھلے میدان میں ایک چارپائی پر بیٹھے تھے۔ بزرگ دوست اور مقبول شاعر مرحوم کوثر تسنیمی کے علاوہ مظفر صاحب کے کلام کو مجھ سے بہتر طور پر سمجھنے والے ہم عمر و ہم جماعت ریاض حیدر کاظمی بھی موجود تھے۔ مظفر حنفی صاحب اپنے کسی دور کے رشتے دار سے

ملنے آئے تھے جو پولیس میں تھے اور ان دنوں ڈسٹرکٹ جیل سہارنپور میں تعینات تھے۔ ان کے آنے کی اطلاع کوثر صاحب نے کچھ اس طرح دی تھی، ''ارے بھئی، مظفر حنفی شہر میں آئے ہوئے ہیں، ملنا چاہو تو مل لو''۔ مجھ سے پہلے ریاض حیدر نے حامی بھر لی ''چلیے، کل ہی مل لیتے ہیں۔'' کوثر صاحب مسکرائے اور بولے ''مگر اس کے لیے جیل جانا ہوگا۔'' یہ سنتے ہی ریاض نے چائے کا کپ میز پر رکھ دیا۔ ''یا علی! کیا وہ جیل میں ہیں؟'' کوثر صاحب کو لاعلمی کی معصومیت سے محظوظ ہونے کا موقع خدا دے۔ دیر تک مکالمے کو کھینچ کر اِدھر اُدھر گھماتے رہے، تب جا کر اصلی بات بتائی۔ ان دنوں ہم لوگوں کے اپنے اپنے علاقوں میں مخصوص چائے خانے تھے اور وہاں دنیا جہان کی باتوں میں اکثر شاؔد عارفی کے اشعار اور مظفر حنفی صاحب کا ذکر رہتا تھا۔ ادبی رسائل میں شائع ہونے والی مظفر حنفی صاحب کی تازہ غزلوں پر بھی بات ہوتی تھی۔ جیل کے باہر مظفر صاحب ہم نوعمروں سے بڑی شفقت کے ساتھ ملے۔ لمبا قد۔ سانولی رنگت، سیاہ بال، دبلے پتلے اتنے کہ مزید دبلے ہوتے تو مشکل سے نظر آتے۔ دیر تک ان سے ادبی دنیا کے حالاتِ حاضرہ وغیر حاضرہ پر گفتگو رہی۔ اگلے روز ان کے اعزاز میں ٹاؤن ہال میں لٹریری کلب کی جانب سے ایک نشست کا اہتمام کیا گیا۔ یہ لٹریری کلب مرحوم ظ۔ انصاری اور معروف فلم رائٹر اور شاعر نسیم سہارنپوری نے ان دنوں قائم کیا تھا جب دونوں نے سہارنپور نہیں چھوڑا تھا۔ ان کے جانے کے بعد کلب بھی بند ہو گیا۔ اب اس کا احیا ہوا تھا اور اس کے اعلیٰ عہدیدار، جملہ اراکین اور اصحابِ ثلاثہ 'کوثر تسنیمی، ریاض حیدر اور میں' تھے۔

اس پہلی ملاقات کے طویل عرصے بعد دہلی میں آل انڈیا ریڈیو کی بلڈنگ میں ایک مرتبہ انھیں آتے جاتے دیکھا تو سلام تو کر لیا مگر کوئی اور بات اس لیے نہیں کی کہ وہ مجھے پہچان نہیں پائے تھے اور میرا انھیں کچھ یاد دلانا اس لیے عجیب محسوس ہوتا تھا کہ تب تک میری واقعی کوئی پہچان نہیں تھی۔ پھر تب تک ان کے بالوں میں چاندی اتر آئی تھی اور خفیف سے فربہ بھی ہو گئے تھے۔ تب سے اب تک دہلی میں قیام کے دوران تیس بتیس برسوں میں وہ اور میں ایک دوسرے سے خاصے واقف ضرور ہو گئے تھے لیکن ان سے دو تین ہی ملاقاتیں بالمشافہہ و بالمصافحہ ہوئی ہوں گی۔ ٹیلی فونی ملاقاتوں کی تعداد بھی کچھ زیادہ نہیں کہ ان کا ذکر کیا جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے انھیں اتنا پڑھا، اتنا جانا اور اتنا مانا ہے کہ ملاقاتوں کی اس کمی کا زیادہ احساس بھی نہیں ہوتا۔ ان کی شخصیت درحقیقت میرے لیے اس درجہ عزیز اور محترم ہے کہ سائنسی، منطقی اور معروضی اندازِ فکر میں خود کو ان کا ہم مکتب و ہم مشرب پا کر کئی بار میں خود اپنا احترام کرنے لگتا ہوں اور اکثر میرے باطن میں یہ صدائیں گونجتی رہتی ہیں کہ جنبش مکن، ہشیار باش، سجدے میں نگاہ رہے، تمام ہوش و خرد پیش باشاہ رہے، زینتِ تختِ ہندوستان، نازشِ لوح و قلم، ظلِّ الٰہی، شہنشاہ، عالم پناہ......اور کوئی نہ کوئی مجھے ڈسٹرب کر دیتا ہے۔

اس کے علاوہ مظفر صاحب کسی بڑے ادارے کے سربراہ اور اس قسم کی کوئی سر برآوردہ شخصیت بھی نہیں ہیں کہ ان سے کسی قسم کا فیض اٹھانے کا جذبہ ہی مجھے کوئی ڈھنگ کا مضمون لکھنے کے لیے مہمیز کر دے اور تو

اور وہ ادیبوں کے کسی طرح کے گروہی سرغنہ بھی نہیں ہیں کہ ان کی علمیت اور تخلیقی عظمت کے لیے جو احترام میرے دل میں ہے اس کا برملا اعلان کرتے رہنا مجھ پر لازم ٹھہرے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے تعلق سے یادوں کا کوئی ایسا خزانہ بھی میرے پاس نہیں ہے جس کا سہارا لے کر میں کوئی اچھا مضمون لکھ سکوں۔ لے دے کر کچھ تاثرات ہیں جن میں سے ایک کا بیان ضرور کروں گا۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ انھوں نے اپنی طویل نظم 'عکس ریز' جب کتابی صورت میں شائع کی تھی تو اس میں ظ۔ انصاری کا ایک مضمون بھی شامل کیا گیا تھا جو پورے کا پورا مظفر صاحب کی شاعری اور ان کے اسلوب کے رد میں تھا۔ اس کے علاوہ کوئی بھی مضمون کتاب میں نہیں رکھا گیا تھا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو صرف نظم چھاپتا مضمون پی جاتا۔ مگر یہ مظفر صاحب تھے۔ انھوں نے کتاب میں اس مضمون کو نہ صرف من و عن شامل کیا بلکہ اپنی شاعری اور شخصیت کے بارے میں کسی کی کوئی مثبت رائے فلیپ پر یا کہیں اور چھاپنے سے بھی گریز کیا۔ کتاب میں صرف دو چیزیں تھیں، مظفر صاحب کی نظم اور ظ۔ صاحب کا مضمون۔ چنانچہ تیسرا کردار۔ یعنی قاری، یکسو ہو کر فیصلہ کر سکتا تھا کہ کس میں کتنا دم ہے۔ میرے دل میں تبھی سے ان کی بڑی قدر ہے۔ اپنی مخالفت کو نہ صرف برداشت کرنا بلکہ اسے سب کے سامنے رکھ دینا بڑے دل گردے کی بات ہے۔ یہ معروضیت آج کی بہت سی 'عظمتوں' کے خمیر تو کیا ضمیر تک میں نہیں پائی جاتی۔

کچھ باتیں مظفر حنفی صاحب کے تعلق سے ایسی ہیں جن کا علم لگ بھگ سبھی کو ہوگا۔ مثلاً وہ ایک محتاط تخمینے کے مطابق ساٹھ سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ اب تک ان کے پندرہ شعری مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں، دو اور آنیوالے ہیں، جن میں ایک کلیات (کمان) کی شکل میں ہوگا۔ تحقیق و تنقید کی ۱۶ر کتابیں الگ ہیں۔ ۱۴ر کتابیں اب تک ترتیب دی ہیں۔ ۶ر کتابیں بچوں کے لیے لکھی ہیں۔ تین مجموعے ان کے افسانوں کے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے تراجم ہیں۔ یہاں تک کہ اگاتھا کرسٹی اور ارل اسٹینلے گارڈنر کے بھی کئی ناولوں کے ترجمے کر چکے ہیں۔ ماہنامہ 'نکہت' میں ابن صفی کے ساتھ ان کے افسانے شائع ہوتے رہے جو بعد میں ابن صفی کے صرف عمران والے ناول چھاپنے لگا تھا۔ ان سب سے بڑھ کر اپنے استاد اور اردو کے منفرد شاعر شاؔد عارفی کی عظمت کی دریافت اور ان کی بازیافت کا بھی ایک ایسا کام انھوں نے کیا ہے کہ جس کے لیے اردو ادب ہمیشہ ان کا احسان مند اور مقروض رہے گا۔ شاد عارفی پر اپنی پہلی کتاب 'ایک تھا شاعر' انھوں نے اپنی شریکِ حیات کے زیور بیچ کر شائع کرائی تھی۔ ہماری اردو اکادمیوں اور دوسرے ادبی اداروں نے اردو ادب کی بڑی خدمتیں کی ہیں مگر یہ قرض ابھی تک کسی نے ادا نہیں کیا ہے اور شاید یہ ادا ہو بھی نہیں سکتا۔

لہٰذا قارئین کرام! میں اپنی اس کوتاہی اور بے بضاعتی کا سرِ عام اعتراف اور اعلان کرتا ہوں کہ میں مظفر حنفی صاحب کے فن اور ان کی شخصیت پر کوئی ایسا مضمون لکھنے سے قاصر ہوں جو واقعی ان کے لیے بھی شایانِ شان ہو اور میرے لیے بھی کسی قدر توقیر کا باعث بن سکے۔ دعا کیجیے، خدا مجھے اس کی توفیق دے۔ ○○○

پروفیسر اسلم جمشید پوری
شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

استاد سا شفیق ایک شخص: پروفیسر مظفر حنفی

جمشید پور میں ایک کل ہند مشاعرہ تھا۔ ساکچی آم بگان میدان میں منعقدہ مشاعرے میں زبردست بھیڑ تھی۔ یہ تقریباً ۱۹۸۲ء کی بات ہے۔ میں دسویں کا طالب علم تھا۔ مشاعرے کی صدارت بہار کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ جگناتھ مشرا کر رہے تھے۔ ایک شاعر نے مشاعرے کو لوٹ لیا تھا۔ سب سے زیادہ تعریفیں اس شعر نے بٹوریں ؎

مِرے بچے کھڑے ہیں بالٹی لے کر قطاروں میں　　کنویں، تالاب، نہریں اور فوارے بناتا ہوں

شاعر کا نام تھا مظفر حنفی۔ یہ مظفر حنفی سے میری پہلی ملاقات تھی۔ میں ان سے ملا نہیں تھا، لیکن ان کے کلام سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان کے اشعار نے جمشید پور میں شور بپا کر دیا تھا۔ مہینوں مظفر حنفی کے اشعار جمشید پور کی ادبی فضا میں تعریف و تحسین کے دوش پہ سوار گشت کرتے رہے تھے۔ میں نے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ کہانی کے علاوہ شعر و شاعری سے خاصا شغف تھا۔ بیت بازی میں خاصی مہارت تھی۔ اکثر بیت بازی کے مقابلے جیتے۔ اقبالؔ، غالبؔ، میرؔ اور دیگر بڑے شعرا کے ساتھ ساتھ نئی نسل کے معروف شعرا کا کلام مجھے ازبر تھا۔ مظفر حنفی کے اشعار بھی بیت بازی کے مقابلے میں اکثر معاون ہوتے۔ ان دنوں ان کا ایک شعر اکثر میری زبان پر ہوتا تھا ؎

کم گوئی نے عزت رکھ لی، بند ہے مٹھی لاکھوں کی　　ورنہ مظفر لطف آجاتا، کھلتی سیپ نکلتی ریت

مظفر حنفی کی ایک شبیہ دل و دماغ میں بسی ہوئی تھی۔ ۱۹۹۲ء میں میں نے ایم۔ اے اردو کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا رخ کیا۔ دہلی کی اجنبیت کی فضا کو میں نے ملاقاتوں اور رسمِ دوستی سے کچھ کم کیا۔ ادبی محفلوں کا انعقاد، اداروں کا قیام، اخبارات میں جز وقتی ملازمت، ٹیوشن، ادھر اُدھر کی بھاگ دوڑ...... زندگی کی اسی سرگرمی میں متعدد لوگوں سے ملاقات ہوئی جو بہت جلد دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ عطا عابدی، کوثر مظہری، شہپر رسول، نگار عظیم، شمع افروز زیدی، انور نزہت وغیرہ...... احباب کی اس فہرست میں ایک نام تھا فیروز بھائی کا۔ بعد میں علم ہوا کہ یہ دراصل فیروز مظفر ہیں اور مظفر حنفی کے صاحبزادے ہیں۔ بٹلہ ہاؤس میں ایک ادارہ تھا 'حلقۂ فکر و فن'،

میں بھی اس میں شامل ہوگیا۔ اکثر نشستیں مظفر حنفی صاحب کے گھر پر ہوا کرتیں۔ ۱۹۹۶ء میں شمع افروز زیدی، نگار عظیم، انور نزہت اور میں نے، ایک ادارہ 'بزم ہم قلم' بنایا۔ 'حلقۂ فکر و فن' کے فعال سکریٹری عطا عابدی تھے جو 'افکار ملی' میں ملازمت کرتے تھے، جنھوں نے اپنی صلاحیتوں سے 'افکار ملی' کو بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ 'حلقۂ فکر و فن' کے جلسے ہوں یا 'بزم ہم قلم' کی محفلیں، اکثر مظفر حنفی صاحب کی شرکت بطور صدر محفل یا مہمانِ خاص کی حیثیت سے ہوتی۔ ہر موقع پر اپنی پُر مغز گفتگو سے ادب کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتے۔ غزلیں سناتے تو تعریفات کا ایک شور داد کی شکل میں نمودار ہوتا۔

شعبۂ اردو سے جب، میں ایم۔ اے اور بعد میں ریسرچ کر رہا تھا، انھیں دنوں مظفر حنفی صاحب کے بارے میں خاصی باتیں سننے کو ملیں کہ آپ پہلے شعبۂ اردو میں استاد ہوا کرتے تھے بعد میں کلکتہ میں پروفیسر اقبال چیئر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ مجھے اس بات کا افسوس رہا کہ علم و فن کے موجزن دریا سے شرفِ شاگردی حاصل نہ ہوا۔ شعبۂ اردو کے پروگراموں میں آپ کی شرکت، میرے لیے باعث مسرت تھی۔

مظفر حنفی کی شخصیت، بے کراں سمندر جیسی ہے۔ وہ ہمیشہ نئی نسل کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ ادب کے ہر پہلو پر بحث کرتے اور صحیح رہنمائی فرماتے۔ دہلی میں رہتے ہوئے میں متعدد اخبارات و رسائل میں بطور آزاد صحافی کام کرتا تھا۔ 'افکار ملّی' کے مدیر قاسم رسول الیاس نے جب مجھ سے 'افکار' کے ادبی صفحات کی ترتیب کے لیے کہا تو میں نے بخوشی قبول کر لیا۔ میں نے 'افکار' کا ادبی گوشہ تقریباً ۳ر سال تک ترتیب دیا۔ لوگوں کو 'افکار' کے ادبی صفحات کا انتظار رہا کرتا تھا۔ اس دوران میں نے کئی ادبی مباحثے شروع کیے۔ مظفر حنفی ہمیشہ میرے مشیر رہے۔ بحث و مباحثے میں شرکت بھی کرتے اور مفید مشوروں سے بھی نوازتے۔

'جدیدیت کے رجحان نے اردو ادب پر منفی اثرات مرتب کیے ہیں' موضوع پر افکار ملی کے ادبی گوشے میں ایک صحت مند مباحثہ ہوا تھا، جسے بعد میں، میں نے اپنی کتاب 'جدیدیت اور اردو افسانہ' میں بھی شامل کیا تھا۔ یہ مباحثہ نئی نسل میں خاصا مقبول ہوا۔ اس مباحثے میں حصہ لیتے ہوئے پروفیسر مظفر حنفی نے لکھا تھا:

منفی اور مثبت دونوں طرح کے اثرات:

''ادب پر کسی بھی تحریک یا رجحان کے اثرات یکسر منفی یا سرتاسر مثبت ہو نہیں سکتے۔ یہ اثرات مختلف اصناف ادب پر مختلف صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں مثلاً ترقی پسندی نے وضاحت و صراحت پر زور دیا تو غزل پر اس کا منفی اثر ہوا لیکن چوں کہ نظم اور افسانہ بیانیہ وضاحت سے مزاجی مطابقت رکھتے تھے۔ اس لیے ترقی پسند تحریک نے ان اصناف کو مثبت انداز میں متاثر کیا۔ یہی صورت حال جدیدیت کی ہے جو علامت، رمزیت اور اشاریت پر زور دیتی ہے۔ غزل اس رجحان سے بے حد ہم آہنگ ہے، اسی وجہ سے بہت سے ناقدین کا خیال ہے کہ اردو

کے غزلیہ سرمائے میں بہترین حصہ جدید غزل کا ہے۔اس کے برعکس وہ اصناف ادب جن کے خمیر میں صراحت اور بیان واقعہ شامل ہے مثلاً افسانہ، یک بابی ڈراما وغیرہ، انھیں جدیدیت نے بہت نقصان پہنچایا۔ دیکھیے کہ ترقی پسند افسانہ کے مقابلے میں جدید افسانہ کتنا پست ہے اور جدید افسانے میں جو قابل قبول نگارشات ہیں ان کے خالق اکثر ترقی پسندی سے متاثر ہیں۔ ناول نے جدیدیت سے بحیثیت مجموعی اثر ہی قبول نہیں کیا، وہ نظمیں جو زیادہ جدید ہیں، ناپسندیدہ قرار پائیں اور جہاں نظم نے متوازن جدیدیت کو قبول کیا، بلند ہوگئی، اس طرح میں کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے ادب پر جدیدیت کے رجحان نے منفی اور مثبت دونوں طرح کے اثرات مرتسم کیے ہیں۔"

پروفیسر مظفر حنفی اقبال چیئر، کلکتہ یونیورسٹی

(جدیدیت اور اردو افسانہ، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء، ص ۱۰۵،)

میں نے ایم۔اے کرنے کے بعد ریسرچ میں داخلہ لیا۔ پروفیسر عظیم الشان صدیقی کے زیر نگرانی رجسٹریشن ہوا۔ روزی روٹی کی فراہمی کے سلسلے میں، میں دہلی کی خاک چھانتا رہا اور مقالے کا کام پس پشت چلا گیا۔ پریشانیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں مقالے کی شروعات کیسے کروں؟ میرا موضوع تھا 'آزادی کے بعد اردو افسانہ: فکری و فنی جائزہ (۱۹۴۷ تا ۱۹۹۰)' میں پریشان تھا کہ تقریباً نصف صدی پر محیط موضوع کے تحت کئی صد افسانہ نگار اور ہزاروں افسانے میں کیوں کر پڑھ پاؤں گا، پڑھوں گا کب اور لکھوں گا کب؟ ۴/سال میں زندگی کی تگ و دو میں گزار چکا تھا۔اسی پریشانی کے عالم میں ایک دن مظفر حنفی سے ان کے گھر ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ یہ ۱۹۹۸ء کا واقعہ ہے۔مظفر حنفی نے میرے مقالے کا عنوان بغور سنا اور چٹکیوں میں میری پریشانیوں کا حل پیش کر دیا۔ میری خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ افسانے کی تنقیدی کتب کا مطالعہ کروں۔ ہر افسانہ نگار کے ہر افسانے کو پڑھنے کی بجائے افسانوی Trends کا مطالعہ کروں۔ مثلاً ترقی پسند تحریک، تقسیم کے اثرات، جدیدیت، مابعد جدیدیت وغیرہ کے تحت افسانے میں آنے والے موضوعات اور اسلوب کی تبدیلی کا مطالعہ کروں اور ان کے تحت افسانہ نگاروں کے افسانے کا بھی۔ ایک ایک افسانے کے تجزیے کے بجائے اجتماعی اوصاف کے تحت افسانوں کا ذکر کروں۔ بات میری سمجھ میں آ چکی تھی۔ میں نے مظفر صاحب کے مشوروں پر عمل کرنا شروع کیا اور سب کچھ آسان ہوتا چلا گیا۔ مقالہ مکمل ہوا، ڈگری بھی تفویض ہوگئی۔ میں اس کے لیے مظفر صاحب کا ہمیشہ شکر گزار رہوں گا۔

۲۰۰۲ء میں، میرا تقرر چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے شعبۂ اردو میں ہو گیا۔ میں میرٹھ آ گیا۔ یہاں شعبۂ اردو نہیں تھا۔ مجھ پر شعبہ کی تعمیر و تشکیل کی ذمہ داری تھی۔ ابتدا میں بہت سے منصوبے بنائے۔ بیرونی اسکالرز کے خطبے بھی اس منصوبے کا حصہ تھے۔ پہلا توسیعی خطبہ 'میر اور اس کا اسلوب' پروفیسر مظفر حنفی نے دیا۔ یہ

شعبۂ اردو کا پہلا باضابطہ بڑا پروگرام تھا۔ صدارت اس وقت کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر رام پال سنگھ کر رہے تھے۔ میرٹھ کے باذوق اردو والے جلسے میں موجود تھے۔ پروفیسر مظفر حنفی نے اپنے مخصوص انداز میں میر کی شاعرانہ خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے میر کے اسلوب کی انفرادیت پر سیر حاصل خطبہ دیا۔اس سلسلے میں ایک اور یادگار بات ہوئی۔ TA / DA کے بطور ایک حقیر سی رقم میں نے ایک خاکی لفافے میں مظفر صاحب کو پیش کی۔ چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم سب میرٹھ کے معروف شاعر طالب زیدی صاحب کی رہائش پر ظہرانے کے لیے گئے۔ زیدی صاحب نے اپنی روایتی مہمان نوازی سے سب کا دل خوش کر دیا۔ کھانے سے قبل، دوران اور بعد میں بھی سب مظفر صاحب سے محو گفتگو رہے، ان سے اشعار سنتے رہے۔ بعد ازاں رخصت ہو کر مظفر صاحب دہلی روانہ ہو گئے۔ کئی ماہ بعد ان سے ٹیلیفون پر گفتگو ہوئی تو برسبیل تذکرہ انھوں نے ذکر کیا کہ جو لفافہ ہم لوگوں نے دیا تھا وہ اندر سے خالی تھا۔ دراصل لفافہ کئی ہاتھوں سے گزر کر مظفر صاحب تک پہنچا تھا۔ دونوں باتوں کے امکان تھے، ایک تو کسی نے رقم نکال لی یا پھر مظفر صاحب نے نوٹ چیک کیے ہوں تو کہیں گر پڑے ہوں۔ پہلا امکان قوی تھا۔ لیکن مظفر صاحب کی اعلیٰ ظرفی دیکھیے انھوں نے کبھی اس کی شکایت مجھ سے نہیں کی۔

شعبۂ اردو کے قیام کے ساتھ ہی میں نے میرٹھ کی ادبی اور سماجی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اسی سلسلے میں سبھاش چندر بوس کے یوم پیدائش منانے کے لیے نیتا جی سبھاش چندر بوس کمیٹی کی میٹنگ بھگوان شرما (جواب بھگوان کے پیارے ہو گئے ہیں) کی قیادت میں ہوئی۔ مجھے اس موقع پر مشاعرہ کے انعقاد کی ذمہ داری دی گئی۔ بجٹ بالکل نہ کے برابر تھا۔ کمیٹی نے مشاعرے کے لیے ۵۰۰۰ روپے مختص کیے تھے۔ اتنی رقم میں مقامی مشاعرہ بھی ممکن نہیں تھا۔ لیکن ہم لوگوں نے اہل ثروت حضرات سے چندہ وغیرہ جمع کر کے کسی طرح ایک کل ہند مشاعرے کا اہتمام کیا۔ مشاعرے کے مہمان خصوصی معروف سیاسی رہنما سلمان خورشید تھے۔ ڈاکٹر بشیر بدر کو Life time achievment award دیا جانا تھا۔ مجھ سے ذاتی طور پر ٹیلی فون پر بشیر بدر صاحب نے مشاعرے میں شرکت اور ایوارڈ قبول کرنے کی بات کہی۔ ایک بات خاص طور پر میں نے بشیر صاحب سے کہی کہ ہم بہت زیادہ آپ کی خدمت میں پیش نہیں کر پائیں گے۔ یہ جملہ میں نے زیادہ تر شعرا سے کہا تھا۔ اکثر شعرائے کرام نے شرکت کی۔ بزرگوں میں پروفیسر مظفر حنفی صاحب نے میری درخواست پر لبیک کہا۔ بشیر بدر کو نہ آنا تھا نہ آئے۔ میری خوش فہمی چکنا چور ہو گئی تھی۔ مشاعرے کی صدارت پروفیسر مظفر حنفی نے کی۔ بشیر بدر کی غیر موجودگی سے شائقین مشاعرہ مایوس ہو گئے تھے۔ لیکن پروفیسر مظفر حنفی مائک پر آئے اور انھوں نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں جب غزل کا مطلع پڑھا

تنکوں کے ارمان لبیک لبیک   طوفان طوفان لبیک لبیک

تو ردیف لبیک لبیک نے سامعین پر ایسا جادو کیا کہ پورا ہال لبیک لبیک سے گونجنے لگا۔ مظفر صاحب

شعر پڑھتے اور ردیف سے قبل ہی پورا ہال لبیک لبیک کی صداؤں سے گونج اٹھتا۔

اونچا ہوا سر نیزہ بہ نیزہ — یاروں کا احسان لبیک لبیک
تتلی شگوفے جگنو ستارے — سب تیری پہچان لبیک لبیک

مشاعرہ میں ان کے ہر ایک شعر کو کئی کئی بار سنا گیا۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ رات ۲ ربجے مشاعرہ گاہ لبیک لبیک کی صداؤں سے مظفر آمیز ہوگئی تھی۔ لوگ بشیر بدر کو بھول چکے تھے۔ مظفر حنفی نے میرٹھ کی تاریخی سرزمین کو لبیک لبیک کی صداؤں سے مسحور کردیا تھا۔ برسوں تک مظفر حنفی کی اس غزل کی دھوم مچی رہی۔ اس کے بعد مظفر صاحب جب بھی میرٹھ آئے لبیک کی فرمائش ہمیشہ ان کے ساتھ رہی۔

مظفر حنفی نے متعدد بار شعبۂ اردو کے پروگراموں میں شرکت کی۔ ہمیشہ ایک مدبر، شفیق مہربان استاد کی طرح، وسائل کی کمی سے آنے والی پریشانیوں میں بھی ہمیشہ ہمارا ساتھ نبھاتے رہے۔ میں ذاتی طور پر ان کا ممنون ہوں۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میری شخصیت کی تعمیر میں ان کا بھی ہاتھ رہا ہے۔ ان سے میرا ایک رشتہ اور بھی ہے۔ وہ میرے شفیق و مہربان استاد پروفیسر خالد محمود کے بھی استاد ہیں۔ یہی نہیں میرے کئی احباب ڈاکٹر شمع افروز زیدی، ڈاکٹر نصرت جہاں وغیرہ کے بھی وہ استاد رہے ہیں۔ میں نے باضابطہ طور پر ان سے کلاسیں نہیں لیں لیکن میری زندگی میں ان کی حیثیت ایک شفیق استاد کی رہی ہے۔ وہ جہاں کثیر جہتی ادیب و شاعر ہیں وہیں ایک مخلص انسان اور شفیق و مہربان استاد بھی ہیں۔ مظفر حنفی کے فن پر گفتگو پھر کبھی۔ آخر میں میرے پسندیدہ اشعار...... یہ اشعار مظفر حنفی کو بطور تہنیت پیش ہیں۔

اب اتنا بردبار نہ بن میرے ساتھ آ — بدلیں گے مل کے چرخِ کہن میرے ساتھ آ
سچ بولنے کا تجھ کو بڑا اشتیاق ہے — اچھا تو سر سے باندھ کفن میرے ساتھ آ
بسمل تھے مگر رقص کیا، رنگ اُڑائے — دنیا تری تفریح کا سامان رہے ہم
ان کے سوا کسی پہ بھروسہ نہ کیجیو — وہ پر تراش دیں گے ترے اعتماد کے
وہ خوشبو کا چنچل جھونکا میں سوکھی ڈالی کا پھول — اس کا میرا کیا ناتا ہے محرومی محرومی
ٹوٹی پھوٹی ناؤ ہماری، زخمی دونوں ہاتھ — لیکن بے پتوار کیے ہیں سات سمندر ایک
عمر بھر لمسِ محبت کے لیے ترسا ہوں — اب جو شبنم نے چھوا ہے تو بکھر جانے دے
اک بار یوں خموش ہوئے وہ جواب میں — میرے سبھی سوال عرق ریز ہوگئے
میرا تمہارا ساتھ ہے اس مصلحت کے موڑ تک — تم کو کنارہ چاہیے، مجھ کو سمندر چاہیے
انا تھی مظفر کی خنجر بکف — وہاں اور کوئی نہ تھا، یا اخی

OOO

انیس رفیع
کولکاتا

مظفر حنفی پر ایک گفتگو

یوں تو میری یادداشت اچھی نہیں ہے لیکن حافظہ پر بار بار زور دے کر لاشعور میں دبے واقعات کو کریدنے کی کوشش کروں تو کبھی کبھی بات لاشعور سے نکل کر تحت الشعور پھر شعور کا سفر بھی کر لیتی ہے۔ عزیزی فیروز مظفر کے پہلے Massage کے ملتے ہی یہ کوشش شروع کی۔ لمبی مدت کی دھند میں ڈوبی یادوں کی بازیافت ذرا سخت مرحلہ ہوتا ہے، سو ہُوا۔

یاد کے ایک غیر مصدقہ صفحے کے مطابق مظفر صاحب سے پہلی ملاقات غالباً آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس کے پروگرام سیکشن میں ہوئی، شاید ۱۹۷۵ء میں۔ اس وقت وہاں مظفر حنفی کے علاوہ ایک اور حنفی صاحب بھی تھے جن سے ملاقات کی غرض سے میں گیا تھا۔ حوالہ ڈاکٹر محمد حسن تھے۔ شعبے میں زبیر رضوی بھی موجود تھے۔ مظفر صاحب وہیں بیٹھے تھے۔ میرا تعارف ہوا، تو دو حنفیوں سے ایک ساتھ مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ ملاقات بہت سرسری تھی، اور پھر میں خاصہ گمنام۔ چند افسانوں کی بساط بھی کیا ہوتی ہے۔ یہ بھی کہ نہ میں گلیری نہ علیم مسرور کہ ایک افسانے (اُس نے کہا تھا) اور چھوٹے سے ناول (بہت دیر کردی) کی اشاعت سے ہی ریکارڈ توڑ شہرت پیدا کرسکوں۔ بہرحال اس دن کا تجربہ بڑا خوش گوار تھا۔ حوصلہ بھی ملا کہ میدان ادب میں سب کچھ ویسا نہیں ہے جیسا کہ سن رکھا تھا۔ یہ تھی وہ پہلی جھلک جو میں نے دیکھی۔ بہت اچھا لگا۔

دلی کی دوسری Trip شاید ۱۹۷۸ء میں ہوئی۔ لمبے عرصے کے لیے وہاں قیام کی صورت تھی۔ آل انڈیا ریڈیو کے تربیتی کورس کے لیے گیا تھا۔ تین مہینے کے لیے۔ اپنے دوست ڈاکٹر سید الابرار کا Hostel Room میرا پہلا پڑاؤ تھا۔ خواہش تھی کہ اس بار ان سارے لوگوں سے بھی ملوں جن سے پچھلی بار ملاقاتیں تشنہ رہ گئی تھیں۔ اس کا اظہار میں نے ڈاکٹر ابرار سے کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس بار بطور خاص جامعہ ملیہ جاؤں وہاں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کے علاوہ مظفر حنفی بھی ملیں گے۔ وہ جامعہ ملیہ میں آگئے ہیں۔ ان دونوں سے ہی کیا اور بھی لوگ ملیں گے۔ محمد حسن صاحب سے تو آپ یہاں مل ہی رہے ہیں۔ کچھ وقت وہاں گزار لیں۔ چنانچہ میں

جامعہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ نارنگ صاحب، حنفی صاحب اور شاید صغرا مہدی بھی ان دنوں شعبے میں آ گئی تھیں۔ دونوں صاحبان سے تفصیلی گفتگو رہی۔ دونوں میری تحریروں (افسانے) سے واقف تھے۔ بڑے تپاک سے ملے۔ حنفی صاحب نے بتایا کہ وہ آل انڈیا ریڈیو کے مختلف پروگراموں میں شرکت کرتے رہے ہیں۔ کبھی شعر سنا کر، کبھی انشائیہ اور ڈرامے لکھ کر تو کبھی فیچر۔ ان کی گفتگو سے یہ اندازہ بھی ہوا کہ ریڈیو کے لیے کیسے لکھا جانا چاہیے، رسائل و جرائد کے مطالبات کیا ہیں۔ مظفر حنفی کو شعور تھا ان باریکیوں کا۔ افسانے کی زبان بسا اوقات سادہ اور عام فہم ہوتی ہے، جو ریڈیو کے لیے موزوں و مناسب ہے۔ مشکل تب آتی ہے جب مختصر افسانوں میں علامتوں کا دخول ہوتا ہے۔ حالاں کہ زبان سادہ ہوتی ہے، مگر علامتوں سے ملوث ہو کر لفظوں کے معنی و مفہوم ہی بدل جاتے ہیں۔ لہٰذا ذریعہ ابلاغ ایسی تحریروں کو رد کر دیتا ہے۔ ایک اچھے براڈ کاسٹر کے لیے ان نکات کو بہر حال ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا۔ ڈاکٹر مظفر حنفی اس گُر سے واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ Broad Casting Community میں ہر دلعزیز ہیں۔ ہر دلعزیزی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ریڈیو کے سارے آزمائے ہوئے Prog.Formets سے بخوبی واقف ہیں۔ زبان کی قید نہیں۔ جس زبان میں ضرورت ہو وہ لکھ دیتے ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی پروڈیوسروں کو Guidance بھی دیتے ہیں۔ تو صاحب ان کی ایک جہت یہ بھی ہے۔ لکھنا، پڑھنا، پڑھانا شعر کہنا ان کی جبلت میں شامل ہے۔ لہٰذا درس و تدریس کی اعلیٰ سطحوں پر مامور کیے جاتے ہیں تو یہ اُن کا حق ہے اور یہاں جو ان کے فیصلے ہوتے ہیں اس پر ان کا مکمل اختیار ہے۔ سارے اختیارات کا استعمال وہ اپنے مقررہ اصولوں کے تحت کرتے ہیں۔ وہ زندگی میں اصول پرستی، مشرقی قدروں اور روایت پرستی کو برقرار و بحال رکھنے کی ایک مثال ہیں۔

گورکھپور ریڈیو اسٹیشن میں اپنی تقرری کے دوران میں نے جدید شاعری کا مشاعرہ کیا۔ مدعو جدید شاعروں کی فہرست میں اس وقت کے اہم شاعروں کے نام شامل تھے۔ مثلاً کلکتہ سے علقمہ شبلی، (فاروق شفق بوجوہ شامل نہ ہو سکے) پٹنہ سے سلطان اختر، ظہیر صدیقی، رانچی سے پرکاش فکری، دلی سے مخمور سعیدی، علی گڑھ سے شہریار، وحید اختر، جامعہ ملیہ اسلامیہ سے مظفر حنفی، لکھنؤ سے محترمہ داراب بانو وفاؔ اور اعظم گڑھ سے بزرگ شاعر فضاؔ ابن فیضی۔

میں نے قصداً مقامی شاعروں کو اس فہرست میں شامل نہیں کیا تھا کہ ریڈیو سے کم از کم اس نوعیت کے مشاعروں کی داغ بیل ڈالی جائے۔ نئی فکر کی روشنی اردو شائقین بطور خاص ان تک پہنچے جو سنجیدہ شعر و ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

بہر حال یہ ہوا کہ مشاعرہ اسٹوڈیو میں غیر ضروری اناؤنس منٹ اور غیر ضروری تمہید سے گریز کرتے ہوئے صرف شاعروں کے مختصر تعارف کے ساتھ مشاعرے کا آغاز کر دیا گیا۔ صدارت کی روایت سے بھی

پرہیز کیا۔ یعنی مشاعرہ بلا صدر شروع کر دیا گیا۔ اب شومئ قسمت کہ میں نے شہریار سے پہلے پروفیسر وحید اختر کو پڑھوا دیا۔ بس کیا تھا ان کی پیشانی شکنوں سے بھر گئی۔ غصہ پھٹا پڑ رہا تھا۔ پڑھ کر فوراً اسٹوڈیو سے نکل گئے۔ مظفر حنفی اور شہریار متبسم تھے۔ میں وحید اختر کے اس تیور سے واقف نہ تھا، لہٰذا میں نے بزرگ شاعر فضا ابن فیضیؔ (جو آخری شاعر تھے) سے پہلے پڑھوایا۔ فضا ابن فیضی کے کلام کے بعد اظہار تشکر کی رسم ادا ہوئی اور مشاعرہ ختم ہوا۔ اسٹیشن ڈائریکٹر کے کمرہ میں خورد و نوش کا اہتمام تھا۔ باہر نکلے تو دیکھا کہ وحید اختر غصے میں بھرے Corridor میں ہاتھ پیٹھ پر باندھے آ جا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر اُبل پڑے ''میں تمہیں دیکھ لوں گا، میری انسلٹ کی تم نے، دیکھ لوں گا۔'' بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ مظفر حنفی شاید بات سمجھ رہے تھے۔ انھوں نے میری حمایت میں پہلے تو وحید اختر کو نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی لیکن جب وہ اکڑتے ہی گئے تو مظفر حنفی نے انھیں لتاڑتے ہوئے کہا ''آپ خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوں، مجھ سمیت اس مشاعرے کے بیشتر شعرا آپ سے برتر ہیں۔'' مظفر حنفی صاحب چشم دید گواہ تھے۔ آج ان پر لکھتے ہوئے یہ حادثہ بھی تازہ ہو گیا۔ اب تو اس مشاعرے کی فہرست میں بیشتر نام مرحوم ہو گئے۔ پرکاش فکری، وحید اختر، مخمور سعیدی، فضا ابن فیضی، بانو داراب وفا، شہریار اور اسٹیشن ڈائرکٹر کشور سلطان بھی۔

ایسی کئی یادیں مظفر حنفی صاحب سے ملاقات میں تازہ ہوتی رہتی ہیں۔ پرانی باتوں کو یاد کر کے ہم دونوں ہی جی کو بہلاتے رہتے ہیں۔ وہ تو مدت دراز تک کلکتہ میں تھے۔ آج بھی دلی، علی گڑھ، یا کسی مشاعرے میں ان کے ساتھ مل بیٹھنا باعث افتخار ہوتا ہے۔

شعر و ادب کا جو معاملہ ہے وہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ ان کا داخلی میدان ہے۔ اس باؤنڈری میں وہ اکیلے کھیلتے ہیں۔ کہیں کہیں کبھی کبھی تکنیکی مسئلوں سے الجھتے ہیں تو خارج سے رابطہ بھی کرتے ہیں۔ جیسے 'کون بنے گا کروڑ پتی' میں امیتابھ بچن Phone Friend کو آواز دیتے ہیں، ایسی صورت میں بھی حتمی رائے خود ان کی ہوتی ہے، کیوں کہ فن پارہ دوست کے نہیں خود مظفر حنفی کے نام سے منظر پہ آئے گا۔ اس کے معیار و اعتبار کی ساری ذمہ داری خود ان پر ہوگی۔

'بادبان' کراچی کے ایک شمارہ میں محاسبہ کرتے ہوئے مظفر حنفی کی غزلوں سے متعلق میں نے ایک غیر سنجیدہ ریمارک لکھ دیا تھا۔ غیر سنجیدہ کیا مضحک تھا۔ ہر حساس شخص کو یہ بات ناگوار گزر سکتی تھی۔ مظفر حنفی انتہائی حساس اور غصے والے فن کار۔ میں خط لکھ کر تقریباً بھول گیا تھا۔ زبیر رضوی کو اردو اکادمی ان کو کلکتہ آنے پر استقبالیہ دے رہی تھی۔ جلسے میں مظفر صاحب اور میں اغل بغل کی کرسیوں پر تھے۔ زبیر رضوی سامنے ہی بیٹھے Audeince کو Face کر رہے تھے۔ ہم دونوں کو بھی۔ مظفر صاحب کا موڈ گڑبڑ لگ رہا تھا۔ میں نے سلام کیا۔ جواب میں ہوں ہاں۔ پروگرام کے آغاز ہونے میں شاید کچھ دیر تھی۔ پھر میں نے مظفر صاحب سے گفتگو

کی پہل کی۔ اس بار وہ جلال میں تھے۔ بولے: ''آپ نے 'بادبان' کراچی میں میری غزلوں کے بارے میں کیا لکھ دیا ہے کہ میں غزلیں 'تھوک' میں لکھتا ہوں۔ عرصہ ہو چکا تھا بادبان کو خط لکھے۔ کچھ یاد نہیں پڑ رہا تھا۔ پھر انھوں نے مختلف لفظوں، کامل حوالوں اور صفحے اور صفحے پر دوسرے خطوط نگاروں کے نام بتائے۔ تب مجھے یاد آنے لگا۔ انھوں نے دوبارہ کہا کہ اگر میں یہ کہوں کہ انیس رفیع 'گھٹیا' افسانہ لکھتے ہیں تو؟ میں نے کہا کوئی بات نہیں یہ آپ کا حق ہے مگر انھیں شائع کرا کر آپ لوگوں کا وقت ضائع کرتے ہیں۔ سامنے زبیر رضوی موجود تھے۔ میں نے کہا ''آپ زبیر رضوی سے پوچھیں کہ میرے گھٹیا افسانے' ذہن جدید' میں کیوں چھاپتے ہیں۔'' ان کا برجستہ جواب تھا ''انیس کے افسانے اس لیے چھاپتے ہیں کہ وہ انیس رفیع کے دوست ہیں، محکمے کے ساتھی ہیں۔'' خاموشی طاری ہوگئی تو صاحب نام بھی کبھی کبھی کام کر جاتا ہے کہ وہ ہے، اس کا وجود ہے۔ بعد کو شناخت نامہ۔

مظفر حنفی کے یہاں غالب احساس حق تلفی کا ہے، جس کے نتیجے میں طنز، تشنیع، رشک، شکوہ وغیرہ کا بھر پور کھیل ملتا ہے۔ لہٰذا ان کے یہاں گدگداہٹ، شباب کی خوشیاں، نازک جذبات جیسے Tools کا استعمال کم کم ہے۔ کہیں کہیں کسی کلام میں شعری کیفیت کا احساس ضرور ہوتا ہے مگر پڑھ کر یا سن کر وجدانی کیفیت طاری نہیں ہوتی۔ آخر کسی بھی شاعر یا ادیب میں خاص کر آج کے ادیب میں کسی غیر کے لیے Feeling کا فقدان کیوں ہے؟ اگر محرومیاں ہیں تو دل گداختہ کیوں نہیں۔ اس کی وجہ ہے۔ آج کے بیشتر ادیب و شاعر اپنی اپنی ملازمتوں میں محفوظ ہیں۔ Security ان کا پہلا مقصد ہے۔ بے کاری کے دنوں میں بھلے ہی وہ دوسروں کے لیے دل گداخت کرتے ہوں۔ مگر مالی تحفظ ملنے کے بعد نئے نئے فلسفے تلاش کرنے لگتے ہیں۔ وہ بھی بغیر کسی نظریہ کے۔ حالاں کہ ہمارے معاشرے میں نظریے کے لیے زندگی تج دینے کا حوصلہ اب بھی باقی ہے۔ اردو دنیا محفوظ لوگوں کی آماجگاہ ہے، کوئی مشاعروں میں محفوظ تو کوئی بڑے دفتر، بڑے عہدے میں محفوظ۔ کوئی ابرک، کوئی کان کنی کی تجارت میں محفوظ۔ درس وتدریس میں تو محفوظ ہی محفوظ۔ مظفر حنفی کا تعلق بھی درس وتدریس سے رہا ہے۔ لہٰذا وہ محفوظ تر ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ جینوین فن کار اس حفاظتی خطے سے کچھ نہ کچھ نکال لے آتا ہے۔ کیوں کہ تمام Securities کے باوجود آدمی کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی ٹوٹنے کے عمل سے ضرور گزرتا ہے۔ مظفر صاحب نے کئی مرحلے جھیلے ہیں۔ اوائل عمری کے جھمیلے، پھر جنگل کی ملازمت، فطرت سے ٹکراؤ کے دن، بعد کو درس وتدریس۔ اشعار میں تنوع بھی انھیں کی دین ہے۔ حالاں کہ مظفر حنفی اپنے مشاہدات، تجربات اور تفاعل میں کسی بڑے سے کم نہیں رہے۔ مگر نہ جانے کیوں اپنے اصولوں کی محبت میں خود کو اپنے ہی مقولے میں نظر بند کرلیا: ''لیکن فنی پابندیوں میں رہ کر شعر میں نئی نئی باتیں کہنا اور نئے اسلوب میں شاعری کرنا میرے نزدیک فن کی معراج ہے۔'' دراصل یہ پابندی عقل کی ہے دل پر اور اقبال اس پابندی سے خوش نہیں تھے۔

لازم ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل　　　لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

مظفر حنفی ہمارے درمیان زیب غوری، بانی، سلطان اختر، عمیق حنفی، شجاع خاور، عین رشید کی صف میں بلند تر ہوتے اگر خود پر خود کی عائد کردہ پابندیوں کو ذرا ہٹا دیتے۔ مظفر صاحب کے ادب میں بھی لہجہ مودب، پابند، شعر میں عروض وبحور، فکری ریزہ خیالی کی جگہ منظم ومربوط خیال، شعر گتھا ہوا، طریقۂ اظہار میں تنوع، ان سب کو ملا کر بات بن ہی جاتی ہے اور مظفر حنفی ہمارے درمیان قابل توجہ اور سرخرو بن کر ابھرتے ہیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وجدان اور جذب وکیف کی عدم موجودگی کے باوجود ان کی شاعری کو عام پسندیدگی بلکہ قبول عام کا شرف حاصل ہے۔ شاید اس کی وجہ ان کا مخصوص اسلوب ہے جس میں بلا کی کاٹ، ذہانت اور طنز ہے جو پہلی ہی قرأت میں قاری پر کچھ منکشف کر دیتا ہے۔ ان کا کلکتے میں ہونا ہم کلکتے والوں کے لیے کئی اعتبار سے اچھا تھا۔ وہ ایک اچھے استاد تھے جو طلبا کو فیض پہنچاتا تھا۔ وہ علم وادب کے شناسا تھے۔ لسانی اور شعری رموز سے واقف۔ اس طرح شعرا، ادبا بھی ان سے مشورے کر لیتے تھے۔ خود میں بھی دو ایک سلسلے میں ان سے مشورہ کر چکا ہوں۔ میرا بھانجہ اردو میں Ph.D کرنے کے لیے Topic تلاش کر رہا تھا۔ مظفر حنفی صاحب نے اپنی طرف سے کوئی Topic تجویز کر رکھا تھا۔ میں نے ان کو دوردرشن کلکتہ میں ریکارڈنگ کے لیے بلا رکھا تھا۔ میرا بھانجہ شکیل ان کو ساتھ ہی لے کر آیا۔ چائے پیتے وقت Topic پر گفتگو شروع ہوئی۔ میں نے ان سے گزارش کی کہ وہ اگر کسی شخص پر تحقیق کرانا چاہیں تو کلکتہ کے عباس علی خاں بیخودؔ مناسب ہیں۔ حیات سے نہیں ہیں۔ حنفی صاحب تھوڑی دیر غور کرتے رہے، پھر کہا، 'ٹھیک ہے، بیخودؔ صاحب پر تو نہیں مگر کلکتہ کے ابراہیم ہوشؔ کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔ اس طرح ابراہیم ہوشؔ پر پہلا کام ہو گیا۔ انھوں نے کہا ہوش ایک خاص زاویۂ فکر رکھتے تھے۔ مارکسی ادب اور ترقی پسند ادب کے سرخیلوں میں تھے۔ ان کا تعلق انقلاب بمبئی سے بھی تھا۔ پرویز شاہدی اور سالک لکھنوی انھیں اپنی صف میں رکھتے تھے۔ ہوشؔ بنگال کے Oral Culture کے نمائندہ تھے۔ ان کا ثانی کوئی بنگلہ ادیب بھی نہ تھا۔ کالا چاند، ڈوما اس تہذیب کے (کلکتیا زبان وتہذیب) کے زندہ کردار ہیں جسے ابراہیم ہوشؔ نے رچا تھا اور اسے 'جندگی کا میلہ' نامی مجموعے میں یکجا کر دیا تھا۔ ہوش صاحب سے متعلق ان کے خیالات جان کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہر اچھا ٹیچر، شاعر، محقق، مقالہ نگار نئی جگہ پر پہنچ کر اگر اپنی آنکھیں کھلی رکھے تو اجنبی مقامات کو بھی اپنا کر اس میں رچ بس جاتا ہے، اور مظفر حنفی ایسے ہی ایک شخص تھے۔

○○○

ڈاکٹر ماجد دیوبندی
ایس ۳/ ۲۴، میزان روڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، رابطہ:9810859786

ہمہ جہت شخصیت، پیارے انسان: مظفر حنفی

انسان کی شخصیت کا دار و مدار اس کے آخری وقت پر کیا جاتا ہے کہ جب وہ دنیا سے اپنے خالق حقیقی سے ملنے جارہا ہے اس وقت اس کی کیا کیفیت ہے۔ بڑے بڑے بظاہر نیک اور بزرگ نظر آنے والے لوگوں کا آخری وقت نہایت تکلیف دہ اور سبق آموز دیکھا گیا ہے۔ یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ کیا حالات ہیں لیکن بظاہر یہی قیاس کیا جاتا ہے کہ آخری لمحات کی کیفیات اچھی ہیں تو خاتمہ بھی اچھا ہوگا۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ اللہ کے نیک بندوں اور بزرگوں کی روح اس طرح اس دارِ فانی سے کوچ کرتی ہے کہ سب دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ یقیناً اس کے اعمال اور زندگی کی پاکیزگی کا دخل اس کا اصل انجام ہوتا ہے۔ لاکھوں بزرگانِ دین اور آج کے زمانے میں بہت سے لوگوں کی آخری کیفیات ایسی دیکھی گئی ہیں کہ فخر ہوتا ہے کاش ہر مسلمان کا انجام اسی طرح ایمان پر ہو کہ بات کرتے اور قرآن کی تلاوت کے ساتھ شکر کرتے ہوئے رخصت ہوئے۔

تاریخ میں صرف اور صرف میرے آقا حضرت محمد مصطفیٰؐ کی ذات گرامی ایسی ہے جہاں روح قبض کرنے سے پہلے اجازت لی گئی اور گفتگو کے دوران آقا سے کہا گیا کہ ''اللہ آپ سے ملاقات کا متمنی ہے۔'' حضورِ اکرمؐ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے وقت یہ کیفیت تھی کہ پیشانی مبارک پر پسینہ تھا اور کچھ پریشانی محسوس کر رہے تھے۔ یہ سب اللہ نے ہمارے لیے کیفیت دکھلائی ورنہ جہاں حضرت جبرئیل خود اجازت کے ساتھ حاضر ہو رہے ہوں وہاں تکلیف کا کوئی مطلب نہیں۔ جن کے صدقے میں کائنات بنی اور ہماری بخشش کا جس نے وعدہ فرمایا ہو، اس کے امتّی کیسے تکلیف میں رہ سکتے ہیں۔ یقیناً کچھ سختی کی جائے گی لیکن یہ ہمارا ایمان ہے جنّت ہمارے یعنی ایمان والوں کے لیے بنائی گئی ہے۔ ایک لاکھ چوبیس یا تیس ہزار انبیا اور ان کے بعد صحابۂ کرام اور معصومین اور اہلِ بیت کی عظمتوں کا کیا ٹھکانہ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہرحال موت کا مزہ ہر شخص کو چکھنا ہے اور اس کے ساتھ حساب کتاب ہونا طے ہے۔ ان سب حقیقتوں کے باوجود یہ امید رکھنی چاہیے کہ حشر میں آقاؐ کے صدقے ہمارا بیڑا پار ہوگا۔

جنّت اُسے مل جائے ممکن ہی نہیں ماجدؔ — بے کار ہے وہ سینہ جو عشق سے خالی ہے

مندرجہ بالا سطور لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ مجھے ایک ایسی شخصیت پر کچھ لکھنے کی جسارت کرنی ہے جس پر دنیائے ادب و تحقیق کی نامور شخصیات نے اتنا لکھا کہ کتابیں بھری پڑی ہیں۔ میری کیا اوقات لیکن ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ میرا حق ہے کہ میں کچھ لکھوں۔ ایک روحانی خانوادے کے چشم و چراغ، اخلاق و معاملات، سلوک، برتاؤ اور رہن سہن میں قلندرانہ مزاج رکھنے والے پیارے انسان اور انکساری کا مجسمہ پروفیسر مظفر حنفی کا میں ذکر رہا ہوں جنھوں نے پوری زندگی شان کے ساتھ گزاری اور انجام بھی ایمان پر ہوا۔ جہاں رہے اپنی ایسی چھاپ چھوڑی کہ دنیائے ادب ان پر فخر کرتی ہے۔ علمی سنجیدگی، ادبی وقار، خاندانی رکھ رکھاؤ، گفتگو اور شاعری میں برجستگی و شگفتگی کے حوالے سے مظفر حنفی نئی نسل کو یہ پیغام دینے والے بزرگوں میں شامل تھے جن سے مجھ جیسے طفلِ مکتب نے بہت کچھ سیکھا۔ میں جب جب ان سے ملا ایسا لگا کہ اپنے خاندان کے کسی بزرگ سے مل رہا ہوں۔ ان کے اخلاق کا یہ عالم کہ کبھی سڑک پر بات نہیں کی اور گھر بٹھا کر بغیر چائے وغیرہ کے نہیں آنے دیا۔ دراصل یہ قدریں خاندان سے ملا کرتی ہیں جو اُن میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ قدرت حنفی صاحب پر مہربان تھی لیکن اس میں ان کا عجز، بزرگوں کے احترام کے ساتھ ساتھ اپنے چھوٹوں کو دعائیں دینے اور شفقت کرنے کا مزاج ان کے سفرِ حیات میں شجرِ سایہ دار کی طرح رہا۔ نئی نسل کے لیے ان کے دل میں جو تڑپ تھی اس نے نہ جانے کتنے نوجوانوں کو کچھ کرنے کا حوصلہ دیا۔ مظفر حنفی، صاحبِ علم ہی نہیں صاحبِ کردار بھی تھے۔ میں جب جب ان کی خدمت میں حاضر ہوا، ان کی کرم فرمائی اور دعاؤں سے فیض یاب ہو کر آیا۔ میری اب تک تین کتابیں غزل کی شاعری کی، دو نثر کی اور دو نعتوں کے علاوہ دو ہندی میں غزل کی شائع ہو چکی ہیں۔ ہر کتاب کے ٹائٹل کور پر ان کی دعائیہ تحریر موجود ہے جس سے میرے وقار میں اضافہ ہوا۔ میں ان کی سادگی اور اخلاق پر جتنا فخر کروں وہ کم ہے۔ اکثر و بیشتر ان کی خدمت میں نیاز حاصل کرنے جایا کرتا۔ کبھی چہرے پر ناگواری نہیں ہوئی بلکہ خوشی کا اظہار کیا۔ ہمیشہ مسکراتے ہوئے گفتگو کرتے۔ کسی کی تذلیل یا توہین کرنا ان کے مزاج میں شامل نہیں تھا۔ بے انتہا تیز شعر کہنے والے، نئے نئے موضوعات پر قلم اٹھانے والے اس طرح زندگی میں سادہ کہ مل کر مزہ آ جائے۔ ہندستان، پاکستان کا کوئی رسالہ ایسا نہیں جس میں ان کی غزلیں شائع نہ ہوتی ہوں۔ نئی نئی تراکیب کے ساتھ غزل کہنے میں ان کو مہارت حاصل تھی۔ شاعری میں یہ کمال کہ غزلوں میں نئے پن کے ساتھ نئے فکر و فن سے شاعری کرنا ان کا اپنا مزاج تھا۔

مشاعرہ آج کچھ خاص ادبی حیثیت نہیں رکھتا۔ آج سے تینتالیس سال قبل ۱۹۷۸ء میں جب میں نے اس ادبی دنیا میں قدم رکھا اور پہلا مشاعرہ پڑھا، تب ادبی اور تہذیبی قدروں کا آئینہ ہوا کرتا تھا مشاعرہ۔ میرے والد بزرگوار جن کو ہزاروں اشعار یاد تھے، کئی سو کلومیٹر تک مشاعرہ سننے جایا کرتے اور میں ان کے

ساتھ جاتا۔ اس وقت یہ عالم تھا کہ کوئی مبتدی یا نوجوان شاعر اسٹیج پر کونے میں چھپ کر بیٹھتا کہ کہیں کسی بزرگ شاعر کی نظر نہ پڑ جائے اور بیٹھنے میں کوئی گستاخی نہ ہو جائے۔ کاش وہ قدریں قائم رہتیں۔ آج مشاعرے سے تہذیب کا دوُر دوُر کا بھی واسطہ نہیں۔ جو مشاعرے کے سینئر شاعر ہیں، وہ اس قدر ابن الوقت اور مصلحت پسند ہیں کہ خدا کی پناہ۔ ان کو یہ خطرہ رہتا ہے کہ ان کے کسی جملے سے کنوینر یا شاعر ناراض نہ ہو جائے اور ایک دو مشاعروں کا نقصان نہ ہو جائے۔ مشاعرے میں آج ایک دو پروفیسر شاعر ہیں جو خوب پیسہ کما رہے ہیں۔ کالج یا یونیورسٹی میں انھوں نے کبھی نہیں پڑھایا اور دنیا بھر میں پروفیسر کہلاتے پھر رہے ہیں۔ ادب میں ایسے لوگ زندہ نہیں رہتے، ہاں مشہور ضرور ہو جاتے ہیں۔ میں اکثر یہ کہتا ہوں کہ مشاعرہ ہمیں شہرت تو دلا سکتا ہے لیکن ادب میں ہمیں زندہ رکھے، یہ ضروری نہیں۔ ایسے مشہور شاعروں کا کلام دیکھا جائے تو اس میں مہمل مضامین اور ذم کے پہلوؤں کی بھرمار ملے گی۔ آج مشاعروں میں غیر اردو داں لوگ اور متشاعر شریک ہو رہے ہیں جس سے یہ ادارہ جسے ہم ایک اسکول کی طرح سمجھتے تھے، برباد ہو چکا ہے۔ مظفر حنفی نے دنیا بھر میں مشاعرے بھی خوب پڑھے اور معیار کے ساتھ پڑھے۔ ملک اور بیرون ملک میرا ان کا بہت ساتھ رہا۔ ہر جگہ وہ ہی صدارت کرتے اور آخر میں اپنا کلام سناتے۔ اپنی شاعری، اعلیٰ معیار اور خاص جدید اور قدیم لہجے کے امتزاج کے حوالے سے انھیں ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ ابھی چند سال قبل دوحہ (قطر) کے ایک مشاعرے میں ان کی صدارت تھی۔ میرا ان کا دہلی سے ہی ساتھ رہا۔ سارے راستے ادب پر بات ہوتی رہی اور ان سے میں استفادہ کرتا رہا۔ مجال ہے کسی سوال سے الجھ گئے ہوں، کوشش کرتے کہ میری اصلاح ہو اور میرے ہر سوال کا جواب دیں۔ اتنا لمبا سفر دوستانہ ماحول میں گزرا کہ آج بھی اس کی یاد تازہ ہے۔ دراصل مظفر صاحب اپنے چھوٹوں کو ساتھ لے کر چلنے اور ان کی تربیت کرنے والے تھے اور چاہتے تھے کہ نئی نسل کچھ سیکھ سکے اور اردو کی ہماری تہذیب پامال نہ ہو۔ ان کے اس جذبے نے ہر عمر کے لوگوں میں ان کو محبوب بنا کر رکھ دیا تھا۔ ذرا بھی باتوں میں غرور کا شائبہ نہیں۔ کبھی ادبی لطیفے سنا رہے ہیں تو کبھی ادبی مذاق ہو رہا ہے۔ مجھے ایسا نہیں لگا کہ میں کسی بزرگ کے ساتھ ہوں۔ دراصل یہ وہ ادا ہے جس سے انسان اور زیادہ محترم اور بڑا بن جایا کرتا ہے۔ دہلی سے قطر اور دہلی واپسی تک میں ان کی خدمت کرتا رہا جو میرا اخلاقی فرض تھا۔ اس کا انھوں نے اعتراف بھی کیا اور بے انتہا دعاؤں سے نوازا۔ دراصل مظفر صاحب ایسے بزرگوں میں تھے جو اپنے چھوٹوں کو دیکھ کر نہ صرف خوش ہوتے بلکہ ان کی ترقی اور بہتر مستقبل کی دعائیں کرتے تھے۔

بین الاقوامی نمائندگی کرنے والے ہندوستان کے چند اہم ترین جدید شعرا اور تنقید نگاروں میں پروفیسر مظفر حنفی کا نام بہت نمایاں اور قابل قدر حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی تحریروں میں اثر پذیری کا اعلیٰ معیار دیکھنے کو ملتا ہے۔ تنقیدی مضامین کے لیے ضروری نہیں کہ زبان سخت اور مشکل ہو، مظفر حنفی آسان اور سادہ زبان

میں لکھتے جس سے ہر شخص سمجھ کر استفادہ کر سکے۔ انھوں نے اپنے اسلوب سے تنقید کو تخلیق کا پیراہن عطا کیا۔ تنقید جیسے خشک، بوجھل اور گنجلک موضوع کو سہل، سادہ، شیریں اور دلچسپ پیکر عطا کرنا آسان کام نہیں۔ یہ پہاڑ کی چٹانوں میں پھول کھلانے کے مترادف ہے۔ ان کی تحریریں چاشنی و شگفتگی اور فصاحت و بلاغت سے لبریز ہیں۔ اسلوب نگارش میں سمندر کی روانی، جھرنے کی زمزمہ سنجی، کویل کی نغمہ سرائی، شبنم کی پاکیزگی اور نسیم سحر کی خنکی و نغمگی پائی جاتی ہے۔ تحریروں میں سادگی کے ساتھ ایسے ایسے خوب صورت جملے ملیں گے کہ طبیعت خوش ہو جائے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ تنقید نگار شاعر کو گردانتا نہیں بلکہ اس کے عیب نکالنے میں اپنی قابلیت سمجھتا ہے۔ اس کو تنقید نہیں بلکہ تنقیص کہا جاتا ہے۔ تنقید اس حسن تحریر کا نام ہے جس میں محاسن بھی بیان ہوں اور نقائص بھی لکھے جائیں۔ میرے خیال میں ایک تنقید نگار کو سب سے پہلے ایماندار ہونا ضروری ہے۔ اصل خالق تو شاعر ہے، اس کی اس عظمت کو نفی کر کے آپ تنقید نہیں کر سکتے۔ مظفر حنفی نے کبھی کسی پر بے جا تنقید نہیں کی بلکہ شاعر کے کلام پر ایمانداری سے تبصرہ کیا، ساتھ ہی شاعری کے محاسن بھی بیان کیے۔ ایک دو ملاقاتوں میں مجھ سے انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ بہر حال شاعر تنقید نگار سے بڑی حیثیت رکھتا ہے کہ وہ شاعری کرے گا تب تنقید نگار کچھ لکھ سکے گا۔ پوری زندگی میں مظفر حنفی نے کبھی کسی شاعر یا ادیب کی تذلیل نہیں کی بلکہ محبت کے ساتھ سمجھانے کا کام کیا جس سے اس کی اصلاح بھی ہوتی رہی۔

پروفیسر مظفر حنفی پر جتنا لکھا جائے، کم ہے۔ میں نے ان کی کتابوں، شاعری، تنقید اور نثر کے حوالے سے اس مضمون میں کچھ نہیں لکھا کہ اردو کی اہم ترین ادبی اور علمی شخصیات نے ان پر بہت کچھ لکھا اور لکھ رہے ہیں۔ مزید مضامین تازہ ترین کتاب میں شائع ہو رہے ہیں۔ دراصل یہ مضمون نہیں بلکہ میرے ذاتی احساسات اور مشاہدات ہیں جو ان کے حوالے سے میرے ذہن پر ثبت ہیں۔ یہاں یہ بات بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مظفر حنفی نے خوب اور بہترین زندگی گزاری اور آخیر وقت تک اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے کام کرتے رہے۔ ۸۵ر سال کی عمر تک سینکڑوں سمینار، مشاعرے پڑھے اور اپنے لہجے کو منوایا۔ ان کی بیشتر کتابیں ہمارے ادب کا عظیم سرمایہ ہیں۔

مدھیہ پردیش کے مشہور شہر کھنڈوا میں پیدا ہو کر حنفی صاحب دنیائے ادب کو روشن کرتے ہوئے دنیا سے چلے گئے اور ہم جیسے لوگوں کو یہ بتا گئے کہ زندگی کیسے گزاری جاتی ہے۔ میں اکثر یہ کہتا ہوں کہ ہمارا مزاج مردہ پرستی کا ہے۔ زندگی میں قدر نہیں کرتے اور مرنے کے بعد روتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ منافقت ہے۔ زندگی میں قدر اور بزرگوں کی خدمت کرنا ہمارا ایمانی اور اخلاقی فریضہ ہوتا ہے۔ خدا کا شکر حنفی صاحب کے خاندان اور ان کی اولادوں نے سعادت مندی کا ثبوت دیا اور آج بھی ان کے حوالے سے کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں۔

OOO

ڈاکٹر فرحت حسین خوشدل
ہزاری باغ، رابطہ:9113750958

اردو شعر و ادب کا منفرد فن کار: ڈاکٹر مظفر حنفی

اردو کے مشہور و معروف شاعر، ادیب، افسانہ نگار، ناقد، ماہر ادبِ اطفال، نامور قلم کار اور باشعور فن کار ڈاکٹر مظفر حنفی کی شخصیت سے شاید ہی کوئی اردو شعر و ادب کا طالب علم واقف نہ ہوگا۔ موصوف مدت مدید سے لوح و قلم کی پرورش کر رہے ہیں۔ موصوف معاصر اردو شعر و ادب کی ہر دل عزیز شخصیت ہیں جو آج کے چند سکہ بند ناقدوں کے گروہی تصادم سے دور ۱۹۴۹ء سے تا دمِ آخر اردو شعر و ادب کی آبیاری اور اس کے فروغ میں مصروف رہے۔

مظفر حنفی کا پورا نام محمد ابوالمظفر ہے۔ اتر پردیش کے مشہور و معروف ضلع فتح پور کا مردم خیز قصبہ ہسوہ ان کا آبائی وطن ہے۔ اردو شعر و ادب کے رسائل و جرائد کے مطالعہ نے انھیں بہت ہی کم عمر میں باذوق قاری اور صاحبِ قلم بنا دیا۔ ۱۹۴۹ء کے آس پاس وہ بچوں کے لیے کہانیاں لکھنے لگے۔ ۱۹۵۵ء میں انھوں نے سیہور کے مڈل اسکول میں ٹیچر کی حیثیت سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ ۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۵ء تک مظفر حنفی کے لیے لکھنے پڑھنے کا شوق جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ یہی وہ جذبہ تھا جس کی بنا پر انھوں نے ۱۹۵۹ء میں کھنڈوا سے ایک ماہنامہ 'نئے چراغ' کے نام سے شائع کیا جس کی شہرت کے چرچے بہت جلد اردو کے اہم ادبی رسائل کے ساتھ ہونے لگے۔ تقریباً سات درجن کتابوں کے مصنف اور مولف مظفر حنفی کی پیدائش ایک متوسط آمدنی والے گھرانے میں ہوئی۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق انھوں نے اپنی انتھک محنت، سچی لگن، ادبی بصیرت اور بے پناہ صلاحیت کی بدولت اردو شعر و ادب کے باشعور فن کاروں کی فہرست میں اپنا نام درج کروانے میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۷۴ء میں اپنے استاد گرامی شادؔ عارفی کی فکری و فنی جہات پر تحقیقی مقالہ لکھ کر برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال سے پی ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی۔ بعد ازاں نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ میں ان کا تقرر اسسٹنٹ پروڈکشن آفیسر (اردو) ہوا۔ دو سال کے مختصر سے عرصے میں انھوں نے اردو نصابیات کی تیاری کرنے والے دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر قابل قدر خدمات سر انجام دیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ

میں تقرری کے بعد ابوالمظفر پر فتح و نصرت کے ابواب وا ہوتے گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ موصوف کی تقریباً سات درجن کتابوں میں کچھ کی حیثیت دستاویزی اور سند کا درجہ رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر مظفر حنفی نے حقیقی معنوں میں اردو طلبا کی علمی اور عملی رہنمائی فرما کر اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ ان کی نگرانی میں پی ایچ۔ ڈی کرنے والے ڈیڑھ درجن اسکالرز میں ڈاکٹر خوشحال زیدی، ڈاکٹر خالد محمود اور ڈاکٹر شمع افروز زیدی کے اسمائے گرامی میری نظر میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

ڈاکٹر مظفر حنفی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بعد ۱۹۸۹ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی اقبال چیئر کے منصب پر بحیثیت پروفیسر متمکن ہوئے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہو یا جامعہ کلکتہ دونوں مقام پر انھوں نے اپنی جملہ ادبی خدمات سے اردو شعر و ادب کے خزینے میں بھرپور اضافہ کیا۔ اپنی مصروف اور سرگرم زندگی کے ساتھ ساتھ انھوں نے نہ صرف اپنا ادبی سفر جاری رکھا بلکہ عمر کے آخری لمحے تک سرگرم عمل رہے ہیں۔

ڈاکٹر مظفر حنفی کی ہمالہ صفت شخصیت کو اس مختصر سے مقالہ میں سمیٹنا اگرچہ آسان نہیں ہے لیکن اپنی بساط بھر کوشش یہ رہے گی کہ موصوف کی جملہ خدمات کو اجمالی طور پر آپ کے سامنے رکھ دوں۔ موصوف کی چند اہم کتابوں کے نام درج کرتا ہوں۔ 'پانی کی زبان'، 'ایک تھا شاعر'، 'طلسم حرف'، 'نثر و غزل دستہ'، 'صریر خامہ'، 'پردہ سخن کا'، 'یم بہ یم'، 'دیپک راگ'، 'کھل جا سم سم'، 'عکس ریز'، 'تیکھی غزلیں'، 'چوروں کے قاتل'، 'بین الاقوامی لٹیرے'، 'پیلی کوٹھی'، 'تارِ عنکبوت'، 'پُراسرار قتل'، 'شرلاک ہومز ہندوستان میں' اور ماہنامہ 'نئے چراغ' کے علاوہ بھی کئی کتابیں ایسی ہیں جو انھیں اردو شعر و ادب اور غزل کے صحرا نوردوں کی فہرست میں اہم مقام عطا کرتی ہیں۔ وہ میدانِ علم و ادب کے ایسے سپہ سالار ہیں جنھیں نظم و نثر پر یکساں مہارت حاصل ہے۔ میری باتوں کی صداقت کو ان درجِ بالا کتابوں کے اوراق میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

'پانی کی زبان' ڈاکٹر مظفر حنفی کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو ہندوستان میں جدید شاعری کا اولین صحیفہ ہے جس کے پیش لفظ میں موصوف نے اپنا ایک ایسا شعر درج کیا ہے جس سے ان کی خود اعتمادی اور خود شناسی کی عکس ریزی ہوتی ہے ۔

عظمت سے ہٹ کے ندرت و جدّت کو ناپیے　　　ہم اور چیز، غالبؔ و میرؔ و فراقؔ اور

'ایک تھا شاعر' ۱۹۶۷ء میں منظر عام پر آیا یہ ڈاکٹر مظفر حنفی کا مرتب کردہ مضامین کا پہلا مجموعہ ہے جو ۸۵۰ ؍صفحات پر مشتمل ہے جس میں موصوف نے اپنے استاد محترم شاد عارفی کی ادبی شخصیت کے علاوہ مختلف جہات کا عقیدتمندانہ جائزہ لیا ہے۔

'شاد عارفی: ایک مطالعہ' ڈاکٹر مظفر حنفی کا مرتب کردہ ایسا مجموعہ ہے جس میں موصوف کی تنقیدی صلاحیت نمایاں ہو کر منظر عام پر نہ صرف آئی ہے بلکہ اس کو پڑھ کر ان کی ناقدانہ بصیرت افروزی بھی جلوہ گر

ہوتی ہے۔ پہلے باب میں شاد عارفی کے فن اور شخصیت پر مختلف ادبا اور ناقدین فن کے مضامین اور اقتباسات شامل ہیں جب کہ دوسرے باب میں باقیات شادؔ عارفی کو صفحۂ قرطاس کی زینت بنایا گیا ہے۔ اس کتاب میں عقیدتمندانہ جائزہ کم اور ناقدانہ جائزہ زیادہ نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر مظفر حنفی اس سے قبل 'کلیات شادؔ عارفی'، 'ایک تھا شاعر' جن کا تذکرہ سطور بالا میں ہو چکا ہے کے علاوہ 'شاد عارفی: فن اور شخصیت' میں ان کے شعری اور نثری فن پاروں کے علاوہ دوسری تخلیقات کو شامل کر کے حقِ شاگردی (کُل چودہ ماہ) کا فریضہ ادا کر چکے تھے۔ شادؔ عارفی سے متعلق شمس الرحمٰن فاروقی نے Nutshell کی شکل میں جو لکھا ہے اس کا تعمیمی جائزہ لینے کی اب بھی ضرورت ہے:

''شاد عارفی بہر حال ایک عہد ساز شاعر تھے۔ ان کے بعد آنے والے ہر شاعر اور علی الخصوص نئی غزل کے ہر شاعر نے ان سے اکتساب فیض کیا ہے۔ زمانے نے ان کی خاطر خواہ قدر نہ کی ...... اور شاعر کی یہ بد نصیبی ہے کہ جب تک وہ کسی سیاسی یا تہذیبی ادارہ سے منسلک نہ ہو، اس کی قدر شناسی خاطر خواہ نہیں ہوتی۔''

اس ضمنی گفتگو کا ماحصل صرف یہ ہے کہ شمس الرحمن فاروقی صاحب نے بڑی ہی قیمتی باتیں اور ایک ایسی سچائی کو رہتی دنیا تک کے لیے لکھ دیا ہے جس کی زد میں موصوف کے ساتھ ڈاکٹر مظفر حنفی جیسی شخصیت کے علاوہ دوسری شخصیات بھی آتی ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے شاید ہی کوئی انکار کرے گا کہ: ''مشک آنست کہ خود ببوید، نہ کہ عطار بگوید۔''

لیکن لاکھ ایوارڈ اور انعامات کے حصول کے بعد بھی اہلِ نظر اور قارئین کی نظر میں کمتر فن کار ابدالآباد تک نہیں رہ سکتا۔ یہ بھی سچ ہے کہ کسی فن کار کی ستائش میں جس طرح بے جا جملے دیر پا ثابت نہیں ہو سکتے اسی طرح یہ انعامات بھی۔ سچائی تو یہ ہے کہ دیر پا ثابت ہونے والی چیز اس فن کار کی افادیت سے پُر تخلیق ہوتی ہے۔ گفتگو 'شادؔ عارفی: فن اور شخصیت' کی ہو رہی تھی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر مظفر حنفی سے متعلق عنبر شمیم لکھتے ہیں:

''شاد عارفی نے نہایت کسمپرسی کے عالم میں زندگی گزاری اور انھیں حسب مرتبہ قدر و منزلت بھی نہیں ملی، اس کے باوجود یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ وہ ایک خوش قسمت شاعر تھے جنھیں مظفر حنفی جیسا شاگرد مل گیا۔ غالبؔ کے عہد میں غالبؔ کو بھی حسب مرتبہ قدر و منزلت نہیں ملی تھی جس کے وہ حقدار تھے مگر حالؔی نے 'یادگار غالب' لکھ کر غالبؔ کو امر کر دیا۔ اس طرح پروفیسر مظفر حنفی لائقِ ستائش ہیں کہ انھوں نے حالؔی کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔''

مذکورہ بالا عبارت کے روایتی انداز فکر سے میں کلّی طور پر اتفاق نہیں کرتا۔ مجھے امید ہے کہ ناقدین فن اور اہلِ نظر میری بات سے اتفاق کرتے ہوئے میرے درجِ ذیل جملے کی تائید کریں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ غالبؔ

کو غالبؔ ان کے کلام نے کیا نہ کہ 'یادگارِ غالب' نے۔ اگر حالؔی نے یہ کتاب نہ بھی لکھی ہوتی تب بھی غالبؔ اپنے شعر کی روشنی میں اردو شاعری کی تاریخ میں زندہ رہنے کی سکت رکھتے تھے۔ انھوں نے بصیرت افروز درج ذیل شعر میں جس بات کی طرف اشارہ کیا تھا وہ حرف بہ حرف سچ ثابت ہوا۔

کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بوده است　　　شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

(کلیاتِ غالب ۴۸۹)

علامہ شبلی نعمانی کی 'موازنہ انیسؔ و دبیرؔ' کو اس پس منظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ علامہ کی لاکھ کوشش کے باوجود دبیرؔ کی شاعرانہ عظمت انیس کے مقابلے میں ذرا بھی کم نہیں ہوئی۔ انیسؔ نے جس ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں وہ ماحول اور گھرانا دبیرؔ کے حصے میں نہیں آیا۔ اس کے باوجود دبیر اپنے بل بوتے اور اپنے کلام کی فصاحت و بلاغت کے سہارے آج بھی زندہ ہیں۔ انیس سے وہ اگر زیادہ نہیں تو کم بھی نہ تھے۔ یہاں پر میں الطاف حسین حالؔی، علّامہ شبلی نعمانی اور ڈاکٹر مظفر حنفی کو ایک لحاظ سے عطّار کی صف میں کھڑا دیکھتا ہوں۔

یہاں اس بات کا بھی اعتراف کرتا چلوں کہ ابوالمظفر اور مظفر حنفی کو ڈاکٹر مظفر حنفی بنانے میں افسانہ نگاری، ناول نگاری اور ترجمہ نگاری سے زیادہ شاعری کا ہاتھ رہا ہے۔

ڈاکٹر مظفر حنفی نے آفرین حسین کے درج ذیل سوال ''سینکڑوں افسانوں اور تین افسانوی مجموعوں کے باوجود آپ نے اس صنف کو خیر باد کیوں کہا۔'' کے جواب میں جو باتیں کہیں ذرا اس پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں، امید ہے کہ میرے سطور بالا میں کیے گئے دعوے کی کسی حد تک تصدیق ہو جائے گی:

''بے شک ادبی زندگی کے ابتدائی گیارہ برسوں میں کہانیاں اور افسانے زیادہ تخلیق کیے۔ ۱۹۶۰ء کے آس پاس ادب میں جدید رجحانات کا بول بالا ہوا۔ جدیدیت نے تمام اصناف ادب میں رمزیت، اشاریت، علامت اور ابہام پر زور دیا۔ ان کی شمولیت سے شاعری خصوصاً غزل کو نئے پر و بال مل گئے۔ مجھے تخلیق کار ہونے کے ناتے شاید بروقت احساس ہو گیا اور میں نے افسانے کی جگہ غزل کو اپنا وسیلۂ اظہار بنا لیا۔ میرا ایک مقطع ہے:

بری نہیں ہے مظفرؔ کوئی بھی صنف ادب
قلم غزل کے اثر میں رہے تو اچھا ہے''

درج بالا شعر معنوی اور صوری لحاظ سے جامع صفات کا حامل ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ڈاکٹر مظفر حنفی نے اردو شاعری کی محبوب صنف کو وسیلۂ اظہار بنا کر اردو غزل کو نئے سرے سے فکر کی تازگی عطا کی ہے۔ میری نظر میں غزل کے شعر میں ندرت خیال، ندرتِ فکر اور ندرتِ طرز ادا کے ساتھ زبان کی صحت اور اسلوب کی برجستگی ضروری ہے۔ ڈاکٹر مظفر حنفی کی غزلوں میں کم و بیش درج بالا عناصر کو بدرجہ اتم تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر مظفر حنفی کے پہلے

شعری مجموعہ کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جس میں جدید شاعری کی جھلک نمایاں ہے۔

الفاظ کو خیال کی تتلی جو مل گئی　　کچھ دیر لطفِ رنگ اٹھا کر مسل دیا
اے مظفرؔ مجھے ان پر بھی ترس آتا ہے　　جن کے حصے میں کوئی چوٹ نہ کاری آئی
اپنا آنگن، اپنا بستر، اپنی یادیں، اپنا وقت　　یوں لگتا ہے جیسے دن سے رات زیادہ روشن ہے
اتنی مبہم، اتنی تنہا، اتنی بھاری بھاری شام　　جانے کس کو ڈھونڈ رہی ہے جنگل میں بیچاری شام
پیچیدہ عہدِ نو کی علامت کے نام پر　　یاروں نے شاعری کو تماشا بنا لیا

اول الذکر اور موخر الذکر شعر اپنی جامعیت کے لحاظ سے فکر تازہ کی عمدہ مثال پیش کرتا ہے۔ دوسرا شعر شاعر کے تجربے اور مشاہدے کی عکس ریزی کرتا ہے۔ تیسرے اور چوتھے شعر سے شاعر کی تخلیقیت نمایاں ہے۔

ڈاکٹر مظفر حنفی کا دوسرا شعری مجموعہ 'تیکھی غزلیں' ہے جس میں ان کی فکری اور فنی ہنر مندی کے ساتھ طنز کے نشتر کو بہ یک وقت محسوس کیا جا سکتا ہے۔ چند اشعار دیکھیے۔

ہم تم کو جانتے ہیں ہمیں مت فریب دو　　شیخِ حرم سلام، نمستے برہمنو
تری یہ مصلحت اندیشیاں بیکار ہیں اے دل　　محبت میں بلندی اور پستی دیکھتا کیا ہے
کہتے ہیں یار لوگ مظفرؔ کے باب میں　　کڑوے زبان کے ہیں، طبیعت کے صاف ہیں
چھپائے پھر رہے ہیں تیز خنجر آستینوں میں　　یہی جو آپ سے شانہ ملا کے ساتھ چلتے ہیں
یوں کسی کے عیب گنوانے کے ہم عادی نہیں　　چشم پوشی سے مگر جرأت تمہاری بڑھ گئی

عصر حاضر میں شیخ حرم اور برہمنوں کی حالتِ زار سے شاعر آشنا ہے اس لیے ان کے دامِ فریب سے بچنے کی تلقین کرتا ہے، موخر الذکر شعر میں شاعر جس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ میری نظر میں نہ صرف اہم ہے بلکہ ہماری اخلاقی اقدار کے ناگزیر ہونے کی علامت ہے۔ ظاہر ہے ہماری چھوٹی سی بھول ہی بڑی بھول کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی بنیادی غلطی چشم پوشی سے زہر ہلاہل بن سکتی ہے۔ ڈاکٹر مظفر حنفی کا اول الذکر شعر اس بنیادی نکتے کی زد میں اس لیے آتا ہے کہ اہلِ ایمان خدائے حقیقی کے علاوہ کسی غیر کے آگے سرخم نہیں کرتے۔

ڈاکٹر مظفر حنفی کے بقیہ اشعار میں طنز کے نشتر کے ساتھ ان کے ذاتی تجربے اور مشاہدے کا بھی عمل دخل ہے۔ وہ مصلحت اندیشی اور مصلحت کوشی کو محبت کے باب میں ضروری نہیں سمجھتے۔ تیسرے شعر میں وہ خود سے باتیں کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ میرے مزاج آشنا اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ میں کڑوی زبان کا ہوں مگر دل میں کڑواہٹ نہیں رکھتا۔ لیکن اگلے ہی شعر میں وہ ہمیں متنبہ کرتے ہوئے اس حقیقت سے بھی آگاہ کرتے ہیں کہ جو آپ کے شانہ بہ شانہ چلتے ہیں عصر حاضر میں ان سے بھی ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر مظفر حنفی کی ایک دعائیہ غزل جو مجھے بہت اچھی لگی، اس کے چند اشعار آپ کی نذر کرتا ہوں۔

میں شاعر ہوں، تمنا ہے مجھے مقبول ہونے کی　　مگر مقبولیت سے پہلے مجھ کو نیک نامی دے
مری حق گوئی خامی ہے خردمندوں کی نظروں میں　　یہ بے حد قیمتی خامی ہے مولا اور خامی دے
اگر درکار ہے تاثیر تجھ کو اپنے شعروں میں　　انھیں رنگت مقامی دے انھیں لہجہ عوامی دے

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ہر شاعر کی یہ دلی تمنا ہوتی ہے کہ اس کی شاعری مقبولیت سے ہمکنار ہو جائے۔ ظاہر ہے یہ تمنا سب کی یکساں پوری نہیں ہوتی۔ مظفر حنفی نے درج بالا شعر میں دو دو تمناؤں کا ایک ساتھ اظہار کیا ہے۔ وہ مقبولیت سے پہلے نیک نامی کی دعا کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ موصوف کی تمنا بشکل دعا بارگاہ ایزدی میں قبول ہوئی۔ البتہ دوسرے شعر پر نظر ٹکتی ہے۔ خردمندوں کی نظروں میں کسی کی حق گوئی خامی کے زمرے میں نہیں آسکتی۔ سچ تو یہ ہے کہ 'قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری' کے مصداق جو اہلِ خرد ہوتے ہیں وہ حق گوئی کو خامی کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ موخر الذکر شعر میں شاعر نے جس قاعدے، کلیے کا بیان کیا ہے وہ سو فیصد اچھی شاعری اور دیرپا اثر انگیزی کے لیے لازمی قرار دی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر مظفر حنفی کی غزلوں کے بالاستیعاب مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ اپنی غزلوں میں الفاظ کا جادو جگاتے ہوئے نہایت ہی بلیغ اور دل آویز اسلوب میں خیال و فکر کو شعری تجسیم عطا کرنے کے فن سے واقف ہیں۔ سہل ممتنع میں وہ بڑی سے بڑی اور قیمتی بات نہایت روانی اور سلاست سے کہہ جاتے ہیں۔

اس کھردری غزل کو نہ یوں منہ بنا کے دیکھ　　کس حال میں لکھی ہے مرے پاس آکے دیکھ
تو میرا ہم سفر ہے تو پھر میرے ساتھ چل　　ہے راہزن تو نقشِ قدم رہنما کے دیکھ
ٹھپّہ لگا ہوا ہے مظفرؔ کے نام کا　　اس کا کوئی بھی شعر کہیں سے اُٹھا کے دیکھ

میرا ایسا ماننا ہے کہ مظفر حنفی شعر کی تخلیق کے بعد اپنی شاعری کی تعریف کے لیے در بدر اور گھر گھر کشکول لیے نہیں پھرتے نیز وہ ہر ناقدِ فن سے اپنے فن کی داد لینا نہیں چاہتے۔ وہ تو صرف اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ جو حقیقی معنوں میں فن کا پارکھ ہو وہ بغیر کسی تحریص و ترغیب اور بغیر کسی تعصب کے ان کے شعر کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد اپنی صائب رائے کو صفحۂ قرطاس کی زینت بنائے۔

○○○

شکیل اعجاز
اکولہ

طوفان طوفان: مظفر حنفی

اکولہ میں تاجنا پیٹھ پولیس چوکی ہے، اس کے سامنے ایک کھلی جگہ ہے جہاں برسہا برس سے بڑے بڑے جلسے، جلوس، قوالیاں، تقریریں اور مشاعرے ہوتے رہتے ہیں۔ پولس چوکی میں ڈیوٹی پر تعینات پولیس والوں کے لیے یہ اضافی مزے ہیں۔ میں نے ایسے مناظر دیکھے ہیں کہ قوالی اپنے عروج پر ہے اور پولیس والے ہاتھ کے اشارے سے رپورٹ درج کروانے والوں کو روک رہے ہیں کہ کل صبح آنا۔ پورا عملہ قوالی سے محظوظ ہو رہا ہے۔ اس تھانہ پہ مستقل بیٹھنے والے بعض لوگ مشاعرے سُن سُن کر شاعری کرنے لگے تھے۔ اسی جگہ ۱۹۸۰ء میں جب ڈاکٹر مظفر حنفی صاحب کی صدرات میں مشاعرہ تھا اور وہ اپنی صدارتی غزل پڑھ رہے تھے، یہ منظر آج تک اکولہ والوں کو یاد ہے۔ غزل یہ تھی ۔

تنکوں کے ارمان لبّیک لبّیک   طوفان طوفان، لبّیک لبّیک

مظفر صاحب ایک مصرعہ پڑھتے تھے اور ثانی پر آ کر جب طوفان طوفان، لبیک لبیک کہتے تو سینکڑوں کا مجمع ان کے ساتھ طوفان طوفان لبیک لبیک کہتا۔ ایسا منظر اس سے پہلے کبھی دیکھنے سننے کو نہیں ملا تھا۔ سامعین اتنے بے قابو ہو گئے تھے کہ آخر آخر میں پورا شعر سننے کی بجائے ثانی مصرعہ کے آخری ٹکڑے کا انتظار کرتے کہ وہ کب آتا ہے اور کب گلا پھاڑ کر ایک ہی سُر میں لبّیک لبّیک مظفر حنفی صاحب کی لَے میں کہنے کا موقع ملتا ہے ۔

آزار دیدہ   مردُم گزیدہ   آئینہ حیران لبیک لبّیک
طوفان طوفان لبیک لبیک

ایک بار غزل ختم ہوئی تو دوسری بار فرمائش ہوئی، پھر وہی طوفان کھڑا ہوا، طوفان طوفان، لبیک لبیک۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی دیہاتی ریلوے پلیٹ فارم پہ کھڑا ہوں اور سامنے سے Super Fast Train پوری رفتار میں اس طرح گزر رہی ہے کہ اپنے پیچھے اپنے ساتھ کئی چیزیں لے کر اُڑی جا رہی ہے۔ ہر طرف طوفان ہے ۔

بے دست و پا میں، بے دست و پا تو   جنگل بیابان، لبیک لبیک

اگلے روز اکولہ میں بڑے چھوٹے بچے بھی یہی چلّاتے پھر رہے تھے 'طوفان، طوفان، لبیک لبیک'۔ یہ تھا مظفر صاحب کے کلام کا ان کے پڑھنے کے انداز کا، ان کی مقبولیت کا جادو۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ڈاکٹر محبوب راہیؔ صاحب کے توسط سے ہماری ان سے ملاقاتوں کی ابتدا ہوئی۔ ابّا جان سے ملاقات کے لیے وہ کئی بار گھر آتے اور اپنی فطری شرافت اور اعلیٰ اخلاق کے سبب ابّا جان سے اس طرح ملتے جیسے ابّا جان (غنی اعجاز) ان کے خاندانی بزرگ ہیں۔ یہیں میں نے دیکھا کہ مظفر صاحب چھوٹوں سے بہت شفقت سے پیش آتے ہیں اور بزرگوں کے سامنے خود کو معمولی شخص کے بطور پیش کرتے ہیں۔ ہمارے گھر میں مظفر صاحب کی آمد کے موقع پر شہر اور آس پاس کے کئی شعرا اور ادیب ان سے ملاقات کے لیے موجود ہوتے۔ گھنٹوں بات چیت کا سلسلہ چلتا۔ مظفر صاحب کی باتیں اور موضوعات اتنے دلچسپ ہوتے کہ لگتا یہ کہتے جائیں اور ہم سنتے جائیں۔

ان دنوں محبوب راہیؔ صاحب مظفر حنفی پر پی ایچ۔ ڈی کے لیے مقالہ لکھ رہے تھے۔ راہیؔ صاحب آتے یا ہم لوگ ان کے مکان بارسی ٹاکلی جاتے تو زیادہ تر اسی مقالہ کے مواد کے بارے میں باتیں ہوتیں۔ راہیؔ صاحب کے گھر میں ہر طرف مقالے کے کاغذات بکھرے ہوتے۔ مظفر صاحب کی زندگی پر دلچسپ باتیں ہوتیں اور مجھے مزے مزے کے واقعات سننے کو ملتے۔

۱۹۸۰ء کے آس پاس دلّی میں حنفی صاحب کا مہمان رہا دو ہفتوں تک۔ وہاں میں نے چچی جان (مسز عاصمہ مظفر) کو بہت خاموش، صلح کل اور خصوصاً بحث نہ کرنے والی خاتون پایا۔ مجھے یقین ہے کہ چچی جان نے اپنی اسکول لائف میں نہ صرف یہ کہ کسی ڈیبیٹ کے مقابلہ میں حصّہ نہ لیا ہوگا بلکہ وہ اس قسم کے حجت بحث والے پروگراموں میں سننے کے لیے بھی نہ جاتی ہوں گی۔ یہی سبب ہے حنفی صاحب کے گھر کے سکون کا۔ اپنے گھر کے لیے بہوئیں چنتے وقت یہ معلومات بھی حاصل کر لینی چاہیے کہ لڑکی خدانخواستہ کسی ڈیبیٹ مقابلے میں ملوّث تو نہیں رہی ہے۔ ان دو ہفتوں میں چچی جان نے اتنا خیال رکھا کہ کبھی کبھی دسترخوان پر کھانا شروع کرنے سے پہلے میرا دل ڈوب جایا کرتا تھا کہ دِلّی جیسے مہنگے شہر میں صبح کے بہترین ناشتہ سے لے کر شام کے نت نئے پکوانوں تک چچی جان کو کتنی زحمت ہوتی ہوگی لیکن ان کے چہرے پر وہی مادرانہ شفقت شروع سے آخر تک رہی۔ چچی جان کا ذکر چلا ہے تو عرض کر دوں کہ مظفر حنفی صاحب جیسی زندہ دل، شگفتہ مزاج اور شرارتی شخصیت کے ساتھ رہتے رہتے چچی جان بھی کبھی کبھار ان سے شرارت کرتی ہیں۔ ۱۹۹۷ء میں لندن جاتے ہوئے ہوائی جہاز میں مظفر حنفی صاحب کو کھڑکی کے پاس دو سیاح لڑکیوں کے ساتھ جگہ ملی اور چچی جان کو کچھ دوری پر۔ حنفی صاحب نے چاہا کہ لڑکیاں یہاں سے اٹھ کر جائیں تا کہ چچی جان ان کے پاس بیٹھ سکیں۔ لیکن چچی جان نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ "آپ ان لڑکیوں کے ساتھ ہی بیٹھیں، اچھی تو ہیں۔" ساتھ بیٹھے بیٹھے حنفی صاحب کی ان دو لڑکیوں سے خوب باتیں اور

ناشتے ساتھ ساتھ ہونے لگے۔ ایک لڑکی ڈنمارک کی تھی، بہت دیر بعد چچی جان نے آواز دی۔ ''ہماری بھی تو سنیے، آپ تو اپنی دوستوں میں مست ہیں۔'' حنفی صاحب نے دیکھا تو ہتھیلی پر کچھ الائچیاں، لونگ وغیرہ پیش کی جارہی تھیں۔ مظفر صاحب کا مزاج ان کے بچوں میں بھی آیا ہے۔ لندن پہنچ کر حنفی صاحب نے اقبال کے یہاں خود فون لگایا تو اُدھر سے تسکین (بیگم اقبال) بولیں۔ ہیلو۔ حنفی صاحب نے کہا میں برمنگھم سے مظفر حنفی بول رہا ہوں، پرویز کا پاپا۔ تسکین نے قہقہہ لگایا: پرویز، بدمعاش! اب میں دھوکے میں نہیں آؤں گی۔ تم نے پہلے بھی گجراتی بن کر مجھے دھوکا دیا تھا۔ کبھی شرارتیں کرنے والوں کے ساتھ شرارت ہو جاتی ہے۔

اسکول لائف ہی میں حنفی صاحب کی تخلیقات 'کھلونا'، 'پھلواری'، 'جگنو' وغیرہ میں شائع ہونے لگی تھیں۔ مندرجہ بالا رسائل کا نام سن کر میرا دل دھڑکنے لگا، مجھے یاد ہے وہ احساس جب ہم دوکان پر پوچھا کرتے تھے کہ کھلونا کب آئے گا۔ آجاتا تو میرے ایک دولت مند دوست کے پاس بیٹھ کر میں انتظار کرتا رہتا کہ کب وہ مجھے پڑھنے کے لیے دیتا ہے۔ کھانا پینا بھول کر میں اس کے پاس بیٹھا رہتا اور جب تک پڑھنے کے لیے نہ ملتا رسالہ کا سرورق ہی دیکھتا رہتا تھا۔ جیسے بلّی اس بھیگی ہوئی چڑیا کو دیکھتی رہتی ہے اور پوچھتی رہتی ہے کہ اب کھاؤں؟ چڑیا کہتی ہے ابھی تو میں پوری طرح سوکھی بھی نہیں۔ سوکھ جاؤں تو کھا لینا۔

کالج کے سالانہ امتحان سے ۱۵؍روز قبل انھیں ایئر فورس میں انٹرویو کے لیے طلب کیا گیا۔ انٹرویو میں تو کامیاب ہو گئے۔ سینہ ایک انچ کم تھا اس لیے ملازمت میں نہیں لیے گئے۔ یہ رعایت دی گئی کہ عمر کے بیس سال پورے ہونے سے قبل جب بھی سینہ ۳۲؍انچ کا ہو جائے ملازمت میں لے لیا جائے گا۔ اس دوران ہر ماہ بعد ایئر فورس کے دفتر میں جا کر اپنا طبی معائنہ کراتے رہے لیکن تخلیقی سرگرمیوں اور حالات کی ناہمواریوں نے سینہ کی چوڑائی میں نصف انچ کی کمی کر دی، لہٰذا ۱۹۵۵ء میں انھیں ایئر فورس میں انتخاب کے حتمی طور پر نا اہل قرار دے دیا گیا۔ (محض سینہ کی نااہلی کے سبب پورے آدمی کو نا اہل قرار دے دینا کوئی اچھی بات نہیں لگی۔)

مارچ ۱۹۶۹ء میں اپنے پرانے دوست بخشش عباس کے اصرار پر بھوپال میں محکمۂ جنگلات میں بحیثیت کلرک ملازم ہو گئے۔ میرے ایک دوست اِدھر محکمۂ جنگلات میں ہیں۔ دیگر احباب ان سے زبان سنبھال کر بات کرتے ہیں، اور اگر مذاق مذاق میں بات بڑھ جائے تو خود کو بحث سے خارج کرنے کے لیے ایک دوسرے سے کہتے ہیں اس سے بحث مت کرو یہ محکمۂ جنگلات کا آدمی ہے۔ حنفی صاحب کے ساتھ مجھے کبھی کبھار ریلوے اور بس سے سفر کرنے کے مواقع ملے۔ مشکل سے مشکل سچویشن میں حنفی صاحب اچھے اچھوں پر جس طرح حاوی ہو جاتے اور ان کو پسپا کر دیتے ہیں اس سے مجھے پہلے ہی شک تھا کہ یہ کبھی نہ کبھی محکمۂ جنگلات میں ملازمت کر چکے ہوں گے۔ حنفی صاحب انگلستان میں بھی محکمۂ جنگلات کے آدمی رہے۔ مطلب محکمۂ جنگلات کو یاد کرتے رہے۔ اپنے سفرنامہ 'چل چنبیلی باغ میں' ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اب ہمارا راستہ بہت تنگ ہو گیا تھا اور بتدریج ڈھلوان ہوتا جا رہا تھا۔ اتنا ڈھلوان کہ مجھے بھوپال یاد آ گیا جہاں چودہ برس میں نے محکمۂ جنگلات کی ملازمت میں رہ کر بسر کیے تھے وہاں اکثر پہاڑی پُر پیچ راستوں سے جیپ اُترتی چڑھتی تھی ڈر لگتا تھا کہ اس بار موڑ پر ہم نیچے کھڈ میں نہ جا پڑیں۔ یہاں یہ پتلی سڑک بھی ایک پہاڑ سے گزر کر اس وادی میں جھانک رہی تھی، جس میں 'ونڈرمیئر' بسا تھا: ''پگڈنڈی تو ہاتھ ہلا کر نیچے کود گئی۔''

مظفر حنفی صاحب کا یہ سفرنامہ پڑھتے ہوئے کئی بار ایسا لگا کہ میں ابن صفی کا کوئی دلچسپ ناول پڑھ رہا ہوں۔

مظفر حنفی کے دوست قاضی حسن رضا بچپن کے واقعات سناتے ہیں کہ مظفر حنفی ہر وقت کتابوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے۔ فٹ پاتھ پر بیٹھنے والے ایک پنجابی کتب فروش کے وہ مخصوص گاہک تھے۔ کتابوں پر پانچ پانچ روپئے قیمت چھپی ہوتی۔ کتب فروش بے حد کائیاں تھا۔ ادھر مظفر میاں اپنے آپ کو چالاک سمجھتے۔ کتب فروش سے کتاب کی قیمت پوچھتے، وہ بڑی مسکینی سے کہتا بھیّا میں تو ان پڑھ ہوں تم خود قیمت پڑھ کر پیسے دے دو۔ مظفر نصف قیمت بتا کر کتاب خرید لیتے اور خوش ہوتے کہ خوب بے وقوف بنایا ہے۔

قاضی حسن رضا کہتے ہیں: ''مظفر، قاضی انصار اور راقم الحروف کو بچپن میں جاسوسی ناول پڑھنے کا شوق تھا۔ ہر ایک کے بستے میں ایک ناول ضرور ہوتا۔ ایک دن استاد نے بستوں کی تلاشی لینی شروع کر دی۔ مظفر نے اپنی ناولیں قاضی انصار کے بستے میں رکھ دیں۔ سزا پاتے وقت انصار کو صفائی پیش کرنے کا بھی موقع نہ ملا۔ مظفر اس دوران پیکر معصومیت بنا جغرافیہ کے مطالعہ میں غرق دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنے تمام ہم جماعتوں سے پڑھنے کے لیے کتابیں لیتا۔ مجھ سے کتاب لی پڑھی کسی اور کو دے دی۔ بدلہ میں اس سے کتاب حاصل کر لی۔ اس کی ٹوپی اس کے سر والا معاملہ تھا۔

اس قسم کے واقعات پڑھتے اور سنتے ہوئے اس زمانہ پر رشک آتا ہے کہ بچے کتابوں کے لیے کیسے بے چین رہتے تھے۔ آج کل تو نصاب میں شامل اردو کی اکلوتی ایک کتاب کا پڑھنا بھی بچوں کو پہاڑ معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مظفر حنفی جیسے اہلِ قلم اس زمانہ نے دُنیا کو دیے ہیں اور آج اردو کے بیشتر طلبا حنفی صاحب کی طرح شاعری کرنا تو درکنار اس شاعری کو سمجھنے کی قابلیت بھی نہیں رکھتے۔ قاضی حسن رضاؔ صاحب نے اعتراف کیا کہ ان تمام شرارتوں اور کھلنڈرے پن کے باوجود گفتگو اور نشست و برخاست میں نفاست اور خوش سلیقگی اپنی جگہ تھی۔ گندہ مذاق، فحش گالی اور اخلاق سے گری ہوئی بیہودہ بات ہم نے کبھی مظفر کی زبان سے نہیں سنی۔

'نئے چراغ' رسالہ کے سبب کھنڈوہ کا ایک گروپ جس کے سربراہ وہاں کے ایک ڈاکٹر تھے، جو اقتدار کی اونچی مسند پر متمکن تھے اور خیر سے شاعر بھی تھے، مظفر حنفی کے سخت مخالف تھے۔ وہ صاحب بڑی بڑی رقمیں خرچ کر کے کھنڈوہ میں کل ہند مشاعرے کرواتے رہتے تھے۔ مظفر حنفی نے اُن کے عظیم الشان مشاعروں کے

جواب میں 'پاگلوں کے مشاعرے' کی داغ بیل ڈالی۔ وہ منظر بھی قابل دید ہوتا تھا۔ مظفر حنفی کے مخالفین کے عظیم الشان مشاعرے کا سجا سجایا پنڈال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ برقی قمقموں سے آراستہ اسٹیج پر ملک کے نامور مشاعرہ باز شاعر رونق افروز ہیں۔ مشاعرہ شباب پر ہے کہ اچانک سامعین کی ایک بڑی تعداد اُٹھ کر جانے لگتی۔ معلوم ہوا سامنے ہی ایک کھلی جگہ میں صرف ایک لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا ہے اور پاگلوں کا مشاعرہ چل رہا ہے۔ کچھ ہی دیر میں مشاعرے کے پنڈال میں دھول اُڑتی نظر آتی اور سامعین پاگلوں کے مشاعرے سے لطف اندوز ہونے کے لیے کھلے میدان میں جمع ہونے لگتے۔

شاعری ہی شاؔد صاحب کا ذریعۂ معاش تھی اسی لیے وہ شاگردی کے درخواست دہندہ کو 'انجمن ارباب ادب' کا رکن بننے کی شرط پیش کرتے تھے جس کی رو سے تھوڑی سی رقم سالانہ اور کچھ فیس داخلہ پیش کرنا ہوتی تھی۔ شاد عارفی کی مالی حالت ان دنوں خراب ہی تھی لیکن حنفی صاحب نے اپنی مالی مشکلات کا ذکر کیا اور یہ بھی لکھا کہ اگر شاؔد صاحب (بوجہ عدم ادائیگی فیس داخلہ وغیرہ) انھیں شاگردی میں قبول نہ کریں گے تو وہ نوحؔ ناروی یا ابر احسنی گنوری کے شاگرد ہو جائیں گے اور اس حقیقت کی تشہیر بھی کریں گے۔ شاؔد صاحب بڑے بڑوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے لیکن انھوں نے اپنے جواب میں اس تہدید کا کوئی ذکر نہ کیا۔ حنفی صاحب کو اپنا شاگرد بنانا قبول کیا اور ساری شرطیں معاف کر دیں۔ اس سے حنفی صاحب کے مزاج میں چھیڑ چھاڑ کے رجحان کا پتہ چلتا ہے۔

ان کی بڑی بہن محترمہ عزیز فاطمہ سے روایت ہے کہ چار سالہ مظفرؔ نے ایک مرتبہ چولہے میں چمٹا ڈال دیا اور گرم ہونے پر میرے پیروں پر رکھ دیا۔ گھر کی اچھی خاصی چیزوں کو توڑ پھوڑ کرتے رہتے تھے۔

ایک واقعہ نجمہ امین (پروفیسر نفسیات جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے بیان کیا: ایک مرتبہ میں نے دوپہر کی چائے تیار کی، ایک کپ عاصمہ بھابی کے ہاتھوں بھائی صاحب کو بھجوایا۔ دوسرا کپ بھابی کے لیے لگایا ہی تھا کہ بے ساختہ ''پھینک دو، بھائی صاحب چائے پھینک دو'' چیختی ہوئی دیوانہ وار ان کے کمرے کی طرف دوڑی اور جھپٹ کر چائے سے لبالب طشتری جو حنفی صاحب ہونٹوں سے لگانے ہی والے تھے ان کے ہاتھوں سے گرا دی۔ ان کا بے داغ لباس چائے سے لت پت ہو گیا۔ میں نے بمشکل اپنی سانسوں پہ قابو پاتے ہوئے چائے کی پتیلی ان کے سامنے رکھ دی جس کے پیندے میں ایک بچھو اُبل کر جس کی جسامت دُگنی ہو گئی تھی، پڑا ہوا تھا۔ ایسا بھیانک منظر دیکھنے کے بعد بھی ان کے چہرے پر ناگواری کی لہر تک نہ آئی۔ (ناگواری کی لہریں اس کے چہرے پہ ضرور آئی ہوں گی جس کو زندہ اُبال دیا گیا تھا۔)

میں نے طویل خطوط لکھنے بند کر دیے۔ بہت دنوں بعد ڈرتے ڈرتے ایک مختصر خط لکھا اس کا جواب آیا: ''سردار عرفان اور ابن صفی دونوں سے میرے ذاتی تعلقات رہے ہیں اور ان کی وفات میرے لیے کم اذیت ناک نہیں ہے۔ اول الذکر کا بہیمانہ قتل لرزہ خیز ہے۔'' اس کے بعد میں نے حنفی صاحب کے نام مختصر خطوط

لکھنے بھی بند کر دیے۔

ان کی زندگی والدین کے لیے فرماں بردار بیٹے، استادوں کے لیے سعادت مند شاگرد، شاگردوں کے لیے خلیق استاد، بہنوں کے لیے بامروّت بھائی، بیوی کے لیے محبت شعار اور وفادار خاوند، اولاد کے لیے شفیق باپ اور دوستوں کے لیے مخلص ترین دوست کا ایک مثالی نمونہ پیش کرتی ہے۔ حنفی صاحب سے ملاقاتوں میں میں نے ان کی شخصیت میں ایک طرف رعب و دبدبہ محسوس کیا، وہیں دوسری طرف اپنا پن، بے تکلفی اور شگفتگی کا وصف پایا۔ میرے اس احساس کو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب نے اس طرح بیان کیا ہے:

''ان کی طبیعت میں ایک خاص طرح کی متانت، سنجیدگی اور رکھ رکھاؤ ہے۔ وہ ہر شخص سے آسانی سے نہیں کھلتے اور کچھ لیے دیے سے رہتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں ایک خاص نوع کی جرأت مندی اور استقامت ہے۔ وہ جہاں احسان شناس اخلاص شعار اور خلیق و وضعدار ہیں وہاں ضرورت پڑنے پر صاف صاف اپنی رائے کا اظہار بھی کر دیتے ہیں۔''

دہلی میں جہاں وہ جامعہ ملیہ میں پروفیسر تھے ان کی گفتگو اور نشست و برخاست کا نپا تُلا انداز نظر آتا ہے۔ ان سے ملنے والے بھی مودب ہو کر سرگوشی کے انداز میں مخاطب ہوتے ہیں لیکن کھنڈوہ میں معاملہ ہی اور ہوتا ہے۔ ہر شخص تکلف برطرف کی تفسیر بنا اپنے مظفر سے ملتا ہے۔ حنفی صاحب اپنے دوستوں کے ساتھ کھنڈوہ کی کسی سڑک سے گزر رہے ہیں کہ اچانک کسی دوکان یا ہوٹل سے مظفر یا مظفر بھائی کی آواز آتی ہے۔ مظفر حنفی فوراً پلٹتے ہیں اور کسی قسم کی ناگواری کا اظہار کیے بغیر خندہ پیشانی اور تپاک سے اس شخص سے جو معاشرہ کی نظر میں معمولی اور غیر اہم ہے، ملتے ہیں۔ خیر و عافیت دریافت کرتے ہیں۔ اس کی چائے کی دعوت قبول کرتے ہیں، ان کے دلّی لوٹ جانے پر وہ شخص مدتوں اپنے دوستوں میں مظفر حنفی صاحب سے اپنے قریبی تعلقات کا ذکر فخریہ انداز میں کرتا رہتا ہے۔

حنفی صاحب کا سفر نامہ 'چل چنبیلی باغ میں' نے اپنی دلچسپی کے سبب مجھے بہت پریشان کیا۔ پہلی بار پڑھتے ہوئے میں نے اپنے پسندیدہ حصوں پر پنسل سے نشان لگا لیے کہ ہر بار پوری کتاب نہ پڑھنی پڑے گی، صرف پسندیدہ حصے پڑھ لیا کروں گا۔ دوسری بار پڑھتے ہوئے پسندیدہ حصوں میں پیراگراف اور صفحات کے اضافے ہوتے گئے۔ تیسری بار میں نے مجبوراً صرف ان حصوں پر نشانات لگائے جو مجھے بار بار پڑھنے نہیں ہیں کیوں کہ یہ کم تھے۔ اسی سفر نامہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''یہ مادام تو سادا کا عجائب گھر ہے۔ عاصمہ نے شریمتی اندرا گاندھی کے ساتھ تصویر کھنچوائی۔ صبا نے شہزادی ڈائنا کے ساتھ۔ پرویز نے شیکسپیئر اور مجھے کیمرے میں ایک ساتھ کھڑا کر لیا۔ پھر کیمرہ میرے ہاتھ میں تھما کر خود چارلی چیپلن اور مائیکل جیکسن کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ ایک جگہ ایک

خاتون ہاتھ میں بیگ تھامے اوپر دیکھ رہی تھیں۔ پرویز نے اس کا بیگ چھوا تو عاصمہ نے کہا اب یہ لیڈی پرویز کو جھڑکے گی۔ پرویز نے کہا ممی یہ بھی موم کی مورت ہے۔ ''نو'' مورت مڑ کر مسکرائی۔ عاصمہ ڈرتے ڈرتے ایک صوفہ پر بیٹھ گئیں جس پر ایک سن رسیدہ لیڈی پہلے سے بیٹھی تھی۔ پرویز نے تصویر کھینچی، مجسمہ بدستور بے حرکت بیٹھا رہا۔ صبا فوٹو کھنچوانے کے لیے دوسرے صوفے پر ایک اور مجسمے کے ساتھ بیٹھ گئی۔ نسرین نے کیمرہ سنبھالا تو مجسمہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک جگہ گیٹ پر کھڑے ہوئے وردی پوش گائیڈ سے نسرین نے کچھ دریافت کیا لیکن وہ سگریٹ منھ میں دبائے گم صم چھت کو دیکھتا رہا۔ یہ مجسمہ تھا جس کی سگریٹ کا لال سرا دراصل بجلی کا چھوٹا سا بلب تھا۔''

اسی سفرنامے میں ایک اور جگہ یہ دلچسپ واقعہ پڑھنے کو ملتا ہے:

''دوسرے دن ناشتہ پر صبا نے کل رات کا عملی لطیفہ سنایا کہنے لگی۔ پاپا! بھابی اور بھائی میاں (پرویز مظفر)، مشاعرہ شروع ہونے سے کچھ پہلے آ گئے تھے۔ بھائی میاں نے بھرے جلسے میں لیٹ لیٹ کر فوٹو کھینچے۔ صدر صاحب نے آپ کو پہلے پڑھنے نہیں دیا اور خود مائیک پر چلے گئے تو ہماری بھابی کو بہت غصہ آیا۔ کہہ رہی تھیں ہمارے پاپا کو 'لوٹن' میں بھی ایک پوئٹ نے پڑھنے سے روک دیا تھا اور خود پڑھنے لگا تھا یہاں بھی یہ بڑے میاں لڑ بھڑ کر مائیک پر چلے گئے۔ ہم نے ان کو سمجھایا کہ بڑے شاعر آخر میں کلام سناتے ہیں اس وجہ سے عزت دینے کے لیے لوگ پاپا سے پہلے پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بھی ہنسنے لگی اور بولی۔ پاپا ہم نے زندگی میں پہلی مرتبہ مشاعرہ سُنا، وہاں کے طور طریقوں کی ہمیں کیا خبر۔''

یہ سننے کے بعد مظفر حنفی صاحب نے بچوں سے کہا ایسے ہی ایک پٹھان پہلی بار مشاعرہ میں پہنچا تھا۔ اس کے پاس بیٹھے ہوئے ایک آدمی کو کسی کا شعر پسند آیا تو 'مکرّر ارشاد، مکرّر ارشاد' کہا۔ پٹھان اس پر بگڑ گیا کہ غور سے کیوں نہیں سنتا۔ شاعر کو مکرّر مکرّر سے پریشان کرتا ہے۔

برمنگھم میں حنفی صاحب نے کھانا بھی بنایا۔ تفصیل انھیں کی زبانی سنیے:

''چار بجے کے قریب کچن سے ہو کر بیک یارڈ جا رہا تھا کہ ریک پر رکھے ہوئے ایک پیکٹ پر نظر پڑی۔ موٹی موٹی دالیں، کُٹی ہوئی جَو، گیہوں کے دانے اور ایسی ہی بے ضرر اشیا پر مشتمل اس پیکٹ کو میں نے حلیم کے ساز و سامان کے ساتھ ایک بڑے بھگونے میں اُنڈیل کر فریج کا جائزہ لیا۔ جلدی جلدی مختلف ڈبوں پر لگے لیبل پڑھے، دھنیہ، نمک، مرچ، ہلدی اور نہ جانے کاہے کاہے کے ڈبّے مدتوں سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ کسی کو مایوس نہیں کیا۔ بھگونے پر ڈھکن رکھ کر ٹی وی کے سامنے بیٹھنے جا رہا تھا کہ ٹیبل پر ایک اور کام کی چیز نظر آئی، یہ لیموں کا

عرق تھا۔ تھوڑی دیر بعد کھدبد کی آواز پر کمرے سے باورچی خانہ میں آ کر بھگونے کا احوال پوچھا۔ خوشبو تو اچھی تھی، البتہ پانی سوکھ گیا تھا۔ بڑا سا جگ بھر کر قصیدے (اس گاڑھے) کو پانی پانی کر دیا اور صوفے سے کمر ٹیک لی۔ آنکھ کھلی تو عاصمہ اور صبا باورچی خانہ میں قہقہے لگا رہی تھیں۔ یہ کیا پکایا گیا ہے۔ میں نے کہا چکھ کر دیکھ لو حلیم ہے۔ پاپا حلیم ایسا ہوتا ہے؟ تو پھر کھچڑا ہوگا۔ چھ بجے پرویز دفتر سے لوٹا تو پوچھا آج کیا مزیدار چیز پکائی ہے۔ کتنی اچھی خوشبو آ رہی ہے۔ ''تمہارے پاپا نے کیا گھوٹ گھاٹ کر رکھا ہے۔ خود ہی دیکھ لو۔''

پرویز نے بھگونے کا ڈھکن کھولا تو گھر طبلۂ عطار کی طرح مہکنے لگا۔ ''واہ منھ جل گیا مگر کوئی بات نہیں۔ ممی اسے چکھ کر دیکھیے کتنا مزیدار ہے۔''

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ''قدرِ جوہر شاہ داند یا بداند جوہری۔'' عاصمہ نے تو اس رات دودھ دہی اور پِزّا سے کام نکالا۔ بقیہ لوگوں نے حلیم نوشِ جان کی۔ پرویز نسرین کو لانے گیا تو اپنے ساتھ ہاٹ بکس میں حلیم رکھ کر لے گیا۔ بہو بیٹے بعد میں آئے عزیز کا فون پہلے۔ ہنستا ہوا کہہ رہا تھا ''انکل! حلیم تو میں نے زندگی بھر میں اتنا مزے دار نہیں کھایا۔ تھینک یو۔''

میں نے عاصمہ کو ایک راز کی بات بتائی۔ ''یہ جو نسرین کا بھائی عزیز ہے۔ بہت سمجھدار لڑکا ہے۔''

میں بڑے شوق سے اس سفرنامہ کا مطالعہ کر رہا تھا۔ جب یہ ختم ہو گیا تو میرے دل کی وہی کیفیت ہو گئی جو مظفر صاحب کی ہوئی تھی، جب انگلستان میں قیام کی مدت ختم ہوئی۔ انھوں نے فارسی کا مصرعہ درج کیا۔ میں کئی دنوں تک اس مصرعہ کو پڑھتا اور لطف لیتا رہا۔ ''روئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد۔''

حنفی صاحب نے بچپن کے واقعات سُناتے ہوئے کہا تھا ''میرے ایک ماموں سید زوار حسین اسی اسکول میں دوسری کلاس لیتے تھے۔ جب کبھی گھر جاتے والدہ سے کہتے آپ کا بیٹا اسکول میں بلّی بنا بیٹھا رہتا ہے'' (بعد میں یہی بلّی اردو ادب کا اصلی شیر بن گئی اور شیر ہی کی طرح پوری زندگی گزار دی)

مجھے اس بات پر ہمیشہ فخر رہے گا کہ حنفی صاحب جیسا جید عالم، فاضل، صاحبِ طرز شاعر اور ادیب، اردو ادب کی ناقابلِ فراموش اور ناقابلِ نظر انداز شخصیت ہمارے قریب رہی ہے اور ہم اس کے قریب رہے ہیں۔ مسز عاصمہ مظفر صاحبہ نے کہا تھا ''بچوں کے ساتھ وہ بالکل بچہ بن جاتے ہیں۔ بالخصوص عرفی اور صبا تسنیم کے ساتھ انھیں دیکھ کر لگتا ہے جیسے حنفی صاحب کا بچپن لوٹ آیا ہے۔''

حنفی صاحب پر یہ مضمون لکھتے ہوئے میرا بچپن لوٹ آیا ہے اور جس طرح بچے بزرگوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر بیٹھتے ہیں اسی طرح کی حرکتیں اس مضمون میں مجھ سے بھی سرزد ہوئی ہیں۔ محترم حنفی صاحب اور ان کے نہایت چاہنے والے مجھے معاف فرمائیں۔ ○○○

ظفر اقبال ظفرؔ
۱۷۰۔ خیلدار، فتح پور، یوپی، رابطہ نمبر: 7379512431

مظفر حنفی: ایک نابغۂ روزگار شخصیت

پروفیسر مظفر حنفی دنیائے شعر و ادب کی وہ گراں مایہ، عظیم اور برگزیدہ شخصیت ہیں جو کہ اپنے تخلیقی جواہر پاروں کی وجہ سے منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ تخلیقی میدان میں انھوں نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں وہ انھیں زندہ جاوید رکھیں گے۔ تقریباً ستر اسی کتابوں کے مصنف ہیں جو تنقید، تحقیق، شاعری، ڈراما، افسانہ، ترجمہ نگاری، تبصرہ نگاری، بچوں کے ادب پر مشتمل ہیں۔ ہر صنف ادب میں انھوں نے اپنا نام اہمیت کے ساتھ درج کرایا ہے۔

مظفر حنفی کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ انھوں نے جس صنف سخن کو اپنایا اسے اپنی ذہانت وذکاوت کے ساتھ ہی مشق سخن اور ریاضت کو اپنا شعار بنا کر پیش کیا۔ ہم اہل فتح پور کیوں کر نہ فخر کریں کہ ان کا تعلق سرزمین نیاز سے ہے جن کی شہرت وطن سے نکل کر تمام دنیا میں پھیل گئی اور فتح پور کو بلندی نصیب ہوئی۔ ان کا آبائی وطن فتح پور ضرور ہے لیکن ان کی پیدائش یکم اپریل ۱۹۳۶ء کو کھنڈوہ، مدھیہ پردیش میں ہوئی اور وہیں انھوں نے تعلیم وتربیت حاصل کی۔

مظفر حنفی کی معاشرتی اور ادبی زندگی دونوں اس بات کی شاہد ہیں کہ انھوں نے انتہائی جدوجہد کی ہے اور نامساعد حالات میں بھی انھوں نے مردانہ وار مقابلہ کیا ہے جو ان کی کامیابی اور مثبت رویوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔

مظفر حنفی نے اردو ادب میں کئی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کی ہے۔ تنقید نگار، محقق، افسانہ نگار، ڈراما نگار، شاعری، مترجم، انشائیہ نگار، بچوں کی نظمیں وغیرہ ہر صنف ادب پر انھوں نے اپنا نام درج کرایا ہے۔ ان کا تخلیقی عمل کبھی رکا نہیں۔ تبصرہ نگاری میں بھی انھوں نے اپنی بصیرت کے جوہر دکھائے ہیں۔ ’کتاب نما‘ کے سابق مدیر شاہد علی خاں نے تبصروں پر مشتمل ’کتاب نما‘ کے خاص نمبر کا اعلان کیا تو اس نمبر میں سب سے زیادہ کتابوں پر مظفر صاحب کے تبصرے شامل تھے۔ غرض کہ انھوں نے ادب کے جس شعبے

میں قدم رکھا اسے مثالی بنا دیا۔

مکتبہ جامعہ کے ادارے سے ’کتاب نما‘ کے خصوصی شمارے، جائزے جس کو تبصرے کی دوسری کڑی کہا جائے گا، اس کی ترتیب کا کام بھی مظفر حنفی نے انتہائی سلیقہ اور خوب صورتی سے انجام دیا جسے ادبی حلقے میں کافی سراہا گیا۔

مظفر حنفی نے اپنے استاد شاد عارفی کے فن اور شخصیت پر اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ ان پر تحقیقی کام کر کے انھوں نے ان کی شخصیت کو جامعیت عطا کر دی ہے۔ اس تحقیقی کام پر انھیں بھوپال یونیورسٹی نے پی ایچ۔ ڈی کی سند سے نوازا۔ یہ ان کا ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ انھوں نے ان کے فن پر پوری سچائی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا ہے جو کھری تنقید کی مثبت مثال ہے۔

اگر مظفر حنفی کی ادبی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو وہ تقریباً نصف صدی پر محیط ہے جو کہ مختلف اصناف اور موضوعات پر مشتمل ہے۔ ان کی سب سے بڑی پہچان ان کی غزل گوئی ہے جس میں تازگیٔ بیان اور ندرت خیال کی رنگ آمیزی ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری جدید غزل کے نئے افق کا روشن استعارہ ہے جس سے ان کے تخلیقی شعور کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی شاعری پر گہری نظر اور گرفت تھی۔ وہ مطالبات فن سے کما حقہ واقف تھے۔ ان کے لہجے میں جو بلاغت اور رمزیت ہے وہ کم شعرا میں پائی جاتی ہے۔

مظفر حنفی کا ایک مجموعہ ’تیکھی غزلیں‘ کے عنوان سے بھی شائع ہوا ہے جو ان کے کھردرے لہجے اور طنز آمیز رجحان کی نشان دہی کرتا ہے۔ ان کا مخصوص طنزیہ لہجہ ایسا ہے کہ وہ بھیڑ میں بھی پہچانے جا سکتے ہیں۔ انھیں یہ لہجہ اپنے استاد شاد عارفی سے ملا ہے جو ان کی نثر میں بھی پایا جاتا ہے اور ان کے افسانوں میں بھی یہ تیکھا پن موجود ہے۔ مظفر حنفی صاحب کے تقریباً سترہ، اٹھارہ شعری مجموعے منظر عام پر آئے ہیں جو ان کے شعری اظہار کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کی شاعری ان کی زندگی کی عکاس ہے جس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی زندگی اور شاعری میں کوئی تضاد نہیں۔ سفر ان کی شاعری میں بھرپور استعارہ بن کر ابھرا ہے جو کہ کھنڈوہ، بھوپال، سیہور، دہلی اور کولکاتا و دیگر یوپی کے اضلاع تک محیط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی کا سفر انھیں تخلیقی سفر کی شاہراہ پر بھی کامرانی عطا کرتا ہے، جس کا اظہار ان کے اشعار سے نمایاں ہے۔

تھا ہے قافلہ مجھ ایک نقش پا کے سوا — کوئی نہیں ہے مرا ہم سفر ہوا کے سوا
تمام عمر سفر میں رہے تو اچھا ہے — ہوا بگولے کے سر میں رہے تو اچھا ہے
سفر شروع کیا تھا ترے سہارے پر — پھر ایک مرحلہ آیا سہارا توڑنے کا

انھوں نے سفر کو جس استعاراتی ومعنوی سطح پر اپنے اشعار میں پیش کیا ہے، اس سے ان کی تخلیقی قوت اور مشاہدے کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کا درج ذیل شعر اپنی پوری معنویت کے ساتھ قاری کے ذہن کو متاثر کرتا ہے

اور یہ حقیقت ہے کہ ان کے نہ ہونے پر ان کا ادبی سفر ختم نہیں ہوا بلکہ اور رواں دواں ہے۔ حقیقی فن کار اپنے تخلیقی عمل کے باعث ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

بیٹھیں گے اگر نقش قدم، خاک اڑے گی　　مرنے پہ کہاں میرا سفر ختم ہوا ہے

درس وتدریس کے پیشے سے منسلک ہونے کے بعد انھیں کافی عزت وشہرت اور کامرانی ملی۔ کلکتہ یونیورسٹی میں اقبال چیئر کے پروفیسر کی حیثیت سے کئی سال ان کا کلکتہ میں قیام رہا۔ اس دوران میرا کلکتہ جانے کا اتفاق ہوا تو ان سے کئی یادگار ملاقاتیں رہیں۔ وہ بنگال اردو اکادمی کے ممبر بھی تھے۔ اکادمی کی ایک میٹنگ میں وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے تو وہاں ظفر اوگانوی، علقمہ شبلی، انیس رفیع اور دیگر قلم کاروں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ مظفر بھائی انتہائی شفیق اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ انھوں نے ہمیشہ مجھ سے ایک بڑے بھائی کی طرح محبت کی۔ کلکتہ میں ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کو اپنی ہمشیرہ کی علالت کی خبر سن کر اچانک دہلی جانا پڑا تو میں نے بھی اسی ٹرین سے الہ آباد تک رزرویشن کرالیا۔ اس طرح میں نے کلکتہ سے دہلی کا سفر ان کے ساتھ کیا جو انتہائی دلچسپ اور یادگار رہا۔ مختلف موضوعات پر ان سے گفتگو رہی جن سے میری معلومات میں اضافہ ہوا۔ انھوں نے اپنے ابتدائی ادبی سفر میں افسانے بھی لکھے ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے 'دوغنڈے' اور 'اینٹ کا جواب' شائع ہوکر مقبول ہوئے ہیں جن پر اہل قلم حضرات نے تاثرات بھی پیش کیے۔

کسی نہ کسی وسیلے سے میرا دہلی جانا اکثر وبیشتر ہوا ہے۔ اکثر میرا قیام ان کی رہائش گاہ پر بھی ہوا ہے۔ میں ان کی محبت وشفقت کو فراموش نہیں کرسکتا۔ کتنی خوش گوار یادیں آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہیں۔

ایک بار حلیم ڈگری کالج کے مشاعرے میں ان کا ساتھ ہوا۔ یہ مشاعرہ ان کی صدارت میں ہوا تھا۔ میں اسٹیج پر پہنچا تو انھوں نے مجھے اپنے پاس بٹھایا۔ فتح پور جب بھی ان کا آنا ہوتا مجھ سے ضرور ملتے پھر مجھے لے کر اپنے اعزا سے ملنے جاتے۔ جگر اکادمی کان پور کے مشاعرے میں ایک بار آئے۔ اس مشاعرے میں ذکیہ غزل کناڈا سے تشریف لائی تھیں۔ یہ مشاعرہ بھی یادگار اہمیت کا حامل تھا۔ غرض کہ دہلی، کلکتہ، کان پور اور فتح پور میں ہونے والی ڈھیر ساری یادوں سے ذہن معطر ہے، جس کی تفصیل لکھنے کے لیے کافی صفحات درکار ہیں۔

مظفر حنفی کے دو لائق فرزند فیروز مظفر اور پرویز مظفر ان کی ادبی وراثت کے ہونہار وارث ہیں۔ ان کے بڑے بیٹے فیروز مظفر جو پیشے سے انجینئر ہیں لیکن انھوں نے اپنا رشتہ اردو ادب سے جوڑ رکھا ہے۔ ان کی کئی کتابیں مرتب کی حیثیت سے منظر عام پر آئی ہیں جو ان کے ذہنی شعور، ادبی شغف اور سلیقے کی غماز ہیں۔ 'مظفر حنفی: ایک مطالعہ' ان کی اہم تالیف ہے جس میں مظفر حنفی پر لکھے جانے والے اہم قلم کاروں اور دانش وروں کے مضامین شامل ہیں جسے فیروز مظفر نے بڑے سلیقے سے ترتیب دے کر شائع کیا ہے۔ یہ کتاب مظفر صاحب کے فن اور شخصیت پر کام کرنے والوں کے لیے ایک اہم دستاویز کا کام دے گی۔ فیروز مظفر باصلاحیت اور اردو

ادب سے دلچسپی رکھنے والے باشعور قلم کار ہیں۔

ان کے دوسرے بیٹے پرویز مظفر جو برمنگھم لندن میں مقیم ہیں۔ وہ ایک ممتاز شاعر ہیں جن کا شعری مجموعہ 'تھوڑی سی روشنی' کے عنوان سے منظر عام پر آچکا ہے۔ اردو کے تمام اہم ادبی جرائد میں ان کا کلام پابندی سے شائع ہوتا ہے۔ انھوں نے غزل اور نظم دونوں صنف سخن کو اپنی تازگی فکر سے شاداب کیا ہے۔

مظفر حنفی کو قدرت نے ایسا تخلیقی ذہن عطا کیا تھا کہ انھوں نے ہر صنف سخن میں اپنی انفرادیت قائم رکھی مگر ان کی شاعری کا دامن کافی کشادہ ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری سے ہر مکتبۂ فکر کے لوگوں کو متاثر کیا ہے۔ ان کی یہ شاعرانہ انفرادیت ہمیشہ قائم رہی جس سے ان کی شعری عظمت کا احساس ہوتا ہے۔

مظفر حنفی اردو ادب کی ایک ایسی نابغۂ روزگار شخصیت تھے جنھوں نے ہر صنف میں اپنے تخلیقی جوہر دکھائے ہیں اور جدید اردو غزل کو سنوارنے میں انھوں نے اپنی عمر عزیز صرف کردی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شعری اظہار کے وسیلے سے دور سے پہچان لیے جاتے ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ میں ان کا نام سنہرے حروف سے لکھے جانے کا مستحق ہے۔

○○○

''......آپ کی غزلوں نے بھی متاثر کیا۔ لوگ جو بھی کہتے ہیں یا کہتے رہیں انھیں کہنے دیجیے، آپ برابر لکھتے جایئے۔ یہ بھی محض آپ کی بدقسمتی ہے کہ آپ پھوپال میں ہیں، اگر دہلوی، لکھنوی، حیدرآبادی یا لاہوری ہوتے تو لوگ آپ کو سرآنکھوں پر بٹھاتے۔ **(کنھیالعل کپور)**

سلطان آزاد
پٹنہ سٹی، پٹنہ، رابطہ نمبر:8789934730

مظفر حنفی: ایک عبقری شخصیت

ہر انسان اپنی پیدائش کے ساتھ کچھ نہ کچھ ذہنی صلاحتیں لے کر پیدا ہوتا ہے۔ علم اور مناسب تربیت کے باعث ان کو پروان چڑھاتا ہے، اور ان ہی کی بنیاد پر بنی نوع انسان کی بھیڑ میں اپنی الگ شناخت بناتا ہے۔ عظیم شخصیتوں میں ایک بات نمایاں طور پر دیکھنے کو ملتی ہے اور یہ کہ ہر معاملہ میں عام لوگوں سے مختلف واقع ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم یہ کہ ایسی عظیم شخصیتیں خلوت کی دلدادہ ہوتی ہیں۔ ان میں محنت، لگن اور جدو جہد سے بس کارنامے انجام دیئے جانا ان کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ ایسی ہی عظیم شخصیتوں میں ایک پر وقار شخصیت مظفر حنفی کی ہے، جو کثیر الجہت قلم کار اور اپنی علمی کاوشوں کے باعث نہ صرف ممتاز ہیں بلکہ ان کی حیثیت ادبی دنیا میں ایک عبقری شخصیت کے مانند ہے۔

مظفر حنفی کی ادبی زندگی کے مطالعہ اور محاسبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں بڑے نشیب و فراز دیکھے۔ کافی تگ ودو کے بعد کامیابی اور کامرانی حاصل کی۔ انھوں نے ٹیوشن سے لے کر ملازمت بھی کی اور اسی دوران پرائیویٹ امتحان دیتے ہوئے ایم۔ اے اور پھر پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری کی حصولیابی تک اپنا تعلیمی سفر جاری رکھا۔ درس و تدریس کے تحت جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شعبۂ اردو میں بحیثیت استاد مقرر ہوئے۔ ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں کلکتہ یونیورسٹی کی ایما پر اقبال چیئر پر بحیثیت پروفیسر کا عہدہ ملا جسے انھوں نے خوش اسلوبی کے ساتھ نبھایا۔

مظفر حنفی کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے شروع ہوا۔ لیکن شاعری سے انھیں خصوصی رغبت رہی۔ اپنی شاعری میں انھوں نے غزل گوئی کے علاوہ نظم نگاری، حمد و نعت، مرثیہ و سلام، رباعی اور گیت وغیرہ پر بھی طبع آزمائی کی۔ نثر نگاری میں تحقیق و تنقید، ترتیب و تدوین، سفر نامہ اور مکتوب نگاری کے ساتھ سب سے اہم کارنامہ وضاحتی کتابیات ہے۔ وضاحتی کتابیات کے تحت اس کی انیس جلدیں مرتب کیں جسے قومی کونسل دہلی نے شائع کیا۔ ان جلدوں میں کتابوں کی کل تعداد بیس ہزار کے آس پاس ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کافی

محنت اور رابطے کیے۔ جہاں سے اس دوران کتابوں کی خبر ملتی اسے حاصل کرتے رہے۔ خاکسار کو بھی ان دنوں انھوں نے کلکتہ سے ایک پوسٹ کارڈ بھیجا تھا جس میں میری کتاب 'بہار میں اردو طنز و ظرافت' مطبوعہ ۱۹۸۹ء طلب کی تھی۔ میری وہ کتاب 'بہار میں اردو طنز و ظرافت' وضاحتی کتابیات کی بارہویں جلد میں شامل کی گئی۔ یہ کتاب مظفر حنفی کا گراں قدر کارنامہ ہے جس کی حیثیت حوالہ جاتی اور دستاویزی ہے۔ تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ ایک علمی تحفہ ہے۔

مظفر حنفی کے علمی و ادبی کارناموں میں شاعری کے سترہ مجموعے، تین افسانوی مجموعے، تیرہ تحقیق و تنقید سے متعلق کتابیں، تیرہ ترتیب و تدوین سے متعلق کتابیں، چھ ادب اطفال کی کتابیں، اٹھارہ ترجمے اور انیس وضاحتی کتابیات کی فہرستیں ملتی ہیں۔

مظفر حنفی کی شاعری میں ان کی غزلیہ شاعری کی ایک الگ پہچان ہے۔ حالاں کہ انھوں نے اردو شاعری کے کئی ادوار دیکھے، خصوصی طور پر جدیدیت کا عہد بھی دیکھا لیکن غیر ضروری طور پر عام فن کاروں کی طرح خود کو نہیں ڈھالا بلکہ اس سے ہٹ کر شاعری کی۔ یعنی جدیدیت کی پیروی نہ کر کے جدید لب و لہجے کی شاعری کی۔ جدیدیت کے دور میں اپنی جدید شاعری سے متعلق خود فرماتے ہیں:

> ''اپنے آپ کو نیا شاعر کہنے کے باوجود بدقسمتی سے میں ان لوگوں میں سے ہوں جو شاعری میں نئے پن کو بہت کچھ تو سمجھتے ہیں لیکن 'سب کچھ' نہیں۔ میرے نزدیک شاعری میں سب سے بڑی بات خود شاعری ہے (جی چاہے تو آپ اسے شعریت کہہ لیجیے، البتہ میری مراد تغزل سے ہرگز نہیں۔)'' (نقد ریزے از مظفر حنفی، ص ۸۲)

مظفر حنفی اپنی غزلیہ شاعری میں ان اسالیب کو برتتے ہیں جن میں عشق اور زندگی کے تجربات و مشاہدات فرد واحد کی طرح جھلکتے ہیں۔ یہ ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ جدید اور جدیدیت سے متعلق پروفیسر ممتاز حسین کی رائے سامنے رکھ کر مظفر حنفی کے جدید لب و لہجے کی شاعری کو پرکھا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

> ''جدیدیت کے فن کاروں کا ایک نعرہ یہ بھی ہے کہ فن صرف فن کار کے لیے ہوتا ہے نہ کہ غیر کے لیے۔ لیکن عجیب معاملہ یہ ہے کہ اسے مسلط غیروں ہی پر کرتے ہیں۔ جدیدیت کے ان فن کاروں کے برعکس وہ ادیب اور شاعر جو اپنے معاشرے کے لوگوں کو، ساری دنیا کے لوگوں کو اپنے خیالات و جذبات میں شریک کرنا چاہتے ہیں، کسی نہ کسی مقبول عام روایت کا سہارا لیتے ہیں۔'' (ادب، روایت، جدت اور جدیدیت از پروفیسر ممتاز حسین، ص ۱۳)

ان کی غزلیہ شاعری کا ماحصل یہ ہے کہ انھوں نے جدیدیت کے دور میں جدت طرازی پر زور دیا، اور قابل قدر روایت کو بھی اپنایا۔ واردات قلبی کو انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا۔ غزلیہ شاعری کے تحت

ہندی ادب میں شرنگار رس یعنی عشقیہ اشعار کی اہمیت پر بھی ان کا منفرد لب ولہجہ رہا ہے جس میں بہت حد تک ان کے استاد شاد عارفی کا رنگ دکھائی دیتا ہے۔مختصر یہ کہ ان کے یہاں معاملات عشق میں لہجے کی شوخی، بے ساختگی، بے با کی اور انداز گفتگو میں بے تکلفی وغیرہ کو دیکھا جاسکتا ہے۔ملاحظہ ہوں ان کے چند اشعار ۔

پھینکا گیا ہے پھول جہاں سے رقیب پر
تشویش ہے وہ تیرا دریچہ نہ ہو کہیں

آج اک لڑکی نے میرا حافظہ مہکا دیا
رنگ تیرے پیرہن جیسا تھا بو تیری نہ تھی

بات ہی کچھ اور ہے اس کی کمر کے لوچ کی
نرم رَو جھرنا ابھی کچھ اور بل کھائے ذرا

نیم غنودہ جسم ہے یا ہالے میں چاند
جھل مل تاروں میں پلکیں سی جھپکا تا ہے کون

اُگی ہے دوب یہاں بھی ترے بدن جیسی
کھلے ہیں پھول یہاں بھی ترے بدن کی طرح

اردو کی غزلیہ شاعری کے جم غفیر میں اپنی منفرد اور مخصوص آواز، لہجہ اور آہنگ کے ذریعہ اپنی شاخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ملاحظہ ہوں ایسے چند خوب صورت اشعار ۔

مظفر اپنی راہ خود نکالنے کی دھن میں ہے
اگرچہ خود بھی علم ہے اسے ندی کی دھار کا

ٹھپہ لگا ہوا ہے مظفر کے نام کا
اس کا کوئی بھی شعر کہیں سے اٹھا کے دیکھ

راہ عام سے بچ کر شعر کہنے والوں میں
آپ کے مظفر کا نام بھی ضروری ہے

مظفر اپنے اردگرد کے ماحول، فضا، واقعات و حادثات، فسادات اور تاریخی واقعات سے نہ صرف واقف رہے بلکہ انھیں اپنی شاعری میں بھی خوب برتا جسے شہرت ومقبولیت بھی ملی۔اس مناسبت کے چند اشعار دیکھے جاسکتے ہیں۔ملاحظہ ہوں ۔

سوندھی سوندھی سی مہکار آنے لگی
ہل چلا تو زمیں کھلکھلانے لگی

پس ماندگی پہ گاؤں کی ماتم بہت ہے یاں
اے مہربان شہر ہوا کم بہت ہے یاں

پھر بسیں ٹولیوں میں جلادی گئیں
دلہنیں ڈولیوں میں جلادی گئیں

نوجوانوں کے سر در پہ کاٹے گئے
لڑکیاں کھولیوں میں جلادی گئیں

کربلا مجھ کو بلاتی ہے مری راہ نہ روک
ہاتھ آئی ہے بگولے کی عناں جانے دے

میں شہادت کے لیے پھر مضطرب ہوں
خون کی ہر بوند میں ہے زلزلہ سا

مظفر حنفی نے اپنی شاعری میں زیادہ توجہ غزل گوئی پر دی لیکن نظم نگاری بھی کی۔اگرچہ اس کی تعداد بہت کم ہے۔ان کی ایک طویل نظم 'عکس ریز' کے نام سے شائع ہوئی۔اس کی اطلاع ہمیں 'مظفر حنفی: شخصیت اور فکروفن' مصنفہ جاوید اختر سے یوں ملی ہے:

''......جدید طرز فکر اور منفرد اسلوب کی معرکۃ الآرا اور کچھ حد تک متنازعہ طویل نظم 'عکس ریز' کے

ذریعہ مظفر حنفی اپنی جگہ مستحکم کر چکے ہیں۔یہ نظم اس وقت کے معاشرے کے مختلف کرداروں کے ایک سو چوبیس خاکوں پر مشتمل ہے۔ہر خاکہ میں آٹھ مصرعے ہیں۔یہ نظم ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۶ء کے درمیان کی ہے۔۱۹۶۷ء میں اسے کتابی شکل میں کتاب پبلشرز، لکھنؤ نے شائع کیا تھا۔''(مظفر حنفی: شخصیت اور فن، جاوید اختر، ص ۵۴)

جب کہ اس نظم کے بارے میں خود مظفر حنفی لکھتے ہیں:

''اپنی طویل نظم 'عکس ریز' کا میں بطور خاص ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ایک کتاب کی شکل میں شائع ہوچکی ہے اور جسے میں اپنی سب سے اہم نظم سمجھتا ہوں، یہ نظم نونو (۹۔۹) مصرعوں کے ایک سو چوبیس بندوں پر مشتمل ہے۔''

پتہ نہیں فاضل مصنف جاوید اختر نے اس نظمیہ خاکے کو آٹھ مصرعے والا کیوں بتایا۔اس کی تحقیق کیوں نہیں کی۔کیوں کہ فاضل مصنف کتاب نے اپنی اسی کتاب میں مظفر حنفی کے حوالے سے اس پر نظم کے نونو مصرعے کا ذکر کیا ہے جو صفحہ ۵۸ / پر درج ہے:

کاٹ لے گی اک نہ اک دن منھ جلی
گھورتی رہتی ہے مجھ کو چھپکلی

ہائے اس لوٹے میں مینڈک مرگئی
رات، ان سے میں نگوڑی ڈر گئی

نوج، بچے کو میں سمجھی چور تھا
دیکھ تو منا یہ کیسا شور تھا

تھا جو بچھو! بال پن کی نوک ہے
ان کی گھر والی بڑی ڈر پوک ہے

آپ ہی چنگی کے ناکیدار ہیں

مختصر یہ کہ یہ نظمیہ خاکے، مختصر نظم ہے جس میں ہمارے معاشرے کی سچی تصویریں ملتی ہیں جو ہماری سماجی، ثقافتی، اخلاقی اور سیاسی حالات کی ترجمانی کرتا ہے۔

مظفر حنفی کی شاعری میں ادب اطفال پر بھی توجہ رہی ہے۔وہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۲ء تک بچوں کے لیے لکھتے رہے۔اس دوران ان کی تخلیقات مختلف رسائل وجرائد میں شائع بھی ہوئیں۔ان کی شعری کلیات برائے اطفال بعنوان 'بول میری مینا' ۲۰۱۸ء میں شائع ہوچکی ہے۔

مظفر حنفی کی نثر نگاری میں اولیت افسانہ نگاری کو حاصل ہے۔ان کے تین افسانوی مجموعے ہیں 'اینٹ کا جواب'، 'دوغنڈے' اور 'دیدۂ حیراں'۔ان تین مجموعوں میں افسانوں کی تعداد کل چھہتر ہوتی ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے کچھ منی افسانے بھی لکھے ہیں۔ان کے افسانوں میں قصہ گوئی اور بیانیہ انداز ہے۔اس کے علاوہ زندگی کے مختلف موضوعات کی احاطہ بندی بھی ہے۔افسانوں میں جو تخیل کی بلند پروازی اور احساس کی لطافت درکار ہوتی ہے وہ ان کے افسانوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔انھوں نے ادب اطفال کے تحت نثر میں بچوں کے لیے

کہانیاں اور ڈرامے وغیرہ بھی لکھے ہیں جو کتابی شکل میں 'نیلا ہیرا'، 'بندروں کا مشاعرہ' اور 'تاج کی درگت' وغیرہ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ بچوں کے ادب میں ان کی خدمات کے پیش نظر انھیں کئی علاقائی اور قومی اعزاز سے نوازا جا چکا ہے۔

تنقید و تحقیق میں مظفر حنفی کی کئی کتابیں اور مجموعۂ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں خصوصی طور پر 'نقد ریزے'، 'تنقیدی ابعاد'، 'جہات و جستجو'، 'ادبی فیچر اور تقریریں'، 'باتیں ادب کی'، 'لاگ لپیٹ کے بغیر'، 'مضامین تازہ'، 'ہندوستان اردو میں'، 'شاد عارفی'، 'شاد عارفی: شخصیت اور فن'، 'شاد عارفی: فن اور فن کار'، 'غزلیات میر حسن' اور 'تنقیدی نگارشات' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ شاد عارفی: شخصیت اور فن' ان کے پی ایچ۔ ڈی کا تحقیقی مقالہ ہے جسے انھوں نے نو ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ یہ کتاب تحقیق اور تنقید دونوں لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے۔ انھوں نے شاد عارفی پر دوسرا تنقیدی کام 'شاد عارفی: فن اور فن کار' کے نام سے شائع کرایا۔ مظفر حنفی کی تنقید نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر تابش مہدی فرماتے ہیں:

''انھوں نے ہمیشہ آزادانہ طور پر اظہار خیال کی کوشش کی ہے۔ جہاں اور جس کے اندر کوئی خوبی نظر آتی ہے اس کے اعتراف میں بخل سے کام نہیں لیتے بلکہ کھل کر تحسین فرماتے ہیں۔ انھوں نے اگر واضح طور پر ترقی پسندوں کی نعرہ بازی اور سیاسی شاعری پر اعتراض کیے ہیں تو اردو ادب میں ان کے بعض کارناموں کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اس طرح انھوں نے جدیدیت کے روشن اور مثبت پہلوؤں کی تعریف و تحسین کے ساتھ اس کے بعض تاریک گوشوں پر بھی نگاہ ڈالی ہے۔'' (مظفر حنفی کا نظریۂ تنقید از ڈاکٹر تابش مہدی، رسالہ مژگاں، کولکاتہ، ۲۰۰۶ء، ص ۲۱۹)

مظفر حنفی ایک غیر جانب دار ناقد ہیں۔ وہ شخصیت پرستی کے قائل نہیں اور نہ ہی وہ کسی گروپ کے پابند ہیں بلکہ اپنے آزادانہ اظہار خیال اور بے لاگ تنقید و رائے پر قائم رہتے ہیں۔

ترتیب و تدوین کے تحت بھی مظفر حنفی نے کئی کتابیں ترتیب دی ہیں۔ ان میں خصوصی طور پر 'جدیدیت: تجزیہ و تفہیم'، 'جائزے'، 'آزادی کے بعد دہلی میں اردو طنز و مزاح'، 'کلیات ساغر نظامی'، 'روح غزل'، 'پچاس سالہ انتخاب' وغیرہ قابل ذکر ہیں جو اردو ادب میں ان کی گراں قدر خدمات کا مرتبہ رکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں سولہ کتابوں کے ترجمے دوسری زبانوں سے اردو میں اور اردو کی کتابوں کو انگریزی اور ہندی میں پیش کر چکے ہیں۔ ان کی ترجمہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''لفظی ترجمے میں لسانیات کی رو سے ایک متنی اظہار کو دوسرے متبادل اظہار میں منتقل کرنا ہوتا ہے لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ ترجمہ صرف لسانیاتی عمل نہیں، نشریاتی عمل بھی ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ مطابق کو ترجیح ہونی چاہیے کیوں کہ ہر زبان کی صرفی و نحوی خصوصیت علیحدہ ہوتی

ہے۔'' (ترجمہ اور اصطلاح سازی کے مسائل از آل احمد سرور، مشمولہ: ترجمہ کا فن اور روایت مرتبہ: قمر رئیس، ص ۵۴)

ترجمہ نگاری میں مظفر حنفی نے ادبی دیانت داری کا ثبوت دیا اور یہ ثابت کیا ہے کہ انھیں نہ صرف اردو زبان و لسانیات پر عبور ہے بلکہ وہ انگریزی اور دوسری زبانوں کے تقاضوں کو بخوبی پورا کرنے میں ماہر تھے۔ اس سلسلے کے کارناموں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ اپنے نثری کارناموں میں ان کا سفرنامہ 'چل چنبیلی باغ میں' بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے اس سفرنامے میں سیاحت، ادبی محفلوں اور برطانیہ کے ادبی ماحول کی ایسی عکاسی کی گئی ہے جسے پڑھ کر ہر قاری محظوظ ہوتا ہے۔

جہاں تک مکتوب نگاری کی بات ہوتی ہے تو اس ضمن میں کئی اہم شعرا و ادبا کے مکاتیب اور ان کی مکتوب نگاری سامنے آتی ہے۔ خصوصی طور پر غالب کی نثر نگاری میں ان کی مکتوب نگاری کو ایک اہم مقام اور اہمیت حاصل رہی ہے۔ مظفر حنفی نے بھی خطوط لکھے ہیں۔ ان کے خطوط سادگی اور سلاست کے بہترین نمونہ ہیں۔

مظفر حنفی نے صحافتی خدمات بھی انجام دی ہیں۔ ایک رسالہ 'نئے چراغ' کا اجرا ۱۹۵۹ء میں کیا تھا، جس کے سترہ شمارے منظر عام پر آئے۔ اتنی قلیل مدت میں بھی انھوں نے اس رسالہ کو ایک پہچان دی۔ اس کی مقبولیت میں بڑے قلم کاروں کی قلمی معاونت شامل تھی۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ بلاشبہہ اردو کی ادبی دنیا میں مظفر حنفی ایک ہمہ جہت، ہمہ پہلو، ذہین اور عبقری شخصیت کے مالک تھے جن کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف ہمیشہ کیا جاتا رہے گا۔

OOO

منابع و مآخذ:

۱۔ نقد ریزے از ڈاکٹر مظفر حنفی
۲۔ ادب، روایت، جدت اور جدیدیت از پروفیسر ممتاز حسین
۳۔ مظفر حنفی: شخصیت اور فکر و فن از جاوید اختر
۴۔ مظفر حنفی کا نظریۂ تنقید از ڈاکٹر تابش مہدی
۵۔ ترجمہ کا فن اور روایت مرتبہ قمر رئیس، مضمون: ترجمہ اور اصطلاح سازی کے مسائل از پروفیسر آل احمد سرور

OOO

ڈاکٹر وسیم افتخار انصاری
صدر شعبۂ اردو، کملا راجا گرلس گورنمنٹ پی۔ جی کالج لشکر، کامپو، گوالیار، رابطہ نمبر: 9827333039

پروفیسر مظفر حنفی کی شخصیت اور خدمات پر ایک نظر

نماڑ کی سرزمین سے مظفر حنفی ایک قابلِ قدر نام ہے۔ ان کی شخصیت اور ادبی قد، ایوانِ اردو میں محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ نماڑ کی سرزمین، ان پر فخر کرتی ہے۔ آج مظفر حنفی علم و شہرت کے جس عظیم مقام پر فائز ہیں، ان کی ابتدائی زندگی، نت نئے مصائب و آلام کے پہاڑ سر کرنے میں، ایک عام آدمی ہی کی طرح گزری ہے۔ ان کی ذات اور شخصیت خود ان کی ذاتی کوششوں کے نتائج کا ثمرہ ہے۔ مظفر حنفی کی شخصیت ادب کے کئی خانوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ان کے اوپر طویل گفتگو بھی ہو چکی ہے۔ مشتے از خروارے، ان کی شخصیت اور ادبی خدمات کا مختصراً تذکرہ ذیل میں کرنے کی سعی کی جا رہی ہے۔

یکم اپریل ۱۹۳۶ء (۱) کو صوبہ مدھیہ پردیش کے خطۂ نماڑ، کھنڈوہ میں، عبدالقدوس صدیقی کے یہاں آنکھیں کھولیں۔ اس وقت ان کے والد تدریسی ملازمت کے سلسلے سے کھنڈوہ میں سکونت اختیار کیے ہوئے تھے۔ اس لیے زندگی کا ابتدائی زمانہ یہیں گزرا۔ دوسری جماعت مین اردو اسکول کھنڈوہ سے پاس کرنے کے بعد اپنے ننہال ایریاں ضلع فتح پور یو۔ پی، چلے گئے اور وہاں سے تیسری، چوتھی جماعت میں پورے پرگنے میں اول آئے۔ بعد ازاں اپنے آبائی مکان ہسوہ فتح پور یو۔ پی، میں سکونت اختیار کر کے پانچویں پاس کی۔ تقریباً ۱۰ رسال کی عمر میں کھنڈوہ واپس آئے۔ اینگلو ورنا کیولر مڈل اسکول کھنڈوہ سے ساتویں، آٹھویں کی اور سبھاش ہائی اسکول کھنڈوہ سے نویں، دسویں اور گیارہویں جماعت پاس کی۔ ۱۹۵۲ء (۲) میں سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ ناگ پور سے ہائر سیکنڈری سرٹیفکیٹ امتحان کے ساتھ جامعہ اردو علی گڑھ کے ادیب ماہر میں بھی درجہ اول سے کامیاب ہو گئے۔

کھنڈوہ میں اپنے تایا زاد بھائی سیٹھ مظہر الدین کے تجارتی کاروبار میں لگ گئے، لیکن ان کے والد کو تعلیم چھوڑ کر کاروبار سنبھالنا منظور نہیں تھا، اس لیے وہ ہسوہ چلے گئے۔ اسی اثنا ۱۹۵۳ء (۳) میں ایئر فورس کے امتحان میں کامیاب ہوئے، کان پور کی خاک چھانی، ٹیوشن پڑھائی لیکن فزیکل فٹنیس کے سبب انھیں تقرری نہیں مل پائی۔ آگے بڑھنے کی چاہ نے نئی راہ دکھائی۔ ۱۹۵۵ء (۴) میں بھوپال پہنچے، اسسٹنٹ ٹیچر کے طور پر منتخب

ہو کر لاڑکوئی، تحصیل نصر اللہ گنج، ضلع سیہور میں تقرری ہوئی۔ قیام کے دوران انھوں نے جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب کامل اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایف۔ اے (انگریزی) پرائیویٹ امتحان پاس کیے۔ ۱۹۵۸ء میں جب ان کا تبادلہ دور دراز مقام 'پیپلیا خاص' میں کر دیا گیا، جہاں پہنچنے کے ذرائع بھی نہیں تھے، پاپیادہ کئی میل کی مسافت طے کرنے کے بعد اس قصبے میں پہنچنا پڑتا تھا۔ مجبوراً انھوں نے استعفیٰ دے دیا اور ۱۹۵۸ء میں (تقریباً ۲۲ رسال کی عمر میں) کھنڈوہ تشریف لے آئے۔

اس بار کھنڈوہ پہنچنے کے بعد انھوں نے اپنے تایا زاد بھائی سیٹھ مظہر الدین کے تجارتی اور کاروباری بار کو اٹھاتے ہوئے ادبی سرگرمیاں بھی مزید تیز کر دیں۔ اپنے ہم نوا، ساتھیوں قاضی حسن رضاؔ، حسن بشیرؔ، قاضی انصارؔ، علی احمد، منشی جلیسؔ، وغیرہ کے ساتھ مل کر کھنڈوہ میں انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کی، ۱۹۵۸ء میں نیشنل اردو لائبریری کی داغ بیل ڈالی اور ایک اردو میڈیم ہائی اسکول کھولنے میں کامیاب ہو گئے۔ ادبی سرگرمیوں کو مزید موثر بنانے اور اپنی آواز کو دور دراز کے مقامات تک پہنچانے کی خاطر جنوری ۱۹۵۹ء میں ماہ نامہ 'نئے چراغ' (۵) کا اجرا کیا۔ اسی سال ۹ رنومبر ۱۹۵۹ء (۶) کو کڑہ مانک پور، الہ آباد کے سید محمد احمد کاظمی کی اکلوتی دختر عاصمہ خاتون سے ان کا نکاح کر دیا گیا۔ شادی کے بعد اہل و عیال کی کفالت کے لیے مارچ ۱۹۶۰ء (۷) میں محکمۂ جنگلات ایم۔ پی میں بحیثیت کلرک ملازمت کر لی اور سیہور میں تقرری ہوئی۔ سیہور قیام کے دوران علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔ اے پرائیویٹ پاس کیا۔ ۱۹۶۳ء میں ان کا تبادلہ سیہور سے بھوپال کر دیا گیا۔ بھوپال کی ادبی شخصیتوں سے شناسائی ہوئی لیکن ۱۹۶۵ء میں پھر انھیں بھوپال سے سیہور تبادلہ کی وجہ سے منتقل ہونا پڑا۔ اسی سال ۴ رجون ۱۹۶۵ء کو ہسوہ فتح پور میں والد کا سایۂ شفقت اور تقریباً ۸ رماہ بعد ۲۸ رمارچ ۱۹۶۶ء کو ان کے سر سے ردائے مادر بھی اٹھ گئی (۸) حالات کی ستم ظریفیاں مسلسل ان کا پیچھا کرتی رہیں لیکن عزائم کے تیز قدموں نے انھیں ہر موقع پر مات دی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۶۸ء میں سیہور کے قریب قصبہ 'بیل کھیڑا' میں زمین خرید کر کاشتکاری کا سلسلہ شروع کیا۔ اس وقت تک مظفر حنفی چار بچوں کے باپ بھی بن چکے تھے بلکہ بڑا بیٹا اسکول (دوسری جماعت میں) بھی جانے لگا تھا لیکن اب بھی ان کے دل میں تحصیل علم کی شمع روشن تھی۔ ۱۹۶۹ء میں گورنمنٹ کالج سیہور میں ایل۔ ایل۔ بی، اور سیفیہ کالج بھوپال میں ایم۔ اے اردو میں داخلہ لیا اور ۱۹۷۱ء میں ایم۔ اے اردو میں (برکت اللہ یونیورسٹی میں) پہلی پوزیشن اور ۱۹۷۲ء میں سیہور کالج کے ۵۴ رطلبا میں تنہا کامیاب ہوئے۔

۱۹۷۴ء میں ڈاکٹر عبدالقوی دسنوی کی نگرانی میں تحریر کردہ مقالہ 'شادؔ عارفی: شخصیت اور فن' پر انھیں بھوپال یونیورسٹی نے پی ایچ۔ ڈی کی سند تفویض کی۔ (۹) اسی سال نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ دہلی میں اسسٹنٹ پروڈکشن افسر (اردو) کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا۔ اس عہدے پر فائز رہتے ہوئے

انھوں نے ایک اہم کارنامہ یہ انجام دیا کہ این۔سی۔ای۔آر۔ٹی کی اردو مطبوعات کی قیمتیں جو عموماً دوسری زبانوں سے زیادہ تھیں، اپنی ذاتی کوششوں اور جرأت مندانہ جدوجہد کے نتیجے میں اردو، ہندی، انگریزی کتابوں کو یکساں قیمت پر شائع کرنے کا اہم فیصلہ لیا، اس طرح اردو کے قارئین اور طلبا پر ان کا یہ بڑا احسان ہے۔

انسانی زندگی میں ۴۰ ؍سال کی عمر کے بعد انسان کی صلاحیتیں اور پوشیدہ جواہر کھل کر باہر آنے لگتے ہیں اور انسان کے ذریعے سے بڑے بڑے کارنامے انجام دینے کی یہی عمر ہوتی ہے۔ڈاکٹر مظفر حنفی کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔تقریباً ۴۰ ؍سال کی عمر ۱۲ ؍فروری ۱۹۷۶ء کو بحیثیت اردو لیکچرار جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شعبۂ اردو میں تقرری ملی اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ساتھ ’وضاحتی کتابیات‘ جیسے بڑے پروجیکٹ کا آغاز کیا۔ترقی کرتے ہوئے لیکچرار سے فروری ۱۹۸۴ء میں جامعہ کے شعبۂ اردو میں ’ریڈر‘ ہو گئے۔ ۱۹۸۸ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ سینٹر سے ان کی نگرانی میں تحریر کردہ تحقیقی مقالوں پر شمع افروز زیدی اور خوشحال زیدی کو پی ایچ۔ڈی کی اسناد تفویض ہوئیں۔آگے چل کر اسی جامعہ سے خالد محمود اور ممتاز الحق کو ڈاکٹریٹ عطا ہوئی۔(۱۰)

ستمبر ۱۹۸۹ء میں کلکتہ یونیورسٹی نے انھیں ’اقبال چیئر‘ پروفیسر کی حیثیت سے فائز کیا۔کل ہند انجمن اساتذہ اردو، جامعاتِ ہند کی پریسیڈیم کے رکن اور آگے چل کر نائب صدر بنے۔ ۱۹۹۱ء میں مغربی بنگال اردو اکادمی کی جنرل کونسل نیز گورننگ باڈی کے ممبر اور آل انڈیا ریڈیو کلکتہ کے مشیر رہے۔(۱۱) ۱۹۹۶ء میں رسمی ریٹائرمنٹ کے بعد کلکتہ یونیورسٹی سے پانچ برس کی ملازمت میں توسیع (Employment_Re) ہوئی۔ ۱۹۹۷ء میں لندن یونیورسٹی انگلینڈ نے اعزاز دیا اور ادارۂ ’صدا‘ لندن نے ماہر اقبالیات لوح طلائی بھی پیش کی۔ ۱۹۹۸ء میں جوشؔ (ملیح آبادی) سمینار (لندن) کے سیشن کی صدارت کی۔یوں تو انھوں نے کئی سمیناروں کی صدارت کی اور متعدد بار برطانیہ، سعودی عرب، پاکستان اور جرمنی وغیرہ ممالک کے سفر بھی کر چکے ہیں۔ ۲۰۰۱ء سے دوبارہ دہلی چلے گئے اور وہیں تادم آخر اپنی ادبی سرگرمیوں میں مصروفِ عمل رہے۔

ان کی مختلف النوع ادبی خدمات، تصانیف وتالیفات پر انھیں ملک کے مختلف اداروں، انجمنوں اور اکادمیوں نے تقریباً پچاس (۵۰) اعزازات سے سرفراز کیا، جس کی ایک فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

اعزازاتِ مظفر حنفی:

۱۔افسانوی مجموعہ ’دوغنڈے‘، اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۶۹ء
۲۔غزلوں کا مجموعہ ’صریر خامہ‘، اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۷۳ء
۳۔شعری مجموعہ ’دیپک راگ‘، اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۷۴ء
۴۔تحقیق ’شاد عارفی: شخصیت وفن‘، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۷۸ء

۵۔کلام کا انتخاب ’یم بہ یم‘، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۷۹ء
۶۔کلام کا انتخاب ’یم بہ یم‘، آندھرا پردیش اردو اکادمی، ۱۹۷۹ء
۷۔’وضاحتی کتابیات‘ (جلد اول)، بہار اردو اکادمی، پٹنہ، ۱۹۸۰ء
۸۔شعری مجموعہ ’طلسمِ حرف‘، مغربی بنگال اردو اکادمی، کلکتہ، ۱۹۸۰ء
۹۔غزلوں کا مجموعہ ’کھل جا سم سم‘، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۱ء
۱۰۔غزلوں کا مجموعہ ’کھل جا سم سم‘، کلچرل اکادمی، گیا، (بہار) ۱۹۸۱ء
۱۱۔غزلوں کا مجموعہ ’کھل جا سم سم‘، کل ہند میرا اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۱ء
۱۲۔بیداری (ترجمہ)، مغربی بنگال اردو اکادمی، ۱۹۸۱ء
۱۳۔گلاک مجمع الجزائر (ترجمہ)، بہار اردو اکادمی، پٹنہ، ۱۹۸۱ء
۱۴۔تنقیدی وتحقیقی مضامین کا مجموعہ ’جہات وجستجو‘، مغربی بنگال اردو اکادمی، ۱۹۸۲ء
۱۵۔بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ ’نیلا ہیرا‘، دہلی اردو اکادمی، ۱۹۸۳ء
۱۶۔بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ ’نیلا ہیرا‘، بہار اردو اکادمی، پٹنہ، ۱۹۸۳ء
۱۷۔بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ ’نیلا ہیرا‘، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء
۱۸۔غالب ایوارڈ، کلچرل سوسائٹی، بنگلور ۱۹۸۳ء
۱۹۔پریم چند ایوارڈ، کلچرل سوسائٹی، بنگلور، ۱۹۸۳ء
۲۰۔وضاحتی کتابیات جلد دوم، مغربی بنگال اردو اکادمی، ۱۹۸۴ء
۲۱۔قومی ایوارڈ، نیشنل کونسل آف چائلڈ ایجوکیشن، دہلی، ۱۹۸۵ء
۲۲۔مجموعہ کلام ’پردۂ سخن کا‘ (سال کی بہترین کتاب کا انعام)، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۶ء
۲۳۔کل ہند پرویز شاہدی ایوارڈ (مجموعی خدمات کے اعتراف میں)، مغربی بنگال اردو اکادمی، ۱۹۸۸ء
۲۴۔آزادی کے بعد دہلی میں اردو طنز ومزاح (مرتب)، مغربی بنگال اردو اکادمی، ۱۹۹۰ء
۲۵۔حسرتؔ موہانی (تحقیق)، دہلی اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۰ء
۲۶۔باتیں ادب کی (تنقیدی مضامین)، بہار اردو اکادمی، پٹنہ، ۱۹۹۴ء
۲۷۔’وضاحتی کتابیات‘ جلد سوم، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۹۶ء
۲۸۔محمد حسین آزاد (تحقیق)، مغربی بنگال اردو اکادمی، ۱۹۹۶ء
۲۹۔اسپیشل ایوارڈ، انٹرنیشنل فرینڈشپ اینڈ فریٹرنٹی ایوارڈ
۳۰۔مجموعہ کلام ’یا اخی‘، انٹرنیشنل فرینڈشپ اینڈ فریٹرنٹی ایوارڈ، ۱۹۹۷ء

۳۱۔ ماہر اقبالیات لوحِ طلائی، ادارۂ 'صدا'، لندن (انگلینڈ)، ۱۹۹۷ء
۳۲۔ اسپیشل ایوارڈ، انڈو برما پیٹرولیم لمیٹڈ، ۱۹۹۷ء
۳۳۔ فخر الدین علی احمد ایوارڈ (برائے تحقیق وتنقید)، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ۱۹۹۸ء
۳۴۔ چل چنبیلی باغ میں (سفر نامہ انگلینڈ)، مغربی بنگال اردو اکادمی، ۱۹۹۸ء
۳۵۔ چل چنبیلی باغ میں (سفر نامہ انگلینڈ)، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۹۹ء
۳۶۔ کلیاتِ ساغر نظامی، (مرتبہ) مغربی بنگال اردو اکادمی، ۱۹۹۹ء
۳۷۔ اعزاز (برائے ادبی خدمات)، بھارتیہ بھاشا پریشد سمان، کلکتہ، ۱۹۹۹ء
۳۸۔ شاد عارفی: فن اور فن کار (تنقید)، دہلی اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۱ء
۳۹۔ حسرت موہانی (تحقیق)، دہلی اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۳ء
۴۰۔ ہندوستان اردو میں (مضامین)، دہلی اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۷ء
۴۱۔ 'نشانِ جنگ' اعزاز، کراچی، پاکستان
۴۲۔ افتخار میر ایوارڈ لکھنؤ
۴۳۔ سراج میر خاں سحر بھوپال ایوارڈ، ایم۔ پی، اردو اکادمی، بھوپال
۴۴۔ ملک حیدر ایوارڈ، کلچرل اکادمی، گیا (بہار)
۴۵۔ نباضِ ادب ایوارڈ، ایم۔ سی میموریل کمیٹی، کھنڈوہ
۴۶۔ نیشنل ایوارڈ (برائے شاعری)، دہلی اردو اکادمی، دہلی
۴۷۔ وضاحتی کتابیات، دہلی اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۵ء (۱۲)

ڈاکٹر مظفر حنفی نے اپنے ادبی سفر کا آغاز غالباً نثر نگاری سے کیا۔ اس تعلق سے خود انھوں نے اپنے اصل نام 'محمد ابو المظفر' سے ماہ نامہ 'صبحِ نو' میں ایک مضمون 'مظفر حنفی ہسوی میری نظر میں' تحریر کیا ہے، لکھتے ہیں:

''۵۰ء کے اس دن کو میں آج بھی بد دعائیں دیتا ہوں۔ سالانہ امتحانات قریب تھے۔ کورس کی کتابوں سے اکتا کر میں دماغ تازہ کرنے کی نیت سے ایک اردو رسالہ اُلٹ پلٹ رہا تھا کہ والد صاحب قبلہ نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ بغیر کسی باز پرس کے خاصی مرمت کی گئی کہ امتحان کی تیاری نہ کرتے ہوئے یہ بے کار سی چیز کیوں پڑھ رہے ہو، اور اگر ادب سے اتنا ہی ذوق ہے تو کیوں نہیں اپنے اندر وہ صلاحیت پیدا کرتا کہ میری (مظفر حنفی کی) تحریر کردہ چیزیں دوسرے پڑھیں۔ بڑے میاں تو اپنے ہاتھ کی کھجلی مٹا کر اور لیکچر پلا کر اپنے کام سے لگ گئے اور ان کے روانہ ہونے کے فوراً بعد ہی اس شخص (مظفر حنفی) نے مجھے دھر دبایا۔ چنانچہ اس سال میں امتحان

کی طرف کوئی توجہ نہ دے سکا، اور یہ (مظفر حنفی) حضرت بچوں کے لیے کہانیاں اور نظمیں وغیرہ تخلیق کر کر کے مجھ سے نقل کرواتے رہے۔'' (۱۳)

اسی بات کو انھوں نے 'نقد ریزے' میں بھی تحریر کیا ہے:

''ایک بار والد صاحب نے رات کو بارہ ایک بجے 'طلسمِ ہوشربا' پڑھتے دیکھ کر مجھے خاصا طویل لیکچر پلایا جس کا لبِ لباب یہ تھا کہ مجھے اپنی تعلیم کی طرف توجہ دینی چاہیے تاکہ آگے چل کر اس لائق ہو جاؤں کہ دوسروں کی کتابیں پڑھنے کی جگہ خود دوسروں کے لیے کتابیں لکھ سکوں۔ ناپختہ ذہن پر بات کا الٹا اثر ہوا اور میں فی الفور دوسروں کے لیے لکھنے پر تل گیا۔ بچوں کے لیے کہانیاں اور نظمیں، بڑوں کے لیے افسانے دھڑا دھڑ ڈھلنے لگے۔ 'کھلونا'، 'شمع'، 'نکہت'، 'بیسوی صدی' اور اس قبیل کے دوسرے رسائل میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔'' (۱۴)

انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز بچوں کے ادب سے کیا۔ پھر اس کے بعد انھوں نے ادب کے دوسرے میدان میں طبع آزمائی کی۔ جیسا کہ 'نقد ریزے' میں انھوں نے لکھا ہے:

''میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۱ر سال کی عمر میں ۱۹۴۷ء کے آس پاس کبھی کیا تھا۔ ۵۲ء تک بچوں کے لیے لکھتا رہا۔'' (۱۵)

ادبِ اطفال میں ان کی پہلی تخلیقی کتاب 'بندروں کا مشاعرہ' ہے، جس پر ڈاکٹر محبوب راہی نے یوں تبصرہ کیا ہے:

''بچوں کے لیے مظفر حنفی کا یہ طویل فنطاسیہ مکتبہ 'کلیاں' لکھنؤ کے زیرِ اہتمام ۱۹۵۴ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ اس اعتبار سے کتابی شکل میں منظرِ عام پر آنے والی یہ ان کی پہلی تخلیق ہے۔ آسان اور سلیس زبان، دلچسپ فقرے اور لطیف مزاحیہ اشعار کے ذریعے موجودہ مشاعروں کا بے حد کامیاب چربہ اس کہانی میں اتارا گیا ہے۔ مظفر حنفی نے پہلی سطر سے اختتام تک کہانی کو پر لطف مزاحیہ بنانے کا پورا پورا التزام کیا ہے...... بندروں کے مشاعرے کی رعایت سے اس کے کرداروں کے نام اور تخلص بے حد دلچسپ ہیں۔ بندروں کے اوصاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک خاص معنویت کے ساتھ انھیں اسمِ بامسمیٰ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔'' (۱۶)

بچوں کے ادب پر 'بندروں کا مشاعرہ' کے ایک طویل عرصے بعد ان کی دوسری کتاب 'نیلا ہیرا' مکتبہ پیامِ تعلیم دہلی سے ۱۹۸۳ء (۱۷) کو شائع ہوئی۔ حال ہی میں 'شیر آیا' اور 'حلوہ چور' بھی شائع ہو چکی ہیں۔

'نیلا ہیرا' کا تعارف ڈاکٹر خوشحال زیدی نے اس طرح کروایا ہے:

''نیلا ہیرا ان مقبول کہانیوں اور ڈراموں کا مجموعہ ہے جو موصوف نے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۶ء کے

دوران قلم بند کی تھیں۔اس میں بارہ کہانیاں اور دو یک بابی ڈرامے ہیں جو کتابی شکل میں چھپنے سے قبل بچوں کے مشہور و مقبول رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔‘‘(۱۸)

اس کتاب پر محمد یوسف پاپا نے یوں تبصرہ کیا ہے:

’’یہ کہانیاں دیو اور پریوں کی کہانیوں سے ہٹ کر ہیں۔ان کے کردار ہماری دنیا کے جیتے جاگتے کردار نظر آتے ہیں۔ان کو ہم اپنے اردگرد محسوس کر سکتے ہیں۔کہانیاں دلچسپ ہیں۔ان کو پڑھنے میں برابر دلچسپی قائم رہتی ہے۔جب تک کتاب ختم نہ ہو جائے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔اس کتاب کو پڑھ کر بچے لطف اندوز بھی ہوں گے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی محسوس کریں گے کہ یہ کہانیاں خود ان کی اپنی ہیں۔‘‘(۱۹)

ادب اطفال کے علاوہ نثری ادب میں ان کا دوسرا میدان ترجمہ نگاری رہا ہے۔وہ اس میدان میں کامیاب مترجم کی حیثیت سے مقبول ہیں۔اس حیثیت سے بھی ان کے کام کافی طویل اور اہمیت کے حامل ہیں۔اس سلسلے سے انھوں نے مختلف زبانوں کے افسانے ، ڈرامے ، سوانح ، جاسوسی ناول ، غیر جاسوسی ناول وغیرہ ترجمہ کر کے کتابی شکل میں شائع کیے ہیں۔اس کی فہرست درج کی جارہی ہے:

(۱)چوروں کا قاتل، انگریزی ناول سے ترجمہ، مانسرور پبلشنگ اکادمی، الہ آباد، ۱۹۵۴ء
(۲) پراسرار قاتل، ناول نگار، ارل اسٹانگلے گارڈنر، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۵۵ء
(۳)دوہری سازش، ناول نگار، اگاتھا کرسٹی، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۵۶ء
(۴)شرلاک ہومز ہندوستان میں، ناول نگار، کارٹن ڈکسن، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۵۶ء
(۵) تارِ عنکبوت، انگریزی ناول سے ترجمہ، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۵۶ء
(۶) گلاک مجمع الجزائر (دفتر اول)، انگریزی ناول سے ترجمہ، نیشنل اکادمی، دہلی، ۱۹۷۵ء
(۷)سخاروف نے کہا (انگریزی)، نیشنل اکادمی، دہلی، ۱۹۷۶ء
(۸) گجراتی کے یک بابی ڈرامے، ایم۔ایم۔راول، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، دہلی، ۱۹۷۷ء
(۹) گلاک مجمع الجزائر (دفتر دوم)، نیشنل اکادمی، دہلی، ۱۹۷۸ء
(۱۰)اڑیا افسانے، پٹھانی پٹ ناٹک، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، دہلی، ۱۹۷۸ء
(۱۱) بیداری، بنگالی ناول نگار، ستی ناتھ بھادوڑی، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، دہلی، ۱۹۸۰ء
(۱۲) گلاک مجمع الجزائر (دفتر سوم)، نیشنل اکادمی، دہلی، ۱۹۸۱ء
(۱۳) بھارتیندو ہریش چندر، سوانح نگار مدن گوپال، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۱۹۸۴ء
(۱۴)بنکم چندر چٹرجی، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۱۹۸۸ء(۲۰)

ان کی ترجمہ نگاری پر ڈاکٹر محبوب راہیؔ نے جامع تبصرہ کیا ہے۔لکھتے ہیں کہ:

’’ترجمہ کے میدان میں بھی مظفر حنفی کے کارناموں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے......مظفر حنفی نے دنیا کے کچھ نامور مصنفین کے چند شاہکاروں کو اردو کا ملبوس عطا کر کے ہمارے ادبی خزانے میں اضافہ کیا ہے۔مختلف اور متضاد نظریات کے حامل روسی مصنفین مثلاً میکسیم گورکی، چیخوف، الیگزینڈر رسونسٹن وغیرہ کی مشہور زمانہ تصانیف کو مظفر حنفی نے کچھ اس خوبی سے اردو میں منتقل کیا ہے کہ دونوں زبانوں کے مابین تاریخی، جغرافیائی، سماجی، معاشی اور سیاسی ابعاد کے باوجود زبان و بیان اور مزاج و ماحول کے اعتبار سے یہ اردو کی تخلیقات معلوم ہوتی ہیں......مظفر حنفی نے گجراتی، بنگالی اور اڑیا زبان کے شاہکار ادب پاروں کو اردو میں منتقل کر کے ان علاقائی ادب پاروں کے توسط سے اردو والوں کو ان علاقوں کی تہذیب، طرزِ معاشرت، رسوم و رواج اور رہن سہن کے طور طریق سے روشناس کرایا۔‘‘(۲۱)

ڈاکٹر مظفر حنفی نے اپنے تخلیقی سفر کے ابتدائی دور میں بحیثیت افسانہ نگار، خاصی مقبولیت حاصل کی ، تقریباً ۱۰ر سال کی مدت میں انھوں نے سینکڑوں افسانے تخلیق کیے اور تین افسانوی مجموعے ’اینٹ کا جواب‘ (۲۲) ’دو غنڈے‘ (۲۳)، ’دیدۂ حیراں‘ (۲۴) منظر عام پر آئے۔ پہلے افسانوی مجموعے ’اینٹ کا جواب‘ پر فراقؔ گورکھپوری نے پیش لفظ تحریر کیا ہے۔اس میں وہ لکھتے ہیں:

’’ان کے افسانوں میں زندگی کے کئی پہلوؤں کی عکاسی ہے بیان نہایت سلجھا ہوا ہے۔ان میں نیا پن ہے۔ان کا انداز دل کش ہے۔مکالمے فطری ہیں اور پلاٹ میں جدت ہے۔‘‘(۲۵)

ان کے دوسرے افسانوی مجموعے پر اردو کے مایہ ناز افسانہ نگار کرشن چندر نے تعارف تحریر کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

’’یہ واقعی مختصر افسانے ہیں۔کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ کہنے کی کوشش کی گئی ہے...... مظفر حنفی کو بات کہنے کا ڈھب آتا ہے اور افسانے کی تخلیق کے سارے لوازم معلوم ہیں۔کون سی بات قاری سے کس وقت کہنا ہوگی، کون سی بات چھپا کر رکھنا ہوگی اور صرف آخری سطر میں مٹھی کھول دینا ہوگی......ان افسانوں کے کردار مثبت نہیں ہیں، مثالی بھی نہیں ہیں۔محض منفی بھی نہیں ہیں، گوناگوں اضداد کا مجموعہ ہیں جیسے کہ انسان ہوتے ہیں۔‘‘(۲۶)

کنہیا لال کپور نے ان کے تیسرے افسانوی مجموعے ’دیدۂ حیراں‘ کے پیش لفظ میں لکھا ہے:

’’عام طور پر شاعر، افسانہ نویس نہیں ہوتے اور افسانہ نویس (چاہے وہ کبھی کبھار نثر میں شاعری کرتے ہیں) شاعر نہیں ہوتے......مظفر حنفی کا کلام دیکھا تھا۔اس کے افسانے پڑھ کر میری

نظروں میں اس کی توقیر دو چند ہوگئی۔ میں نے سوچا ادبی مجاہد کی نیام میں دو تلواریں ہیں، اور دونوں کا وار کاری ثابت ہوتا ہے......بحیثیت افسانہ نگار مظفر حنفی کو اپنی سماجی ذمہ داری کا بھرپور احساس ہے۔ وہ پرانی قدروں پر نہایت لطیف اور چابک دست انداز میں طنز کرنے کے فن میں مشاق ہے......ان کے افسانے بڑے جاندار ہیں اور ان کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ بادی النظر میں وہ سہل ممتنع کے نمونے نظر آتے ہیں لیکن اس سادگی میں غضب کی پرکاری ہے۔'' (۲۷)

ترتیب و تدوین کے سلسلے سے بھی ڈاکٹر مظفر حنفی کے کام کافی وسیع، وقیع اور اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی مرتب و مدون کردہ کتابوں کو ادبی حلقوں میں وقار حاصل ہے۔ خصوصاً شاد عارفی کے تعلق سے ان کی مرتب کردہ ۶ رکتابیں تو اردو ادب میں دستاویزی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس سلسلے میں انھیں جن خارزار، دشوار گزار، تلاش وتحقیق کے مراحل سے گزرنا پڑا، جس جہد مسلسل اور عرق ریز کوشش و کاوش کے بعد انھوں نے کتابیں شائع کیں، وہ قابلِ رشک، لائق ستائش اور قابلِ تقلید ہے۔

اس سلسلے کی پہلی کڑی ماہ نامہ 'نئے چراغ' کھنڈوہ کی ادارت ہے، جس کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا اور اٹھارہ مہینے میں کل ۱۷ رشمارے نکلنے کے بعد یہ سلسلۂ اشاعت منقطع ہوگیا تھا۔ اس رسالے کے تقریباً ۱۴ رشمارے ڈاکٹر مظفر حنفی کی ادارت میں شائع ہوئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس رسالے کی مدت اشاعت مختصر رہی لیکن تھوڑے سے عرصے میں ہی اس نے ملک گیر شہرت حاصل کر لی تھی۔ جس کا اندازہ رسالے میں شائع ہونے والے فن کاروں کے نام سے کیا جا سکتا ہے، مثلاً نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری، احمد ندیم قاسمی، احتشام حسین، قاضی عبدالودود، شاد عارفی، خلیل الرحمن اعظمی، کوثر چاندپوری، آل احمد سرور، عمیق حنفی، شکیل بدایونی، بشیر بدر، معین احسن جذبی، نثار احمد فاروقی، صالحہ عابد حسین، کرشن چندر وغیرہ ہیں۔ ان کی مرتب و مدون کردہ کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جو اس طرح ہیں:

۱۔ ایک تھا شاعر (مختلف ناقدین کے شاد عارفی پر مضامین، شاد عارفی کے مکاتیب وغیرہ) (۲۸)
۲۔ نثر و غزل دستہ (کلام اور مضامین شاد عارفی) (۲۹)
۳۔ شوخیِ تحریر (شاد عارفی کی نظموں کا انتخاب) (۳۰)
۴۔ شاد عارفی کی غزلیں (۳۱)
۵۔ کلیات شاد عارفی (۳۲)
۶۔ جدیدیت، تجزیہ و تفہیم (۳۳)
۷۔ جائزے (۳۴)
۸۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو طنز و مزاح (۳۵)

۹۔ غزلیات میر حسن (۳۶) (انتخاب و مقدمہ)
۱۰۔ شاد عارفی کا ایک مطالعہ (۳۷)
۱۱۔ روحِ غزل (۳۸) (۶۹۳ رشعرا کے کلام پر مشتمل اردو غزل کا ۵۰ رسالہ انتخاب)
۱۲۔ کلیات ساغر نظامی جلد اول (۳۹)
۱۳۔ کلیات ساغر نظامی جلد دوم (۴۰)
۱۴۔ کلیات ساغر نظامی جلد سوم (۴۱)

شاعری، ترجمہ نگاری، افسانہ نگاری، ترتیب و تدوین کے علاوہ جس چیز نے ڈاکٹر مظفر حنفی کو ادب میں شہرت کی بلندیاں عطا کیں وہ ان کی تحقیقی و تنقیدی صلاحیتیں ہیں۔ تحقیق کے سلسلے سے 'شاد عارفی: شخصیت و فن' (۴۲) ان کا ایک گراں مایہ تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس مقالے پر پروفیسر مسعود حسین رقم طراز ہیں:

''اس مقالے کی اشاعت کے بعد اہل نقد و نظر دیکھیں گے کہ ابھی چند دہے قبل ہمارے درمیان سے جو سخنور خاموشی سے اٹھ گیا ہے، اس کی شخصیت اور فن دونوں کس قدر تہ دار تھے......میں سمجھتا ہوں کہ یہ تصنیف کئی لحاظ سے ڈاکٹر مظفر حنفی کا 'حاصل عمر' ہے......غالباً یہ مقالہ ڈاکٹر مظفر حنفی کے لیے وجہ تسلی بھی ہوگا، اس لیے کہ شاد عارفی کو ان سے بہتر سوانح نگار ناقد اور انھیں شاد عارفی سے بہتر ممدوح نہیں مل سکتا۔'' (۴۳)

تحقیقی مقالے کے علاوہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی معاونت سے تیار کردہ وضاحتی کتابیات (۱۹۸۰ء سے ۲۰۰۱ء تک ۲۲ رجلدیں) بھی ڈاکٹر مظفر حنفی کا قابلِ قدر تحقیقی کارنامہ ہے۔ ہندوستان گیر پیمانے پر اردو کی شائع شدہ اہم اور غیر اہم کتابوں کی تفاصیل کسی ایک کتاب میں درج کرنا، خاصی تلاش و تحقیق اور جستجو چاہتا ہے۔

تحقیق کے علاوہ تنقید کے میدان میں بھی ان کی ایک الگ پہچان ہے۔ اس تعلق سے ان کے کئی تنقیدی اور تحقیقی مضامین کے مجموعے بھی منظرِ عام پر آ چکے ہیں، جن میں ان کا تنقیدی شعور، تخلیقی نقاد کے بطور، ایک منفرد انداز میں سامنے آیا ہے۔ ان میں نقد ریزے، (۴۴) جہات و جستجو، (۴۵) تنقیدی ابعاد، (۴۶) ادبی فیچر اور تقریریں، (۴۷) باتیں ادب کی، (۴۸) لاگ لپیٹ کے بغیر، (۴۹) ہندوستان اردو میں، (۵۰) سوالوں کے حصار میں (۵۱) وغیرہ اور ان کے دیگر تحقیقی کارناموں میں حسرت موہانی (۵۲) محمد حسین آزاد (۵۳) وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

ان کے مختلف الجہات، ادبی، تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی کارناموں پر مختلف کام ہو چکے ہیں۔ ان کی حیات، شخصیت اور کارنامے پر مقالہ تحریر کر کے ڈاکٹر محبوب راہی نے ناگ پور یونیورسٹی سے ۱۹۸۴ء میں پی ایچ۔ ڈی کی سند پائی۔ ۱۹۹۹ء میں تقریباً ۵۵۰ صفحات پر مشتمل کتاب 'مظفر حنفی: ایک مطالعہ' ان کے فرزند انجینئر فیروز مظفر

نے مرتب کر کے شائع کی ہے۔ان پر مختلف رسائل وجرائد نے مختلف گوشے اور خصوصی نمبر جاری کیے ہیں۔ مثلاً اوراق (لاہور، پاکستان)، روشنائی (کراچی، پاکستان)، اقدار (کراچی، پاکستان)، صدائے اردو (بھوپال)، سفیر اردو (لندن)، مژگاں (کلکتہ)، انشا (کلکتہ)، بیسویں صدی (دہلی)، ترسیل (ممبئی)، جدید ادب (جرمنی) وغیرہ۔

مذکورہ تفاصیل کے پیشِ نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر مظفر حنفی کی ادبی خدمات کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ان کی مختلف النوع ادبی خدمات پر کئی مقالے تحریر کیے جاسکتے ہیں۔ یہاں ان کی خدمات کے مختلف گوشوں اور نقوش کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے، جس سے ان کی شخصیت اور ادبی قد کو سمجھنے میں آسانی ہو سکے۔

○○○

حواشی:

۱۔ نثر و غزل دستہ، مرتب: مظفر حنفی، مرکز ادب، بھوپال، ۱۹۶۷ء، سرورق کی پشت ملاحظہ کریں؛ ایضاً: کلیاتِ شاد عارفی، مرتبہ مظفر حنفی، نیشنل اکادمی، دہلی، ۱۹۷۵ء، سرورق کی پشت ملاحظہ کریں۔

۲۔ توقیتِ مظفر حنفی، صبا تسنیم، بشمول: مظفر حنفی ایک مطالعہ، مرتبہ: فیروز مظفر، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۵۳۳

۳۔ ایضاً، ص ۵۳۴

۴۔ ڈاکٹر مظفر حنفی: حیات، شخصیت اور کارنامے، ڈاکٹر محبوب راہی، موڈرن پبلشنگ بک ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۳۵

۵۔ ماہ نامہ ’نئے چراغ‘ کھنڈوہ، شمارہ نمبر ا، جلد نمبر ا، جنوری ۱۹۵۹ء

۶۔ توقیتِ مظفر حنفی، ص ۵۳۵

۷۔ ڈاکٹر مظفر حنفی: حیات، شخصیت اور کارنامے، ص ۵۶

۸۔ توقیتِ مظفر حنفی، ص ۵۳۵ تا ۵۳۷

۹۔ ایضاً، ص ۵۳۶ تا ۵۳۷

۱۰۔ ایضاً، ص ۵۳۸ تا ۵۴۰

۱۱۔ تعارف، پریم گوپال متل، بشمول: ہندوستان اردو میں، پروفیسر مظفر حنفی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۷ء، فلیپ پشت

۱۲۔ توقیتِ مظفر حنفی، ص ۵۳۶ تا ۵۴۱

۱۳۔ مظفر حنفی ہسوی میری نظر میں، ابوالمظفر، بشمول: ماہ نامہ صبحِ نو، نومبر ۱۹۶۳ء، ص ۱۹

۱۴۔ نقد ریزے، مظفر حنفی، ادارہ خضرِ راہ، کان پور، ۱۹۷۸ء، ص ۹۷ تا ۹۸

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۵۲

۱۶۔ ڈاکٹر مظفر حنفی: حیات، شخصیت اور کارنامے، ص ۱۴۹ تا ۱۵۰

۱۷۔ نیلا ہیرا (ادبِ اطفال، کہانیاں) مظفر حنفی، مکتبہ پیامِ تعلیم، دہلی، ۱۹۸۳ء

۱۸۔ مظفر حنفی بچوں کے ادیب و شاعر کی حیثیت سے، خوشحال زیدی، بشمول: مظفر حنفی ایک مطالعہ مرتبہ: فیروز مظفر، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۹۹ء، ص ۲۲۵

۱۹۔ نیلا ہیرا، مبصر: محمد یوسف پاپا، بشمول: مظفر حنفی: ایک مطالعہ، مرتبہ: فیروز مظفر، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۴۰۵

۲۰۔ توقیتِ مظفر حنفی، ص ۵۳۴ تا ۵۴۱

۲۱۔ ڈاکٹر مظفر حنفی: حیات، شخصیت اور کارنامے، ص ۵۰۲ تا ۵۰۳

۲۲۔ اینٹ کا جواب (افسانوی مجموعہ) مظفر حنفی، مرکز ادب، بھوپال، ۱۹۶۷ء

۲۳۔ افسانوی مجموعہ دو غنڈے، مظفر حنفی، نصرت پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۶۹ء

۲۴۔ افسانوی مجموعہ دیدۂ حیراں، مظفر حنفی، فن کدہ، سیہور، ایم۔ پی، ۱۹۹۷ء

۲۵۔ پیش لفظ، فراق گورکھپوری، بشمول: اینٹ کا جواب، مظفر حنفی، مرکز ادب، بھوپال، ۱۹۶۷ء، ص ۵

۲۶۔ تعارف، کرشن چندر، بشمول: دو غنڈے، مظفر حنفی، نصرت پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۶۹ء، ص ۷ تا ۹

۲۷۔ پیش لفظ، کنہیا لال کپور، بشمول: دیدۂ حیراں، مظفر حنفی، فن کدہ، سیہور، ایم۔ پی، ۱۹۷۰ء، ص ۶ تا ۸

۲۸۔ ایک تھا شاعر، مرتبہ: مظفر حنفی، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۶۷ء

۲۹۔ نثر و غزل دستہ، مرتب: مظفر حنفی، مرکز ادب، بھوپال، ۱۹۶۷ء

۳۰۔ شوخیٔ تحریر، مرتبہ: مظفر حنفی، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۷۱ء

۳۱۔ شاد عارفی کی غزلیں، مرتبہ: مظفر حنفی، مکتبہ شاہراہ، دہلی، ۱۹۷۴ء

۳۲۔ کلیاتِ شاد عارفی، مرتبہ: مظفر حنفی، نیشنل اکادمی، دہلی، ۱۹۷۵ء

۳۳۔ جدیدیت: تجزیہ و تفہیم، مرتبہ: ڈاکٹر مظفر حنفی، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۸۵ء

۳۴۔ جائزے، ڈاکٹر مظفر حنفی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۸۵ء

۳۵۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو طنز و مزاح، ڈاکٹر مظفر حنفی، دہلی اردو اکادمی، دہلی ۱۹۹۰ء

۳۶۔ غزلیاتِ میر حسن، مرتبہ: ڈاکٹر مظفر حنفی، دہلی اردو اکادمی، دہلی ۱۹۹۱ء

۳۷۔ شاد عارفی: ایک مطالعہ، مرتب ڈاکٹر مظفر حنفی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۱ء

۳۸۔روحِ غزل، مرتبہ: ڈاکٹر مظفر حنفی، انجمن روحِ ادب، الہ آباد، ۱۹۹۳ء
۳۹۔کلیات ساغر نظامی جلد اول، مرتب: ڈاکٹر مظفر حنفی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۹۸ء
۴۰۔کلیات ساغر نظامی جلد دوم، مرتب: ڈاکٹر مظفر حنفی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۰ء
۴۱۔کلیات ساغر نظامی جلد سوم، مرتب: ڈاکٹر مظفر حنفی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۰ء
۴۲۔شاد عارفی: شخصیت و فن، ڈاکٹر مظفر حنفی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۷۸ء
۴۳۔پیش لفظ، پروفیسر مسعود حسین، بشمول: شاد عارفی: شخصیت و فن، مظفر حنفی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ص ۱۰
۴۴۔نقد ریزے، مظفر حنفی، مکتبہ خضر راہ، کان پور، ۱۹۷۸ء
۴۵۔جہات و جستجو، مظفر حنفی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۸۲ء
۴۶۔تنقیدی ابعاد، مظفر حنفی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۷ء
۴۷۔ادبی فیچر اور تقریریں، مظفر حنفی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۲ء
۴۸۔باتیں ادب کی، مظفر حنفی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۹۴ء
۴۹۔لاگ لپیٹ کے بغیر، مظفر حنفی، مکتبہ جدید، دہلی، ۲۰۰۱ء
۵۰۔ہندوستان اردو میں، مظفر حنفی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۷ء
۵۱۔سوالوں کے حصار میں، مظفر حنفی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۷ء
۵۲۔حسرت موہانی، مظفر حنفی، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء
۵۳۔محمد حسین آزاد، مظفر حنفی، ساہتیہ اکادمی، دہلی ۱۹۹۶ء

○○○

پرویز مظفر
برمنگھم

ہمارے پیارے پاپا

بچپن سے لے کر آج تک جب بھی کسی مشکل لمحے میں کسی مدد، صلاح مشورے کی ضرورت پڑی تو سب سے پہلے مجھے اپنے والد محترم یاد آئے اور ان سے مشورہ کیا اور ہمیشہ دانش مندانہ اور صحیح مشورہ ملا اور خدا کا شکر ہے کہ اس پر عمل کرنے سے ہمیشہ میرے کام بنے اور ہر بار مشکل کی دلدل سے باہر آ گیا۔ یہ تجربہ ایک بار نہیں زندگی میں کئی مرتبہ ہوا۔ اس سے اس بات پر ایمان لانا پڑتا ہے کہ سچائی اور ایمانداری سے دیے گئے مشورے ہمیشہ انسان کے لیے سودمند ہوتے ہیں۔

والد محترم سچائی، ایمانداری اور خلوص و محبت کا پیکر ہیں۔ ان کے ظاہر اور باطن میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جو محسوس کرتے ہیں، جیسا محسوس کرتے ہیں وہ کہہ دیتے ہیں۔ چاہے وہ نجی زندگی میں ہو یا شاعری میں ؎

جو نہ محسوس کیا ہو اسے کیوں کر کہتے ورنہ آسان تھا قطرے کو سمندر کہتے

ان کی ہزاروں خوبیوں میں سے ایک اچھائی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے بارے میں کبھی کسی سے کچھ نہیں کہتے چاہے وہ ان کے اپنے فن سے متعلق ہو، ترقی یا انعام و اکرام کا معاملہ ہو یا ذاتی پریشانی۔ کبھی کسی سے کچھ نہیں کہتے۔ ہماری ممی نے ان کو کچھ بدلنے کی کوشش کی ہے مگر یہ بدلاؤ نہ ہونے کے برابر ہے۔

ہم پانچ بھائی اور ایک بہن ہیں۔ ہم میں سے کسی کو آج تک یاد نہیں ہے کہ پاپا نے کبھی ہم لوگوں سے سر بھی دبوایا ہو۔ اگر کبھی معلوم ہوا کہ پاپا کی طبیعت خراب ہے اور ہم نے ان کا سر یا پاؤں دبانے کی کوشش کی تو انھوں نے فوراً روک دیا اور ہمیشہ کہا کہ ماں کی خدمت کرو اور ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ ان سارے واقعات کے بارے میں جب بھی سوچتا ہوں تو مجھے اپنے پاپا ایک درویش صفت انسان نظر آتے ہیں جس نے دنیا کو صرف دینا ہی سیکھا ہے، لینے کی کسی سے کوئی اُمید نہیں رکھی۔ گھر ہو یا گھر کے باہر ہمیشہ لوگوں کے ساتھ کچھ کیا ہی ہے لیا کبھی کسی سے کچھ نہیں۔

ہم نے جب آنکھ کھولی تو ہمیں اپنے گھر میں پیار محبت اور عیش و آرام کی زندگی ملی۔ مگر والد محترم کا بچپن

اور عہدِ جوانی بہت مشکل حالات میں گزرا۔ اس کا ذکر وہ کبھی نہیں کرتے، ہم لوگوں کو یہ باتیں اپنی ممّی یا پھر ڈاکٹر محبوب راہیؔ کے تحقیقی مقالے سے معلوم ہوئیں۔ ان سب کے باوجود وہ ایک جذباتی انسان، مخلص اور بچوں سے ٹوٹ کر محبت کرنے والے باپ، اچھے شوہر اور بے مثال دادا، نانا ہیں جو قسمت والوں کو ہی ملتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے سے پہلے اپنے چاہنے والوں کی فکر کرتے ہیں۔ ممّی کو کھانسی آئی نہیں کہ پاپا پریشان ہو گئے۔ کسی بچے کو بخار آیا نہیں کہ پاپا کی راتوں کی نیند غائب!

کئی بار ایسے مواقع آئے کہ ان کا پروگرام ہے، مشاعرہ ہے، بڑے معاوضے پر باہر جانا ہے لیکن ممّی کی تھوڑی سی طبیعت خراب ہوگئی تو پاپا اپنے پروگرام ملتوی کر دیں گے۔ ہم لوگ کئی بار کہتے کہ آپ چلے جایئے ہم ہیں تو، مگر وہ نہیں مانتے۔ ہر انسان کے چاہنے کے الگ انداز ہوتے ہیں اور ہمارے پاپا کا یہ انداز نرالا ہے۔ ممّی تو کئی بار پاپا کو اپنی طبیعت کے بارے میں بتاتی ہی نہیں ہیں مگر پاپا کو جانے کیسے معلوم ہو جاتا ہے۔ ہماری ممّی بھی پاپا کا بہت خیال رکھتی ہیں، ہر مسئلے میں ان سے مشورہ کرتی ہیں مگر میرا خیال ہے پاپا کی محبت ان کے لیے بہت زیادہ ہے۔ گھر کے سارے اختیارات ممّی کو سونپ رکھے ہیں اور ہماری ممّی ہی فیصلے کرتی ہیں کہ گھر میں کیا ہوگا، کیا نہیں۔ پاپا کی یہ عادت ہم سب بھائی بہن میں آئی کہ جو پک جائے اللہ کا شکر ادا کر کے کھالو۔ خدا کا احسانِ عظیم ہے کہ مجھے ماں، بھابیاں، بہن اور بیوی ایسی ملی جنھوں نے ہمیشہ اچھے اور لذیذ کھانے پکا کر کھلائے۔ ہمارے پاپا اپنے بھرے پُرے خاندان کے ہر فرد کا خیال رکھتے ہیں۔ خاندان ان کے لیے فیملی کی حیثیت رکھتا ہے۔

کنبے کا کوئی فرد کسی وجہ سے پریشان ہے یا بیمار پڑا تو پاپا اس کے بارے میں فکر مند ہو جاتے ہیں اور مختلف طریقوں سے اس کی مدد کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ رات رات جاگ کر ترجمے کیے۔ دو دو ملازمتیں کیں اور خاندان کے افراد کے کام آئے۔ متعدد شادیاں کروائی ہیں اور لوگوں کی اس طرح مدد کی کہ دائیں ہاتھ سے دیا اور بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہوئی۔ ان کی یہ صفت ہمارے بڑے بھائی فیروز مظفر میں اس خوبی سے سموئی ہے کہ جواب نہیں۔ کاش ان دونوں کے اس وصف کا کچھ حصہ مجھ میں آ جاتا۔

ہمارے پاپا کو بناوٹ اور جھوٹ سے سخت نفرت ہے مگر لوگ شاید آج کل ان چیزوں کو فیشن کے طور پر استعمال کرنے لگے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ ہمارا مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا۔ ہم میں سے کوئی بڑے سے بڑا نقصان یا غلطی کر دے جو اکثر کرتے ہیں اور آ کر پاپا کو بتا دیا تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ پاپا ناراض ہوئے ہوں، ہمیشہ پیار سے سمجھایا ہے۔ پاپا کی انھی خوبیوں کی وجہ سے شاید ان کے دوست کم ہیں دشمن زیادہ ہیں۔ میں ان کے بہت سے ایسے دوستوں کو جانتا ہوں جن کی انھوں نے مختلف طریقوں سے مدد کی، بڑی بڑی کمیٹیوں سے اپنا نام نکلوا کر دوستوں کو بتائے بغیر ان کا نام ڈلوا دیا۔ کئی ایسے جلسوں میں اور ٹی وی وغیرہ کے پروگراموں

میں شرکت نہیں کی جہاں ان کے دوستوں یا استادِ محترم کو نہیں بلایا گیا۔ ایک آدھ دوست تو ایسے ہیں جن کی پی ایچ۔ ڈی برسوں سے مکمل نہیں ہو رہی تھی وہ والدِ محترم نے کرا دی اور کام پورا ہوتے ہی موصوف کے رنگ بدل گئے۔

پاپا ایسے بڑے دل کے آدمی ہیں کہ ان کے دشمنوں کا احوال بھی ان کے دوستوں سے برسوں کے بعد معلوم ہوتا ہے کیوں کہ ان کی عادت ہے کہ کسی کی برائی کبھی اُس کی پیٹھ پیچھے نہیں کرتے اور دشمن کو بھی اچھی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہم نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ وہ صاف بات کہنے والے بے حد حق گو انسان ہیں۔ پاپا کو یہ بالکل پسند نہیں ہے کہ لوگ کسی کی غیبت کریں جو کہنا ہو وہ منھ پر صاف صاف کہہ دیتے ہیں۔ کوئی لاگ لپیٹ نہیں رکھتے۔ حالاں کہ بات سچ ہوتی ہے مگر اکثر لوگوں کو حتیٰ کہ دوست احباب کو بھی پسند نہیں آتی۔

آج کل کا دور وہ ہے کہ لوگ مُنھ پر خوشامد کرنا اور کروانا پسند کرتے ہیں جو ہمارے پاپا کے مزاج سے میل نہیں کھاتا۔ اس طرح لوگوں کا دوستی سے بھروسہ اٹھتا جا رہا ہے۔ ہم نے اپنے ڈرائنگ روم میں ایسے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو کسی شخص کی اس قدر بُرائی کرتے ہیں جیسے کوئی کسی دشمن کی کرتا ہے، اور ہفتہ بھر بعد اُسی شخص سے فنکشن میں اس طرح بغل گیر ہوں گے جیسے ان کا سب سے بڑا دوست ہو۔

اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ہمارے والدِ محترم اپنے ڈرائنگ روم سے ایسے لوگوں کو نکال باہر کرتے ہیں جو ہمارے والد کے دوست یا دشمن کی برائی کر رہا ہو۔ ان کا اپنے دوستوں کے لیے ایثار کرنے کا انداز بھی بے حد نرالا ہے اکثر مجھے بھی کہتے ہیں کہ اگر دوستوں کے لیے کچھ کیا اور انھیں جتا دیا تو پھر وہ جو کچھ کرنے کا مزہ ہے وہ جاتا رہتا ہے۔ دوستی کی بنیاد تو یقین پر ہوتی ہے۔ اسی لیے کئی ایسی مثالیں موجود ہیں جب اتنی سچائی اور صاف گوئی کے باوجود ان کے چاہنے والوں کا ایک بڑا حلقہ موجود ہے جس میں ڈاکٹر محبوب راہی، پریم گوپال متّل، پروفیسر صغرا مہدی، پروفیسر خالد محمود، نعیم کوثر صاحب، پروفیسر نعمان خاں، پروفیسر آفاق احمد، منور رانا، ڈاکٹر راحت اندوری اور حباب ہاشمی جیسے لوگ شامل ہیں۔

جن باتوں پر وہ خود عمل پیرا ہیں وہی باتیں شاعری میں بیان کرتے ہیں۔ میں نے کئی منظر دیکھے ہیں جہاں دولت یا عہدے کے نشے میں چور بڑے لوگوں نے اپنے غریب و معصوم والدین کو لوگوں سے ملوانے میں شرم محسوس کی۔ ہمارے پاپا کو جب بھی ایسے مواقع پر احساس ہوا تو انھوں نے بڑے لوگوں کی محفل چھوڑ کر ان بزرگوں کے پاس احترام سے بیٹھنا زیادہ پسند کیا اور ان کی دعائیں لی ہیں۔ وہ ان بزرگوں کو اہمیت دیتے ہیں جن کی اپنی اولادیں انھیں لوگوں کی آنکھوں سے چھپا رہی ہیں۔

بچے بہت معصوم ہوتے ہیں۔ انھیں چاک پر جس طرح چاہو ڈھال لو مگر ایک بات صاف ہے کہ وہ سچے پیار کو بہت اچھی طرح پہچانتے ہیں اور ہمارے پاپا میں یہ قدرتی خوبی ہے کہ وہ اپنے بچوں سے بے انتہا اور سچا پیار کرتے ہیں۔ اسی لیے تو ان کے بچے، پوتے، پوتیاں، نواسے، نواسیاں سب ان سے بے انتہا پیار کرتے

ہیں۔اتنے مصروف ہونے کے باوجود بھی وہ بچوں کے ساتھ کھیلنے کا وقت ضرور نکال لیتے ہیں۔

ہم لوگ چھوٹے چھوٹے کاموں یا مشکل گھڑی میں فیصلے لینے میں پریشان ہو جاتے ہیں مگر ہمارے پاپا کبھی بھی مشکل گھڑی میں گھبراتے نہیں اور ہم نے دیکھا ہے کہ ایسے مواقع پر پرسکون رہ کر اور سوجھ بوجھ کا استعمال کر کے پریشانی کا حل نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمیشہ کہتے ہیں ہر چیز کے دو رُخ ہوتے ہیں اگر پریشانی آتی ہے تو اس کا حل بھی ہوگا۔ہاں انھیں ہاسپٹل اور اونچائی پسند نہیں ہے۔پھر بھی حوصلہ دیکھیے،ایک واقعہ یاد آیا۔ایک بار والد محترم اسپتال میں داخل تھے۔ناک کا آپریشن ہوا تھا۔نرس نے غلطی سے گلوکوس چڑھا دیا یہ دیکھے بغیر کہ پاپا ذیابیطس کے مریض ہیں۔جب اگلے دن Consultant آیا تو اسے علم ہوا کہ Glucose غلط چڑھایا گیا ہے۔فوراً ہٹوایا۔اب جو ناک سے روئی نکالی تو خون کے دھارے بہنے لگے۔ڈاکٹر،نرس، بھائی وغیرہ سب بری طرح گھبرا گئے۔ پاپا بالکل نارمل رہے، بجائے اس کے کہ ڈاکٹر ان کو تسلی دے پاپا ان کو خود تسلی دیتے رہے اور ان کی مدد کرتے رہے۔کافی دیر بعد جب خون بند ہوا تو ان لوگوں کی سانس میں سانس آئی۔ اس Consultant نے ممی کے پاس جا کر کہا کہ اس نے اتنا بہادر اور حوصلہ مند مریض کبھی نہیں دیکھا۔

تعلیم کے سلسلے میں ہمارے پاپا گھر تو کیا گھر کے باہر جا کر بھی لوگوں کی مدد کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔کئی رشتے داروں کو اور تین چار غیر لوگوں کو بھی اپنے گھر میں رکھ کر اعلیٰ تعلیم دلوائی۔کئی شاگردوں کو پی ایچ۔ڈی کرانے میں اپنے دن رات ایک کر دیے۔ہم سب بھائیوں اور بہن نے جب اپنی تعلیم مکمل کی تو ہمیشہ پوچھا اگر ہم اور آگے پڑھنا چاہتے ہیں تو بندوبست کریں۔ ہمیشہ حوصلہ افزائی کی کہ اور آگے تعلیم حاصل کریں۔اس سلسلے کے بے شمار واقعات میں سے دو کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔اس زمانے میں میں ہائر سیکنڈری میں پڑھتا تھا۔میرا ایک دوست ہاسٹل میں رہتا تھا۔نہ جانے کیوں اس کے پیسے وقت پر نہ پہنچے اور وہ پریشان ہو گیا کہ اگر اس کی فیس وقت پر نہ جمع کی گئی تو شاید نام کٹ جائے گا۔اس کا ذکر میں نے پاپا سے کیا پاپا نے بنا کچھ سوال پوچھے مجھے وہ رقم دے دی اور کہا کہ اس کی فیس وقت پر جمع ہونی چاہیے۔ اس کے کچھ سالوں بعد ایک واقعہ پھر گزرا جب میں یونیورسٹی میں تھا۔میرے دوست کو ہاسٹل کی فیس جمع کرنے کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ پاپا سے کہا اس وقت انھوں نے صرف یہ پوچھا واقعی فیس کے لیے چاہیے کہیں عیش کرنے کے لیے تو نہیں مانگ رہا ہے۔میرے تصدیق کرنے پر انھوں نے فوراً پیسے نکال کر دے دیے۔ان واقعات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے پاپا کتنا بڑا دل رکھتے ہیں اور تعلیم کے سلسلے میں لوگوں کی مدد کرنے میں کتنا آگے جاتے ہیں۔امریکا سے کئی بار سات آٹھ ہفتوں پر مشتمل پروگراموں کے لیے دعوت نامے آئے لیکن یونیورسٹی کے بچوں کی تعلیم میں حرج ہوتا تھا،اس لیے وہ انکار کر دیتے تھے۔شاید اس لیے کہ خود بچپن میں اپنی تعلیم کے سلسلے میں بہت مشکلیں جھیلی تھیں۔ بہت دکھ سہے تھے۔لوگوں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھ کر جینے والے انسان ہیں ہمارے پاپا۔

پاپا کو پڑھنے لکھنے کا اتنا شوق ہے کہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔کوئی مضمون لکھنا ہو،کسی کے اوپر لکھنا ہو، اس کی کتاب کا مطالعہ ضرور کریں گے، پھر لکھیں گے۔ کتابیں پڑھنے کا اتنا شوق ہے کہ ہم جتنی محنت امتحان کے زمانے میں کرتے تھے اس سے کئی گنا زیادہ پڑھنا لکھنا ان کا روزمرہ کا معمول ہے۔اردو، ہندی، انگریزی کی کتابیں۔ ۴۵ رسال سے تو میں دیکھ رہا ہوں دن رات پڑھنا اور کام کو پابندی سے کرنا ان کے مزاج میں شامل ہے۔کلکتہ کے قیام کے دوران وہاں کا کیئر ٹیکر ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ پروفیسر صاحب جب صبح ٹہلنے نکلتے ہیں تو مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ صبح کے ساڑھے پانچ بج گئے ہیں۔

اگر کوئی کام کرنا ہے تو پھر اچھی طرح کرنا ہے اور وقت پر کرنا ہے، پھر کوئی آندھی طوفان انھیں روک نہیں سکتا۔کھانا پینا بھول کر دن رات ایک کر دیں گے اس کام کو پورا کرنے کے لیے یہاں تک کہ اپنی صحت کا خیال بھی نہیں رکھیں گے۔ممی کبھی کبھی اس بات پہ جھگڑتی ہیں کہ آپ اپنی صحت کا خیال تو رکھیں مگر پاپا نے اگر وعدہ کر لیا اور کوئی پروجیکٹ ہاتھ میں لے لیا تو پھر وہ مکمل کرنا ہی ہے اور وقت پر مکمل کرنا ہے۔اس کی صرف تین مثالیں پیش کرتا ہوں۔ پروفیسر قمر رئیس صاحب نے پاپا سے میر تقی میرؔ کا مونوگراف تین ہفتوں میں تیار کرنے کی گزارش کی اور انھوں نے اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہوئے پاپا سے کہا کہ اگر ہندوستان میں کوئی یہ کام اتنے دنوں میں کر سکتا ہے تو وہ صرف آپ ہیں۔ پاپا نے اس کام کو مکمل کرنے کے لیے دن رات ایک کر دیے اور اٹھارہ انیس گھنٹے روز کام کیا اور اٹھارہ دن میں یہ کام مکمل کر کے دہلی اردو اکادمی کے حوالے کر دیا۔

انجمن روحِ ادب (الٰہ آباد) نے اردو شاعری کا پچاس سالہ انتخاب تیار کرنے کے لیے پاپا کا انتخاب کیا اور صرف چھ مہینے میں غزل کا پچیس سالہ سب سے بڑا انتخاب تیار کرنے کی درخواست کی۔ پاپا نے دن رات ایک کر کے ۶۹۳ رشعرا کا جو انتخاب کیا وہ اردو غزل کا اب تک کا سب سے بڑا انتخاب ہے۔’وضاحتی کتابیات‘ اُن کا ایک اور بڑا کارنامہ ہے جس کی پچیس جلدیں تیار کرنے کے لیے پورے ایک ادارے/ انجمن کی ضرورت تھی، وہ کام پاپا نے اکیلے دم پر تین چار برسوں میں سرانجام دیا۔

ہمارے پاپا کو شاعری سے جنون کی حد تک محبت ہے اور شاعری سے وہ ایسی ہی محبت کرتے ہیں جیسی ہم لوگوں سے۔شاید ہم لوگوں سے بھی زیادہ۔سینکڑوں بار ہم نے دیکھا کہ والد محترم کی رات کو نیند کھل گئی اور اپنے ریڈنگ روم میں بیٹھے غزل کہہ رہے ہیں۔راتوں کو اٹھ کر شعر کہنا ان کی عادت ہو گئی ہے۔ ہمیشہ کہتے ہیں شعر بنائے نہیں جاتے وہ تو پکّے پھلوں کی طرح خود بہ خود ٹپکنے لگتے ہیں۔پاپا نے کتنی اچھی اور معیاری شاعری کی ہے اس کا اندازہ روز آنے والے بے شمار خطوط سے لگایا جا سکتا ہے۔مگر نقاد اور صاحبانِ اقتدار شاید انھیں جان بوجھ کر نظر انداز کر رہے ہیں کیوں کہ ہمارے پاپا میں اچھا اور سچا فن کار پوشیدہ ہے جو دوسروں کے سامنے جھکنا پسند نہیں کرتا۔اقتدار کے دروازے پر جا کر سلام نہیں کر سکتا، نہ ہی ان کی شان میں قصیدہ لکھ سکتا ہے۔

بلا مبالغہ ان کی شاعری کی خوشبو پورے جہان میں پھیل رہی ہے۔ پاپا روزے نماز کے زیادہ پابند نہیں ہیں مگر اسلام نے ایک اچھے مسلمان کے لیے جو خوبیاں بیان کی ہیں اس پر وہ پورے اترتے ہیں۔ ان کے اصولوں اور سچائی کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ پاپا نے اردو ادب کی بہت خدمت کی ہے اور بنا صلے کی پروا کیے ہوئے۔ وہ اپنے آپ کو قلم کا مزدور کہتے ہیں مگر ہم سب جانتے ہیں کہ پھل دار درخت ہمیشہ زمین کی طرف جھکا ہوا رہتا ہے۔

انھوں نے نوّے سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں۔ ۲۵۰۰ رسے زیادہ غزلیں کہیں۔ بہت سارے کاموں میں تو ہمارے پاپا پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے اور لوگوں کا ماننا ہے کہ ہمارے والد نے ۱۹۵۹ء میں جب رسالہ ’نئے چراغ‘ جاری کیا تو وہ جدید ادب کا ہندوستان میں پہلا رسالہ تھا۔ اس کے سات آٹھ سال بعد ’شب خون‘ جاری ہوا۔ ہندوستان میں جدید شاعری کا سب سے پہلا شائع ہونے والا مجموعہ کلام ’پانی کی زبان‘ ہمارے پاپا کا ہے۔ مختلف موضوعات پر دو ہزار پانچ سو اشعار ’ہیرے ایک ڈال کے‘ بھی وہ کارنامہ ہے جس کی پہل ہمارے والد محترم نے کی اور اب تک کسی ایک ہی شاعر کے مختلف موضوعاتی اشعار اور اتنی تعداد میں کبھی منظر عام پر نہیں آئے۔

میری اس سلسلے میں اکثر اپنے پاپا سے بات ہوتی ہے اور وہ ہمیشہ کہتے ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا انعام و اعزاز کسی چھوٹے تخلیق کار کو بڑا نہیں بنا سکتا اور بڑا تخلیق کار بڑا ہی رہے گا چاہے اسے کوئی اعزاز ملے یا نہ ملے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے ملک میں سیاست، چاپلوسی اور Public Relations کا چلن بہت زیادہ ہو گیا ہے اور آج کل بہت سارے ادیبوں نے اسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے اور Lime Light میں رہنے کے لیے Public Relations پر زیادہ زور دیتے ہیں اور اچھے اور سچے فن کار کو پیچھے ڈھکیلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے ہندوستان کی تہذیب میں سچائی سموئی ہوئی ہے مگر آج ہم اپنی نئی نسل کو کیا پیغام دینا چاہتے ہیں کہ سچی محنت اور لگن کوئی چیز نہیں ہے۔ ہاں اگر آپ Public Relations میں اچھے ہیں تو آپ سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ ہماری حکومت کو اس طرف غور کرنا چاہیے کہ ایماندارانہ فیصلے کرے اور جینوئن ادیب اور سچے فن کار کے کام کو اہمیت دے۔

انسان کی ہزاروں خواہشیں ہوتی ہیں۔ ہماری بھی ڈھیر ساری خواہشیں تھیں اور ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے اپنے پاپا کی شکل میں اتنا عظیم انسان ملا ہے کہ انھوں نے ہماری ہر خواہش پوری کی اور کبھی ہماری سوچ پر قدغن نہیں لگائی۔ ایک اچھے اور بہترین والد میں جو خوبیاں ہونی چاہئیں وہ سب میرے پاپا میں موجود ہیں اور مجھے فخر ہے کہ میں ان کا بیٹا ہوں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ایسے شخص کے قدم کیوں نہ چومے جائیں۔

OOO

ڈاکٹر مہتاب عالم
بھوپال

اردو ادب کا مظفر: مظفر حنفی

برار سے مدھیہ پردیش کو جو علاقہ جوڑتا ہے اس میں خاندیش اور نماڑ دونوں شامل ہیں۔ بھارت کا نقشہ آپ دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ دریائے تاپتی اور گرنا کی سرسبز و شاداب وادیوں میں واقع سرزمین نماڑ زمانۂ قدیم سے ہی رشی منیوں کی آماجگاہ اور بزرگانِ دین کی تبلیغی، علمی اور روحانی سرگرمیوں کا مرکز رہی ہے۔ نماڑ جنوبی ہند کے کوہستانی سلسلہ وندھیاچل اور ستپوڑہ کے درمیان واقع ہے۔ نماڑ کی سرحدیں مغرب میں گجرات، مشرق میں ہوشنگ آباد، جنوب میں خاندیش اور شمال میں مالوہ سے ملتی ہیں۔ تاپتی اور نربدا اس کی مشہور ندیاں ہیں۔ ریاستی امور اور سرکاری کام کاج کے لحاظ سے یہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ قدیم حصہ مغرب میں ہونے کی وجہ سے مغربی نماڑ اور باقی حصہ مشرق میں ہونے کی وجہ سے مشرقی نماڑ کہلاتا ہے۔

نماڑ میں عام طور سے جو زبان بولی جاتی ہے اسے نماڑی کہتے ہیں۔ یہ زبان (بولی) مالوی گجراتی، بھیلی، خاندیشی، مراٹھی اور قدیم اردو کا مرکب ہے۔ اس زبان کا چلن شہروں کی بہ نسبت گاؤں اور دیہاتوں میں زیادہ ہے۔ یہاں اردو زبان کا چلن دیہاتوں اور گاؤں سے زیادہ شہری علاقوں میں ہے۔ کھنڈوہ، برہانپور، کھرگون، سناود، بڑوانی اور بڑواہا وغیرہ میں اردو زبان رائج ہے۔ نماڑ میں بولی جانے والی اردو زبان پر علاقائی زبان نماڑی کے ساتھ ساتھ دکنی، دہلوی اور لکھنوی زبان کے بھی اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ نماڑ میں اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کا کام کسی ایک عہد میں نہیں ہوا بلکہ یہ عہد بہ عہد جاری ہے۔ یہاں اردو زبان و ادب کی سرپرستی ہر دور میں ہوئی ہے، نماڑ میں ادب کے دو بڑے مراکز میں کھنڈوہ اور برہان پور کا نام نمایاں ہے۔

ریختہ کے موجد کہے جانے والے شیخ سعدی دکنی کی ملاقات سلطان الاولیا کے دربار میں امیر خسرو سے ہونے کا ذکر ’خزائن الفتوح‘ میں بھی ہے۔ ’مخزن نکات‘ میں قائم نے بھی اس ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ یہ بات تاریخ سے ثابت ہو چکی ہے کہ فاروقی بادشاہ ملک نصیر خاں فاروقی نے جب اپنے پیر و مرشد صوفی زین الدین کی خواہش کے احترام میں ۱۴۰۷ء میں نماڑ میں دریائے تاپتی کے کنارے برہان پور کو آباد کیا تو یہ شہر اس زمانے

میں ایک گاؤں کی شکل میں تھا جو وسانا کہلاتا تھا اور حضرت شیخ سعدی دکنی کو چھوڑ کر گنگا جمنی اردو شاعری کی ابتدا کر چکے تھے، جب کہ شیخ سعدی دکنی کا مزار برہان پور سے دس میل دور شکار پور میں آج بھی موجود ہے۔ اس طرح نماڑ میں شیخ سعدی دکنی نے اردو کے لیے ریاضت کی، بہاء الدین باجن نے اردو کو خزانۂ رحمت عطا کیا۔ عیسیٰ جند اللہ نے اردو کو مسیحائی عطا کی اور شیخ علی متقی نے اسے پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا۔ یہ تحریک اپنے ارتقائی عمل سے جب آگے بڑھی تو اسی تحریک کے بطن سے سعد اللہ گلشن نے جنم لیا۔ یہ وہی سعد اللہ گلشن ہیں جنھوں نے ولیؔ کو شاعری کے آداب سکھائے تھے اور انھیں کے مشورے پر ولی نے دلی کے ایک فارسی مشاعرے میں اردو غزل پیش کی تھی۔ نماڑ کی مٹی میں وہ خمیر موجود ہے جو ہمیشہ اردو کے معیاری شاعر اور ادیب پیدا کرتا ہے۔ پروفیسر مظفر حنفی کا تعلق نماڑ کے تاریخی شہر کھنڈوہ سے ہے۔

کھنڈوہ ایک تاریخی قدیم شہر ہے۔ اس کی تاریخ تقریباً ڈھائی ہزار سال قدیم ہے۔ کچھ محققین کا خیال ہے کہ کھنڈوہ مہا بھارت کے کھنڈروں کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اس شہر کی قدامت کا پتہ اس بات سے بھی چلتا ہے کہ گیارہویں صدی کی ابتدا میں ابوریحان نے کھنڈوہ کا ذکر کیا ہے۔ عربی سیاح البیرونی گیارہویں صدی میں یہاں آیا تھا۔ اس نے اس کا نام کھنڈوہ ہی تحریر کیا ہے۔ یہاں بکھرے ہوئے آثار اس شہر کی قدامت کے گواہ ہیں۔ کھنڈوہ میں آج بھی بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی کی خوب صورت جین مورتیاں اور دیگر تراشے ہوئے پتھر ملتے ہیں جن سے اس شہر کی قدامت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ممتاز مورخ قاسم فرشتہ نے اپنی کتاب 'تاریخ فرشتہ' میں مالوہ ریاست کے صوبے دار کی قیام گاہ کے طور پر کھنڈوہ کا ذکر کیا ہے۔ کھنڈوہ چاروں جانب تالابوں سے گھرا ہوا ہے، جن کے نشانات آج بھی اس کی ترقی اور قدامت کے مظہر ہیں۔ ان تالابوں اور کنڈوں پر بڑی تعداد میں مندر تعمیر ہیں۔ کھنڈوہ شہر کے نام کے پیچھے ایک خیال یہ بھی ہے کہ اس کے چہار جانب بنے تالابوں اور کنڈوں کی وجہ سے اس شہر کا نام کھنڈوہ پڑا ہوگا۔ شہر کی مشرقی سمت میں سورج کنڈ، مغربی سمت میں پدم کنڈ، شمال میں رامیشور کنڈ اور جنوب میں بھیم کنڈ کے نام سے تالاب موجود ہیں۔

کھنڈوہ میں اردو زبان و ادب کی تاریخ کے حوالے سے جو دستاویز ملتے ہیں ان کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کھنڈوہ میں اردو شعر و ادب کے جو سوتے زمانۂ قدیم سے دکھائی دیتے ہیں اس کا منبع نماڑ کے تاریخی شہر برہان پور سے ملتا ہے۔ برہان پور آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد تقریباً ۲۰۰۰ء تک ضلع کھنڈوہ کی ایک تحصیل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسی ادبی اور تاریخی شہر میں مظفر حنفی کی پیدائش یکم اپریل ۱۹۳۶ء کو ہوئی۔ آپ کا نام محمد ابوالمظفر ہے۔ لیکن ادبی دنیا میں آپ کو مظفر حنفی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مظفر حنفی کی ابتدائی تعلیم کھنڈوہ میں ہوئی۔ انھوں نے پہلی کلاس سے آٹھویں درجہ تک کی تعلیم اردو میڈیم سے حاصل کی لیکن جب نویں جماعت میں پہنچے تو اس وقت ملک آزاد ہو چکا تھا۔ اس آزادی کا تحفہ مظفر حنفی صاحب کو اس شکل میں ملا کہ ان سے ان کی

مادری زبان چھین لی گئی۔ اردو ذریعۂ تعلیم سے تعلیم حاصل کرنے کا ان کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ تعلیم حاصل کرنا تھا، اس لیے انھوں نے اردو زبان کے ساتھ ہندی زبان کو سیکھا اور امتحان بھی دیا لیکن کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔ جب کہ آٹھویں جماعت میں مظفر حنفی نے پورے ضلع میں امتیازی نمبر حاصل کر کے گولڈ میڈل حاصل کیا تھا۔ مظفر حنفی کی تعلیم کا سلسلہ ایک ساتھ جاری نہ رہا۔ انھوں نے نامساعد حالات میں ملازمت کے ساتھ تعلیم حاصل کی۔ جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب کامل، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایف۔ اے اور بی۔ اے، بھوپال برکت اللہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ممتاز شاعر شادؔ عارفی کے فن اور شخصیت پر پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد مظفر حنفی نے ۱۹۷۴ء میں دہلی کا سفر کیا۔ پھر تو دہلی کی زلف گرہ گیر کے ایسے اسیر ہوئے کہ اس سے باہر نہیں نکل سکے۔ اب دہلی ہی ان کا وطن ثانی بن چکا ہے۔ ڈاکٹر مظفر حنفی پہلے نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ میں اسسٹنٹ پروڈکشن افسر ہوئے، اس کے بعد ۱۹۷۶ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو میں ریڈر رہوئے۔ بعد ازاں کلکتہ میں اقبال چیئر پر پروفیسر کے عہدے پر فائز رہے ہیں۔

مظفر حنفی کے ادبی سفر کا آغاز نماڑ کھنڈوہ میں ضرور ہوا لیکن ان کے فن کو جلا بخشنے میں نماڑ کے ساتھ مالوہ اور بھوپال کی ادبی فضا نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ موصوف کا نام ادب کے حوالے سے اب صرف نماڑ یا مدھیہ پردیش ہی نہیں بلکہ ملک کی سرحد کے باہر بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ مظفر حنفی کو تعریف و تعارف کے مراحل سے گزرے ہوئے ایک زمانہ ہو چکا ہے۔ ان کی تخلیقات میں تحقیق، تنقید، انشائیے، افسانے، خاکے، سفرنامے، تراجم، غزلیں، نظمیں، آپ بیتیاں اور جگ بیتیاں سبھی شامل ہیں۔ وہ بیک وقت ایک ممتاز محقق، مستند ناقد، افسانہ نگار، ڈراما نگار، صحافی، بہترین مترجم اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ مظفر حنفی کے یہاں موضوع اور تجربے کا تنوع بھی ہے، خیال اور نظریات کا تسلسل بھی ہے۔ ان کی غزلیں اور نظمیں لغت، محاورہ، اظہار و آہنگ میں کافی حد تک بے مثل و یک رنگ ہیں لیکن بعض نظموں میں وہ خوبیاں نہیں ہیں جن کی توقع مظفر حنفی جیسے صاحب طرز نظم نگار سے کی جاتی ہے۔ البتہ غزل جو مظفر حنفی کا فطری اور دل پسند میدان ہے اس صنف میں اظہار و ابلاغ کی ایسی صفائی، سلاست و کفایت اور انسانی احساسات کی ایسی آمیزش ملتی ہے کہ آپ فال کی طرح ان کی کسی بھی غزل پر انگلی رکھ دیجیے اس میں آپ کو فن اور معنی کے لحاظ سے کوئی نہ کوئی ایسا کرشمہ ضرور مل جائے گا جو بقول شاعر: ''دامن دل می کشد کہ جا اینجاست۔'' میں اپنے اس دعوے کی تائید میں مظفر حنفی کے مجموعے سے پچاسوں اشعار پیش کر سکتا ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرے اس دعوے کی تصدیق کے لیے آپ خود ان کے شعری مجموعوں کا مطالعہ کریں تا کہ آپ کسی بھرم میں نہ رہیں۔ ان سب باتوں پر مستزاد مظفر حنفی کا صحت مند، با مقصد، حقیقت پسندانہ اور انسان دوست مسلک فکر ہے جس کا بیان انھوں نے صرف اپنی غزلوں، نظموں میں ہی نہیں بلکہ اپنی

تحقیق،تنقید،افسانے،سفرنامے،تراجم میں بھی کیا ہے۔ پراگندہ خیالی اور کج مج نویسی کے اس دور میں پروفیسر مظفر حنفی جیسے ادیبوں،شاعروں کی ہر تحریر مستحسن ہے۔میرے لیے یہ بات قابل فخر ہے کہ مجھ جیسے طالب علم کو ایسے فن کار پر قلم اٹھانے کا موقع ملا جس کی تحریریں آئندہ نسلوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔

ڈاکٹر مظفر حنفی کی مختلف موضوعات پر اب تک ۷۱ رکتابیں شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔ان کے شعری مجموعوں میں پانی کی زبان ۱۹۶۷ء،'تیکھی غزلیں'،۱۹۶۹ء'عکس ریز'طویل طنزیہ نظم ۱۹۶۹ء'صریر خامہ' ۱۹۶۹ء،'دیپک راگ'۱۹۷۴ء،'یم بہ یم'۱۹۷۹ء،'طلسم حرف'۱۹۸۰ء،'کھل جا سم سم'۱۹۸۱ء،'پردہ سخن کا'۱۹۹۶ء، 'یا اخی'۱۹۹۷ء،'پرچمِ گرد باد'۲۰۰۱ء،'ہاتھ اوپر کیے'۲۰۰۲ء اور'آگ مصروف ہے'۲۰۰۴ء وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ وہیں اگر ان کے افسانوی مجموعوں پر نظر ڈالیں تو ہمیں'اینٹ کا جواب'۱۹۶۷ء،'دو غنڈے' ۱۹۶۹ء،'دیدۂ حیراں'۱۹۷۰ء کے نام دیکھنے کو ملتے ہیں۔ پروفیسر مظفر حنفی نے تحقیق وتنقید کے میدان میں بھی اپنی تحریروں کے انمٹ نقوش مرتب کیے ہیں۔تحقیق وتنقید کے میدان میں ان کی جو تصانیف زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں ان میں'شاد عارفی: شخصیت اور فن'۱۹۷۸ء،'نقد ریزے'۱۹۷۸ء،'تنقیدی ابعاد'۱۹۸۰ء،'جہات وجستجو'۱۹۸۲ء،'غزلیات میر حسن'انتخاب ومقدمہ ۱۹۹۱ء،'ادبی فیچر اور تقریریں'۱۹۹۲ء، 'باتیں ادب کی'۱۹۹۴ء ،'محمد حسین آزاد' ۱۹۹۶ء،'حسرت موہانی' (کئی زبانوں میں) ۲۰۰۰ء،'وضاحتی کتابیات'(بائیس جلدیں)۲۰۰۱ء،'شاد عارفی: فن اور فن کار'۲۰۰۱ء،'لاگ لپیٹ کے بغیر'۲۰۰۱ء،'ہندوستان اردو میں'۲۰۰۷ء،'سوالوں کے حصار میں'(انٹرویوز)۲۰۰۷ء،'میر تقی میر'۲۰۰۹ء،'کتاب شماری'۲۰۱۲ء کے نام قابل ذکر ہیں۔ترجمے کے میدان میں بھی مظفر حنفی نے اہم کام کیا ہے۔ان کے تراجم میں'پانچ جاسوسی ناول'۱۹۵۴ء،'دوہری سازش'۱۹۵۴ء،'گلاگ مجمع الجزائر تین'، دفتر ۱۹۷۵ء،'سخاروف نے کہا'۱۹۷۶ء، 'گجراتی کے یک بابی ڈرامے'۱۹۷۷ء،'اڑیا افسانے' ۱۹۸۰ء،'بیداری'۱۹۸۰ء،'بھارتیندو ہریش چندر' ۱۹۸۴ء،'بنکم چندر چٹر جی' ۱۹۸۸ء کے نام قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر مظفر حنفی نے سفرنامہ بھی لکھا ہے۔ان کا سفرنامہ'چل چنبیلی باغ میں'۱۹۹۸ء میں شائع ہوکر منظر عام پر آچکا ہے۔

کسی بھی زبان کے فروغ میں ادب اطفال کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔اردو ادب میں اس کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے۔ادب اطفال پر ہمارے یہاں لکھنے والوں کی بڑی کمی ہے۔لیکن ادب اطفال میں بھی انھوں نے اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔مظفر حنفی کی جو کتابیں شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں ان میں'بندروں کا مشاعرہ' ۱۹۵۴ء،'نیلا ہیرا' ۱۹۷۳ء،'کھیل کھیل میں' ۲۰۰۴ء،'چٹخارے نرسری کے گیت'۲۰۰۷ء،'بچوں کے لیے' ۲۰۰۸ء کے نام قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر مظفر حنفی نے ترتیب وتدوین کے ذریعہ بھی اہل قلم کو متوجہ کیا ہے۔انھوں نے جن اہم کتابوں کی ترتیب وتدوین کی ہے اس میں'نئے چراغ' ماہنامہ ۱۹۵۹ء،'ایک تھا شاعر'۱۹۶۷ء،'نثر و

غزل دستہ'۱۹۶۷ء،'شوخیِ تحریر'،'شاد عارفی کی غزلیں'۱۹۷۴ء،'کلیات شاد عارفی'۱۹۷۵ء،'جدیدیت تجزیہ وتفہیم' ۱۹۷۱،'جائزے'۱۹۸۵ء،' آزادی کے بعد دہلی میں اردو طنز ومزاح'۱۹۹۰ء،'شاد عارفی ایک مطالعہ'۱۹۹۲ء،'روح غزل'(پچاس سالہ انتخاب)۱۹۹۳ء،'کلیات ساغر نظامی'(تین جلدیں)،'شریسٹھ ایکان کی ہندی'۲۰۰۳ء،'مظفر کی غزلیں' دیوناگری ۲۰۰۳ء،'جھرنے اور بگولے کے بیچ' دیوناگری ۲۰۱۰ء،'مضامین تازہ'۲۰۱۰ء کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں۔

مظفر حنفی کا شمار مدھیہ پردیش کے کثیر التصانیف قلم کاروں میں ہوتا ہے۔مدھیہ پردیش کی تاریخ میں نواب صدیق حسن خاں کے بعد پروفیسر مظفر حنفی دوسرے ایسے ادیب ہیں جنھوں نے مختلف موضوعات پر اتنی بیش قیمت کتابیں تحریر کی ہیں۔ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے صرف کتابوں کی تعداد بڑھانے کے لیے اتنی کتابیں ترتیب دی ہوں بلکہ ان کی ہر کتاب اپنی جگہ اہمیت اور معنویت کی حامل ہے۔ پروفیسر مظفر حنفی نے اپنے کھنڈوہ قیام کے دوران انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کی تھی جس کے ذریعہ اردو طلبا کو تعلیم کے مواقع فراہم کرنے کے لیے عملی اقدامات کیے گئے تھے۔آپ کی تحریک کے بعد کھنڈوہ میں جو اردو میڈیم اسکول قائم کیے گئے تھے وہ آج بھی نہ صرف قائم ہیں بلکہ ان میں اردو طلبا کی ایک بڑی تعداد تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ پروفیسر مظفر حنفی نے ۱۹۵۹ء میں کھنڈوہ سے'نئے چراغ' کے نام سے رسالہ بھی جاری کیا تھا۔گرچہ یہ رسالہ بند ہو چکا ہے لیکن اس کے ذریعہ جو خاص نمبر شائع کیے گئے تھے وہ آج بھی انتہائی اہم ہیں۔



محمد ذکیرالدین ذکی
S-1A/14، جوگا بائی ایکسٹینشن، جامعہ نگر، نئی دہلی، رابطہ:8920653127

مظفر حنفی کی یاد میں

''ہندوستان میں مظفر حنفی کو غزل کا شہنشاہ مانا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ لسانی اور فنی مہارت کے اعتبار سے مظفر حنفی پختہ اور قادرالکلام شاعر ہونے کے ساتھ ہی علم و ادب کے بحرِ بے کراں تھے، ان کی شخصیت نابغۂ روزگار اور اردو ادب کے لیے سنگ میل تھی، ہر ملنے والوں کے لیے وہ شفیق و مہربان تھے، ان کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔ وہ ایک بہترین نقاد اور اپنے استاد کے دل وجان سے قدرداں تھے۔ انھوں نے اپنے استاد شاؔد عارفی پر کارہائے نمایاں انجام دے کر انھیں اَمر کر دیا ہے۔ انھوں نے شاد عارفی ہی کی طرز ادا کو مزید استحکام بخشا۔ آپ کھردرے لہجے اور مخصوص اسلوب کی وجہ سے پہچانے جاتے تھے۔ آپ کی حیثیت نہ صرف بلند پایہ شاعر کی تھی بلکہ آپ اچھے ناقد، مترجم اور قلم کار بھی تھے۔ آنے والی نسلیں مظفر حنفی مرحوم کی قلمی تخلیقات سے مستفید ہوتی رہیں گی۔''

مذکورہ بالا پیراگراف اُن خیالات کا لب لباب ہے جنھیں بے شمار ادیبوں، ناقدوں، قلم کاروں اور دانشوروں نے مظفر حنفی کے انتقال کے بعد سمیناروں اور مختلف رسائل و اخبارات کے ذریعے خراجِ عقیدت کے طور پر پیش کیا۔ اکثر حضرات کے خیالات مذکورہ پیراگراف کے مضامین کے مدار پر گردش کرتے نظر آئے۔ علاوہ ازیں بہت سے قلم کاروں کی وہ نگارشات بھی نظر سے گزریں جنھوں نے اُن سے لحاتی ملاقات کو اپنے لیے باعث فخر سمجھا اور اُن کے ملفوظات کو اپنے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت دی۔ ظاہر ہے جس کسی کے اندر یہ ناپیدا کنار کمالات اور عروج و کمال کا اتمام ہو تو قدردانِ علم و فن ان کو اپنا رہنما و راہبر سمجھنے پر مجبور ہو ہی جاتے ہیں۔

بہرحال پروفیسر مظفر حنفی کی شعری اور نثری خدمات سے اردو ادب کا تقریباً ہر طالب علم آگاہ ہے۔ مظفر حنفی شعر و ادب، تحقیق و تنقید اور دیگر علمی کاموں میں کم از کم چھ دہائیوں تک مصروف عمل رہے۔ وہ ایک ہمہ جہت فن کار تھے۔ ان کا قلم رنگا رنگ موضوعات کی عقدہ کشائی کرتا رہا ہے اور ان کی تحریریں مدلّل

اور صداقت پر مبنی ہیں، جن کے ثبوت کے طور پر ان کی ۹۰ سے زائد کتب موجود ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تحریر کے چند نمونے پیش کر دیے جائیں تا کہ ان کی تحریر کی چاشنی قارئین بھی محسوس کر سکیں۔ اپنے استاد شاؔد عارفی کے تعارف میں لکھتے ہیں:

''دراصل شاؔد عارفی کی شخصیت کا یہ پودا ایک ایسی سرزمین میں کچھ اس قسم کی آب و ہوا پا کر پروان چڑھا تھا کہ اس میں حسین، خوشبودار اور رنگ برنگے پھولوں کے ساتھ نیش عقرب کی سی جلن رکھنے والے کانٹوں کی موجودگی فطری اور لازمی تھی۔ رام پور ویسے ہی متشرع لوگوں کی بستی ہے، شاؔد صاحب کے والد مدرسۃ العالیہ کے فارغ التحصیل مولوی تھے اور اس مولویت کو اُن کی تھانیداری نے کٹّر پن میں تبدیل کر دیا تھا، ماں ایک عالمِ وقت کی بیٹی تھیں، چنانچہ اس گھر کی فضا، جہاں شاؔد عارفی نے آنکھیں کھولیں، مذہبیت اور قدامت پرستی سے مملو تھی۔ باپ اور نانا اُنھیں مولوی بنانا چاہتے تھے جو شاؔد عارفی نہ بن سکے لیکن گھریلو ماحول کے زیرِ اثر مذہب اور کسی حد تک قدامت نے بچپن میں ہی اُن کے دل و دماغ میں اس طرح گھر کر لیا تھا کہ عمر بھر پوری طرح اس سے دست کش نہ ہو سکے۔ اس بات کے شواہد اُن کی نثری و شعری کاوشوں میں جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔'' (کلیات شاد عارفی، جدید ایڈیشن، ص ۳۹)

یہ ہوتی ہے تحریر کہ ایک ایک جملے پر آدمی انگشت بدنداں رہ جائے۔ پھر آگے چل کر شاؔد عارفی کے مزاج و اطوار کا ذکر جس حقیقت بیانی کے ساتھ کرتے ہیں وہ بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے:

''شاؔد عارفی کی جن خداداد پریشانیوں اور ردِ عمل ...... کے نتیجے میں چڑچڑا پن، بہت جلد سیخ پا ہو جانا، خود ترحمی، زود حسی، تشکک مزاجی، اور انانیت نے اُن کی فطرت میں گھر کر لیا۔ آئے دن کی بیماریوں نے ان کمزوریوں کو مزید بڑھاوا دیا۔ ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا لینا، اُس کا بہت گہرا اثر قبول کرنا اور اُتنی ہی شدّت کے ساتھ React کرنا ان کے مزاج میں داخل ہو گیا۔ جزوی اختلاف کے وہ قائل نہ تھے کسی سے ذرا سی ناراضگی کا موقع ملتا تو سلام دعا تک ترک کر دیتے تھے۔ منافقوں کے ساتھ ساتھ اپنے مخلصین پر سے بھی ان کا اعتماد اُٹھ چکا تھا۔ اگر ان کے مزاج سے گہری واقفیت نہ ہوتو کسی کا شاؔد عارفی کے ساتھ زیادہ دن تک نباہ لے جانا مشکل تھا۔
(کلیات شاد عارفی، جدید ایڈیشن، ص ۴۵)

ان دو اقتباسات سے شاد عارفی کا پورا پورا تعارف ہو جاتا ہے۔ یہ ہے قلم کی گرفت جو مظفر حنفی کے قلم کی طاقت تھی، جو جا بجا ان کی تحریروں میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے ادیب ان سے آنکھ ملانے سے کتراتے تھے۔

اب ذیل میں راقم الحروف اور پروفیسر مظفر حنفی کے مراسم کے تعلق سے کچھ باتیں پیش کی جا رہی ہیں۔ واضح ہو کہ جب (۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۵ء تک) ناچیز مشاعروں اور ادبی پروگراموں میں سامع کی حیثیت سے شریک ہوا کرتا تھا تو اکثر مشاعروں اور سمیناروں میں ڈاکٹر مظفر حنفی کے کلام اور خطابات سے مستفید ہونے کا موقع ملتا رہتا تھا، اس کے بعد ادبی پروگراموں میں جانا بہت کم ہو گیا۔ پھر ۲۰۱۳ء کی بات ہے کہ ایک دن اچانک مظفر حنفی صاحب غریب خانے پر آدھمکے۔ جانی پہچانی شکل وصورت لیکن یقین کرنا دشوار کہ یہ مظفر حنفی ہی ہیں یا کوئی اور۔ مجھے حیران و پریشان دیکھ کر وہ خود گویا ہوئے: ''مجھے مظفر حنفی کہتے ہیں۔''

اس جملے سے میں سٹپٹا سا گیا اور یقینِ کامل ہو گیا کہ یہ واقعی مظفر حنفی ہی ہیں۔ میں نے انکساری کے ساتھ عرض کیا: ''فرمائیے، میرے لائق کوئی خدمت؟''

کہنے لگے: ''میاں! تم میرے شاگرد تو نہیں؟''

میں نے کہا: ''حضرت میں آپ کا باقاعدہ شاگرد تو نہیں، لیکن معنوی شاگرد ضرور ہوں۔''

اس جملے سے وہ بہت خوش ہوئے، اور ہونا بھی چاہیے تھا کہ کوئی بھی ادیب اپنے شاگرد کو چاہے وہ معنوی ہی سہی باعثِ فخر سمجھتا ہے۔ پھر کہنے لگے: ''مجھے صغرا مہدی نے تمہارا پتہ دیا ہے اور بتایا ہے کہ 'ایک شخص ایسا ہے جس کو میں اپنا کام دے کر مطمئن ہو جاتی ہوں، تمام امور کمپوزنگ سے لے کر پروف ریڈنگ اور طباعت تک وہی انجام دیتے ہیں۔ میاں! مجھے بھی ایسے شخص کی ضرورت تھی، تمہاری اتنی ساری تعریف سن کر دوڑا چلا آیا ہوں۔''

میں نے عرض کیا: ''یہ تو صغرا آپا کی ذرہ نوازی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ بندہ ہر ممکن ان کی خدمت ضرور کرتا رہتا ہے۔''

پھر انھوں نے ایک کتاب کا مسودہ عطا کرتے ہوئے فرمایا: ''اس کتاب کی کمپوزنگ کرنی ہے۔'' میں نے کہا: ''زہے قسمت کہ آپ کی کتاب کی کمپوزنگ کی خدمت ناچیز کے حصے میں آئے۔''

اس طرح ان سے باہمی مراسم پیدا ہوئے اور ان کی علمی اور عملی صلاحیتوں سے کما حقہ واقف ہونے کا موقع میسر آیا۔ اس کے بعد ناسازیِ صحت تک ان کی بیشتر کتابوں کی کمپوزنگ وتزئین ناچیز کے سپرد رہی۔ اس عرصے میں ان سے تعلق بڑا ہی خوش گوار رہا۔ صحت خراب ہونے سے قبل تک وہ صبح کے وقت ٹہلنے ضرور نکلتے تھے۔ چہل قدمی کے بہانے اکثر غریب خانے پر بھی تشریف لاتے۔ اسی بہانے کتابوں کی کمپوزنگ کی پوزیشن اور ضروری ہدایات مرحمت فرماتے۔ ساتھ ہی ادبی موضوع پر بڑے ہی طمطراق سے واقعات بیان کرتے۔ باتوں باتوں میں کبھی کبھی دو دو گھنٹے بیت جاتے اور وقت کا پتہ ہی نہ چلتا۔ چائے کے لیے پوچھا جاتا تو کہتے کہ ''مجھے شوگر ہے بھائی! میں چائے کہاں پیتا ہوں'' جب ان کے لیے بغیر شکر کی چائے پیش کی جاتی تو شوق سے

نوش فرماتے اور کہتے ''میاں زحمت نہ کیا کرو، ورنہ پھر ہماری آمد و رفت کم ہو جائے گی۔'' جو بات بھی ہوتی وہ بہت ہی صاف صاف کہہ دیا کرتے تھے۔ مجھے شرمندگی بھی ہوتی، لیکن ان کے جذبات وخیالات سن کر مبہوت ہو جاتا۔ ایک بار کہنے لگے: ''تمہارے نام کے ساتھ ذکی کا جو تخلص جیسا لاحقہ ہوتا ہے، کیا تم شاعری واعری کیا کرتے ہو یا یوں ہی یہ لاحقہ استعمال کرتے ہو؟''

میں نے عرض کیا: ''حضرت! کسی زمانے میں شاعری کا بھوت چڑھا تھا اور کچھ کہہ بھی لیا کرتا تھا۔ لیکن جب میں نے آپ جیسوں کی شاعری پڑھی اور سنی، ساتھ ہی زمانے کے حوادثات اور گھریلو ذمے داریوں نے آ گھیرا تو یہ بھوت اُتر گیا۔''

کہنے لگے: ''اچھا ہے، یہ شاعری انسان کو کہیں کا رہنے نہیں دیتی، اس لیے یا تو اچھی شاعری کی جائے یا پھر اس کو چھوڑ ہی دیا جائے تو بہتر ہے۔''

کتنے صاف گو تھے مظفر حنفی؟ اس مشورے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مصلحت کو طاق پر رکھ کر حقیقت پر نظر رکھتے تھے۔ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو شاعری سے دستبردار ہونے کا مشورہ کبھی نہ دیتا۔ اپنا کام نکالنے کے لیے کچھ گر بتاتا اور اسے اپنا ماتحت کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن وہ تو خیر خواہی کا مجسمہ تھے، انھیں ان باتوں سے کیا لینا دینا۔

ان کی انکساری کا یہ عالم کہ اپنا مسودہ یا کمپوز شدہ مضامین کے لیے کبھی گھر پر نہیں بلایا بلکہ وہ خود تشریف لاتے اور مسودہ دے جاتے یا کمپوز شدہ مواد لے کر جاتے۔ اتفاق سے جب کبھی ان کی طبیعت خراب ہوتی تو ناچیز خود ہی ان کے گھر پہنچ جاتا تو وہ خاطر میں کسی قسم کی کسر باقی نہیں رکھتے تھے۔ میں نے ان جیسا خاطر مدارات کرنے والا شخص نہیں دیکھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ معاوضہ وہ خود طے کرتے تھے اور ادھر کام پورا ہوا چیک یا رقم حاضر۔ حساب کتاب میں ایسے بے باک کہ ان جیسے اب دنیا میں کمیاب ہیں۔

پہلی بار جب وہ ۲۰۱۳ء میں تشریف لائے تھے (جیسا کہ اوپر گزر چکا) تو فرمایا تھا کہ شاد عارفی میرے استاد ہیں جن کی وفات کے ۵۰ سال پورے ہو گئے ہیں اور انہی کے کارناموں پر یہ مسودہ ہے۔ جب اس کتاب کو کمپوز کرنے لگا تو حیرت زدہ تھا کہ ایک شاگرد اپنے استاد کی زندگی کے ہر گوشے کو اس طرح اجاگر کر سکتا ہے گویا وہ استاد کی زندگی کے ہر لمحہ میں موجود ہو۔ یہ کتاب ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل تھی۔ اس سے قبل ناچیز نے شاد عارفی کا صرف سرسری نام سنا تھا، اس کتاب کو پڑھ کر ان کی زندگی کے ہر گوشے سے واقف ہوا۔ بہر حال وہ میرے کام سے اتنے مطمئن ہوئے کہ ان کی وہ کتابیں بھی جو چھپ چکی تھیں نظر ثانی کے بعد یکے بعد دیگرے کمپوز کرا کر دوبارہ شائع کرائیں۔ خاص طور پر 'کلیاتِ شاد عارفی' جو ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تھی جس کی ضخامت ۴۶۲ صفحات پر مشتمل تھی، اس میں اضافہ کر کے تقریباً ساڑھے نو سو صفحات کی کتاب تیار کر دی، جسے رام پور رضا لائبریری نے بڑے اہتمام کے ساتھ دوبارہ شائع کیا ہے۔

مذکورہ دونوں کتابوں اور دوسری چھوٹی کتابوں کے علاوہ ان کی کئی ضخیم کتابیں بھی میرے ہاتھ سے کمپوز ہوکر گزری ہیں۔مثلاً ’گفتگو: دو بدو‘(۲۰۱۳ء)،۲۵۶رصفحات،’تنقیدی نگارشات‘ (۲۰۱۴ء)،۴۳۲رصفحات، ’بھولی بسری کہانیاں‘(۲۰۱۵ء)،۴۴۰رصفحات،’چنیدہ‘(۲۰۱۵ء)،۳۶۰رصفحات،’ کچھ انٹرویوز‘(۲۰۱۵ء)، ۲۲۸رصفحات،’منتخب کلام شاد عارفی‘۴۴۰رصفحات،’سالک لکھنوی‘۲۰۷رصفحات وغیرہ۔

اس کے علاوہ فیروز مظفر کی مرتبہ تین ضخیم کتابیں:’شاد شناسی (۲۰۱۸ء)‘ ۵۲۰رصفحات،’مظفر حنفی: حیات وجہات‘ (۲۰۱۳ء) ۵۴۴رصفحات، اور’شاد عارفی: حیات و جہات‘ (۲۰۱۴ء) ۴۵۶رصفحات، بھی انھیں کے توسط سے کمپوز کی گئیں۔ان کتابوں کے علاوہ بہت سے مضامین جو رسائل واخبارات میں شائع کرنے کی غرض سے بھیجا کرتے تھے انھیں کمپوز کرنے کا شرف بھی ناچیز کو حاصل تھا۔ مذکورہ کتابوں کے کمپوز کرنے کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ مظفر حنفی صاحب سے قربت کا ایک طویل عرصے کا اندازہ ہو جائے۔اس دوران ان سے بہت کچھ حاصل کرنے اور سیکھنے کو ملا۔



''مظفر حنفی جس بے تکلفی کے ساتھ عام بول چال کی زبان میں رواں دواں شعر کہتے ہیں اور بات کہنے کے لیے جن انوکھے اور نادر اسالیب بیان سے کام لیتے ہیں اس کی مثال ان کے معاصرین میں نظر نہیں آتی۔ زبان پر ان کی گرفت مضبوط ہے اور اس کی لطافتوں اور نزاکتوں سے مظفر کی گہری شناسائی ہے......مطالعے اور مشاہدے کے تال میل سے وہ ایسے ایسے پہلودار شعر تیار کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں جن میں جذبے کی گھلاوٹ، فکر کی شادابی، احساس کی گرمی، طرزِ ادا کی ندرت اور جدید حسیت شیر وشکر کی طرح آمیز نظر آتے ہیں......مظفر حنفی کے اکثر اشعار میں ایک خاص نوع کی واقعاتی فضا پائی جاتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے افسانے کے کسی مرکزی واقعے کو شعر کا قالب عطا کر دیا گیا ہے۔شعریت اور واقعیت کا یہ امتزاج ان کے کلام کو ایک ایسی کیفیت کا حامل بنا دیتا ہے جس کا ذائقہ ہم عصر شاعری سے بالکل الگ ہے۔'' **(گوپی چند نارنگ)**

شاعری

پروفیسر محمد زماں آزردہ
سری نگر

مظفرؔ حنفی کا منفرد اندازِ فکر: چند اشعار کے حوالے سے

مظفر حنفی کی ادبی شخصیت ہمہ پہلو ہے۔ اُنھوں نے تقریباً سبھی اصنافِ نظم ونثر میں طبع آزمائی کی ہے۔ اوّل تو لوگ اسی پر حیرت زدہ ہیں کہ اس آدمی کو زندگی کے جھمیلوں سے اتنی فرصت کیسے ملی جو اتنا لکھ پائے، دوسرے یہ کہ ایک ذات کے اندر اتنی چیزیں، اتنے ہُنر جمع ہونا ایک غیر معمولی بات ہے۔ بہر حال اس کے بارے میں اس کے سِوا کیا کہیے کہ:

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مظفرؔ حنفی صاحب کی تخلیقی کاوشوں کو کسی ایک حکم میں جمع کرنا نہ تو ممکن ہے نہ مناسب۔ زندگی کے تقریباً سبھی پہلوؤں پر اُنھوں نے نہ صرف سوچا ہے بلکہ کچھ نہ کچھ، کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی صورت ضرور کہا ہے۔ ایسے موقعوں کے لیے خواجہ حیدر علی آتشؔ کا یہ شعر ہماری ضرور رہنمائی کرتا ہے۔

کہے جاتے وہ سنتے یا نہ سنتے زباں تک حالِ دل آیا تو ہوتا

یوں تو سبھی اپنے اپنے طور پر بقدرِ فکر خود حالات کو دیکھتے ہیں، کوائف سے نبرد آزما ہوتے ہیں، نتائج اخذ کرتے ہیں، شکار ہوتے ہیں یا شکار کرتے ہیں مگر سبھی ان کوائف کا، اپنے تاثرات کا اور اپنے ردعمل کا اظہار نہیں کر پاتے بلکہ چپ چاپ بغیر کسی چاپ کے آگے نکل جاتے ہیں۔ آگے چل کے پھر ان کی لن ترانیاں اور مبالغہ آرائیاں بھی اس طرح سامنے آتی ہیں کہ آدمی کو کافی محنت کے باوجود حقائق تک رسائی نہیں ہوتی۔ مظفرؔ حنفی صاحب کا معاملہ یہ ہے کہ ان کے فن میں لاکھ پیچیدگیاں سہی مگر اپنے اظہار میں یہ ایسی سادگی اختیار کرتے ہیں کہ لگتا ہے کہ ایک معصوم بچہ فطرت کی آغوش میں کھیلتا مسکراتا ہوا کبھی ایک انگلی پکڑتا ہے تو کبھی دوسری، کبھی ایک کان کو پکڑ کے کھینچنے لگتا ہے تو کبھی دوسرے کان پر تھپکیاں دیتا ہے اور کبھی سورج کی کرنوں کو اپنی مٹھی میں بند کرنا چاہتا ہے، کبھی یہی بچہ اپنے گھٹتے بڑھتے ہوئے سایہ کے پیچھے دوڑ کر اسے پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس معصوم بچے کی سمجھ میں روشنی کا یہ کھیل نہیں آتا جب کہ مظفر حنفی صاحب جانتے ہیں کہ اس سایہ کی

تکیل، قریب یا دور ہوتی ہوئی روشنی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ بیک وقت سایہ پر بھی نگاہ رکھتے ہیں اور روشنی کو بھی آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ مثال کے طور پر آج کل ہر حکومت کو اپنے چاروں طرف یا تو باغی نظر آتے ہیں یا وفادار۔ ملک سے وفاداری کا مطلب ہے حاکم سے وفاداری، اور حاکم سے بغاوت کا مطلب ہے ملک سے غداری اور بغاوت۔ یہ تو سنا تھا کہ حاکم خدا بن بیٹھتا ہے مگر اس طور پر کہ اپنے سے انحراف کرنے والوں کو حکم کفر دے کر ملک دشمن قرار دے گا، اس پر یقین نہ تھا۔ وجہ یہ ہے کہ جمہوریت کے پردے میں انسان نے آزادیِ رائے، اظہارِ رائے اور اس طرح کی بیشتر اصطلاحوں سے آشنائی حاصل کر لی تھی مگر یہ آشنائی محض لغت آشنائی تھی، جس میں دیے ہوئے مفاہیم گمراہ کن ہوتے ہیں۔ مظفر حنفی صاحب روایت سے بھی واقف ہیں اور بغاوت کے اسباب سے بھی۔ غالبؔ نے کہا تھا ''ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نہ کرد'' مگر آج کے دور میں صاحبِ نظر ہونے سے مراد ہے کہ آدمی حاکم کی پسند اور ناپسند کو پہچانتا ہو، اُس میں حاکم کی غلطیوں کو نظر انداز کرنے کی صلاحیت ہو۔ مظفر حنفی کہتے ہیں:

جو دہشت گرد کہہ کر بے خطا پر وار کرتے ہیں
زمانے کو بغاوت کے لیے تیار کرتے ہیں

اُن کا اندازِ فکر صاف اشارہ کرتا ہے کہ جو کہا جاتا ہے، اُس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا ہے اور جو نظر آتا ہے اُس میں بھی نظر کی رفتار، روشنی کی مِقدار اور فاصلے کی فریب کاری کا اثر نمایاں ہو سکتا ہے۔ غالبؔ نے جب یہ کہا تھا کہ۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

اُس وقت نہ ٹیلی ویژن تھا اور نہ اس کی اتنی خبروں والی چینلز اور نہ اتنے اخبار اور نہ یہ جمہوریت کہ ہزاروں لوگ ہر طرف سے انگلی اُٹھا کر ایک ہی نشانے پر رکھیں اور لوگوں کو واقعے کی وہ صورت دکھائیں جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ ہر حاکم یہ چاہتا ہے کہ لوگ اُس کی نظر سے ہر چیز کو دیکھیں۔ لوگ شریف بنیں اور شرافت کا معیار حاکم کی نظر میں یہ ہے کہ آدمی کو نہ بھوک ہو، نہ کسی چیز کی ضرورت، نہ اُس کی زبان پر کوئی حرفِ شکایت آئے، سر اُٹھا کر چلنے کی ہمت بھی نہ ہو اور اس کے انگ انگ سے وفاداری ٹپکتی ہو۔ مظفرؔ حنفی اس صورت حال کا نتیجہ اور اس نتیجے کا سبب یوں سامنے رکھتے ہیں۔

ہزاروں صدیوں کی روندی ہوئی شرافت ہوں
یہی سبب ہے کہ میں سر بسر بغاوت ہوں

وفاداری اور بغاوت کے معنی وہی سمجھتے ہیں جو مکہ مسجد اور مالیگاؤں کے دھماکوں کے الزام میں ملوث

کیسے گئے اُن بے قصور نوجوانوں کی حقیقت جان چکے ہوں جن کی خطا محض یہ تھی کہ حاکم کو ایک ڈھال چاہیے تھی، ریڈیو، ٹی وی اور اخباروں کو خبر چاہیے تھی۔ وفاداری اور بغاوت کے معنی اُس پادری سے زیادہ کون جان سکتا ہے جسے اپنے بچے سمیت اڑیسہ میں جلا دیا گیا۔ مظفر حنفی صاحب کا اندازِ فکر اور اندازِ تخاطب دیکھیے۔

ملا سکتے ہو کیا ہم سے نگاہیں
بغاوت کی سزا دینے سے پہلے

پرانا محاورہ ہے کہ کام کرے سپاہی اور نام بلند ہو سردار کا۔ آج کل کی دنیا میں قابل لوگ، محنتی لوگ، اہلِ فکر و نظر کسی نہ کسی سبب سے مہرے بنتے ہیں، دوسروں کے آلۂ کار بنتے ہیں۔ آج کی دنیا اشتہاری ہے، اشتہار کی استطاعت ہر آدمی کے پاس نہیں ہوتی۔ آدمی شریف ہو تو وہ اپنی تعریف پسند ہی نہیں کرتا۔ سنسکرت میں ایک تمثیل میں آیا ہے کہ ''تعریف ایک کنواری لڑکی ہے، اس کی شادی کرنا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ تعریف کو دولھا پسند ہو اور دولھا بھی تعریف کو پسند کرے۔ پوری دنیا میں تلاش کیا، جس کو تعریف نے پسند کیا اُس نے تعریف کو پسند نہیں کیا اور جس نے تعریف کو پسند کیا اُس کو تعریف نے پسند نہیں کیا۔ یوں تعریف ساری زندگی کنواری رہی۔'' اس لیے جو لوگ اپنا اشتہار پسند کریں، اپنی تعریف کروائیں وہ تو سب کو نظر آئیں گے لیکن اس تعریف کے پیچھے جن لوگوں کی خاموشی، ایثار اور محنت ہوتی ہے وہ گم نام رہتے ہیں۔ اہلِ علم و ہنر اس حقیقت سے واقف ہیں۔ مگر بہت کم ایسے ہیں جو مظفر حنفی کی طرح اس کو زبان پر لاتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

محنت کسی کی نام کسی کا ہُوا بلند
ذرّے سمٹ گئے تو بگولا ہوا بلند

اس کیفیت کی سامنے کی مثال تو مضامین کے وہ مجموعے ہیں جو لوگ مختلف سمیناروں میں آ کے پڑھتے ہیں اور ایک آدمی ایڈٹ کرنے کے نام پر دو ڈھائی صفحے کا مقدمہ یا پیش لفظ لکھ کے ان کے مقالوں کو کتاب کی صورت میں شائع کرتا ہے۔ اشتہار تو اس مجموعے کے سرورق پر چھپا ہوتا ہے اور شرافت، محنت اور لیاقت اندرونی صفحات میں چھپی ہوئی۔ بہرکیف یہاں بیشتر لوگ زینہ بنتے ہیں، کچھ اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے اور کچھ دوسروں کی عیّاری کے سبب سے۔ اندازہ کیجیے ان لوگوں کی سینہ زوری کا جو دوسروں کے کندھوں پر سوار ہو کے اُن ہی کو اُن کے بونے پن کا طعنہ دیتے ہیں۔ مظفر حنفی نے اس کیفیت کو یوں بیان کیا ہے۔

جا کر بلندیوں پر وہ طنز کر رہے ہیں
ہم لوگ جن کی خاطر زینہ بنے ہوئے تھے

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ زندہ رہنے کے لیے کسی کی جان نہیں لیتے بلکہ سقراط کی طرح خود مرتے ہیں، سربلند ہونے کے لیے دوسرے کے کندھے پر نہیں، بلکہ سرِ حسین کی طرح نیزے کی نوک پر

سوار ہونا پڑتا ہے۔

اصل میں شاعری کی حقیقت یہ ہے کہ اِدھر کانٹا چبھا اُدھر آہ نکلی۔ یہ آہ چاہے خاموش ہو یا چیخ بنے، مگر کانٹا چبھنے پر اس کے ردِّعمل کا اظہار فطری ہے۔ یہ آہ یا چیخ 'صداقت نشاں' ہوتی ہے۔ آج کی دنیا میں سچائی پر اتنے پردے چڑھائے جاتے ہیں کہ شاید ہی کوئی حقیقت تک رسائی حاصل کرتا ہے مگر ان حالات میں بھی ایسے سرپھروں کی کمی نہیں جن کا یہ پہلا اور فطری ردِّعمل سامنے آ ہی جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اِس کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ مگر وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ کہی ہوئی یا لکھی ہوئی بات ایک نہ ایک دن ضرور سامنے آ کے رنگ دکھاتی ہے۔ مظفر کہتے ہیں۔

سچ کہنا فطرت ہے میری لیکن اکثر سوچتا ہوں
نقاروں میں کون سنے گا طوطی کی آواز یہاں

میرؔ نے کہا تھا کہ فتح و شکست نصیبوں سے ہوتی ہے مگر یہ بات اہم ہے کہ دلِ ناتواں مقابلہ کرے۔ مظفر حنفی اپنے آپ کو آج کے دَور کی بیساکھیوں کے اعتبار سے بے دست و پا مانتے ہیں مگر لڑنے اور مقابلہ کرنے میں جو مزہ ہے، اُس سے وہ محروم نہیں رہنا چاہتے، اس کے پیشِ نظر کہتے ہیں کہ۔

نقارہ و علَم تو میسّر نہ تھے اُنھیں
پھر بھی یزیدیوں سے مظفرؔ بہت لڑے

مظفر حنفی کے یہاں بیسیوں ایسے اشعار آسانی سے ملتے ہیں جن سے اُن کے اندازِ فکر کی انفرادیت سامنے آتی ہے اور یہ محسوس کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی کہ اُن کا زاویۂ نگاہ عام ہونے کے باوجود خاص بھی ہے اور اُن کا ردِّعمل اُن کو عوام سے قریب بھی رکھتا ہے اور اپنے مقام پر مستحکم بھی۔

○○○

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید
حیدرآباد

'آگ مصروف ہے'

اب زندگی میں اتنی جاذبیت اور کشش، اتنی رونق اور چہل پہل، اتنی حلاوت اور شیرینی اور اتنا کیف و سرور کہاں رہا ہے کہ شعر و ادب میں اس کی جھلکیاں ملیں۔ ادب کو زندگی کا ترجمان کہا گیا ہے اور یہ ایسی اٹل اور قطعی حقیقت ہے کہ ہر دور میں اس کی سچائی کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ آج سے نہیں ابتدا سے، شعر و ادب کے ازل سے، ہر ادیب، شاعر اور قلم کار نے وہی لکھا جس میں اس نے زیست کی، جو اس نے اپنے آس پاس دیکھا۔ جس کو برتا جس کو گوارا کیا، تھوڑی بہت حاشیہ آرائی اور تخیل کی کارفرمائی ہونی چاہیے وہ ہوتی رہی۔ ہم سب سے اکثر یہ کہتے ہیں کہ محمد قلی قطب شاہ کی شاعری زندگی سے دور تھی۔ داغؔ اور کئی کلاسیکی شاعروں نے اپنے اطراف ہونے والے حقائق کو نظر انداز کر دیا۔ یا فلاں شاعر کے پاس صرف ادب برائے ادب ہے۔ اس کے تخلیق کردہ ادب کا زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ ایسا نہیں، بات دراصل یہ ہے کہ جن شاعروں کے بارے میں ہم کہہ رہے ہیں ان کے دور میں زندگی ایسی ہی تھی۔ محمد قلی قطب شاہ کی زندگی میں کون سی پیچیدگی تھی، عیش و عشرت کی ساری سہولتیں موجود تھیں۔ بن مانگے ہر شے حاضر تھی۔ محمد قلی قطب شاہ ایسی شاعری نہ کرتا تو اور کیا کرتا۔ داغؔ کے دور میں قلعۂ معلیٰ سے باہر زندگی پارہ پارہ تھی۔ ویرانیوں اور وحشتوں کا دور دورہ تھا، بکھراؤ عام تھا۔ کہنے کو بہادر شاہ ظفر بادشاہ تھے لیکن داغِ فراق صحبتِ شب کی جلی ہوئی شمع کی طرح جو خموش ہو چکی تھی۔ داغ نے بھی ایسا نہیں کہ قلعہ کے باہر کی زندگی سے صرف نظر کر لیا ہو۔ انھوں نے تھوڑا بہت دیکھا اور اس کا اظہار جہاں تک ہو سکا اپنے اشعار میں کیا بھی اور کہیں تو یہ بھی کہہ دیا کہ ان پر جو صدمے گزر رہے ہیں آپ بندہ نواز کیا جانیں اور یہی احوال، حالیؔ، شبلیؔ، اقبالؔ اور پریم چند کے دور کے قلم کاروں کا رہا۔ ترقی پسند تحریک کے زمانے کا اور پھر ادھر جدیدیت اور پھر مابعد جدیدیت کا۔ آج کا شاعر، آج کا قلم کار وہی لکھ رہا ہے جو وہ دیکھ رہا ہے جو اس پر بیت رہی ہے۔ ماضی کے کسی بھی دور کا شعر و ادب۔ اس دور کی زندگی کا ترجمان تھا اور آج کا شعر و ادب آج کے حالات اور شب و روز کا آئینہ دار ہے۔ (ہاں بعض ایسے قلم کار بھی ہوتے ہیں جو ماضی ہی کے کسی بھولے بسرے

دور کی راگنی الاپتے ہیں۔ لیکن یہاں ایسے فن کاروں سے بحث نہیں) آج کے دور کی پیچیدگیاں، کچھ اور ہی نوعیت رکھتی ہیں۔ اب مقامیت، علاقائیت اور قومیت کی اصطلاحیں اپنا مفہوم بدلتی جا رہی ہیں۔ یہ گلوبل ازم کا دور ہے۔ کمپیوٹر نے وہ رنگ جمایا ہے کہ نئی حقیقتوں کو تسلیم کیے بغیر چارہ ہی نہیں۔ سائنسی ترقیات اور صنعتی ایجادات نے معاشرہ ہی نہیں ادبی منظر نامہ بھی بدل دیا ہے۔ ادبی سطح کچھ اور ہوتی جا رہی ہے۔ ویسے آج ترقی پسندی کو بھی رنگ و آہنگ دینے کی سعی جاری ہے۔ جدیدیت کے ہمنوا، جدیدیت کی جے جے کار کر رہے ہیں اور مابعد جدیدیت والے بھی اپنی دھن میں گا رہے ہیں۔ کون، کیا اور کیسا ہے، اس خصوص میں سوچنے سے زیادہ اس حقیقت کو مان لینا چاہیے کہ یہ سب ہیں اور ان کے وجود کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ ہم عصروں میں بہت کم قلم کار ایسے ہیں جنھوں نے حالات خواہ کیسے ہی ہوں صالح اقدار کا ساتھ دیا نہ تو جدیدیت کے نام پر زندگی کو فراموش کیا اور نہ ماضی کی زنجیروں میں اسیر رہے۔ اور بھی کئی شاعر ایسے ہیں لیکن یہاں میں نام لوں گا مظفر حنفی کا جن کی شاعری کلاسیکی اقدار سے بھی اپنا رشتہ رکھتی ہے اور جنھوں نے عصری صداقتوں کو بھی ملحوظ رکھا، اور اپنی شناخت بھی برقرار رکھی۔ مظفر حنفی کے کوئی ۱۵۔ ۱۲ر شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ پانی کی زبان، یم بہ یم، صریر خامہ، دیپک راگ، کھل جا سم سم، پردہ سخن کا، یا اخی اور ہاتھ اوپر کیے وغیرہ اور اب ان کا شعری مجموعہ آیا ہے 'آگ مصروف ہے'۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ مظفر حنفی کے شعری مجموعوں کے عنوان ہی ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اپنی شاعرانہ انفرادیت اور شناخت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرورؔ نے مظفر حنفی کے ایک شعری مجموعہ 'یا اخی' کے پیش لفظ میں لکھا ہے:

> ''یہ شعروں کے تیروں اور غزلوں کی چڑھی کمانوں، یہ سخت زمین اور رواں دواں آبشار کا سا لہجہ، یہ لہو میں تر اشعار، یہ کھری زبان، یہ دل کے لہو کی بوند، یہ آسمان پر چھائی ہوئی زمین، یہ سب باتیں مظفر حنفی کے لہجہ ان کی کھردری، تیغ کی سی تیزی رکھنے والی زبان کے متعلق کیا کچھ نہیں کہتیں۔ ان کے اشعار میں دھیمی دھیمی بہنے والی جوئے آب کی سی سوئی ہوئی روانی نہیں ہے۔ پہاڑی چشمے کی سی تند و تیز لہر ہے۔ ان کے اشعار میں تلوار کی کاٹ ہے۔ ایک برہم نوجوان کے لہجے کی تلخی ہے۔ اس میں کچھ توڑنے اور کچھ جوڑنے کی بات بھی ہے۔ اس میں بگاڑ اور نئے سرے سے بناؤ کی داستان بھی ہے اور اس میں غزل کی کمائی سے کچھ نا آسودگی کی آہٹ بھی۔ یہ ایک سرکش روح کی کہانی ہے اور ایک باغی کا خواب۔ زندگی کا کتنا زہر پی کر یہ امرت حاصل ہوا ہے۔''

مظفر حنفی کے کلام پر یہ نہایت جامع تبصرہ ہے۔ مظفر حنفی کی شاعری کی یہ خصوصیات، ان کی انفرادیت آج بھی برقرار ہے۔ ان کے تازہ شعری مجموعہ 'آگ مصروف ہے' کے مطالعہ کے بعد بھی قاری اس رائے پر قائم

رہے گا۔مظفرحنفی ہیں تو غزل کے شاعر لیکن ’آگ مصروف ہے‘ میں غزلیں اور نظمیں دونوں شامل ہیں۔انھوں نے ان دونوں اصناف کا حق ادا کیا ہے۔عزیز قریشی صاحب نے ’حرف آغاز‘ میں مظفرحنفی کی شخصیت کے بعض گوشوں کو بے نقاب کیا ہے۔مظفرحنفی کی شخصیت کی تفہیم میں اس تحریر سے بڑی مدد ملے گی۔الفاظ کے انتخاب، مصرعوں کے دروبست، لہجہ کی کاٹ اور اسلوب کی طرفگی کے باعث، مظفرحنفی کی آواز ان کی آواز، بن جاتی ہے۔ اور ان کے ہم عصروں کی آواز سے بہ آسانی ممیز بھی کی جاسکتی ہے۔اختر سعید خاں نے ’مظفرحنفی: سخن کے آئینے میں‘ کے تحت لکھا ہے اور خوب لکھا ہے:

’’لہجہ، لفظیات، اظہار کے وسیلے، خیالات کی رو، ندرتِ بیان، جدت طرازی، نئی زمینیں، نئے گوشے، غرض جو کچھ ہے اور جیسا ہے، ان کا اپنا ہے۔‘‘

مظفرحنفی زود گو ضرور ہیں لیکن وہ سنبھل کر شعر کہتے ہیں۔اس لیے ان کے ہاں نہ فنی طور پر ایسی کوئی خامی ملتی ہے اور نہ موضوع کے بارے میں کوئی بے راہ روی۔ نیز ان کے ہاں خیالات کی ایسی تکرار بھی نہیں۔خاص بات یہ ہے کہ وہ نئی نئی ردیفوں اور نئے نئے قافیوں کا استعمال بھی نہایت روانی اور فن کارانہ قدرت کے ساتھ کرتے ہیں۔’آگ مصروف ہے‘ میں جو ردیفیں ہیں ان میں سے چند ایک ملاحظہ ہوں۔میں کیا کرتے ہیں/ چلی ٹھنڈی ہوا/ ہے محرومی محرومی/ بھی پڑتا ہے/ چلو یہاں سے/ کی زد پر ہیں/ جل جائے گا/ لیکن تم لوگ/ وغیرہ جس سے فن اور زبان و بیان پر ان کی بے پناہ دسترس مترشح ہے اور روانی و بے ساختگی بھی لائق داد۔ اختر سعید خاں نے آگے چل کر لکھا ہے:

’’ان کی غزلوں کا معنوی تسلسل اور بے ساختگی اس کے شاہد ہیں کہ ان کا جذبہ، قوتِ تخیل اور قلم تینوں ایک ساتھ چلتے ہیں۔ان کی غزل محض قادر الکلامی نہیں ہے، فطری جوش ہے جو رو کے نہیں رکتا ہے۔‘‘

تغزل، سرشاری اور حلاوت غزل کی جان ہیں اور اس کا انحصار شاعر کے فکری مزاج اور تخیل پر ہوتا ہے۔مظفرحنفی کے ہاں وہ تغزل اور شاعری نہیں جو بہ یک نظر واضح ہوتی ہے۔ بلکہ ان کے ہاں وہ داخلی تغزل ہے جس سے معنویت دو چند ہو جاتی ہے۔ان کی ہر غزل میں دو چار اشعار ایسے ضرور مل جاتے ہیں۔مظفرحنفی کی شاعری اپنے اطراف و اکناف کی بو باس سے بھری پڑی ہے۔غزلوں کے اشعار میں بھی اور نظموں سے بھی انھوں نے اپنی عصری حسیت کا ثبوت دیا ہے۔ زندگی کی بے معنویت، اقدار کی گم شدگی، معاشرتی انتشار و اختلال، سیاستدانوں کی خود غرضی، مذہبی جنون، استحصال، افراتفری اور کیا کیا کچھ۔مظفرحنفی کھلی آنکھ سے ان سب کا نظارہ کرتے ہیں۔خاص طور پر ان کی نظمیں ’فلسفے کے شہر میں‘، ’خوف در خوف‘، ’جنس سے ہٹ کر‘، ’پرتوں کا زنداں‘، ’موت کا دوسرا نام‘، ’آگہی کا غم‘، ’ڈھلتے سورج کی دوپہر‘ اور ’اندھیر نگری‘ وغیرہ میں ان کی جاگتی عصری حسیت

ملے گی۔خاص طور پر فسادات کے موضوع پر ان کے ہاں اشعار مل جائیں گے۔نظم ’ایک فساد زدہ رات‘ پڑھیے ایک بے نام خوف، عدم اعتماد کی فضا، شکوک و شبہات کا ماحول، کتنی حقیقت پسندانہ عکاسی ہے اور پھر فسادات کے ذیل میں غزل کے یہ دو اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔

ذرا سی بات پہ واویلا اس قدر نہ کرو
جلے ہیں شہر میں دو چار گھر زیادہ نہیں

......

نہ جانے کیوں مرا گھر جل رہا ہے اور وہ خوش ہیں
یہی ہمسائے کل تک مجھ سے بے حد پیار کرتے تھے

مظفرحنفی نے غزلیں، نظمیں اور آزاد نظمیں ہی نہیں کہی ہیں، ان کے ہاں نثری نظم اور رباعیات بھی ہیں۔رباعیات ان کے فن کی پختگی کی دلیل ہیں۔آخر میں ان کے اس شعری مجموعہ سے غزلوں کے چند اشعار۔

رنگ جتنے ہیں اس گلی کے ہیں
ساری خوشبو ادھر سے آئی ہے

دل سے اس کی یاد کیسے محو کردوں
کیوں انگوٹھی سے کوئی ہیرا نکالے

دنیا کو آپ میری نظر سے نہ دیکھیے
میں عرض کر چکا ہوں کہ دیکھی نہ جائے گی

سچ بولنے کا تجھ کو بڑا اشتیاق ہے
اچھا تو سر سے باندھ کفن میرے ساتھ آ

اسی کو باندھ کے پھینک آئے لوگ دریا میں
وہی تو شہر میں کشتی بنانے والا تھا

میرا تمہارا ساتھ ہے اس مصلحت کے موڑ تک
تم کو کنارا چاہیے مجھ کو سمندر چاہیے



’’......غزل میں تو بہت پہلے ہی آپ اپنی انفرادیت کا لوہا منوا چکے تھے، اب نظم گوئی میں بھی آپ کا اپنا اسلوب بن رہا ہے۔آپ کی تیز رفتاری پر رشک آتا ہے۔‘‘

(شہریار)

پروفیسر مجاہد حسین حسینی
ممبئی

اپنی شناخت آپ قائم کرنے والے منفرد شاعر: مظفر حنفی

میرے عزیز بھائی اور اردو کے جانے مانے اُستاد، ادیب اور شاعر جناب پروفیسر مظفر حنفی صاحب کا کلام پڑھ کر مجھ پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکار ہوگئی کہ سچ مچ موصوف کا سارا کلام (جو میری نظر سے اب تک گزرا ہے) منتخب ہے۔ میرے اس قول کو خدارا مدلل مداحی پر محمول نہ کیا جائے بلکہ خود موصوف کے حسبِ ذیل حکیمانہ قول کی بازگشت سمجھا جائے جہاں وہ فرماتے ہیں:

''دراصل میں کسی فن پارے کو اُس کے اندر سے برآمد ہونے والی روشنی میں پرکھنے کا قائل ہوں کہ نظریے کی عینک نقاد کی نگاہ میں بالغ نظری کی جگہ کج بینی پیدا کرتی ہے۔''(۱)

اس قول سے اُسی وقت بھرپور استفادہ کیا جاسکتا ہے جب ہم زیر بحث فن پارے کے متن کو اپنے سامنے رکھیں۔ میرے خیال ناقص میں متن خواہ سال خوردہ ہو یا نوزائیدہ، اُسے صاف ستھرا، قابل مطالعہ، روشن اور صوری ومعنوی ہر حیثیت سے معتبر ہونا چاہیے۔ تخلیق کار کے حسب منشا اور اصلاح کاتب وٹائپسٹ سے محفوظ ہو کیوں کہ:

''صحیح متن کو متعین کرنے کے لیے غیر معمولی علم اور قوتِ فیصلہ کی ضرورت ہے۔''(۲)

اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے ہم مزید ایک تنقیدی گوشے پر بھی غور کرسکتے ہیں جہاں 'متن' کی اہمیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ:

''نئی تنقید متن کے گہرے مطالعے سے عبارت ہے۔ یہاں ہم فن پارے کے لسانی محاسن کو مدنظر رکھتے ہیں تو نفسیاتی، سماجی اور جمالیاتی رویّوں سے استفادہ کرتے ہوئے تخلیق میں چھپے ہوئے معنی تک بھی رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں...... بڑے سے بڑا متن بھی چھوٹے چھوٹے جملوں سے پروان چڑھتا ہے۔ اسی لیے جب آپ متن بنائیں گے تو مقررہ زمان ومکان میں وہ بامعنی بھی ہوسکے گا۔ اگر ایسا ممکن نہیں تو پھر آپ زبان کے وجود کو ہی خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔''(۳)

'متن' کے بارے میں اب تک جو کچھ عرض کیا گیا اس کی حیثیت محض ایک اصول نظری (Theory)

کی سی ہے۔ آیئے اس اصول کا استعمال حضرت مظفر حنفی کی شاعری میں بھی دیکھیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم نے مظفر صاحب کی صرف غزلوں کو ہی اپنا موضوعِ گفتگو بنایا ہے کیوں کہ غزل کے علاوہ موصوف کا ذخیرۂ تخلیقات شعری کافی وسیع اور ضخیم ہے جس پر ایک ہی نشست میں روشنی ڈالنا خاطر خواہ ممکن ومناسب نہیں۔

موصوف کے شعری مجموعے کافی تعداد میں شائع ہو کر ارباب ادب سے داد وتحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان مجموعوں میں غزلیں، نظمیں، رباعیات اور تراجم کیا کچھ نہیں ہے۔ لیکن غزلوں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے۔ مجموعوں کے نام رکھنے میں بھی حنفیؔ صاحب کو غیر معمولی مہارت حاصل ہے۔ ان کے ایسے چند مجموعوں کے نام ہیں: پانی کی زبان، عکس ریز، تیکھی غزلیں، صریر خامہ، دیپک راگ، طلسم حرف، یم بہ یم اور آگ مصروف ہے وغیرہ۔ موصوف کی نثری تخلیقات ایک تفصیلی مضمون بلکہ مبسوط کتاب کا مطالبہ کرتی ہیں۔ فی الحال مظفر صاحب کی غزلوں کا مختصر جائزہ لینا مقصود ہے۔

مظفر حنفی صاحب کے کلام کو پڑھ کر سب سے پہلا تاثر یہ پیدا ہوا کہ موصوف نے ماشاءاللہ ایک بھرپور زندگی گزاری۔ وطن تو قصبہ ہسوہ ضلع فتح پور (یو۔پی) ہے لیکن ولادت باسعادت یکم اپریل ۱۹۳۶ء کو کھنڈوہ (مدھیہ پردیش) میں ہوئی تھی۔ بقول خود تقریباً ۹رسال کی عمر سے شعر کہہ رہے ہیں یعنی ۱۹۴۵ء سے شاعری کررہے ہیں۔ حضرت شادؔ عارفی رام پوری مرحوم کے شاگرد ہونے کے بعد کلام میں کافی زور پیدا ہوگیا لیکن زندگی کے ابتدائی حصہ میں طرح طرح کے دُکھ جھیلنے کی وجہ سے مظفر صاحب میں حد سے زیادہ انانیت اور جذباتیت پیدا ہوگئی۔ خاص طور پر سماج میں نابرابری اور بے انصافی کی وجہ سے مظفر صاحب میں بغاوت اور بے خوفی کا مادہ پیدا ہوگیا جو عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہی چلا گیا۔ 'شب خون' (الٰہ آباد) میں مطبوعہ غزلوں کے حسبِ ذیل اشعار انھیں تلخ وتند حالاتِ زندگی کا آئینہ ہیں۔

اے بام فلک پہ رہنے والو
مٹی کو اگر جلال آیا؟

سورج زیادہ دور نہیں ہاتھ تو بڑھا
محشر کے انتظار میں بینائی جائے گی

دل کا چور یہیں آکر پکڑا جاتا ہے
اپنا دامن سب سے پہلے دیکھا تم نے

دھرتی کا یہ نٹ کھٹ بالک گھر سے ناآسودہ سا
کھیل رہا ہے نیل گگن کے زہریلے غُبارے سے

مشین عہد رواں کی خدا، فریب فریب
یہ ارتقا ہے کہ تحت الثریٰ فریب فریب

خوشبوئیں سر پیٹ رہی ہیں
کھڑکی کھولو، کھڑکی کھولو

ماحول میں زہر گھل چکا ہے
اب خون کثیف کر دیا جائے

جنابِ قیس کے قصّے مجھے نہیں بھاتے
خلانورد کو صحرا نورد کیا شے ہے

مظفر حنفی کی غزلوں میں پایا جانے والا اَکھڑپن ہی ان کے مخصوص لہجے کی شناخت ہے۔ کمال یہ ہے

کہ اس میں ابتذال یا منافیِ فصاحت کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ چند مثالیں دیکھیے۔

تمہاری شان میں کیسے قصیدہ لکھ دیا جائے   میاں میں اپنی کستوری کو کستوری نہیں کہتا
اگر اندر ہی اندر بُغض کے شعلے بھڑکتے ہیں   تو پھر کیا فائدہ آنگن میں پھلواری لگانے سے
چہروں پہ جمی ہوئی تھی بارود   اور امن کی بات ہو رہی تھی
جگمگ جگمگ ارمانوں سے کُلبُل کرتی دنیا   اتنی ساری بندوقیں شمشیریں کیا کرتی ہے
بستی دُھو دُھو جلتی ہے   گھر میں سوتا ہے سیلاب

مظفر حنفی صاحب چوں کہ عرصۂ دراز تک تعلیم و تعلّم سے وابستہ رہے، انھیں کتابوں کے مطالعہ اور قلم فرسائی کا ذوق بھی رہا، مدتوں کھنڈوہ سے ادبی ماہ نامہ 'نئے چراغ' بھی شائع کیا۔ اس لیے اردو زبان کے لسانی مطالعے اور تقریر و تحریر میں الفاظ کے حسن استعمال نیز اُن کے اُلٹ پھیر کا عملی تجربہ خوب ہوا۔ ذہانت، اختراع اور اجتہاد کی صفات مبداءِ فیاض سے ملی تھیں۔ لہٰذا ان کی غزلوں میں ایسی ردیفیں اور قافیے ملتے ہیں جن کا تصور آپ نے اور ہم نے خواب میں بھی نہیں کیا تھا۔ مثالوں کے لیے مندرجہ اشعار دیکھیے۔

ہمیں چُست و نادر قوافی ملے   مضامین تازہ بھی کافی ملے

آتے جاتے ہر دم ٹوکا کرتے تھے کھڑکی دروازے
جھلّا کر آزاد ہَوا نے توڑ دیے کھڑکی دروازے

عالم الغیب نمائش کو نہیں کرتا قبول   آپ کا سجدہ تو پیشانی پہ رکھّا ہوا ہے

اُدھر کنارے کھڑے ہوئے ناقدین شِستیں جما رہے تھے
اِدھر مظفر جمی ہوئی سطحِ آب سے سر نکالتا تھا

نور مانگا تھا تو ناسور ہے پیشانی پر   اور اس پر بھی نہیں دیر و حرم شرمندہ
بے دست و پائی کا تو یہی اک علاج ہے   آوازۂ جرس پہ دمادم سفر سفر
آستیں شبنم نے تر کی سبزۂ بےگانہ کی   غنچۂ نو رستہ کی خاطر چلی ٹھنڈی ہوا
سوائے میرے کسی کو جلنے کا ہوش کب تھا   چراغ کی لَو بلند تھی اور رات کم تھی
چاندنگر میں دھول اُڑائی تارے تارے پھینکے جال   اب میری جھولی میں کیا ہے، محرومی محرومی
سر تا بہ قدم زخم ہیں، اب کیسے بتائیں   گُلدان رہے ہم کہ نمکدان رہے ہم

مظفر حنفی کی غزلوں کا ایک طرۂ امتیاز شوخی اور ظرافت بھی ہے جس سے ان کا کلام کافی دلچسپ اور رنگارنگ ہو جاتا ہے۔ آپ بھی ایسے چیدہ چیدہ اشعار سے لطف حاصل کر سکتے ہیں۔

مری صف کے نمازی، جانتے ہیں، مانتے بھی ہیں   وضو اشکوں سے ہوگا، آب زم زم سے نہیں ہوگا

معراجِ بندگی ہے مرا سر اُٹھا ہوا   سجدے نہ کر سکیں گے نمازی مری طرح
فضیلت کی یہ دستاریں ہمیشہ تنگ کرتی ہیں   ہمیشہ دوسرے کا سر تری دستار سے نکلا
جنھیں زمانے میں ہر شخص، غیر لگتا ہے   انھیں کے پاس مظفرؔ، نظر زیادہ نہیں
نیچے سے بُنیادی اینٹیں کھسکا دیں   چوٹی پر جھنڈے لہرائے یاروں نے
ہمارے زخمِ سر کو ناخنِ وحشت ہی کیا کم تھے   کہ عصری آگہی کے سینگ بھی سر سے نکل آئے

ممکن ہے قارئین کرام یہ پوچھیں کہ آپ نے مظفر صاحب کی غزلوں کے کچھ نمایاں جوہر تو ہمیں دکھائے نہیں۔ یہ بتایئے کہ آپ کے شاعر کے یہاں 'چیزے دگر' بھی ہے؟ میں آپ کے مافی الضمیر کو سمجھ گیا۔ آپ شاید خالص رُومانیت اور تغزل کے نمونے بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ تو لیجیے اس کی چند مثالیں بھی ملاحظہ فرمایئے۔

اب اتنا بُردبار نہ بن، میرے ساتھ آ   بدلیں گے مل کے چرخِ کہن، میرے ساتھ آ
ویسے بھی اپنے دستِ ہُنر کھا رہے ہیں زنگ   پھیکا پڑا ہے رنگ چمن، میرے ساتھ آ
سچ بولنے کا تجھ کو بڑا اشتیاق ہے   اچھا، تو سر سے باندھ کفن، میرے ساتھ آ

اس نے اس انداز سے جھٹکا گیلے بالوں کو
میری آنکھوں میں در آیا پورا کجلی پن
کنبے میں شہرہ ہے جِس کی شوخ طبیعت کا
مرجھائی مرجھائی سی ہے وہ میرے کارن
آنکھوں میں آکر بس جائے ایسا رُوپ اس کا
جھیلیں اس کی آنکھیں جھرنے اس کا الھڑپن

یہاں بھی دُوب اُگی ہے ترے بدن جیسی   یہاں بھی پھول کِھلے ہیں ترے لبوں کی طرح
چوڑی کا ایک ریزہ چبھا تھا کہیں اُسے   میں ایک زخم چوم رہا تھا کہاں کہاں
ان کو چھو کر دیکھ چکا ہوں   سر تا پا بجلی کے نکلے
روز اس کے پاس جا کر بیٹھنا   روز کچھ دیوار جیسا درمیاں
چلنے لگے، تمہاری گلی میں اٹھا کے سر   جب سے سُنا ہے، طرزِ ستم جانتے ہو تم

مذکورہ بالا غزلوں کو پڑھ کر آپ محسوس کریں گے کہ تغزل کے ساتھ ساتھ جہاں روایتی مضامین ہیں وہیں استعاروں اور تلمیحات کا نظام بھی نظر آتا ہے۔ عصری مسائل کی طرف لطیف اشارے بھی ہیں۔

مظفر حنفی کے کلام میں سادگی، روانی، ندرت، خیال افروزی، طنز کی ہلکی سی کاٹ اور ان کا منفرد لب و لہجہ ہر جگہ موجود ہے۔ بہ الفاظ دیگر مظفرؔ صاحب کا ہر شعر خواہ اس کا تعلق کسی خیال، کسی جذبے اور فکر کے کسی پہلو سے

کیوں نہ ہو، پکار پکار کر کہہ دیتا ہے کہ مجھ پر 'مظفر حنفیت' کی چھاپ لگی ہے۔ اسی لیے میں نے اپنے مضمون کی سرخی رکھی ہے: 'اپنی شناخت آپ قائم کرنے والے، منفرد شاعر، مظفر حنفی'

جب مظفر حنفی ہم کو اپنے جدید انداز کے اشعار سناتے ہیں تو ہمیں اُن میں ذرّہ برابر شاعرانہ تفاخر، خودنمائی یا تعلّی کا احساس نہیں ہوتا بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے انکسار سے کام لیا ہے اور مبالغہ آرائی کے قیاس سے اپنے دامنِ فن کاری کو بچایا ہے۔ حقیقت تو وہی ہے جس کا اظہار ہمارے ہم عصر بزرگ ترقی پسند شاعر اور مظفر صاحب کے دیرینہ مرحوم کرم فرما جناب اختر سعید خاں (ایڈوکیٹ) نے کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''مظفر کی ابتدائی شاعری کا مطالعہ کیجیے یا آج کی شاعری کا، قاری کو محسوس ہوگا کہ جو شخص اس سے خطاب کر رہا ہے وہ مکمل اکائی ہے۔ لہجہ، لفظیات، اظہار کے وسیلے، خیالات کی رو، ندرتِ بیان، جدّت طرازی، نئی زمیں، نئے گوشے، غرض جو کچھ ہے، جیسا کچھ ہے، اس کا اپنا ہے۔ اگر کسی دوسرے کا خیال اسے اظہار کے لیے اُکساتا بھی ہے تو وہ اس پر اختلافی نوٹ لگا کر آگے بڑھ جاتا ہے۔''(۴)

میں اپنے اس مختصر سے مضمون کا اختتام حضرت مظفر حنفی کے چند اہم جملوں پر کرنا چاہتا ہوں جو موصوف نے ۱۹۷۳ء میں اپنے لکھے ہوئے ایک مضمون میں تحریر فرمائے تھے۔ اس سے بحیثیت ایک منفرد شاعر اُن کا ادبی مقام معین کرنے میں مدد ملے گی۔ موصوف کا بیان ہے کہ:

''میں ابتدا ہی سے اپنی آواز کو بھیڑ میں کھوئے جانے سے بچانے کی کوشش میں لگا رہا ہوں، اور نئے ادب میں لہجے کی یکسانیت کا الزام کم از کم مجھ پر صادق نہیں آتا۔ ویسے بھی نقادوں میں عام طور پر میرے منفرد رنگ اور مخصوص لہجے کا اعتراف کیا جاتا رہا ہے۔ میرا خیال ہے مخالفین خوش ہو رہے ہوں گے کہ میں نے اپنے گرد جو انفرادیت کا اتنا گھنا تانا بانا بُن لیا ہے۔ اس سے ان کے اس الزام کو تقویت ملے گی کہ نیا ادب حد سے زیادہ انفرادیت پرست ہے اور انفرادیت کی دُھن میں اسلوب کے حُسن کی پروا نہیں کرتا لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے کہ ''فیضان سخن رائگاں نہیں جاتا'' سوچ ہی کہا ہے کیوں کہ یہاں بھی میرے مقطعے اور اشعار مدافعت کے لیے موجود ہیں۔''(۵)

چند مقطعے آپ بھی دیکھیں۔

لفظ و معنی مل گئے، ترسیل ہے جس رنگ میں — اے مظفر ختم ہے وہ رنگ تجھ پر آن کر
لفظوں سے کھیلتے ہیں مظفر غزل میں لوگ — جذبے سے کھینچتا ہوں غزل میں اثر کو میں
اے مظفر، صاف اور تہ دار ہے میری غزل — آپ بیتی ہے، حدیثِ دیگراں ہوتے ہوئے
اُٹھ گیا شعر سے ابلاغ مظفر حنفی — جب تلک تجھ سے بنے، بات بنائے رکھنا

اے مظفر، مرے نقاد نہ مانیں لیکن — اَن گنت رنگ مری طرز ادا سے نکلے
آسان تر ہے آؤ مظفر غزل کہیں — مفہوم کی بھی خیر سے علّت نہیں رہی
اے مظفر، شعر ہیں افکار کی قوس قزح — ایک اچھے شعر کی ہوتی ہیں تفسیریں بہت
پیچیدگیٔ عہد رواں مجھ سے نہ اُلجھے — حاتم کے لیے موت نہیں کوہِ ندا میں
نازک ہے فنِ شعر، مگر طرز نو کے ساتھ — ہم اس حباب کو بھی سلامت اُٹھائیں گے

اے مظفر، نئی شاعری کے لیے شرط ابلاغ اٹھ ہی گئی دیکھنا
شعر سے شعریت بھی نہ جاتی رہے نفسیاتی گرہ کھولتے کھولتے

آج نہیں تو خیر مظفر مستقبل کا کوئی ناقد
میرے فن کی گہرائی میں جدت ہی پا کر جھانکے گا

مظفر حنفی صاحب کی یہ پیشین گوئی انشاءاللہ مستقبل قریب میں اُسی طرح سچ ہو جائے گی جس طرح مرزا اسداللہ خاں غالب کی حسب ذیل پیشین گوئی۔

ہے رنگ لالہ و گُل و نسریں جُدا جُدا — ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

اور جو ایسا ہوا تو اُردو شاعری کے لیے یہ ایک فالِ نیک ہی سمجھا جائے گا۔

ع: ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد!

○○○

حواشی:

۱۔نقد ریزے (شرح گفتار) پہلا ایڈیشن، مارچ ۱۹۷۸ء، ص۹
۲۔ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی: متنی تنقید از ڈاکٹر خلیق انجم (پیش لفظ)، اشاعت اوّل ۱۹۶۷ء، ص۷
۳۔امجد طفیل: مضمون: جدید ادبی تنقیدی نظریے اور متن کی تلاش، مطبوعہ: شب خون، الٰہ آباد، جون تا دسمبر ۲۰۰۵ء، ص ۲۶۱۔۲۶۴
۴۔مظفر حنفی: سخن کے آئینے میں، مشمولہ: آگ مصروف ہے، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال، ۲۰۰۴ء، ص ۱۱۔۱۲
۵۔مظفر حنفی، مضمون: عصری ادب اور میری پہچان، مطبوعہ: شب خون، بحوالہ: نقد ریزے، پہلا ایڈیشن، مارچ ۱۹۷۸ء، ص ۱۴۹۔۱۵۰

○○○

پروفیسر منظر اعجاز
پٹنہ، رابطہ نمبر: 9431840245

مظفر حنفی کے اشعار میں پیکر تراشی کا عمل

ڈاکٹر مظفر حنفی متغزلین عصر میں اپنی مخصوص آواز اور لہجے کے خوش گوار تیکھے پن کے لیے مشہور ہیں۔ میرے نزدیک وہ کثیر الجہت مایۂ شعور اور ہر پہلو سے منفرد نظر آتے ہیں۔ اگر پیکر تراشی کے حوالے سے ان کی غزلوں کے اشعار کا مطالعہ کیا جائے تو یہاں بھی ان کے امتیاز کا ایک اور پہلو سامنے آسکتا ہے، لیکن بہ اعتبار تنقید یہ ایک جزوی معاملہ ہے جسے کلّی تنقید پر منطبق نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم پیکر تراشی جیسے جزوی معاملے پر بھی اظہار خیال کرنے سے پہلے اس کے معنوی حدود یا فنی اصطلاحی مفہوم کو کسی حد تک سمجھ لینا غیر ضروری اور بے محل نہ ہوگا۔

'پیکر' کسی واقعہ، خیال یا تصور کی نقل، پرچھائیں یا عکس کو کہتے ہیں۔ یا تحریر و تقریر کے ذریعہ ذہن پر کسی شے کے اظہار کو پیکر تسلیم کیا جاتا ہے۔ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کے مطابق 'پیکر' وہ شے ہے جو کسی دوسری شے کا تصور کرائے۔ دوسرے لفظوں میں وہ ایک علامت، ایک نشان یا ایک مکمل استعارہ ہے۔

انسائیکلو پیڈیا آف پوئٹری اینڈ پوئٹکس کے مطابق: ''پیکر سے مراد ظاہری مادی محسوسات کے نقش کو ذہن میں از سرِ نو خلق کرنا ہے۔ ایسی صورت میں نقش کا براہِ راست تعلق ہمارے حواس سے ہوتا ہے۔ ایک پیکر، محسوسات و مشاہدات کے وسیلے سے ہمارے حواس کو متاثر کرتا اور پھر متخیلہ کو متحرک کر دیتا ہے جس کے نتیجے میں ہم ان محسوسات و مشاہدات کے نقوش اپنے ذہن میں قائم کرتے ہیں۔ ذہن میں ان نقوش کو قائم کرنے کے لیے ہم زبان سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ زبان کے الفاظ و بیانات انھیں محسوسات و مشاہدات پر مبنی ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر انیس اشفاق نے Rene Wellek and Austin Warren کی کتاب Theory of Literature کا درج ذیل حوالہ نقل کیا ہے:

''نفسیات میں پیکر کا مطلب کسی گزشتہ حسّی یا ادرا کی تجربے کی ذہنی باز آفرینی اور یاد رہے جس کا خود بصری ہونا ضروری نہیں۔''

اور پھر وہ اس خیال کی روشنی میں اظہارِ خیال فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ایسی صورت میں پیکر کا تعلق براہِ راست ہماری تخئیل سے ہوتا ہے۔ پہلے ہم اشیا کا مادی یا ظاہری نہیں بلکہ (ان کی حسّی کیفیت کا) تخیلی ادراک کرتے ہیں اور پھر انھیں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ قاری کے حواس کو متاثر اور متخیلہ کو متحرک کریں۔ اسکاٹ جیمس کے لفظوں میں اسے تخیّلی باز آفرینی بھی کہہ سکتے ہیں۔ ارسطو نے اسے (کرداروں اور منظروں کے ساتھ) فطری ہم احساسی کا نام دیا ہے۔''

اب ہم اگر غور کریں کہ وہ فن جو تحریری شکل و صورت میں تخلیق پذیر ہوتا ہے اس کی اساس کیا ہے؟ تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ فن، فن کار کے تخلیقی وجدان کا جوش یا روح کی آواز ہے۔ یہ آواز مفرد بھی ہوتی ہے اور مرکب بھی۔ مفرد آواز کی ترسیلی علامت حرف اور مرکب آواز کی ترسیلی علامت لفظ ہوتا ہے۔ لسانی سطح پر صوتی سالمات کی ترسیل حرف و لفظ کی صورت میں ہوتی ہے۔ یعنی حرف و لفظ صفحۂ قرطاس یا لوحِ تحریر پر آواز یا آوازوں کے اجزا و عناصر کے علامتی پیکروں کی صورت میں ابھرتے ہیں۔ لیکن تخلیقی عمل کے مرحلے سے گزرتے ہوئے یہ صرف صوتی سالمات یا آواز کے اجزا و عناصر کے علامتی پیکروں تک ہی محدود نہیں رہتے بلکہ وجدانی، حسی اور تجرباتی واقعات و واردات کی تشکیل و تجسیم اور تصویر سازی و پیکر تراشی سے لے کر ان کی ترسیل تک کے عمل میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہی نہیں وہ کائنات حرف و صوت اور جہانِ لفظ و معانی تک کی ترتیب و تنظیم اور ربط و انضمام کے اجزا و عناصر بن کر تکمیل حیات و کائنات و ترسیل تجربات و تاثرات کا حیرت انگیز کارنامہ انجام دیتے ہیں۔ اسی بنا پر میں نے کہیں لکھا ہے کہ ادب دراصل ایک تخلیقی عمل ہے اور ادیب کائنات کی تشریح و توضیح کے لیے عمل کے اس مرحلے سے گزرتا ہے۔ لہٰذا ادب کی حیثیت تمثیل کی ہے، جس میں ہر عبارت، ہر علامت اور ہر حرف ایک کردار ہوتا ہے، جس کے ذریعے فن کار اپنے تجربات و تاثرات اور تاویلات کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ وہ ادیب جن میں تخلیقی توانائی اور محرکات قوی ہوتے ہیں، ایسے کردار خلق کرتے ہیں جن کی گرفت نظامِ خارج پر بھی اور نظامِ داخل پر بھی مضبوط رہتی ہے۔ چنانچہ یہاں یہ بات بلا مبالغہ کہی جاسکتی ہے کہ مظفر حنفی ایسے ہی قوی مایہ فن کار ہیں جن کے شعری کردار نے تخیلی واردات اور تجربی واقعات و تاثرات کو مطالعے اور مشاہدے کی سطح پر ایسے ایسے پیکر عطا کیے ہیں جو نگار خانۂ حیات و کائنات کی جلوہ سامانیوں سے مزین و مرتب ہو کر بامعنی اور بے مثال بن گئے ہیں۔ تخلیقی عمل یوں بھی کثرت جہات کا حامل ہوتا ہے۔ ہماری متغزلانہ روایت میں اس کی بے شمار شہادتیں موجود ہیں۔ مظفر حنفی صاحب اور ان کی شاعری بھی اسی روایت کا توسیعی عمل ہے۔ چنانچہ ان کی غزلوں میں پیکر تراشی کا عمل بھی کثرتِ جہات کا حامل دکھائی دیتا ہے۔ پہلے یہ اشعار دیکھیں:

کچھ دیر تو نیزے پہ اچھالو نہ سروں کو ۔۔۔ بستی میں ابھی رقصِ شرر ختم ہوا ہے

ادھر بھی لاش تڑپتی ہے دفن ہونے کو یہ سر بھی نیزۂ سفاک سے اتارا جائے

پہلے شعر کے پہلے مصرع میں نیزے پہ سروں کا اچھالنا اور دوسرے مصرع میں 'رقصِ شرر' بصری پیکر ہیں اور یہ دونوں حرکی ہیں کیوں کہ حِس بصارت سے متعلق یہ دونوں پیکر حرکت کا احساس کراتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے کہ یہاں پیکر کا مفہوم نیزے پہ سروں کے اچھالنے اور رقصِ شرر تک محدود ہے بلکہ پورا بیان ہی ایک پیکر ہے جس سے پے در پے دو واقعات کے رونما ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ یعنی پہلے تو بستی جلائی گئی ہے اور شعلے سے اٹھتی ہوئی چنگاریاں ابھی ابھی بجھی ہیں اور اس کے بعد قتل کا سفاکانہ عمل جاری ہوا ہے پھر نیزے پہ سروں کو اچھالنے کی تیاری ہے۔ اس طرح جو واقعہ تقدم کا حامل ہے، اسے موخر کر کے سفاکانہ قتل کی شدت کو ظاہر کیا گیا ہے۔ کچھ دیر کے ٹکڑے سے سفاک قاتل کے جذبۂ ترحم کو مہمیز کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دوسرا شعر بھی اسی قبیل کا ہے۔ تڑپتی ہوئی لاش اور نیزۂ سفّاک پہ سر، لیکن اس بیان کا لہجہ پہلے شعر کی طرح دردمندانہ اور ملتجیانہ نہیں بلکہ تحکمانہ ہے۔

ہمیں یہ تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے کہ اپنے عمل کے اعتبار سے پیکر کا دائرہ نہایت وسیع ہوتا ہے اور اس میں اشاراتی عناصر کی بھی کارفرمائی ہوتی ہے یعنی ایک پیکر پیش منظر سے پس منظر کی طرف بھی اشارہ یا رہنمائی کر سکتا ہے اور کرتا بھی ہے اور معنی و بیان کے مختلف مرحلوں سے بھی گزار دیتا ہے۔ مثلاً ان اشعار میں جو مناظر تشکیل و ترتیب کے مرحلے سے گزار کر پیش کیے گئے ہیں یا پیش منظر پر ابھارے گئے ہیں وہ ایک خاص واقعاتی پس منظر کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اور یہ پس منظر واقعۂ کربلا ہے جہاں یزید کے لشکر نے پہلے تو حضرت امام حسین کے اقربا، اعزا اور احباب و انصار کو شہید کیا، پھر امام عالی مقام کو شہید کرنے کے بعد خیمے میں آگ لگا دی۔ اس کے بعد امام کے سرِ مبارک کو تن سے الگ کر کے نیزے پر بلند کیا۔ شاعر نے پیکر تراشی کے ذریعے واقعۂ کربلا کی باز آفرینی کی ہے اور اسے شعری استعارہ میں تبدیل کر دیا ہے یا اسے شعری استعارے کے پیکر میں ڈھال دیا ہے۔ ایک شعر اور دیکھیں۔

اس کے چلّو میں سمندر مرے ہونٹوں پہ سراب میں پیاسا ہوں تو وہ بھی نہیں کم شرمندہ

اس شعر کی لفظی ترکیب 'چلو میں سمندر' پر غور کریں تو ایک تصویر ابھرتی ہے۔ لیکن 'ہونٹوں پہ سراب' سے کسی مادی شے کی تصویر نہیں ابھرتی یا کوئی پیکر محسوس نظر نہیں آتا کیوں کہ بیان واقعہ میں سراب اپنا مادی یا حسی وجود نہیں رکھتا۔ البتہ شدید پیاس کی علامت کے طور پر ہمارے احساس اور متخیّلہ کو متحرک کر دیتا ہے۔ اس لیے یہ تخیلی پیکر ہے اور دوسرے مصرع میں پیاس کی کیفیت اس مافوق یا معنی کی زیریں سطح سے مربوط ہو جاتی ہے۔ اس طرح دوسرا کردار جس کے چلّو میں سمندر ہے، وہ بھی شرمندہ دکھائی دیتا ہے اور شرمندگی کی وجہ کم ظرفی ہے یعنی دو کرداروں کے تفاعل میں تو تضاد ہے کہ ایک کم ظرف کو سمندر نصیب ہے اور دوسرے باظرف یا باضمیر

کو پیاس یا پیاس کی شدّت! اس میں مماثلت کا بھی ایک پہلو ہے اور وہ یہ کہ ایک کو پیاس ظرف کی ہے تو دوسرے کو پانی کی۔ لیکن یہ قدرِ مشترک اپنی قیمت کے اعتبار سے مماثل یا یکساں نہیں۔ سمندر اور سراب دونوں علامتی تعبیریں ہیں اور ایک دوسرے کے مدمقابل اور اس مقابلے میں پیاس کی علامت سراب کو سمندر پر فوقیت حاصل ہو جاتی ہے اور بحیثیت کردار حسّی پیکر سمندر، تجریدی پیکر سراب سے مات کھا جاتا ہے۔ تعبیر کے ایک مختلف زاویے سے یہ ایک طرح کی ناآسودگی کا بیان ہے لیکن وہ کردار جس سے پیاس کی شدت ابھرتی ہے، اس کی ناآسودگی اپنے حریف کی شرمندگی سے آسودہ حال ہو جاتی ہے۔

کبھی کبھی پیکر اپنے متعلقات کے امتزاج و انتشار سے ایک مجموعی یا کلی حیثیت اختیار کر لیتا ہے جس کے نتیجے میں یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ پیکر کے حدود کیا ہیں؟ یعنی وہ کہاں سے شروع ہوا اور کہاں ختم؟ جارج وہیلے (George Whalley) کا خیال تو یہ ہے کہ ''کوئی پیمانہ نہیں جس کے ذریعے ہم کہہ سکیں کہ شاعری میں کیا پیکر ہے اور کیا نہیں۔'' دراصل اس کے خیال میں پیکر اکہرا لفظ ہے جس کا وجود غیر متعین ہے۔ چنانچہ یہاں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ 'چلّو میں سمندر' یا 'ہونٹوں پہ سراب' سے جہاں حِسی اور بصری پیکر تراشی کا کارنامہ انجام دیا گیا ہے، وہاں 'پیاس' اور 'شرمندگی' جیسے تجریدی یا غیر حِسی پیکروں کو بھی بروئے کار لایا گیا ہے جس کی وجہ سے ایک مخلوط یا مرکب کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس طرح یہ پورا شعر ایک پیکر ہے۔ ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔

وسعتیں مجھ کو خلاؤں سے صدا دیتی ہیں یہ نشیمن کی گرہ پڑ گئی پر میں کیسے

پہلے مصرع میں 'وسعتیں' اور 'خلا' اپنے امتزاجی ربط کے ساتھ حسی اور بصری پیکر ہیں جب کہ 'صدا' استماعی پیکر ہے۔ دوسرے مصرع میں 'نشیمن' اور 'پر' اور 'گرہ' حِسی بصری پیکر ہیں۔ گویا کہ بصری اور استماعی پیکروں کے امتزاج سے ایک تخیلی پیکر کی صورت گری یا تشکیل کا کارنامہ انجام پذیر ہوا ہے۔ مفہوم یا معنی کے اعتبار سے یہ انفعالیت یا انفعالی کیفیت کا اظہار ہے جِسے استفہامیہ لہجے نے تاثیر کی شدت عطا کر دی ہے۔ یہ استفہامیہ لہجہ متاسفانہ ہے۔ تاسف اس بات پر ہے کہ خلاؤں کی بے پناہ وسعتیں قوت پرواز کو بلند پروازی اور تسخیر پہنائے فلک کی تحریک دے رہی ہیں۔ لیکن پرندہ فطرتِ پرواز سے گریز پا ہے۔ نشیمن کی راحت و آسودگی نے اس کے پروں میں گرہ ڈال دی ہے۔ عیش کوشی، عشرت پسندی اور راحت طلبی کا میلان انفرادی زندگی اور اجتماعی و معاشرتی زندگی کے لیے بھی نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ بہ فتوائے تاریخ یہ ایک مسلم حقیقت ہے، اس کا احساس مظفر حنفی نے علامتی، استعاراتی اور تمثیلی پیکروں سے مرتب اس شعر میں سوز و سازِ آرزومندی کے ساتھ دلایا ہے۔ اسی سوز و گداز آرزومندی سے لبریز اسی قسم کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو۔

وسعتیں آواز دیتی ہیں کہ موقع ہے یہی حسرتِ پرواز ہے، ٹوٹے ہوئے پر اور ہم

شاعر پیامِ برِحق اور ہادیٔ برحق بھلے ہی نہ ہو لیکن وہ رہنمایانِ قوم کے حلقے میں ایک اعلیٰ منصب اور

بلند مرتبے پر فائز ہوتا ہے۔ اس لیے اپنی اجتماعی، معاشرتی اور قومی زندگی میں اپنی ذمہ داریوں کو نظر انداز نہیں کرسکتا، ان سے دست بردار نہیں ہوسکتا۔ مظفرحنفی نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے یہی کارنامہ انجام دینے کی پرخلوص کاوش کی ہے اور اسے فنّی پیرایہ عطا کرنے میں اپنی فن کارانہ مہارت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

اشعارِ زیرِ بحث میں پرندہ بیانِ واقع نہیں بلکہ فوق البیان ہے۔ یہ علامتی تمثیلی پیرایۂ اظہار ہے جس سے اصل مفہوم تک رسائی ہوجاتی ہے اور قاری یا سامع کے دل و دماغ پر گہرا اثر بھی مرتب ہوتا ہے۔ جہاں تک پیکروں کا تعلق ہے تو 'وسعتوں کی آواز' اور 'حسرتِ پرواز' تخیلی پیکر ہیں جب کہ 'ٹوٹے ہوئے پر' تخیلی ہوتے ہوئے بھی حِسی درکی تناظر پیش کرتے ہیں اور بصری پیکر کے ذیل میں آتے ہیں۔

وسعتوں کا خلاؤں سے آواز لگانا یا صدا دینا صوتی یا استماعی پیکر ہے لیکن یہ حِسی اور درکی نہیں بلکہ تخیلی پیکر ہے۔ البتہ درج ذیل شعر میں صوتی پیکر کی خوب صورت مثال ملتی ہے جو بہ اعتبارِ تجربہ حِسی اور درکی بھی ہے ؎

وہ ہر اک ٹھوکر پہ اس کا کانچ سا چھن بولنا | سر کے ٹکرانے سے کتنی روشنی پتھر میں تھی

پہلے مصرع کا ٹکڑا 'کانچ سا چھن بولنا' صوتی یا استماعی پیکر ہے جب کہ دوسرے مصرع میں سر کے پتھر سے ٹکرانے کے نتیجے میں پتھر کا چمک جانا روشنی کی حقیقی تعبیر نہیں بلکہ تخیلی تصویر ہے جو خون کے رنگ سے مرتب ہوئی ہے لیکن سر، پتھر اور روشنی بہرحال بصری پیکر ہیں۔ بصری اور لمسی پیکر کی مثال بھی دیکھیں:

حصارِ جسم سے خواہش کے زلزلے نہ رکے | غبار بیٹھ گیا اب ہوا رکے نہ رکے

یہ مخلوط پیکر بھی دیکھیں:

آ مرے سینے سے لگ جا تو اگر سیلاب ہے | اور خوشبو ہے تو جا بستی میں گھر گھر پھیل جا
یہ کون کہہ رہا ہے دھرتی نہیں مہکتی | جتنا لہو پیا ہے، اتنی نہیں مہکتی
پھول کس کام کا جس میں تری خوشبو ہی نہ ہو | اور ویرانہ ہے وہ شہر جہاں تو ہی نہ ہو
مرتبے رنگ نے، خوشبو نے، ہوا نے پائے | خار تھے ہم ترے نزدیک نہ آنے پائے

یہاں بصری اور لمسی پیکروں کے ساتھ ساتھ حِس شامہ کو متاثر کرنے والے پیکر بھی موجود ہیں۔ بعض دوسرے اشعار میں حِسی ذائقہ کو متاثر کرنے والے پیکر بھی نظر آتے ہیں ؎

بوتل کا دوسرا ہے، کتابوں کا طاق اور | مے کش کا ذوق اور ہمارا مذاق اور
سپاٹ لہجے کو لفظوں کی سان پر رکھ دے | سیاہ مرچ غزل کی زبان پر رکھ دے

ایک اہم اور توجہ طلب بات یہ بھی ہے کہ مظفرحنفی کے اشعار میں بیشتر اور بالعموم حرکی پیکروں کا استعمال ہوا ہے۔ ایسا غالباً اس لیے ہے کہ ان کا سکون نا آشنا قلب، اضطرابِ عصر کی آماجگاہ بنا ہوا ہے جو تخلیق کا اصل

محرک ہے اور اسی ساز کی پُردرد اور پُرسوز آواز پر مظفرحنفی نے نغمہ سرائی کی ہے جس کی ہر لے، ہر سر اور ہر تال میں مخصوص تناسب و توازن کے ساتھ ساتھ اتار چڑھاؤ کی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ اس تناسب و توازن سے حسن بھی پیدا ہوتا ہے اور تاثیر بھی۔ یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

گھما پھرا کے بھنور انکشاف کرتا ہے | کہ بلبلے کا سمندر طواف کرتا ہے
سائے مچل رہے ہیں چراغوں کی گود میں | سمجھے تھے ہم کہ گھر سے اندھیرا نکل گیا
اوپر بوڑھے ہاتھ اٹھائے سوکھتے تھے دو چار درخت | پہلے ان پر بجلی ٹوٹی، ویسے بادل برسا بھی
نہ جانے کب سے زمیں گھومتی ہے محور پر | میں بن چکا ہوں مجھے چاک سے اتارا جائے

مظفرحنفی حیرت انگیز ذہانت و ذکاوت اور غیر معمولی فنّی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ یہ میں نہیں کہتا، ان کے اشعار کہتے ہیں اور اشعار میں یہ قوتِ ناطقہ اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب تک وہ شاعر کے ذاتی تجربے اور مشاہدے سے ہم آہنگ نہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ مظفرحنفی کے تجربے اور مشاہدے میں باریکی بھی ہے اور تہ داری بھی۔ وسعت و تنوع بھی ہے اور رنگارنگی و بوقلمونی بھی۔ اس لیے ان کے اشعار مختلف انداز کے حامل ہوتے ہیں اور قاری یا سامع کے ذہن کو مختلف سطحوں پر مختلف زاویے سے متاثر کرتے ہیں۔ وہ حق بجانب معلوم ہوتے ہیں جب ان کی زبان سے یہ شعر ادا ہوتا ہے:

مختلف انداز رکھتی ہے مظفرؔ کی غزل
یہ ہماری آپ بیتی ہے خبرنامہ نہیں

○○○

ڈاکٹر سید تقی عابدی
ٹورنٹو

مظفرؔ حنفی کی شعری فتوحات

(اے مظفرؔ صاف اور تہ دار ہے میری غزل)

فطری تخلیق کار ایک ایسے تراشے ہوئے ہیرے کے مانند ہوتا ہے جس کی ہر جہت تراش اور خراش جداگانہ رکھتے ہوئے بھی تابندہ اور منوّر رہتی ہے۔ جس طرح ہیرا خارج سے روشنی کی کرن کو اپنے سینے میں جذب کر کے نہ صرف خود چمکنے لگتا ہے بلکہ نورانی شعاع کو رنگ برنگ دھنک میں بکھیر دیتا ہے، بالکل اسی طرح مظفرؔ حنفی فطری شاعر ہیں جو ان کی اصلی شناخت بھی ہے کہیں سفر نامہ نگار، افسانہ نگار، کہانی نویس، ناول نگار، محقق، ناقد، مترجم، ادیب ڈراما اور خاکہ نویس کی شکل میں اپنی آب و تاب دکھاتے رہے۔

مظفر سچّے یعنی حنیف تھے اسی لیے عمر بھر فتح یاب بھی رہے۔ وہ امیروں کے نہیں بلکہ غریبوں، حکمراں نہیں بلکہ عوام کے دِل میں بستے تھے اور اُس پر فخر بھی کرتے تھے۔

اگر عوام سے نزدیک ہوں مظفرؔ میں — تو اک حنیف سا کج بھی مری کلاہ میں ہے

اسی لیے ان کی تمام تخلیقی کاوشوں میں قلم کی پاسداری جھلکتی ہے۔ انھوں نے بہ بانگِ دہل یہ نعرہ لگایا اور آخری سانس تک اس پر قائم رہے۔

ہر ضرورت پہ مظفرؔ کا قلم حاضر ہے — شرط یہ ہے کہ قصیدہ نہ لکھایا جائے

ان کی زندگی عملاً اس حقیقت کی گواہ ہے کہ انھوں نے کسی کی روشنی سے اپنا اُجالا نہیں کیا بلکہ شبستانوں کے چراغوں سے دوری کی، وہ جانتے تھے کہ ایسے مانگے ہوئے اُجالوں سے باطنی تاریکی بڑھتی ہے۔ خود کہتے ہیں۔

اُجالے بڑھا کر اندھیرا نہ کر — مشاہیر میں ذکر میرا نہ کر
شاہوں کے نام لو نہ گداؤں کے سامنے — جلتے نہیں چراغ ہواؤں کے سامنے

اسی لیے صاحب جاہ و حشم کے چراغ ان کے سامنے جل نہ سکے اور ان سے چڑھتے ہوئے سورج کی پوجا نہ ہو سکی۔ وہ جانتے تھے اسی لیے صحیح پیغام بھیجا۔

چڑھتے سورج سے کہیو بعد سلام — شام تو آپ کی بھی آئے گی

یہ مختصر اجمالی تحریر مظفرؔ حنفی کے فن پر اس لیے بھی پیش کی جا رہی ہے کہ آج اکیسویں صدی کے گلوبل ولیج کے پر آشوب ماحول میں اس دِل سوز، دل نواز شاعر کا کلام زخم پر مرہم کا کام کرے گا۔ مظفرؔ جو اصل میں شاعر وہ بھی غزل کا شاعر ہے، دُنیا کی دکھتی رگ پر قلم رکھتا ہے۔ جس کو ظلم و جور کی دُنیا پسند نہیں کرتی۔ ذیل کی عمدہ رباعی میں مضمون کی ندرت، الفاظ کی قدرت اور شاعری کی صداقت اور جرأت دیکھیے۔ اگر یہ پیام، پیامبری نہیں تو کیا ہے؟

بھڑکی ہوئی اک مشعل غم رکھتا ہوں — شبنم کی طرح دیدۂ نم رکھتا ہوں
دُکھتی ہوئی رگ اپنی چھپالے دُنیا — مجبور ہوں کاغذ پہ قلم رکھتا ہوں

شاعر اپنے جذبات کو پوری طرح اس لیے بھی صفحۂ قرطاس پر بکھیر نہیں سکتا کہ ان الفاظ میں وہ خون دوڑایا نہیں جا سکتا جو شاعری کی رگ و پے میں اس زمانے کی محرومیاں، حق تلفیاں، ناانصافیاں اور ناقدریوں کی وجہ سے اُبل رہا ہے۔ ایک رباعی میں اس جہت پر عمیق اشارہ کیا ہے۔ مظفرؔ نے ستّر، اسّی عمدہ رباعیاں کہی ہیں جو ان کے مجموعے ’دیپک راگ‘ میں غزلوں کے ساتھ نظر آتی ہیں۔

موتی نہ تھے دریا میں تو ہم کیا کرتے — آنسو ہی نہیں آنکھ میں نم کیا کرتے
ہاتھ آئے وہی کھوکھلے لفظوں کے صدف — گہرائی کی روداد رقم کیا کرتے

ہم اِس مضمون میں دوسری اصناف کے نام کا ذکر تو کریں گے لیکن حاصلِ گفتگو صرف شاعری پر تبصرہ ہوگا جس کے بارے میں انھوں نے خود اشارہ کیا ہے۔

ہر چند کے فن کار کہا جاتا ہوں — میں وقت کے دریا میں بہا جاتا ہوں
کیا کیا نہ لکھا جائے گا میرے پیچھے — افسوس کے محروم رہا جاتا ہوں

مظفرؔ حنفی نے شاعری کی تقریباً تمام تر اصناف میں عمدہ نمونے یادگار چھوڑے ہیں۔ وہ دراصل غزل کے کہنہ مشق استاد شاعر تھے اور تقریباً تیرہ سو (۱۳۰۰) کے لگ بھگ غزلیں کہہ ڈالیں۔ سو (۱۰۰) سے زیادہ طویل اور مختصر نظمیں، رباعیات، قطعات، گیت، دوہے اور شخصی مرثیے بھی شاہکار شعری پارے ہیں جو فلک سخن پر تارے بن کر چمک رہے ہیں۔ مظفرؔ کے پاس موضوعات کی بوقلمونی اور مطالب کی فراوانی ہے مگر لہجہ کی یگانگی ان کی انفرادیت کی ضامن ہے۔ ان کی شاعری کی جڑیں برصغیر کی زمین ہی میں گڑی ہیں۔ حمد کے چند اشعار سنیے۔

چراغِ حرم کے اُجالے میں تو — برہمن کے اونچے شوالے میں تو
امیروں کے ہر لقمۂ تر کے ساتھ — غریبوں کے سوکھے نوالے میں تو
وہاں بے زبانوں کی آواز ہے — یہاں فلسفی کے مقالے میں تو

اِدھر خوفِ جاں بن کے بزدل کے ساتھ اُدھر سر بکف ہے جیالے میں تو

'نعت' میں پھولوں کی مسکراہٹ، کلیوں کی خوشبو، بادِ صبا کی خنکی اور زندگی و زندہ دلی ہے۔ اور ردیف نے نامِ گرامی 'محمدؐ' سے اشعار کو گراں مایہ کر دیا ہے۔

غنچے غنچے کِھلا محمدؐ خوشبو سا پھیلتا محمدؐ
سینے سینے مہک رہا ہے چاند کرن موتیا محمدؐ
دم گھٹنے کی کیفیت میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا محمدؐ
مرنے کے لاکھوں حیلے ہیں جینے کا آسرا محمدؐ

امام حسین کی منقبت کے دو شعر سنیے۔

جب آ گیا ہے لب پہ ترا نام اے حسین تھم سی گئی ہے گردشِ ایام اے حسین
شبنم سے تر رہے گی ہر اک صبح کی پلک خونِ شفق بہائے گی ہر شام اے حسین

مظفرؔ نے تقریباً بیس (۲۰) سال کی عمر میں شاعری شروع کی اگرچہ وہ اس سے پہلے مضامین، ڈراموں کے تراجم، کہانی اور افسانے لکھ رہے تھے۔ تقریباً چودہ مہینے استاد شاد عارفی سے شاعری کا گُر سیکھا اور زندگی بھر استاد کے کلام و فن کو چھ کتابوں کے ذریعہ 'ایک تھا شاعر' سے 'شاد عارفی: شخصیت اور فن' تک لوگوں تک پہنچایا۔ سچ تو یہ ہے ایسا شاگرد قسمت والے اساتذہ کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ جس طرح گوئٹے کو ایکرمن، سراج کو لچھی داس، بیدلؔ کو بندرا داس، ذوقؔ کو آزاد اور غالبؔ کو حالیؔ ملے، اُسی طرح شادؔ عارفی کو مظفرؔ حنفی مل گئے۔ اسی لیے اس پر افتخار کر کے خود حنفی کہتے ہیں۔

ہے شادؔ عارفی سے مظفرؔ کا سلسلہ اشعار سان چڑھ کے بہت تیز ہو گئے
اوروں سے تقابل نہ کرو ہے مری توہین ہاں شادؔ و مظفرؔ میں کجا شادؔ، کجا میں

مظفرؔ حنفی کی تصانیف میں دس شعری مجموعے، تین افسانوی مجموعے، چار تنقیدی اور تحقیقی مجموعے، تین بچوں کی کتابیں، چار وضاحتی کتابیات، تیرہ تراجم، آٹھ ترتیب و تدوین کے علاوہ خطوط بنام مظفرؔ وغیرہ شامل ہیں۔ تحریر کی نوعیت سے ہم صرف یہاں شعری مجموعوں کی فہرست پیش کر رہے ہیں: 'پانی کی زبان' مطبوعہ ۱۹۶۷ء، 'تیکھی غزلیں' مطبوعہ ۱۹۶۸ء، 'عکس ریز' مطبوعہ ۱۹۶۹ء، 'صریر خامہ' ۱۹۷۳ء، 'دیپک راگ' ۱۹۷۴ء، 'یم بہ یم' ۱۹۷۹ء، 'طلسم حرف' ۱۹۸۰ء، 'کھل جا سم سم' ۱۹۸۱ء، 'پردہ سخن کا' ۱۹۸۶ء۔

مظفرؔ حنفی نے جو غزل کی روح سے واقف تھے، پچاس سالہ غزلوں کا انتخاب بھی کیا جس میں سات سو کے قریب شعرا کی غزلیں شامل کیں اور ایک بسیط مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ بچوں کے ادب سے مظفرؔ حنفی کو خاص دلچسپی تھی۔ ان کے لیے بچوں ہی کی زبان اور لہجے میں مضامین، کہانیاں، ڈرامے اور تعلیمی و اخلاقی

تحریریں لکھیں۔ یہی نہیں بلکہ ان کی شاعری میں بچوں پر خوب صورت شعری کاوشیں نظر آتی ہیں۔ ذیل میں مکتب میں آموختہ پڑھتے ہوئے بچوں کی تصویر کشی دیکھیے، جس میں نیا مضمون اور نئی تشبیہات ہیں۔

سمٹے ہوئے کوزے میں سمندر جیسے اک تار میں گوندھے ہوئے گوہر جیسے
آموختہ پڑھتے ہوئے چنچل بچے پَر جوڑ کے بیٹھے ہوں کبوتر جیسے

مظفرؔ حنفی کی غزلوں کی بحر غنائیت سے لبریز، عموماً چھوٹی بحر کے سات آٹھ اشعار سے بنی ہوتی ہے جس میں ان کے تیکھے پن کا لہجہ اپنی گداز سے بھرے سادے اور عوامی الفاظ لاتا ہے اور اس طرح معنی آفرینی کے ساتھ غزل سادگی اور عام فہمی سے بھی مزین ہو جاتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ مظفرؔ حنفی کی پہچان ان کی غزل ہے۔ اس میں انھوں نے جگ بیتی کے ساتھ آپ بیتی بالخصوص مطلعوں اور مقطعوں میں بیان کر دی ہے۔ ان کی شخصیت کی انفرادیت اور سچ بولنے کی عادت کا اگرچہ نتیجہ ان کے لیے سودمند نہ ہوا لیکن ان کی شاعری کو وہ بڑی شاعری میں شامل کر دیتا ہے۔ آل احمد سرور نے کہا تھا۔

غزل میں ذات بھی ہے اور کائنات بھی ہے ہماری بات بھی ہے اور تمہاری بات بھی ہے

یا ع: جو سنتا ہے اُسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

مظفرؔ حنفی کہتے ہیں۔

اے مظفرؔ صاف اور تہ دار ہے میری غزل آپ بیتی ہے حدیث دیگراں ہوتے ہوئے
آستاں بوس تو لاکھوں ہیں مظفرؔ صاحب شہر میں سر نہ جھکانے کی ادا ہم تک ہے

تنقید نگاروں کے بارے میں کہتے ہیں۔

لاکھ ناقد ہوں مظفرؔ کے مخالف لیکن شہ سواروں کے لیے بھیڑ بھی چھٹ جاتی ہے

ناقدین مظفرؔ حنفی کے قدرداں بھی تھے اور بعض جو توصیفی کلمات اور خوشامد چاہتے تھے وہ طنز کرتے اور ناخوش رہتے تھے جس کا حنفی پر کچھ اثر نہیں پڑتا تھا۔ مظفرؔ کی غزلوں میں طنز کا تیکھا پن اور انداز کا کٹیلا پن ہے۔ اس میں احتجاج اور صداقت موجزن ہے۔

شکست کھا چکے ہیں ہم مگر عزیز فاتحو! ہمارے قد سے کم نہ ہو فراز دار دیکھنا
بجا کہ جاگتی آنکھوں کے خواب جھوٹے ہیں مگر کرے بھی کوئی کیا جو آنکھ ہی نہ لگے
میں برگ زرد مجھے کیا پتہ سبب کیا ہے یہ جانتا ہوں بگولہ بڑے جلال میں تھا

خوب صورت منظر نگاری اور پیکر سازی دیکھیے۔

کانٹوں نے اپنی خشک زبانیں نکال دیں موتی جو برگ و بار پہ جڑنے لگی ہوا
دن چیختا تھا حبس زدہ چیل کی طرح پر مارتی تھی رات ابابیل کی طرح

ہم یہاں مظفرؔ کی دو غزلوں کے چند اشعار بطورِ نمونہ پیش کرتے ہیں تاکہ ہمارا منشا آشکار ہو جائے۔

خون کے داغ آستینوں پر — اور تمغے اُنھیں کے سینوں پر
ایک ذرّے نے لے لی انگڑائی — آسماں آپڑے زمینوں پر
ہم ستارے بنا کے نادم ہیں — آپ نازاں ہیں آبگینوں پر

......

ڈوب جاتا ہے یہاں تیرنا آتا ہے جسے — وہ کبھی ناؤ تھی دریا لیے جاتا ہے جسے
باغباں بھی ہے یہی وقت یہی گلچیں بھی — توڑ لیتا ہے وہی پھول اُگاتا ہے جسے
ہم تو خوش بو کی طرح خود ہی بکھر جاتے ہیں — تم وہ دیوار کہ مزدور اُٹھاتا ہے جسے

مظفرؔ نے تیرہ سو سے زیادہ غزلیں کہیں جن میں موضوعات کی فراوانی ہے اور مطالب کی ندرت ہے۔ مظفرؔ نہ ترقی پسند گروپ میں شامل تھے نہ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے قبیلے میں مگر ان کی غزلیں بیسویں صدی کے آخری ربعے اور اکیسویں صدی کے ماحول کی فضا میں راگنی بن کر مچل رہی ہیں۔ کیوں کہ ان میں بناوٹ نہیں صداقت ہے، اشرافیت کا ڈھونگ نہیں بلکہ شرافت کا سچا عمل ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ وہ اپنے استاد شادؔ عارفی کی تقلید کا چربہ ہو بلکہ ہر غزل میں ان کی آواز صاف سنائی دے رہی ہے۔ ان کی غزلوں اور نظموں میں طنز اور مزاح کا ایک خوب صورت سنگم ہے جس میں ان کی طبیعت کی روانی اور فکری توانائی ہے جسے وہ اپنی قادر الکلامی سے خوش گوار بنا دیتے ہیں۔ صرف گفتگو غزل اور طنز و مزاح تک محدود نہیں بلکہ ع: دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے'' مظفرؔ کے شخصی مرثیے اپنے دور کے بلند پایہ شخصی مرثیوں میں شامل ہیں۔ ان کے سات آٹھ شخصی مرثیے حالیؔ کے مرثیوں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ یہ شخصی مرثیے انھوں نے اپنے استاد شادؔ عارفی کے لیے لکھے جن کی تعریف معتبر اساتذہ نے بھی کی۔

اس گفتگو کو ہم مظفرؔ کی نظموں پر تمام کریں گے، باوجود یہ کہ وہ غزل کے مستند شاعر ہیں انھوں نے کم از کم ایک سو دس نظمیں کہی ہیں جن میں سے بعض بہت مختصر اور جدیدیت کے قالب میں ڈھلی ہوئی ہیں تو بعض پابند اور غیر پابند ہیں۔ ایک معرکۃ الآرا نظم 'عکس ریز' ان کی شاہکار پابند نظم ہے جس میں سوا سو خاکے موجود ہیں۔ اُس دور میں جب دُنیائے شاعری میں ہر طرف سے نغمگی سے سرشار نظمیں خوشبو بن کر بکھر رہی تھیں، مظفرؔ نے اپنی نظموں کا مصرف بتایا۔

میں نہیں کہتا
کہ میری کھردری نظموں کو پڑھ کر
سنگِ میلِ راہِ نو تسلیم کیجیے
میری نظمیں تو

روایت کی بہت پامال و فرسودہ سڑک کے دونوں جانب
کنکروں اور پتھروں کے ڈھیر کی مانند ہیں
جن سے
آئندہ نئی راہیں بنائی جائیں گی

ذیل کی تین مختصر جدید نظموں میں 'صورِ اسرافیل' بتاتی ہے کہ موت انتظار نہیں کرتی۔ 'دوسری جلاوطنی' میں انگریزی الفاظ کا استعمال اور تلمیحات کی کارکردگی عمدہ ہے۔ 'بات کی بات' میں صنعتِ حسنِ تعلیل کی رنگینی ہے۔

صورِ اسرافیل

اب تو بستر کو جلدی سے تہ کر چکو
لقمہ ہاتھوں میں ہے تو اسے پھینک دو
اپنے بچوں کی جانب سے منہ پھیر لو
اس گھڑی بیویوں کی نہ پروا کرو
راہ میں دوستوں کی نظر سے بچو
اس سے پہلے کی تعمیل میں دیر ہو
سائرن بج رہا ہے چلو دوستو!

دوسری جلاوطنی

جب گیہوں کا دانہ جنس کا سمبل تھا،
اس کو چکھنے کی خاطر،
میں جنّت کو ٹھکرا آیا تھا۔
اب گیہوں کا دانہ،
بھوک کا سمبل ہے۔
جس کو پانے کی خاطر،
میں اپنی جنّت سے باہر ہوں!

بات کی بات

ہوا جانے کیا کان میں کہہ گئی،
کہ برگد کے پتوں نے تالی بجائی،
شگوفے نے سن کر تبسم کیا،

تھرکنے لگی لہر تالاب میں،
بھڑک کر چراغِ سحر بجھ گیا،
ہوا جانے کیا کان میں کہہ گئی......

شاعر اپنی نظموں اور گیتوں میں بچوں، جوانوں، بڈھوں سب کو مساوات، اخوت اور محبت کا درس دیتا ہے۔ یہاں برصغیر کے ماحول کو جس میں کئی قوموں، دھرموں اور رنگوں کے باسی بستے ہیں، انھیں حفظانِ صحت اور روگ سے دوری کے آدرش دیئے جاتے ہیں جو اکیسویں صدی کی مقصدی شاعری کی پہچان ہے اور یہی انسانیت کی آن بان بھی ہے۔ ہم کچھ مصرعوں کو یہاں نقل کرتے ہیں۔

کشمیری ہو یا سندھی
اُردو بولے یا ہندی
دھوتی پہنے یا شلوار
پھول سجائے یا بندی
سب کا مان برابر ہے
ہر انسان برابر ہے
......
اکثر سوچا کرتا ہوں
کیوں گھر گھر بیماری ہے
کیوں چوراہوں پر مجمع
کیوں اتنی بے کاری ہے
کتنی گندی ہیں گلیاں
جینا کتنا بھاری ہے
یہ قول بہت سچا ہے
چھوٹا کنبہ اچھا ہے

ہم اس تحریر کو مظفرؔ ہی کے ایک شعر پر تمام کرتے ہیں جو انھوں نے اپنے بڑے بیٹے فیروز مظفرؔ کے لیے کہا ہے جس میں ترقی اور محبت کا درس دعا شامل ہے۔

آ مرے سینے سے لگ جا تو اگر سیلاب ہے
اور خوشبو ہے تو جا بستی میں گھر گھر پھیل جا

○○○

کلیم حاذق

مظفر حنفی: ایک صاحبِ طرز فن کار

کسی فن کار کو بڑا بننے کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ اس کے یہاں تخلیقی توانائی ہو یا تخلیق کرنے کا اپنا رنگ ڈھنگ اور اپنا اسلوب ہو۔ یہ سب باتیں تو ہر اس فن کار کے یہاں مل ہی جائیں گی جو فن کو ہنرمندی کے ساتھ استعمال کرنے کا گر جانتا ہو۔ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں یہ تمام باتیں ممکن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم آسانی سے کسی فن کار کی بڑائی تسلیم کر لینے میں پس و پیش سے کام لیتے ہیں، لیکن اگر کسی فن کار کی تخلیقی توانائی کئی دہائیوں تک قائم رہتی ہے اور اس کا اثاثہ کلام اسلوب کی رنگارنگی کا نگارخانہ قائم کرنے لگے تو پھر پس و پیش سے بچنے کا جواز خود ہی پیدا ہو جاتا ہے۔ میں یہاں اس بات کو ذرا واضح کر دوں کہ اسلوب کی رنگارنگی سے یہ مراد نہیں ہے کہ مختلف اسالیب آپس میں مدغم ہو کر خود اسلوب کی انفرادیت پر سوالیہ نشان لگا رہے ہوں بلکہ میرا نکتۂ نظر یہ ہے کہ فن کار کا کسی ایک Style کا اسیر ہونا بعض اوقات اپنے نکتۂ عروج کے بعد سپاٹ پن کی طرف لے جاتا ہے اور اس کی بڑائی حاشیے پر چلی جاتی ہے لیکن اگر کوئی فن کار اپنی تخلیقی توانائی کو تادیر برقرار رکھنے کا ہنر جانتا ہو اور تخلیق کرنے کے طور طریقوں میں رنگارنگی پیدا کرتا رہتا ہے، اس کے مختلف Shades ابھارتا رہتا ہے، ایسا فن کار جس کے اندر وقت پھیلتا جاتا ہے اس کی بڑائی تسلیم کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ میرے خیال میں مظفر حنفی ایسے ہی فن کاروں کے ذیل میں آتے ہیں جن کا تخلیقی سفر کئی دہائیوں پر محیط ہے۔ ان دہائیوں میں کئی پڑاؤ آئے، کتنے تخلیقی مسافر وقت کے غبار میں کھو گئے لیکن بقول گوپی چند نارنگ ''حنفی صاحب نے کسی پڑاؤ کو منزل بننے نہیں دیا'' ان کے اندر کا تخلیق کار اگر اپنے تخلیقی کارناموں پر مطمئن ہو جاتا تو 'پھر یا اخی' جیسا شعری مجموعۂ کلام اردو دنیا کو میسر نہ آتا جس کے لیے پوری اردو دنیا اور شعر و ادب کے شائقین ان کے شکرگزار رہیں۔

اس سے پہلے کہ میں مظفر حنفی صاحب کی شاعری اور ان کے فن کے چند گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کروں آیئے ذرا گزشتہ دہائیوں میں اردو شاعری اور خصوصاً اردو غزل کن راستوں سے گزر کر ارتقا کے منازل طے کر رہی ہے اس کا مختصر جائزہ آپ کے سامنے پیش کروں۔

اردو شاعری بالخصوص غزل کے تعلق سے جدیدیت (آدھونکتا)، جدت پسندی، جدت جوئی اور پھر جدت طرازی کم وبیش آدھی صدی پر محیط ہے۔فکری اور اسلوبیاتی مطمح نظر کی اس تبدیلی نے بلاشک وشبہہ ہماری ادبی روایت میں ایک تابناک مقام محفوظ کرلیا ہے کہ نئے پن کی تلاش صرف ہمارے ہی عہد کا طرۂ امتیاز نہیں بلکہ یہ عمل انسانی ارتقا کی تاریخ میں بذاتِ خود ایک الگ تھلگ روایت کا درجہ بھی رکھتا ہے لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ اب فنونِ لطیفہ پر اثر انداز ہونے والی سماجی وثقافتی تبدیلیاں اتنی تیزی کے ساتھ صورت گیر ہوتی چلی گئیں جن کے زیر اثر ہر نئی نسل اپنی قریب ترین پیش رو نسل کا بھی آموختہ بننے کے لیے خود کو تیار نہیں پاتی کہ انسانی ذہن پر پے در پے تغیرات کی اس یلغار نے اسے ارتکاز (Concentration) سے محروم کر دیا ہے اور اس کی کیفیت اس آبی پودے کی طرح ہوگئی ہے جو سطح دریا پر بہاؤ کے رخ پر تیرتا رہتا ہے۔اس صورت حال میں یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ ہر نئی نسل کے یہاں اپنے پیش رووں سے کچھ مختلف اور کچھ منفرد ہونے کا رجحان اسے بے تکان صرف اور صرف ردِ عمل کے طور پر فکر واسلوب کا معکوس بننے کے لیے مہمیز کرتا رہا۔شوالے گرائے جانے لگے، کج اساسی کی بنیاد پر نئے شوالوں کی تعمیر ہونے لگی، معبود ایک رہا، عبادت گاہیں بدلتی رہیں۔ ہر عابد بشارت دیتا رہا کہ صرف اسے ہی حقیقی عبادت کا شرف حاصل ہے کہ نئے معبد میں سجدہ ریزی کا لطف ہی کچھ اور ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ فطری طور پر شوالوں کا منہدم ہوجانا اور غیر فطری طور پر خیالی دانش مندی کے جبر سے انسانی افعال کے کاغذی ڈھانچے تعمیر کرنا بجائے خود ایک غیر فطری عمل ہے کہ روایت کے گہرے شعور کے بغیر کچھ نیا اور کچھ منفرد پیش کرنے کی سعی فن کار کی تخلیقی توانائی کو اس آنچ سے محروم کر دیتی ہے جو روایت کے گہرے عرفان اور صدیوں پر پھیلے تخلیقی تجربات سے منقلب ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔اردو غزل نے افراط وتفریط کے اس عہد کو جھیلنے کی صعوبت برداشت کی اور نکھر کر کندن ہوگئی۔اس نازک صنف نے شمشیر وسناں، زنجیر وزنداں، دار ورسن کی سخت گیریوں کو قاموسِ فکر کی گہرائی اور گیرائی عطا کی، رسمیات کے شکنجوں سے خود کو آزاد کیا اور تحیر کم ہونے لگا تو موجود کو ماورا کا ملبوس پہنا کر ان گنت خال وخد کو تخیل کے پردے پر اتارنا شروع کیا۔ایسے لمحات میں بھی ڈاکٹر مظفر حنفی کی شاعری دیر تک ٹھہرتی ہے اور ہمیں بھی ٹھہر کر لطف اندوز ہونے کی دعوت دیتی ہے۔

’یا اخی‘ ڈاکٹر مظفر حنفی کا دسواں شعری مجموعہ ہے۔ پہلا مجموعہ ’پانی کی زبان‘ ۱۹۶۷ میں شائع ہوا تھا، اس کے بعد ’تیکھی غزلیں‘ (۱۹۶۸ء)، ’عکس ریز‘ طویل طنزیہ نظم (۱۹۶۹ء)ء، ’صریر نامہ‘ (۱۹۷۳ء)، ’دیپک راگ‘ (۱۹۷۴ء)، ’یم بہ یم‘ (۱۹۷۹ء)، ’طلسمِ حرف‘ (۱۹۸۰ء)، ’کھل جا سم سم‘ (۱۹۸۱ء)، پردہ سخن کا‘ (۱۹۸۶ء) منظر عام پر آئے۔آخری دو مجموعوں میں ایک دہائی کا فاصلہ ہے۔ظاہر ہے کہ مظفر حنفی صاحب کتنے پُر گو ہیں اس کا اندازہ تو مجموعہ ہائے کلام کی فہرست دیکھ کر ہوتا ہے۔ساتھ ہی احتمال بھی ہوتا ہے کہ تخلیقی رو میں خاروخس بھی

آ گئے ہوں گے لیکن ’یا اخی‘ کے مطالعے سے حیرت ہوتی ہے کہ ان غزلوں کے معتد بہ اشعار کہیں خیال وفکر اور کہیں اسلوب ولہجے کی اثر انگیزی کے باعث دیر تک اپنی گرفت میں رکھتے ہیں۔

اس میں دو رائے نہیں کہ مظفر حنفی ہمارے عہد کے بے حد منتخب جدید شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ یہ کم بڑی بات نہیں کہ اپنے منفرد، کاٹ دار اور توانا لہجے کی وجہ سے ان کی غزلیں دور سے پہچانی جاتی ہیں۔ ہر چند غزل جیسی لطیف ترین صنفِ سخن میں طنزیہ پیرائے میں اظہار کا عمل بذاتِ خود ایک جوکھم بھرا راستہ ہے۔ ہمارے بیشتر شعرا کے یہاں اس نوع کی شاعری میں بعض اوقات فکر وجذبے کی سرکشی ایک براہ راست عمل بن جاتی ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شعر نے مکالمے کی شکل اختیار کر لی ہے لیکن مظفر حنفی صاحب کی اردو کی غزلیہ روایت پر گہری نظر اور رموزِ فن پر قابلِ رشک دسترس نے غزل کی فضا کو مجروح ہونے نہیں دیا ہے۔ بیشتر اہلِ نظر نے ان کے لہجے کی نشتریت کو شاد عارفی کا ترکہ ضرور کہا ہے لیکن اس اعتراف کے ساتھ کہ اس کی ”بو قلمونی، طرحداری اور ابعاد“ مختلف ہیں۔مندرجہ ذیل اشعار دیکھیں:

ذرا سی روشنی مانگی تھی، رات کاٹنے کو   چراغ اتنے جلے گھر ہی پھونک ڈالا مرا
ہم تو خوشبو کی طرح خود ہی بکھر جاتے ہیں   تم وہ دیوار کہ مزدور اٹھاتا ہے جسے
سچ بولنے لگے ہیں کئی لوگ شہر میں   دیواریں اٹھ رہی ہیں نئی، قید خانے میں
بلا سے بجھے یا بڑھے تشنگی   سمندر کو آداب کرتے رہو
میرے گھر میں جو کچھ بھی ہے موجِ بلا ہے تیرا   لے جا جو چاہے، بے جا تفسیریں کیا کرتی ہے
ہم ستارے بنا کے نادم ہیں   آپ نازاں ہیں آبگینوں پر
جنوں تباہ نہ کر دے کہیں زمانے کو   یہ تیشہ دستِ ہنر میں رہے تو اچھا ہے
کیا دیر ہے، مجھ کو بھی اجازت ہو رجز کی   حرف آنے لگا نام ونسب تک مرے مولا

محولہ بالا اشعار جہاں مظفر حنفی صاحب کی تیکھی زبان اور کاٹ دار لہجے کی تمثیل پیش کرتے ہیں وہیں اس امر کا اثبات کرتے نظر آتے ہیں کہ ان کی غزلیں بے پناہ تخلیقی بصیرت کے باعث اس چیخ دھاڑ سے پاک ہیں جو عموماً اس نوع کی شاعری کا طرۂ امتیاز بن جاتے ہیں۔اک ذرا بدلے اور منفرد انداز کے ان اشعار کی فضا بندی غزل کی رسمیات سے قطعی مختلف ہے۔لفظیات کے استعمال میں بھی آزادانہ روش اختیار کی گئی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تصورات کے سارے کلیشے ایک ہی آن میں زمین بوس ہوگئے، کہاں روشنی کی تکرار کرتے اشعار اور کہاں یہ آگہی کہ چراغ اتنے جلے گھر ہی جل گیا، ہمارے عہد کی ایک عجیب تصویر پیش کرتا ہے۔نئے حقائق کا ادراک ہوتا ہے۔ان حقائق کا جو ہمارے آس پاس خوابیدہ نظر آتے ہیں۔ذرا ان اشعار کے تیور دیکھیں!

بس کہہ دیا کہ ہم نہ چلیں گے کسی کے ساتھ   پیچھے پلٹ کے دیکھ رہا ہے زمانہ کیوں

سفر کیسا کہ باہم بر سر پیکار ہیں سارے
ہمارے کارواں میں کارواں سالار ہیں سارے

بادی النظر میں ان اشعار پر محض تضادات کو جنم دینے کا گمان ہوگا لیکن عصری تقاضوں کا دروں بینی سے جائزہ لیا جائے تو ادراک ہوگا اس جبر کا جس نے اپنے آپ کو مختلف پردوں میں چھپا رکھا ہے۔ دنیا سرد جنگ کے خاتمے کے بعد ایک نئی جنگ سے نبرد آزما ہے جہاں ثقافت کے خوش رنگ کھلونے بطور ہتھیار استعمال کیے جا رہے ہیں۔ ایک زمین ایک کلچر کے نام پر کس طرح دنیا کی رنگارنگ تہذیب پر ایک مخصوص پاپولر کلچر غلبہ حاصل کرنے کی سعی کر رہا ہے، اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کے مقابل اپنی تہذیبی بقا کی جدوجہد میں کمزور طاقتوں کا انحراف کرنے کا رویہ اور اس صورت حال سے پیدا ہونے والی کشمکش، بے اطمینانی اور قیادت کا بحران جیسے مسائل منظر نامے کو اور اجال دیتے ہیں۔ ایسے کئی حوالے ان اشعار کے تعلق سے پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ ان اشعار کا قاری یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا ہے کہ مظفر حنفی اپنے اردگرد کی دنیا کا کتنی باریک بینی سے جائزہ لیتے ہیں اور ان خامیوں کو اپنے اشعار میں اجاگر کرتے ہیں جو خامیاں ہمیں منزل تک پہنچنے سے روک دیتی ہیں اور ہم راستے کے پیچ وخم میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔

حنفی صاحب کی شاعری کو محض طنزیت اور نشریت کے خانے میں محبوس کر دینا میری نگاہ میں ایک بڑی ناانصافی ہوگی۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے اکثر اشعار میں پہاڑی جھرنے کی طرح تیز رو بہنے کا عمل جاری وساری نظر آتا ہے لیکن ان اشعار پر کیا کہیں گے۔

آ گیا میں کسی جگنو کی نظر میں کیسے
بوند بھر نرم اجالا مرے گھر میں کیسے

وسعتیں مجھ کو خلاؤں سے صدا دیتی ہیں
یہ نشیمن کی گرہ پڑ گئی پر میں کیسے

ساری بستی پہ نہ لے آئے وہ آفت کوئی
کون ہے، کوہِ ندا روز بلاتا ہے جسے

اے گلِ تر شگفتہ باد میں تو چراغِ صبح ہوں
میری نجات کے لیے دامنِ باد کم نہیں

سانس لیتی ہے زمیں سن تو سہی
بیج پھوٹا ہے کہیں سن تو سہی

کہاں ہے تیرا قبیلہ کہ راہ پانی دے
عصا نہیں ہے تو جادوگروں سے جنگ نہ کر

ان اشعار میں وہی تخلیقی رچاؤ ہے جو ہماری جدید تر غزل کا خاص وصف ہے۔ وہی پراسرار دھند تہ بہ تہ نظروں کے سامنے حائل ہوتی ہوئی جو صدیوں سے انسانی نفسیات اور جبلت کا حصہ بنی ہوئی ہے جہاں سب کچھ ہویدا ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ انجانا محسوس ہوتا ہے جس سے ایک عجیب طرح کی سرشاری حاصل ہوتی ہے۔ یہ اشعار ایسے جہانِ معنی کی سیر کراتے ہیں جہاں عزم وحوصلہ ہے صدیوں کی روایت میں سانس لیتی دھرتی میں نئے بیج پھوٹنے کی دھڑکن ہے، نئی امید اور تمناؤں کے حصول کے لیے جاگتے ذہن کی ہوشیاری ہے۔ بوند بھر نرم اجالا، نشیمن کی گرہ، ستارے کا دیدۂ نمناک سے اترنا، بیج پھوٹنے کو زمین کے سانس لینے سے عبارت

کرنا، گلِ تر کو چراغِ صبح سے تعبیر کرنا نیز ہر دو کی رعایت سے دامنِ باد کا ذکر ایسی تمثیلیں ہیں جو نشاط انگیز بھی ہیں اور کربناک بھی۔ شاید بڑی غزل کے لیے راستہ کھل گیا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ مظفر حنفی صاحب کے یہاں بیان کی رنگارنگی اور دل کشی ان کی ہر غزل میں ایک وصف بن کر ابھرتی ہے۔ نئی نئی تراکیب تراشنا، پرانی تشبیہات کو نیا رنگ وآہنگ دینا اور سب سے بڑھ کر لفظیات کا وسیع تر اور خلاقانہ استعمال نئے نئے موضوعات خود بخود پیدا کر دیتا ہے۔ ہر غزل میں ایک نئی بات بالکل نئے پیرائے سے صرف تاریخی تلمیحات ہی نہیں روزمرہ کی بولیوں، محاورات اور ضرب المثل میں شعریت تلاش کر لینا اور انھیں تخلیقی دھارے سے گزار کر زندہ جاوید کر دینا مظفر حنفی صاحب کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔

دشمن بن کر لکھتا ہوں میں خود اپنے اعمال
لاکھ فرشتہ آزو بازو بیٹھا رہتا ہے

گُل بُل گُل بُل امتحان کا کمرہ بچوں سے
برفیلا موسم پنچھی چٹیل میدان ہوا

حبس کی برف آخر پگھلنے لگی
کنمنائی ہوا دیکھتے دیکھتے

ہونے لگا ہے ماں کی دعا میں غلط اثر
بیٹی تو گھر میں بیٹھی ہے بیٹا نکل گیا

مسلسل یوں نہ پی آنسو مبادا
تری آنکھوں میں پارا بیٹھ جائے

کیسے کیسوں کو مٹی نے سیدھا کیا
اچھے اچھوں کی یاں رستی رہ گئی

تو نے بہتیرا سمجھایا، موٹی کھال گرہ میں مال
اے دنیا کیسے آ جاتے ہم تیرے بہکانے میں

ان سے دھیان لگائے رکھنا، اس حالت میں لازم ہے
فرصت ہی فرصت ہے ہم کو تیری تو چاندی ہے دل

گھوم رہا ہوں دیپک لے کر
قریہ قریہ سن سن کرتا

سناٹے اوڑھے بیٹھا ہوں
تن اکتارہ جھن جھن کرتا

سائے سائے میں چھپ کر وہ
جلوہ درپن درپن کرتا

ان اشعار پر اگر غور فرمائیں تو محسوس ہوگا کہ اردو کی شعری روایت میں فارسیت کا غلبہ کم ہو رہا ہے اور اردو ہندی کے میل جول سے پیدا ہونے والی زبان میں مٹی کی خوشبو داخل ہو رہی ہے۔ یہ وہ ارضیت ہے جو ہماری سائیکی کا حصہ بن چکی ہے اور ہمارے صاحبِ نظر فن کاران سے عرق کشید کر رہے ہیں۔ اس نوع کی شاعری میں ہمارے آس پاس کی جیتی جاگتی دنیا ہے، ہمارے اپنے مسائل ہیں، اپنے دکھ سکھ کی باتیں ہیں۔ یہ شاعری اوڑھی ہوئی نہیں بلکہ زندہ وتوانا لگتی ہے اور خود بھی ہمیں جاگنے اور زندہ رکھنے کے اسباب فراہم کراتی ہے۔ مظفر حنفی صاحب اس مقام پر سب سے الگ تھلگ نہیں بلکہ اس مٹی کی آواز معلوم ہوتے ہیں۔

○○○

ڈاکٹر شمع افروز زیدی
نئی دہلی

ایک البیلا، طنز نگار شاعر

پروفیسر مظفر حنفی کا نام نوکِ زبان پر آتے ہی ایک ایسی شخصیت کا تصوّر اُبھرتا ہے جو بے حد فعال اور متحرک ہے۔ ان کی شخصیت کے مختلف النوع زاویے ہیں۔ وہ ناقد بھی ہیں، مضمون نگار اور افسانہ نگار بھی۔ انھوں نے سفرنامے بھی قلم بند کیے ہیں اور ترتیب و تدوین، تراجم نیز ادبِ اطفال میں بھی ان کے کارنامے کسی سے پوشیدہ نہیں......اور 'نئے چراغ' کے مدیر ہونے کے ناتے صحافی کی حیثیت سے بھی پہچان رکھتے ہیں۔ غرض یہ کہ کوئی ایسا موضوع نہیں جس کا انھوں نے احاطہ نہ کیا ہو اور اپنی شناخت درج نہ کرائی ہو۔

عام طور پر ہمارے ناقدین ادب سچی اور کھری تنقید سے پہلو تہی کرتے ہیں وہ دو اور دو چار کے مسئلے پر ہی اٹکے رہتے ہیں۔ مظفر حنفی ایسے سچے اور کھرے فن کار ہیں کہ سچی بات کہنے سے چوکتے نہیں بلکہ خدا لگتی کہنے پر آجائیں تو بلا تکلف قدآور شخصیتوں کو بھی قلم کی زد پر رکھ لیتے ہیں۔ بلا شبہ جدید شاعری کے حوالے سے مظفر حنفی کے لہجے کی انفرادیت مسلم ہے۔ ناقدین نے ان کے شعری منظر نامے پر اپنے اپنے انداز میں روشنی ڈالتے ہوئے انھیں سندِ افتخار سے نوازا ہے۔ ان کی شاعری پر ظ۔ انصاری جیسے اکھڑ ناقد اس انداز میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

"قدرتِ کلام، کلاسیکی ورثے پر بھرپور گرفت، طبیعت کا رچاؤ سہار اور سبھاؤ، پھر ماضی کی طرف ایک چھلانگ میں بے نیازانہ باہر نکل پڑنے کا دم خم جب یکجا ہو جائے تب کہیں جا کے ویسی سڈول غزل ہوتی ہے جس کی اُٹھان جاں نثار اخترؔ سے ہوئی تھی اور شباب مظفر حنفی کے قلم میں نظر آتا ہے۔"

شمس الرحمن فاروقی جیسا ناقد بھی مظفر حنفی کی شعری معجز بیانی کا معتقد نظر آتا ہے:

"مظفر حنفی نے انتہائی شگفتہ زمینوں میں رواں دواں شعر کہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ نئے نئے ردیف و قافیہ کا ایک فوّارہ ہے جو ابلتا جا رہا ہے۔ ان کی شاعرانہ چالا کی کہیں مات نہیں کھاتی......"

خلیل الرحمن اعظمی فرماتے ہیں:

"مظفر حنفی ان شاعروں میں ہیں جنھوں نے شاعری اور فن کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے اور اس کے لیے وہ ریاضت کی ہے جس کے بغیر شاعری کی انفرادیت نہیں اُبھر سکتی۔"

فرمان فتح پوری ان کی عظمتوں کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"مظفر حنفی اردو کے ممتاز ترین شاعروں میں سے ہیں اور ہندو پاک کے ایسے منفرد غزل گو ہیں جنھیں اپنے لہجے کی بنا پر دور سے پہچانا جاتا ہے......"

گوپی چند نارنگ کہتے ہیں:

"مظفر حنفی کی غزل نے محض ایک موضوع یا واقعات کے کسی ایک سلسلے تک خود کو محدود نہیں رکھا، ان کے ہاں بیک وقت سوچ کے کئی سلسلے کارفرما نظر آتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کاٹ دار تیکھی غزل کی راہ انھوں نے شاد عارفی سے پائی لیکن اس میں بوقلمونی، تہ داری اور طرحداری کی فضا اپنی بنائی......"

وزیر آغا کا خیال ہے:

"تجربے اور روایت کا بنتا بگڑتا سنجوگ مظفر حنفی کی غزل کا امتیازی وصف ہے۔"

سجاد نقوی رقم طراز ہیں:

"غزل کے میدان میں وہ تازہ ڈکشن اور منفرد لہجے کے باعث بآسانی پہچانے جاتے ہیں......"

اس میں شک نہیں کہ ان کی شاعری میں فکر کے ساتھ طنز کی دھیمی دھیمی آنچ سہج سہج ذہن کو چھوتی ہوئی دل کی عمیق گہرائیوں میں جاں گزیں ہو جاتی ہے۔ ناقدین اُن کے لہجے کو شادؔ عارفی سے مماثل قرار دیتے ہیں، یہ بات کسی حد تک درست ہے لیکن کلیتاً اس کا اطلاق ان کے کلام پر نہیں کیا جا سکتا۔ مظفر حنفی نے اپنا رنگ علیحدہ اختیار کیا اور ان کا لہجہ و آواز دور سے ہی اپنی پہچان کراتا ہے۔ البتہ ابتدائی دور کی شاعری پر شاد عارفی کا اثر قبول کرنے کا اعتراف مندرجہ ذیل اشعار کے ذریعہ کرتے ہوئے خود فرماتے ہیں۔

ہے شادؔ عارفی سے مظفؔر کا سلسلہ   اشعار سان چڑھ کے بہت تیز ہو گئے
شادؔ صاحب کی طرح میں نے مظفؔر حنفی   طنز پر سان چڑھانے کی قسم کھائی ہے

لیکن اپنی راہ یک و تنہا متعین کرنے کے ضمن میں وہ کیا کہتے ہیں، اسے بھی ملاحظہ کیجیے۔

لکھتا ہے مظفؔر روشِ عام سے ہٹ کر   شہرت اسے درکار نہ رسوائی کا غم ہے
تقلیدیوں کے بس کی مری شاعری نہیں   اندازِ میرؔ حضرت فانیؔ نہ پا سکے
مظفؔر شاعری میں عمر ضائع ہو گئی لیکن   مری آواز الگ ہے منفرد آہنگ ہے میرا

تمہارا نام ہر سو گونجتا ہے قریۂ جاں میں   مظفرؔ ایک صحرا اور صحرا کی اذاں، تم ہو

بے شک ابتدائی دور کی شاعری میں مظفرؔ حنفی کے یہاں شادؔ عارفی کا طنطنہ اور طنزیہ لہجے کی کاٹ محسوس ہوتی ہے۔ لیکن ان کا لہجہ کھردرا ہونے کے باوجود شگفتگی اور شیرینی کی گھلاوٹ سے لبریز شعری منظر نامے کے افق پر امتیازی شان اور نمایاں اسلوب کے ساتھ اپنے منفرد ہونے کا اظہار یوں کراتا ہے۔

یہ سوز یہ گداز مظفرؔ کے شعر میں   صحرا میں گونجتی ہے اذاں یار بادشاہ
میں نے ڈبو کے نوکِ قلم اپنے خون میں   جس لفظ کو چھوا وہ شرارہ سا بن گیا
نازک ہے فنِ شعر مگر طرزِ نو کے ساتھ   ہم اس حباب کو بھی سلامت اٹھائیں گے

تازگی، پختگی اور جدّت پسندی کے سبب مظفرؔ حنفی کو اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں ہی ایسی شہرت حاصل ہوگئی تھی جو کم لوگوں کا مقدر بنتی ہے۔ یہ ان کی انفرادیت ہی تو تھی کہ ان کی شاعری کا اعتراف مخالفین نے بھی کیا۔ ان کی شہرت کو پَر لگ گئے یہاں تک کہ ان کا شمار پختہ کار شاعروں میں کیا جانے لگا۔ پھر ان کی شاعری کے ایسے ایسے جوہر کھل کر سامنے آئے جن کی بنا پر وہ اپنے جدید لب و لہجے سمیت دنیائے شعر و ادب پر چھا گئے۔

اچھے شعر کی خوبی یہی ہے کہ اس کی تاثیر نہ صرف سامع اور قاری کے ذہن و دل کو اسیر کرلے بلکہ وہ اس کے حصار سے باہر نکل ہی نہ سکے۔ شعر کا تاثر جتنا گہرا اور دیرپا ہوگا شعر اتنا ہی کامیاب اور ابدی ہوگا، اور اپنے سامع یا قاری کو مغلوب کرنے میں معاون ہوگا۔ غزل ہو یا نظم شاعری زندگی کی سچائیوں اور حقیقتوں کی ترجمان ہوتی ہے اور اس ترجمانی میں عام انسان کے دکھوں، پریشانیوں، پشیمانیوں، مسرتوں اور خوشیوں کا اظہار ہوتا ہے۔ شاعر کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

اوپر بوڑھے ہاتھ اُٹھائے سوکھتے تھے دو چار درخت
پہلے ان پر بجلی ٹوٹی، ویسے بادل برسا بھی
چلے تھے کارواں کے ساتھ پھر مڑ کر نہیں دیکھا
پشیماں کس قدر ہیں آکے منزل پر اکیلے ہم
بچوں کا نہیں ذکر کہ تہذیب و ادب سے
بیگانہ ہیں کچھ اہلِ ادب تک مرے مولا

فنّی خلوص، جبلّی شرافت اور ذوقِ جمال، کے سائے میں پروان چڑھنے کے سبب مظفر حنفی کی شاعری طنزیہ ہوتے ہوئے بھی لطیف احساسات وجذبات کا مرقع بن گئی ہے۔ ان کے مخصوص انداز اور اس سے بڑھ کر وجدان اور شعور نیز لفظوں کے استعمال پر ان کی خلّاقانہ دسترس نے ان کی شاعری کو سان پر چڑھا دیا لیکن انھوں نے اپنے استاد شادؔ عارفی سے اپنی راہ کچھ اس طور سے مختلف رکھی کہ ان کی آواز کو بھیڑ میں بھی شناخت

کرلیا گیا، یہاں تک کہ ان کے ایک ایک شعر کو موتی کی طرح چُن کر یکجا کیا جاسکتا ہے۔ خود شاعر اس کا اعلان مندرجہ ذیل اشعار کے ذریعہ کرتا ہے۔

ٹھپہ لگا ہوا ہے مظفرؔ کے نام کا   اس کا کوئی بھی شعر کہیں سے اٹھا کے دیکھ
واللہ مظفرؔ تری غزلیں ہیں کہ ترکش   پیوست ہوئے دل میں، ترے شعر ہیں یا تیر
یوں بھیڑ میں چھپی ہے مری انفرادیت   جس طرح ریگزار میں موتی رُلے ہوئے
خوش فہم مظفرؔ سا زمانے میں نہ ہوگا   کہتا ہے نہ ہوگا کوئی مجھ سا مرے پیچھے

مظفرؔ حنفی کا دامنِ فکر تجربات و مشاہدات سے مزیّن ہے۔ انھوں نے جدید شاعری کے تمام و کمال تقاضوں کو اپنے یہاں نہایت خوبی سے نبھایا ہے۔ ان کے یہاں تراکیب، استعاروں کی تہ داری اور بے ساختگی کا اتنا رچاؤ ہے کہ وہ اپنے آہنگ میں یکتا و تنہا نظر آتے ہیں۔ شاعر کو اپنی اس خوبی کا خوب احساس ہے جب ہی تو وہ کہتا ہے۔

ہاں مظفرؔ کی غزل ہے تو جدید   اے روایت کے امیں سُن تو سہی
سوچ نئی ہے، لہجہ تیکھا، لفظ کھرے، آواز جدا   دانستہ رکھا ہے اپنے شعروں کا انداز جُدا
آپ کے مظفرؔ نے زندگی کو برتا ہے   اس لیے مظفرؔ کے شعر بھی مثالی ہیں
شعر کہتا ہے مظفرؔ داد سے بیگانہ وار   پھل میں وہ لذّت کہاں ہے جو شجر کاری میں ہے

مظفرؔ حنفی کا لہجہ روایتی شاعری سے جدا ہے۔ ان کی سوچ و فکر جامد نہ ہو کر متحرک ہے اور ان کے اسی مخصوص رویے نے انھیں دنیائے شاعری میں لازوال شان عطا کردی ہے۔ ایک زمانے میں شاعری کا ایک بڑا حصّہ یکسانیت کا شکار ہو کر رہ گیا تھا، فن کاروں میں خود کو دہرانے کا عمل شروع ہو چکا تھا لیکن مظفرؔ حنفی کے یہاں خود کو دہرانے کا عمل دور دور تک نظر نہیں آتا۔ انھیں اس بات کا غم یا اس کی پرواہ ہرگز نہیں کہ ان کی اہمیت و انفرادیت کو ناقد حضرات گردانتے ہیں یا نہیں، ان کا شِعار تو بہترین شاعری پیش کرنا رہا جب ہی تو وہ بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں۔

اے مظفرؔ مرے نقاد نہ مانیں لیکن   شہ سواروں کے لیے بھیڑ بھی چھٹ جاتی ہے
مظفرؔ پستہ قد تنقید سر پر تاج رکھتی ہے   کھرا شاعر کبھی عظمت کے چکّر میں نہیں رہتا
نیازمند مظفرؔ کہاں سے ہوجائے   کہ بانکپن تو ہے اس کی سرشت میں داخل
غزل کی شمع کو میں اشتعال دیتا ہوں   نئی زبان، انوکھے خیال دیتا ہوں

مظفرؔ حنفی نے اپنی شاعری کو فقط اپنی ذات تک محدود نہ رکھ کر اپنے افکار و تصورات کو کائناتی وسعت عطا کردی ہے۔ وہ عملاً ایک حقیقت پسند فن کار ہیں اسی لیے سماج میں پرورش پارہی خامیوں کے خلاف آواز

بلند کرنے سے چوکتے نہیں۔ انھیں زندگی میں جو تلخیاں، سچائیاں، دلفریبیاں اور بدصورتیاں نظر آتی یا محسوس ہوتی رہی ہیں۔ انھیں وہ فنّی مہارت اور چابک دستی کے ساتھ اپنے اشعار میں سمیٹتے رہے۔ انھوں نے اپنے فن کو کسی بھی مصنوعی جذبے سے آلودہ نہیں کیا۔ اسی وجہ سے ان کے شعر ہمیں بار بار باور کراتے ہیں کہ ان کی شاعری نئے تجربوں کی شاعری اور اپنے سماج کی تاریخ ہے۔ ان کے فکری رویّوں کے ساتھ ان کی غزل کا اٹوٹ اور گہرا رشتہ ہے اور قاری سمجھتا ہے جیسے یہ اشعار صرف اور صرف اس کے جذبات کی ترجمانی کے لیے ہی کہے گئے ہیں۔ مثلاً ؎

کس لیے صحن میں دیوار ہے پوچھو اُن سے   کون بٹوارے پہ تیار ہے پوچھو ان سے
چپکے چپکے اونچی کر لی میری کھڑکی پر دیوار   ہمسائے نے کاٹ لیا ہے آسمان مجھ بے پر کا
زخموں کے اسرار نہ پوچھو   ٹانکے روز اُدھڑ جاتے ہیں
جب کوئی تن کر ملتا ہے   ہم کچھ اور اکڑ جاتے ہیں

موجودہ معاشرے میں ٹوٹ پھوٹ کا جو عمل جاری ہے، بھائی بھائی کے درمیان جو معرکہ آرائی، کشمکش اور نفرت فروغ پا رہی ہے کوئی بھی سچا فن کار اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، چنانچہ مظفر حنفی اپنی شاعری میں ان مسائل کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

ہوا چلی ہے ہرے درختوں سے دشمنی کی   ہمیں بھی آلے گی سرخ آندھی چلو یہاں سے
آگ لگی ہے بستی بھر میں   تم اب تک اپنے گھر میں ہو
دل دہلتا ہے مکانوں سے نکلتے ہوئے کیوں   ہول کیسا سرِ بازار ہے پوچھو ان سے
شہر میں جشن ہے نیزوں پہ چڑھے ہیں بچّے   آج مکتب میں مناجات نہیں ہونے کی
گولی برسی خوب مظفرؔ دہشت گردوں پر کل رات   مرنے والوں میں شامل ہے تین برس کا بچّہ بھی

ایسے اور اس قبیل کے کتنے ہی اشعار فرقہ وارانہ فسادات کا منظر نامہ پیش کرتے ہیں جو آزادی کے بعد سے ہمارا مقدر بن گئے ہیں۔ مظفر حنفی کے کلام میں جو تاثر، ماحول اور فضا ملتی ہے وہ معاشرے کی دین ہے۔ ہمارا معاشرہ کس سمت جا رہا ہے ان اشعار میں محسوس کیجیے ؎

دور تلک دھواں دھواں گرچہ ہے سر پر آفتاب   شور ہے اتحاد کا اور فساد کم نہیں
آج دس بیس پھر جان سے جائیں گے   آج ہر موڑ پر سنتری ہے میاں
نگر نگر میں بظاہر ملاپ ہم نے کیے   فساد خون میں ہے وار آپ ہم نے کیے
جن بستیوں کو آگ لگانے چلے ہو تم   ان بستیوں میں ہو نہ تمہارا بھی گھر کہیں

مظفر حنفی زندگی کے ہر پہلو کو اپنے دائرۂ اختیار میں رکھتے ہیں۔ ہر جہت اور ہر سمت میں ان کی نظر جاتی ہے، انھیں وہاں سے جو کچھ بھی دستیاب ہوتا ہے وہ نشاط انگیز جذبہ ہو یا کربناک احساس، اسے الفاظ کا جامہ

عطا کر دیتے ہیں۔ ان کی شاعری کا خمیر چوں کہ ان کی اپنی مٹی سے اٹھا ہے، اس مٹی کی تاثیر ہے کہ اس میں جنم لینے والے شاعر کے یہاں وہ جذبہ بہر صورت موجود ہوتا ہے جو زندگی میں ترتیب پانے والے دُکھوں اور اندیشوں کی صورت میں بار بار اسے اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ ہمارے سماج میں جہیز کی لعنت اس قدر سرایت کر چکی ہے کہ پیسہ نہ ہونے کے سبب لڑکیاں باپ کی دہلیز پار نہیں کر پاتیں۔ اس درد کو شاعر نے ان اشعار میں سمویا ہے ؎

چپکے چپکے روتا ہے اک نازک سا دل مخمل میں
دور کہیں ویرانے میں زنجیر چھنکتی جاتی ہے
بھائی کس منہ سے جا کر محبت کرے اس کی بہنوں کو رشتے میسر نہیں
باپ کے دل میں بے روزگاری کا غم ماں کو حیرت کہ برکت کہاں اُڑ گئی

مظفر حنفی کی غزلوں کی دل کشی کا باعث ان کی شفاف اور سادہ زبان ہے۔ وہ بھاری بھر کم الفاظ سے اپنی غزلوں کو بوجھل نہیں بناتے۔ اکثر اوقات زبان ایسی سرل استعمال کرتے ہیں جو عام انسان کی فہم سے اس طرح نزدیک ہو جاتی ہے کہ قاری یا سامع کے ذہن پر مخصوص تاثر چھوڑنے کے ساتھ ہی مفہوم ایک دم واضح ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب وہ کہتے ہیں ؎

سہج سہج اُپلوں سے آنچ نکلتی ہے   ترل ترل بہتی ہے نالی رات ہوئی
گھنگھرو جیسی رم جھم بوندنیاں   بادل جھینا جھینا مولا پانی دے
ابھی درخت پہ پتھر چلا رہا تھا میں   گرے ہیں پھل تو انھیں چوم کر اٹھاتا ہوں

مظفر حنفی کے یہاں اس جذبے کا ذکر کرنا بھی بے حد ضروری ہے جس کا ذکر قدیم و جدید شعرا نے اپنے یہاں اپنے اپنے انداز میں کیا ہے۔ اس البیلے شاعر نے بھی عشق کی دھیمی دھیمی آنچ کو محسوس کر کے اس موضوع کو اپنی شاعری میں اس خوب صورتی اور صناعی سے برتا ہے کہ ان اشعار کو پڑھ یا سُن کر عشق کی وادیوں میں سرگرداں مسافر اپنے اندر شگفتگی اور تازگی محسوس کرنے لگتا ہے لیکن یہاں بھی مظفر حنفی نے اپنی انفرادیت و شان برقرار رکھی ہے۔ ذرا ملاحظہ کیجیے ؎

میں اکثر سوچا کرتا ہوں چاند نہیں لیکن پھر بھی   سورج ڈھلنے پر وہ کیوں بالائے بام آ جاتا ہے
چاندنی اتنی گھٹی پہلو میں گھٹ کر آ گئی   یاد ان کی دامنِ شب سے لپٹ کر آ گئی
کچھ ایسے انداز سے جھٹکا اس نے بالوں کو   میری آنکھوں میں در آیا پورا کجلی بن
آج اِک لڑکی نے میرا حافظہ مہکا دیا   رنگ تیرے پیرہن جیسا تھا بوتری نہ تھی
ہر ایک سانس تری یاد سے معطّر ہے   ہر ایک لمحہ ترے انتظار سے روشن
وہ سر سے پا تک تمام شعلہ   اسے کوئی چومتا کہاں سے

وہ کنوار پن میں دبی دبی، وہ حیا کے بار سے مضمحل　　　مری اک نگاہ کے لمس سے وہ متاعِ حسن نکھر پڑی

آخر میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مظفر حنفی نے جدید اُردو غزل کو جو وقار بخشا ہے وہ ان کی تخلیقی بصیرتوں کا غمّاز ہے۔ ان کی بعض غزلوں میں صوتی آہنگ اور نغمگی کا بھرپور رچاؤ ملتا ہے۔ ذرا گنگنائیے تو سہی ؎

پاس آکر حال پوچھا آپ کو زحمت ہوئی　　　لیکن اس کے بعد مجھ کو اور بھی وحشت ہوئی
آئنے میں عکس بھی اپنا نہیں لگتا مجھے　　　اب کوئی تیرے سوا اچھا نہیں لگتا مجھے
دل کی یلغار ناکام پھر ہوگئی　　　پھر بگل بج گیا شام پھر ہوگئی

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ مظفر حنفی نے فکر کی پختگی کے ساتھ ذات وکائنات کے مسائل کا ادراک نیز دورِ حاضر، ماضی اور مستقبل سے اپنا رشتہ اس طرح استوار رکھا ہے کہ اُن کی عظمت ہر دور میں تسلیم کی جاتی رہے گی۔

○○○

....

''ہم مظفر حنفی کی رباعیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ وہ اس پُل صراط سے سلامتی کے ساتھ گزرے ہیں اور ان کی رباعیوں میں اس فن کی امتیازی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مظفر حنفی ایک سچے تخلیقی فن کار ہیں اس لیے جس طرح موضوع کا تنوع، بول چال کی زبان کا کھردرا پن، بے باک لہجہ اور طنزیہ کاٹ ان کی غزلوں کی خصوصیات ہیں، اسی طرح یہ ان کی رباعیوں کو بھی جاندار اور پرکشش بناتی ہیں اور ہم ایک حیرت انگیز اور خوش گوار جمالیاتی تجربے سے دوچار ہوتے ہیں۔ طنز مظفر حنفی کی شاعری کا نمایاں وصف ہے۔ انھیں زندگی کی ناہمواریوں، گردوپیش کی کھردری حقیقتوں اور معاشرتی کجیوں اور خامیوں کا گہرا احساس ہے۔ وہ طنزیہ پیرایۂ بیان میں ان کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ کثرتِ مشاہدہ اور نفاست طبع نے اسے تلوار کی دھار بنا دیا ہے جس کا نشانہ دوسرے ہی نہیں، خود شاعر بھی ہیں۔'' **(علقمہ شبلی)**

ڈاکٹر محسن جلگانوی
سالار جنگ کالونی، حیدرآباد، رابطہ نمبر: 7013380902

مظفر حنفی کی شاعری میں جدید حسیت

پچھلے مہینے جدید شاعری کے نہایت معتبر اور نمائندہ شاعر مظفر حنفی کا انتقال ہوگیا۔ انھوں نے اپنے جدید اسلوب اور لہجے کی آمیزش سے اپنی شاعری میں سماجی معنویت اور عصری حسیت کو پیش کیا ہے۔ ان کے آہنگ شعر میں جو تلخی، طنز اور تازہ کاری کا کرارہ پن دکھائی دیتا ہے اس کی نظیر اس عصر کے کسی شاعر کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتی۔

مظفر حنفی اپنی فکری شادابی، اسلوب کی ندرت اور جدید حسیت کے باوصف، اردو کی غزلیہ شاعری کے مستند اور معتبر شاعر کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی شاعری کے الاؤ میں تجربات کا ایندھن ہمیشہ شعلہ ذہن رہا ہے۔ ان کی شعری حسیت میں تازہ کاری، نیا پن اور عصری حسیت ان کے فن کی پہچان بن کر ابھرتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کو اس طرح بھوگا ہے کہ تجربے ان کے اظہار کی زبان بن کر بولتے ہیں۔ مظفر حنفی کی غزل کا خاص وصف ان کی زبان و بیان کی کھنک اور گونجتے ہوئے قافیے اور اچھوتی ردیفیں ہیں۔ ان کے لہجہ میں جو چھپا ہوا طنز ہے وہ ان کی غزل کو ممیز کرتا ہے۔ مظفر حنفی کی شاعری کے تعلق سے یہ بات کہی جاتی رہی ہے کہ روایت کا احترام کرنے والا کوئی شاعر شعور و ابلاغ کی سطح پر عصری حسیت اور نجی تجربے کو شعری صورت دینے میں مظفر حنفی سے بہتر طریقے پر زبان کو شاید ہی برت سکے۔

مظفر حنفی کے زبان و بیان کا خاصہ یہ رہا ہے کہ انھوں نے فارسیت کے غلبہ سے اپنی شاعری کو بچائے رکھا اور رواں دواں اور سہل اندازِ بیان میں شعر کہے، لیکن اس سادہ بیان میں انوکھا پن اور نادرانہ اظہار ان کے ہاتھوں سے نہیں گیا۔ بیان و زبان پر ان کی گرفت اور قادر الکلامی ان کی شخصیت کو اعتبار بخشتی ہے۔ اردو غزل کے اکثر شاعروں کے یہاں مقلدانہ لفظیات کے باوصف ان کی شاعری پر کسی نہ کسی پیش رو شاعر کی کاربن کاپی ہونے کا الزام لگتا رہا ہے۔ مظفر حنفی ان شاعروں میں سے ہیں جن کے بارے میں گوپی چند نارنگ نے اظہار خیال کیا تھا کہ ان کی اپنی لفظیات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ کہتے ہیں:

''مظفر حنفی ہمارے دور کے ان چند شاعروں میں سے ہیں جن کی لفظیات کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ انھیں نئی بات پرانے انداز میں اور پرانی بات نئے اسلوب میں کہنے پر قدرت حاصل ہے۔ اکثر قدیم علامتیں ان کے جذبے میں تحلیل ہو کر مفاہیم اور جدید حسیت کی آئینہ دار بن جاتی ہیں۔''

ابتدا ہی سے مظفر حنفی، ذہنی اور مزاجی سطح پر شاد عارفی سے متاثر رہے تھے۔ شاد عارفی سے تلمذ حاصل کرنے کے بعد ان کے کلام میں طنز کی دھار مزید تیز ہوتی چلی گئی۔ حنفی کی ذہنی تازہ کاری اور ندرت تراشی نے جلد ہی اپنی شاعری کی ایک مخصوص پہچان بنائی اور طنزیہ مضامین میں مزید وسعتوں اور اضافوں کے ساتھ اپنی علیحدہ شناخت بنالی۔ حنفی کے طنزیہ لہجے کی الگ شناخت کے سلسلے میں ڈاکٹر وہاب اشرفی نے اس طرح تجزیہ کیا ہے۔ ناقدین کی عام رائے یہ رہی ہے کہ اُردو شاعری میں شاد عارفی کے یہاں جو طنزیہ عنصر کی شدت ہے بعض اوقات تلخی اور درشتگی پیدا کرتی ہے:

''اردو میں طنز و جراحت کی جو مثال شاد عارفی نے قائم کی تھی اور جس کے بارے میں خیال تھا کہ شاد عارفی اس اندازِ فکر کے شاعر آخر الزماں ہوں گے۔ اس کا ایک روشن زاویہ مظفر حنفی کی شاعری کی صورت میں ابھرا ہے۔ مظفر حنفی چوں کہ شاد عارفی کے رشادِ تلامذہ میں سے تھے اس لیے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کے فن میں فیضِ استاد کی کرنیں بھی موجود ہیں۔''

ظ۔ انصاری نے مظفر حنفی کے شعری مجموعہ 'طلسم حرف' کے تبصرے میں اپنے مخصوص انداز تحریر سے اس طرح مخاطبت کی ہے:

''شاد کی بازگشت سے نکل کر وہ یگانہ چنگیزی کے تیکھے لہجے، دل نواز ترنم اور اکھڑ غزل تک آیا، زندگی کے وسیع مشاہدے اور شدید تر سنگھرش نے اسے خاص ایسے زمانے کی کھردری حقیقتوں، روزمرہ کی ناہمواریوں اور بیان کی آڑی ترچھی لکیروں کو برتنا سکھایا۔ غزل تیار کرتے وقت اب وہ لفظوں کو کھرل اور ترکیبوں کو پکڑ چھان نہیں کرتا، دردرا پن رہنے دیتا ہے تاکہ ایک گھونٹ میں حلق سے نہ اتاریں، تھمیں، اٹکیں، چبا سکیں اور لطف لیں۔''

مظفر حنفی نے شاد عارفی کی جزوی شاعری کا تتبع بھی کیا اور اس کی توسیع بھی۔ شاد عارفی کی تیکھی اور نوکیلی غزل کے وہ مداح تھے اور ہیرو بھی۔ اس سلسلے پر انھیں فخر بھی ہے اور ناز بھی۔ لکھتے ہیں۔

ہے شاد عارفی سے مظفر کا سلسلہ　　اشعار سان چڑھ کے بہت تیز ہوگئے
پیروکار شاد، مظفر گنتی میں دو ایک سہی　　طنز غزل کے تار پہ چل کر دکھلاتے ہیں مثلاً میں

شاد عارفی نے ناقدانِ فن کو نشانہ بناتے ہوئے کہا تھا۔

غالب کے شعر نام سے میرے سنا کے دیکھ　　پھر اعتراضِ ناقدِ فن آزما کے دیکھ

ہر چند کہ اب غزل یا نظم میں درشت لہجے کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی ہے اور ''درشت لہجہ تو اب حرفِ مسترد ٹھہرا'' مگر مظفر حنفی نے اپنی کھردری اور دردری درشت زمین میں یہ شعر کہہ کر غزل میں کھردرے پن کا جواز پیش کیا تھا۔

اس کھردری غزل کو نہ یوں منھ بنا کے دیکھ　　کس حال میں لکھی ہے مرے پاس آ کے دیکھ

پروفیسر قاضی عبید الرحمن ہاشمی نے مظفر حنفی کی شاعری میں طنز و تشنیع کے عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''مظفر حنفی کی شاعری کو جو چیز ایک نوع کی مخصوص انفرادیت سے آشنا کرتی ہے وہ طنز ہے، جس نے خوابناک فضاؤں میں بھی جا بجا تیکھے پن، کسیلے پن، کھردرے پن اور کٹیلے پن کی فصل اگائی ہے۔ یہ شاعری معاشرے کے مزاج کی نقل کے مطابق اصل نہیں ہے بلکہ خود اپنی ذات سے ایک مکمل اور البیلی کائنات ہے۔ جس کی اپنی دھوپ، چھاؤں، سبزی اور شادابی ہے۔ کائناتِ آب و گل کے متوازی ایک زیادہ مبنی بر حقیقت، زیادہ پرکشش اور بامعنی کائنات ہے۔''

حنفی نے طنزیہ غزل کے وسیلے سے سماجی مقصدیت اور عصرِ حاضر کی حسیت کو کھردرے لہجے میں پیش کر کے موضوعِ شعر کے امکانات کو وسعت دی اور خود کو یگانہ چنگیزی اور شاد عارفی جیسے عصر ساز شاعروں کی صف میں لا کھڑا کیا۔

دشت میں پہنچے تو ویرانی نہ راس آئی ہمیں　　گھر ملا تو اس کی دیواریں نہیں درد آشنا

جدید شاعری کے رجحان کی شناخت ۱۹۶۰ء میں ہوئی۔ اس سے پہلے یعنی ۱۹۵۵ء میں اس کے درخت کا بیج بویا جا چکا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں اس کا وجود ایک تناور درخت کی شکل میں منصۂ شہود پر آیا۔ تحریکیں اور رجحانات میں فکر و شعور اور نظریات کی رو آہستہ آہستہ اپنی جگہ بناتی رہتی ہے۔ کوئی تحریک یا رجحان اچانک ہی منظر عام پر نہیں آ جاتا بلکہ مروجہ رجحانات نئی بلندیوں کے لیے اپنی جگہ چھوڑتے جاتے ہیں۔ جدید شاعری کے سلسلے میں بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ نئی نسل پر ترقی پسند تحریک نے جو اثرات مرتب کیے ان میں بعض منفی نوعیت کے تھے۔ ان سے متنفر ہو کر نئی نسل نے اس تحریک سے گلوخلاصی حاصل کی۔ اسے نئی شاعری میں زیادہ توانائی اور اعتماد حاصل ہوا۔ یہی شاعری تجرباتی عبوری دور سے گزر کر اردو شاعری کا ایک نمایاں کردار بن گئی۔

مظفر حنفی کے بموجب ''میری شاعری کی ابتدا ۱۹۶۰ء سے پہلے ہو چکی تھی لیکن سنجیدگی کے ساتھ شعر گوئی میں نے ۱۹۶۰ء کے بعد ہی شروع کی ہے اور ابتدا ہی سے روش عام سے بچ کر کہنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔'' ۱۹۶۰ء کے بعد سے اردو ادب میں جدیدیت کے رجحان نے زور پکڑا۔ اس وقت تک بھوپال میں نئی شاعری کے صرف دو نام ایسے تھے جنھیں جدید لہجے کے شعرا کہا جا سکتا تھا جن میں مظفر حنفی کے علاوہ ایک اور نام فضل

تابش کا تھا۔ جدید تنقید نگاروں اور دانشوروں نے مظفر حنفی کو ایک مستند اور معتبر جدید شاعر کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ حنفی جدیدیت کی وضاحت اور اس سلسلے میں اپنے موقف کی صراحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''جدیدیت کوئی تحریک نہیں، مختلف ادبی رویوں کے اجتماع کا نام ہے، نیا شاعر ہونے کے لیے ضروری نہیں کہ ترقی پسندی سے بیزاری کا اعلان کیا جائے لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ نئی شاعری کو ترقی پسند شاعری کی توسیع سمجھا جائے۔ جدید رجحان رکھنے والوں میں بیش تر شاعر ایسے نکلیں گے جو ترقی پسندانہ خیالات یا اینٹی کمیونسٹ نظریات رکھنے کے باوجود کامیاب نئے شاعر ہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ نئی شاعری مخصوص نظریات کی قائل نہیں، ہر نیا شاعر اپنی جگہ اپنے طور پر سوچنے کے لیے آزاد ہے۔''

ڈاکٹر محبوب راہی جنھوں نے مظفر حنفی کی شخصیت اور شاعری پر ڈاکٹریٹ کی تھی، اپنے مقالہ میں مظفر حنفی کی انفرادیت پسندی کے ضمن میں لکھا ہے کہ اکثر ناقدین ومبصرین جدید غزل کے منفرد ناموں میں مظفر حنفی کے ساتھ ظفر اقبال، محمد علوی، سلیم احمد، بانی وغیرہ کے نام بھی جوڑ لیتے ہیں۔ عصری حسیت اور جدید تقاضوں کی ترجمانی کی حد تک اس بات کو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ مظفر حنفی بھی مذکورہ بالا کامیاب جدید شاعروں میں سے ایک ہیں لیکن جہاں تک جدید غزل میں منفرد رنگ وآہنگ اور اچھوتے لب ولہجہ کا تعلق ہے، مظفر حنفی کے رنگِ سخن سے ہندو پاک کے کسی شاعر کا رنگ میل نہیں کھاتا اور وہ اپنے رنگ میں یکتا اور بے جوڑ ہیں۔ شاید اسی لیے حنفی نے کہا ہے۔

ٹھپہ لگا ہوا ہے مظفر کے نام کا
اس کا کوئی بھی شعر کہیں سے اٹھا کے دیکھ

اے مظفر ریشمیں غزلوں سے میں الجھا نہیں   ورنہ بن جاتیں وہ پیرِ تسمہ پا میرے لیے
نازک ہے فنِ شعر مگر طرزِ نو کے ساتھ   ہم اس حباب کو بھی سلامت اٹھائیں گے
بلا سے گردِ تغزّل مری غزل میں نہیں   جدید لہجہ گھٹن کو تو صاف کرتا ہے

بیشتر جدیدیوں نے روایت کو ایک مکروہ چیز یا فحش گالی سمجھتے ہوئے اسے دامن سے یکسر جھٹک دیا ہے۔ مظفر حنفی کے نزدیک جدیدیت کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ دیرینہ ادبی، تہذیبی اور ثقافتی روایات کی بنیادوں کو یکسر ڈھا دیا جائے بلکہ جو صالح اور لازوال انسانی، سماجی اور معاشرتی زندگی کا ناگزیر حصہ بن چکی ہیں، انھیں طرزِ نو کے ساتھ جدیدیت کے دھارے میں شامل رہنے دیا جائے اور باقی تمام فرسودہ اور گلی سڑی روایتوں کو ماضی کی قبر میں دفن کر دیا جائے۔ قدیم اور جدید روایات اور جدیدیت کی مروجہ بحثیں، مظفر حنفی کی نظر میں کم نظری کی دلیل ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا اپنا بیان ملاحظہ کریں:

''بہ ظاہر نیا فن کار قدیم ادب سے باغی نظر آتا ہے لیکن سچی بغاوت کے لیے لازم آتا ہے کہ جس روایت سے بغاوت کی جا رہی ہے اس کے حسن وقبح پر باغی کی گہری نظر ہو۔ چنانچہ وہی نئے لکھنے والے صحیح معنوں میں ادب تخلیق کر سکتے ہیں جو اپنے کلاسیکی سرمائے کا سچا شعور رکھتے ہیں۔''

مظفر حنفی کی شاعری میں واشگافی، تندہی، سرکشی اور تیکھا پن حنفی کی برسہا برس کی مشقت ومزاولت کا نتیجہ ہے جس نے ان کی آواز واسلوب کو نمایاں حیثیت دی ہے۔ ڈاکٹر محبوب راہی نے مظفر حنفی پر برسوں تحقیقی کام کیا اور ان کی شخصیت، فن اور شاعری، لب ولہجہ وآہنگ کو سمجھنے میں مشاقی حاصل کی۔

مظفر حنفی کی جدید غزل کی نمایاں خصوصیات جو انھیں جدید ہم عصر شعرا کی بھیڑ بھاڑ میں سب سے منفرد کرتی ہیں وہ ان کا منفرد اور جداگانہ، بے خوف، بے باک اور واشگاف لہجہ، تلخ وتند، کٹیلا، تیکھا اور قطعی، مصلحت ناشناس لہجہ، معروضی، روکھا اور غیر روایتی لہجہ، آرائشی حالات اور تغزل سے عاری لہجہ، صاف سیدھا، دوٹوک، بے تکلف اور بے ساختہ لہجہ، کھردرا اور سرکش لہجہ، ایک ایسا لہجہ جس کی بازیافت کے لیے انھوں نے برسوں مسلسل کوشش کی ہے۔ مظفر حنفی کی شاعری میں احساس کی شدت، جذبات کی ہنگامہ خیزی نے رجز کی ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے کہ قاری کا لہو خود بہ خود جوش مارنے لگتا ہے۔ یہ لہجہ اردو کی جدید شاعری میں کمیاب ہے۔

دریائے خوں سے اٹھتے تھے سر بلبلے نہیں   پل کی جگہ تنا ہوا خنجر تھا سامنے
زلزلہ خون میں آیا تھا جو اندر کی طرف   میں نے شہ رگ ہی بڑھا دی ترے خنجر کی طرف
گردن کو جھکاتے ہی چلی پشت پہ تلوار   سر ہم نے اٹھایا تھا کہ ماتھے پہ لگا تیر
سر پہ تلوار لٹکنے کا مزہ کہتا ہے   اور کچھ دیر ابھی سر نہ اٹھایا جائے

رزم گاہوں کے ایسے خوں آشام منظر اردو شاعری میں انیسؔ ودبیرؔ کے مرثیوں میں ملتے ہیں کہ وہاں یہ چیزیں موضوع کے تقاضے کے تحت ہیں لیکن اردو شاعری اور بالخصوص جدید شاعری میں اس کی مثالیں ناپید ہیں۔ شدتِ اظہار اور سرفروشی کا یہ والہانہ پن حنفی کے لہجہ کی شناخت ہے۔ مزید کچھ اشعار۔

جھوم کر اٹھا بگولہ، برگ زرد اے برگِ زرد   لطف آتا ہے ہوا سے چھیڑ خانی میں بہت
بھونکتی ہوئی ہوا، ہونکتی ہوئی فضا   چونکتی ہوئی زمیں شہر بے چراغ میں
ایک مدت سے اسے حسرتِ ہنگامہ ہے   آج اے سیل بلا میرے مکاں تک چلنا

بلا کو گھر تک آنے کی دعوت دینا، بگولے دیکھ زرد پتوں سے چھیڑ خانی کرنا، بدن میں آندھی بھر دینا، شہر سے چراغ میں ہوا کے ہونکنے سے زمیں کا چونکنا، ایسی علامات وتراکیب کا استعمال مظفر حنفی کے مخصوص اور غضب ناک لہجے کا وصف ہے۔ ان کی غزل میں جو تیکھا پن اور کٹیلا انداز ہے وہ ان کا بنیادی اور انفرادی شناخت نامہ ہے۔

بھیڑ ہے اور اشتراک شدہ بیچ میں اک ہرن ہلاک شدہ
شکست کھا چکے ہیں ہم مگر عزیز فاتحو! ہمارے قد سے کم نہ ہو فرازِ دار دیکھنا

یلغار، چیخ، تیغ، گرم ہوا، شگاف، زلزلہ، آندھی، بگولہ، شہ رگ، لاش، تابوت، سرخ پرچم، ہنگامہ، سیلِ بلا، بھیڑیے، ہلاک شدہ ہرن، تیرکمان، تلوار، کسک، صدائے بازگشت، بال و پر، رگ و پے، شبِ خون، نیزے، اڑان، صحرا ایسے الفاظ لہو کو گرم اور احساس کو مشتعل و متحرک رکھتے ہیں۔ یہ الفاظ حنفی کی شاعری میں علامیہ بن کر ان کے مخصوص لہجے کی بنیادی شناخت بن جاتے ہیں۔ مظفر حنفی کا یہ کھردرا، ٹیڑھا، ترچھا لہجہ ان کا دانستہ اختیار کردہ ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر انور صدیقی نے ایک تبصرے میں بہت ہی خاص بات کہی ہے:

''جب ہم دوسروں سے لڑتے ہیں تو خطابت جنم لیتی ہے اور جب خود اپنے آپ سے لڑتے ہیں تو شاعری...... مظفر حنفی کی لڑائی سے دونوں ہی صورتوں میں شاعری پیدا ہوتی ہے۔ اچھی، سچی اور معتبر۔ ہندوستان میں بانی کے بعد محمد علوی اور مظفر حنفی دو ایسے شاعر ہیں جنھیں ہم اعتماد کے ساتھ پاکستانی غزل کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں۔ علوی کے مقابلے میں لسانی اور فنی مہارت کے اعتبار سے مظفر حنفی زیادہ پختہ اور زیادہ قادر الکلام شاعر ہیں۔''

ہر مروجہ فیشن سے بغاوت کر کے اپنے ایجاد کردہ ٹیڑھے میڑھے راستوں پر چلنا اور ہر اعتبار سے اپنے آپ کو بھیڑ بھاڑ سے منفرد رکھنا ہی مظفر حنفی کا مقصدِ فن اور مطمحِ نظر ہے۔

جدیدیت کی آمد آمد کے دور میں نیا شاعر علامتی پیرایۂ اظہار کے وسیلے سے نئے امکانات کی جستجو میں نئے تجربے کر رہا تھا، مظفر حنفی نے بھی نئی فضا میں چند تجربات کیے لیکن وہ جلد ہی عام تقلیدی دائرے سے کٹ کر منفرد راہ اپنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس دور میں انھوں نے جو تجرباتی غزلیں کہیں ان سے چند اشعار پیش ہیں ؎

گرمی جو آ گئی تری یادوں کے خون میں پرچھائیوں نے پھوڑ لیے سر جنون میں
بجلی کے کھمبوں نے آنکھیں جھپکائیں جلدی جلدی ہاتھ ملائے یاروں نے
روئی پر ناریل چڑھا تھا یار سیب اندر سے پلپلا تھا یار

جدیدیت کے ابتدائی دور میں چند کم سواد و کم بساط شاعروں کی الول جلول قسم کی شاعری نے اس رجحان کو نقصان پہنچایا لیکن اس تجرباتی دور کے بعد جو شاعر آئے ان میں مظفر حنفی کا نام بہت اہم رہا۔

جدیدیت کے رجحان کے نتیجہ میں جو جدید شاعروں کا ایک بڑا ریلا سا آ گیا تھا، ان میں خس و خاشاک چلا آیا تھا جس نے جدید شاعری میں رطب و یابس کو شامل کر کے شاعری کی فضا کو مکدر کیا۔ لیکن اس شاعری کی خوش قسمتی تھی کہ اسے مظفر حنفی جیسے شاعر مل گئے۔ اس سلسلے میں پروفیسر ممتاز حسین لکھتے ہیں:

''ہر نئے شاعر کے ابتدائی دور کی شاعری اس کی تجرباتی شاعری ہوتی ہے لیکن ہر تجرباتی شاعر کا

نیا ہونا ضروری نہیں ہے، ٹھیک اسی طرح نت نئی اختراعی کاوشوں کی وجہ سے ہر بڑا شاعر تجرباتی شاعر ہو سکتا ہے، لیکن ہر تجرباتی شاعر کا بڑا ہونا ضروری نہیں ہے۔ نقال و بساط شاعروں کے اوٹ پٹانگ تجربات شاعری میں اپنی اہمیت تسلیم نہیں کرا سکتے۔ جو جدید حسیت Modern Sensibility رکھتا ہو، جس کے وژن میں وسعت ہو اور جو زندگی کے لامتناہی پہلوؤں پر کامیابی کے ساتھ اپنے فن کی گرفت مضبوط رکھ سکے وہی لائقِ اعتنا ٹھہرتا ہے۔''

تجربات کی کامیابی اور ناکامی سے قطع نظر مظفر حنفی کی فکر جدید حسیت کی حامل تھی، جس کی وجہ سے وہ اپنے تجرباتی اشعار میں بھی زندگی کے لامتناہی پہلوؤں پر گرفت رکھنے میں بڑی حد تک کامیاب رہے۔ جدید شاعری سے عام قاری کی شکایت یہ رہی ہے کہ اس پر اس شاعری کی آسانی سے ترسیل نہیں ہو پائی۔ دراصل عصری مسائل اور ذاتی تجربات کے اظہار کے لیے جدید شاعر جو علامتیں استعمال کرتا ہے وہ پیچیدہ اور الجھی زبان میں ہوتی ہیں اور ان میں کچھ کچھ ابہام بھی آ جاتا ہے، یہ نئی شاعری کی پہچان ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی نئی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نئی شاعری اسٹاک کی شاعری نہیں ہے۔ محاورے کی صف سے الگ رہنا چاہتی ہے۔ اس کے ابہام کا راز یہی ہے۔ اگر پرانے افکار نئی سج دھج سے پیش کیے جائیں تو ان کی سال خوردگی پر ملمع چڑھ جاتا ہے۔''

جدید شاعری کا یہ ادعا رہا ہے کہ وہ اپنے عصر کی تہ در تہ کیفیات اور مخصوص موضوعات کی پہلوداری اور ناگفتہ بہ تجربات کے اظہار کے لیے برہنہ پیرایۂ اظہار اختیار کرنے کا جوکھم نہیں لے سکتی، اس لیے اس کو اپنے موضوعات و تجربات کو برتنے کے لیے ابہام کی پرت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جدید شاعر کی اس ادعائیت و روش نے عام قاری ہی نہیں بعض تنقید نگاروں کو بھی بدگمانی کا شکار بنایا۔ ہر چند کہ مظفر حنفی شاعری میں ترسیل و ابلاغ کے زبردست حامی ہیں لیکن ان کے یہاں بھی جب اہمال سے مملو مندرجہ ذیل اشعار پڑھنے کو ملتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ابہام نے ایمائیت کی حدوں کو چھو لیا ہے ؎

انگلی پکڑ کے چاند مرے ساتھ ہو لیا مشرق میں جس کو ڈھونڈ رہا ہے سنپولیا
جب پار کی نگاہ نے فولاد کی سرنگ شرما کے میری آنکھ سے منظر سکڑ گئے
چشمہ اور دستانے لانا چکنی مچھلی ہرا سمندر
قصبے پہ چڑھ آیا سورج کھڑرک کھڑرک مٹی میں

یہ اشعار علامتی پیرایۂ اظہار میں شاعر نے اپنے ذاتی تجربات کے لیے کہے تھے لیکن جب تک شاعر کے فکری و ذہنی منظر و پس منظر کے در وا نہیں ہوتے ان کے مفہوم تک رسائی مشکل ہے۔ لیکن مظفر حنفی کے یہاں

ابہام وایہال کی ایسی شاعری نسبتاً بہت کم ہے۔ان کی شاعری کا جو خاص وصف ہے وہ ان کی پیکر تراشی اور تجسیم کاری ہے۔وہ لفظوں کے وسیلے سے تصورات کے پیکر بناتے چلے جاتے ہیں،اس سمعی، بصری، لمسی، متحرک اور مثالی پیکروں کا استعمال مظفر حنفی کی شاعری میں سطحی انداز میں نہیں بلکہ فن کارانہ انداز میں ملتا ہے۔مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار۔

سہج سہج اپلوں سے آنچ نکلتی ہے
ترل ترل بہتی ہے نالی، رات ہوئی

ستارۂ سحری کا جگر جگر کرنا
وہ چاندنی کا کتھک ناچنا درختوں پر

خوشبوئیں سر پیٹ رہی ہیں
کھڑکی کھولو، کھڑکی کھولو

گھنگھرو جیسی رم جھم رم جھم بوندنیاں
بادل جھینا جھینا، مولا پانی دے

سہج سہج اپلوں سے آنچ نکلنا، نالی کا ترل ترل بہنا، ستارۂ سحری کا جگر جگر کرنا، چاندنی کا کتھک ناچنا، خوشبوؤں کا سر پیٹنا، رم جھم رم جھم بوندوں کا گھنگھروؤں کی طرح بجنا۔ان تمام کیفیتوں میں سمعی پیکر، بصری پیکر، حرکی پیکر اور شامی پیکر شامل ہو کر شعری اظہار کو دوچند کرتے ہیں۔انھوں نے لفظیاتی تکرار سے اشعار میں جو نغماتی موسیقیت پیدا کی ہے،اس سے فن پر ان کی دسترس کا پتہ بھی چلتا ہے۔

چھتوں سے ستارے ٹپکنے لگے
ہری گھاس دیوار پر چڑھ گئی

پتوں نے اپنے کان کھڑے کر لیے ادھر
وحشی بگولہ ناچ رہا ہے پسِ غبار

تاروں کی موت گریۂ شبنم پہ ٹل گئی
سورج کے قتل پر تو برستا رہا لہو

ہاتھ میں زیتون کی ڈالی ہے سر پر فاختہ
اندر اندر خون کی تلوار چلتی جائے گی

آنتوں سے پیر پیٹ کے اندر لپیٹنا
پھر سائرن کی چیخ پہ بستر لپیٹنا

(اور پھر) برسات میں چھتوں سے پانی کی بوندوں کو ستارے قرار دینا، دیواروں پر ہری گھاس کا چڑھ جانا، وحشی بگولہ کا ناچ اور پتوں کے کان کھڑے ہو جانا، سورج کی موت پر آنکھوں سے لہو کا برسنا، ہاتھوں میں زیتون کی ڈال اور سر پر فاختہ ہونے کے باوجود خون کی تلوار کا چلنا، سائرن کی چیخ، آنتوں سے پیر پیٹ کر اندر لپیٹنا، جیسا علامتی منظر نامہ مظفر حنفی کی شاعری کو گنجلک نہیں بناتا بلکہ مفاہیم کی وسعتیں ہموار کرتا ہے اور جدید شاعری میں علامتوں کے استعمال میں سلیقہ مندی اور ترسیل و ابلاغ کی راہیں متعین کرتا ہے۔

جدید شاعری میں قدروں کی شکست و ریخت، تشکیک، مہاجرت، ذات کا اظہار، فرد کی گم گشتگی، لاسمتیت وغیرہ اہم موضوعات رہے ہیں۔مظفر حنفی کے یہاں یہ موضوعات ان کے اپنے منفرد اسلوب میں ملتے ہیں۔

سرحدوں پر سر پٹکتی ہے مری لاسمتیت
وسعتِ ارض و سما مشکل مری آسان کر

پھر مکڑیاں سی رینگ رہی ہیں دماغ میں
ذہنوں سے آگہی کا اجالا نہ جائے گا

وہی میں دائرہ در دائرہ ہر سمت پھیلا ہوں
طلسمِ ذات بھی اک نقش ہے آئینہ بندی کا

مجھ کو ہونے کا یہ احساس نہ جینے دے گا
سوئی کی نوک پہ ہر سمت گھماتا ہے مجھے

کھلا کہ اپنی ہی قید میں ہوں
مرا بدن خود حصار نکلا

مظفر حنفی کی شاعری میں وہ سبھی عناصر موجود ہیں جن سے جدید حسیت تشکیل پاتی ہے۔ان کی شاعری میں موجودہ ماحول کی زمینی سچائیوں، زندگی کی تلخیوں، ناہمواریوں کے علاوہ عالمی مسائل و موضوعات اپنی مکمل حسیت، شعور، آگہی اور معنویت کے تمام در و بست کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ان کی شاعری میں ذات و کائنات کے تقاضے، اپنے مشینی عہد کے پیچیدہ مسائل، سماجی معنویت کے موضوعات شاعری سے ان کے سچے تعلق اور دروں بینی سے وابستگی کی نشاندہی کرتے ہیں۔

مظفر حنفی کی شاعری میں جدید حسیت، سیاسی جبریت، سماجی ناانصافی، معاشرتی و معاشی اندوہگی، طنز و تمسخر کی چیخ بن جاتی ہے۔

یہ اضطراب، یہ پارہ صفت شعور، یہ خوف
مری صدی ہے مری خود نوشت میں داخل

اک آدھ چھینٹ ہو تو نیا دور بے قصور
یہ آستین، خون سے تر کس طرح نہیں

تجھ پر اپنے گھر کی باتیں کیوں کر کھلتیں
جب دیکھا مریخ سے آگے دیکھا تو نے

آج ہر ایک ازم ہے ٹوٹے ہوئے طلسم سا
خوف زدہ معاشرہ، خوار ہے فرد ہر طرف

ماں کی چھاتی دودھ سے نم ہوگئی
دودھ کا ڈبہ نہیں دوکان میں

نظم کی طرح غزل میں بھی واقعات و معاملات کا وجود ہوتا ہے لیکن غزل میں واقعات پردے کے پیچھے یوں مستور ہوتے ہیں کہ ان کے نقوش سے چہرے مبہم ہو جاتے ہیں۔غزل کی زمین پر ایک پر اسرار دھند ہوتی ہے جسے وزیر آغا نے ایسی دھند سے تعبیر کیا ہے جو 'نیا گرا' یا دوسری آبشاروں پر ہمہ وقت بنتی رہتی ہے اور ایسے میں نظر کے خوردبین زاویے کی جگہ دوربین زاویہ لے لیتا ہے۔وزیر آغا نے مظفر حنفی کی غزل پر یوں اظہارِ خیال ہے:

''مظفر کی غزل نے محض ایک موضوع یا واقعات کے کسی ایک سلسلہ تک خود کو محدود نہیں رکھا۔ ان کے ہاں بیک وقت سوچ کے کئی سلسلے کارفرما نظر آتے ہیں۔مثال کے طور پر سیاسی اور معاشی جبر کا موضوع لیجیے جو جدید اردو غزل گو شاعر کے ہاں مقبول ہوا ہے، مگر عام طور پر اس نے یا تو نظریاتی سطح اختیار کر کے کسی ایک سیاسی، مذہبی یا معاشی نظریے کی ترویج واشاعت کے لیے کام کیے یا پھر آمرانہ عصبیت کے خلاف آواز بلند کی۔مظفر حنفی کے ہاں معاشرتی اور سیاسی جزر و مد کو اس کی عالم گیر اور دیر پا صورت کے حوالے سے موضوع بنایا گیا۔اس باب میں ان کے ہاں شاد عارفی کی حیثیت ایک منارۂ نور کی سی ہے۔''

ادھر بھی لاش تڑپتی ہے دفن ہونے کو
یہ سر بھی نیزۂ سفاک سے اتارا جائے

جال کے اندر لاکھوں چیخیں
پہلے تم اپنے پر تولو

ہمارے شہر میں انصاف کا یہ عالم ہے
کہ تیر کھا کے بھی کوئی رہائی دیتا نہیں

ہرچند کہ آئین میں تحریر نہیں ہے
آزادئ گفتار پہ تالے ہیں عزیزو!

سرخ آندھی نے بڑا شور مچایا کل رات
گھر بنائے ہیں پرندوں نے شجر میں کیسے؟

کچھ دیر تو نیزے پہ اچھالو نہ سروں کو
بستی میں ابھی رقصِ شرر ختم ہوا ہے

حنفی کے بے شمار اشعار میں فرد کی ذات، ذات کی گم گشتگی، غیر یقینیت، خوف زدگی، انسان کی بے بسی و لاچاری، سیاسی، سماجی، معاشرتی، معاشی موضوعات کی ترجمانی ملتی ہے۔ تقسیم اور فرقہ وارانہ فسادات کے موضوعات جدید شاعر کی شاعری کا مقدر رہے ہیں۔ بے شمار شاعروں نے ان موضوعات پر اظہارخیال کیا ہے۔ مظفر حنفی کی شعری حسیت میں ان مسائل پر جو احساس کی شدت ہے، اس سے ان کی بیدار مغزی کا پتہ چلتا ہے۔

اب جو بٹوارہ ہوا تو مورتی بھگوان کی
بانٹ لی جائے گی دو ٹکڑے برابر کاٹ کر

ہاں سینہ سپر ہم تھے اندھیروں کے مقابل
چلتی رہی خورشید کی تلوار ہمیں پر

زمیں ہے تنگ مظفر مرے زمانے کی
سبھی بلاؤں نے ہندوستان کو دیکھا

شعر پر عائد ہوئے جغرافیائی دائرے
کوئی پرچہ اس طرف آئے نہ پاکستان جائے

شیوجی تانڈو و ناچ گئے
وہ مسند سے ہلا نہیں

مظفر حنفی کی غزل متنوع موضوعات کی آماجگاہ رہی ہے۔ نئے شاعر کو تقسیم کا کرب، ہجرت کا کرب، محافظین کی جانبداری، کرفیو زدہ حالات، فسادات کا کرب ورثہ میں ملا تھا جس سے انسانی قدروں اور رشتوں میں نئے نئے مسائل، پیچیدگیاں اور تشکیک و بے یقینی کے حالات پیدا کر دیے۔ ان موضوعات کی ترجمانی مظفر حنفی کے اشعار میں جابجا ملتی ہے۔

ہم سائے کے اچھے نہیں آثار خبردار!
دیوار سے کہنے لگی دیوار خبردار!

ایک میرا دوست جس کا آخری دم تھا لہو
اور میں مجبور میرے پاس بھی کم تھا لہو

ہر سمت آگ، ہر سمت خاک
بستی میں اک سن سن چراغ

شہر میں اور سب خیریت ہے مگر
دن میں کرفیو رہا، سنسنی رات میں

رات اندھیری نگری میں کرفیو
خوف چیخا، کواڑ کھولو نا

مکینوں کی فریاد جعلی سہی
مگر زخم دیوار و در میں بھی ہیں

صدائے بازگشت بھی نہ آئی میری چیخ پر
بگل بجا تو ہر طرف جوان ہی جوان تھے

مظفر حنفی کے کلام میں سماجی اور معاشرتی شعور کی سطح بہت سے جدید شاعروں سے ممیز ہے۔ عام شاعر کے ہاں ہزیمت اور احتجاج کا جو احساس نظر آتا ہے وہ موثر قوت نہیں رکھتا۔ مظفر حنفی کا احتجاج، آلام و کرب کا احساس اعلیٰ قدروں سے وابستہ ہے۔

یہ خنجر بھونکنا، بس توڑنا، دفتر جلا دینا
مری جانب سے بھی لوبان چٹکی بھر جلا دینا

پھر بسیں ٹولیوں میں جلا دی گئیں
دلہنیں ڈولیوں میں جلا دی گئیں

جتنی شامیں تھیں مہندی کے اس پیڑ پر
اب کے سب ہولیوں میں جلا دی گئیں

نوجوانوں کے سر در پہ کاٹے گئے
لڑکیاں کھولیوں میں جلا دی گئیں

برسرِ پیکار تھے ہم مشعل و خنجر سمیت
جل بجھے بستی کے سارے گھر ہمارے گھر سمیت

ریڈیو پہ سن کے خبریں اک فسادی شہر کی
گھر لرزتا ہے ہمارا صحن و بام و در سمیت

سوختہ شہر میں کیا قدر اکیلے گھر کی
آپ زحمت نہ کریں ہم ہی جلا لیتے ہیں

مظفر حنفی نے اپنے عہد کے کرب کو شعور کی گہرائیوں سے محسوس کیا اور اپنے مشاہدہ اور مطالعہ کی شدت سے ان تمام مناظر کو شعری پیکر عطا کر دیے جو عصری مسائل کی صورت میں ان کے شعور کی حسیت کو مہمیز کرتے رہے۔ مظفر حنفی جدید حسیت کے ایک منفرد اور معتبر شاعر تھے۔ ان کا فنی رکھ رکھاؤ، قادر الکلامی، ندرت، جدید اسلوب، مخصوص جدید لہجہ اور آفاقی شعور انھیں جدید شاعروں میں امتیازی حیثیت عطا کرتا ہے۔ اس مرحلہ پر ان کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

عظمت سے ہٹ کے ندرت و جدت کو ناپیے
ہم اور چیز، غالب و میر و فراق اور

''دانا اور ناداں، دونوں پر ہنسنے کا حوصلہ، سبھی کچھ ہے۔ نہیں ہے تو وہ شے جسے شعر کی مزاج داں، ربودگی یا گم شدگی کہتے ہیں۔ نہ تو خود والہانہ کیفیت میں ڈوبتا ہے، نہ ہمیں ڈوبنے دیتا ہے۔ اسے اپنی 'ترچھی پرواز' پر ناز ہے اور ہمیں اس کے یہاں یہی صفت خوب جچتی ہے...... تصور کیجیے، میدانِ جنگ میں رات کا سناٹا ہے۔ پتّا کھڑکے تو گولی پڑے، اتنے میں سامنے چند گز کے فاصلے سے کوئی بانکا جوان خندق سے کھڑے قد اٹھتا اور بنکر Bunker کے اوپر 'لائٹر' جلاتا

ٹہل ٹہل کر سگریٹ کے کش لینے لگتا ہے، گویا اپنی سرفروشانہ بے نیازی سے فریق مخالف کا منھ چڑا رہا ہے۔ اسے جلا رہا ہے، اب یا تو وہ ایک گولی کی خوراک بنے گا یا اپنے پرایوں سب کو بوکھلا دے گا۔ مظفر حنفی دونوں پر کمر بستہ ہے، اس پر دونوں حالتیں گزری ہیں۔''

خلیق انجم کے لفظوں میں ان کی شاعری روایت اور بغاوت کے درمیان کی چیز ہے، وہ ماضی کا احترام کرتے ہیں اور ہر اس روایت کو اپناتے ہیں جو قابلِ قدر ہے، لیکن ان تمام روایتوں سے بغاوت کرتے ہیں جو ادب کو جمود، فرسودگی اور کھوکھلے پن سے آلودہ کرتی ہیں۔ شاعر اپنے عہد کی سماجی اور معاشی کشمکش کا بھرپور شعور رکھتا ہے۔ وہ تاریخ کی ان جابر قوتوں سے بھی آشنا ہے جو انسان سے خوشیاں چھین لیتی ہیں۔ شاعر کے پاس وہ بصیرت، حسیت اور قوتِ اظہار ہے جو اس کشمکش کی مکمل عکاسی کرتی ہے۔ خود حاصل کیے ہوئے تجربات کی عکاسی نے اس کی شاعری کے رنگ و روپ کو نکھارا ہے اور ایک ایسی تازگی دی ہے جو زبان و بیان کی قیود سے بلند ہے۔

OOO

نوٹ:

'فیضان ادب' کے قلم کاروں سے مودبانہ گزارش ہے کہ اپنی نگارشات بھیجتے وقت اردو اور انگریزی میں اپنا مکمل پتہ اور موبائل نمبر ضرور درج کریں۔ مکمل پتہ اور موبائل نمبر کی عدم دستیابی کی وجہ سے قلم کاروں کو بھیجی گئی کاپیاں ادارے کو واپس کردی جاتی ہیں جس کی وجہ سے ادارہ غیر ضروری مالی خسارے کا شکار ہوتا ہے۔ اس لیے براہ کرم نگارشات بھیجتے وقت اپنا مکمل پتہ اور موبائل نمبر ضرور لکھیں۔

خان حسنین عاقب
علامہ اقبال ٹیچرس کالونی، مومن پورہ، پوسد، مہاراشٹر، رابطہ: 9423541874

مظفر حنفی کی شاعری میں عصری حسیت

اردو شاعری کو تقسیم جدید کے لحاظ سے دو ادوار میں خانہ بند کیا جا سکتا ہے۔ 'اردو شاعری: آزادی سے پہلے' اور 'اردو شاعری: آزادی کے بعد'۔ معاصر اردو شاعری کا شمار آزادی سے بعد کے دور میں ہی ہوتا ہے۔ ملک کی آزادی کے بعد ایک مخصوص طبقے نے ہی پاکستان ہجرت کے حق میں فیصلہ کیا جب کہ اکثریت نے یہیں رہنے کے حق میں فیصلہ کیا۔ ملک کے مسلمانوں نے ان لوگوں کے فیصلے کی بہت بڑی قیمت چکائی اور اب بھی چکاتے آرہے ہیں جنہوں نے بھارت کی سرحدوں کو پار کیا تھا۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ Colonialism سے آزادی اور برطانوی نوآبادی کا ٹیگ ہٹا کر ایک خودمختار ملک بننے تک کے سفر میں ہمارا ملک جن مسائل سے نبرد آزما رہا، اس کی ابتلا کی نوعیت Monotonous یا یک موضوعی نہیں تھی۔ بھانت بھانت کے مسائل تھے جن میں فرقہ وارانہ نوعیت کے بھی تھے اور سیاسی بھی؛ معاشی بھی تھے اور سماجی بھی......ایک نیا ملک وجود میں آیا تھا جس کا ڈھانچہ تو وہی پرانا تھا لیکن اس کا پورا نظام بدلا ہوا تھا...... جب کہ بہت کچھ بدلنا باقی تھا اور ملک تبدیلی کے مرحلوں سے گزر رہا تھا۔ مادی اور طبعی تبدیلیاں تو بہر حال رونما ہو ہی جاتی ہیں لیکن ذہنی اور فکری تبدیلیاں بہت جلدی نہیں آتیں۔ فکری تبدیلیوں کے لیے ایک زمانہ لگ جاتا ہے، اور پھر یوں بھی کسی ملک کو ترقی یوں ہی نصیب نہیں ہوتی۔ ملک کے شہریوں کو بہت سی قربانیاں دینی ہوتی ہیں۔ آزادی کی تحریک میں ملکِ عزیز کے لیے قربانیاں دینے میں مسلمان پیش پیش تھے اور انھوں نے یہ فریضہ آزادی کے بعد بھی نبھایا۔ پاکستان ہجرت کر جانے والوں کے فیصلے کا بھگتان بھارت کے مسلمانوں نے کیا اور اب بھی کر رہے ہیں۔ جہاں ایک طرف ملک کے مسلمان ناانصافی، تعصب، یک طرفہ فیصلوں اور سیاسی بے وزنی کے عمل سے گزار کر حاشیے پر ڈھکیلے جا رہے تھے، وہیں دلت اور پسماندہ طبقہ بھی اپنے مسائل سے گزر رہا تھا۔ حالاں کہ آئین نے انھیں تحفظات عطا کر دیے تھے لیکن سماجی مسائل ان کے بھی اپنے تھے۔ آزادی کے بعد انہی مسائل سے جھوجھنے والی نسل میں نئے شعرا اور ادیبوں کو عروج حاصل ہوا۔ ایک نئی نسل وجود میں آئی جس کی تخلیقات میں عصری مسائل کی نمائندگی

نظر آتی ہے۔ کچھ شعرا کی تخلیقات کی لے مدھم تھی تو کچھ کی لے تیز۔ جن شعرا کی شاعری کی لے تیز تھی ان میں مظفر حنفی کا نام نمایاں طور پر لیا جاسکتا ہے۔

مظفر حنفی نے اس زمانے میں اپنی غزل کو گودوں کھلایا جب ترقی پسندی کافور کی طرح ہوا میں معدوم ہوتی جارہی تھی اور اردو غزل پر جدیدیت کا آنچل سایہ کیے ہوئے تھا۔ اس Transitional Period سے جو قلم کار یعنی ادیب و شعرا گزر رہے تھے، ان میں حنفی صاحب تو تھے ہی، اس میں کوئی دورائے نہیں۔ میں اس بات سے بحث نہیں کروں گا کہ حنفی صاحب کے ساتھ اور کون کون سے غزل گو شعرا اور ادیب ان کے ساتھ اس سفر میں شریک تھے کیوں کہ وہ باتیں جنھیں سارے لوگ جانتے ہیں، تکرار کے زمرے میں آتی ہیں۔ ہم بات مظفر حنفی کی کررہے ہیں اور اس مضمون میں انھی کی بات کریں گے۔ دیکھتے ہیں کہ ہم عصروں کے ذکر کے بغیر بھی کیسے کسی شاعر کی غزل گوئی کی بات کی جاسکتی ہے، اور پھر اگر بات مظفر حنفی کی کریں تو ان کی ادبی زندگی تنوع اور رنگا رنگی سے بھرپور ہے۔ انھوں نے بچوں سے لے کر بڑوں تک، سب کے لیے تقریباً ہر صنفِ شعر میں طبع آزمائی کی لیکن فی الوقت ہمیں ان کی غزل گوئی سے سروکار ہے۔ مظفر حنفی کی غزل نئے دور کی غزل ہے۔ ان کی غزل ایسی غزل ہے جس کو بچپن ہی سے تنگی اور مسائل بھری زندگی سے واسطہ رہا ہو اور جس نے عیش و عشرت کا مزہ نہ چکھا ہو۔ حنفی کی غزل میں تلخئ ایام، شکایتِ زمانہ، مسائل کی نشاندہی، Social Issues کی آگاہی جیسے عوامل بہ کثرت ملتے ہیں۔ ان کے یہاں غزل کسی شاعر کی خود مرکزیت کا Vehicle نہیں ہے بلکہ وہ سماجی مسائل کا ایسا بکھان ہے جس میں نستعلیق گفتگو اور شائستہ انداز سے زیادہ کٹیلا لہجہ اور دھاردار الفاظ کا آمیزہ ملتا ہے۔ مظفر حنفی کی شاعری میں کرب و بلا، آزمائش اور ابتلا کے استعارے بہت واضح دکھائی دیتے ہیں۔

آج تک آزما رہی ہے مجھے — کربلا پھر بلا رہی ہے مجھے

کربلا کا یہ استعارہ اس بات کی علامت ہے کہ شاعر اپنے وقت، اپنے زمانے کے مسائل سے بخوبی آگاہ ہے، ان مسائل کا شعور رکھتا ہے اور اس نے اپنے اندرون میں اتر کر شدتِ احساس سے اپنی تخلیق کو گوندھا ہے۔ 'کربلا کا پھر بلانا' ابتلا اور آزمائش کے دور کا ایک وقفے کے بعد دوبارہ شروع ہوجانے کا استعارہ ہے۔ شاعر یہاں ایک نقیب کا کردار نبھا رہا ہے۔ اسی کربلا سے گزرنے کا منظرنامہ پیش کرتے ہوئے شاعر اپنے لفظوں سے ایک تصویر کھینچتا ہے۔

لائقِ دید وہ نظارہ تھا — لاکھ نیزے تھے، سر ہمارا تھا

ایک تخلیق کار کا ذہن محض اپنے ماحول اور اردگرد وقوع پذیر ہونے والے واقعات جیسے خارجی مسائل سے ہی متاثر نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی ذات، اپنے اندرون میں پیدا ہونے والی ہلچل اور ارتعاش کو بھی محسوس کرتا ہے۔ اردو شاعری میں رہبر اور رہزن جیسے دو متضاد عوامل ہمیشہ ہی استعمال ہوتے رہے ہیں، سو مظفر حنفی نے بھی

رہزن کو مورِدِ الزام ٹھہرایا۔ لیکن ان کے اس شعر میں موضوع کی فرسودگی کے باوجود ایک مختلف کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ رہزن کے جھنجھلانے کی حالت راہرو کی ہوشیاری اور خبرداری سے مشروط ہے۔

آنکھوں میں یہ رات کٹے تو ٹھیک مظفر حنفی جی — رہزن جھنجھلایا بیٹھا ہے اک منزل سر ہونے سے

لیکن اسی منظرنامے پر ایک Scene شاعر ایسا بھی پیش کرتا ہے جہاں وہ رہنما اور راہرو، ان دونوں عوامل کو ایک ہی ساتھ، ایک ہی فریم میں سامنے لاتا ہے۔

یہ سچ ہے کوئی رہنما ٹھیک نئیں — مرے بھائی تو بھی چلا ٹھیک نئیں

شاعر نے بڑی سادگی کے ساتھ ایک دوطرفہ صورتِ حال کی نشاندہی کردی ہے۔ یعنی محض رہنما کو رہزن کہہ کر ایک طرفہ بات کرنا تو اردو شاعری میں ایک معمول رہا ہے لیکن اس شعر میں مظفر حنفی نے چکی کے دونوں پاٹوں کے گھومتے اور ایک دوسرے کا تکملہ بننے کا اعتراف کیا ہے۔ انھوں نے محض رہنما ہی نہیں بلکہ راہرو کو بھی مورِدِ الزام ٹھہرایا ہے۔ گو کہ جی حضوری اور سرکاری درباری شاعری کا زمانہ گزر چکا ہے لیکن جمہوری سرکاروں میں بھی ادب دو خیموں میں بٹا ہوا نظر آتا ہے۔ مظفر حنفی کو اپنے ہم عصروں میں ہی ایسے کئی لوگ دکھائی دیے جن کے لیے انھوں نے شعر کہا۔

ادیبوں کو سچ بولنا چاہیے — سیاست کی آب و ہوا ٹھیک نئیں

ایک شعر دیکھیں۔

غوغا کھٹ پٹ چیخ دہاڑ — اف آوازوں کی جھنکاڑ

ہمارے آس پاس بے فیض اور غیر نافع سرگرمیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ بنا ہوا ہے جس کا نتیجہ سوائے وقت کے ضیاع اور توانائی کے زیاں کے کچھ نہیں نکلتا۔ شاید یہی وہ صورتِ حال ہے جس کے پیشِ نظر صدیوں پہلے عرفی نے مشورہ دیا تھا۔

عرفی! تو میندیش ز غوغائے رقیباں — آوازِ سگاں کم نکند رزقِ گدا را

مظفر حنفی نے زندگی کے سرد و گرم بہت طویل مدت تک دیکھے، انھوں نے زندگی کے مختلف رنگ ہی نہیں دیکھے بلکہ زندگی کو رنگ بدلتے بھی دیکھا۔ اسی لیے ان کی غزلوں میں لفظیاتی پیچیدگی نہیں ملتی بلکہ ان کے اشعار سیدھے سبھاؤ قاری تک بھی اور سامع تک بھی پہنچ جاتے ہیں۔ ان کے شعروں کا سیدھا سبھاؤ لہجہ کتنی آسانی سے اپنی بات پہنچا دیتا ہے۔ مثال سامنے کی ہے۔

پھر سورج سے ٹکرانا — دھرتی میں تو پنجے گاڑ

یہاں ان کا لہجہ ناصحانہ ہوگیا ہے۔ چھوٹی بحر کے دونوں مصرعوں میں دو بڑی باتیں کرنا ایک فن ہے اور مظفر حنفی اس فن میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے، اس میں شاید کسی کو کوئی شک نہیں ہوسکتا۔ ان کا مشورہ کتنا سیدھا سادا ہے کہ

بھائی! پہلے اپنی بنیادیں مضبوط کر۔ زمین میں پنجے گاڑ۔ سورج یعنی طاقتور سے ٹکرانا اس کے بعد کا مرحلہ ہے، اس لیے وہ بنیاد کے مضبوط کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ مجھے اپنا ہی ایک بیس برس پرانا شعر اسی موضوع پر یاد آ گیا۔

گرتی دیواریں دوبارہ بھی تو اٹھ سکتی ہیں — مصلحت یہ ہے کہ بنیاد سنبھالی جائے

خیر، مظفر حنفی کی شاعری ایسے ہی مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ شعر دیکھیے۔

ریت بھری ندیوں کو دیکھو بہنا بھول گئیں — نفرت کی آندھی نے دیکھو کتنے شہر اجاڑ دیئے

ریت بھری ندیوں کا استعارہ دراصل سوکھی ندی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ ندیوں سے ریت تب ہی باہر نکل آتی ہے جب پانی سوکھ جاتا ہے۔ یہ ریت نفرت کی ہے جس نے محبت کے پانی کو خشک کر دیا ہے۔نہیں، بلکہ یہ پانی تبخیر کے عمل سے بھی نہیں گزرا، براہِ راست معدوم ہو گیا ہے...... Evaporate پھر کبھی واپس نہ آنے کے لیے...... اس نفرت کی آندھی نے شہروں کو ایسے اجاڑ دیا ہے کہ ان کی باز آبادکاری ممکن نہیں رہی۔ حنفی صاحب نے اس شعر میں تو ندی اور پانی کا استعاراتی استعمال کیا ہے لیکن اگلے شعر کو دیکھیے جہاں انھوں نے قحط سالی اور سوکھے کی صورتِ حال پر اپنی تشویش کا اظہار کیا ہے۔

سوکھا بانجھ مہینہ مولا پانی دے — ساون پیٹے سینہ مولا پانی دے

سوکھا بانجھ...... یعنی بالکل ہی سوکھا، انتہائی خشک...... وہ کیفیت زمین پانی کے واحد قطرے کو ترس رہی ہو۔ ساون کا مہینہ سینہ پیٹ رہا ہے کہ اے مرے مولا، تجھ سے یہی دعا ہے کہ تو اب اپنے کرم کی لاج رکھ اور پانی برسا تا کہ خلقِ خدا اس خشکی کے عالم سے باہر نکل آئے۔ کسی بھی شاعر کا ادبی منصب محض شعر کہنے سے پورا نہیں ہو جاتا، بلکہ سماجی سروکاروں سے اس کی جذباتی وابستگی ہی اس کی فکری وسعت کی ضمانت ہوتی ہے۔ مظفر حنفی بھی سماجی سروکاروں سے پرے نہیں رہے۔ بلکہ انھوں نے سماجی سروکاروں کو جہاں اور جب مجروح دیکھا، اپنے عصائے شعر سے اس پر ضرب لگائی۔ ملک میں نفرت کا ماحول گرم ہونے کی حالت کو اس شعر میں کیسے بیان کرتے ہیں، ذرا ملاحظہ کریں۔

بستی بستی گھور اندھیرا یا انگارے برسیں — صحرا صحرا نام اجالے جیسی تیری مرضی

بستی بستی اندھیرا...... اندھیرا؟ اور پھر انگارے؟ یہ دونوں استعارے کس کے لیے استعمال ہوئے ہیں؟ یہ اندھیرا اور یہ انگارے، دونوں موجودہ ماحول میں پنپ چکی نفرت کا استعارہ ہیں۔ یہ شعر دیکھیں جس میں شاعر کی نازک خیالی اپنے جوہر دکھا رہی ہے۔

زخموں کی چھلنی میں ان کو چھان رہا ہوں — کرنیں اپنے ساتھ اندھیرے بھی لائی ہیں

زخموں کی چھلنی سے سورج کی کرنوں کو چھاننا ایک نیا استعارہ ہے۔ حنفی صاحب نے بڑی نزاکت سے ایک احساس کو الفاظ کی شکل میں باندھا ہے جس نے شعر کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ کرنوں کا اپنے ساتھ اندھیروں کو

لانا بھی ایک ایسی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے جس میں اجالے بھی یقین کی سرحدوں تک پہنچنے میں ناکام دکھائی دیتے ہیں۔ ایک جگہ شاعر کہتا ہے۔

لاکھوں کا حق مار چکے ہو، چین کہاں سے پاؤ گے — پیدل آگے سرکاؤ تو فرزیں کی بھی چال کھلے

یہ لاکھوں کا حق مارنا سیاست کا کام ہے۔ سیاست مختلف چالیں چلتی رہتی ہے۔ اگر ہم سیاست کی تجسیم کریں تو سیاست ایک چالاک سیار کی شکل میں سامنے آتی ہے جو اپنی فتح کے لیے ہر ہتھکنڈا، ہر چال جائز سمجھتی ہے۔ اس کے سامنے شطرنج کی بساط پھیلی ہوئی ہوتی ہے اور اس بساط پر مہرے آگے بھی بڑھائے جاتے ہیں اور مروائے بھی جاتے ہیں۔ لیکن اس صورتِ حال پر شاعر کچھ اور کہنا چاہتا ہے۔ اس شعر میں Divine Justice پر شاعر کا یقین اپنے جلوے دکھاتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ تم نے اگرچہ اپنی سیاسی قوت کے بل بوتے پر لاکھوں کے حقوق مارے ہیں لیکن تم حق تلفیوں کے باوجود چین اور سکون جیسی نعمت سے محروم ہو۔ اگر تم پیدل مہروں کو سرکاؤ گے تو فرزین کی بھی چال کھل جائے گی۔ اس کا اطلاق سیاست پر ہی نہیں بلکہ انفرادیت اور اجتماعیت کی کسی بھی سطح پر کیا جا سکتا ہے۔ گزشتہ برس ہم شاہین باغ کا حصہ رہ چکے ہیں اور اس سال ہم کسان آندولن یعنی کسانوں کے انقلاب کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ بہت پہلے مظفر حنفی نے اپنی بات کہی تھی۔

انقلابات کے شعلے بھی کہیں بجھتے ہیں — آپ نے آگ بجھانے کی قسم کھائی ہے

انقلاب کا مزاج ہوتا ہے کہ وہ وقتی اور عارضی طور پر تو مدھم ہو سکتا ہے لیکن طویل مدت کے لیے اسے خاموش نہیں بٹھایا جا سکتا تا آں کہ وہ متوقع تبدیلیوں کو پوری طرح متعارف نہ کروا دے۔ بادشاہت، حکومت اور سرکاریں انقلاب کی آگ بجھانے کی قسم کھائے ہوتی ہیں لیکن شاعر کا ایقان ہے کہ انقلابات کے شعلے بجھا نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے بطن میں جو کچھ بھی ہے اسے سماج میں انڈیل کر اور اس کے اثرات تاریخ میں رقم کر کے ہی مانتے ہیں۔ ہر فرد کسی نہ کسی سماج کا ہی ایک جزوِ لاینفک ہوتا ہے۔ ہمارے سماج میں کچھ...... بلکہ بہت سے کردار ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہمارے روزانہ مشاہدے کا حصہ ہوتے ہیں۔ شاعر بھی اسی مشاہدے کو الفاظ کا جسم دیتا ہے۔

بابو جی بھی پی لیتے ہیں — مل جاتی ہیں غیبی رقمیں

بابو جی کون ہیں؟ یہ 'بابو جی' مشہور کارٹونسٹ آر۔ کے۔ لکشمن کا 'عام آدمی' ہے لیکن عام آدمی میں اور اس بابو جی میں فرق یہ ہے کہ بابو جی 'غیبی رقموں' کے دامِ فریب میں آ جاتے ہیں اور پھر حسبِ عادت 'پی لیتے' ہیں۔ یہ ہمارے سماج کا المیہ بھی ہے اور سماج کے تانے بانوں کے بکھرنے کی ایک وجہ بھی۔ اب آیئے موجودہ شعری منظر نامے کی طرف جہاں شاعر، شاعری اور شاعر کو نہیں بلکہ خود کو 'شاعر' Pretend کرنے والے متشاعروں پر ہندی کا 'کٹا کش' کرتے ہیں۔

غزل دستے میں کیوں آواز کی پتی لگاتے ہو — خدا نے پاؤں دے رکھے ہیں، بیساکھی لگاتے ہو

غزل دستے میں آواز کی پتی لگانا لفظی اختراع تو ہے ہی لیکن وہ غزل جیسی نازک صنفِ سخن میں آواز کی پتی لگانے کو قبیح مانتے ہیں۔مظفر حنفی خود غزل کے بلکہ نئی غزل کے شاعر ہیں جنھوں نے موجودہ غزل کی لفظیات کو صیقل کرنے میں اپنا کردار بخوبی نبھایا ہے۔اس لیے وہ کمزور شاعری کو غزل کہنے اور پھر اس نحیف و نزار اور نازک اندام صنفِ شعر یعنی غزل کو آواز کا تڑکا لگانے کے سخت خلاف ہیں۔حنفی صاحب مانتے ہیں کہ غزل اگر خود اپنے اندر صلاحیت رکھتی ہو تو اسے آواز کی بیساکھی لگانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ہر شاعر پھر وہ چاہے کسی بھی زبان اور صنف کا ہو، اپنی ایک فکر رکھتا ہے۔مظفر حنفی کو اس اصول سے استثنیٰ حاصل نہیں تھا۔ان کی اپنی بھی فکری نہج تھی، ان کا اپنا بھی نظریاتی Stand تھا جس کی وکالت وہ بڑی شد و مد سے کرتے تھے۔خود شاعری کے بارے میں ان کے اپنے خیالات تھے۔ان کے خیالات تین نوعیتوں کے تھے:

۱۔خود اپنی شاعری کے بارے میں خیالات

۲۔موجودہ شعری رویوں اور دیگر شعرا کی شاعری کے بارے میں ان کے خیالات

۳۔نقادوں کے بارے میں خیالات

۱۔خود اپنی شاعری کے بارے میں مظفر حنفی کے خیالات:

مظفر حنفی کو دیگر منتخب شعرا کی طرح ہی فطرت کی جانب سے شعورِ خود آگہی حاصل تھا۔ان کی شاعری میں ہمیں ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں جہاں وہ اپنی شاعری کے بارے میں بلا تکلف اپنی رائے رکھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔میرا اپنا مطالعہ یہ ہے کہ مظفر حنفی نے اکثر و بیشتر اپنی غزلوں کے مقطعوں میں اپنی شاعری اور اپنے شاعر ہونے کی کیفیت کو بیان کیا ہے۔ان کا یہ شعر دیکھیں جس میں انھوں نے بڑی بے باکی اور جرأت کے ساتھ اپنے صاحبِ اسلوب شاعر ہونے کا اعلان بانگِ دہل کیا ہے۔

ٹھپہ لگا ہوا ہے مظفر کے نام کا   اس کا کوئی بھی شعر کہیں سے اٹھا کے دیکھ

ایسا نہیں کہ شاعر کو اپنی شاعری کے یکتا اور بے نظیر ہونے کا زعم ہو لیکن شاعر اپنی شاعری کے بارے میں پر یقین ہو، یہ بھی ضروری ہوتا ہے۔حنفی صاحب کے اس شعر میں ہمیں یہی واقعہ ملتا ہے۔وہ خود اس بات کی نفی کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

شہرت کے آسمان پہ اڑنے لگا تھا میں   رستے میں آگہی کا خلا مل گیا مجھے

یہ بات تو طے ہے کہ کسی بھی تخلیق کار کے لیے شہرت ایک دو دھاری تلوار کا کام کرتی ہے۔اگر اسے صحیح طریقے سے سنبھالا جائے تو ٹھیک ورنہ یہ تلوار خود شمشیر زن کو ہی نقصان پہنچا سکتی ہے۔شہرت کے آسمان پر اڑنے والے بہت جلد شہرت کے فریب میں گرفتار ہو کر اپنے فن کی ریاضت کو نظر انداز کرنا شروع کر دیتے ہیں۔البتہ جن لوگوں کو تخلیقِ فن کے راستے میں آگہی کا انعام نصیب ہو جائے، وہ بہت سنبھل سنبھل کر اپنا راستہ

طے کرتے ہیں۔حنفی صاحب کے بارے میں بلا خوفِ تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان کا محولہ بالا شعر ان کی زندگی کا عکاس ہے۔اپنی سخن گوئی کے بارے میں حنفی صاحب کی خود اعتمادی نہ ہی نامناسب تھی اور نہ ہی خودستائی یا یاوہ گوئی کا مظہر۔یہ ان کی برس ہا برس کی ریاضت تھی۔وہ خود کہتے ہیں۔

مظفرؔ ہم نہیں مانے، بہت یاروں نے سمجھایا   زمینِ شعر پر کیوں جان کی بازی لگاتے ہو

زمینِ شعر پر جان کی بازی لگانا یعنی مسلسل ریاضت کرنا، متواتر فن کی صیقل گری کرنا اور یہ کام مظفر حنفی نے بخوبی کیا، اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔اپنی غزلوں کے منفرد ہونے کا یقین اور اس یقین کا اظہار غزل کے توسط سے ہی کرنا بھی حنفی صاحب کا ایک خاص اسلوب تھا۔ان کا یہ شعر دیکھیں۔

آج مظفر کی غزلوں پر   خوب نہائے لوگ عرق میں

بھائی، مظفر حنفی کی غزلیں پڑھ کر لوگ عرق میں کیوں نہائے؟ ایک سوال کھڑا کر دیا اس شعر نے جس کا جواب حنفی صاحب کی غزلوں کا پارکھ ہی دے سکتا ہے۔یا پھر خود آپ کوشش کیجیے۔ایک جگہ وہ اپنی غزلوں میں ندرت اور جدت کے بارے میں اس درجہ پر یقین نظر آتے ہیں کہ انھیں لگنے لگتا ہے کہ ان کے ہر شعر میں ندرت کا دفینہ موجود ہے۔حالاں کہ یہ بات شاعرانہ تعلّی کے زمرے میں داخل ہے۔

جب وقت نے چھانی ہیں مظفر کی بیاضیں   ہر شعر میں ندرت کا دفینہ نکل آیا

لیکن وہ فوراً سنبھل کر دوسروں کو مشورہ دینے کے بہانے خود کو سمجھاتے ہوئے ملتے ہیں۔

وہ شعر کہو میاں مظفرؔ   آئینہ شش جہات ہووے

یہ کسی شعر کی معجز نمائی سے متعلق کسی بھی شاعر کے لیے ایک نہایت اہم اور کارآمد نصیحت ہے۔کوئی بھی شاعر اگر اس پر عمل کرے گا تو اس کا ایک اچھا شاعر بننا طے ہے۔شاعری کے بارے میں ان کے نظریات کا ایک پہلو یہ بھی تھا۔

مٹی پر بوچھار مظفر شعروں کی   دانہ مول نگینہ مولا پانی دے

ایک اور شعر ہم دیکھ لیتے ہیں جس کے ذریعے حنفی صاحب اچھے شعر کی تعریف بیان کرتے ہیں۔

میرے تیکھے شعر کی قیمت دکھتی رگ پر کاری چوٹ   چکنی چپڑی غزلیں بے شک آپ خریدیں سونے سے

حنفی صاحب کو اس بات کا احساس تھا کہ ان کے اشعار سچے ہیں البتہ ان اشعار کا لہجہ تیکھا ہے۔اسی لیے انھوں نے اس شعر میں اپنے اس احساس کو اجاگر کر دیا ہے۔لیکن اس شعر کے دونوں مصرعوں میں دو مختلف کیفیات کا بیان ہے۔یہ محض دو مختلف کیفیات نہیں ہیں بلکہ موجودہ ادب کے منظر نامے پر موجود دو متضاد رویّوں کی عکاسی ہے۔پہلے مصرعے میں شاعر نے اپنی اور اپنے جیسے اچھے شعرا کی اچھی غزلوں کی تحسین کر کے یہ بتا دیا ہے کہ اچھے اشعار وہی ہوتے ہیں جو بھلے ہی تیکھے لہجے کے حامل ہوں لیکن دکھتی رگ پر کاری چوٹ لگاتے ہوں۔

۲۔موجودہ شعری رویوں اور دیگر شعرا کی شاعری کے بارے میں خیالات:

معاصر اردو غزل سے حنفی صاحب کو بہت شکایت تھی۔ یہ شکایت غالباً اس وقت کی ہے جب جدید اردو غزل نے دشتِ ادب میں قدم رکھ کر نئے نئے استعاروں، علامتوں اور تشبیہات کے ذریعے شاعری کم اور ابہام زیادہ تخلیق کیے۔ مظفر حنفی اس صورتِ حال پر خاموش نہ رہ سکے۔ انھوں نے برملا چوٹ کی۔

شاخوں پر ابہام کے پیکر لٹک رہے ہیں لفظوں کے جنگل میں معنی بھٹک رہے ہیں

یہ شاخیں کون سی ہیں؟ یقیناً یہ شاخیں جدید اردو غزل کی شاخیں تھیں جن سے ابہام کے پیکر لٹک رہے تھے۔ اردو غزل اس سے پہلے کبھی اس تجربے سے نہیں گزری تھی جہاں لفظوں کو معنوں سے جدا ہو کر ادھر اُدھر بھٹکنا پڑے۔ حنفی صاحب نے یہاں ایک بحث چھیڑنے کی کوشش کی ہے جو اگر چھڑ جائے تو بے معنی نہیں کہی جاسکتی۔ یہ بحث ہے حسنِ الفاظ بمقابل حسنِ معنی! ایک شعر میں وہ موجودہ شعری رویوں پر ضربِ کاری لگاتے ہوئے کہتے ہیں۔

سنا اے دوستو! تم نے کہ شاعر ہیں مظفر بھی بہ ظاہر آدمی کتنے بھلے معلوم ہوتے ہیں

یعنی حنفی صاحب کی نظر میں اگر شاعر اچھا آدمی ہے تو یہ اچنبھے کی بات ہے اور اس شعر میں انھوں نے اسی واقعہ پر حیرت واستعجاب کا اظہار کیا ہے۔ حالاں کہ انھوں نے اس شعر میں خود کو مخاطب کیا ہے لیکن یہ بھی ایک قسم کی شاعرانہ تعلّی ہے جہاں شاعر نام تو اپنا استعمال کرتا ہے لیکن اس کا ہدف فردِ دیگر ہوتا ہے۔ اسی فن کاری کا استعمال انھوں نے درجِ ذیل شعر میں بھی کیا ہے۔

فن ہے وہ سمندر کہ کنارا نہیں جس کا ڈوبا ہوں مظفرؔ تو مرا نام ابھر آیا

فکر سخن ایک ایسا سمندر ہے جس کے شناور موجودہ دور میں کم ہی رہ گئے ہیں۔ اکثریت تو بس کناروں پر بیٹھ کر گہرائی پر تبصرہ کرنے والی ہے۔ شاعر تو وہی ہے جو فن کے سمندر میں ایسی گہرائی تک جائے کہ اس کے ہاتھ شعروں کے موتی ہی آئیں اور پھر جب شناور پہنائیوں سے نکل کر وسعتوں کو ناپنے کا عزم کرلے تو پھر کنارے بے چارگی کا شکار ہو جائیں گے۔ اوپر کہیں میں نے اردو غزل میں جدت طرازی پر حنفی صاحب کی رائے کا ذکر کیا ہے، اسی خیال کی توسیع حنفی نے ایک اور جگہ کی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

ایسی جدت سے ہم کو کیا مل جائے گا پڑھنے والے ہر مصرعے پر اٹک رہے ہیں

وہ غزل میں ایسی جدت کے شاکی تھے جو غزل کی روح کو ضرب لگا رہی تھی۔ ایسی جدت بے فیض اور بے فائدہ ہوتی ہے جس سے حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ اگر غزل پڑھتے ہوئے پڑھنے والا ہر مصرعے پر اٹک رہا ہو تو پھر ایسے شعر اور ایسی غزل گوئی سے توبہ ہی بھلی! حنفی صاحب نے شادؔ عارفی پر تحقیقی کام کیا اور پھر شادؔ صاحب کی بازیافت کی۔ شادؔ عارفی کو جو امتدادِ زمانہ کا شکار تھے، حنفی جیسا شاگرد میسر آیا تو وہیں حنفی کو بھی شادؔ جیسا استاد میسر

آیا۔ بڑی کشادہ دلی کے ساتھ حنفی صاحب اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی شاعری پر شادؔ صاحب کے اثرات نہایت گہرے ہیں۔ وہ دوسرے استاد کُش شعرا کی طرح احسان ناشناس نہیں تھے، اسی لیے انھوں نے اعلیٰ ظرفی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

شادؔ صاحب کی طرح میں نے مظفر حنفی طنز پر سان چڑھانے کی قسم کھائی ہے

'شادؔ صاحب کی طرح' سے مراد کیا ہے؟ اس فقرے سے حنفی صاحب کی مراد یہی ہے کہ میری شاعری پر شادؔ صاحب کے اثرات ہیں اور میں طنز پر اسی طرح سان چڑھاتا ہوں جیسے شادؔ صاحب کے اشعار میں سان چڑھی ہوتی تھی۔ اور پھر قسم کھانے کی بات کرنا عزمِ مصمم کو ظاہر کرتا ہے۔ مظفر حنفی کو اپنے، اپنی شخصیت اور اپنی شاعری کے بارے میں ایسا یقین تھا جس میں غیر یقینی کی گنجائش بھی موجود تھی۔ شعر دیکھ کر خود فیصلہ کر لیجیے۔

آپ مظفر حنفی سے مل کر شاید مایوس نہ ہوں
دل کے صاف، بصیرت گہری، ذہن رسا، اعمال کھلے

حنفی صاحب سے مل کر 'شاید' مایوس نہ ہوں......شاید میں نے اوپر کچھ غیر موزوں بات کہہ دی ہے کیوں کہ اب مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے یہ 'شاید' تشکیک اور غیر یقینی کے اظہار کے لیے نہیں استعمال کیا گیا ہے بلکہ یہ 'شاید' عجز وانکسار کا اظہار ہے۔ شاعر کو خود اس بات کا ادراک ہو جانا کہ اس کا دل صاف ہے، بصیرت گہری ہے، ذہن رسا ہے اور اعمال میں پوشیدگی کی خواہش نہیں بلکہ سب کچھ کھلا کھلا ہے۔

۳۔نقادوں کے بارے میں خیالات:

دورانِ مطالعہ ہمیں مظفر حنفی کی غزل میں نقادوں کی تضحیک واستہزاء کے بھی درشن ہوتے ہیں۔

آخر تجھ کو مانیں گے نقادوں کو خوب لتاڑ

حنفی صاحب کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب نقادوں کا طوطی بولتا تھا۔ ہر تخلیق تنقید کی طرف مُنہ اٹھائے کھڑی نظر آتی تھی۔ ہر بڑا تخلیق کار اپنے نقاد کو یا تو ساتھ لیے گھومتا تھا یا پھر خود اس کے آگے پیچھے گھومتا تھا۔ حنفی نے اسی صورتِ حال کے پیشِ نظر برعکس رویے کا مشورہ دیا ہے کہ اگر نقادوں کو تخلیق کار لتاڑنے لگیں تو نقاد انھیں ماننے لگیں گے ورنہ وہ تخلیق کاروں کے استحصال سے باز نہیں آئیں گے۔

ہم اگر چند بنے بنائے، لگے لگائے، چھٹے چھٹائے اور گنے چُنے ادیبوں اور شاعروں کے گھسے گھسائے موضوعات پر لکھ لکھ تھک نہ گئے ہوں تو بات دوسری ہے ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے۔ حنفی اور ان جیسے کئی مستحق ادیب وشعرا ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو جاتے ہیں اور لکھنے والے صدیوں سے گِھسے جا رہے موضوعات پر ہی قلم گھسے جاتے ہیں۔

○○○

ڈاکٹر ذیشان حیدر
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس، رابطہ نمبر: 9336027795

مظفر حنفی کی شاعرانہ انفرادیت

شعر و شاعری ایک فطری، جذباتی اور احساساتی عمل ہے جس کے توسط سے شاعر کبھی مناظر فطرت، کیفیاتِ دل، مسائلِ اجتماعی، حق گوئی، وفاشعاری اور عشق حقیقی و مجازی جیسے مفاہیم کو قلم بند کرتا ہے اور کبھی فکاہیات، تضحیکات وطنزیات جیسے خیالات کو اپنا آلۂ کار قرار دیتا ہے تاکہ مخاطب کو موثر انداز میں اپنے قلبی جذبات و احساسات اور افکار و خیالات سے روشناس کرا سکے۔ شعر دریائے عقل کے اس موتی کو کہتے ہیں جسے شاعر اپنی افسوں گری اور جادوگری کے ذریعہ ایک خوب صورت لڑی میں پروتا ہے۔ عمدہ شعر کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دل سے نکلتا ہے اور قاری و سامع کے دلوں میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔ فارسی کے معروف شاعر ملک الشعرا بہار مشہدی نے اس مفہوم کی عکاسی بڑے دل کش انداز میں کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

شعر دانی چیست، مرواریدی از دریای عقل — شاعر آن افسون گری کاین طرفہ مروارید سفت
شعر آن باشد کہ خیزد از دل و جوشد ز لب — باز در دل ہا نشیند ہر کجا گوشی شنفت

شاعر مشرق علامہ اقبالؔ نے بھی اپنے ایک شعر میں کیا خوب کہا ہے کہ دل سے نکلا ہوا ہر کلام بال و پر سے عاری ہونے کے باوجود قوتِ پرواز رکھتا ہے اور قارئین و سامعین کو متاثر کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے — پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

شعر و شاعری کی اس فطری وفکری اور جذباتی وطنزیاتی کائنات میں بہت سے عظیم المرتبت اور نامور سخنور پیدا ہوئے جنھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی اور اس میں حتیٰ المقدور کامیابی بھی حاصل کی ہے۔ انھوں نے عمیق معانی اور وسیع مفاہیم کو ایجاز کی شکل میں روانی و سادگی کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے کہ اس بیان پر خیر الکلام ماقلّ و دلّ جیسی عربی مثل بجا طور پر صادق آتی ہے۔ بعض اشعار سہل ممتنع کی عمدہ مثال نظر آتے ہیں جن کی کماحقہ توضیح وتشریح ضخیم کتابوں سے بھی ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ مشہور مقولہ ہے کہ **المفهوم الشعر في بطن الشاعر**۔ بعض شعرا گوشۂ گمنامی میں رہ کر فنا کے گھاٹ اتر جاتے ہیں جب کہ صفحۂ شاعری پر

بہت سے ایسے خوش نصیب شعرا بھی موجود ہیں جو خداداد صلاحیت اور شاعرانہ انفرادیت کے باعث اپنی زندگی میں ہی کمالِ عروج اور شہرتِ دوام حاصل کر لیتے ہیں۔ انھیں خوش نصیب شاعروں میں مظفر حنفی کا نام نامی قابلِ ذکر ہے جنھوں نے اپنی حیات ہی میں اپنے شعری مجموعوں کے سبب شہرت و عروج کے حصول کے ساتھ متعدد تعلیمی اداروں سے بیش بہا جوائز اور گراں قدر انعامات حاصل کیے ہیں۔

مظفر حنفی نے اردو شاعری کے مختلف قالبوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل گوئی ان کا خاص میدان رہا ہے۔ ان کی شاعری میں طنز کا نشتر، سختیِ روزگار، شکوۂ ایام، حمایتِ مظلوم اور تلخیِ حیات کی حسین عکاسی نظر آتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہم ظالم و جابر بادشاہِ وقت کے ظلم و استبداد کے سامنے کبھی سرِ تسلیم خم نہیں کر سکتے خواہ حق گوئی کی راہ میں ہمیں جانِ شیریں کی قربانی ہی کیوں نہ پیش کرنا پڑے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

ہمیں بھی جان پیاری ہے مگر اتنی نہیں پیاری — یزیدِ وقت کی بیعت سے ہم انکار کرتے ہیں

شعر مذکور میں شاعر نے یزید سے ظلم و ستم اور تمام انواع و اقسام کی بدی و پلیدی کا استعارہ کیا ہے جب کہ مفہوم شعر کو مدنظر رکھ کر یہ بات واضح طور پر کہی جاسکتی ہے کہ امام حسین صدق و صفا کے پیکر تھے۔ ان کی ذاتِ مبارک ہر قسم کی خوبی اور استحسان کا استعارہ ہے۔ شاعر نے بھی خودداری و نیکوکاری کو اپنا خاصہ قرار دیا ہے اور ذکر کیا ہے کہ یزید وقت یعنی دورِ حاضر کے ظالم و جابر حکمراں سے بیعت کرنا ممکن نہیں ہے۔ چاہے اس انکار کے نتیجے میں جان کی بازی لگانا پڑے۔

مظفر حنفی کی نگاہ میں حق و صداقت کی سربلندی مسلم ہے۔ باطل کی کذب گوئی حق پرست کی حقانیت کے مدّمقابل نہیں ٹھہر سکتی۔ باطل کی ہزاروں نیرنگیاں اور فریب کاریاں صدق و صفا کی فداکاری اور جاں نثاری کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ وہ کہتے ہیں۔

مگر توڑ سچ کا کسی میں نہیں — ہزاروں وسیلے ہیں باطل کے پاس

تعلّی اور خودستائی تقریباً تمام عظیم شعرا کی امتیازی شان رہی ہے۔ مظفر حنفی کی بھی شاعرانہ انفرادیت تعلّی ہے۔ ان کو اپنی شاعری پر اس قدر اعتماد ہے کہ انھیں اپنے تمام اشعار فکرِ رسا سے مملو اور معانی و مفاہیم کے لحاظ سے مستند اور پُرمغز نظر آتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کے تمام شعری مجموعوں میں سے کسی بھی شعر پر نظر ڈالیں تو وہ مستند اور معتبر ہی دکھائی دے گا۔ تعلّی اور خودستائی سے متعلق ان کا یہ شعر قابل دید ہے۔

ٹھپہ لگا ہوا ہے مظفر کے نام کا — اس کا کوئی بھی شعر کہیں سے اٹھا کے دیکھ

تعلّی کے باب میں مظفر حنفی خود کو مخاطب کرتے ہوئے ذکر کرتے ہیں کہ تیری شاعرانہ انفرادیت یہ ہے کہ تیرے اشعار میں بلا کی آمد موجود ہے یعنی آورد کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے اور تیری غزلوں میں سمندر جیسی روانی پائی جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

تری غزل میں رواں دواں ہر طرف سمندر
بلا کی آمد ہے تیرے اشعار میں مظفرؔ

طنز وظرافت کی خلش اور لب خندی مظفر حنفی کی شاعری کا حسین شیوہ رہا ہے۔عہد ساز انسان خود کو زمانے کی موج کے حوالے نہیں کرتا بلکہ وقت کے دھارے کو اپنے لیے سازگار بنالیتا ہے یا خود کو اس دھارے سے علیحدہ کر لیتا ہے، خواہ اس کی بنا پر احباب اس سے کنارہ کش ہی کیوں نہ ہو جائیں۔وہ کہتے ہیں کہ ؎

کہ ہم نے دھارے میں بہنا نہیں گوارا کیا
اسی بنا پہ سب احباب نے کنارا کیا

سماجی زندگی میں نقصان کی حد تک مشینوں کا استعمال مظفر حنفی کی تضحیک کا باعث بن گیا ہے۔ان کا نظریہ ہے کہ عہد حاضر میں مشینوں کی کثرت اور خدا فراموشی زمانے کی ترقی نہیں بلکہ یہ ایک طرح کی فریب کاری ہے۔اجتماعی زندگی میں مشینیں ارتقائی منازل کے طے کرنے کا اہم وسیلہ تصور کی جاتی ہیں لیکن درحقیقت یہ ترقی نہیں بلکہ اخلاقی پستی ہے کیوں کہ یہ مشینیں سماج میں بلندی و پستی اور امیری و ناداری کا ذریعہ بنتی جا رہی ہیں۔دورِ حاضر میں مشینوں سے بڑی عقیدت ہوتی جارہی ہے جب کہ خودشناسی اور خداشناسی سے دوری بڑھتی جارہی ہے گویا یہ مشینی ترقی عہدِ رواں کے انسان کو زنادقہ کی طرف راغب کر رہی ہے۔یہ عجیب وغریب نام نہاد ترقی جو خالق حقیقی کو فراموش کرتی جارہی ہے دراصل انسان کو پستی میں تحت الثریٰ تک پہنچا رہی ہے۔درج ذیل شعر میں لفظِ فریب کی تکرار نے لفظی ومعنوی خوبیوں کے ذریعہ شعر کے حسن میں چار چاند لگا دیا ہے۔وہ کہتے ہیں ؎

یہ ارتقا ہے کہ تحت الثریٰ فریب فریب
مشین عہدِ رواں کی خدا فریب فریب

مظفر حنفی کی شاعرانہ انفرادیت واقعاتِ کربلا سے عقیدت اور وابستگی ہے۔وہ اس راہِ غم ناک میں جذبۂ ایثار، حمایتِ مظلوم، فداکاری، وفاشعاری، صداقت، حقانیت اور شرافت کے علم بردار نظر آتے ہیں۔انھوں نے اپنے بہت سے اشعار میں درسِ کربلا سے کسب فیض کیا ہے اور اس فکر کی عکاسی ان کی شعری تخلیقات میں جا بجا موجود ہے۔چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

کربلا پھر بلا رہی ہے مجھے
آج تک آزما رہی ہے مجھے

نیزہ نیزہ گھما رہی ہے مجھے
یہ سمندر سی تشنگی میری

خودشناسی مٹا رہی ہے مجھے
خنجرِ شمر تو وسیلہ ہے

مظفر حنفی نے شاد عارفی کے خرمنِ علم وفن سے کافی خوشہ چینی کی ہے اور شرفِ تلمذ حاصل کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ استاد کی طنزیہ شاعری کا یہ عنوان جزو لاینفک بن کر شاگرد کی سرشت میں پیوست ہو گیا ہے۔لیکن استاد کے طنزیہ اشعار کی خلش اور چبھن زیادہ تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے جب کہ شاگرد نے اس خلش کو وسعت دیتے ہوئے اس میں لطافت اور نرمی کا پہلو بھی شامل کرلیا ہے۔اس تعلق سے بعض معاصر محققین کے نظریات پیشِ خدمت ہیں۔شمس الرحمٰن فاروقی رقم طراز ہیں:

"مظفر حنفی نے انتہائی شگفتہ زمینوں میں رواں دواں شعر کہے ہیں۔معلوم ہوتا ہے نئے نئے ردیف وقافیہ کا ایک فوارہ ہے جو ابلتا جارہا ہے۔ان کی شاعرانہ چالاکی کہیں مات نہیں کھاتی۔طنزیہ شاعری، بے خوفی اور حاضر جوابی ان کے یہاں موجود ہے۔مختلف باتوں کو ایک ہی طرح اور ایک ہی بات کو کئی طرح کہنے کا ڈھنگ انھیں بخوبی آتا ہے۔"(۱)

پروفیسر سلیم اختر لکھتے ہیں:

"شاد عارفی کا تیز طنز بعض اوقات زہر میں بجھا ہوا تیر بن جاتا ہے، لیکن مظفر حنفی کا طنز اساسی طور پر ایک لطیف اشارہ ہی رہتا ہے۔"(۲)

پروفیسر گوپی چند نارنگ کا خیال ہے:

"انھوں نے شاد عارفی کے رنگ کو نہ صرف برتا ہے بلکہ اس کی توسیع کی ہے۔شاد عارفی کی واقعیت اور خارجیت مظفر حنفی کے یہاں داخلی لے میں بدل گئی ہے اور شخصی احساس، تجسس اور آشوب آگہی کی سان پر چڑھ کر تیز تر ہو گئی ہے۔"(۳)

وہاب اشرفی کا خیال ہے:

"مظفر حنفی کی طنز نگاری محض تقلیدی نہیں ہے۔شاد عارفی کے یہاں تو ایک قسم کا کھردرا پن، نکتہ چینی کا تیور اور لڑائی بھڑائی کی کیفیت ہے لیکن مظفر حنفی لب ولہجہ کی متانت انتہائی سنگین موقعوں پر بھی نہیں کھوتے۔اس لیے ان کے طنز پر غصہ نہیں آتا بلکہ سوچنے سمجھنے کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔"(۴)

غزل کا مقطع تخلص یعنی شعری نام کے ذکر کے ساتھ شاعر کی شخصیت کے بیان کا ذریعہ بھی ہوتا ہے۔اگر کوئی شاعر اپنے مقطعوں کے توسط سے بسا اوقات بیش بہا پیغامات اور گراں قدر جذبات کا احساس دلاتا ہے تو اس شاعر کے مقطعے لافانی اور قاری وسامع کے دلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔مظفر حنفی کے مقطعے اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کے کچھ مقطعے ملاحظہ ہوں ؎

مظفرؔ آپ کی ترچھی اڑانیں کام آئیں گی
سنا ہے فن کے دروازے پہ پہرے دار بیٹھے ہیں

مظفرؔ آج کے ناقد بھی جانب دار ہوتے ہیں
ہمارا نام ان کے ذہن میں آئے گا مشکل سے

مظفرؔ کے لیے یہ کلمہ ہائے خیر کیا کم ہیں
کہ بیشک سر بریدہ ہے مگر ہارا نہیں ہے وہ

ہم بھی یزیدیوں سے مظفرؔ بہت لڑے
ہاں اہتمامِ لشکر و پرچم نہیں کیا

اپنے اشعار کے لہجے سے مظفرؔ صاحب
بھیڑ میں دور سے پہچان لیے جاتے ہیں

عصرِ حاضر میں قوم وملت کے نام نہاد ٹھیکے داروں پر مظفر حنفی کے طنز کا نشتر اپنے شباب پر نظر آتا ہے کہ

وہ اپنے ذاتی مفاد کے لیے قوم وملت کے سرمایے کو قوم کے نام پر جمع کرتے ہیں مگر خود قوم کے غریب اور مسکین افراد اس کے فائدے سے محروم رہتے ہیں۔ اسی طرح وہ قوم کی رہبری کے حصول کے لیے سرگرمِ عمل رہتے ہیں لیکن ان کے حوصلے پست اور پاؤں لنگ نظر آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

قوم سے چندے وصولے ہیں بہت — اب ذرا خیرات بھی جاری کریں
آپ میں رہبری کے سبھی وصف ہیں — حوصلہ پست ہے، پاؤں میں لنگ ہے

مظفر حنفی کی شاعری روایت اور بغاوت کے مابین ایک چیز نظر آتی ہے۔ وہ روایت سے پوری طرح اجتناب بھی نہیں کرتے ہیں اور روایتی جمود سے گریز بھی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم مظفر حنفی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مظفرؔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری روایت اور بغاوت کے درمیان کی چیز ہے۔ وہ ماضی کا احترام کرتے ہیں اور ہر اس روایت کو اپناتے ہیں جو قابلِ قدر ہے، لیکن ان تمام روایتوں سے بغاوت کرتے ہیں جو ادب کو جمود، فرسودگی اور کھوکھلے پن سے آلودہ کرتی ہیں۔'' (۵)

عہد ساز فن کار موجودہ زمانے کے ساتھ آئندہ نسلوں کو بھی اپنے فن پارے سے متاثر کرتا ہے۔ اگر عام معاصر افراد اس کی قدردانی نہ کریں تب بھی وہ آئندہ زمانے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مرزا غالبؔ کو بھی اسی کا شکوہ تھا، اسی بنا پر انھوں نے خود سے متعلق کہا ہے کہ میں آئندہ نسل کا شاعر ہوں۔ دورِ حاضر میں ان کی مقبولیت نے ان کے اس قول کو سچ کر دکھایا ہے۔ مظفر حنفی شادؔ عارفی کی توصیف کے ضمن میں تحریر کرتے ہیں:

''اہم اور عہد ساز فن کاروں کے سلسلے میں ایسا ہوتا ہے کہ وہ اگلی نسلوں کو متاثر کرتے ہیں اور صدیوں تک موضوع بحث بنے رہتے ہیں۔ اپنی حیات میں عام لوگوں کو اُن کا ادبی قد بھی عام سا نظر آتا ہے لیکن دراصل وہ بھی اپنے عہد کے آئس برگ ہوتے ہیں جو بہ ظاہر نظر آنے والے ڈیل ڈول سے حقیقتاً کئی گنا زیادہ جسامت رکھتے ہیں بشرطیکہ دیکھنے والا زیرِ آب بھی دیکھ سکے۔'' (۶)

مظفر حنفی کی غزل گوئی میں جہاں لہجے کا تیکھا پن ہے وہیں اعتماد کی بحالی بھی موجود ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

خلوص نام کی اک ہولناک بیماری — کسی کسی کو تو زندہ ہی گاڑ دیتی ہے
ہمارے چاروں طرف تنگ ہو رہی تھی زمیں — ہمارا کام بنا آسماں گرانے سے

مظفر حنفی کی شاعری میں بعض مقامات پر طنز ومزاح کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ مثلاً درج ذیل شعر میں طنز بھی کر رہے ہیں کہ ہم کسی شخص کی بے جا تعریف نہیں کرتے، لہٰذا کوئی بھی اس کا خواہش مند نہ رہے اور اس میں ایک طرح کا مزاح بھی ہے کہ کوئی شخص ہمارے ذریعہ تعریف وتوصیف کا امیدوار نہ رہے کیوں کہ ''من ترا

حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو'' ہمارا شیوہ نہیں ہے۔

ہم سے اس قسم کی امید نہ رکھے دنیا — ہم کسی شخص کی تعریف تو کرتے ہی نہیں

ان کی رباعیاں بھی نہایت پُرمغز اور معنی خیز ہیں۔ بطور نمونہ ان کی ایک رباعی ذکر کرتا ہوں۔

بھڑکی ہوئی اک مشعلِ غم رکھتا ہوں — شبنم کی طرح دیدۂ نم رکھتا ہوں
دُکھتی ہوئی رگ اپنی چھپالے دنیا — مجبور ہوں کاغذ پہ قلم رکھتا ہوں

مظفر حنفی کی عشقیہ شاعری بھی قابلِ لحاظ ہے۔ اگرچہ ان کی طنزیہ شاعری ان کی عشقیہ شاعری پر غالب نظر آتی ہے، پھر بھی ان کی عشقیہ شاعری لائق ستائش ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

مظفر بھی چلے ہیں عشق کرنے — کہیں سے دل مہیا کرلیا ہے
کہاں کہاں سے کیا کسبِ نور مت پوچھو — کسی کی مانگ میں چھوٹی سی کہکشاں کے لیے

مظفر حنفی کی شاعرانہ عظمت وانفرادیت کو سراہتے ہوئے متعدد علمی اداروں نے ان کے شعری مجموعوں پر انھیں گراں قدر انعامات سے نوازا ہے۔ وہ اپنی شعری وادبی خدمات کی بدولت کائناتِ شعر وادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

○○○

منابع و مآخذ:

۱۔ ڈاکٹر مظفر حنفی: حیات، شخصیت اور کارنامے، ڈاکٹر محبوب راہی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۶۷، نقل از تبصرہ 'تیکھی غزلیں' شمس الرحمٰن فاروقی، مشمولہ: 'شب خون' الہ آباد، فروری ۱۹۷۰ء، ص ۷۵

۲۔ ڈاکٹر مظفر حنفی: حیات، شخصیت اور کارنامے، ڈاکٹر محبوب راہی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۶۵، نقل از تبصرہ 'تیکھی غزلیں' سلیم اختر، کتاب لکھنؤ، ص ۷۰

۳۔ ڈاکٹر مظفر حنفی: حیات، شخصیت اور کارنامے، ڈاکٹر محبوب راہی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۶۵، ۱۶۶، نقل از تبصرہ 'طلسم حرف' گوپی چند نارنگ، اوراق، لاہور، ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۰ء

۴۔ ڈاکٹر مظفر حنفی: حیات، شخصیت اور کارنامے، ڈاکٹر محبوب راہی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۶۴، ۱۶۵

۵۔ مظفر حنفی: ایک مطالعہ، فیروز مظفر، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۰۷

۶۔ شادؔ عارفی ایک مطالعہ، مرتب: پروفیسر مظفر حنفی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ۱۳

○○○

فیضان حیدر
پورہ معروف، کرتھی جعفر پور، ضلع مئو، رابطہ نمبر:7388886628

مظفر حنفی کے شعری امتیازات

پروفیسر مظفر حنفی ان چند کامیاب شعرا میں ہیں جن کا ادبی سفر کم و بیش ساٹھ سال کے طویل عرصے کو محیط ہے۔ وہ ایک قادرالکلام شاعر ہونے کے ساتھ ہی ایک دیدہ ور محقق و ناقد، ایک فن شناس مترجم اور کامیاب افسانہ نگار رہے ہیں۔ لیکن ان کو ہر دلعزیزی اور شہرت ان کی شاعری اور افسانہ نگاری نے بخشی۔ ان کے افسانوں کو جو چیز طلسمِ تاثیر عطا کرتی ہے وہ پلاٹ کا تانا بانا ہے، وہ اپنے افسانے کے واقعات کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ قاری کا اشتیاق افسانے کے اختتام تک برقرار رہتا ہے۔ شاید یہی ان کے افسانوں کی کامیابی کا راز ہے۔ دراصل ان کی شخصیت جلوۂ صد رنگ کا سرچشمہ ہے۔ یہاں دوسرے ادبی کارناموں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ان کی شاعری کے حوالے سے چند نکات پیش کیے جا رہے ہیں۔

عصر حاضر کے کامیاب شعرا کی فہرست میں مظفر حنفی وہ فردِ فرید نظر آتے ہیں جن کی شاعری کو کاملین فن نے نہ صرف سراہا ہے بلکہ بعض نے تو ان کی شاعری پر صالح تنقید بھی کی ہے۔ حتیٰ کہ بعض کاملین فن نے تو آپ کے اشعار کو اپنے لیے نمونۂ عمل قرار دیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شعر فہمی اور شعر گوئی کا ملکہ ان کو فطرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا تھا جس کو انھوں نے مسلسل مطالعہ اور مشق سے مزید جلا بخشی۔ چوں کہ وہ شعری لوازمات اور اس کے اسرار و رموز سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے اس لیے اپنی شاعری میں ان تمام حربوں سے براہ راست استفادہ کیا اور انھیں اپنی ذات کے عمق میں اتار کر بصورت شعر لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

ان کے اشعار کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نفسیات پر مکمل دسترس رکھتے ہیں۔ جذبات و احساسات کو الفاظ کے قالب میں پوری طرح اتار دینا ان کا قابلِ رشک کارنامہ ہے۔ وہ اپنی شاعری میں کبھی جذباتِ رنج و غم کا آئینہ اتارتے ہیں تو کبھی فرحت و انبساط کی خوشیاں لٹاتے ہیں۔ گویا وہ ایک پھول کے مضمون کو سو سو رنگ میں باندھتے ہیں۔ یہی ان کے اشعار میں جدت کا سبب بھی بنا ہے۔ بطور نمونہ چند

اشعار پیش کرتا ہوں۔

ذرا سی روشنی مانگی تھی رات کاٹنے کو   چراغ اتنے جلے گھر ہی پھونک ڈالا مرا
ہم ستارے بنا کے نادم ہیں   آپ نازاں ہیں آبگینوں پر
سفر کیسا کہ باہم بر سر پیکار ہیں سارے   ہمارے کارواں میں کارواں سالار ہیں سارے

عالم کون و فساد کا ہر نقش و نگیں فانی ہے۔ اس عالم کے ہر وجود کے ساتھ عدم کا دھڑکا لگا ہوا ہے۔ چمن زار کا موسمِ بہار میں خوشبوئیں بکھیرنا اور پھر خزاں کی چادر اوڑھ لینا، کلیوں کا کھلنا پھر مرجھا جانا اور سبزوں کا خاک سے اگنا پھر خاک میں مل جانا اس بات کا غماز ہے کہ ہر شے فنا ہو جانے والی ہے، بس ذاتِ باری تعالیٰ ہی حی و قدیم ہے۔ مظفر حنفی بھی فلسفۂ حیات و ممات میں اساطین ادب کے ہم خیال ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

کانٹوں میں رکھ کے پھول ہوا میں اڑا کے خاک   کرتا ہے سو طرح سے اشارے مجھے کوئی
روتی ہوئی اک بھیڑ مرے گرد کھڑی تھی   شاید یہ تماشا مرے ہنسنے کے لیے تھا

مظفر حنفی کا خیال ہے کہ حقیقی اور اصلی شاعری وہی ہے جو موضوعات و مقاصد کی قید و بند سے آزاد ہو۔ کیوں کہ جب تک جذبات و احساسات کے اظہار کی آزادی نہ ہو ان میں تہ داری، حسن اور تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ نیچرل شاعری کے علم بردار ہیں۔ البتہ اخلاقیات کے پابند ہیں، کسی کی دل آزاری ان کی فطرت کے برخلاف ہے۔ وہ اس بات کے مخالف ہیں کہ شاعری کے ذریعہ لوگوں کی قوت شہوانیہ کو بھڑکایا جائے، صالح نفوس کو بدی کی طرف مائل کیا جائے اور ان کو ارتکاب معصیت پر آمادہ کیا جائے۔ بلکہ انسانیت کے بلند و بالا مراتب تک پہنچنے کے لیے ایک صالح فکر کا ہونا لازمی قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سامنے کئی تحریک و رجحان وجود میں آئے اور دم توڑا لیکن وہ کسی خاص رجحان اور تحریک کے پابند نہیں رہے۔ بلکہ ان کا تخیل تمام قید و بند سے آزاد رہا اور انھوں نے ہواؤں کے دوش پر اڑتے ہوئے نازک خیالات کو الفاظ اور تراکیب کی صورت میں بند کیا اور پھر فنی لوزمات کا پابند بنا کر شعری صورت میں ڈھال دیا۔

ان تمام مراحل میں ان کا لہجہ بڑا بے باک اور برجستہ ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار دیکھیے۔

جو ہونٹوں پہ مہر خموشی لگادی   تو مل کر نگاہوں نے تالی بجادی
جنوں اپنی تقدیر سے کھیلتا ہے   مٹائی بنادی، بنائی مٹادی
ابھی نور و ظلمت میں چلتی رہے گی   نہ وہ اس کے عادی نہ میں اس کا عادی
خبر کارواں کی نہ ہو رہزنوں کو   یہی سوچ کر میں نے مشعل بجھادی
گلوں نے جب الزام رکھا خزاں پر   تو وہ خار کو دیکھ کر مسکرادی
توقع نہیں تھی مظفرؔ سے ان کو   کھری بات سن کر قیامت اٹھادی

ان کی شاعری میں ہمارے آس پاس کی دنیا جیتی جاگتی، ہنستی مسکراتی اور اپنے سکھ چین اور دکھ درد کی داستان سناتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ ارضیت کے قائل ہیں۔ فوق فطرت اور ماورائیت کے لیے ان کی شاعری میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ ان کے گرد و پیش کے حالات، ظلم و استبداد، جبر و اختیار، زندگی کی کشاکش نے ان کی شاعری کو ایک نئی سمت و رفتار عطا کی۔ البتہ کہیں کہیں ان کا تخلیقی رچاؤ ان کی شاعری کو جدت کے خانے میں لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ لیکن ہم انھیں اس کا پابند قرار نہیں دے سکتے۔ اس کے باوجود ان کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جو جدیدیت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان اشعار کو دیکھیے اور خود فیصلہ کیجیے۔

بلا سے بجھے یا بڑھے تشنگی　　　سمندر کو آداب کرتے رہو
آ گیا میں کسی جگنو کی نظر میں کیسے　　　بوند بھر نرم اجالا مرے گھر میں کیسے
وسعتیں مجھ کو خلاؤں سے صدا دیتی ہیں　　　یہ نشیمن کی گرہ پڑ گئی پر میں کیسے
اے گلِ تر شگفتہ باد، میں تو چراغِ صبح ہوں　　　میری نجات کے لیے دامنِ باد کم نہیں

ان کے احساسات اتنے قوی ہیں کہ کبھی بھی انھوں نے اپنی قوت متخیّلہ کو ذہن و دماغ پر حاوی ہونے نہیں دیا، بلکہ پیچیدہ سے پیچیدہ مضمون کو بھی بڑی سادگی اور صفائی سے اس طرح پیش کر دیا ہے کہ انھیں سہل ممتنع کی مثال قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے اشعار میں نامانوس الفاظ، اجنبی تشبیہات و استعارات کا استعمال نہیں کرتے بلکہ کثیر المعانی خیالات، نادر تصورات اور دقیق مطالب کو اپنے ذاتی تجربات اور عینی مشاہدات کی چاشنی دے کر اس طرح برتتے ہیں کہ وہ مانوس محسوس ہونے لگتے ہیں۔ موضوعات کی انفرادیت، روزمرہ اور محاورات کا برمحل استعمال ان کی شاعری کو مزید باثر بنا دیتا ہے۔ ذرا یہ اشعار بھی دیکھیے۔

شکست کھا چکے ہیں ہم مگر عزیز فاتحو!　　　ہمارے قد سے کم نہ ہو فرازِ دار دیکھنا
آلامِ روزگار کا منھ زرد ہو گیا　　　ہر زخم کا علاج ترا درد ہو گیا
جاں بہ لب ویسے ہی تھے اور ہمیں مار چلا　　　دھوپ کے ساتھ کہاں سایۂ دیوار چلا
وجود غیب کا عرفان ٹوٹ جاتا ہے　　　صریرِ خامہ سے وجدان ٹوٹ جاتا ہے

مذکورہ اشعار کی قرأت سے اندازہ ہوگا کہ زبان و بیان میں سادگی کے ساتھ کتنی پرکاری اور شگفتگی ہے۔ کبھی کبھی الفاظ و تراکیب کے انتخاب و ترتیب پر دل سے داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ سادگی، صفائی، روانی، روزمرہ و محاورات کا برجستہ استعمال ان کی شاعری کے حسن کو دوبالا کر دیتا ہے۔ چوں کہ ان کے کلام کی اساس جذبے سے زیادہ تجربے اور جذباتیت سے زیادہ عقلیت پر ہے اس لیے وہ تجربات کو الفاظ و تراکیب کے ذریعہ ایک ایسا کیف بخش دیتے ہیں جو قارئین کو اپنے محسوسات میں در آنے کو ترجیح دیتا ہے۔

انھوں نے اپنے استاد شاؔد عارفی سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے مزاج کے مطابق انھوں نے اپنی شاعری کے لیے جو دنیا خلق کی اس کا تعلق ہماری روزمرہ کی زندگی سے ہے۔ انھوں نے شاؔد عارفی سے شاعری کے آداب ضرور سیکھے لیکن اپنے دامنِ شاعری کو ان کے رنگ سے محفوظ رکھا۔ ظاہر ہے اس کی معقول وجہ یہ ہے کہ اگر انسان کلی طور پر کسی کی شاعری کو اپنے لیے نمونۂ عمل اور سرمشق قرار دے تو اس کی اپنی انفرادیت کہیں نہ کہیں ضرور متاثر ہوگی۔ اس لیے انھوں نے ہر جگہ اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے۔

انسان فطرتاً متلون مزاج واقع ہوا ہے۔ اس کی طبیعت میں تنوع اور گونا گونی پائی جاتی ہے۔ چوں کہ وہ اپنے گرد و پیش کے واقعات سے متاثر ہوتا رہتا ہے اس لیے وقوعاتِ عالم وقت کے ساتھ ساتھ اس کے دل و دماغ کو بھی حیرت انگیز طور پر متاثر کرتے رہتے ہیں چنانچہ مرورِ ایام کے ساتھ افکار و نظریات میں بھی تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔ مظفر حنفی کی شاعری بھی اس کلیہ سے الگ نہیں ہے۔ انھوں نے بہت سی نئی تراکیب تراشی ہیں اور بہت سی روایتی تراکیب کو نئے مفاہیم و معانی عطا کیے ہیں۔ زبان کا تخلیقی استعمال ان کی شاعری میں جا بجا موجود ہے۔ میرے دعوے کی دلیل کے طور پر ان چند اشعار کی متن خوانی کیجیے۔

کہاں تو پائے سفر کو راہ حیات کم تھی　　　قدم بڑھایا تو سیر کو کائنات کم تھی
خیال صحرائے ذات میں اس مقام پر تھا　　　جہاں کہ گنجائشِ فرار و نجات کم تھی
وہ فرد بخشش کہ جس کی تکمیل کی ہے میں نے　　　نگاہ ڈالی تو اس میں اپنی ہی ذات کم تھی
بہاؤ پانی کی بوند پر خون کا سمندر　　　نہیں تو اک قطرۂ لہو سے فرات کم تھی

زبان کے تخلیقی استعمال کے ساتھ ایک اہم شے جس کا ان کی شاعری میں قدم قدم پر احساس ہوتا ہے وہ واقعات کربلا سے اثر پذیری اور علامات کربلا کا بیان ہے۔ ان کی شعری تخلیقات کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں زندگی کا ایک المیاتی تصور موجود ہے۔ یہ المیاتی تصور دورِ حاضر کے سانحات و حادثات کا نتیجہ ہے۔ چوں کہ انھوں نے اس ہندوستان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جب ایک طرف ہمارا ملک برطانوی سامراج سے آزاد ہو رہا تھا جو عوام پر ایک استحصالی اور نوآبادیاتی نظام مسلط کیے ہوئے تھا جس میں انسانی اقدار کی نہ صرف دھجیاں اڑائی جا رہی تھیں بلکہ حق بات کہنے کی بھی اجازت نہیں تھی، تو دوسری طرف ایک گھر آنگن کی تقسیم نے اندرون خانہ فرقہ وارانہ فسادات کو جنم دے دیا تھا۔ شہر کے شہر ویران اور خاکستر کیے جا رہے تھے۔ ہر طرف درندگی عام تھی۔ بچے بچیاں، بوڑھے جوان سبھی موت کی بھینٹ چڑھ رہے تھے۔ ریل گاڑیاں مسافروں کی جگہ لاشوں کا ڈھیر لیے شہر بہ شہر پھر رہی تھیں۔ اس پر بھی طرفہ یہ کہ یہ پورا کھیل سیاست اور مذہب کی آڑ میں کھیلا جا رہا تھا۔ یہ وحشت ناک اور شرم ناک کھیل ہماری تاریخ کا المیہ ہے۔ ان واقعات نے مظفر حنفی کے ذہن کو واقعاتِ کربلا کی جانب منتقل کر دیا کیوں کہ وہاں بھی اسی قسم کا کھیل مذہب کی آڑ میں کھیلا گیا تھا۔ جس گھر سے اسلامی شریعت پروان چڑھی اسی کے افراد کے سروں کو دردناک شہادت کے

بعد نوکِ نیزہ پر بلند کیا گیا۔ چوں کہ انھوں نے ایک تانا شاہ کی بیعت سے انکار کر دیا تھا اس لیے انھیں باغی قرار دیا گیا۔ وہاں حق کی بقا کے لیے بہتر نفوس نے قربانیاں پیش کی تھیں اور رہتی دنیا تک اقوامِ عالم کو یہ درس دے دیا کہ حق کے لیے سر کٹایا جا سکتا ہے لیکن جھکایا نہیں جا سکتا۔

اس سانحے سے نہ صرف مظفر حنفی بلکہ تاریخِ عالم کا ہر بشر متاثر ہوا ہے، لیکن مظفر حنفی کے یہاں اس کا احساس شدت کے ساتھ موجود ہے۔ البتہ اس بات کا خیال رہے کہ انھوں کے واقعات کربلا کو صرف رونے رلانے تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ وہ اس سے عبرت حاصل کرنے کے حق میں ہیں۔ چند اشعار دیکھیے۔

ہمیں بھی جان پیاری ہے مگر اتنی نہیں پیاری　　یزیدِ وقت کی بیعت سے ہم انکار کرتے ہیں
مظفر کے لیے یہ کلمہ ہائے خیر کیا کم ہیں　　کہ بے شک سر بریدہ ہے مگر ہارا نہیں ہے وہ
کوفہ و کربلا سے دور بغض و عناد کم نہیں　　قحطِ حسین ہے بہت ابنِ زیاد کم نہیں
خنجر ترا پیاسا ہے تو سچ بول رہا ہوں　　پھندا ترا خالی ہے تو اونچا ہے مرا سر
آپ نیزے بلند فرمالیں　　سر مظفرؔ کو خم نہیں کرنا

ہم سجدے میں جھک جاتے ہیں چاہے گردن پر خنجر ہو
اپنا سر اونچا رکھنے کو خود ہی نیزہ بن جاتے ہیں

ان کی شاعری میں زندگی کا جو المیاتی تصور ہے اسے ہم قنوطی اور وجودی فلسفے کا شاخسانہ قرار نہیں دے سکتے۔ بلکہ یہ تو ایک ایسی باشعور حقیقت نگاری ہے جس کی کڑیاں کہیں نہ کہیں ایک صالح سماج اور معاشرے کے وجود سے مل جاتی ہیں۔ اسی طرح ہم ان کے اس پہلو کو کسی مکتبۂ فکر سے وابستہ نہیں کر سکتے کیوں کہ ان کے یہاں جو حقیقت نگاری کا پہلو ہے وہ ایک جیتے جاگتے سماج اور معاشرے کا حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری تاریخی، سیاسی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے اپنے ہم عصروں میں امتیازی شناخت رکھتی ہے۔ اس سلسلے کی ایک چھوٹی بحر کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جن میں واقعات کربلا کے کئی کردار اور لفظیات بطور علامت استعمال ہوئے ہیں۔

تو یہ حرملہ نہیں کام کا　　کوئی تیر ہے مرے نام کا
نہ لعین ہوں نہ شہید ہوں　　نہ یزید کا نہ امام کا
مری لو بلند نہ ہو سکی　　مرے سر پہ بوجھ تھا شام کا
مرے بازوؤں میں گرہ نہ دے　　یہ خیال دانہ و دام کا
نہ بدن میں آگ نہ آنکھ تر　　یہ صلہ ہے جذبۂ خام کا

ان اشعار میں اگرچہ واقعات کربلا کا صریحی بیان نہیں ہے لیکن جو لفظیات اور ترکیبات استعمال کی گئی

ہیں ان کی آب یاری واقعات کربلا سے کی گئی ہے۔ خودداری اور عزت نفس مظفر حنفی کی شخصیت کا جزوِ لاینفک ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں ایسا لہجہ کم یاب ہے جو حد اعتدال سے گزر کر خود بینی و خود ستائی تک پہنچے، بلکہ ان کی طبیعت کا فطری میلان انکساری کی جانب تھا۔ واقعۂ کربلا نے جس طرح ان کے ذہن و فکر کو متاثر کیا ہے وہ کسی نہ کسی شکل میں ان کی شاعری میں جا بجا نمایاں ہے۔

موجۂ خوں تا کجا نیزہ اچھالا جائے گا　　وہ کب آئے گا جو سوئے کربلا لے جائے گا
پانی پناہ دے نہ ہوا راہ میں پڑے　　ایسے مقامِ کرب و بلا راہ میں پڑے
بڑھتے ہیں فتح یاب ہتھیلی پہ لے کے سر　　روتے رہیں گے آبلہ پا راہ میں پڑے

مظفر حنفی کے کلام کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو بین السطور میں کہیں دعائیہ اور کہیں زمانے کی شکایت میں اس عہد کی تہذیبی اور سیاسی ابتری کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کی غزلوں اور نظموں میں حسین، یزید، ابن زیاد، شمر، حرملہ، مشکیزہ، فرات، نوک سناں، نوک نیزہ، خنجر، قاتل، موجۂ خوں، آبلہ پا، تشنگی، زخمی، بریدہ، چاک اور شکست و فتح جیسے تلازمات اور استعارات جو استعمال ہوئے ہیں وہ سانحۂ کربلا سے ماخوذ ہیں اور اپنے اندر بھرپور معنویت رکھتے ہیں۔ دورِ حاضر میں سیاسی منظر نامے پر جس قدر ظلم و استبداد اور جبر و تشدد کا بول بالا ہوگا ان لفظیات کی معنویت میں مزید اضافہ ہوتا جائے گا۔ انھوں نے ان تلازمات اور استعارات کو اس خوبی اور سلیقے سے استعمال کیا ہے کہ وہ ان کی شاعری کو علاقائیت سے نکال کر آفاقیت کی حدود میں داخل کر دیتے ہیں۔ اس پس منظر میں ان اشعار کی بھی متن خوانی کیجیے۔

کچھ دیر تو نیزوں پہ اچھالو نہ سروں کو　　بستی میں ابھی رقصِ شرر ختم ہوا ہے
ادھر بھی لاش تڑپتی ہے دفن ہونے کو　　یہ سر بھی نیزۂ سفاک سے اتارا جائے
نہ جانے کب سے زمیں گھومتی ہے محور پر　　میں بن چکا ہوں مجھے چاک سے اتارا جائے
دھڑ ہمارا خواہشوں کی آگ میں ہے　　سر ہے نیزے پر شہیدِ کربلا سا
سر اونچا، آنکھیں روشن، لہجہ بے باک ہمارا　　تلوے زخمی، ہاتھ بریدہ، دامن چاک ہمارا

متذکرہ بالا اشعار کی قرأت سے اندازہ ہوتا ہے کہ کربلائی تشبیہات و استعارات میں ان کی مخصوص ہوش مندی ہر جگہ کارفرما رہتی ہے۔ اس ہوش مندی اور دانش ورانہ حاکمیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تشبیہات و استعارات ہیئت اور موضوع کی اس امتزاجی کیفیت کی منزل میں پہنچ گئے ہیں جہاں ایک دوسرے سے جدا کر کے ان کی افہام و تفہیم کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ورنہ ان کا روایتی استعمال تو انھیں ملبوس کی طرح برتتا ہے جنھیں شاعری سے الگ بھی کیا جا سکتا ہے۔ جن اشعار میں انھوں نے ان استعارات کا استعمال کیا ہے اگر ان کی شاعری سے ان کو الگ کر دیا جائے تو ان اشعار کا نہ صرف خون ہو جائے گا بلکہ

وہ تلف بھی ہو جائیں گے۔

مظفر حنفی کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کے جائزے کے بعد یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ وہ ایک اعلیٰ پایے کے فن کار اور بلند پایہ شاعر تھے۔ انھوں نے فن کی اہمیت کو بخوبی سمجھا اور انھیں فن کے اصولوں کا گہرا شعور حاصل تھا۔ انھوں نے اردو شاعری کو زندہ دلی، شگفتگی، رجائیت، ترنم ریز اور ترانہ بار فضا عطا کی اور اپنے رجائیت بھرے لہجے سے اسے خوش گوار اور خوش آہنگ بنایا۔ کسی طرح کی بے دلی، ہراسی اور مایوسی کا ان کے یہاں گزر نہیں۔ وہ زندگی کی اتھل پتھل اور حادثات سے گھبراتے نہیں اور نہ ان سے کنارہ کشی ان کا وطیرہ ہے بلکہ ناموافق اور ناسازگار حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں اور یہی ان کی کامیابی اور مقبولیت کا اصل راز ہے۔ زبان و بیان صاف ستھری اور عام فہم ہے۔ عربی و فارسی کے گاڑھے گاڑھے الفاظ کے استعمال کو زبان دانی نہیں سمجھتے البتہ بوقتِ ضرورت ان کا استعمال بھی کرتے ہیں لیکن اس خوش اسلوبی سے کہ وہ ہمارے روزمرہ کا حصہ محسوس ہوتے ہیں۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ مظفر حنفی کی شاعری ہمارے عہد کی زندہ شاعری ہے۔ نثری خدمات سے قطعِ نظر اگر وہ صرف شعر کہتے تو بھی اپنی شاعری کے بل بوتے پر اردو ادب میں زندۂ جاوید رہتے۔

○○○

سلیم انصاری
جبل پور

مظفر حنفی کی شاعری

مظفر حنفی کا تعلق شعرا کی اس نسل سے ہے، جس نے اردو شاعری کو عہد بہ عہد نہ صرف اپنا چہرہ بدلتے ہوئے دیکھا ہے بلکہ شاعری کی زبان اور اس کے روایتی اسٹرکچر میں ٹوٹ پھوٹ کی چشم دید گواہ بھی رہی ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مظفر حنفی نے شاعری کے کئی موسموں اور رنگوں کو شعوری اور غیر شعوری طور پر خود میں جیا بھی ہے اور شاعری کے تیزی سے بدلتے ہوئے خد و خال اور نظریاتی شعور و فکر کی آمیزش سے روشن ہوتے ہوئے منظر ناموں کا مشاہدہ بھی کیا ہے۔ مظفر حنفی کی شاعری میں برسوں نہیں بلکہ دہائیوں پر مشتمل سیاسی، سماجی اور ثقافتی تجربات، مشاہدات اور احساسات کی وراثت موجود ہے۔

مظفر حنفی کی شعر گوئی کا آغاز ۱۹۵۶ سے ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اردو شاعری ترقی پسندی کے اشتراکی نظریات اور منشور کے زیر اثر گل و بلبل اور زلف و رخسار کی فکری بندشوں سے رہائی حاصل کرنے کی تگ و دو میں مصروف تھی۔ مظفر حنفی اپنی تخلیقی زندگی کے آغاز میں شاعری کے علاوہ افسانے بھی لکھ رہے تھے، اور ان کی افسانہ نگاری محض منھ کا ذائقہ بدلنے کے لیے نہیں تھی بلکہ وہ افسانہ نگاری کے تخلیقی عمل میں بھی سنجیدہ تھے، اور اچھے اور قابلِ ذکر افسانہ نگاروں کی فہرست میں شمار کیے جاتے تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے تین افسانوی مجموعے ’دوغنڈے‘، ’اینٹ کا جواب‘ اور ’دیدۂ حیراں‘ شائع ہو کر اس وقت کے قابلِ قدر ناقدینِ ادب سے خراج وصول کر چکے تھے۔ مظفر حنفی کا تخلیقی اور ادبی سفر بیک وقت کئی جہتوں میں روشن تھا، وہ ایک کامیاب اور اپنی طرز اور اسلوب کے انوکھے اور منفرد شاعر تھے، اس کے علاوہ وہ افسانہ نگار، نقاد، مترجم، بچوں کے ادیب اور صحافی کے طور پر بھی اپنی مستحکم شناخت بنا چکے تھے۔ اس زمانے میں مظفر حنفی ادبی رسائل میں تنقیدی مضامین بھی تواتر سے لکھ رہے تھے، جس کے نتیجے میں ان کے مضامین پر مشتمل کئی کتابیں بھی منظر عام پر آئیں، یہی نہیں اپنے منفرد لہجے اور تیور کے سبب ان کی شاعری کی گونج بہت کم عرصہ میں ہی پوری دنیا میں سنائی دینے لگی تھی۔ ہندوستان اور پاکستان کے موقر رسائل مظفر حنفی کی غزلوں کو شائع کرنا باعث فخر سمجھتے تھے، ادب کے سنجیدہ

قارئین بھی مظفر حنفی کی نئی غزلوں کے منتظر رہتے۔

مظفر حنفی کی شاعری کو کئی دہائیوں سے پڑھتے ہوئے میری نسل کے بے شمار تخلیق کاروں نے فکری اور فنی روشنی اور رہنمائی حاصل کی ہے، مجھے یاد ہے کہ اپنے تخلیقی سفر کے آغاز میں تقریباً چار دہائی قبل علی گڑھ سے نکلنے والے رسالہ ’الفاظ‘ میں، میں نے مظفر حنفی کی کئی غزلیں ایک ساتھ پڑھی تھیں جن میں ان کے طنزیہ، تیکھے اور کھردرے لہجے نے بے ساختہ متاثر کیا تھا،ان غزلوں میں شامل دوشعراب تک میرے حافظے کا حصہ ہیں اوران غزلوں نے میری تخلیقی ذہن سازی اورادبی تربیت میں نہ صرف اہم رول ادا کیا ہے بلکہ شاعری کے ایک بالکل نئے ذائقے اوراسلوب سے بھی آشنا کیا ہے۔وہ شعر یوں ہیں۔

ہرسمت اڑاتے رہو بوچھار لہو کی
تا وقت کہ گردن سے نکل آئے نیا سر

میں قصبے کا بھولا پنچھی اندر باہر ایک
جس شہری نے ہاتھ ملایا، کاٹ لیا پر ایک

مظفر حنفی شاد عارفی کے بے حد عزیز اور اہم شاگردوں میں شمار کیے جاتے ہیں اور اپنے استاد سے ذہنی وابستگی ،قربت اور عقیدت کے زیرِ اثر انھوں نے شاد عارفی کی شخصیت اور فن پر تحقیق کر کے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے اور اپنا تحقیقی مقالہ ’شاد عارفی: شخصیت اور فن‘ کے عنوان سے شائع بھی کرایا ہے۔مظفر حنفی نے اپنے استاد سے فنی باریکیوں کے علاوہ اسلوب اور لہجے کی سطح پر بہت زیادہ کسب فیض کیا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر ناقدین ادب نے شاؔد عارفی کی غزل اور ان کے شاعرانہ لہجے کو سامنے رکھ کر ہی مظفر حنفی کی غزل کا محاسبہ اور تجزیہ کیا ہے، جو میرے نزدیک کسی طور مناسب نہیں، کیوں کہ مظفر حنفی کی شاعری میں سیاسی سسٹم اور معاشرتی وتہذیبی اقدار کی ناہمواریوں اور انتشار کے حوالے سے طنز تو موجود ہے مگر یہ طنز شاد عارفی کے یہاں موجود طنز کے مقابلے زیادہ تیکھا اور کھردرا، سنجیدہ، براہِ راست اور متاثر کرنے والا ہے جسے یقینی طور پر مظفر حنفی کا اختصاص، انفراد اور اجتہاد ہی کہا جائے گا۔ مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ مظفر حنفی کی تخلیقی فکر کا وژن اور کینوس بے حد وسیع ہے، لہٰذا ان کے طنز میں بھی گہرائی اور زندگی سے سروکار کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ان کے یہاں طنز کا عنصر ان کے شعری سفر کے ساتھ ارتقائی عمل سے گزرتا ہے۔

مظفر حنفی کی غزلوں میں فکر اور اظہار نیز اسلوب ہر سطح پر تنوع کا احساس ہوتا ہے،اس کے علاوہ ایک اور خصوصیت جوان کی شاعری میں نمایاں ہے وہ یہ کہ ان کے یہاں نئی نئی ردیفیں اور قوافی تراشنے کا عمل شدید ہے جوان کے ناقدین اور قارئین کے ذہن و دل پر خوش گوار اثرات مرتب کرتا ہے۔اپنی رائے کے ثبوت میں مظفر حنفی کے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

مظفر نے خطا کی ہے یقیناً ہاتھ پھیلا کر
مگر اس وقت جیبوں سے تمہارے ہاتھ باہر تھے

چاندنی تقسیم کی جائے گی دو دن صبر کر
اور اگر ان دو دنوں میں چاند آدھا رہ گیا

اس قدر خاکساری بھی اچھی نہیں
سر اٹھا ورنہ دستار گر جائے گی

طوفاں سے کیا باتیں کی ہیں پیارے مانجھی سچ بتلانا
دریا کو گروی رکھا ہے، یا ساحل کو بیچ دیا ہے

منزل سے کٹ کے دشت کو رستہ نکل گیا
لگتا ہے جیسے پاؤں کا کانٹا نکل گیا

کیا خبر اب کے بھنور سے ہاتھ نکلے یا نہیں
دیکھیے کیا گل کھلائے بادباں اس مرتبہ

گرداب سے نکال مجھے بادبان باد
وحشت میں ہوں سنبھال مجھے بادبان باد

تعصب سخت جاں ایسا کہ صدیوں تک نہیں مرتا
بھروسے کی عمارت لمحہ بھر میں بیٹھ جاتی ہے

قریۂ جاں میں بھر گئی ایک نگاہ آگ سی
وہ تو کہو کہ بال بال شہرِ خیال بچ گیا

نہ رک سکے گا یہ پانی ندی کو بہنے دو
کہ زندگی ہے روانی ندی کو بہنے دو

نہ پوچھیے کہ یہ لہجہ کہاں کا حصہ ہے
کھری زبان مرے جسم و جاں کا حصہ ہے

ہمیں لوح و قلم بخشے تو ہیں تقدیر نے لیکن
ہمارا آب و دانہ لکھ دیا ہے چور ہاتھوں میں

اس طرح کے بے شمار اشعار مظفر حنفی کی شاعری سے نقل کیے جاسکتے ہیں جوان کے مخصوص شعری اور فکری رویوں نیز منفرد اسلوب کے حامل ہیں۔میرے نزدیک مظفر حنفی ایک ایسے شاعر کا نام ہے جس نے ایک بے حد وسیع کینوس پر زندگی کے مختلف شیڈس کو مصور کر کے شاعری کو ایک نئے تخلیقی مدار میں داخل کر دیا ہے۔لگ بھگ چھ دہائیوں پر مشتمل ان کے شعری تجربات اور تخلیقی اظہارات کی روشنی میں کئی نسلوں نے اپنی ادبی شناخت حاصل کی ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ مظفر حنفی کے یہاں غزل میں نئی اور انوکھی زمینوں کے ساتھ نئے ردیف وقوافی کو بھی تراشنے کا عمل شدید ہے۔میرے اس خیال کی تائید میں محولہ بالا اشعار کے علاوہ درجنوں شعری مجموعوں پر مشتمل ان کے شعری سرمایہ سے بے شمار اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مظفر حنفی کی شاعری کو سمجھنے کے لیے کسی لغت کے سہارے کی ضرورت نہیں۔بے حد سادہ، سلیس اور قابلِ فہم زبان میں تلوار کی سی دھار رکھنے والے اشعار کہنے والے مظفر حنفی نے اپنی غزل کو روایتی اسلوب اور ڈکشن کی یکسانیت اور نظریاتی وابستگی سے بچائے رکھا ہے۔انھوں نے اپنے ناقدین کی منفی آرا کی بھی پروا نہیں کی، بلکہ اپنے فکری اور تخلیقی وجدان کی روشنی میں اپنا شعری سفر نہ صرف جاری رکھا بلکہ عصری غزل کا لہجہ اور رویہ بھی بدلنے میں کامیاب رہے۔ان کے نزدیک غزل کسی بھی ازم اور رویے کی روشنی میں تخلیق نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی اسے روایتی، ترقی پسند، جدیدیت اور مابعد جدیت جیسے خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔مظفر حنفی کا یہی تخلیقی شعور ان کی پوری شاعری میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ان کے یہاں کسی بھی طرح کی نظریاتی وابستگی کی تلاش بے سود ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی غزل کو اپنی فکر، اسلوب اور لہجے

کا کھلا اور وسیع آسمان فراہم کیا۔ ان کے اس تخلیقی کمٹمنٹ اور شعری رویے کی تلاش ان کے بعض اشعار میں بھی کی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کے دو شعر پیش کرتا ہوں۔

میرے قلم نے دھوپ کی قلمیں لگائی ہیں
اب تک تمہاری زلف کے سائے تھے شعر میں

ایطائے خفی میری غزل میں بھی نکالی
ظالم نے کمی تاج محل میں بھی نکالی

مظفر حنفی کے مطابق شعر کا تخلیقی عمل جگنو کو پکڑنے جیسا ہی مشکل کام ہے۔ مگر نقاد چوں کہ تخلیقی عمل کی نفسیات اور اس کے کرب سے نا آشنا ہوتا ہے، لہٰذا اس کے لیے کسی بھی شعر کو ایک جھٹکے میں رد کر دینا بہت آسان ہے۔ اپنے اس خیال کا اظہار مظفر حنفی نے اپنے ایک شعر میں بھی کیا ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے مظفر شعر کہنے میں
کہ جیسے ہاتھ آ کر کوئی جگنو سا نکل جائے

مظفر حنفی اب ہمارے درمیان نہیں، مگر ان کے ادبی کارنامے اور تخلیقی سرمایے کی روشنی نئی نسل کے قلم کاروں کے لیے قطب نما کا کام کرتی رہے گی۔ ان کی شاعری پر ہونے والے تحقیقی کام، ان کی شاعری کو نئی دشاؤں میں منعکس کرتے رہیں گے۔

OOO

ڈاکٹر جاوید ارشد
بچھرایوں

مظفر حنفی اور کربلا

دنیا کی تمام تر زبانیں ہمیشہ حق کی علمبردار رہی ہیں۔ حق و باطل اور نیکی و بدی کی لڑائی میں تمام زبانوں کا اہم کردار رہا ہے۔ یہ جنگیں ہر زمانہ میں ہوتی رہی ہیں اور شاعروں نے ہمیشہ ہی باطل کے مقابلے میں حق کی طرف داری کی ہے۔ جدید غزل میں بھی حق کی آواز کافی سنی جا سکتی ہے۔ ایسی شخصیتوں کی طرف متوجہ ہونا جو حق کے طرفدار ہیں جنھوں نے تلوار کے سائے میں سجدہ کیے ہیں۔ ایسی عظیم المرتبت شخصیات جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام، سقراط، ارجن، رام، حضرت امام حسین شہیدِ کربلا۔ ان میں سید الشہدا کی جرأت، استقلال، شجاعت، حق گوئی کو شعرائے متقدمین و متاخرین نے اپنی شاعری کی علامت بنایا ہے اور ایک صنفِ سخن مرثیہ کا یہی موضوع بھی ہے۔

کربلا اور واقعاتِ کربلا، حق و صداقت، ایثار و قربانی، جرأت و ہمت و استقلال کی علامت بن گئے ہیں۔ بہت سے شعرائے کرام نے اس موضوع کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ مولانا محمد علی جوہرؔ نے غزل میں اس موضوع پر یہ شعر کہا۔

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

غزل خصوصاً جدید غزل کو لہو سے تر کرنے کے فن سے مظفر حنفی واقف ہیں۔ نوکِ سناں پر سرفرازی کی جرأت مظفر حنفی صاحب کے یہاں ہے۔ کربلا باطن میں جلوہ گر ہو تو جرأت و ہمت و استقلال کی موجیں اشعار کی شکل میں رواں دواں ہوتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں موصوف کے سلام کا یہ مطلع اور اس کا طمطراق:

اونچا ہوا نشان سناں پر حسین کا
کٹنے کے بعد بھی نہ جھکا سر حسین کا

مظفرؔ صاحب نے غزل میں اگرچہ ایک موضوع تک خود کو محدود نہیں رکھا ہے، تاہم باطنی کرب، جبر و تشدد کے خلاف ایک احتجاجی شناخت کربلا کی علامت بن کر ان کے اشعار کو لہو رنگ کرتی ہے۔ سربلندی ان کا مزاج ہے، جرأت ان کی سرشت میں داخل ہے۔ اس دور میں بھی جہاں مصلحت اور خوشامد ضرورت بن گئی ہے،

وہ بہ بانگِ دہل اعلان فرماتے ہیں۔

آپ نیزے بلند فرمالیں — سر مظفرؔ کو خم نہیں کرنا

مظفرؔ حنفی نے اکثر کربلا کی علامتوں کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے اور کربلا کے کرب کو جدید غزل میں لہورنگ کیا ہے۔ نوک سناں اور بریدہ سر، سرفرازی کی علامت بن کر ان کے اشعار کے پیکر میں ڈھل جاتے ہیں۔ حالاں کہ مظفر صاحب نے کسی ایک موضوع یا واقعات کے کسی ایک سلسلہ تک خود کو محدود نہیں کیا، زندگی کے تمام رنگ ان کی شاعری میں ہیں۔ تلخ وشیریں احساسات، سیاسی ومعاشرتی مدوجزر، جبر کے خلاف ایک آواز۔

میں شاعر ہوں مِری پرچھائیں مستقبل پہ پڑتی ہے — مگر تاریخ کی ہر چوٹ میرے دل پہ پڑتی ہے

میرا موضوع 'مظفر حنفی اور کربلا' ہے۔ نوکِ سناں پہ سر رکھنا، گلے سے تیغ کا رشتہ استوار کرنا، سرفرازی کا دکھ یہ سب مظفر صاحب نے واقعاتِ کربلا سے سیکھا ہے۔ صحرائے کربلا کی تمازت، تشنگی، بریدہ سر، نوکِ سناں یہ وہ علامتیں ہیں جو مظفر صاحب نے اپنے باطن میں محسوس کی ہیں۔

مظفر حنفی نے اکثر کربلا کی علامتوں کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ اس موضوع پر ان کے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

کوفہ و کربلا سے دور بغض و عناد کم نہیں — قحطِ حسین ہے بہت ابن زیاد کم نہیں
نیزہ بردار و کماں دار مِرے گھر میں نہیں — وہ دلاور ہوں کہ تلوار مرے گھر میں نہیں
ہمیشہ دل نے کہا ہے ادائے سجدہ پر — اُٹھا یہ سر کہ فرازِ سناں کا حصہ ہے

ہم سجدے میں جھک جاتے ہیں چاہے گردن پر خنجر ہو
اپنا سر اونچا رکھنے کو خود ہی نیزہ بن جاتے ہیں

اٹھائے پھرتے ہو نیزے پہ تم یہ کس کا سر — دلیر وہ ہے جو شانے پہ سر نہیں رکھتا
میرے مذہب نے سکھایا ہے مظفر مجھ کو — جنگ کی مجھ سے شروعات نہیں ہونے کی
رجز عدو نے پڑھا زہر خند کرتے ہوئے — ہمارا نیزہ ہمیں پر بلند کرتے ہوئے
یہ بات دشمنوں سے نہیں دوستوں سے پوچھو — یک لخت ہم پہ بند ہوا آب و دانہ کیوں
مظفر کے لیے یہ کلمہ ہائے خیر کیا کم ہیں — کہ بے شک سر بریدہ ہے مگر ہارا نہیں ہے وہ
کبھی حسین بھی سرمد بھی اور اب ہم بھی — گلے سے تیغ کا رشتہ بہت پرانا ہے
سرافرازی کی یہ پہچان کتنی خوب صورت ہے — وہ پہلے سر کو نیزے پر گھما کر دیکھ لیتے ہیں
نعرہ زن ہاتھ میں تلوار عدو ہے کہ اخی — دیکھنا بر سرِ پیکار عدو ہے کہ اخی
ہمیں بھی جان پیاری ہے مگر اتنی نہیں پیاری — یزیدِ وقت کی بیعت سے ہم انکار کرتے ہیں

نوک سناں پہ سر رکھنا، گلے سے تیغ کا رشتہ استوار کرنا، سرفرازی کا دکھ سہنا یہ سب کچھ مظفر صاحب نے واقعاتِ کربلا سے سیکھا ہے۔ وہ آج بھی میدان کربلا میں ہیں۔ آج بھی اعلانِ حق جاری ہے چاہے مظفر حنفی کے اشعار ہی کیوں نہ ہوں۔ کربلا کی علامات' پردہ سخن کا' مجموعۂ کلام کا انتساب برطانیہ میں مقیم اپنے بیٹے پرویز مظفرؔ کے نام کے ساتھ کیا۔

دائیں ہاتھ میں نیزہ ہو تو بائیں شانے پر مشکیزہ
باہر کیسا ہی بنجر ہو، اندر سے مٹی نم رکھنا

جرأت، ہمت وایثار کے جذبہ کی تلقین کے لیے حضرت عباس علمبردار کی شہادت کی علامت 'مٹی نم رکھنا' کی تاکید۔

سردار کے ہر حال میں توقیر کے پہلو — سجدہ میں جھکا سر ہو کہ نیزہ پر چڑھا سر
خنجر ترا پیاسا ہے تو سچ بول رہا ہوں — پھندا ترا خالی ہو تو اونچا ہے مرا سر
اونچا ہوا سر نیزہ بہ نیزہ — یاروں کا احسان لبیک لبیک
یاد کرو کیا فرمایا تھا بابا نے گرنے سے پہلے — گھوڑے پر تکیہ مت کرنا ہمت کو تازہ دم رکھنا
سر اونچا، آنکھیں روشن، لہجہ بے باک ہمارا — تلوے زخمی، ہاتھ بریدہ، دامن چاک ہمارا
تمہیں کو سوچنا ہے نیزہ بازو! — مِرا سر ایک ہے بھالے بہت ہیں
بریدہ سر تماشا دیکھنا ہے — نِشانہ حرملہ کا دیکھنا ہے
خلوص اور شجاعت کا امتحاں ہے آج — ادھر سے دوست ادھر سے عدو بلاتا ہے
میں اس کو روکتا کیسے میں اس سے پوچھتا بھی کیا — کہ اس کی گود سے دو ننھے ننھے ہاتھ باہر تھے
ہمارے بال و پر باندھے ہوئے ہیں — شہادت پر کمر باندھے ہوئے ہیں
راستے میں ہو نہ جائے شام چلنا ہے تو آ — درمیاں ہے کوفۂ بدنام چلنا ہے تو آ
اجازت ہو تو میں بھی سر جھکا دوں روک لوں نیزہ — کبھی نرغے میں اپنی حیثیت ممتاز کرنے دے
روندا گیا بدن کہ غلط بیعتیں نہ کیں — نیزے پہ ہوں بلند کہ سر خم نہیں کیا
ہم بھی یزیدیوں سے مظفرؔ بہت لڑے — ہاں اہتمامِ لشکر و پرچم نہیں کیا

اس نوع کے ایک دو نہیں بلا مبالغہ سینکڑوں اشعار مظفر حنفی کی غزلوں میں موجود ہیں۔ ایک شعر اس موضوع پر اور سن لیں۔ لفظ 'پھر' میں طویل داستان سمیٹ کر علی اصغر کی میدانِ جنگ میں تشریف آوری کا بیان ہے۔

پھر اک چھے ماہ کا بے حال بچہ — شہادت کے لیے خیمے سے نکلا

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اردو شاعری میں سانحۂ کربلا کے استعاراتی استعمال پر پوری کتاب قلم بند

کی ہے، مجھے حیرت ہے کہ اتنے دیدہ ور نقاد کی نظر مظفر حنفی کے کلام پر کیوں نہیں گئی۔

نقادوں کا ذکر چھڑا تو ظ۔ انصاری یاد آ گئے جنھوں نے اپنی 'کتاب شناسی' میں مظفر صاحب کے دوسرے مجموعۂ کلام 'طلسمِ حرف' پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھا ہے:

''ہم 'طلسمِ حرف' کے طلسم میں گرفتار ہوتے ہوتے رہ گئے کیوں کہ اس میں اگر چہ طنز کے لوچ، لچک اور بیان کے پیچ و خم کی کمی نہیں البتہ 'اسرار' ہلکے ہیں۔ نہ تجربوں کی کمی ہے نہ تجزیوں کی، ہاں وہ جو کہرے کی دلرُبائی ہوتی ہے اور دور تک لرزتی ہوئی روشنیوں کی قطار، جھلملاتے دیوں کی سی بات، وہ جس سے طلسم پورا ہوتا ہے۔ وہ آخری ورق اُلٹنے سے پہلے کافور ہو گئی۔''

میں اسے تنقید کی سہل انگاری سے تعبیر کرتا ہوں۔ مظفر صاحب نے اتنا وقیع سرمایۂ شعر اردو ادب کو تفویض کیا ہے کہ اُسے پڑھنے کے لیے وقت درکار ہے اور ناقدین کو فیصلے کرنے کی عجلت ہوتی ہے، چنانچہ ایسے اشعار تلاش کرنے کی فرصت نہیں ملتی جن کی کمی کا شکوہ ظ۔ انصاری نے مندرجہ بالا اقتباس میں کیا ہے وگرنہ کلامِ مظفرؔ میں اُن کی کمی نہیں ہے۔ مشتے از خروارے سینکڑوں میں سے چند ابیات پیشِ خدمت ہیں۔

یہ کون جاتا ہے تاروں کی گرد راہ کے پار   خلا میں کس کے قدم کا نشان بیٹھ گیا

آخرش آئی داستاں جھیل میں خود کشی کے پاس   رات نے آنکھ موند لی چاند نے جب کہا کہ یوں

میں اپنی وحشتوں سے محظوظ ہو رہا ہوں   اپنے مزے میں دریا گرداب دیکھتا ہے

بجھتے ہوئے چراغ مظفرؔ بھڑک اُٹھے   جلتے ہوئے پروں سے پتنگا کہاں چلا

سر پر یہ گھٹا چھائی ہوئی ہے کہ تری یاد   سایہ سا کوئی راہ میں جاتا ہے کہ میں ہوں

خفیف رہتے ہیں اپنے ضمیر کے آگے   یہ تو نے کیسے ترازو پہ رکھ دیا ہے ہمیں

آبلوں سے چور سر پر آسماں   رات بھر چُنتا ہے کانٹے پاؤں کے

ٹوٹتی رہتی ہے سینے میں مسلسل کوئی شے   درد مصروف ہے راتوں کو سحر کرنے میں

اک ستارا سا کہیں ٹوٹ گیا پہلو میں   چاندنی رات نے چپکے سے کہا سنتے ہو!

مظفر حنفی کے چودہ شعری مجموعوں کو ذرا تھم تھم کر پڑھا جائے تو اُن کے ہاں بڑی تعداد میں ایسے اشعار مل جائیں گے جن میں ربودگی، فضا آفرینی اور کیفیت سازی کی افراط ہے۔

کچھ نقادوں کو مظفر صاحب کی غزلوں میں عاشقانہ مضامین اور حسن و محبت کے حامل شعروں کی قلت نظر آتی ہے۔ میں نے اس زاویے سے موصوف کے مجموعہ ہائے کلام کا جائزہ لیا تو ہر ورق پر اس طرح کے اشعار جھلملاتے، جگمگاتے دکھائی دیے۔

نکلی نہا کے آج وہ جب باتھ روم سے   ساری کا رنگ آب گہر کی طرح لگا

ایسا لگا سمٹ سی گئی ساری کائنات   اس نے کمر کے گرد جو ساری کو بل دیا

محبوب کے بدن کی نمی سے چسپاں ساری کو آبِ گہر سے مشابہت کرنا کمال فن ہے۔ کبھی حسرتؔ نے کہا تھا۔

اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ سر بسر   رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

مظفر صاحب کے دوسرے شعر میں ساری کے محبوب کی کمر سے لپٹنے کے ساتھ کائنات کے سمٹ جانے کا احساس ایک انوکھا تجربہ ہے اور دیکھیے۔

تیر چڑھائے کھول رہی تھی خون کی ہر اک بوند   رات ہوئی تو سارے شکوے ایک نظر میں صاف

یہ میرا مہرباں پردے سے نکلا   کہ اک لشکارا آئینے سے نکلا

اُگی ہے دُوب یہاں بھی ترے بدن جیسی   کھلے ہیں پھول یہاں بھی ترے لبوں کی طرح

آئنے کے سامنے انگڑائیاں مت لیجیے   آئنے کو چُور کر دے گا خمارِ آئنہ

اس نے اس انداز سے جھٹکا اپنے بالوں کو   میری آنکھوں میں در آیا پورا کجلی بن

کسی کو یاد کر کے موند لے آنکھ   کسی کو سوچ لے، سرشار ہو جا

دِیا بے نور ہے سورج کے آگے   ترے آگے غزل فرضی ہماری

مظفرؔ بھی چلے ہیں عشق کرنے   کہیں سے دل مہیّا کر لیا ہے

مجھ پہ اس عمر میں بھی خاص کرم ہے ان کا   ہو گئے کھا کے مظفرؔ کی قسم شرمندہ

یہ چمکتی ہوئی آنکھیں یہ لرزتے ہوئے لب   ہے کوئی بات مظفرؔ سے چھپاتا ہے جسے

اس کا بدن تو لمس کی فردوس بن گیا   اب میری اُنگلیوں کو ضرورت زباں کی ہے

کہاں کہاں سے کیا کسبِ نور مت پوچھو   کسی کی مانگ میں چھوٹی سی کہکشاں کے لیے

پھینکا گیا ہے پھول جہاں سے رقیب پر   ڈرتا ہوں میں وہ تیرا دریچہ نہ ہو کہیں

نظارہ کر رہا ہے اک نیم وا دریچہ   اک پھول پھول پر وہ قربان جا رہا ہے

تم نے میرے دیدہ و دل کی حالت پوچھی، صد احسان
آنکھوں میں موتی ہی موتی پھولوں کی ڈالی ہے دل

روز اس کے پاس جا کر بیٹھنا   روز کچھ دیوار جیسا درمیاں

اس نوع کے شعروں کی مظفر صاحب کے کلام میں کمی نہیں ہے اور یہ بھی محسوس کیا جا سکتا ہے کہ اُن کا عشق عام روایتی اور بازاری قسم کے عشق سے مختلف نوعیت رکھتا ہے جس کی تشریح و تفسیر میں پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

○○○

شمشیر علی
ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی، رابطہ:9005472836

مظفرؔ حنفی کا فن در بابِ 'یا اَخی'

اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو بیک وقت شاعر، ناقد، محقق، فکشن نگار، مدیر وغیرہ کی حیثیت سے جانے گئے، یعنی جسے ادب کا One Man Army کہہ سکتے ہیں۔لیکن معیار کی کسوٹی پر اس شخصیت کی ہمہ جہتی میں سے کسی ایک جہت کا بھی کھرا اُترنا شاید ممکن نہیں، اِس اعتبار سے ان کی تحریریں نہ ہماری توجہ کا مرکز بنتی ہیں اور نہ اُنھیں ادب میں کوئی اعتبار حاصل ہوتا ہے۔ پروفیسر مظفرؔ حنفی کی حیثیت اس لحاظ سے مستثنیٰ ہے کہ انھوں نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی اور انفرادیت قائم کی۔ وہ شاعر، ناقد، محقق، مترجم، افسانہ نگار، سفرنامہ نگار کی حیثیت سے علمی و ادبی حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ تاہم اِس اعتراف میں کوئی باک نہیں کہ شاعری بالخصوص غزل گوئی ہی ان کی شناخت کا وسیلہ بنی۔لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان کی ادبی شخصیت کی دوسری جہتیں غیر اہم یا کم معیاری ہیں بلکہ ان کے بعض کام اردو میں اضافے کا حکم رکھتے ہیں۔ شادؔ عارفی کی شخصیت اور فن کے افہام و تفہیم میں جس قدر انھوں نے محنت اور عرق ریزی سے کام لیا ہے وہ انہی کا خاصہ ہے۔اس ضمن میں خلیق انجم لکھتے ہیں:

> ''ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو مختلف اصنافِ ادب میں طبع آزمائی کرتے ہوں اور ایسے تو اور بھی کم ہوتے ہیں جنھیں مختلف اصنافِ ادب پر واقعی عبور حاصل ہو اور جس میدان میں بھی جائیں اپنی انفرادیت اور امتیاز برقرار رکھیں۔مظفر حنفی اُنھیں بہت کم لوگوں میں سے ایک ہیں۔''(۱)

مظفرؔ حنفی کا محبوب شغل غزل گوئی ہے اور اس میں کوئی باک نہیں کہ ان کی ہمہ جہت شخصیت کو جس صنف نے سب سے زیادہ وقار عطا کیا ہے، وہ ان کی شاعری ہے۔انھوں نے خود کئی جگہ اس کا اعتراف بھی کیا ہے:

بری نہیں ہے مظفرؔ کوئی بھی صنفِ ادب	قلم غزل کے اثر میں رہے تو اچھا ہے(۲)

پروفیسر مظفرؔ حنفی کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں، جن میں پانی کی زبان (۱۹۶۷ء)، تیکھی

غزلیں (۱۹۶۸)، عکس ریز (طویل طنزیہ نظم، ۱۹۶۹ء)، صریرِ خامہ (۱۹۷۳ء)، دیپک راگ (۱۹۷۴ء)، یم بہ یم (۱۹۷۹ء)، طلسم حرف (۱۹۸۰ء)، کھل جا سِم سِم (۱۹۸۱ء)، پردہ سخن کا (۱۹۸۶ء)، یا اَخی (۱۹۹۶ء)، پرچمِ گردباد (۲۰۰۲ء)، آگ مصروف ہے (۲۰۰۴ء) وغیرہ بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ان کی شعری نگارشات میں مختلف ادوار کے تجربوں، تغیر و تبدل کا عکس، جدید لب و لہجے کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے۔ یہ لہجہ اردو کی کلاسیکی شعری روایات کی یاد تازہ کراتا ہے۔ان کے یہاں جہاں ایک طرف عہد رواں کی فرسودہ، غیر معیاری اور روایتی قسم کی شاعری سے انحراف ہے تو دوسری طرف عصری ادبی سماج کے فریب، موجودہ سیاسی منظر نامہ، زوال پذیر انسانی اخلاق کے خلاف ایک احتجاج بھی ہے۔شاید اسی بنا پر خلیق انجم ان کی شاعری کو ''روایت اور بغاوت کے درمیان کی چیز''(۳) قرار دیتے ہیں۔ان کے یہاں خیال کی ندرت، جِدّت طرازی، الفاظ و معنی کا در و بست جو اردو شاعری کی قدیم کلاسیکی روایت کی پہچان ہے، بدرجہ اتم موجود ہے۔مظفرؔ حنفی کی شاعری کا وہ پہلو جن میں طنز اور تلخیوں کو بار بار محسوس کیا جا سکتا ہے، یقیناً توجہ طلب ہے۔زیرِ بحث ان کے شعری مجموعہ 'یا اخی' میں متذکرہ باتوں کو کافی حد تک محسوس کیا جا سکتا ہے۔

مظفرؔ حنفی کا شعری مجموعہ 'یا اخی' پہلی بار ۱۹۹۶ء میں منظر عام پر آیا۔اس مجموعے کو انھوں نے اپنی شریکِ حیات عاصمہ مظفر کی نذر کیا ہے۔مظفرؔ حنفی کے اِس شعری مجموعے کی اہمیت و انفرادیت کو سمجھنے کے لیے اُن کے شعری اعتراف کو جاننا ضروری امر قرار پاتا ہے، جو انھوں نے اپنے مقطعوں میں خصوصیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔'یا اخی' کی غزلوں کے مقطعے کئی معنوں میں اہم ہیں۔ بیشتر مقطعے اپنے معنی و مفہوم، فکری وسعت، گہرائی و گیرائی اور مرکزیت کے لحاظ سے منفرد ہیں اور مظفرؔ کے بے باکانہ تیور کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اِن میں مظفرؔ حنفی کے جذبات، احساسات، میلانِ طبیعت، شعری مقاصد وغیرہ کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔بعض غزلیں ایسی معلوم ہوتی ہیں کہ جیسے پہلے انھوں نے کوئی موزوں مقطع کہہ دیا ہو اور پھر اُسے غزل کا قالب عطا کرنے کی غرض سے مطلع و دیگر اشعار کہے ہوں۔اس مجموعے کے مطالعے کے بعد یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ مظفرؔ حنفی کے مقطعے اُن کی غزلوں کی جان ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جذبوں کا ٹکراؤ، مظفرؔ باطن میں	شعلہ و شبنم کا شیرازہ میرے شعر
قصیدہ پڑھ نہیں سکتا مظفرؔ	غزل گو ہے بچارہ، بیٹھ جائے
مقطع مدد کو آئے مظفرؔ کنارے سے	گرداب شیر چار طرف، درمیان میں

اسی طرح بعض مقطعوں کا لب و لہجہ ایسا بھی ہے جس کی بے باکی پر تعلّی کا شائبہ نظر آتا ہے۔اصل میں یہ تعلّی آمیز لہجہ ان کی شوخی طبع اور خود اعتمادی کا بے تکلف بیان ہے جو زمانے کی روایتی اور غیر معیاری کثرتِ شاعری کے نتیجے میں ایک احتجاج بن کر وجود میں آیا ہے۔ چند اشعار دیکھیں۔

مظفرؔ اپنی راہ خود بنائے گی مِری غزل ‏ ‏ مِرا قلم نہ آئے گا پٹی پٹائی راہ پر
اَے مظفرؔ سُنی غزل تیری ‏ ‏ نور سا آگیا جبینوں پر
مختلف انداز رکھتی ہے مظفرؔ کی غزل ‏ ‏ یہ ہماری آپ بیتی ہے، خبرنامہ نہیں

مظفرؔ حنفی نے مجموعے کی ابتدا چند حمدیہ غزلوں سے کی ہے، جن کے بعض اشعار میں کہیں کہیں ان کا تلخ لہجہ نمایاں ہے۔ یہ تلخیاں کبھی ان کی ذاتی کبھی اجتماعی نظر آتی ہیں۔ اپنی ابتدائی حمدیہ غزلوں میں جو تلخ لہجہ انھوں اختیار کیا ہے وہ بعض دفعہ اقبالؔ کے لہجہ 'شکوہ' سے مستعار معلوم ہوتا ہے۔ مظفرؔ حنفی اولاً تو قصیدائی انداز میں دنیا و مافیہا کی حیثیت کا خدا کی قدرت اور اس کی طاقت کے سامنے بے حد حقیر ہونے کا احساس دلاتے ہیں پھر خدا سے اپنے حالات میں کوئی قابلِ تسکین تبدیلی نہ ہونے پر سوالات، مطالبات اور تقاضوں کا پُرشکوہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اشعار دیکھیے ۔

ایک ذرّے نے لی تھی انگڑائی ‏ ‏ آسماں آپڑے زمینوں پر
چھوڑا تھا کنارہ کہ ذرا شغل رہے گا ‏ ‏ محصور ہوں گرداب میں اب تک مرے مولا
تیرا ہی اعلان کروں، میں تیرے ہی گن گاؤں ‏ ‏ میرے ہی ہونٹوں پر تالے، جیسی تیری مرضی

دنیا و مافیہا میں روز بروز رونما ہونے والی پریشانیوں، زمانے کی ناسازگاریوں اور اس سے پیدا ہونے والی لامتناہی اضطرابیوں سے ایک قسم کی ناامیدی، مایوسی اور احساسِ کمتری کا شکار ہونا ایک فطری امر ہے۔ یہ سلسلہ میرؔ سے لے کر آج تک اپنی الگ الگ صورتوں میں مختلف شعرا کے یہاں موجود ہے۔ میرؔ زمانے کے غم کو اپنا سمجھتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میرؔ کا غم پوری دلّی کا غم ہے۔ مظفرؔ حنفی کے یہاں بھی یہ عکس نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ اُن کا غم ذاتی ہونے کے باوجود معنوی اعتبار سے اجتماعی معلوم ہوتا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں ۔

اگر حضور نے دیوانِ میرؔ دیکھا ہو ‏ ‏ ہر ایک شعر مِری داستاں کا حصہ ہے
جب نچوڑا گیا ہمارا دِل ‏ ‏ رنج و غم دو جہان بھر نکلا
ٹھنڈی سانس نہ لینا ہرگز قاتل سُن گُن پالیں گے ‏ ‏ پہرے دار خفا ہوتے ہیں کوئی دیپ جَلا نا مَت

مظفرؔ حنفی کی شاعری اپنے عہد کی پر آشوب فضا کی ایک ایسی تصویر ہے جسے احساس، فکر، تجربے اور تجزیے کی رنگا رنگی نے خلق کیا ہے۔ انھوں نے اِس عہد کے تلخ حقائق ، ذاتی تجربات اور مشاہدات کو جس شاعرانہ انداز میں اپنی غزلوں میں برتا ہے وہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ ان کی تلخیاں، طنز کے نشتر اس سماج کے لیے ہیں جو اپنی ذمہ داریوں سے انصاف نہیں کرتا، ان ادیبوں کے لیے ہے جو حقیقت کے برعکس اپنے ضمیر سے منھ چراتے ہیں۔ زمانے کی ناسازگاریوں، بکھرتی تہذیب، ٹوٹتے معاشرے، عیاریوں، مکاریوں، فریب اور لالچ کے ماحول نے ہر زمانے میں بے ضمیروں کو قوت عطا کی ہے اور سچا ادب ہمیشہ اس کے خلاف سخت رویہ

اپناتا رہا ہے۔ اسی رویے کے پیشِ نظر مظفرؔ کی پرورش و پرداخت ہوئی ہے۔ ابتداً وہ رومانی شاعر تھے۔ لیکن جب شادؔ عارفی کا شرفِ تلمذ حاصل ہوا تو ان میں طنز نے شراکت کی۔ رفتہ رفتہ یہ طنز احتجاجی ہو گیا۔ اس روپ نے بعد کو کسی بھی ادبی تحریک اور نظریے کے رنگ میں ڈھلنے کی بجائے اپنا الگ رنگ اختیار کیا ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں:

''میں ادب میں نظریاتی حد بندیوں کا قائل نہیں ہوں۔ آپ دیکھیں گے کہ حالیؔ نے ضرورت کے تحت جو اصلاحی تحریک چلائی، جب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی تو لوگوں نے اِس تحریک سے بغاوت کر کے دوسری طرح کی شاعری شروع کر دی۔ شاعری تو رنگا رنگ ہوتی ہے۔ اگر وہ زیادہ حد بندیوں میں جکڑ دی جائے، پھر وہ شاعری نہیں رہتی۔ جدید نقادوں سے میرا اِسی بنا پر اختلاف رہا ہے۔ جدیدیت پسند یہ کہتے تھے کہ چوں کہ ترقی پسندوں نے بہت سی کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے صرف ایک نظریاتی دروازہ یا دریچہ کھول رکھا ہے، اس لیے ہم باقی ماندہ دروازے بھی کھول رہے ہیں۔''(۴)

یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں جدت پسندی بھی ہے اور ترقی پسندی بھی۔ انھیں اس بات کی پروا نہیں کہ انھیں کوئی کسی نظریے یا تحریک سے جوڑ کر دیکھے۔ وہ محض حق و صداقت کو پسند کرتے ہیں اور یہ پسند ہر انسان کو تلخ اور بے باک ضرور بنا دیتی ہے۔ اس ضمن میں ان کے اشعار قابلِ توجہ ہیں ۔

آج تیری مجبوری مانگتی ہے دو لقمے ‏ ‏ کل ضمیر جائے گا، صد ہزار لائے گا
تمھیں شعر کہنا سکھادیں گے ہم ‏ ‏ کہ ذرّوں کو مہتاب کہتے رہو
کتنا ہی عطر مَلیے اُس پر مبالغے کا ‏ ‏ جھوٹی غزل مظفر پھر بھی نہیں مہکتی
غزل یا نظم، جس کو مصلحت کا رنگ لگ جائے ‏ ‏ وہ بازاری سی لگتی ہے، وہ درباری سی لگتی ہے

مظفرؔ حنفی کا طنزیہ طرزِ بیان ان کے ذاتی تجربات و مشاہدات کا بھی غماز ہے۔ دراصل جدید طرزِ زندگی اور جد و جہد کی بے لاگ تگ و دو نے انسان کو انسان سے اس قدر بیزار کر دیا ہے کہ اعتبار، بھروسہ اور دیانت داری جیسے الفاظ بے معنی ہوتے جا رہے ہیں۔ کب کون آپ کے ساتھ ایماندار ہے، کب مکار ہے، کون آپ کا اَخی ہے کون دشمن، یہ اندازہ لگانا بے حد مشکل ہو گیا ہے۔ کچھ اسی طرح کے حالات سے مظفرؔ حنفی بھی دو چار نظر آتے ہیں۔ ان کے اِس مجموعے کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ ان کے ذاتی تجربات اور تلخ مشاہدات کا اجتماعی بیان ہے، جسے کوئی بھی قاری بہ آسانی محسوس کر سکتا ہے۔ یہ تجربہ آل احمد سرور کو بھی ہوا۔ مجموعے کے پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں ''میں نے جب مظفرؔ حنفی کے نئے مجموعۂ غزلیات 'یا اَخی' کے کچھ اوراق دیکھے تو بے ساختہ سعادت حسن منٹو کے مجموعہ مضامین 'تلخ، ترش، شیریں' کی یاد آئی۔ میرا خیال ہے کہ ان کے مجموعہ کا یہ نام بھی ہو سکتا

تھا۔''(۵) موجودہ سیاسی منظرنامے میں جس طرح انسانی قدریں، آپسی رشتے پامال ہوئے ہیں وہ لمحۂ فکریہ ہے۔ مظفر حنفی اِن عوامی شکست وریخت، ناقدری، بیزاری کو جب لفظ عطا کرتے ہیں تو اس میں کرب شدت کا روپ دھار لیتا ہے۔ شعر دیکھیں۔

دیکھو مجھے بھی لمحۂ موجود کی طرح زِندہ ہوں اور میری نشانی کہیں نہیں
سب دشمن بستی کے نکلے سارے تیر اَخی کے نکلے
نعرہ زن، ہاتھ میں تلوار، عدو ہے کہ اخی ہے دیکھنا بر سرپیکار عدو ہے کہ اَخی ہے

مظفر حنفی کے طنزیہ لہجے میں یک رخاپن بالکل نہیں۔ اسی لیے ان کی غزلیں ان کے استاد شاؔد عارفی سے بالکل منفرد ہیں۔ یہی انفرادیت ان کی غزلوں کو مختلف رنگ وآہنگ عطا کرتی ہے۔

مظفر حنفی اپنی شاعری میں حق گوئی کو سب سے زیادہ جگہ دیتے ہیں اور بے باک ہوکر سیاسی منفی رویوں، مختلف ادبی اداروں اور تنظیموں کی بے جا روشوں پر کڑی تنقید کرتے ہیں۔ وہ شب وروز کی تمام واردات پر گہری نظر رکھتے ہیں، خواہ وہ سیاسی ہوں، سماجی ہوں یا معاشی۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ایک باصلاحیت صحافی بھی تھے۔ ان کے یہاں ان تمام واردات کا نہ صرف محاسبہ اور مشاہدہ ہے بلکہ وہ اس پر مسلسل غور وفکر کرتے اور مسائل کو اپنے صحافتی مضامین کے ذریعے دوسروں تک پہنچاتے ہیں نیز اپنی شاعری میں بھی برتتے ہیں۔ وہ نہ صرف مزدور، کسان اور کمزور طبقہ کی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہیں بلکہ ان کی آواز بن کر سیاست دانوں، حکمرانوں اور اقتدار میں بیٹھے افراد پر بھی طنز کے نشتر چلاتے ہے۔

اُدھر کھیت میں ریت اُڑتی رہے اِدھر فکرِ سیلاب کرتے رہو
ہم بھوک اُگاتے ہیں کھیتوں میں، ہمارے گھر سبزی بھی نہیں پکتی، چاول بھی نہیں بنتا
وہ گاؤں تھا کہ ہاتھ سے جاتی رہی زمیں یہ شہر ہے کہ سر کے لیے چھت نہیں ملی

مظفر حنفی نے ابتدائی تعلیم کے دوران ہی داستانوں اور ناولوں کا مطالعہ شروع کردیا تھا۔ کلاسیکی شعرا میں انھیں میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کی شاعری سے خاص شغف تھا، تاہم شاؔد عارفی کے علاوہ وہ ترقی پسند شعرا سے خاصا متاثر تھے۔ نتیجتاً ان کا اپنا ایک خاص شعری مزاج وجود میں آیا جس میں کلاسک اور جدید شاعری کی افہام و تفہیم کے ساتھ ترقی پسند عناصر بھی موجود تھے۔ مظفرؔ ایسی شاعری کے قائل تھے جو ہم مزاج اور یہ تمام شعرا اُن کے مزاج کو تسکین عطا کرتے تھے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں کلاسیکی رنگ وآہنگ کے ساتھ رمز وایمائیت اور جدید فکر ونظر کی خوب صورت آمیزش دکھائی پڑتی ہے۔

مظفر حنفی کے اِس مجموعے میں شامل غزلوں کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے جگہ جگہ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ جیسے کلاسیکی شعرا اَور دوسرے ترقی پسند وجدید شعرا کے طرزِ بیان سے استفادہ کیا ہے، جس کا

اعتراف اِس مجموعے میں دیکھا بھی جاسکتا ہے۔

تِرا سخن تو مظفرؔ ہے دل لگی کے لیے میاں غزل اسدؔاللہ خاں کا حصہ ہے

جس معنوی وسعت کے ساتھ غالبؔ اپنی تنہائی اور کرب کو کوہ ودشت، بیابانی ویرانی، گھر اور مکان، در و دیوار، سبزہ وگل وغیرہ کے ذریعے شعری پیکر میں ڈھالتے ہیں، آبلہ پا ہوکر پُرخار راہوں کو مسکراتے ہوئے دیکھتے ہیں، مظفر حنفی بعض جگہوں پر غالبؔ کے اس شعری طرزِ اظہار کی پیروی کی سعی کرتے نظر آتے ہیں۔

اُتنی ویرانی کہاں سے آئے دشت بھی آپ کا گھر ہے کوئی
دیواروں سے سر اُگتے ہیں روشن دانوں سے آنکھیں تنہا ہوں تو کیسی کیسی کارستانی گھر میں ہے
ہماری آبلہ پائی نے کیا کیا گل کھلائے ہیں اِدھر جنگل ہے کانٹوں کا اُدھر فصلیں گلابوں کی

علامہ اقبالؔ جہاں بڑی خوب صورتی کے ساتھ پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر چاک کرنے کی مثال پیش کرتے وہیں مظفر حنفی برگِ گل سے پتھر کا سینہ ریزہ کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ایک کے یہاں ممکنات کے مثبت پہلو کا حوالہ ہے تو دوسرے کے یہاں طنزیہ تسکین کا ذریعہ۔

مظفرؔ برگِ گُل سے پتھروں کو کاٹ سکتے ہیں مذمّت اب غزل کی ظوؔئ انصاری نہیں کرتے

اسی طرح اِس مجموعے میں چند دوسرے شعرا کا اثر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ مثلاً کیفیؔ اعظمی جس طرح مسکراتی صورت کے پیچھے کا غم اور غم کو چھپانے کی اداکاری کو بھانپ لیتے ہیں، اسی طرح مظفر حنفی بھی اس کوشش میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

یہ چمکتی ہوئی آنکھیں، یہ دَمکتے ہوئے لب ہے کوئی بات مظفرؔ سے چھپاتا ہے جسے

اردو کی کلاسیکی شاعری میں میرؔ اور غالبؔ کی شہرت کا لوہا ہر کسی نے مانا ہے۔ جہاں اہل شعر اور سخن فہموں نے غالبؔ پر میرؔ کو فوقیت دی ہے وہیں کچھ نے غالبؔ کی شاعرانہ عظمت اور وقار کو دوسرے شعرا کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دی ہے۔ اس میں کوئی باک نہیں کہ میرؔ، غالبؔ سے بڑا شاعر ہے بلکہ غالبؔ نے خود بھی ماضی کا استاد شاعر میرؔ کو تسلیم کیا ہے۔ مظفر حنفی کے یہاں بھی میرؔ کی شعری کائنات کی مختلف جہات کا مطالعہ صاف نظر آتا ہے اور میرؔ کی عظمت کا اعتراف 'یا اخی' کی غزلوں میں جگہ جگہ نظر بھی آتا ہے۔

چلے ہیں قلبِ مظفرؔ پہ میرؔ کے نشتر پتہ چلا کہ غزل دُور بین کتنی ہے

مظفرؔ نے اگرچہ غالبؔ کے طرزِ بیان سے کسبِ فیض کیا ہے جو اُن کے کلاسیکی رنگ وآہنگ میں مترشح ہوتا بھی ہے۔ لیکن بعض جگہ وہ غالبؔ کی شاعری پر تنقید کرتے نظر آتے ہیں، اور جب میرؔ اور غالبؔ کی شاعری کا موازنہ درپیش ہو تو مظفرؔ کا تنقیدی نظریہ شدت اختیار کرجاتا ہے، اور کبھی کبھی ایسی شدت کہ قاری کو یاسؔ یگانہ کی یاد آجاتی ہے۔

یہ الگ بات مظفرؔ ہی نہ مانے خود کو — ورنہ غالبؔ کے طرف دار مِرے گھر میں نہیں
غالبؔ کی غزل پر بھی پھڑک جاتے ہیں ہم — میرؔ کے اشعار سُن کر سَنسنا جاتا ہے جی
افسُردگی کو آگ لگائی تھی میرؔ نے — غالبؔ نے سبز باغ دِکھائے تھے شعر میں

متذکرہ مختلف النوع شعرا کی شعری جہات کا ارتکازی مطالعہ اور اس کے آمیز واثر سے مظفرؔ حنفی کی شاعری میں وسعت، معنویت، گیرائی، شگفتگی اور سہل الفہمی پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنی ایک ایسی الگ راہ بنانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں جو ان کی شاعری کو منفرد اور شخصیت کو خاص بناتی ہے۔

اجالے بڑھا دو کہ جگنو کے نام — ستارے کا پیغام آنے نہ پائے

مختصر یہ کہ مظفرؔ حنفی اس روایت کے پاسدار ہیں جن کی شاعری قدیم وجدید طرز فکر کی آمیزش سے وجود میں آتی ہے۔ یہ ہمارے ماضی اور مستقبل یعنی قدیم وجدید کے رشتوں کو نہ صرف ہموار کرتی ہے بلکہ انھیں زندگی عطا کرتی ہے۔ ان کا تخلیقی اور تنقیدی شعور مختلف موضوعات کی عقدہ کشائی کرتا ہے۔ ان کی مدلّل اور سنجیدہ باتیں نئے ادبی اُمور پر غور وفکر کرنے اور تحقیق وتنقید کی راہیں ہموار کرنے میں معاون ہوتی ہیں۔

○○○

مآخذ ومصادر:

۱۔ پیش لفظ از خلیق انجم، مشمولہ: یم بہ یم از مظفر حنفی، ص ۵
۲۔ پروفیسر مظفر حنفی: سوالوں کے حصار میں، مدون: فیروز مظفر، ص ۸۸
۳۔ پیش لفظ از خلیق انجم، مشمولہ: یم بہ یم از مظفر حنفی، ص ۶
۴۔ پروفیسر مظفر حنفی: سوالوں کے حصار میں، مدون: فیروز مظفر، ص ۳۹
۵۔ پیش لفظ از آل احمد سرور مشمولہ: یا اخی از مظفرؔ حنفی، ص ۷
۶۔ پروفیسر مظفر حنفی: سوالوں کے حصار میں، مدون: فیروز مظفر، ص ۳۰

○○○

شوبی زہرا نقوی
ریسرچ اسکالر چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

صاف کہتا ہوں مجھے ڈر کیا ہے: مظفر حنفی

اردو ادب کو گلہائے رنگا رنگ سے آراستہ ومزین کرنے والے شاعر وادیب مظفر حنفی، آزاد خیال، مفکر، عالم، وسیع القلب، بے باک لب ولہجے اور جداگانہ شخصیت کے مالک تھے، جن کی سراپا نگاری اور خوبیوں کو دیکھ کر پروفیسر ظفر احمد نظامی یوں رقم طراز ہیں:

> ''چہرہ گول، گفتار انمول، چہرے پر نمک، پیشانی پر علمیت کی دمک، ابھری ہوئی ناک، فکر میں انہماک، بولتے ہوئے لب، رخ پر ذہانت کی تاب وتب، آنکھیں پر نور، دل مسرور، سر پر سفید بال، برف کی شال، یہ ہیں ممتاز افسانہ نگار، نامور قلم کار، شاعر بے بدل، واقف رموز غزل، محقق باریک بیں، شخصیت دل نشیں، صاحب طرز تنقید نگار، اسپ ادب کے شہسوار، ماہر ادب اطفال، ادیب باکمال، قنوطی فکر حیات کی نفی......یعنی محمد ابوالمظفر ،مظفر حنفی۔''(۱)

مظفر حنفی ایک باصلاحیت اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے جنھوں نے نثر ونظم دونوں میں طبع آزمائی کی اور اپنا الگ اور منفرد مقام بنایا۔ شاعری میں انھوں نے میرؔ، غالبؔ، حالیؔ اور شادؔ عارفی سے بہت فیض اٹھایا، مگر کسی کی بھی نقل کرنے کی کوشش نہیں کی، کیوں کہ روش عام اور دوسروں کے ذریعے متعین کی ہوئی راہ پر چلنا ان کے شایانِ شان نہیں تھا۔ ان کے نزدیک فنی پابندیوں میں رہ کر شعر میں نئے اسلوب میں نئی نئی باتیں کہنا ہی فن کی معراج ہے پھر ''شاعر کی تخلیق اگر خود پر زمانے کی گرد جمنے نہ دے اور عہد بہ عہد پرتیں اتارتی رہے تو یہی اس کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔''(۲)

مظفر حنفی کی شاعری کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس میں داخلیت سے زیادہ خارجیت کے پہلو نمایاں ہیں۔ مگر خارجیت کے یہ پہلو بھی دل پر ایک دیرپا اثر چھوڑتے ہیں، جس سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یوں تو انھوں نے کبھی کسی نظریے کی تائید نہیں کی مگر ان کے اسلوب میں کلاسیکی روایت سے استفادہ ضرور سامنے آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے دور کے شعرا سے منفرد لب ولہجہ اور منفرد اسلوب میں غزلیں کہتے

تھے۔شمیم حنفی ان کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مزاجاً وہ کلاسیکی مذاق رکھنے والے ہیں اور اپنے پیشے کی ضرورتوں (معلمی کے منصب) سے قطع نظر، اپنی تربیت اور طبیعت کے اعتبار سے بھی، ادب کی کلاسیکی روایت، پرانے اور آزمودہ اسالیب سے ان کا شغف بہت نمایاں ہے......لیکن جو بات انھیں اپنے عہد کے دوسرے، نوکلاسیکی، شاعروں سے الگ کرتی ہے وہ سماجی برہمی طنز اور تناؤ کی نوکیلی کیفیتیں ہیں۔'' (۳)

اردو شاعری میں مظفر حنفی نے غزلیں، آزاد اور پابند نظمیں، رباعیاں اور قطعات وغیرہ کہے ہیں۔ یہ تمام سرمایہ کلیات کی صورت میں (دو جلدوں 'کمان' اور 'تیزاب میں تیرتے پھول') ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔ ان کے کلیات میں ۱۹۶۰ء سے ۲۰۱۲ء تک کا کلام دستیاب ہے جس میں کم و بیش ۸۰ فی صد غزلیں شامل ہیں۔آج مظفر حنفی کو زیادہ شہرت ان کی غزلوں کی بنا پر ہی حاصل ہے اور غزل ہی ان کی محبوب صنف تھی، ان کا کہنا ہے کہ ''اول درجے کی ایسی نظمیں، کہانیاں، ناول وغیرہ نہ صرف دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب میں، بلکہ ہندوستان کی بہت سی علاقائی زبانوں کے ادب میں بھی موجود ہیں لیکن اردو غزل کا جواب کسی اور زبان کے پاس نہیں ہے۔'' (۴)

یہی وجہ ہے کہ مظفر حنفی نے اردو غزل پر خصوصیت کے ساتھ توجہ مرکوز کی، غزل میں ان کے بات کہنے کا انداز منفرد تو تھا ہی ساتھ ہی ساتھ ان کے یہاں مضامین کا تنوع بھی حیرت میں ڈال دیتا ہے۔غزل کی ہیئت میں رہ کر ہی وہ غیر موثر بات کو بھی اس طرح بیان کرتے تھے کہ بات نئی اور دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔مظفر حنفی نے اپنی غزلوں میں موجودہ دور کا تقریباً ہر ایک موضوع مثلاً معاشرے کا بڑھتا ہوا انتشار، انسان کا کرب، دہشت گردی، قتل و غارت گری، بے سروسامانی، حق و باطل کی کشمکش، اقلیتی قوتیں اور بکھرتا ہوا نظام حیات وغیرہ کو پیش کیا ہے، انھوں نے جب یہ تمام موضوعات اپنائے، تو ان کا ذہن کربلا کی سمت منتقل ہو گیا۔انھوں نے ان تمام موضوعات کو کربلا کے تناظر میں پیش کرنا شروع کیا۔ کیوں کہ کربلا ایک ایسا تاریخی واقعہ بن کر سامنے آیا ہے جس نے فلسفۂ جہاد و قربانی کو پیش کیا اور اب یہ واقعہ ظلم و ستم، قتل و غارت گری کے لیے ایک روشن مینارے کا کام انجام دے رہا ہے۔ واقعۂ کربلا کا بیان یوں تو شروع سے ہی رثائی شاعری میں ہوتا رہا، مگر یہ واقعہ وہاں ذکر مصائب سید الشہدا سے آگے نہ بڑھ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ رثائی شاعری میں تفکر کا عنصر برائے نام ہی ہے۔مگر جب غزل آگے بڑھی اور اس میں وقت کے بدلتے ہوئے موضوع پیش کیے جانے لگے تو یہ واقعہ بھی خود بہ خود غزل میں در آیا، کیوں کہ ''غزل کا سرمایۂ حیات یا پروانۂ جواز یہی ہے کہ اس کا وسیع دامن ہر خیال کو سمیٹ لینے کی پوری گنجائش و صلاحیت رکھتا ہے۔اگر غزل دلی کی سوگوار بن سکتی ہے تو کربلا کی کیوں نہیں۔'' (۵)

مظفر حنفی کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ ان کی غزلوں میں ایک نمایاں وصف وہ

فکری پس منظر ہے جس کی تشکیل میں یہ سانحہ اپنی پوری معنویت کے ساتھ کارفرما نظر آتا ہے۔واقعۂ کربلا کے جو مختلف پہلو ہیں اور جن کی نوعیت آفاقی ہے، ان کا بیان مظفر حنفی نے بخوبی کیا ہے۔ان کی غزلوں میں واقعۂ کربلا کبھی عقیدت کے طور پر، کبھی ظلم کے خلاف احتجاج کے لیے، کبھی علامتی، تو کبھی حق و صداقت، بے چینی، مظلومیت، محرومیوں، وفا شعاریوں اور عزت نفس کا استعارہ بن کر سامنے آتا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ اپنی کتاب 'سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ' میں واقعۂ کربلا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تاریخی حوالے کے تخلیقی یا شعری استعمال کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی مدد سے معنیات کی ایسی دنیائیں وجود میں آتی ہیں جن کا الفاظ کے لغوی اور ظاہری معانی سے علاقہ رکھنے والی معنیات میں قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا۔ استعاراتی اور علامتی پیرایوں کی (اگر انھیں فن کار نے سلیقے سے برتا ہے تو) سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ الفاظ صرف منطقی رشتوں تک محدود نہیں رہتے بلکہ تعلیقات اور تلازموں کے ذریعے متحرک بھی کرتے ہیں اور پورے بیان کو برقیا (Energise) دیتے ہیں، نتیجتاً معنیات کی ایسی تنظیم وجود میں آتی ہے جو تہ در تہ اور کثیر الابعاد ہوتی ہے اور الفاظ کی چھپی ہوئی قوتوں کو بروئے کار لاتی ہے......زیر بحث تاریخی حوالہ اب بمنزلہ ایک رجحان کے اردو شاعری میں راسخ ہو چکا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ موجودہ ذہن و شعور اس سے آزادانہ فیضان حاصل کر رہا ہے۔'' (۶)

یوں تو مظفر حنفی کی غزلوں میں بہت سی خوبیاں نظر آتی ہیں لیکن میں نے اس ایک پہلو پر اس لیے زور دیا کہ ان کی غزلوں پر لکھتے ہوئے متعدد تنقیدی مضامین میری نظروں سے گزرے مگر ان میں کوئی بھی مضمون ایسا نہیں تھا جس میں واقعۂ کربلا کو بطورِ خاص پیش کیا گیا ہو، جب کہ اس طرح کے اشعار سے مظفر حنفی کی غزلیہ شاعری میں جہاں عصری صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں ساتھ ہی ساتھ ان کی تخلیقیت پر تفکر کا جو اثر ہوا ہے وہ بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ان کی ابتدائی غزلوں میں واقعۂ کربلا کا ذکر کم ملتا ہے مگر جیسے جیسے ان کی شاعری میں پختگی آتی گئی کربلا سے متعلق موضوع ابھرتے چلے گئے۔ کیوں کہ مظفر حنفی عصری صورتِ حال کا جس طرح سامنا کر رہے ہیں اور لوگوں کو جس راہ پر متعین کرنا چاہتے ہیں وہ دونوں ہی راہیں کربلا سے ہو کر گزرتی ہیں۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں۔

چاہتا ہوں کہ دنیا ظلم کو پہچان جائے   خواہ اس کرب و بلا کے معرکے میں جان جائے
پوچھا کہ عہد نو میں وفاداریوں کی شرط   کہنے لگے کہ تیغ و کفن سے الگ نہیں

پروفیسر انور صدیقی مظفر حنفی کی شاعری کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہ جو جنگ لڑ رہا ہے اسے اس نے حق و باطل کی جنگ میں تبدیل کر لیا ہے اور ایسی جنگ کی

ایک اخلاقی اساس ہوتی ہے۔ میں ابھی یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مظفر حنفی کے اخلاقی وژن کے تمام خدوخال بالکل واضح ہیں مگر یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس جنگ میں ان کی خود اعتمادی کے پیچھے اخلاقیات کا نیا شعور ضرور کارفرما ہے۔''(۷)

میرا خیال ہے اخلاقیات کا یہ نیا شعور ان کی شاعری میں اور کہیں سے نہیں آیا بلکہ کربلا کے عظیم سانحہ سے ہی وجود میں آیا ہے، جس کی بازگشت ان کی غزلوں میں صاف سنائی دیتی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

ہم وہ ظفر مآب کہ جیتے ہیں ہار کر　　جیسے حسین معرکۂ کربلا کے تھے
صاف کہتا ہوں مجھے ڈر کیا ہے　　آپ کیا آپ کا خنجر کیا ہے

مظفر حنفی حق گو اور حق پرست شخص ہیں۔ ان کی غزلیں بھی اس بات کی شاہد ہیں کہ انھوں نے کسی سے ڈر کر شاعری نہیں کی، وہ ہمیشہ سچ کہتے ہیں۔ ان کا تیکھا لب ولہجہ ہمیشہ لوگوں کو غلط راستے سے باخبر رکھنے اور صحیح راستہ متعین کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ انھوں نے سچ کہا، سچ لکھا اور لوگوں کو بھی سچ سے بار آور کرانے کی کوشش کی۔ کیوں کہ مظفر حنفی کو حق وصداقت کی طاقت کا پورا احساس تھا، اسی لیے وہ کہتے ہیں۔

سچ کہنے میں اور مزہ ہے گردن کٹ جانے کے بعد　　میرے ہونٹوں پر تالے ہیں خامۂ ناطق زندہ باد
مگر توڑ سچ کا کسی میں نہیں　　ہزاروں وسیلے ہیں باطل کے پاس

یہ اشعار حق وصداقت کی طاقت کو پیش کرتے ہیں، وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ چاہے ظالم کتنا بھی ظلم کرے لیکن سچ زیادہ دنوں تک پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ اسی لیے کہتے ہیں۔

دور اندیشی اور بغاوت ساتھ کہاں چل سکتے ہیں　　یہ پرچم آدھے نیزے پر دھوکے سے لہرانا مت

مظفر حنفی کی غزلوں میں کربلا سے متعلق مظلومی، حق جوئی، وفا شعاری، قربانی، تشنگی کی وارداتیں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ شہیدانِ کربلا کی عظیم قربانی کے حوالے جہاں بھی آئے ہیں وہاں شاعر نے اپنے احساسات و ارادت کو ان میں جذب کر لیا ہے جس سے ان کے نفسی پہلو تو سامنے آئے ہی ہیں ساتھ ہی یہ اشعار کربلا اور آج کے ماحول کے عکاس بھی بن گئے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کریں۔

ہمیں بھی جان پیاری ہے مگر اتنی نہیں پیاری　　یزید وقت کی بیعت سے ہم انکار کرتے ہیں
آپ لاکھوں کی طرف، میں ہوں بہتر کی طرف　　تیغ چمکے گی بہر حال مرے سر کی طرف
مرے سر کو یونہی نیزہ بہ نیزہ گھومنا ہوگا　　انا الزام ہستی کو سناں سے دھوکے اترے گی

ان اشعار میں مظفر حنفی کی محبت حق اور عقیدت کربلا صاف ظاہر ہوتی ہے اور ساتھ ہی یہ اشعار معاشرے کی فضا کو بھی ظاہر کرتے ہیں، مظفر حنفی چوں کہ ایک حساس شخص تھے، جن میں ہمدردی، وفا، پاسداری، محبت، مروت جیسی اعلیٰ انسانی اقدار موجود تھیں۔ اسی لیے وہ آج کے دور جس میں قتل و غارت گری عام ہے،

بھائی بھائی کا دشمن ہے، حق کو پامال کیا جا رہا ہے، صداقت کو جھٹلایا جا رہا ہے، منافقت کا عالم ہے، چاروں طرف بدامنی پھیلی ہوئی ہے۔ معاشرے کی اس حالت کو دیکھ کر ان کا دل تڑپ اٹھتا تھا اور اسی لیے وہ لکھتے ہیں۔

کوفہ و کربلا سے دور بغض و عناد کم نہیں　　قحطِ حسین ہے بہت، ابنِ زیاد کم نہیں

مظفر حنفی نے اپنی غزلوں کے ذریعے صرف معاشرے کی حالت کو ہی پیش کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان کی غزلوں میں ایسے متعدد اشعار موجود ہیں جو کربلا کے درسی پہلو کو پیش کرتے ہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں۔

خم ہونے سے بڑھ کر نہیں سر کی کوئی توہین　　ہاں کج کلہی میں بھی ذرا شان رہے گی
کوئی جنبش نہ کرے حلق پہ خنجر جو پھرے　　چیخ نکلے نہ کوئی، ہونٹ دبائے رکھنا
ہر سمت نیا حرملہ، ہر سمت نیا تیر　　پانی کی تمنا ہے تو حلقوم پہ کھا تیر

مظفر حنفی نے ذکر کربلا کو علامتی طور پر بھی پیش کیا ہے۔ انھوں نے معاشرے کو واقعۂ کربلا کے احاطے میں رکھ کر معاشرے کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے، کیوں کہ وہ جانتے ہیں چاروں طرف استحصال کے جال پھیلے ہوئے ہیں، منفی طاقتیں سر اٹھا رہی ہیں اور یہ آج ہی نہیں ہو رہا ہے بلکہ جب سے حق اور باطل ایک دوسرے کے سامنے آئے ہیں تب سے یہی حالات کارفرما ہیں۔ یہی اظہار ان کے یہاں علامت کا روپ لے کر سامنے آتا ہے۔ یہ علامتیں ان کی شاعری کو نیا آہنگ دیتی ہیں، جس سے براہِ راست بیان کے مقابلے میں بالواسطہ اظہار کو اہمیت ملتی ہے اور علامتی اظہار میں معانی کے بہت سے پہلو نمودار ہوتے ہیں۔ پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں:

''سانحۂ کربلا اور شہادت امام حسین جدید شاعری کا نہ صرف ایک تکراری موضوع ہے بلکہ کثیر الابعاد علامت بھی ہے......حالیہ غزل میں اس کا اظہار کئی زاویوں سے ہوا ہے اور اس کے توسط سے ان شعرا نے ذاتی غم اور کائنات مسائل کی کئی پرتیں کھولی ہیں۔ کہیں تو سانحۂ کربلا ایک تلمیح ہے جو اپنی جگہ معنی خیز ہے۔''(۸)

مظفر حنفی کی غزلوں میں کربلا سے متعلق علامتیں جن کا کثرت سے استعمال ہوا ہے، نیزہ، نوک سناں، فرات، خیمہ، قاتل، زندان، حلقوم، دشتِ بلا، ساحل، تیغ وتبر، موج خوں، لہو، قاتل، تلوار، پرچم، پیاس، مشکیزہ، جفا، بیعت، اسیر اور شہ رگ وغیرہ ہیں جن سے کثیر المعانی کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔

زلزلہ خون میں آیا تھا جو اندر کی طرف　　میں نے شہ رگ ہی بڑھا دی ترے خنجر کی طرف
راستے میں ہو نہ جائے شام چلنا ہے تو آ　　درمیاں ہے کوفۂ بدنام چلنا ہے تو آ
سر میں سودا ہے تو وہ دن بھی کوئی دور نہیں　　سر بلندی کی طلب نوکِ سناں تک جائے
اٹھائے پھرتے ہو نیزہ پہ تم یہ کس کا سر　　دلیر وہ ہے جو شانے پہ سر نہیں رکھتا

ان اشعار میں ’کوفہ‘ دھوکا اور مکر وفریب کی علامت، ’اندر‘ حوصلہ، قوتِ ارادی اور اعلیٰ انسانی اقدار کی علامت ’مشکیزہ‘ زندگی کے نرم ولطیف احساس کی علامت اور ’تشنگی‘ حق وصداقت اور وفا شعاری کی علامت بن کر سامنے آئی ہیں، جس سے معاشرے میں پیوست ظلم وستم کی پرتیں کھلتی ہیں۔ مظفر حنفی کے یہاں انفرادی خودی کے تحفظ کو کتنے خوب صورت پیرائے میں پیش کیا ہے ملاحظہ کریں۔

آج تک آزما رہی ہے مجھے — کربلا پھر بلا رہی ہے مجھے
یہ سمندر سی تشنگی میری — نیزہ نیزہ گھما رہی ہے مجھے
خون للکارتا ہے بڑھ بڑھ کر — صاف آواز آرہی ہے مجھے
ذرہ ذرہ مرے لیے کوفہ — زندگی ورغلا رہی ہے مجھے
خنجرِ شمر تو وسیلہ ہے — خود شناسی مٹا رہی ہے مجھے

واقعۂ کربلا سے متعلق علامتیں مظفر حنفی کے یہاں کثیر تعداد میں استعمال کی گئی ہیں۔ یہ علامتیں کہیں تو بالواسطہ طور پر معاشرے کی مصوری کا کام انجام دیتی ہیں اور کہیں فرد کے استحصال کی علامت بن کر ابھرتی ہیں۔ وزیر آغا مظفر حنفی کی شاعری میں علامتوں کی پیش کش کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ان کے اشعار کے زیر سطح مفاہیم اپنے عہد کے اس سیاسی یا معاشرتی جبر کو بے نقاب کرتے ہیں جو صرف بیسویں صدی کا وظیفہ حیات ہی نہیں ہے بلکہ جب سے مظلومیت اور سفا کی ایک دوسرے کے مقابل آئے ہیں، وہ ایک سی شدت کے ساتھ کارفرما رہا ہے، مظفر حنفی کی غزل نے اس معرکۂ حق وباطل کو غزل کے مخصوص علامتی اور ماورائی انداز میں اس طور جزو بدن بنایا ہے کہ واقعہ اور خبر اپنی واقعیت اور خبریت کو ترک کیے بغیر غزل کی دھند میں شامل ہو گئے ہیں“ (۹)

مظفر حنفی نے علامتوں کے ساتھ ساتھ کربلا کو پیش کرنے میں شعری استعاروں کا بھی سہارا لیا ہے یہ استعارہ کہیں واقعۂ کربلا کو پیش کرنے کا استعارہ ہے تو کہیں معاشرے میں پیوست ظلم وستم اور شر پسند قوتوں کی بالا دستی کا۔

شہ رگ کا لمس پاتے ہی خنجر تڑپ اٹھا — خنجر کی دھار چوم کے لودے اٹھا لہو
پھول جو نیزہ بہ نیزہ ہے مظفرؔ صاحب — پارسا ہے کہ گنہگار ہے پوچھو اُن سے
خود اپنی ذات میں مصلوب ہوں اَنا کی طرح — بدن کے نیزے پہ آویزاں ہوں میں سر بن کر

مظفر حنفی نے کربلا کو اشارتاً بھی پیش کیا ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں۔

لالۂ صحرا کی شادابی کا بھی کچھ ذکر ہو — تشنہ لب کردار دریا کی کہانی میں بہت
نہ کوئی عافیت گھر میں، نہ دیواریں سلامت ہیں — یہاں تشنہ لبوں کے گھر تلک دریا پہنچتا ہے

ہوائیں ریت کا پیغام صحراؤں سے لاتی ہیں — سمندر نے کہا تشنہ دہانی دیکھنا میری

مظفر حنفی نے کربلا کو نئے معنوں میں بھی پیش کیا۔ لکھتے ہیں۔

سیراب ہو چکے ہوں اگر آپ تو چلیں — تشنہ لبی کا عُرس منائیں فرات پر
سچ کے لیے سر کٹا رہے ہو — پھر شمر کو کیوں پٹا رہے ہو
میری بستی میں نیا قانون نافذ ہے یہاں — سر دیا جس نے گلے وہ کامیابی سے ملا

مظفر حنفی نے کربلا کا ذکر شدت کے ساتھ کیا ہے، انھوں نے کربلا کو کہیں سادہ طور پر اور کہیں طنزیہ اور تیکھے لب ولہجے میں بھی پیش کیا ہے۔ نامی انصاری ان کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”مظفر حنفی کا اپنا ایک خاص مزاج ہے۔ بظاہر وہ بہت نرم رو، شائستہ اور مہذب دانشور نظر آتے ہیں لیکن شعر گوئی کے اوقات میں ان کی شخصیت بالکل منقلب ہو جاتی ہے اور ساٹھ باسٹھ برس کی عمر کے باوجود وہ ایک ایسے باغی نوجوان کی طرح رجز خواں نظر آنے لگتے ہیں، جس کے خواب چکنا چور ہو گئے ہوں اور جو زندگی کی کٹھالی سے ناآسودگی برہمی اور بیزاری کے سوا کچھ اور برآمد کرنے میں ناکام رہا ہو لیکن دنیا اور اہل دنیا سے کوئی بھی سمجھوتہ کرنے کو بھی تیار نہ ہو۔ زندگی کے سرکش حقائق اچھے اچھوں کا طرۂ دستار خم کر دیتے ہیں، لیکن مظفر حنفی پر ان کا کوئی وار کارگر نہیں ہوتا۔“ (۱۰)

مظفر حنفی کی غزلوں میں ذکر کربلا کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ان کی غزلوں میں واردات کربلا ایک پس منظر کے طور پر سامنے آتا ہے، جس سے آج کے معاشرے کی سچی تصویر ابھرتی ہے۔ مظفر حنفی نے اپنی غزلوں میں جتنے بھی موضوعات پیش کیے وہ سب کے سب مردمانِ چشم کا نظریۂ حیات معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے کھلی آنکھوں سے معاشرے کو دیکھا، پرکھا اور اسے تحریر کر دیا، یہی وجہ تھی کہ شمس الرحمن فاروقی نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ”وہ خیال اور عقل کے شاعر پہلے ہیں، باقی سب بعد میں۔“ (۱۱)

یوں تو ان کے ہمعصر شعرا بھی کربلا کو پیش کر رہے تھے مگر انھوں نے ذکر کربلا کو نئے انداز اور منفرد لب ولہجے میں پیش کیا جس سے کربلا کہیں کثیر الابعاد علامت کے طور پر سامنے آیا تو کہیں تلمیح کے روپ میں، کہیں حق وباطل کا استعارہ بن کر نمودار ہوا تو کہیں خود نفسی کے طور پر۔ ”غرض کربلا، مظفر حنفی کا محبوب موضوع ہے جو آج کے انسان کی خود شناسی، اس کے گردوپیش اور جذبۂ مرافعت کا بہترین عکاس ہے۔ مظفر کی داستان کربلا میں رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ، جمہوری عہد کے خدا، مشینوں کی برتری، آگہی کا کرب سبھی موضوعات آجاتے ہیں، جو آج کے دور کا انسان برت رہا ہے۔“ (۱۲)

○○○

حوالہ جات:

۱۔مژگاں، مرتب: نوشاد مومن، مژگاں پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۹

۲۔مژگاں، مرتب: نوشاد مومن، ص ۲۱

۳۔تیزاب میں تیرتے پھول (شعری کلیات۔جلد دوم)، ترتیب و تدوین: فیروز مظفر، عرشیہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، دہلی، ص ۱۰

۴۔مژگاں، مرتب: نوشاد مومن، ص ۴۵

۵۔تحقیق و تفہیم (مجموعہ مضامین)، ترتیب و تدوین: حسن مثنیٰ/ ریحان حسن، ایلیا پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء، ص ۲۶۱

۶۔سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ، گوپی چند نارنگ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۰ء، ص ۱۰۱

۷۔مظفر حنفی: ایک مطالعہ، فیروز مظفر، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۰۰

۸۔معاصر اردو غزل، پروفیسر قمر رئیس، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۰۱ء، ص ۲۰۵۔۲۰۶

۹۔مظفر حنفی: ایک مطالعہ، فیروز مظفر، ص ۲۶

۱۰۔مظفر حنفی: ایک مطالعہ، فیروز مظفر، ص ۱۹۱۔۱۹۲

۱۱۔کمان، (شعری کلیات۔جلد اوّل)، ترتیب و تدوین: فیروز مظفر، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۳ء، ص ۱۳

۱۲۔مظفر حنفی: ایک مطالعہ، فیروز مظفر، ص ۱۴۵



دانش کمال اثری

ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد، رابطہ: 9236741905

مظفر حنفی کا طنزیہ اسلوب

پروفیسر مظفر حنفی اردو ادب کا ایک ایسا نام ہے جسے جاننے والے مختلف حیثیتوں سے جانتے ہیں۔ مظفر حنفی ایک بسیار نویس ادیب کی حیثیت رکھتے ہیں اور جو فرد ادب کی جس صنف سے متعلق ہے وہ پروفیسر مظفر حنفی کو اسی میدان کا شہسوار سمجھتا ہے۔ یہ بات بہت حد تک درست بھی ہے کہ مظفر حنفی نے اردو کی بیشتر اصناف میں اپنی جولانیٔ طبع کے جوہر دکھائے ہیں اور کسی بھی صنف میں ان کا قلم مبتدیانہ نہیں چلا ہے بلکہ انھوں نے جس صنف کو بھی اپنایا ہے اسے ایک وقار عطا کیا ہے۔ بچوں کی کہانیاں ہوں، ان کے لیے نظمیں ہوں، ادب عالیہ کے تعلق سے دیکھا جائے تو افسانے ہوں، شاعری ہو، طنز و مزاح ہو، تنقید ہو گویا ''کرشمہ دامن دل می کشد کی جا ایں جا است۔'' عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ جہاں بسیار نویسی یا زود نویسی جیسی بیماریاں ہوتی ہیں وہاں معیار نہیں ہوتا اور اگر معیار سلامت رکھنے کی کوشش کی جائے تو مقدار میں لازماً کمی واقع ہو جاتی ہے۔ پروفیسر مظفر حنفی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے بہت زیادہ لکھا ہے، لیکن معیار کا بھرپور لحاظ کرتے ہوئے۔ انھیں خود بھی اپنی بسیار نویسی کا احساس تھا، چنانچہ شعری مجموعے 'چنیدہ' کی اشاعت کا جواز پیش کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''تنقید چیں بر جبیں ہے کہ میں اتنا زیادہ کیوں کہتا ہوں ادھر یہ عالم ہے کہ ۷۹ ر برس کا ہو گیا لیکن سینے میں لاوا ویسے ہی کھول رہا ہے......'' (چنیدہ، پروفیسر مظفر حنفی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۵، ص ۵)

پروفیسر مظفر حنفی سے پہلے پہل واقفیت ان کے مجموعۂ کلام 'تیکھی غزلیں' کے ذریعے ہوئی۔ بچپن کا دور تھا، شعر فہمی کی ججے بھی معلوم نہیں تھی، والد صاحب کی لائبریری میں کچھ تلاشتے ہوئے 'تیکھی غزلیں' کا قلمی نسخہ ہاتھ لگ گیا جو غالباً والد صاحب نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں خود ہی لکھ رکھا تھا۔ شاعری سے دلچسپی تو اس وقت بھی تھی، گو معانی و مطالب سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن صوتی آہنگ اور نغمگی دل کو بھاتی تھی۔ کتاب اٹھا کر چپکے سے چھپا لی اور فرصت کے اوقات میں ورق گردانیاں شروع ہو گئیں۔ اُس قلمی نسخے کی پہلی غزل کے

چند اشعار آج بھی حافظے میں موجود ہیں۔

ترے تصور میں وادیٔ دل جو رنگ و نکہت میں بس رہی ہے
بہار قوس قزح کے ساتھ آ گئی ہے، برس رہی ہے
قریب آؤ کہ منتشر منتشر سے گیسو سنوار دیں ہم
قریب آؤ کہ روشنی کو نظر ہماری ترس رہی ہے
خمار کی مشعلیں جلاؤ، شراب لاؤ، شراب لاؤ
کہ رات کی یہ سیاہ ناگن ہمیں لگاتار ڈس رہی ہے

اشعار یاد بھی بہت جلد ہو جایا کرتے تھے، اُس زمانے میں یہ غزل مکمل یاد تھی، اور کھیلتے کودتے با آواز بلند غزل کا ورد جاری رہتا تھا۔ ایک اتفاق یہ ہوا کہ یوں ہی غزل گنگنا رہا تھا اور مذکورہ تیسرا شعر ''خمار کی مشعلیں جلاؤ......'' زبان پر جاری تھا، والد صاحب کہیں سے تشریف لائے، اور انھوں نے گنگناتے ہوئے سن لیا۔ سیدھا سوال وارد ہوا کہ 'ٹیکھی غزلیں' الماری سے اتاری ہے کیا؟ سر جھکا کر اعتراف کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا، چنانچہ کتاب ضبط ہو گئی۔

بچپن کا وہ دن ہے اور آج کا دن ہے، حافظے میں کچھ اشعار اب بھی محفوظ ہیں اور شاید وہ قلمی نسخہ بھی کتابوں کے ڈھیر میں کہیں نہ کہیں محفوظ ہی ہوگا، لیکن جو اشعار ذہن سے چپکنے تھے وہ چپک گئے اور ایسا چپکے کہ باوجود کوشش کے انھیں علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ چند مزید اشعار جو میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔

آپ آئے ہیں گواہی کے لیے — آستیں تو آپ کی رنگین ہے
جام و مینا انھیں پسند نہیں — کھل کے جینا انھیں پسند نہیں
ناخدا ہیں اسی سفینے کے — جو سفینہ انھیں پسند نہیں
پارسائی کا بھرم رکھتے ہوئے پیتے ہیں یہ — چور دروازے سے ان کو مے کدہ پہنچائیے

ان اشعار پر غور کیا جائے کہ آخر ان میں وہ کون سی خاصیت ہے جو انھیں دوام عطا کر رہی ہے؟ کس بنا پر یہ اشعار قاری کے ذہن سے محو نہیں ہو پاتے؟ بلکہ ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔ حالاں کہ ان اشعار میں نہ تو شوکت لفظی ہے، نہ ہی ندرت ترکیبی ہے، نہ موضوع و مضمون میں کوئی خاص جدت ہے، پھر ان میں نفوذ کی وہ قوت کہاں سے پیدا ہو رہی ہے؟ شاید آپ غور کرنے کے بعد میری اس بات سے اتفاق کریں کہ ان تمام اشعار میں بلا کی برجستگی، سادگی اور صفائی ہے۔ طنز کی گہری چوٹ اپنی جگہ، لیکن ایک طرح سے جو روزمرہ کی زبان کا استعمال کرتے ہوئے بڑے سیدھے سادے طریقے سے اپنی بات رکھی گئی ہے وہ قاری کو اپیل کرتی ہے، اور یہی پروفیسر مظفر حنفی کا خاصہ ہے۔

تخلیق ادب کا پہلا، بنیادی اور اہم ترین مقصد احساس جمال کی تشفی ہے اور پروفیسر مظفر حنفی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے تخلیق کے مرحلے میں اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ تلخ سے تلخ بات بھی اس سلیقے سے کہی جائے کہ قاری کے احساس جمال کو ٹھیس نہ لگے۔ اسلوب اور طرز اظہار کی جمالیات کا تو مطلب ہی یہی ہوتا ہے کہ فن کار بری سے بری، انتہائی دہشت آمیز چیزوں کو بھی اتنے حسین طریقے سے پیش کرے کہ قارئین و ناظرین اس سے خوف زدہ نہ ہوں بلکہ اس سے لطف کشید کریں۔ ہم جس عہد اور جس ماحول میں جی رہے ہیں ان کے تعلق سے مشتاق احمد یوسفی کا یہ قول بہت مشہور ہوا کہ ''جو شخص حالات حاضرہ پر گفتگو کرتے ہوئے اپنی زبان پر قابو رکھے، یا تو وہ ولی ہے یا پھر حالات حاضرہ کا خود ہی ذمہ دار ہے۔'' لیکن اِن حالات حاضرہ کی عکاسی کرتے ہوئے مظفر حنفی کا قلم کہیں بھی بہکا نہیں ہے اور نہ ہی کہیں افراط و تفریط کا شکار ہوا ہے۔ یہاں طنز بھی ہے، مزاح بھی ہے لیکن طنز کی تیزابیت سے ان کی شعری فصل کہیں بھی جلتی نہیں ہے بلکہ ان کا طنز بھی طنز ملیح ہوتا ہے جو خوش گوار پھواروں کی طرح قاری پر برس جاتا ہے۔

پروفیسر مظفر حنفی نہ صرف ایک ادیب تھے، بلکہ صاحب طرز ادیب تھے کہ ان کا طرز انھیں کے ساتھ رخصت ہوا۔ اب ان تلخ حقائق کو اس شگفتہ لہجے میں کون بیان کرے گا۔

منبر پہ جیسے شیخ نہیں کوتوال ہو
یوں ہے کہ خانقاہ کچہری لگی مجھے

یہ شعر جب جب ذہن میں گونجتا ہے، ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ رینگ جاتی ہے، ایک منظر آنکھوں کے سامنے لہرانے لگتا ہے اور شعر کی مکمل تفسیر سامنے آ جاتی ہے۔ یہ خلاقی، لفظیات کا یہ برمحل انتخاب و استعمال اور یہ شوخ لہجہ انھیں کے ساتھ چلا گیا۔ انھوں نے غزل کی سابقہ روایات سے ہٹ کر اپنی راہ الگ بنائی تھی اور اُس راہ کے آخری سرے پر ان کی آرام گاہ ہے۔ سردست راستہ بند ہے اور ان کا کوئی بدل نظر نہیں آتا۔ بچپن کے ایک واقعے کے تناظر میں یہ چند سطریں وجود میں آ گئیں جنھیں انھیں کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں۔

زمانہ سمجھا مجھے انتہا نگارش کی
خود آگہی نے بتایا کہ حرف ابجد ہوں

○○○

پروفیسر مولا بخش
علی گڑھ

مظفر حنفی کی غزلیہ کائنات

(اکیسویں صدی کا دل فگار رزمیہ)

اکیسویں صدی علم کی بارش کی صدی ہے۔سائنسی ترقی اپنے عروج پر ہے اور اس نے اپنا سارا زور شعبۂ اطلاعات میں نت نئے انکشافات کرنے پر صرف کر دیا ہے۔اسکرین میڈیا نے ہماری نجی سوچ پر پہرا بٹھا دیا ہے۔ہم کسی بھی حقیقت سے متعلق جانکاری میڈیا کے ذریعے ہی حاصل کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ادب کو بھی میڈیا نگلنے کی انتھک کوششیں کر رہا ہے۔ہمارے ذہنوں میں اپنے عہد کی وہ حقیقتیں سمائی ہوئی ہیں جسے ہم ماورائے حقیقت یا Hyper Reality کہتے ہیں۔فرقہ وارانہ فسادات اور اس سے بڑھ کر ہم پر نازل ہونے والا عذاب مثلاً دہشت گردی، گلوبلائزیشن کے نام پر پردیسی ثقافت مثلاً دیسی بازاروں کی موت اور گاؤں کی سوندھی مٹی کی خوشبو اور زراعتی کلچر کے ختم ہوتے چلے جانے کے سلسلے نیز اقلیتوں اور چھوٹے ممالک پر بڑے ملکوں کے جمہوریت کے نام پر ڈھائے جانے والے مظالم اور جنگوں نے ماحولیات کی آلودگی کو اس طرح بڑھا دیا ہے کہ انسانی معاشرہ آئے دن نئی قدرتی آفتوں سے دل برداشتہ ہو چکا ہے۔کیا ایسے میں ادب کی کوئی صنف یا ہمارا ادب ان جملہ مسائل کی تفہیم اور اس سے جوجھنے والے انسانوں کے لیے کوئی راستہ فراہم کر رہا ہے یا اس سمت میں سوچنے کے لیے اپنے قارئین کے ذہن کو راجع کر رہا ہے۔اس حوالے سے مظفر حنفی ہی کیا ہر شاعر کو دیکھنا، پرکھنا لازمی ہو گیا ہے۔آج کے ادب کی ذمہ داریاں پہلے سے کئی گنا زیادہ بڑھ گئی ہیں۔غزل ہی کو سامنے رکھیے، ہمارے کلاسیکی سرمائے میں شہنشاہ غزل میرؔ اور غزل کے اہم کلاسیکی شاعر سوداؔ نے کس طرح سے اپنے متن کے زمان (Text Time) کو قرأت کے زمان یعنی Reading Time کے لیے کھلا سیاق عطا کیا۔ ناصر کاظمی نے لکھا تھا کہ ''میر کی راتیں ہمارے عہد کی راتوں سے جا ملی ہیں۔اسی طرح سے سوداؔ نے اپنے عہد کی کساد بازاری، لوٹ کھسوٹ، سیاسی انتشار، اخلاقی پستی اور قوم کی زبوں حالی کا جو منظر نامہ پیش کیا تھا، کہہ سکتے ہیں کہ وہ سارے مسائل اکیسویں صدی سے جا ملے ہیں۔آہستہ آہستہ غزل نے ہر عہد میں اسی لیے تغزل کی

غزل

مروجہ شعریات سے انحراف کرتے ہوئے اپنے عہد کے لیے غزل کا اپنا سا لہجہ دریافت کرنے کی سعی کی ہے۔ جس عہد میں کھرے کھوٹے کی پہچان، رشتوں کے تقدس کے ختم ہو جانے کے در وا ہو گئے ہوں اور جس عہد میں عام آدمی کی زندگی تمام ترقیوں کے باوجود اجیرن ہو گئی ہو، سرکاروں پر عوام کے دباؤ کا کوئی اثر نہیں ہو رہا ہو، دہشت گردی کی دکانیں سجی ہوئی ہوں، اور اصل مجرم تک پہنچنا مشکل ہو گیا ہو، شہر شیطان کی آنتوں کی طرح پھیلتے چلے جا رہے ہوں، شہر کی گندگی گاؤں تک پھیلتی چلی جا رہی ہو، روشنی میں نہائے ہوئے شہر کی بڑی آبادی میں عام آدمی کیڑے مکوڑوں کی زندگی بسر کر رہا ہو اور کسی دور افتادہ گاؤں میں ابھی بجلی تک نہیں پہنچی ہو تو ایسے اور ان جیسے کئی مسائل کو شدت سے محسوس کرنے والا شاعر تغزل کی سیدھی لکیر پر چلنے کے بجائے کہیں ایک ایسی راہ اپنی جڑوں سے برآمد کر لیتا ہے جس کی بنیاد پر وہ اپنی غزل کی عمارت تعمیر کر سکے۔ مظفر حنفی نے بھی اپنے لیے تغزل کی وہ راہ چن لی جو کہیں دور نظیرؔ اکبر آبادی اور اس سے پہلے جعفر زٹلی اور انشا اور سودا سے ہوتے ہوئے شاد عارفی تک چلی آئی تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے عہد کے نئے لکھنے والوں مثلاً مدحت الاختر، شجاع خاور، اسعد بدایونی، عرفان صدیقی، محبوب راہی، خالد محمود، شکیل گوالیاری، ظفر صہبائی، شاہد میر اور منور رانا میں اچھی غزل کے امکانات کے ہونے کا مژدہ سناتے ہیں، کیوں کہ ان میں سے بیشتر شعرا مثلاً خالد محمود اور شجاع خاور اپنے طنزیہ تیور کی غزلوں کے لیے خاصے معروف ہو چکے ہیں۔ خلیل الرحمن اعظمی نے جدید تر غزل پر بحث کرتے ہوئے اپنے مضمون بعنوان 'اردو غزل کے نئے زاویے' میں لکھا ہے کہ:

> ''جدید تر غزل کے قافلے میں ۱۹۶۰ کے آس پاس ایک نئی نسل شامل ہوئی ہے جس میں شکیب جلالی، بمل کرشن اشک، مظفر حنفی، خلیل رام پوری، محمد علوی، شہریار، عادل منصوری، ساقی فاروقی، پرکاش فکری اور دوسرے شعرا شامل ہیں جو اپنی غزل کے ذریعے ہماری شاعری کو ایک نئے ذائقے سے روشناس کر رہے ہیں۔'' (فنون، لاہور، غزل نمبر، حصہ اول، ص ۷۳)

مثلاً بانی، مصور سبزواری، زیب غوری، پرکاش فکری، مظہر امام، سلطان اختر، راج نرائن رازؔ، شمس الرحمن فاروقی، ظفر اقبال، لطف الرحمن اور عادل منصوری جیسے شعرا کے درمیان غزل میں اپنی الگ لکیر کھینچنے اور اپنی انفرادیت ثبت کرنے میں مظفرؔ حنفی کامیاب نظر آتے ہیں۔ سیفی سرونجی کو انٹرویو دیتے ہوئے اچھی غزل کی خوبیاں کچھ اس طرح سے بتاتے ہیں:

> ''مثلاً: شدت احساس اور لطف بیان، جس سے غزل کا شعر دل کو چھو سکے۔ عمیق مشاہدہ اور وسیع مطالعہ، تاکہ شاعر کے پاس کہنے کے لیے باتوں کی کمی نہ ہو۔ زبان پر عبور اور قدرت اظہار کہ باریک سے باریک نکتہ اور لطیف سے لطیف کیفیت کو بخوبی پڑھنے یا سننے والے تک منتقل کر سکے۔ صدق بیانی، خلوص اور بے ریائی بھی اچھے غزل گو کی لازمی صفات ہیں اور ان سب سے بڑی

صفت یہ کہ غزل کہنے والا نقادوں کے جھانسے میں آئے نہ مشاعروں کی واہ واہ سے گمراہ ہو۔''(۱)

ایک جگہ انھوں نے 'میرا نظریۂ فن' مضمون میں لکھا ہے کہ:

> ''جن شاعروں اور ادیبوں کا تخلیقی شعور بالغ ہے انھیں اپنی ذات اور فن پر بھی اعتماد ہوتا ہے اور وہ یقین رکھتے ہیں کہ کوئی خراب تخلیق بڑے سے بڑے نقاد کے کہنے پر بھی اچھی نہیں ہو سکتی۔ نیز سچا ادب ناقدین کی بے اعتنائی سے مر نہیں جاتا۔ دوسری جانب نقاد بھی بہر حال انسان ہوتا ہے اور اردو ادب کا نقاد تو ہندوستانی اور پاکستانی بھی ہوتا ہے۔''(۲)

نقاد کے کہنے پر اب تک بہت سی تخلیقات کلاسیکی درجے پر پہنچ گئی ہیں بلکہ اس کے کہے کی بار بار تکرار کی جا رہی ہے۔ 'یادگار غالب' سے پہلے کا غالب اور عبد الغفور شہباز کی تنقید و تحقیق سے پہلے کا نظیر کون ہے؟ کیا ہے؟ اور کس حیثیت کا رہا ہے؟ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ متن قرأت کا محتاج ہے۔ ہاں متن اگر ٹھس ہے تو پھر نقاد چاہے بھی تو اسے بڑا نہیں بنا سکتا۔

غزل کی جو خوبیاں موصوف مظفر حنفی صاحب نے بتائی ہیں وہ وہی خوبیاں ہیں جو اکثر ناقدین کسی بھی شاعر کے یہاں تلاش کر لیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مظفر حنفی کی غزل میں عمیق مشاہدہ، احساس کی شدت صرف کہنے بھر کی نہیں ہے بلکہ واقعتاً یہ کیفیت ان کی شاعری میں موجود ہے لیکن ان کی جملہ شاعری کے بارے میں یہ رائے نہیں دی جا سکتی کہ وہ پہلی قرأت میں پوری کی پوری قاری تک منتقل ہو جاتی ہو۔ اگر ایسا ہو تو غزل میں پائی جانے والی رمزیت اور بھید جو غور و فکر کے بعد اور وہ بھی ہر قاری پر ہر طرح سے کھلتا ہے اس کا کیا ہوگا۔ دراصل غزل سرشت انسانی کی کھوج میں نکلی ہوئی ایک ایسی جوگن معلوم ہوتی ہے جس کو زمانے کے مکر و فریب نے بری طرح سے ٹھگ لیا ہے۔ اس لیے غزل میں متکلم اپنے دکھ درد کو کچھ اس طرح کی زبان میں بیان کرتا ہے جس کے سرے گائکی کے الاپ سے اور صوفی کے اشاروں سے اور کسی حسینہ کی اپنے عاشق سے آہستہ روی کی گفتگو سے جا ملتے ہیں۔ مثلاً ان کے اس شعر کو سنتے ہی کیا قاری معنی تک پہنچ جاتا ہے اور اگر کوئی رائے فوراً قائم کرتا ہے تو کیا اس کی یہ رائے کلی رائے بن جاتی ہے۔ شعر سنیے ؎

راہ مسدود ہے اڑ کے جاؤں کہاں ہر طرف آسماں آسماں آسماں

شعر پر تفصیل سے روشنی نہ ڈالتے ہوئے یہاں صرف یہ سوال کرنا چاہوں گا کہ اس شعر کا مضمون کیا ہے؟ اور شعری کردار کس سے مخاطب ہے؟ کہنا مشکل ہے۔ اس طرف کوئی حتمی اشارہ ممکن نہیں ہے؟ ذرا لفظ آسماں کی تکرار پر غور کیجیے، کیا یہ لفظ آسماں اپنے لفظی معنی میں وہی ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہ لفظ یہاں صرف ایک اشارہ ہے۔ کہنے کے لیے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہاں بے پناہ وسعتوں اور آزادی کے ایک رومانی تصور کو پیش کیا گیا ہے لیکن دراصل کل ملا کر اس ذیل میں ذہن کو راجع کیا گیا ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی بے کراں اور

بے پناہ وسعتیں لیے ہوئے ہماری یہ کائنات بہرحال انسان کے لیے ایک زنداں ہی قرار پاتی ہے۔

آسماں یہاں مظروف نہیں رہ گیا ہے۔ شعری کردار اسے اپنے لیے کم جانتا ہے۔ جب کہ اڑان کے لیے اکثر بطور مظروف آسمان ہی ہمارے سامنے ہوتا ہے۔ لوگ محاورتاً کہتے ہیں کہ آج کل آسمان میں اڑ رہا ہے۔ دراصل یہاں ایک ایسے انسان کی فکر اور مشاہدے کو پیش کیا گیا ہے جسے ہم خود شاعر کا بھی مشاہدہ قرار دے سکتے ہیں لیکن کیا یہ قاری کی بھی سوچ ہے؟ ہاں قاری بھی دنیا کے جھمیلوں، رشتوں، دکھوں، مصروفیتوں سے نجات چاہتا ہے۔ وہ اڑنا چاہتا ہے، اس قید سے نکلنا چاہتا ہے لیکن نہیں نکل سکتا، کیوں کہ وہ چاہے جتنا بھی بھاگے یا اڑے اسی دنیا میں رہے گا۔ مرنے کے بعد بھی وہ اس دنیا کے حافظے میں زندہ رہے گا۔ آیئے کچھ اسی نوع کے درجہ اول کے گہرے اشعار جو ان کے جملہ شعری مجموعوں میں کثرت سے نظر آتے ہیں ان میں سے چند اشعار پر ایک نگاہ ڈالیں۔

نہ جانے کب سے زمیں گھومتی ہے محور پر
میں بن چکا ہوں مجھے چاک سے اتارا جائے

سیاہ رات اور جھلملاتے ہوئے ستارے
ہم ایک تختے پہ نیم جاں، ہر طرف سمندر

اوپر جاتے وقت سراپا اپنا عالی شان لگا
جھولا جب نیچے کو پلٹا منھ کو کلیجا آن لگا

کہاں کہاں سے کیا کسب نور، مت پوچھو
کسی کی مانگ میں چھوٹی سی کہکشاں کے لیے

جلوہ بھی اس کا پردہ ہے، محرومی محرومی
میں نے اس کو کب دیکھا ہے، محرومی محرومی

سب اچھے لگتے ہیں اپنی کرسی پر
چاند ستارے پانی میں کیا کرتے ہیں

کسی سرحد، کسی بندش کو ہوا مانے کیا
آج وحشت کا ارادہ ہے خدا جانے کیا

کب تک ہر ایک بات پہ آئے ہنسی ہمیں
پوچھا کسی نے نام نہ در وا ہوا کوئی

سائے مچل رہے ہیں چراغوں کی گود میں
سمجھے تھے ہم کہ گھر سے اندھیرا نکل گیا

جزو کا یوں کل میں ضم ہونا ہے گویا خودکشی
اس طرح خوش ہے ندی جیسے سمندر بڑھ گیا

چمکنے گرجنے سے کیا فائدہ
گزر جا برستا ہوا ہر طرف

شب گزشتہ کی یادوں کا آسرا بھی نہ تھا
ہزار چاہا کہ سو جایئے، ولے صاحب

آئینہ دار ہوں اس کی تکمیل کا
میں کہ جتنا بھی موجود ہوں کم نہیں

فنا کے غار سے خواہش کے لمبے ہاتھ باہر تھے
کہ وہ دلدل میں سرتک دھنس چکے تھے ہاتھ باہر تھے

میں اس کو روکتا کیسے، میں اس سے پوچھتا بھی کیا
کہ اس کی گود سے دو ننھے ننھے ہاتھ باہر تھے

مذکورہ بالا اشعار پر جنھیں پہلی قرأت میں اچھا محسوس ہونے پر نشان زد کرلیا گیا تھا، کے خط کشیدہ الفاظ وتراکیب، ضمائر کی ساخت اور مصرعوں کے یونٹ پر غور کرنے سے شعر کی معنیاتی تہ داری کو محسوس کرنے میں مدد

مل سکتی ہے۔ آپ یہ بھی محسوس کریں گے کہ ان اشعار پر تو میرؔ و غالبؔ کی غزلیہ روایت کی گہری چھاپ ہے لیکن ٹھہریے ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ذرا آپ شعر نمبر (۴) کے مضمون اور اس میں مستعمل لفظ 'مانگ' نیز شعر نمبر (۲) میں کسی شخص کے جہاز کے تباہ ہونے کے بعد اس کے ٹوٹے ہوئے تختے پر بے سدھ بہتے ہوئے کہیں سے کہیں چلے جانے کے استعارے پر غور کیجیے جو ہمیں ایسی کئی داستانوں کی یاد دلاتا ہے جس کے ہیرو کے ساتھ اسی طرح کی کہانی وابستہ ہے۔ اس استعارے یا داستانی کوڈ کے ذریعے زندگی کے جس المیہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کیا یہ اشارہ اس کوڈ کے ذریعے غزل کے پرانے مضمون کو یکسر بدل نہیں دیتا؟ کیا اس میں انسان کے مجبور محض ہونے کے مضمون کو انتہائی ڈرامائی انداز میں پیش نہیں کیا گیا ہے؟ بلکہ اس مضمون کو مزید گہرائی کے ساتھ قاری کے ذہن میں از سر نو خلق کیا گیا ہے۔ میلوں میں بچے اکثر ہنڈولے پر جھولنے کے لیے مچل اٹھتے ہیں، کبھی کبھی بڑے بھی اس کا لطف اٹھاتے ہیں۔ شاعر کو دیکھیے کہ اس نے اسے عروج و زوال کا کیسا استعارہ بنا دیا ہے۔ عروج پر پہنچنے والوں کو اکثر قانون فطرت کے اصولوں سے بے خبر نشے میں چور دیکھا گیا ہے۔ چوتھے شعر میں خانگی زندگی کے کردار شوہر کو سامنے رکھ کر یہ کہنے کی سعی کی ہے کہ پورے کنبے کی کفالت کے ساتھ ساتھ ایک پتی اپنی پتنی کو خوش کرنے کے لیے کیوں کر روز اپنے ضمیر پر ہزاروں کچوکے لگواتے ہوئے اسے خوش رکھتا ہے۔ سماجیاتی اور ازدواجی زندگی نیز خاندانی پس منظر کو اس شعر میں گوندھ کر کتنی خوب صورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ پانچویں شعر میں حقیقی اور مجازی عشق کی کیسی کشمکش چھپا دی گئی ہے۔ یہ عشق کا وہی تہذیبی اور تخلیقی رنگ ہے جو میر اور غالب کا مقدر بنا ہے۔ شعر کے معنی کو لفظاً بیان کرنا مشکل ہے۔ آپ جس سے محبت کیجیے اس کے دیدار سے طبیعت کی سیری کہاں ہو پاتی ہے۔ چہرے کو تو دیکھ لیتے ہیں لیکن چہرے کی اصل تعریف وہ نہیں جسے ہم دیکھتے ہیں۔ اس کے کئی رنگ ہوتے ہیں۔ پھر اس کی روح کا نظارہ اس کے اندر کی جمالیاتی سطح تک پہنچنا کسے نصیب ہوتا ہے۔ خدا کے ساتھ ساتھ مجازی محبوب بھی اسی طرح سے لاکھ پردوں میں سمٹا ہوا ایک مظہر ہے۔ جس کا دیدار ظاہری آنکھیں کبھی کر نہیں پاتیں۔ یہی وہ دکھ ہے یا تجسس ہے جس نے ہر عہد میں تعلق خاطر کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ اس شعر میں محرومی کی تکرار مثلاً ''ہم نے اس کو کب دیکھا ہے'' ''محرومی محرومی'' بطور ردیف صرف لفظ نہیں بلکہ صدیوں کے اس دکھ کا اشاریہ بن جاتا ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح چھٹے شعر میں مضمون کی ندرت اور ساتویں شعر میں مظفر حنفی کی شعری لغت میں بار بار استعمال ہونے والا لفظ 'ہوا' کو آزادی، خود مختاری اور کسی بھی بندش سے آزاد انسان کا کوڈ بنایا گیا ہے۔ اسی طرح آٹھویں شعر میں اس عہد کی بے حسی کے مضمون کو بڑی خوب صورتی سے باندھا گیا ہے۔ نویں شعر کو غالب کے مشہور شعر ''قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں ''موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں'' کے سامنے رکھ کر پڑھ سکتے ہیں جس میں کچھ اسی طرح کے مضمون کو غالب سے بھی زیادہ پیچیدہ بنا کر مظفر حنفی نے پیش کیا ہے۔ دراصل کہنے کی سعی یہ کی گئی ہے کہ ہر

تھیسس کے بطن میں اینٹی تھیسس موجود ہوتی ہے۔یعنی ہمارا پیدا ہونا وہ صورت ہے جو موت کو پیدائش کے وقت ہی لکھ دیتا ہے۔'چراغ تلے اندھیرا' کا محاورہ کسے معلوم نہیں لیکن شاعر مظفر حنفی نے اپنے اس شعر میں اس مضمون کو کتنی خوب صورتی سے باندھنے کی سعی کی ہے۔سائے کا چراغوں کی گود میں مچلنا، اور متکلم کا یہ سمجھنا کہ گھر سے سارے اندھیرے نکل چکے ہیں کیسا سادہ لوح خیال ہے۔متکلم ایسا ہی سمجھ رہا تھا یعنی اسے اب احساس ہو گیا ہے کہ نہیں ایسا نہیں ہوا۔لفظ 'چراغ' سے ایک قرینہ اور پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ یہاں چراغ استعارہ ہے اولاد کا۔ماں باپ اسے اپنے گھر کا چراغ کہتے ہیں۔فی زمانہ یہ چراغ اپنی سرشت سے بے وفائی کر رہا ہے۔شعر کو اس حوالے سے بھی اور بدی کے ساتھ نیکی اور نیکی کے ساتھ بدی لازم وملزوم کی طرح وابستہ ہے کے تناظر میں بھی پڑھا جا سکتا ہے۔دسویں شعر میں وحدت الوجودی فکر پر ایک طرح سے طنز کیا گیا ہے۔یہ طنز اجتماعیت پسندی کے نشے میں چوران عاملین اور اہل اقتدار پر بھی ہے جو فرد کی آزادی کے سرے سے منکر ہیں۔کہتے ہیں بندہ قطرہ ہے اور خدا سمندر۔یعنی کہا ہے کہ ''جزو کا یوں کل میں گم ہو جانا ہے گویا خودکشی''یعنی قطرہ اگر سمندر میں گم ہو جائے اور اس گمان میں مبتلا ہو جائے کہ اس کی وجہ سے سمندر کا پانی بڑھ گیا ہے تو اس کی اس خوش گمانی کو کیا کہیے۔متکلم کے نزدیک اس کی خوش گمانی خودکشی ہے۔یعنی ''اس طرح خوش ہے ندی جیسے سمندر بڑھ گیا'' شعر کے حوالے سے اور بھی بہت سی باتیں کہی جا سکتی ہیں۔سردست گیارہویں شعر کی طرف اپنا دھیان مرکوز کیجیے جس میں ان لوگوں پر طنز ہے جو اپنے مخصوص کام کے لیے جانے جاتے ہیں لیکن اسے ایمانداری سے نہیں نبھاتے۔جیسے فطرت کا ایک مظہر بادل ہے جو کبھی کبھی صرف گرجتا ہے برستا نہیں ہے۔بارہواں شعر غزل کا خالص روایتی شعر ہے۔مضمون کو سلیقے سے نبھایا گیا ہے۔عاشق کو کہیں سے بھی محبوب سے وصل کی امید نہیں ہے۔حتیٰ کہ گزشتہ راتوں میں تو وہ اس کی یادوں کے سہارے بھی راتیں کاٹ لیا کرتا تھا لیکن اب وہ بھی نہیں لیکن مجال ہے کہ نیند آ جائے۔اب کس کی راہ دیکھے اور کیسی امید لگائے لیکن پھر بھی آنکھوں میں نیند نہیں۔ولے صاحب کی ردیف عاشق کی اس مجبوری کو مصور کرنے میں کلیدی رول ادا کرتا ہے۔تیرہویں شعر کو وہی قاری سمجھ سکتا ہے جس کی نگاہ میں صدیوں سے چلے آ رہے موجود ناموجود، بندہ اور خدا کے رشتے، بندہ خدا اور کائنات کے رشتے، فنا و بقا کے مسائل، اپنے ہونے اور نہ ہونے سے متعلق استفسارات، انسان کے مجبور ہونے یا مختار ہونے، اس کائنات میں انسان کے وجود کے واجب ہونے، ممکن ہونے سے متعلق متصوفانہ مباحث ہوں۔شعر مذکور میں اشارہ یہ ہے کہ 'میں' ضمیر متکلم جو پورے انسانی وجود کا نمائندہ ہے کو اتنا ضرور احساس ہے کہ اسی کے ہونے سے خدا کے موجود ہونے کی دلیلیں سامنے آئی ہیں اور یہ اس امر کی بھی دلیل ہے کہ انسان کا وجود چاہے جس اعتبار کا بھی ہو کم نہیں ہے۔یعنی پہلا مصرع ''آئینہ دار ہوں اس کی تکمیل کا'' کے بعد دوسرا مصرع ''میں جتنا بھی ہوں کم نہیں'' کا قرینہ یہ ہے کہ کم نہیں کہہ کر یہاں انسان کے وجود کے اثبات کے اطمینان بخش ہونے کا

مژدہ سنایا گیا ہے۔لفظ 'آئینہ دار' یہاں قابل غور لفظ ہے جو خدا کے نمائندے کا اشاریہ ہے۔'آئینہ دار' یہاں آئینہ دکھانے والا بھی معلوم ہوتا ہے۔یہ سب کچھ انسان کی عظمت کی دلیلیں فراہم کرتا ہے۔چودھویں شعر میں خط کشیدہ لفظ 'ہاتھ' جو مظفر حنفی کی غزلیہ اور نظمیہ کائنات کا کلیدی لفظ ہے جس نے ان کی شعری لغت میں علامتوں سے بھی آگے بڑھ کر کوڈ کا درجہ اختیار کر لیا ہے۔(جس پر آگے گفتگو کی جائے گی۔) یہ لفظ یا یہ کوڈ یہاں استعاراتی ہی نہیں بلکہ اساطیری نوع کا کردار بن گیا ہے۔کتنا بلیغ مصرع مظفر حنفی نے خلق کیا ہے۔''فنا کے غار سے خواہش کے لمبے ہاتھ باہر تھے'' اور دوسرا مصرع یہ کہ ''وہ دلدل میں سر تک دھنس چکے تھے ہاتھ باہر تھے'' پڑھتے ہی دل و دماغ میں تحیر کی لہریں پیدا ہو جاتی ہیں۔دراصل شعر کا پس منظر یہ ہے کہ شاعر نے ایک شخص کو دلدل میں دھنستے ہوئے اور اپنی موت کو قریب آتے ہوئے دیکھا ہے جو گردن تک دھنسنے کے بعد اپنے ہاتھوں کو اوپر اٹھائے ہوئے ہے کہ خواہش یہ ہے کہ سر کے ڈوب جانے کے بعد بھی شاید انسانی ہاتھ کو دیکھ کر کوئی انسان اسے موت کے غار سے باہر نکال لائے۔یعنی یہاں خواہش نے امید کا جامہ پہن لیا ہے۔دوسرا قرینہ یہ ہے کہ موت کے ساتھ خواہش کی موت نہیں ہوتی یا عین موت کے وقت بھی خواہش بے طرح جوان رہتی ہے۔شاید خواہش نیک یا خواہش بد کوئی بھی ہو موت سے بھی زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔شعر میں 'ہاتھ' کو انسانی زندگی کے تحفظ کا واحد آلہ قرار دیا گیا ہے اور آخری شعر یعنی پندرہویں شعر میں منظر یہ ہے کہ ایک عورت کے ہاتھ میں ایک کپڑوں میں لپٹا بچہ ہے جس پر عامل کسی وجہ سے سخت ناراض ہو گیا ہے لیکن اس کے سامنے بچے کے دو ننھے ننھے ہاتھ کچھ اس طرح سے سامنے آ جاتے ہیں کہ جیسے یہ ہاتھ نہ ہوں کوئی الوہی اشارہ ہو، جسے دیکھ کر وہ اپنے سارے وجود کو بھول گیا ہو۔کچھ کہہ نہ سکنے اور اس عورت کو کچھ یوں ہی نظر انداز کرنے کی وجہ صرف اس بچے کے یہ دو ہاتھ ہیں جو کیسا المیہ ہمارے سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔وہ بچہ جسے دنیا کی کوئی خبر نہیں اس نے بھی ہاتھ ہوا میں لہرا دیے ہیں۔ثابت یہ ہوتا ہے کہ ہمارے لاشعور میں خواہشوں کی ایک ایسی دنیا کھدی ہوئی ہے جس سے بچ کے نکلنا انسانی زندگی کے لیے محال ہے۔مظفر حنفی کے ایسے بہت سے اشعار آپ ان کے مجموعے سے اپنی پسند کے مطابق منتخب کر کے ان میں پائی جانے والی معنی آفرینی پر مختلف زاویۂ نظر سے گفتگو کر سکتے ہیں جو اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ مظفر حنفی نے شعر و شاعری برائے بیت نہیں کی ہے بلکہ شعر کو زندگی کے شانہ بشانہ ایک زندہ حقیقت کے طور پر ڈھالا ہے۔ان کے سامنے انسان کے ہم عصر مسائل کے ساتھ ساتھ انسانوں کے اپنے نفسی، شعوری، لاشعوری اور ازلی مسائل ہیں ایسے سوالات بھی ہیں کہ جن سے صدیوں سے انسان دوچار رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری ہمیں انتہائی معصومیت کے ساتھ اپنی گرفت میں لیتے ہوئے ان شعروں کی از سر نو تخلیق پر اکسانے لگتی ہے۔مظفر حنفی کے مختلف شعری مجموعوں سے منتخب کیے گئے مذکورہ بالا اشعار کے مختصر سے تجزیے کے بعد یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے اردو غزل کی صدیوں سے چلی آ رہی روایت

میں اپنی طرح کی لکیر کھینچ کر اپنی انفرادیت ثبت کرنے کی کامیاب سعی کی ہے جنھیں اپنے استادِ گرامی شاد عارفی کا مقلد ہرگز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ شمس الرحمن فاروقی اور دیگر نقادوں نے یہ فیصلہ بہت جلد بازی اور ان کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیے بغیر سنایا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ معاصرین اپنے معاصر پر ایسے ہی فیصلے تھوپتے رہتے ہیں۔ سیفی سرونجی کو انٹرویو دیتے ہوئے مظفر حنفی نے اُن کے اس سوال کا کہ شاؔد عارفی اور آپ کے لہجے میں کیا فرق ہے، جواب کچھ اس طرح سے دیا ہے:

''شاؔد عارفی کے سلسلہ میں میرے ابتدائی مجموعۂ کلام 'تیکھی غزلیں' (۱۹۶۸) کے پیش لفظ میں خلیل الرحمن اعظمی نے اور اس کی اشاعت کے بعد اس پر تبصرے کرنے والے ناقدین (شمس الرحمن فاروقی، سلیم اختر، امجد اسلام امجد، وزیر آغا، فرمان فتح پوری وغیرہ) نے میرے اور شاد عارفی کے کلام کی مماثلتوں اور مزاج کی مطابقتوں کا اتنی شدت سے اظہار کیا کہ مجھے اپنے مرحوم استاد کی وہ ہدایت بے ساختہ یاد آئی جس میں موصوف نے اپنی الگ راہ نکالنے کی تلقین فرمائی تھی اور خود اپنے (شاد عارفی کے) رنگ میں کہنے سے بھی گریز کرنے کی بات کہی تھی چنانچہ اب شعوری کوشش سے اس رنگ کو نئے پیرایہ میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ دوسرے مجموعے 'صریرِ خامہ' میں اس اسلوب سے مختلف طرزِ اظہار کے نمونے دیکھے جاسکتے ہیں اور 'پانی کی زبان' کے بعد تو رنگ ہی بدلا ہوا نظر آئے گا، البتہ طنز اور سماجی معنویت صرف میرے اور شاؔد عارفی کے کلام کی ہی اقدار مشترک نہیں ہیں بلکہ ان کی جھلک کئی دوسرے ہم عصر غزل گویوں میں بھی نظر آتی ہے۔''(۳)

مظفر حنفی کی رائے سے اتفاق نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں بنتی۔ پروفیسر حنیف فوق نے بھی اس جانب اشارہ کیا ہے کہ:

''انھوں نے (شاد عارفی نے) روایتی غزل کے جامد اور سنگلاخ حصے پر ضرب لگاتے ہوئے تجدیدِ غزل کا سامان کیا ہے۔ شاد عارفی کے اثرات صرف مظفر حنفی کے یہاں ہی نہیں (کہ وہ شاد کے شاگرد ہیں) سلیم احمد اور مظفر علی سید وغیرہ کی غزلوں میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ اگرچہ مظفر حنفی نے شاؔد کے سماجی طنز کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ صفائی سے پیش کیا ہے۔ لیکن شاد کے اشعار میں جو نوکیلی معنی خیزی اور دھار جیسی کیفیت ہے، وہ ان میں سے کسی کے یہاں نہیں ملتی۔'' (فنون، غزل نمبر، حصہ اول، مدیر، احمد ندیم قاسمی، مطبوعہ: جولائی ۱۹۶۹ء)

خلیل الرحمن اعظمی اور حنیف فوق کی رائے سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ مظفر حنفی کی شاعری صرف طنزیہ بنیادوں پر قائم نہیں ہوئی ہے اور انھیں صرف شاد عارفی سے اور ان کے غزلیہ اختصاص سے جوڑ کر نہیں

دیکھا جاسکتا۔ عشرت ظفر نے صحیح لکھا ہے کہ:

''بعض حضرات کا اعتراض ہے کہ مظفر حنفی نے زبان میں تبدیلیاں کی ہیں، تذکیر و تانیث کا لحاظ نہیں رکھا ہے، بعض مقامات پر قوافی صوتی اعتبار سے استعمال کیے ہیں۔ اس کا مثبت جواب یوں دیا جاسکتا ہے کہ لسانیات و شعریات کی تخلیقی سطح بیشتر تکلفات سے پرے ہوتی ہے اور پھر یہ کہ شاعر اب اس بلند مقام تک پہنچ چکا ہے کہ لاکھوں الفاظ اس کے سخن فکر میں تپ کر کندن ہو کر شعر کا روپ اختیار کر چکے ہوں تو پھر اس کا حق ہے کہ تبدیلیاں کرے اور اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔''(۴)

ایک اور بات اس ضمن میں نظر میں ہونی چاہیے کہ انھوں نے ترجیحی بنیادوں پر سینکڑوں افسانوں کو خیرباد کہتے ہوئے غزل گوئی کو کیوں کر اپنے لیے سودمند جانا۔ اس کا جواب دیتے ہوئے مظفر حنفی نے لکھا ہے کہ:

''بے شک ادبی زندگی کے ابتدائی گیارہ برسوں میں کہانیاں اور افسانے تخلیق کیے۔ ۱۹۶۰ء کے آس پاس ادب میں جدید رجحانات کا بول بالا ہوا۔ جدیدیت نے تمام اصناف ادب میں مرکزیت، اشاریت، علامت اور ابہام پر زور دیا اور ان کی شمولیت سے شاعری، خصوصاً غزل کو نئے پر و بال مل گئے۔ مجھے تخلیق کار ہونے کے ناتے شاید بروقت احساس ہو گیا اور میں نے افسانے کی جگہ غزل کو اپنا وسیلۂ اظہار بنا لیا۔ میرا ایک مقطع ہے۔

بری نہیں ہے مظفر کوئی بھی صنفِ ادب
قلم غزل کے اثر میں رہے تو اچھا ہے''(۵)

گوپی چند نارنگ نے انھیں ان جملہ ناقدوں سے الگ سودا کے قریں پایا ہے اور محمد شمشیر عالم نے صحیح لکھا ہے کہ:

''گوپی چند نارنگ کے خیال میں'' کاٹ دار اور تیکھی غزل کی راہ انھوں نے شاد عارفی سے پائی لیکن اس میں بوقلمونی، تہ داری اور طرح داری کی فضا اپنی بنائی نیز زندگی کے گرم و سرد پر بے نیازانہ نگاہ کرنے اور حوصلہ مندانہ گزر جانے کی جہات ان کی اپنی ہیں...... کسی شاعر کا اپنے لہجے اور تیور سے پہچانا جانا ایسی سعادت ہے جس کو تخلیق کا سب سے بڑا افتخار و اعزاز ہی کہنا چاہیے۔''(۶)

پروفیسر نارنگ کی رائے بڑی حد تک جچی تلی اور معروضی معلوم ہوتی ہے۔ البتہ جن لوگوں نے مظفر حنفی کے اشعار میں بعض نوع کی زبان کی تبدیلیوں اور دیگر عیوب کی نشاندہی کی ہے اس کا جواب عشرت ظفر نے دیا تو ہے لیکن قاری اس سے مطمئن نہیں ہوسکتا کیوں کہ جواب صحیح نہیں ہے۔ لوگ غزل کے تمام اشعار میں غزل گو

کو ہی تلاش کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ غزل کے جملہ اشعار میں متکلم یا شعری کردار تقریباً جداگانہ ہوتا ہے۔ مظفر حنفی نے غزلوں میں اکثر مقامات پر اپنے شعری کردار کی رو سے زبان کا استعمال کیا ہے۔ جیسے فکشن میں از روئے تقاضائے کردار و ماحول زبان کا استعمال کیا جاتا ہے جو ظاہر ہے عموماً بولی اور زبان کی وہ شکل ہوتی ہے جو بنی بنائی قواعد کی حدوں کو توڑتی ہے۔ عشرت ظفر نے اس پہلو پر غور نہیں کیا ہے اور مظفر حنفی کے معترضین بھی اس حقیقت سے نابلد نظر آتے ہیں۔ جیسے عشرت ظفر کے ہی کوٹ کیے گئے مندرجہ ذیل شعر پر نگاہ رکھیں۔ یہاں ایک مخصوص نوع کے کردار کی زبان کو مظفر حنفی نے شعر کرنے کے لیے استعمال کیا ہے:

چاندنی سی جگ مگی ہوگی جہاں وہ ہوئیں گے
ہوئیں گے ہم جس جگہ، بادل برستا ہوئے گا

مظفر حنفی کا کمال یہی ہے کہ انھوں نے اپنی غزلوں میں رسمی زبان سے یا غزل کی مخصوص زبان کی جگہ بولی ٹھولی، محاوراتی اور کہاوتی طرز اظہار نیز گھروں، بازاروں اور دوستوں کے درمیان بولی جانے والی اردو میں مروجہ فارسی آمیز زبان اور بوجھل تراکیب پر مبنی غزلیہ اظہار سے گریز کرتے ہوئے، غزل کہنے کی کامیاب سعی کی ہے جسے ہم عام آدمی کی زبان قرار دے سکتے ہیں۔ ان کی شاعری کے مطالعے کے وقت ہمیشہ مصرعوں میں نثری منطق ایک خاص زاویے سے ہمارے دامن دل کو کھینچ رہی ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ نہ صرف مصرعوں کو نثری نحو کی شکل دے دیتے ہیں بلکہ نثری جملوں میں جس طرح قوسین میں جملۂ معترضہ کے لکھنے کی روایت چلی آئی ہے، ان قوسین کا بھی استعمال کرنے میں وہ جھجکتے نہیں ہیں۔ کمال یہ ہے کہ وہ ان اسلوبی راستوں سے گزرتے ہوئے صریحاً غزل کی کلاسیکی روایت سے مکمل طور پر الگ نہیں ہوتے بلکہ ان کے نثری منطق پر مبنی اشعار میں بھی غزل کے کلاسیکی اسلوب کی لکیریں شعر کی داخلی ساخت میں قاری محسوس کرسکتا ہے۔ ویسے تو ان کی پوری شاعری میں اس طرز اسلوب کو محسوس کیا جاسکتا ہے پھر بھی اس نوع کے اشعار کی چند قابل ذکر مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

ترستی رہی روشنی کو نگاہیں — چمکتے رہے چاند تارے وغیرہ
اب کہہ دیا تو بات نبھائیں گے عمر بھر — حالاں کہ دوستی کا زمانہ تو ہے نہیں

جیب میں کیا ہے نئے چالیس پیسوں کے سوا
پرس میں منہ دیکھ لیتا ہوں تری تصویر کا

وہ جو تیرے ہاتھوں چڑ کے کھا جاتے ہیں مثلاً میں
تیری محفل میں آنے سے کتراتے ہیں مثلاً میں

ڈگمگائیں گے قدم جب ہر طرف یہ شور ہو
اس طرف سے 'یوں نہیں' 'ایسے' سنبھل کر آیئے

لوگوں نے (جن کو ربط نہیں زندگی کے ساتھ) — صنف غزل کو مدحت جاناں بنا دیا
بس ایک رات مِرے گھر قیام کرتی جا — نہیں تو موج بلا تجھ سے میری کٹی۔ جا
لوگ دھوکے میں ہیں جاں بہ لب کون ہے — رات کے تین بجتے ہیں۔ اب کون ہے
کیوں اڑے ہو چٹان کی مانند — تم بھی جھرنے کے ساتھ ہو لو نا

میں نے تو حتی المقدور اسے سمجھایا لیکن وہ
میرے بس میں کیا ہے، جی کو سمجھا لوں گا لیکن وہ

چمن میں آں محترم نے جو گل کھلائے ہیں آنچ دے رہے ہیں
نہ بھولیے گا کہ اصل مع سود محترم سے وصول ہوگا

غرقابی کے حیلے ہیں سب — کشتی وشتی ساحل واحل

یہاں کوئی تیسرا نہیں ہے کچھ اور نزدیک آیئے نا
شکن مٹانی ہو شخصیت کی تو گھاس پر لیٹ جایئے نا

شگوفہ کوئی صدف نہیں ہے کھلا کہ خوشبو گہر نہیں ہے
بندھی ہے مٹھی تو ہر طرف سے دکھایئے نا دکھایئے نا

آپ نے مذکورہ بالا اشعار میں بے تکلفی اور عام بات چیت نیز نثری منطق کے اسلوب کا جمال ملاحظہ فرمایا۔ ان اشعار میں سے کچھ اشعار تو معنیاتی تہ داری کی اپنی مثال آپ ہیں لیکن کسی شعر کو ردی شعر کے زمرے میں نہیں رکھا جاسکتا۔ ہر شعر میں کچھ نہ کچھ نیا پن اور خیال کی سطح پر ندرت ہے۔ عادل فاروقی نے صحیح لکھا ہے:

''مظفر حنفی کے ہاں بوجھل تراکیب، ادق الفاظ اور فارسی زدہ اضافتوں کی کمی کے باوجود عام فہم سلیس لیکن ٹکسالی اردو میں ایسی لفظی تصویریں موجود ہیں جن کو دیکھ کر ہر انسان چونک اٹھتا ہے......مظفر کا کلام آہ، واہ اور ٹھاہ نہیں بلکہ کراہ ہے، جیسے کوئی ٹیکے کی سوئی چبھودے......وہ جلی کٹی نہیں سناتے لیکن شائستہ پیرائے میں ایسی چنگاریاں چھوڑتے ہیں کہ پڑھنے والا تلملا اٹھے۔''(۷)

محمود ہاشمی نے اپنے تبصرے 'صریر خامہ: تلاش و تجزیہ' میں لکھا ہے کہ:

''مظفر حنفی نے خالص اسلوب اور ہیئت والی 'چکنی غزل' سے انحراف کیا ہے اور نئی ہیئت کی نسبت شعر میں مواد کی بنیاد کو لازمی قرار دیا ہے......اشیا اور عوامل کی جانب شاعر کا رویہ ایسے مبصر کا ہے جو پیدل چلنے والے مسافر کی طرح مظاہرات کا قریب سے مطالعہ کرتا ہے اور اس مطالعہ کے ردعمل کو بلند آواز میں بیان کرتا ہے۔ چوں کہ شاعر کا ردعمل خارج کی سمت اختیار کرتا ہے،

اس لیے لب و لہجہ کھردرا اور بعض اوقات عامیانہ ہے۔ لہجہ کی اس بے ساختگی اور حقیقت آمیز روش کے باعث اشعار میں نثری منطق بہت نمایاں ہے اور وہ پیچیدگی نہیں ہے جس کے لیے جدید شاعری کو معتوب قرار دیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں، مظفر حنفی کے مشاہدات کا اظہار، سماجی تنقید اور بورژوا تصورات وعناصر سے ٹکرانے کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔‘‘(۸)

محمود ہاشمی نے مختصراً مگر بڑی جامع رائے مظفر حنفی کی شاعری کے حوالے سے پیش کی ہے لیکن مجھے ان کی ایک بات سے اختلاف ہے اور وہ یہ کہ مظفر حنفی نے ہیئت کے بجائے شعر میں مواد کو اہمیت دی ہے۔ پرانی تنقید اسی طرح کی گفتگو کرتی تھی۔ زبان خیال کی شرط ہے اور خیال بغیر زبان کے ایک واہمہ ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ مظفر حنفی کے عہد کی سچائیاں، دکھ اور سیاسی، سماجی اور ثقافتی مسائل نیز ادب کی سطح پر کیے جانے والے تجربوں نے انھیں مروجہ معیار زبان اور شعریات میں اپنی طرح کے تجربے کرنے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے جہاں ضرورت محسوس کی وہاں غزل کی رسمی زبان کا بھی استعمال کیا اور جہاں آواز بلند کرنے کی ضرورت محسوس کی وہاں آواز بلند کی۔ باقی رہی پوری شاعری تو اس کے لیے انھوں نے بات چیت کے لہجے کو ترجیح دی۔

مذکورہ بالا اشعار پر ایک نگاہ اور ڈالیں۔ شعر نمبر(۱) میں لفظ ’وغیرہ‘ کا استعمال شعر کو یکلخت شاعری کے خاندان سے نکال کر نثر کی دنیا میں لاتا ہے۔ قاری کو سکون ملتا ہے کہ وہ غالبؔ کی مشکل گوئی کا مطالعہ نہیں کر رہا ہے۔ تبھی احساس ہوتا ہے کہ شعر میں کہا کیا گیا ہے؟ کتنی آسانی سے بات کہی گئی ہے کہ چاند تارے وغیرہ چمکتے تو رہے ہیں لیکن پھر بھی انسان کی نگاہیں روشنی کے لیے ترستی رہی ہیں۔ چاند تارے کے بعد وغیرہ سے مراد ہے سورج کے علاوہ دنیا کے سارے فلسفے، تحریکیں، انقلابات، جو انسان کو اندھیرے سے نکالنے کا دعویٰ کرتے رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا انسان اس کے بعد کسی قسم کے دکھ اور المیہ کا شکار نہیں ہوا ہے۔ شعر میں لفظ ’وغیرہ‘ کی جگہ یہ لکھ دیا جاتا کہ چمکتے رہے چاند تارے ’جہاں میں‘ یا ’جہاں میں‘ کی جگہ پر لکھا جاتا ’وسورج‘ تو شعر غارت ہو جاتا۔ شعر میں زمانۂ جاریہ کا صیغہ بھی معنیاتی تہہ داری کی وجہ بنا ہے۔ اسی طرح شعر نمبر(۲) میں تو ہے نہیں یعنی نحو شکنی کا عمل، شعر نمبر(۳) میں پیسوں کی جگہ نئے پیسوں کا استعمال طنز پیدا کرتا ہے۔ شعر نمبر(۴) میں چڑ کے کھانا جیسا غیر فصیح دیسی محاورہ بھی طنز کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ شعر نمبر(۵) میں تجھ سے میری کٹی اور پھر فل اسٹاپ کے بعد ’جا‘ کا استعمال بچوں کی سی معصومیت کو سامنے لاتا ہے۔ چھٹے شعر میں بالکل معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہم شعر پڑھ رہے ہیں ایسا لگتا ہے کوئی خود سے باتیں کر رہا ہے۔ یعنی ’’رات کے تین بجے ہیں۔ اب کون ہے۔‘‘ پھر اسی طرح شعر نمبر(۷) میں ردیف بولو نا، ہولو نا سے کتنی خاکساری جھلکتی ہے لیکن ساتھ ہی زیریں سطح پر طنز کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ شعر نمبر(۱۱) میں آں محترم جیسے فقرے میں کیسا طنز مضمر ہے۔ شعر نمبر(۱۳) میں مضمون تقدیر کا باندھا گیا ہے یعنی سب کچھ پہلے سے طے ہے۔ فلسفۂ جبر کو کس خوبی سے شعر میں

نبھایا گیا ہے۔ ڈوبنے والے کو ڈوبنا تھا۔ کشتی وشتی ساحل واحل یعنی بول چال کے انداز میں کتنی گہری بات کہی گئی ہے کہ کشتی وغیرہ تو بہانے ہیں۔ اسی طرح شعر نمبر(۱۴) میں آیئے نا، لیٹ جایئے نا کیسی اپنائیت اور خاکساری کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی اسی طرح کی خاکساری اپنے اندر پیدا کرنے کی تلقین کی گئی ہے لیکن یہاں بھی طنز نے اپنی طرح کی کروٹ ضرور بدلی ہے۔

مظفر حنفی کی شاعری کی ایک پہچان شعریات غزل یعنی Metamorphosis of Ghazal سے متعلق وافر مقدار میں شعر کہنے کی طرح ڈالنی ہے۔ ان میں سے کچھ اشعار پر نگاہ ڈالنا بہت ضروری معلوم ہوتا ہے۔

مِری زمین رہی آسماں پہ چھائی ہوئی — مگر غزل کی کمائی کوئی کمائی ہوئی

(کہتے ہیں غزل قافیہ پیمائی ہے ناصر — یہ قافیہ پیمائی ذرا کر کے تو دیکھو)

نئے قافیوں کی زیارت ہوئی — اٹھو قیمتی رات غارت ہوئی

مظفرؔ کے لہجے نے ثابت کیا — غزل قافیوں کا پلندا نہیں

ہم سے پوچھو کہ غزل کیا ہے، غزل کا فن کیا؟
چند لفظوں میں کوئی آگ چھپا دی جائے

آج بھی لوگوں کو شعروں میں تغزل چاہیے
اور ہم کو اس طرح کے چونچلے آتے نہیں

جمالیات کے شاعر برا تو مانیں گے
مگر یہ عرض کروں گا کہ تھک رہی ہے غزل

جیسے غزلوں میں شامل ہو ہر پڑھنے والوں کی سوچ
یہ فانوس مظفرؔ صاحب کیا کیا رنگ بدلتے ہیں

مذکورہ بالا خط کشیدہ الفاظ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مظفر حنفی نے مروجہ شعریات غزل سے جیسا اور جتنا بھی انحراف و اجتناب کیا ہے اسے ہم جانا بوجھا اجتناب و انحراف (Intentional Deviation) قرار دے سکتے ہیں۔ مظفر اپنی غزل کے ذریعے اپنے عہد کا دل فگار رزمیہ لکھنا چاہتے ہیں جس کے لیے مروّجہ تصور تغزل ناکافی ثابت ہوا، پھر جو سب سے اہم بات اس شاعری میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ شاعر غزل کی شاعری کو یا غزلیہ متن کو یا غزلیہ شعر کو مابعد جدید مفکروں کی طرح مکمل متن (Finished Product) ماننے کو تیار نہیں کیوں کہ غزل ایک بین المتونی صنف شاعری کی سب سے بلیغ مثال فراہم کرنے والی صنف ہے۔ دراصل غزل Genetic Duplication یعنی تناسل مثنیٰ کی شاعری ہے۔ پہلے سے سب کچھ موجود ہے یعنی قافیہ، ردیف، غزل کی مخصوص، غیر مبدل ہیئت، استعاراتی اور علامتی نظام، غزل کے طے شدہ

کردار، عاشق معشوق اور رقیب۔ ایسے میں غزل میں انفرادیت کی تلاش یا شاعر خود کو منفرد تب ہی بنا سکتا ہے جب وہ اپنی روایت کے جملہ دھاروں کی سمجھ رکھتا ہو اور جسے اپنے سننے اور پڑھنے والوں کی ذہانت پر اعتبار ہو۔ اسی لیے مظفر حنفی کے مذکورہ بالا شعر میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ غزل کا شعر قاری کی شراکت کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ مظفر حنفی نے جیسا کہ آخری شعر میں غزل کے شعر کو فانوس کہا ہے ظاہر ہے کہ اس کے رنگ ہر قاری کی قرأت کے بعد بدلتے رہتے ہیں۔ دوسری بات جو انھیں غزل کے بارے میں بخوبی معلوم ہے وہ یہ ہے کہ غزل کا شعر اس وقت تک قاری کو اپنے اندر شریک نہیں کرسکتا جب تک کہ اس کے بطن میں کوئی آگ یعنی کوئی بہت بڑا دکھ، المیہ، انسانی سائکی کا کوئی ان دیکھا پہلو نظر نہ آئے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاعر کی کتھنی اور کرنی میں کوئی مطابقت ہے یا نہیں؟ کیا مظفر حنفی کے اشعار پر انھیں کے بیان کردہ اصول کا اطلاق ہوتا ہے؟ میرا خیال ہے کہ اب تک جن شعروں پر گفتگو کی گئی ہے ان کے پیش نظر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ ہرگز واشگاف شاعر نہیں ہیں۔ مظفر حنفی کی شاعری کسی حد تک روایتی غزلوں سے پرے ہٹتے ہوئے غزل کی نئی شعریات کی طرف گامزن نظر آتی ہے اور شعریات غزل سے بڑی حد تک وابستہ نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے بڑے اور ذہین نقادوں نے جن میں گوپی چند نارنگ کا نام پچھلے صفحے پر سامنے آچکا ہے، کے علاوہ آل احمد سرور اور وزیر آغا نے ان کی شاعری کو ان کے معاصرین سے الگ انفرادیت کی حامل بلیغ شاعری قرار دیا ہے۔ آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''ان کے اشعار میں تلوار کی کاٹ ہے، ایک برہم نوجوان کے لہجہ کی تلخی ہے، اس میں کچھ توڑنے کی بات بھی ہے، اس میں بگاڑ اور نئے سرے سے بناؤ کی داستان بھی ہے اور اس میں غزل کی کمائی سے کچھ نا آسودگی کی آہٹ بھی۔ یہ ایک سرکش روح کی کہانی ہے اور ایک باغی کا خواب، زندگی کا کتنا زہر پی کر یہ امرت حاصل ہوا ہے۔''(۹)

ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے مضمون بعنوان 'بوند بھر نرم اجالا' میں لکھا ہے:

''جدید غزل نے اس صورت حال سے نپٹنے کے لیے نظم سے استفادہ کیا ہے اور وہ 'فاصلہ' جو غزل نے 'موجود' اور 'ماورا' میں قائم کر رکھا تھا، اسے ذرا کم کرنے کی سعی کی ہے، چنانچہ سامنے کی اشیا اپنی نوکیلی موجودگی کا احساس دلاتی ہوئی، غزل کے آنچل پر ستاروں کی طرح چمکنے لگی ہیں۔ مظفر حنفی جدید غزل کے اس خاص انداز سے بھی آگے گئے ہیں اور انھوں نے بڑی دلیری سے غزل کو اس کے اعماق میں چھپی کہانی سے اس طور متعارف کرایا ہے کہ فاصلے کم ہو گئے ہیں۔ ہر چند کہ غزل کی مخصوص خوشبو اور دھند بدستور موجود ہے مگر کہانی کے نقوش مدھم نہیں پڑے جیسا کہ غزل میں عام طور سے ہوتا ہے۔''(۱۰)

اس طرح ان کی شاعری میں پائی جانے والی بلاغت کا اعتراف کرنے والوں میں اعجاز حسین، ظ۔ انصاری، شمس الرحمن فاروقی، گوپی چند نارنگ، شمیم حنفی، ساقی فاروقی، ڈاکٹر گیان چند جین، علی جواد زیدی، مخدوم محی الدین، مسعود اشعر، خورشید احمد جامی، کنہیا لال کپور، عمیق حنفی اور شہریار کے نام نامی اہم ہیں۔ مذکورہ بالا دو اقتباسات میں ان کی شاعری کے ایک اہم عنصر کی طرف وزیر آغا نے اشارہ کیا ہے اور وہ یہ کہ مظفر حنفی کی غزلوں میں بیانیہ عناصر جا بجا بکھرے پڑے ہیں جنھیں پڑھتے ہوئے ہم اکثر کسی نہ کسی کہانی میں داخل ہو جاتے ہیں لیکن مجھے کہنے دیجیے کہ کہانی یا داستان ان کے یہاں عموماً بطور استعارہ سامنے آتی ہے۔ شاید مظفر حنفی اپنی نسل کے واحد فن کار ہیں جنھوں نے سب سے زیادہ اپنے اشعار میں داستانی شعریات، مشہور داستانوں کے واقعات، کردار، وغیرہ کا استعمال بطور کوڈ کیا ہے۔ یعنی انھوں نے ہندوستانی اساطیر کو عموماً اپنے متن میں کچھ اس طرح استعمال کیا ہے کہ پرانے متن کی ساری معنویت ہم عصر زندگی کے پیچیدہ مسائل یا سوالات کی تفہیم کے لیے ایک کھلا سیاق فراہم کر دیتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ Myth always thinks into the man یعنی جب ہم عصر زندگی کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی انتشار کے ذریعے بعض انسانی مسائل کچھ اس طرح سے سامنے آتے ہیں جن کی تفہیم میں انسانی دماغ بے چین ہو اٹھے یا وہ کسی فیصلہ کن رائے پر نہ پہنچے تو ایسے میں خیال کی سطح پر ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ Myth کا استعمال اسی خلا کو پاٹنے کے لیے فن کار ہر عہد میں کرتے ہیں۔ مظفر حنفی کے ذہن میں ہندوستانی فکر و فلسفہ اور اساطیر کی ساری جہتیں موجود معلوم ہوتی ہیں۔ ان کا ذہن سرتا پا ہندوستانی فکر و فلسفہ میں ڈھلا ہوا ذہن معلوم ہوتا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم ان گوشوں پر مزید گفتگو کریں آیئے ان کے کچھ اشعار میں اساطیری و ثقافتی مدخولات کی جھلکیاں دیکھیں:

اب تو خوش آمدید کہے ملکۂ بہار
چنچل پری کو ڈھونڈ کے لائیں کہاں سے ہم

اور پھر پانچویں درویش کی باری آئی
بے پر کی یار لوگ اڑاتے ہیں آج کل

جھنجھلا کے اپنے عکس کو دو لخت جو کیا
آئینے میں بھی روپ بدلتا ہے میرا عکس

پیچیدگی عہد رواں مجھ سے نہ الجھے
اس کلجگ میں گھر کی لنکا ڈھانی ہوگی رام

اوپر نیچے، آگے پیچھے، آزو بازو روک
گھر ملا ہے جسم کے جنگل میں چودہ سال بعد

کانٹوں پہ چل رہا ہوں بڑے اعتماد سے
منے کی ضد بھی کم تو نہیں دیو زاد سے

باغ افسانہ میں ندرت کی سواری آئی
یہ ملکۂ صبا وہ سلیمان ہو گیا

راون کا ایک اور نیا سر تھا سامنے
ہابیل کی طرح کبھی قابیل کی طرح

حاتم کے لیے موت نہیں کوہ ندا میں
پہلے خود اپنے اندر کے راون کو مارو

چنتا کی لچھمن ریکھاؤ! آگے جانے دو
جس میں دو مٹھی ہوا ہے ہاتھ بھر کا آسماں

جاگتے جاگتے آنکھ پتھرا گئی
اور کتنے برس رات کے رہ گئے

یہ بھی کوئی آرزو تھی غرق ہو جاتا جہاز
ایک تختہ اور میں، بہتا، سمندر دیکھتا

سونے کی ہر لنکا ان کی اور مجھے بن باس
چتر سیانے دس دس سر کے، مجھ مورکھ سر ایک

ہماری تہذیبی اور ثقافتی جڑیں ان ہی اساطیری دنیاؤں میں پیوست ہوتی ہیں۔آیئے ہم عصر ثقافتی صورت حال پر مظفر حنفی کے اشعار کے حوالے سے ایک نگاہ ڈالیں۔

داغ بن کر دو جہاں کا غم جگر میں آگیا
اس غریبی میں کہاں مہمان گھر میں آگیا

ٹہنی اپنی شاخ سے کٹ کر بانجھ ہنجھوٹی سوکھی چیز
دریا نالا بن جاتا ہے کٹ کر اپنے دھارے سے

جیپ چلی آتی تھی تیزی سے ہرنوں کی ڈار کی جانب
جنگل کی پگڈنڈی بھاگی خوف کے مارے غار کی جانب

میں اپنی شکل ڈھونڈ رہا ہوں جو نامراد
تہذیب و آگہی کی نقابوں میں کھوگئی

یکسانیت نے فرد کی مٹی خراب کی
وہ گھر دکھایئے جو مِرا گھر نہیں لگے

چراغوں کی بستی میں ڈھونڈا بہت
کہیں بھی ذرا سی نہ تھی روشنی

یوں بھی دلی میں لوگ رہتے ہیں
جیسے دیوان میر چاک شدہ

میں قصبے کا بھولا پنچھی، اندر باہر ایک
جس شہری نے ہاتھ ملایا کاٹ لیا پر ایک

جب گاؤں ترقی کے لیے شہر میں آیا
ناپید ہوئے پھول، ٹھکانے لگے جگنو

پوچھنا چاہتا ہوں بیٹوں سے
میں بھی شامل ہوں خاندان میں کیا

نہ رک سکے گا یہ پانی ندی کو بہنے دو
کہ زندگی ہے روانی ندی کو بہنے دو

مذکورہ بالا جن تیرہ اشعار میں ہم عصر زندگی کی تفہیم جن خط کشیدہ اساطیری سیاق کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے ان میں ملکۂ بہار، دیوزاد، پانچواں درویش، ملکۂ صبا، سلیمان، راون، ہابیل قابیل، حاتم، کوہ ندا، لنکا، رام، راون، لکشمن ریکھا، چودہ سال کا بن باس، سونے کی لنکا اور راون کے دس سر کو بطور ایک کوڈ اور اس زبان سے وابستہ تصور زندگی کو سامنے رکھ کر شاعر نے ہمارے اجتماعی حافظے کو بیدار کیا ہے اور توقع کی ہے کہ قاری ان سے وابستہ کہانیوں اور اس کے معنی سے واقف ہے لیکن پرانے زمانے اور نئے زمانے کے تضادات اساطیر کے سیاق سے ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ جیسے شعر نمبر (٦) کو دیکھیے جس میں ہابیل قابیل کا ذکر ہے۔ ہابیل نے قابیل کو انسانی تاریخ میں بلکہ اسلامی اساطیر میں پہلی بار انسان کے ذریعے انسان کو قتل کیے جانے کی مثال پیش کی تھی۔اس سیاق میں موجودہ ہم عصر انسانوں کے اندر بھی ایک رنگ کے آنے اور دوسرے رنگ کے جانے نیز اس کے اندر نت نئی تبدیلیوں کا مژدہ سناتے ہوئے ہابیل اور قابیل کی مثال کو سامنے رکھا گیا ہے۔ کہنے کی سعی یہ کی گئی ہے کہ انسان کے لاشعور میں بدی اور نیکی یا Killing Instincst یعنی مارنے کی جبلت، گناہ کرنے کی

جبلت کھدی ہوئی ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ اساطیر سے متعلق تمام اشعار پر کھل کر گفتگو کی جائے لیکن طوالت کا خوف طاری ہوگیا ہے۔ البتہ ایک غلط فہمی کا ازالہ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ گوپی چند نارنگ نے بڑی خوب صورتی سے مظفر حنفی کی شعری کائنات میں فنی چابک دستی سے ابھارے گئے اساطیری استعاروں کی طرف قاری کی توجہ مبذول کرائی تھی۔ انھوں نے مظفر حنفی کی شاعری سے بہت سی مثالیں پیش کرتے ہوئے اس کی توضیح وتشریح پیش کی ہے۔ عشرت ظفر اپنے مضمون بعنوان 'سنگ زار غزل کا کوہ کن: مظفر حنفی' میں لکھتے ہیں:

> ''مجھے گوپی چند نارنگ کے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے کہ اسلام نے اساطیری بیان یا واقعات پر یا ان کے مطالعہ پر کوئی قدغن لگا رکھی ہے، ایسا کچھ نہیں ہے ہاں اسلام کا چوں کہ اساطیر سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے صنمیاتی واقعات کو یا مائتھولوجی کو جز و ایمان نہیں بنایا جاسکتا کیوں کہ اس سے شرک کے پہلو برآمد ہوتے ہیں......انبیا علیہم السلام کے واقعات اسطور نہیں، فرضی نہیں، من گھڑت نہیں وہ سب حقائق پر مبنی ہیں، کچھ دنوں پہلے اردو کے ایک بڑے نقاد نے ایک کتاب پر رائے دیتے ہوئے 'اسلامی اساطیر' کی اصطلاح وضع کی تھی، جو قطعی مہمل تھی۔'' (۱۱)

پہلی بات تو یہ کہی جاسکتی ہے کہ اگر اساطیر مہمل ہے، غیر شرعی ہے تو مظفر حنفی کی ہی غزل میں اگر اس کی کارفرمائیاں نظر آرہی ہیں تو موصوف کا اس ذیل میں کیا خیال ہے؟ ان کا کلام بھی کہیں مہمل تو نہیں ہوگیا؟ اسلام میں اساطیر الاولین کو خرافات کس سیاق میں کہا گیا ہے۔ ذرا کسی اچھے مولانا سے عشرت ظفر دوبارہ پوچھیں۔ آدم اور حوا سے متعلق جو کچھ بھی کہا گیا ہے وہ تاریخ نہیں ہے عقیدہ ہے۔ کیا دنیا کے سارے لوگ جو مسلمان نہیں ہیں ان کو ڈنڈے کے زور پر اسے اور اسلام کے دیگر واقعات کو سورج آسا حقیقت کے طور پر پیش کرتے ہوئے سب کو اس پر ایمان لانے کے لیے ہم مجبور کر سکتے ہیں؟ عقیدہ اور اساطیر مترادف الفاظ ہیں نیز اساطیر برابر ادب بھی ہے۔ کس نے کہہ دیا ہے کہ اساطیر کو قرار واقعی سمجھ کر اسے پڑھا جائے۔ جس طرح ادب کے کردار فرضی ہوتے ہیں لیکن سچ سے بھی زیادہ سچے اور متاثر کن نظر آتے ہیں ان کے بارے میں موصوف کا کیا خیال ہے؟ ہوری کہاں ہے؟ شاید ہر جگہ گاؤں میں لیکن ثبوت کے طور پر کہیں نہیں۔ انھیں ایک بار اکبر ایس احمد کی کتاب 'پوسٹ موڈرنزم اینڈ اسلام' ضرور پڑھنا چاہیے جہاں انھوں نے اسلامی اساطیر کو مذہب کی رو سے ایک اہم ڈسکورس کے طور پر پیش کیا ہے۔ ہم سادہ لوح ناقدوں کو یہ خبر ہی نہیں کہ اساطیر ایک زبان ہے۔ وہ زبان جو تہذیب کے آغاز میں ہمارے پرکھوں نے ایجاد کی تھی۔ جو آج ہمارا محاورہ بن چکا ہے۔ اگر اساطیر مہمل ہے تو آج سے ہی عشرت ظفر گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے، دو بھائیوں کے پیار کو دیکھ کر رام لکشمن کی جوڑی وغیرہ جیسی اور بھی کہاوتیں اور محاورے ہیں ان کا استعمال کرنا بند کردیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسے محاوروں کی بڑی تعداد ہے جن کا

استعمال مظفر حنفی صاحب نے بڑی خوب صورتی سے اپنی غزل کے اشعار میں کیا ہے۔ذرا یہ شعر دیکھیے ؎

یہ بتلا دوں اس بستی میں الٹی گنگا بہتی ہے
اب دھولو، بہتی گنگا میں ہاتھ اگر دھو سکتے ہو

ذروں نے آسمان کو سر پر بٹھا لیا
صحرا میں ایڑیاں جو رگڑنے لگی ہوا

ٹھانی کہ خاک بن کے صحیح جائیں گے وہاں
اب خاک ہو گئے تو ہوا لے چلی کدھر

سارا خون نچوڑو تب ہو خواہش کی تکمیل
نو من تیل جٹا سکتے ہو ناچے گی رادھا

ان مثالوں سے قطع نظر اساطیر سے متعلق اشعار میں بھی اساطیری کہانیوں پر مبنی محاورے استعمال کیے گئے ہیں جیسے مذکورہ بالا محاوروں اور کہاوتوں پر مبنی پہلے شعر میں گنگا میں ہاتھ دھونے کا ذکر ہے اور الٹی گنگا کے بہنے کا ذکر ہے جس سے متعلق ایک طویل اساطیری اور لوک کہانی زبانی بیانیہ کے طور پر موجود ہے۔دوسرے شعر میں ہوا کو ایڑیاں رگڑتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔یہ از خود اساطیر گڑھنے کی ایک عمدہ مثال ہے۔حالاں کہ یہ سارا کچھ حقیقت پر مبنی نہیں ایک استعاراتی زبان ہے جس کے ذریعے ہم اپنے عصر کی نیز بعض انسانی صورت حال کی تفہیم کرتے ہیں۔جیسے کہ اسی شعر میں کہ جس میں ہوا کا ذکر ہے کہا یہ گیا ہے کہ ہر تخریب میں تعمیر کا پہلو مضمر ہے۔ہوا آندھی بن کر جہاں بہت کچھ تباہ کر دیتی ہے تو وہیں ذروں کو آسماں پر بھی پہنچا دیتی ہے۔گویا کہ اساطیر ایک زبان ہے جو ہمیشہ ہم عصر زبان کے لیے یا ادب کے لیے ایک ایسے مواد کے روپ میں ابھرتی ہے کہ جو خود کی ردتشکیل کے ذریعے عوامی حافظے کا موضوع بنتی چلی جاتی ہے۔مظفر حنفی کے شعروں میں اساطیر خلق کرنے اور اساطیری استعاریت کے ذریعے عصری تضادات کو ابھارنے نیز ان پر طنز کے تیر برسانے کا کام لیا گیا ہے اور اس میں وہ اپنے ہم عصروں سے بہت آگے ہیں۔

یہی حال آج کی ثقافتی صورت حال کی تفہیم کا ہے۔انھوں نے عموماً موجودہ ثقافتی وتمدنی ترقیوں کو فطرت سے بہت دور پایا ہے۔ثقافتی تغیرات اور ثقافتی اضافیت نیز ثقافتی انتشار ان کے شعروں کے مضامین اکثر بنتے نظر آتے ہیں۔مثلاً پہلے شعر میں عام آدمی جو تہذیب وثقافت کی دہائی زیادہ دیتا ہے، کے گھر غریبی میں مہمان کے آنے کی اطلاع دی گئی ہے اور سبھی جانتے ہیں کہ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے تہذیب کرواتی ہے۔دوسرے شعر میں جڑوں کی تلاش اور تہذیبی جڑوں سے بچھڑنے کے انجام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔بات بھی صحیح ہے کہ زندگی ہو یا ادب دونوں کا سرچشمہ ثقافت ہے۔تیسرے شعر میں ضرورت سے زیادہ تکنیکی ترقی کے ذریعے خلق کردہ ثقافت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔مثال تیزی سے آتی ہوئی ایک موٹر کار اور جنگل میں حد نگاہ تک نظر آتی پگڈنڈی کی دی گئی ہے جو موٹر کو دیکھ کر غار میں چلی جاتی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ ہم کوئی اساطیری کہانی سن رہے ہیں لیکن اشارہ اس جانب ہے کہ بے ہنگم ثقافتی ترقیوں نے فطرت کو زیر زمین چلے جانے پر مجبور کر دیا ہے۔آج کے ماحولیاتی نقاد موجودہ ثقافتی ترقی کے پیش نظر مایوسی کے عالم میں یہ تک کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں:

There is no nature in our world اور Nature is a Myth پانچویں شعر پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔مظفر حنفی اپنے عصر کی خطرناکیوں سے کس قدر واقف فن کار نظر آتے ہیں ہم عصر دنیا میں گلوبلائزیشن نے تکثیریت کو ختم کرنے کی ٹھان رکھی ہے۔ہر شہر اور وہاں کے بازار، لوگوں کی پوشاک، کھانا پینا وغیرہ انتہائی یکسانیت کا شکار ہو چکا ہے۔ایک ہی طرح کے حد نظر تک مکانات، پانچویں شعر کا راوی اس یکسانیت سے بور ہو چکا ہے۔اسے ایسا گھر چاہیے جو اس کا گھر نہ لگے، ایسا اس لیے کہ اس کے گھر جیسے لاکھوں گھر شہر میں موجود ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مظفر حنفی کی شاعری میں ایسے نادر مضمون دوسروں کے مقابلے کہیں زیادہ نظر آتے ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی شاعری کا ثقافتی مطالعات کے غیر روایتی اصولوں کے تحت مطالعہ کیا جائے۔''

آپ نے ان اشعار میں گاؤں اور شہروں کا تقابل بھی ملاحظہ فرمایا ہوگا جو آج کا ایک اہم ثقافتی ڈسکورس بن چکا ہے۔مابعد جدید شاعری میں اکثر شعرا آگ کی گرمی سے پلاسٹک کی طرح پھیلتے ہوئے شہر سے نفریں ہو چکے ہیں اور گاؤں کے ختم ہوتے چلے جانے کے خوف سے لرزاں نظر آتے ہیں۔ہم عصر شاعری کا شعری کردار گاؤں کی طرف لوٹ جانے کی تمنا رکھتا ہے۔

اس ضمن میں مظفر حنفی نے کثرت سے اشعار کہے ہیں۔یہ ان کی شاعری کا ایک اہم مضمون معلوم ہوتا ہے۔چند اشعار اسی نوعیت کے پیش خدمت ہیں کہ جس میں دیسی ثقافت، اور مقامیت پر زور دیتے ہوئے ایک طرح سے ایسی ثقافت کی طرف ذہن کو راجع کیا گیا ہے جہاں فطرت سے چھیڑ چھاڑ نہیں کی گئی ہو ؎

شام سے نازل ہے بستی پر صفائی کی وبا
ہم اٹھائے جائیں گے فٹ پاتھ سے بستر سمیت

جو فرد جس جگہ بھی ہے ٹوٹا ہوا سا ہے
تہذیب آئی ہے تو قبیلے نہیں رہے

کس جگہ رہیے کہاں دن کاٹیے، کیا کیجیے
گاؤں میں کیچڑ بہت ہے، شہر میں کم ہے ہوا

بخشیے مجھ کو، یہ پگڈنڈی غنیمت ہے مجھے
شاہراہوں پہ چلوں گا تو کچل جاؤں گا

مبتلا ہے شہر پھر آسیب میں
سبز پتے لاؤ میرے گاؤں کے

شہر کا زہر مشینوں کا اثر ٹوٹ گیا
جسم سے کھیت کی مٹی جو ذرا لپٹی ہے

مظفر حنفی کے شعری مجموعوں میں ردیف اور قافیے کی چسپیدگی کی بلاغت بھی مطالعے کا موضوع بن سکتی ہے۔اس سے قطع نظر ان کی غزلوں میں ایک اور جہت ردیفوں کی کچھ اس طرح استعمال سے پیدا ہوئی ہے کہ بیشتر غزلیں نظم کا سا تاثر فراہم کرتی ہیں جسے ہم راستہ نامہ، چپ نامہ، دنیا نامہ، آنکھ نامہ، معافی نامہ، بادل نامہ، غزل نامہ، چیخ نامہ، دھواں نامہ، پانی نامہ، فریب نامہ، سایہ نامہ، شب نامہ، خاموشی نامہ، پنچھی نامہ، چراغ نامہ،

سمندر نامہ، آوارگی نامہ، زنجیر نامہ......اور 'شہر نامہ' کے بطور پڑھ سکتے ہیں۔ شہر نامے کے دو شعر ملاحظہ فرمائیں:

آیا ہے تار گاؤں میں لے کر جواب شہر پتے سی کانپتی ہوئی بوڑھی شفیق ماں

رکشہ چلا رہا ہوں ابھی کل کی بات ہے شانے پہ ہل کا بوجھ تھا آنکھوں میں خواب شہر

قصبے کی آبرو تھے مظفر میاں کبھی مسحور کر چکا ہے انھیں بھی سراب شہر

شہر اور گاؤں کے تقابل کے واضح مضمون پر مبنی مذکورہ بالا اشعار کی تہ نشیں ساخت میں دراصل مقامیت اور آفاقیت نیز فطرت اور ثقافت کے مناقشے اور موازنے کے معنی بھی موجود ہیں۔ مثلاً شہر نامے میں مقطع کے شعر نمبر (۳) میں مظفر میاں بعینہٖ وہی مظفر میاں نہیں بلکہ ہر وہ آدمی ہے جو شہر آ کر اس کی بھیڑ میں اپنے گاؤں کی آبرو اور خود اپنی شناخت سے محروم ہو چکا ہے۔ شعر نمبر (۲) میں دیکھیے ہل چلانے والے کسان آخر شہر میں رکشہ چلانے پر کیوں مجبور ہوئے ہیں؟ گاؤں میں ماں بیٹے سے نہیں بس اس کے شہر سے آنے والے تار کو پڑھ کر اپنے دل کو تسلی دے لیتی ہے۔ ان جملہ عوامل کے پیچھے ہمارے موجودہ اقتصادی نظام کا ڈھانچہ ہے یا سرکاروں کی پالیسیاں ہیں جو اب تک گاؤں کی ترقی کے سلسلے میں دوہرے کردار کا ثبوت دیتی آئی ہیں۔ شہر نامے سے پہلے گاؤں اور شہر کے تقابل پر مبنی اشعار میں متکلم شہر سے نفریں ہے۔ یہ ایک ایسا آدمی ہے جسے شہر نے پوری طرح سے نچوڑ لیا ہے اور جسے رہ رہ کر گاؤں کی معصومیت، دیسی پن اور وہاں کی البیلی معصوم فطرت کی یاد آتی ہے اور وہ من مسوس کر رہ جاتا ہے۔ یہ اشعار کہانی کی طرح بہت کچھ کہتے نظر آتے ہیں جسے صاحب ذوق قاری پڑھ کر اگر وہ گاؤں کا رہنے والا ہے تو گاؤں کی ان پگڈنڈیوں کو یاد کرنے لگتا ہے جس پر چلتے ہوئے اس کے ساتھ ہزار ہا لہلہاتے ہوئے پودے، قریب سے اڑ کر گزرتے ہوئے پنچھی اور ہوا میں جھومتے ہوئے پودے اس کے دامن سے لپٹ کر اس کا حال چال پوچھتے تھے۔ یہ سب کچھ وسیع وعریض شہر کی چوڑی شاہراہوں پر چلتے ہوئے متکلم کو یاد آتا ہے جہاں ہر لمحہ کچل جانے کا خوف ذہن میں طاری رہتا ہے۔ مظفر حنفی نے ثقافتی ڈسکورس کو پیش کرنے میں ہمیشہ گاؤں کی معصومیت اور وہاں کی مٹی کی سوندھی خوشبو یعنی فطرت کی موت کا ماتم کیا ہے۔ دوسری طرف ان کے یہاں اقلیتی طبقے کا ایک دبا کچلا کردار بھی یکلخت سامنے آتا ہے۔ انھوں نے اپنے اشعار میں جا بجا چند مخصوص الفاظ کا استعمال کیا ہے ان میں سے ایک لفظ 'جگنو' ہے تو دوسرا 'ہاتھ' اور تیسرا لفظ 'میاں' ہے۔ اس لفظ کا استعمال مختلف سیاق وسباق میں ہوا ہے مثلاً مسلم معاشرے میں اپنے شوہر کو عورتیں عموماً میاں کہہ کر مخاطب کرتی ہیں۔ مسلم معاشرے کے کسی برگزیدہ شخص کو بھی 'میاں' کہا جاتا ہے۔ بڑے اپنے چھوٹوں کو بھی 'میاں' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں لیکن آزادی کے بعد اور اس سے ذرا کچھ پہلے یہ لفظ 'میاں' قدرے سیاسی رنگ میں بھی استعمال کیا جانے لگا۔ اس لفظ پر فرقہ واریت کی موٹی تہ ان ہندوؤں نے جما دی جو مسلمانوں کو 'میاں' کہہ کر مخاطب کرنے لگے۔ اس لفظ میں انھوں نے ایک خاص نوع کی نفرت بھر دی جس کے ذمہ دار مسلمان بھی

تھے۔ مظفر حنفی نے اس لفظ کا استعمال اکثر مقام پر تمثیلی پیرائے میں بھی کیا ہے جس سے شعر میں غضب کا انوکھا پن اور نیا پن قاری محسوس کرتا ہے۔ جیسے ؎

تھوڑی سی روشنی ہے اسے جو بھی لوٹ لے جگنو میاں کے پاس خزانہ تو ہے نہیں

تم اپنے سر تو سہرا، میرے سر الزام رکھتے ہو کہاں کے رہنے والے ہو میاں کیا نام رکھتے ہو

روشنی کے تو میاں چند ہی سرچشمے ہیں وہ کہیں نوک قلم شاخ پلک پر ہوگی

میاں کیا لازمی تھا خاک اڑانا کسی کو راستہ دینے سے پہلے

ہزاروں میں سے کچھ شمعیں بجھا دی جائیں تو کیا ہے میاں جی روشنی کا اس طرف سے بھی تقاضا ہے

ان اشعار کے علاوہ وہ خود کو صاحب کہنے کے علاوہ کسی قدر، یا کسی غیر شخص کو صاحب کا جب لقب دیتے ہیں تو شعر میں جیسے جان پڑ جاتی ہے۔ جیسے ؎

اس بی بی کا نام وفا تھا حضرت عشق فدا تھے جس پر
حضرت نے ہجرت فرمائی، بی بی نے پردہ فرمایا

پھڑ پھڑاتا تھا پرندہ سارگوں کے جال میں شعر صاحب آپ ہیں، میں بھی کہوں کوئی تو ہے

ڈھول پیٹیں گے حضرت اخلاق ناچ گھر میں حیا مٹکتی ہے

ان اشعار کو پڑھتے ہوئے ہم جس نوع کے طنز سے دوچار ہوتے ہیں اس کے عقب میں خاص نوع کے ثقافتی مدخولات کو تمثیلی پیرایہ عطا کرنا ہے جیسے حضرت اخلاق، میاں جی، میاں، بی بی وفا، حضرت عشق اور شعر صاحب وغیرہ۔ ان تمثیلی پیرایوں کے ذریعے انھوں نے طنز کی کاٹ کو مزاح پیدا کرتے ہوئے کم کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان اشعار کو پڑھتے ہوئے خفیف سی مسکراہٹ ہونٹوں پر پھیل جاتی ہے۔ ثقافت کی ان گہری بحثوں کی تہ میں دراصل ان کی شاعری سے ایک ایسا کردار آہستہ آہستہ تخلیقی سطح پر ابھرتا ہے جسے طبقۂ اشرافیہ کے چونچلے بالکل نہیں بھاتے۔ وہ دراصل عام آدمی کا ایک چہرہ ہے جس کی اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہیں اور جو اپنے ہاتھوں سے اپنی ایک دنیا تعمیر کرنے کی سعی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں 'ہاتھ' ایک کوڈ کے طور پر سینکڑوں اشعار میں پیش کیا گیا ہے نیز ان کے ایک مجموعے کا سرنامہ بھی اسی حوالے سے ہے یعنی 'ہاتھ اوپر کیے' سے عام آدمی کی جو تصویریں سامنے آتی ہیں، ان کے دو روپ ہیں۔ ایک وہ 'ہاتھ' جو دعا کے لیے اٹھے ہوں اور دوسرا وہ 'ہاتھ' جو بے چارگی میں اپنی جان کی حفاظت کے لیے خود سپرگی کے طور پر اٹھانے پر مجبور کیا گیا ہو۔ اکیسویں صدی میں عام آدمی اپنی زندگی اسی طور گزار رہا ہے۔ طوالت کے خوف سے چند ہی اشعار اس ذیل میں ملاحظہ فرمائیں ؎

شہکار کی تکمیل پہ کاٹے گئے بازو کیسا میرے ہاتھوں پہ ہنر ختم ہوا ہے

اے خلا میں ناچنے والے ستارو چھپ رہو آچکا ہے ایٹمی چابک مشینی ہاتھ میں

پھول برسائیں مرے دوست کہ پتھر برسائیں
میں نے ہاتھ اپنے اٹھا رکھے ہیں اوپر کی طرف

سیلابوں کو شہہ دینے میں طوفانوں کو اکسانے میں
کتنے ہاتھوں کی سازش ہے اِک دیوار گرانے میں

بستر بھی جہنم کا نمونہ ہوگا ہمدرد ملے تو درد دونا ہوگا
بجلی کے کھلے تار کو چھونا ہوگا بے کاری کا یہ زخم یہ کھجلاتے ہاتھ

ہمیں لوح وقلم تقدیر نے بخشے تو ہیں لیکن ہمارا آب و دانہ لکھ دیا ہے چور ہاتھوں میں

ساتھ تو دینا پڑے گا وقت کی رفتار کا آنکھ مل کر آیئے یا ہاتھ مل کر آیئے

یہ ہاتھ رہے میرے، کام آئیں گے قاتل کے لے جاؤ میرا چہرہ، اخبار پہ رکھ لینا

مذکورہ بالا شعروں پر سرسری سی نگاہ ڈالنے والا بھی آسانی سے یہ سمجھ سکتا ہے کہ مظفر حنفی نے اپنے عہد کے ادبی فیشن جدیدیت سے خود کو بچاتے ہوئے ترقی پسند آئیڈیولوجی کی راست پیش کش سے بھی خود کو دور رکھا ہے۔ ترقی پسندوں نے 'ہاتھ' کے استعارے کو سیاسی معنی میں استعمال کیا اور اسے احتجاج کا نیز بطور مجاز مرسل 'ہاتھ' کہہ کر مزدور مراد لیا تھا۔ مظفر حنفی صاحب نے اس لفظ کا استعمال کھلے سیاق میں کیا ہے۔ نتیجتاً اس حوالے سے ہم عصر زندگی کے بہت سے تضادات اور مسائل سامنے آجاتے ہیں۔ 'ہاتھ' بطور کوڈ بیک وقت سیاسی، سماجی، اقتصادی، معاشرتی، ثقافتی اور عمومی جہت رکھتا ہے۔

مذکورہ بالا اشعار پر تفصیل سے بحث کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ مختصراً ان اشعار میں شاہکار کی تکمیل پر ہاتھ کے کاٹے جانے کا ذکر ہے اور ایٹمی چابک کا مشینی ہاتھ میں آنے، اپنے ہاتھ کو اوپر اٹھا لینے کا، ہاتھوں کی سازش کا اور بے کاری میں ہاتھ کے کھجلا لینے کا ذکر ہے جس سے ہندوستانی عقیدے کا اظہار ہوتا ہے اور تو اور ہاتھ ملنے کے محاورے کے ذریعے بے چارگی کی تصویر بھی کھینچی گئی ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ مظفر حنفی نے لفظوں کو آہستہ آہستہ استعارے اور استعارے سے علامت اور اس سے آگے بڑھ کر کیسے ایک نشانیاتی نظام کا کوڈ بنا دیا ہے۔ جس سے ان کے اشعار میں ندرت، معنی کی تہ داری اور طرفگیٔ خیال پیدا ہو جاتی ہے۔ دراصل انھوں نے اپنے اشعار میں استعاروں اور تشبیہوں کا غیر روایتی استعمال کیا ہے لیکن ان کی جملہ شاعری میں جس صنعت نے ان کے اشعار کو معنی آفریں بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے وہ مجاز مرسل کا وافر مقدار میں استعمال ہے۔ مابعد جدید متن میں اس صنعت نے نیچر اور کلچر کے جوڑ کو دکھانے اور ان کے درمیان کی دوری کو نشان زد کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ آیئے کچھ اشعار پر ایک نگاہ ڈالیں اور مظفر حنفی کے اشعار میں اس صنعت کی بلاغت کی

سطح کا اندازہ لگائیں۔ پہلے ایک حسن تعلیل ملاحظہ فرمائیں۔

ڈوب جاتا ہے یہاں تیرنا آتا ہے جسے وہ کبھی ناؤ تھی دریا لیے جاتا ہے جسے
زلزلہ اور کسے کہتے ہیں کیا پتہ جسم کے اندر کیا ہے

عام طور سے وہ ڈوبتا ہے جسے تیرنا نہیں آتا لیکن یہاں ڈوبنے کی وجہ تیرنے والے کی صفت بتائی گئی ہے جیسے 'کشتی' جو لوگوں کو ڈوبنے سے بچاتی ہے۔ حسن تعلیل کی مزید مثالوں سے قطع نظر مجاز مرسل کی کارفرمائیوں پر مبنی اشعار پیش خدمت ہیں۔

چھت نے آئینہ چمکانا چھوڑ دیا ہے کھڑکی نے بھی ہاتھ ہلانا چھوڑ دیا ہے
خوشبوئیں سر پیٹ رہی ہیں کھڑکی کھولو کھڑکی کھولو
چار سو ہمدرد موجیں پیٹتی پھرتی ہیں سر ناؤ سے پتوار غائب بادباں اترا ہوا
کوئی مجھے عقب سے آواز دے رہا تھا سائے کی جستجو میں دیوار چل رہی تھی
بستر پہ لیٹتے ہی تمہارے بدن کی سوچ پنجے کی طرح گر کے اٹھا لے گئی ہمیں
کھڑکیاں گود پسارے ہیں کہ آجاؤ نا! گیلری آنکھ دکھاتی ہے، کہاں جاتے ہو

اس سلسلے میں ایک رباعی ملاحظہ فرمایئے:

ٹوٹے ہوئے پر چھوڑ گیا ہے راہی جلتا ہوا گھر چھوڑ گیا ہے راہی
منزل پہ پہنچنا تھا اسے عجلت میں رستے میں یہ سر چھوڑ گیا ہے راہی

مذکورہ بالا اشعار نمبر ایک میں کھڑکی کہہ کر دراصل محبوب مراد لیا ہے۔ شعر نمبر دو میں خوشبوئیں سر نہیں پیٹ رہیں بلکہ برہن کے کھلے مہکتے گیسوں بے قرار ہو رہے ہیں۔ شعر نمبر تین میں موجیں نہیں ساحل پر آنے والے کے انتظار میں کھڑے لوگ سر پیٹ رہے ہیں۔ شعر نمبر چار میں دیوار نہیں گھر میں رہنے والے عزیز جیسے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ اسی طرح ہر شعر میں مجاز مرسل کی اس کیفیت سے ثقافت اور فطرت کے مابین کھڑے انسانوں کی مجبوریاں اور حسرتیں واضح ہو کر سامنے آجاتی ہیں۔ ان اشعار میں ایک دو اشعار ایسے بھی ہیں جنھیں ہم جنسیت اور متنیت یعنی Sexuality اور Textuality کے تصور کے تحت پڑھ سکتے ہیں۔ جیسے شعر نمبر پانچ میں جسم یا بدن یعنی محبوب کے ترشے ہوئے بدن نے عاشق کے ہوش و حواس جیسے چھین لیے ہیں۔ بستر پر دراز عاشق بستر پر کب ہے۔ وہ تو کہیں دور خلاؤں میں ہے۔ اس کیفیت کو مجاز مرسل کی صنعت نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ ذرا مصرعوں پر ایک بار اور غور کیجیے کہ ''بستر پہ لیٹتے ہی تمہارے بدن کی سوچ...... پنجے کی طرح گر کے اٹھا لے گئی ہمیں'' یہاں پنجے سے مراد عقاب ہے جو آن واحد میں چوزے کو آسمان میں لے اڑتا ہے۔ محبوب کے بدن کے تصور کو یہاں عقاب کا استعارہ بنایا گیا ہے۔ اس بلاغت کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔

اس نوع کے بہت سے اشعار ان کے جملہ مجموعوں میں ملتے ہیں، جنھیں ہم ہرگز خالص لذت پرست قسم کی لکھنوی شاعری سے کوسوں دور پاتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں ان کے نزدیک یہی جسم روح کا رقیب قرار پاتا ہے۔ ہندوستانی فکر وفلسفہ اور ویدانت کے تصور کے مطابق جسم ایک پنجرہ ہے جس نے روح کو قید کر رکھا ہے۔ لہٰذا جسم کا انہدام اس تصور کے مطابق عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ مظفر حنفی نے ہندوستانی فکر وفلسفہ اور صدیوں سے چلی آرہی متصوفانہ روایات سے بڑی خوب صورتی سے خود کو جوڑے رکھا ہے اور ہمیں تہذیبی تسلسل کا احساس دلایا ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ فرمایئے کہ جس میں جسم کو منہدم کرنے اور روح کی آزادی کے گیت گائے گئے ہیں ساتھ ہی کچھ اشعار ایسے بھی ملاحظہ فرمائیں جس میں عشق کے اس رنگ کو بڑی فن کاری کے ساتھ ابھارا گیا ہے جسے عشق کا تہذیبی اور تخلیقی رنگ کہا جاتا ہے۔ پہلے جسم اور روح کی کشاکش کا نظارہ کیجیے۔

ان منزلوں میں ہوں کہ جہاں موت کا خیال
گرمی میں سایہ دار شجر کی طرح لگا

گھبرا کے نکل آئے جو زندان بدن سے
اخباروں میں چھپنے لگی تصویر ہماری

عمر بھر جسم کے فانوس میں رہنا ہوگا
اور اندر کے تھپیڑوں کو بھی سہنا ہوگا

لگی ہے آگ جو اندر اسے ہوا دوں گا
میں ایک روز یہ دیوار جسم ڈھادوں گا

دھڑ ہمارا خواہشوں کی آگ میں ہے
سر ہے نیزے پر شہید کربلا سا

تنکے جیسا بدن بنا کر
ایک آندھی سی بھر دی اندر

قارئین ان اشعار کو پڑھ کر یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ اشعار اپنے اندر کیسی گہری معنویت رکھتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ اشعار جسم وروح کی کشاکش کے علاوہ انسان کے اندر جو ایک گہرا اور مستقبل کا انسان چھپا ہوا ہے نیز اس کے اندر جو تمنائیں مچل رہی ہیں یا جس قسم کی آزادی کا خواب وہ دیکھتا رہا ہے اس راہ میں جسم یا بدن ایک استعارہ قرار پاتا ہے ان جملہ رکاوٹوں کا جو انسان کو اس کی اصل تک پہنچنے نہیں دیتے۔ شاعری اسی لیے ایک ایسی آرزو کا نام ہے جسے نہ لکھنے والا ٹھیک سے بیان کر پاتا ہے، نہ پڑھنے والا اس کے حتمی معنی تک پہنچ پاتا ہے۔ شعر نمبر تین میں کچھ اسی نوع کا خیال قلم بند ہوا ہے۔ اس حوالے سے مزید گفتگو ہو سکتی ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ مظفر حنفی نے اسی لیے اپنے اشعار میں تہذیب عاشقی کے فروغ کے لیے عشق کے اس رنگ پر زیادہ توجہ دی ہے جو ہمارے قدما کا شعری مزاج رہا ہے۔ مثلاً کچھ اشعار عشقیہ رنگ کے ملاحظہ فرمائیں۔

کہتی ہے ڈائری کہ ابھی کل ملے تھے ہم
احساس مجھ کو یہ کہ ہزاروں جنم ہوئے

بس وہ ہے انجمن میں کوئی دوسرا نہیں
سورج کی روشنی میں ستارے بھی ضم ہوئے

اس جفا پیشہ کی یاد آئی نہ زخم دل ہنسے
خود بخود سیلاب سا کیوں چشم تر میں آگیا

تِری محفل سے اچھا ہے مِرا وحشت کدہ جس میں
جدھر آواز دیتا ہوں وہیں سے تو نکلتا ہے

سنا تم نے کہ دنیا کے بجھائے سے نہیں بجھتی
لگی ہے آگ ایسی خرمن یک دانۂ دل میں

تِرے سوا کوئی جب میرے دل کو چھیڑتا ہے
عجیب ساز ہے آواز ہی نہیں دیتا

گھما پھرا کر اسی کی باتوں سے ہوگئے شعر
اسے تصور میں لائے سرشار ہوگئے ہم

یاد بس اتنا رہا ہے شہد جیسے چھن رہا ہو
ہونٹ جھلمل جگنوؤں سے گفتگو چمکار جیسی

کوئی خدمت میرے لائق، کیوں اتنے مغموم ہیں آپ
پھیکے پھیکے چاند سے پوچھا ایک نکلتے سورج نے

آتے جاتے ہر دم ٹوکا کرتے تھے کھڑکی دروازے
جھلا کر آزاد ہوا نے توڑ دیے کھڑکی دروازے

آنکھیں ہر ایک عضو بدن پر اگی رہیں
جب تک نہ یہ عنایت جلوہ تمام ہو

قصہ یہ ہے اک شیشہ تھا اک پتھر تھا پھر کیا تھا
اس نے مجھ کو، میں نے اس کو، چھو کر دیکھا پھر کیا تھا

ٹوٹی ہوئی چوڑی کی مزے دار کہانی
خوابیدہ گھڑی جاگ پڑی آنکھ مسل کر

مذکورہ بالا اشعار میں دل کو عجیب ساز قرار دینا، ہونٹ کو جھلمل جگنوؤں جیسا بتانا، اداس محبوب کو پھیکے پھیکے چاند کے استعارے میں محسوس کرانا، آزاد ہوا، استعاراتی انداز میں عاشق اور معشوق کا قصہ کہنا یعنی ایک شیشہ تھا ایک پتھر تھا اور پھر ٹوٹی ہوئی چوڑی کی مزیدار کہانی جیسے مصرعے کا تلازماتی اثر قاری پر مرتب ہونا نیز خوابیدہ گھڑی کا آنکھ مسل کر جاگ پڑنا وغیرہ ایسے بلیغ حسی، عقلی، نوری اور بصری پیکر ہیں جو شعروں میں معنی کے شرارے بھر دیتے ہیں۔ میں ان شعروں میں سے صرف ایک شعر پر آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہوں گا یعنی شعر نمبر دو کہ جس میں کہا گیا ہے ''کہ بس وہ ہے انجمن میں کوئی دوسرا نہیں'' اور دوسرے مصرعہ میں کہا گیا ہے کہ ''سورج کی روشنی میں ستارے بھی ضم ہوئے'' بظاہر شعر بڑا آسان معلوم ہوتا ہے، یہ 'وہ' کی ضمیر انتہائی معنی خیز ہے۔ فلسفے میں 'وہ' ایک پراسرار شے یا انسان یا معروض کا نام ہے۔ واحد غائب 'وہ' یہاں محبوب مجازی بھی ہے اور حقیقی بھی۔ حقیقت ومجاز کی آنکھ مچولی شعر کے اندر معنی کی لہریں پیدا کرتا ہے۔ 'کوئی دوسرا نہیں' ہمیں کلمہ کی یاد دلاتا ہے۔ بس وہی ہے اور کچھ نہیں، ویدانت کی طرف بھی ذہن کو لے جاتا ہے۔ کمال یہ ہے کہ دوسرے مصرعہ یعنی دلیل کے مصرعہ میں شاعر نے مروجہ فلسفے کو اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی ہے۔ یہ جو دوسرا ہے وہ ویدانت میں کچھ بھی نہیں ہے لیکن یہاں سورج کے سامنے وہ ستارہ ہے۔ کہنے کو سورج کے سامنے ستارے گم ہو جاتے ہیں لیکن حقیقتاً ایسا ہوتا نہیں، وہ موجود رہتے ہیں نظر نہیں آتے۔ لہٰذا شعر میں ایک قرینہ ان فلسفوں سے الگ شہود کا پیدا ہوتا ہے کہ معشوق سب کچھ نہیں، عاشق کی بھی اپنی ایک حیثیت ہے اور یہ بات ان کے عشقیہ مجاز کی شاعری میں مرکزی مضمون کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں اس نوع کے دیگر مذکورہ اشعار پر کچھ بھی کہنے کے حق میں نہیں ہوں اور آپ کے ذہن پر مزید بار ڈالنا نہیں چاہتا۔ یہ وہ اشعار ہیں جن کو پڑھ کر خموشی میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مظفر حنفی نے اپنی شاعری میں ہمارے زمانے کو یعنی اکیسویں صدی کو کچھ اس طرح سے پیش کیا ہے کہ ہم ان کی شاعری کو

اپنے عہد کے زندہ سوالوں سے جوڑ کر زندگی کی راہوں میں پھیلے اندھیروں سے نباہ کرنے کا ہنر حاصل کر سکتے ہیں۔ان کی شاعری واقعتاً رواں صدی کا ایک ایسا دل فگار رزمیہ ہے جس سے آنے والے عہد میں بھی قارئین روشنی حاصل کر سکیں گے۔مظفر حنفی ہمارے عہد کی شاعری میں ایک ایسا نام ہے جسے بھلانا ناممکن ہوگا۔اخیر میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ مظفر حنفی اردو کی غزلیہ روایت کی ایک اہم اور منفرد رنگ کی شاعری کا قابل قدر نشان بن چکے ہیں۔

مظفرؔ سرنگوں ہیں آبشاروں کی طرح لیکن　　　بگولہ داستاں گو ہے ہماری سر بلندی کا

○○○

نوٹ: مضمون ہٰذا میں جتنے اشعار مختلف حوالوں کے لیے کوٹ کیے گئے ہیں ان میں سے بیشتر اشعار مظفر حنفی کی منتخب کلیات غزل 'پرچم گرد باد' (۲۰۰۲) مکتبہ جدید، دریا گنج، نئی دہلی، سے ماخوذ ہیں۔اس کلیات میں 'پانی کی زبان' (۱۹۷۳)، 'تیکھی غزلیں' (۱۹۶۸)، 'صریر خامہ' (۱۹۶۹)، 'دیپک راگ' (۱۹۷۴)، 'طلسم حرف'، 'یم بہ یم' (۱۹۷۹)، 'کھل جا سم سم' (۱۹۸۱) اور 'پردہ سخن کا' (۱۹۸۶) کی غزلیں شامل ہیں۔

حوالہ جات:

(۱) انتساب، مظفر حنفی شخصیت وفن، شمارہ ۷۷، گفتگو، ڈاکٹر سیفی سرونجی، محمد توفیق، انل اگروال، ص ۵۱
(۲) ایضاً، ص ۵۷
(۳) ایضاً، ص ۴۶
(۴) ایضاً، مضمون: سنگ زار غزل کا کوہ کن: مظفر حنفی، عشرت ظفر، ص ۱۸۹
(۵) ایضاً، مضمون: جدید غزل کا ایک اہم نام، ص ۲۰۲
(۶) ایضاً، مضمون: مظفر حنفی: جدید غزل کا اہم نام، ص ۲۰۲
(۷) ایضاً، مضمون: امام طنزیات: مظفر حنفی، ص ۲۰۶
(۸) ایضاً، تبصرہ: صریر خامہ تلاش وتجزیہ، محمود ہاشمی، ص ۲۸۳
(۹) ایضاً، مضمون: سمندر کو آداب کرتے رہو، پروفیسر آل احمد سرور، ص ۱۰۴
(۱۰) ایضاً، مضمون: بوند بھر اجالا ڈاکٹر وزیر آغا، ص ۱۱۱
(۱۱) ایضاً، مضمون: سنگ زار غزل کا کوہ کن، مظفر حنفی، عشرت ظفر، ص ۱۸۷

○○○

پروفیسر مختار شمیم
سرونج

مظفر حنفی اور غزل کے آبگینے

صاحبو! میں ادب کا ایک معمولی طالب علم ہوں۔ پڑھنا لکھنا میرا ذوق اور شوق رہا ہے، لیکن زندگی کے بعض معاملات کی طرح میری فطرت میں بھی شامل ہے کہ کم گوئی اور کم سخنی کے ساتھ ساتھ قلم کے آداب اور تحریر کے سلسلے کو کبھی دراز نہ کر سکا۔ لاکھ کوشش کے باوجود میں اس میدانِ کارزار سے بچتا رہا۔ مجھے ان ادیبوں اور شاعروں پر ہمیشہ رشک آیا کہ ان کی جہتیں ہر فن میں آئے دن اپنی ذکاوت کا ثبوت دے رہی ہیں اور ان کا جوہر علمی ہر اعتبار سے اپنے مراحل کو طے کر رہا ہے۔ ہم تو بس! دل ہی دل میں ان کی مشاقی اور فضیلت پر آہ اور واہ کا وظیفہ دہراتے رہتے ہیں۔

جناب زمانہ اُسی کا ہے جس نے وقت کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔شعلۂ جوالہ وہی بن سکتا ہے جس نے ہواؤں سے لڑنا سیکھ لیا ہے ورنہ کسی چنگاری کو خاکستر بننے میں دیر کتنی لگتی ہے!

محترم مظفر حنفی ان شاعروں اور ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے زندگی کے ہر محاذ پر اپنی طرحدار شخصیت اور اپنے بانکپن کو محفوظ رکھا ہے۔ ادب کی کون سی ایسی جہت ہے، فن کی کون سی ایسی صورت ہے کہ جس میں انھوں نے اپنی مہارت کا ثبوت نہ دیا ہو۔ یہی سبب ہے کہ ان کی طرحداری اور شخصیت کے بانکپن نے شعر و ادب کے گلزاروں میں اپنے لہو کی مہک کو شامل کیا ہے تو ادب اور فن کی جہات انگڑائیاں لے کر مسکرا اُٹھی ہیں۔

افسانہ، ناول، ترجمہ، تنقید اور تحقیق سے لے کر شعر و سخن کی سنگلاخ چٹانوں کو انھوں نے اپنی فطانت اور ذہانت سے یوں پانی کر دکھایا ہے کہ باید و شاید ہی کوئی ان کی ہمسری کا دعوا پیش کر سکے۔

دیکھنا کیسے ہمکنے لگے سارے پتھر　　　میری وحشت کو تمہاری گلی پہچانتی ہے

غالباً اب سے پچاس برس پہلے مظفر حنفی سے میری پہلی ملاقات بھوپال میں واحد پریمی کے توسط سے ہوئی تھی۔ اس وقت میں حمیدیہ کالج میں زیر تعلیم تھا اور مظفر صاحب سیہور میں سرکاری ملازمت میں تھے۔ بھوپال میں مظفر حنفی کا ایک وسیع حلقہ تھا اور ان کی وہاں بڑی قدر و منزلت تھی (آج بھی ہے)۔ میری ناپختہ عمر

تھی اور مجھ پر یہ منکشف ہو چکا تھا کہ مظفر حنفی ادب میں عظمتوں کے مینار تعمیر کرنے میں مصروف ہیں۔ اسی لیے ہر ملاقات میں یا تو میری نظریں زمین میں گڑی ہوئی ہوتیں یا انھیں گردن اٹھا کر دیکھنے کی جرأت میں اپنی ٹوپی بھی نہ سنبھال پاتا۔ بہر حال جس دور کا ذکر ہو رہا ہے، اس دور میں بھی مظفر حنفی قابل صد احترام تھے اور آج بھی وہی صورت ہے۔ بسیار نویسی اگر چہ مجھ خاکم بدہن کے نزدیک کوئی خوبی نہیں، لیکن عجیب بات ہے کہ یہی چیز اس وقت خوبی کی دلیل بن جاتی ہے جب وہ ایک سطح سے بلند ہو کر اپنے معیار کا مظاہرہ بھی کرتی ہے۔ مظفر حنفی نہ صرف خوب لکھتے ہیں، ادب کی ہر صنف میں اپنا جوہر دکھاتے ہیں بلکہ اپنی ہر تخلیق کو شعور کی وہ رمق بخش دیتے ہیں کہ اس کے معیار اور وقار کی ضمانت کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔

اُسی زمانے (غالباً ٦٦۔٦٥ء) کا ایک واقعہ ہے، ماہنامہ 'آذر' بھوپال سے جاری ہوا تھا؟ شفاؔ گوالیاری اس پرچے کے نگراں اور سر پرست تھے اور ان کے ایک شاگرد واحد پریمی اس کے ادارہ میں شامل تھے۔ 'آذر' کا پہلا شمارہ ایڈٹ کرنے کے بعد میں نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ 'آذر' کے دوسرے یا تیسرے شمارہ میں مظفر حنفی کا ایک افسانہ 'کتّے' شائع ہوا تھا۔ افسانہ پر کسی صاحب کا ردِ عمل (اگلے شمارہ میں) سامنے آیا اور غالباً واحد پریمی نے اس کی در پردہ حمایت بھی کی، تو صاحب! مظفر حنفی بھڑک اٹھے۔ ان کا مختصر مگر کرارا جواب بھی چھاپا گیا۔ ان کے مراسلہ کا یہ شعر میرے ذہن میں چپک گیا، اس کے باوجود کہ میں مجرم ذہن نہیں تھا، اور نہ مجھے اس قضیہ سے کچھ لینا دینا تھا۔

مظفرؔ چور کی داڑھی میں تنکا دیکھنا ہو تو   ہمارا شعر مجرم ذہن پر اچھا چپکتا ہے

بات دراصل یہ ہے کہ مظفر حنفی کا مذکورہ شعر (یا مقطع) ان کی شعری افتاد کی بھرپور چغلی کھا رہا ہے اور یہی وہ طرز ہے جو اب بہر حال بہت شستہ اور مہذب انداز میں ان کے اسلوب کا طرۂ امتیاز بن گیا ہے۔ اساسِ شعر اسی حسّیت سے نمو پذیر ہے۔

سیلابوں کو شہ دینے میں طوفاں کو اکسانے میں   کتنے ہاتھوں کی سازش ہے اک دیوار گرانے میں
ہمیں بھی پیاس لگتی ہے ہمیں بھی سانس لینی ہے   سمندر پر تمہیں قابو، ہوا پر حکمراں تم ہو

سوال یہ ہے کہ مظفر حنفی کا اسلوب شعر اتنا کاٹ دار، اتنا نکیلا کیوں کر ہوا؟ ان کی ذکاوتِ حس اتنی برق یاب کیوں ہے؟ کیا شخصیت کی طرحداری میں اور شعر گوئی کی انفرادیت کی لپک میں کسی سوزشِ برق یا کسی شعوری کوشش کا دخل ہے؟ یا یہ کہ یہ شاعر کے مزاج ہی کا حصّہ ہے؟

تو سنیے! زمانہ کی سفاکیت ہی اس کی تنہا ذمہ دار نہیں ہے۔ یہ تو ان کے مزاج کے آتش زیر پا ہونے اور طبیعت کے برق رو ہونے کا باعث بھی ہے۔ پھر یہ کہ انھیں استاد بھی شادؔ عارفی جیسا جلا بھنا شخص ملا تھا جو بہر حال نالاں تھا اپنے عہد کے طور طریق سے اور ناشائستہ ادبی خدمت گاروں سے۔ مظفر حنفی سے آپ پوچھیں تو شاید وہ

بھی اپنے استاد کے فیض سخن کا اعتراف کریں۔ لیکن بات یہیں تک نہیں ہے۔ مجھ کم شعار کا خیال ہے کہ شاد عارفی سخن طرازی میں جس ہنر مندی کی تلاش میں تھے اور لپک لپک کر اس جگنو کی چمک کو اپنی گرفت میں لینا چاہتے تھے، حسنِ اتفاق کہ وہ ہنر مندی اور ہیروں کی تراش کی جیسی واردات، مظفر حنفی کی شاعرانہ فطرت میں حلول کر گئی اور سراپا روشنی بن گئی۔

مجھے نہیں معلوم کہ مظفر حنفی کی ادبی زندگی کا آغاز نثر سے ہوا کہ نظم سے۔ اگر وہ نثر سے نظم (شاعری) کی طرف آئے ہیں تو یقیناً فتح یاب آئے ہیں۔ بالفرض انھوں نے (جیسی کہ روایت ہے) ابتدا میں ہی غزل کی زلفوں میں پناہ لی تو اس میں حیرت کیا ہے کہ آج بھی وہ غزل کے ناموس کی حفاظت میں چاق و چوبند ہیں۔ صاحبان عالی شان اس جملۂ معترضہ سے میں گریز کرتا ہوں کہ 'ہر بوالہوس نے عشق پرستی شعار کی'۔ مظفر حنفی کا معاملہ غزل کے ساتھ بوالہوسی کا ہے نہ عشق پرستی کا۔ اصل میں مظفر حنفی نے اردو غزل کے آداب کا بہر طور لحاظ رکھا ہے اور اردو غزل نے مظفر حنفی کو بڑے احترام سے نوازا ہے۔ مظفر حنفی کا زود حس ہونا اور اس پر جودت ذہن کی کار فرمائی کہ پلکوں سے ریزہ ریزہ چن لینا، اس کارگہِ شیشہ گری سے بھی سوا نازک کام تھا، جسے غزل کا مزاج داں ہی ادا کر سکتا تھا۔ پُر گوئی کے باوجود وہ غزل کی ایمائیت کو ایقان کا درجہ دیتے ہیں۔

یقیناً غزل کا ہیئتی نظام موضوع کا پابند نہیں رہ سکتا لیکن مظفر حنفی کا فن اس مقام پر ہے کہ جہاں موضوع ان کی غزل میں پناہ لینے کے لیے تڑپتے ہیں، بیتاب نظر آتے ہیں کہ قاری یا سامع ان کی شاعرانہ اپج کے ساتھ ساتھ ان کی غزل کے فنی رچاؤ کی بے پناہی پر تحیر کے سوا اور کر بھی کیا سکتا ہے۔

بنے ہوئے ہیں فصیلِ نظر در و دیوار   ہر اک طرف در و دیوار پر در و دیوار
خبر نہ پھیلنے پائے کہ جا رہا ہے کوئی   نہیں تو سر پہ اٹھا لیں گے گھر در و دیوار
فصلیں آتے جاتے لشکر کاٹے گا   اپنے بھاگ پسینہ، مولا پانی دے
اونچا ہوا سر نیزہ بہ نیزہ   یاروں کا احسان لبیک لبیک

مذکورہ اشعار مظفر حنفی کی پرانی غزلوں سے ماخوذ ہیں، لیکن ایمان سے کہیے ان اشعار میں ردیف و قافیہ کی پابندیوں کے باوجود مضمون (موضوع) پانی سا بہتا نظر آ رہا ہے کہ نہیں۔

مظفر کے لہجہ نے ثابت کیا   غزل قافیوں کا پلندہ نہیں

لفظوں کی بندش اور روز مرّہ محاورے کی آرائش کا یہی عالم ان کی نئی غزلوں میں مزید نکھر کر سامنے آیا ہے۔

تھوڑا سا التفات میاں یار بادشاہ   دینے لگے ہیں زخم دھواں یار بادشاہ
ہے کون دستگیر مِرا آپ کے سوا؟   سیلاب میں ہے قریۂ جاں یار بادشاہ
پھول برسائیں مرے دوست کہ پتھر برسائیں   میں نے ہاتھ اپنے اٹھا رکھے ہیں اوپر کی طرف

درد کے رشتے عداوت سے بڑے ہیں | آئے کانٹے سے کوئی کانٹا نکالے!
جو آ کے دشت میں دیکھا تو دشت غائب ہے | وہ میرے گھر پہ نہ کرتا ہو انتظار مرا

واقعہ یہ ہے کہ مظفر حنفی نے غزل کی روایتوں کو اک نیا موڑ دیا ہے اور اس صنف کو انھوں نے اپنے تیکھے لہجے، نئے خیال اور درک سے آشنا کیا ہے۔ اپنے معاصرین میں شہریار، مخمور سعیدی، زبیر رضوی اور ندا فاضلی سے وہ انھیں اوصاف کی وجہ سے نمایاں ہیں کہ ان کے شعر کا خمیر انسانی ضمیر کی تہوں سے ابھرتا ہے اور کائنات کی وسعتوں کو رنگ آمیز بنا دیتا ہے۔ انھوں نے اپنی سخن طرازی کے بارے میں جو دعوا کیا ہے تو اس میں کیا شک ہے۔

لکھتا ہے مظفر روش عام سے ہٹ کر | شہرت اسے درکار نہ رسوائی کا غم ہے
نوٹ کر لیں مرا لہجہ نہ سمجھنے والے | کھردرا پن ہی مرے شعر کا گہنا ہوگا
اے مظفر مرے نقاد نہ مانیں لیکن | سینکڑوں رنگ مری طرزِ ادا سے نکلے

سبھی جانتے ہیں کہ مظفر حنفی کی بے قرار روح کسی ایک صنف کی اسیر ہو کر نہیں رہ سکتی لیکن صنفِ غزل کو وہ اپنے اعمال نامہ کے لیے غیب سے فردوس خیال کی بشارت کا ذریعہ سمجھتے ہیں، اور اسی لیے لفظوں کی ایک کائنات اپنی طلسماتی قوت کے ساتھ انھیں غزل ہی میں نظر آتی ہے۔

تاہم عجیب بات ہے کہ غزل کے سیمیا بازار میں ہزار ہا خوشنما، طوطیِ جلوۂ صد رنگ تو نظر آتے ہیں لیکن جب طلسم ٹوٹتا ہے اور وقت آئینہ دکھاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے بہت کم غزل گو شاعر اپنی قدر و قیمت کے ساتھ تاریخ ادب کا حصہ بن پاتے ہیں، ورنہ تو کئی خوشنما پرندے اپنی اپنی بولیاں بول کر آسمانوں کی اونچائیوں کی فکر میں انھیں پہنائیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ مظفر حنفی ان خوش نصیب غزل گو شعرا میں سے ہیں جن کے اشعار اپنی چمک دمک، اپنی قدر کے اجالوں کا خود احساس دلاتے ہیں اور اپنی بلندیوں کی خبر خود ہی دیتے ہیں۔

مظفر حنفی کی غزل سے وابستگی کا عالم یہ ہے کہ تحریکوں اور نظریوں کی روشنی بھی ان کے گہر ہائے آب دار کو متاثر نہ کر سکی۔ ان کی غزل کا سچا شعر سچا ہی رہا۔ اسے نہ تو وقتی جبلّتوں نے اور نہ ہی جذباتی کرشموں نے اپنا اسیر بنایا کیوں کہ وہ تو لا مکاں کی آزادانہ تلاش کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے کہ جس کی طرفگی میں شادابی و تازگی اور روشنی کے احساس کے ساتھ مشام جاں میں خوشبو بن کر باقی رہنے کی قدرت تا حیات موجود رہے گی۔

○○○

ڈاکٹر محمد کلیم ضیا
راول نگر، تھانے، مہاراشٹر، رابطہ نمبر: 9892933626

غزل میں دنیا داری اور پنچایتی رنگ کا شاعر: مظفر حنفی

زمانہ سمجھا مجھے انتہا نگارش کی | خود آگہی نے بتایا کہ حرفِ ابجد ہوں

یہ انکساری ہے یا عاجزی یا یوں کہیں کہ جسے ہم انتہا سمجھتے ہیں وہ مظفر حنفی کی نظر میں ابتدا ہے۔ بات جو بھی ہو مظفر کے کلام پر لکھنا ناممکن تو نہیں لیکن مشکل ضرور ہے۔ مرحوم شمس الرحمن فاروقی نے ان کے کلیات کے دیباچہ میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''لہٰذا افسوس یہ ہے کہ غلط اصطلاحوں اور غلط تصورات کے چکّر میں پڑ کر ہم نے غزل کی شاعری کی حقیقت کے بارے میں ایک بنیادی بات بھلا دی ہے۔ اور وہ بنیادی بات یہ ہے کہ یہ لازمی نہیں کہ غزل کا شاعر انفعالی اور 'پژمردہ' مزاج رکھتا ہو، ہر بات پر آنسو بہاتا ہو اور معشوق کی یاد میں صحرا و دریا کی خاک چھانتا پھرتا ہو۔ دوسرے الفاظ میں، غزل کے مضامین اور اسالیب وہ نہیں جن کا مذاق حالی نے انتہائی بے دردی سے اڑایا تھا۔ غزل کا شاعر جارحانہ، تفکرانہ اور تحکمانہ مزاج کا حامل بھی ہو سکتا ہے۔ غزل کا شاعر صرف محرومیٔ قسمت اور ناسازگاریٔ زمانہ کی بات نہیں کرتا، وہ لوگوں سے جھگڑتا بھی ہے۔ (ہمارے یہاں سب سے بڑے جھگڑالو حضرت میر محمد تقی میر تھے۔) اور اگر وہ محرومی اور نارسائی وغیرہ مضامین اٹھاتا بھی ہے تو اپنے شعر میں انفعال کی جگہ برہمی، یا طنز، یا مبصرانہ اظہار رائے کو بیش از بیش بکار لاتا ہے۔''

آگے مزید لکھتے ہیں کہ:

''غزل میں دنیا داری اور پنچایتی رنگ بھی ہو سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ شاعر کو ندرت کی تلاش ہو، وہ نئے الفاظ اور مضامین کو 'مضر' نہ سمجھے، ان سے پرہیز نہ کرے، بلکہ انھیں غزل کے مزاج کے موافق بنائے۔''

اس تمہید کے بعد مظفرؔ حنفی کے کلام کا جائزہ لیں تو واضح ہوجاتا ہے کہ مظفرؔ نے قدیم روایات کا دامن نہیں چھوڑا ہے لیکن وہ جدید روایات کے ساتھ بھی کھڑے نظر آتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں جہاں غزل کی روایتی تعلیقات کی بہتات ہے وہیں پر وہ جدید دور کے تقاضوں کو بھی بڑے ہی شد و مد کے ساتھ اجاگر کرتے ہیں، لہٰذا ان کے اشعار میں جا بجا طنز کی کاٹ بھی نظر آتی ہے۔ اس کے لیے وہ استعاروں کا استعمال بھی کرتے ہیں اور اشارے کنائے سے بھی کام لیتے ہیں اور کہیں تشبیہ و رمز و ابہام سے طنز کے تیر بھی چلاتے ہیں۔

اِس وقت میرے پیشِ نظر ان کے وہ اشعار ہیں جن میں انھوں نے کسی قسم کے تکلفات کو نہ برتتے ہوئے صاف طور پر طنز و تنقید کو برتا ہے۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ حالات کو کس نظر سے دیکھ رہے تھے اور ان کے تعلق سے اُن کے کیا احساسات تھے۔ انھوں نے ترقی زمانہ پر تنقیدی نگاہ ڈالی۔ انھوں نے صرف ترقیات کی چکا چوند دیکھ کر عش عش اور واہ واہ نہیں کیا بلکہ ان کے عقب میں موجود اندھیروں پر بھی نظر عمیق ڈالی ہے اور اس کے اظہار میں کسی رمز و کنایہ یا استعارہ سے صرفِ نظر کر کے صاف الفاظ میں اپنی بات رکھ دی۔ وہ کہتے ہیں ۔

مشین عہدِ رواں کی خدا فریب فریب ۔۔۔ یہ ارتقا ہے کہ تحت الثریٰ فریب فریب

ان کی نظر میں یہ ترقیات صرف عروج کی جانب گامزن کرنے والی نہیں ہیں بلکہ وہ ان کے پیچھے چھپے زوال کو بھی دیکھ رہے ہیں ۔ یہ فلک بوس عمارتیں نہیں بلکہ یہ تحت الثریٰ ہیں۔ یہاں وہ عمارت کو بطور استعارہ استعمال کر رہے ہیں کہ ان ترقیات میں ہماری تہذیب اور تہذیبی شناخت دونوں گم ہو رہی ہیں۔ وہ بذاتِ خود اس بات کی طرف یوں توجہ دلاتے ہیں ۔

یہ فلک بوس عمارت ہمیں پہچانے کیا ۔۔۔ انھیں اطراف میں بنیاد کہیں میری تھی

اور یہ کہ ۔

کارخانے نہیں ہوسکتے ثقافت کا بدل ۔۔۔ لکھنؤ خیر سے لدھیانہ تو بن جائے گا

ان ترقیات نے معاشرے پر کیا اثرات ڈالے ہیں اور ترقی نے ہمارے معاشرتی تانے بانے کو کس طرح نقصان پہنچایا ہے۔ اس پر گفتگو کرنے سے قبل اس بات کا اعادہ کرنا ضروری ہے کہ جس زمانے میں مغرب کی چکا چوند کا چرچہ تھا اور تقریباً ہر شخص مغربی تہذیب اپنانے میں فخر محسوس کرتا تھا لیکن جب علامہ اقبالؔ نے مغربی ممالک کا دورہ کیا اور قریب سے اس معاشرہ کا جائزہ لیا تو برملا کہہ اٹھے کہ:

ع: ''مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے''

علامہ اقبالؔ یورپ جانے سے قبل جتنے مسلمان نہیں تھے وہاں سے پختہ مسلمان بن کر لوٹے۔ یہ بات پیشِ نظر رہے کہ مظفرؔ حنفی کا ترقیاتی دور پر طنز محسوس کریں تو اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ ان ترقیات کے پیچھے چھپے

اندھیروں کو صرف محسوس نہیں کر رہے ہیں بلکہ حقیقتاً انھیں چھایا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ اُن کا مشاہدہ اِس بات کی بھی غمازی کر رہا ہے کہ اِس ترقی نے ہمیں کیا دیا اور ہم سے کیا چھین لیا۔ وہ اس کی ابتدا بھی بیان کرتے ہیں اور انتہا بھی۔ ان کا مشاہدہ اور تجزیہ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ان ترقیات نے انسان کو کس طرح ایک دوسرے سے دور کر دیا ہے جس کی ابتدا اسکول سے ہوئی ہے اور انتہا کارخانے پر۔ کارخانوں کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اسکولوں میں بچوں پر پڑھائی کا جو بوجھ ڈالا جاتا ہے وہ بچے کو گھر آنے کے بعد بھی مشغول رکھتا ہے اور اسے والدین سے بات کرنے کی بھی فرصت نہیں ہوتی اور والدین کارخانوں کی ضرورت پوری کرنے میں اتنے مشغول ہوجاتے ہیں کہ انھیں بچوں سے ملنے کی بھی فرصت نہیں اور انھیں دونوں کے مابین نوجوان نسل زندہ ہے۔ جنھیں نہ بچپن کا پیار حاصل ہوتا ہے نہ بزرگوں کی شفقت اور پھر یہ دائرہ اسی طرح مکمل ہوتا چلا جارہا ہے اور ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہو رہا ہے۔ اس پوری بات کو سمجھنے کے لیے ان کے مندرجہ ذیل اشعار سلسلہ وار ملاحظہ فرمائیں ۔

اب اتنا کام بچے لے کے اسکولوں سے آتے ہیں ۔۔۔ کہ اُن سے بات کرنے کا ہمیں موقع نہیں ملتا

اسے غم ہے کہ بیٹی کے لیے لڑکا نہیں ملتا ۔۔۔ ادھر ہم ہیں کہ گھر کیا فون پر بیٹا نہیں ملتا

باہر کیا اپنے گھر میں بھی حد سے بڑھ کر پابندی ہے ۔۔۔ بیٹی سرکش ہوجاتی ہے بیٹا باغی ہوجاتا ہے

دورِ ترقی میں بچوں کو آسائش ہے ہم سے زیادہ ۔۔۔ البتہ اِس دور کا بچہ بوڑھا جلدی ہوجاتا ہے

اس کشمکش کا ایک انجام یہ بھی سامنے آتا ہے کہ لوگ ضروریات زندگی کے لیے اپنے گھروں سے اور وطن سے دور ہوجاتے ہیں، رشتے ناتے کچے دھاگوں کی طرح ہوجاتے ہیں، روپیوں کی بہتات اور رشتوں کی پامالی مقدر بن جاتی ہے اور پھر بڑے بوڑھوں کے پاس البم کی تصویریں یادوں کی صورت میں ماضی کے ورق ورق پلٹی رہتی ہیں لیکن ان کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ ۔

میں جِسے بیزار ہوکر چھوڑ آیا تھا کبھی ۔۔۔ اب وہی بستی بہت نزدیک اندر سے ہوئی

کہا پھر فون پر ماں سے کہ راوی عیش لکھتا ہے ۔۔۔ سمندر پار میرا حال کیا ہے کس نے دیکھا ہے

اس ترقی کی دوڑنے اور دولت کی ہوڑ نے انسانوں کو بے حس بنا دیا ہے اور وہ اپنی وقعت بڑھانے، اپنا سیاسی اثر ورسوخ بڑھانے کے لیے جو بھی حربے ہوں، بے دریغ استعمال کیے جارہے ہیں۔ خصوصاً وطنِ عزیز کے جو حالات ہیں وہ کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں کہ کس طرح ایک مخصوص طبقے کو نشانہ بنایا جارہا ہے اور حقیقی مسائل سے چشم پوشی کی جارہی ہے۔ حالاں کہ اِس کا انجام سِوائے تباہی کے اور کچھ نہیں ہوگا۔ یہ تو فطری امر ہے کہ ببول بونے کے بعد اس سے کسی میٹھے پھل کا تصور احمقوں کی دنیا میں رہنے کے مصداق ہوتا ہے۔ آگ محلے کے ایک گھر میں لگ جائے تو بقیہ گھر اس کی زد میں نہ آئیں، یہ کیوں کر ممکن ہوسکتا ہے اور بدقسمتی یہ ہے کہ یہ تمام خرافات

مذہب کے نام پر ہو رہی ہیں۔ انسانی خون آج جس قدر ارزاں ہے شاید اِس سے قبل اتنا ارزاں کبھی نہ رہا ہوگا۔ مظفر حنفی اِس کرب کا اظہار کرتے ہوئے کس قدر مایوس ہو جاتے ہیں ملاحظہ فرمائیے۔

جو دہشت گرد کہہ کر بے خطا پر وار کرتے ہیں — زمانے کو بغاوت کے لیے تیار کرتے ہیں
بے گھر ہو جائیں گے لاکھوں — اک معبد ہے ڈھہنے والا
بہانہ وفا کا نکالا گیا — بہت خون میرا بہایا گیا
بستی جلانے والو! تمھیں کیا بتاؤں میں — مدت سے میرے گھر میں دھواں بھی نہیں اٹھا

یہاں کوئی نہ حق بات سننے والا ہے نہ سننے کو تیار ہے اس لیے جو حق کہتا ہے اُس سے لوگ دور ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ اپنے بھی اس سے کنارہ کش ہوتے چلے جاتے ہیں اور حق گو کی آواز بے اثر ہو جاتی ہے۔ اب تو یہ اور اس قبیل کے معاملات روزمرہ کی زندگی کا جزو لاینفک سے ہو گئے ہیں۔ رہبر و رہنما آنکھیں، کان اور منھ تک نہیں کھولتے اور اگر اتفاق سے منھ کھل بھی جائیں تو زہر کے علاوہ کچھ نہیں اگلتے، جب حق و صداقت کی آواز اجتماعی طور پر اٹھنے لگتی ہے تو مختلف جوازات پیش کر کے اور حیلے بہانوں سے معاملات کو پسِ پشت ڈال دیا جاتا ہے اور یہ رویہ قوموں کی تباہی کا وسطی حصہ ہوتا ہے جس کے بعد انجام قوم نمرود، قوم شداد، قوم قارون سے مختلف نہیں ہوتا۔

اسی بنا پہ سب احباب نے کنارا کیا — کہ ہم نے دھارے میں بہنا نہیں گوارا کیا
ہم احتجاج کسی رنگ میں نہیں کرتے — ہمارے خون سے کوئی نشان پڑتا نہیں

اور حکمرانوں نے عوام کی طرف سے اپنی آنکھیں اور اپنے کان بند کر رکھے ہیں۔ مختلف الخیال لوگوں کے درمیان کھائی کی وسعت میں اضافہ ہو چکا ہے اور یہ صرف عاقبت نا اندیش سیاست دانوں کی وجہ سے ہو رہا ہے ورنہ ہمارا ماضی تو بڑا ہی روشن و تابناک رہا ہے۔

تو نے اتنی جالیاں کیوں کھڑکیوں پر تان دیں — ڈور سانسوں کی تری باریک اندر سے ہوئی

یہ چند اشعار تھے جو بِنا کسی لاگ لپیٹ کے برملا حالات و واقعات پر مظفر حنفی نے کہے ہیں۔ اُن کا پورا کلام اسی طرح کی طنز کی کاٹ لیے ہوئے ہے۔ اگر زمانہ انھیں سمجھ لے تو بہتر ہے۔ مذکورہ بالا اشعار شاعرِ موصوف کے جذبات، تخیلات، احساسات، تجربات اور عمیق مشاہدات کے غماز ہیں، ایک حساس مزاج فن کار جس کے دل کا یہ عالم ہے کہ ادھر پتّا کھڑکا اور اُدھر دل دھڑکا، جو ہر طرف خوش حالی، ہر جگہ روشنی اور ہر چہرے پر تمازت دیکھنا چاہتا ہے۔ جسے اندھیروں سے چِڑ، بے ایمانی، فریب، مکّاری اور عیّاری سے نفرت ہے، جِسے رشتوں کی پاس داری ہے، جو انسان کو نہ تو خدا سمجھتا ہے نہ فرشتہ اور نہ ہی شیطان بلکہ انسان کو صرف ابنِ آدم سمجھ کر اس سے خود بھی انسانوں کی طرح پیش آتا ہے اور یہی توقع اور تمنا وہ دوسروں سے بھی کرتا ہے کہ یہ اس کا نہ

صرف پیدائشی حق ہے بلکہ فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے۔ وہ منفی کو منفی، مثبت کو مثبت، دن کو دن اور رات کو رات کہتا ہے اور نتائج کی پروا نہیں کرتا۔ یہ کام اتنا سہل بھی نہیں ہے بلکہ ایسے لوگ پیغمبروں کی وراثت ہوتے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس وراثت کو تا قیامت قائم دائم رکھے اور مرحوم فن کار کو جنت کے اعلیٰ مرتبت لوگوں میں شامل فرماتے ہوئے ان سے راضی ہو جائے۔ ان کے کلام کو دوام بخشے اور مجموعے کو قبولِ عام کا درجہ عطا فرمائے۔ آمین۔ ثم آمین یارب العالمین۔

○○○

....

''مظفر حنفی کی شرافت سے میں اتنا ہی ڈرتا ہوں جتنا رام پوری حضرات ان کے استاد شادؔ عارفی کے طنز سے خوف کھاتے ہوں گے، لہٰذا تعمیل ارشاد کے طور پر یہ کہتا ہوں کہ مظفر حنفی نظم میں تھوڑے بہت محتاط یا مہذّب دکھائی دیتے ہیں لیکن غزل میں وہ تمام حربے بے تکلف برتتے ہیں جن سے ان لوگوں کو گھبراہٹ ہونے لگتی ہے جو غزل کو گھر بیٹھنے والی کنواری کی طرح منھ پر موٹی اوڑھنی ڈالے ہوئے پند و موعظت کا مصالحہ یا عشق و محبت کی چٹنی پیستے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں، مگر لطف یہ ہے کہ ان سب بے باکیوں کے باوجود مظفر حنفی اینٹی غزل کے شاعر نہیں بلکہ غزل ہی کے شاعر رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی بے باکیوں کا اظہار تضحیک و رنج کے بجائے اظہار برہمی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ مظفر حنفی غزل کے ان اسالیب کو بھی آزادی سے برت لیتے ہیں جو نسبتاً زیادہ معروف اور قابل قبول ہیں۔ عشق اور زندگی کے وہ تجربات جنھیں انسان فرد واحد کی طرح جھیلتا ہے، سماجی یا انسٹی ٹیوشنل انسان کی طرح نہیں، وہ بھی مظفر حنفی کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہیں۔

مثبت طور پر دیکھیے تو مظفر حنفی نے انتہائی شگفتہ زمینوں میں رواں دواں شعر کہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ نئے نئے ردیف و قافیہ کا ایک فوارہ ہے جو اُبلتا جا رہا ہے۔ ان کی شاعرانہ چالاکی کہیں مات نہیں کھاتی۔ طنزیہ شاعر کی بے خوفی اور حاضر جوابی بھی ان کے یہاں موجود ہے۔ مختلف باتوں کو ایک ہی طرح اور ایک ہی بات کو کئی طرح کہنے کا ڈھنگ انھیں بخوبی آتا ہے۔''

(شمس الرحمٰن فاروقی)

ڈاکٹر صالحہ صدیقی
الہ آباد، یو۔ پی، رابطہ: 9899972265

مظفر حنفی کی غزلیہ کائنات کا تخلیقی، فنی و فکری مطالعہ

صنفِ غزل نے جہاں عشق و محبت کی ساری واردات و کیفیات اور تمام اسرار و رموز کو اپنے دامن میں سمویا ہے، وہیں یہ بات بھی صحیح ہے کہ وہ صرف اسی موضوع تک محدود نہیں رہی۔ اس میں ان موضوعات کے ساتھ ساتھ زندگی کے متنوع پہلوؤں کا احساس اور اس کی ترجمانی بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ فلسفیانہ گہرائیاں، سماجی اور معاشرتی احساس، تاریخی واقعات اور عمرانی نظریات بھی موجود ہیں۔ یعنی اس کے موضوعات زندگی ہی کی طرح وسیع ہمہ گیر اور متنوع ہیں۔ صنفِ غزل کی عظمت کا راز تو اس میں ہے کہ وہ ان تمام پہلوؤں کو ایک ایسے سانچے میں ڈھال کر اور ایک ایسے رنگ میں پیش کرتی ہے جو اس کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ رنگ وہ ہے جو 'غمِ دنیا' کو بھی 'غمِ معشوق' کی طرح پیش کرتا ہے۔ غزل کے اس رویے پر یا اس رویے کی ناسمجھی کی بنا پر لوگوں نے اس سے اختلاف کیا۔ نیم وحشی کہا یا مشورہ دیا کہ گردن اڑا دینی چاہیے۔ جوشؔ کی ایک نظم 'غزل گوئی' ملاحظہ فرمائیں ۔

رنگ و بو آب و نمک نور و ضیا کچھ بھی نہیں — چند نرم و گرم غزلوں کے سوا کچھ بھی نہیں
ان غزل گویوں کا ہے معشوق ایسا نازنیں — نام جس کا دفترِ مردم شماری میں نہیں
یہ فقط رسمی مقلد وامق و فرہاد کے — مر رہے ہیں آج تک معشوق پر اجداد کے
ان کی سیرت ہے انوکھی ان کی غیرت ہے عجیب — گڑ نہیں جاتے حیا سے یہ اب وجد کے رقیب
آج تک غالب ہے ان پہ وہ رقیب روسیاہ — کر چکا ہے زندگی جو میرؔ و مومنؔ کی تباہ
پائی ہے ترکے میں ان لوگوں نے ہر لے ہر صدا — ان کے لب پر بھی وہی ہے جو ولیؔ کے لب پہ تھا
ان کی حالت وہ ہے جیسے کوئی بزدل خواب سے — ''چور آیا، چور آیا'' کہہ رہا ہو چونک کے
اور گھر کے جس قدر پیر و جواں ہیں زور زور — اپنے اپنے بستروں پر چیختے ہیں ''چور چور''
ان کے دل میں شعر کی روشن ہو کس صورت سے آگ — قافیے کے ہاتھ میں رہتی ہے جن لوگوں کی باگ

اس نظم سے جہاں شوخی و ظرافت ٹپکتی ہے وہیں یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ نظم اس عام باغیانہ رجحان کا نتیجہ

بھی ہے، جس کے زیرِ اثر ماضی کی ہر چیز کو لایعنی سمجھ لیا گیا۔ جوشؔ کی مخالفت کا محرک یہ جذبہ ہے کہ صنفِ غزل کا شاعر تقلید اور نقالی میں رہتا ہے اور قافیہ پیمائی پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔ یا انھیں اردو شاعری صرف چند نرم و گرم غزلوں کا مجموعہ نظر آتی ہے۔ حالاں کہ اردو شاعری میں غزل کی ایک عظیم روایت ملتی ہے۔ شاعری کا ہر پہلو اس روایت میں موجود ہے۔ ولیؔ، میرؔ، دردؔ، سوداؔ، مصحفیؔ، غالبؔ، مومنؔ، اقبالؔ، فانیؔ، اصغرؔ، یگانہؔ، حسرتؔ، فراقؔ اور جگرؔ سب نے اس میں ایک جدّت اور منفرد طرز اپنایا۔ ان کی غزلوں میں صحیح معنوں میں اپج اور اچھوتا پن، جدت اور طرفگی، ایک صحیح احساس، ایک گہرا شعور اور انفرادیت نظر آتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ شعرا نے متقدمین کے مضمون کو اپنے انداز میں پیش کیا۔ ایک مضمون کو سو طرح سے باندھنا کمال ہے، اس کو نقالی یا تقلید سے موسوم کرنا غلط ہے۔ ہمارے ذہنوں میں غزل کا ایک سانچہ ہے۔ اس کا ایک انداز ہے۔ ہم انھیں کو مدِنظر رکھ کر غزل کے اچھے پہلو یا برے پہلو پر بات کرتے ہیں۔ ہم غزل کی روایت کے مطابق گل و بلبل، شمع و پروانہ، مے و میخانہ، گل چیں و باغباں، گلشن و صحرا، قیس و لیلیٰ، فرہاد و شیریں، طور و موسیٰ اور یوسف و زلیخا وغیرہ جیسے نہ جانے کتنے اشاروں، تمثیلوں اور تلمیحوں کا استعمال ہر شاعر کے یہاں دیکھتے ہیں۔ لیکن بالکل جدا رنگ میں، ہر شعر میں بالکل الگ بات بیان ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ یہ کئی سو سال پرانی روایت آج بھی صنفِ غزل کا بڑا سرمایہ ہے۔ ان کے ذریعہ مواد اور موضوع میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ رمزیت و ایمائیت غزل کے بنیادی لوازم ہیں۔ اس کی وجہ سے غزل میں دل کشی پیدا ہوتی ہے۔ اس حقیقت سے منھ نہیں موڑا جا سکتا ہے کہ غزل سے اگر ان لوازمات کو نکال دیا جائے تو اس میں بالکل وہ رعنائی اور دل کشی نہیں رہ جائے گی جو اس کا خاصہ ہے۔

ان تمام باتوں کو مدِنظر رکھ کر مظفر حنفی کی غزلوں کا مطالعہ کیا جائے تو چند اہم خصوصیات نظر آتی ہیں۔ مظفر حنفی کی غزلوں میں عشقِ حقیقی بھی ہے اور عشقِ مجازی بھی۔ ان کے یہاں جگہ جگہ حقیقت کے جلوے بکھرے ہوئے ہیں۔ غزلیں سوز و گداز ناز و نیاز سے بھرپور ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ان کے یہاں تصوف کا غلبہ ہے۔ جا بجا معرفت کی چاشنی ملتی ہے اس کے علاوہ زندگی اور اس کے اندرونی مسائل پر غور و فکر موجود ہے۔ کہیں مشاہدۂ باطن ہے تو کہیں کائنات کے اسرار کو سمجھنے کی کوشش ہے اور ماسوا کی رنگینیوں میں ڈوب جانے کی خواہش بھی ہے۔ یہی نہیں بلکہ عشق و محبت، حسن و جمال، گل و بلبل کے تذکرے، محبوب کے خد و خال کی تعریف، اس کے جور و ستم، ہجر و فراق کی تڑپ، کرب و اضطراب اور محبوب کے وصال کی آرزو، جنون و وحشت، خزاں و بہار اور یاس و امید وغیرہ سبھی کچھ اس میں شامل ہے۔ انھوں نے فلسفہ، سیاست، حیاتِ انسانی کے مختلف مسائل، دقیق خیالات اور سنجیدہ مضامین تمام موضوعات کو کلام میں جگہ دی۔ دنیا کی تمام زبانوں کے شعری سرمایہ میں عشقیہ ادب زیادہ مشہور و مقبول رہا ہے۔ فارسی اور اردو شاعری سے اگر یہ نکال دیا جائے تو بے جان اور بے کیف ہو جائے گی۔ اردو شاعری میں امیر خسروؔ سے لے کر آج تک شاعری کا اہم موضوع عشق

ہی رہا ہے۔ اردو شعرا نے عشق کے موضوع کو تمام موضوعات پر فوقیت دی۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ دوسرے موضوعات بالکل رد کر دیے گئے۔ بلکہ سماجی اور سیاسی موضوعات بھی اگر غزل کی حدود میں داخل ہوئے تو عشق کا رنگ اختیار کر گئے۔ مثال کے طور پر سراج الدولہ کی گرفتاری ایک سیاسی سانحہ تھا۔ مگر جب غزل کا شاعر اسی سانحہ سے متاثر ہوا تو اس نے اس طرح کہا۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی — دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اس طرح کے لاتعداد اشعار ہیں جو غزل کے انداز میں رچ بس کر اردو کے شعری ادب کی جان بن چکے ہیں، لہٰذا صنف غزل میں جن انفرادی کیفیات کی تصویر کشی ملتی ہے اس میں عشقیہ کیفیات بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ غزل نے متنوع اور رنگا رنگ عشقیہ کیفیات کو اپنے دامن میں جگہ دی، اور ان جذباتی تقاضوں کو پورا کیا۔ ان عشقیہ کیفیات میں آفاقیت ہے۔ خسروؔ، ولیؔ، سوداؔ، دردؔ، مصحفیؔ، غالبؔ اور مومنؔ نے جن عشقیہ کیفیات کو پیش کیا وہ آج بھی ہمیں اپنی کیفیات معلوم ہوتی ہیں۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

غزل کی روایت میں گل و بلبل، شمع و پروانہ، مے و میخانہ، گل چین و باغباں، گلشن و صحرا، قیس و لیلیٰ، فرہاد و شیریں، یوسف و زلیخا اور طور و موسیٰ وغیرہ نہ جانے کتنے اشاروں، تمثیلوں اور تلمیحوں کا استعمال ملتا ہے۔ ہر شاعر اپنے اپنے انداز میں ان کا استعمال کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی انفرادی خصوصیت علیحدہ نظر آ جاتی ہے۔ اس میں شاعر کی شخصیت کا بھی دخل ہوتا ہے اور شخصیت بڑی حد تک ماحول کے اثر سے بنتی ہے۔ ہر دور کا ماحول دوسرے دور کے ماحول سے کسی نہ کسی حد تک مختلف ہوتا ہے اور اس ماحول کے اثرات شاعر کی شخصیت پر مختلف زاویوں سے پڑتے ہیں۔ شاعر کا فن اس شخصیت کا عکس ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ غزل کے ہر دور بلکہ ایک ہی دور کے مختلف غزل گو شعرا میں اس رنگا رنگی کا احساس ہوتا ہے۔ صرف میرؔ اور غالبؔ ہی ایک دوسرے سے مختلف نہیں، بلکہ خود میرؔ، سوداؔ اور دردؔ میں باوجود ایک ہی عہد میں پیدا ہونے کے بالکل مختلف ہیں۔ مثلاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ میرؔ کے یہاں محبت، سپردگی، ناکامی، اداسی اور سوگواری ہے۔ کیوں کہ حالات نے ان پر کچھ اسی طرح کے اثرات مرتب کیے۔ سوداؔ کے یہاں وہ کسی حد تک بدل جاتا ہے۔ یہاں سوگواری اور اداسی کی جگہ مسرت و شادمانی ملتی ہے۔ دردؔ کے یہاں حقیقت و معرفت کی چاشنی نمایاں ہے۔ بالکل یہی معاملہ مصحفیؔ، انشاؔ اور جرأتؔ کے یہاں بھی ہے۔ تینوں ایک ہی عہد سے تعلق رکھتے ہیں لیکن بالکل مختلف رنگ کے حامل ہیں۔ مصحفیؔ کے یہاں عشق سوز و گداز کا نام ہے۔ جرأت کے یہاں وہ معاملہ بندی سے عبارت ہے۔ انشا کے یہاں محض خوش وقتی اور شوخی ہے۔ کلاسیکی اردو غزل میں عشق کے مضامین کو مرکزیت حاصل ہے، البتہ دیگر مضامین پر بھی پابندی نہیں۔ غرض کہ مظفر حنفی نے روایت کے مطابق بھی تمام موضوعات کو اپنایا اور اس میں طبع آزمائی کی۔ ان کے کلام کا یہ نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

یہ سچ ہے کوئی رہنما ٹھیک نئیں — مرے بھائی تو بھی چلا ٹھیک نئیں
ادیبوں کو سچ بولنا چاہیے — سیاست کی آب و ہوا ٹھیک نئیں
نگاہوں سے میلا نہ ہوجائے وہ — اسے دیر تک دیکھنا ٹھیک نئیں
ہمیں تو وہی سمت مرغوب ہے — بلا سے ادھر راستہ ٹھیک نئیں
چلو دھوپ سے آشنائی کریں — یہ دیوار کا آسرا ٹھیک نئیں
نمی آنکھ میں ہاتھ میں تھر تھری — ترے مانگنے کی ادا ٹھیک نئیں
زمانہ مخالف تھا قسمت خراب — مظفرؔ یہاں کچھ بھی تھا ٹھیک نئیں

مظفر حنفی نے اپنے تخیل کی مدد سے کوئی نیا پہلو تلاش کیا اور روایتی شاعری میں جو موضوعات نہیں ہیں یا بہت کمیاب ہیں ان کو بھی اپنے کلام میں جگہ دی اور ہر جگہ اپنی قادر الکلامی اور مہارت کا ثبوت دیا۔ مظفر حنفی نہ صرف بہترین شاعر تھے بلکہ عمدہ استاد بھی تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے شاگردوں اور قدردانوں کی ایک لمبی فہرست بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مظفر حنفی کی شاعری میں احساس اور الفاظ کے درمیان جسم اور روح کے رابطے کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے یہاں جذبے کی گہرائی، احساس کی شدت اور فکر و خیال کی تازگی و شادابی موجود ہے، جو ان کے اسلوب کی سادگی و برجستگی اور سلاست و روانی اور سوز و گداز کے ساتھ مل کر ان کی شاعری کو ان کے ذاتی تجربہ و تاثر سے بلند کر کے ہمہ گیر اور وسعت کا مرقع بنا دیتی ہے۔ مظفر حنفی کے کلام میں کلاسیکیت اور جدت کا ایک حسین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے، جس میں متانت ہے، حسن ہے اور اثر آفرینی بھی موجود ہے۔ ان کے یہی اوصاف انھیں اپنے عہد کے شعرا میں منفرد مقام دلاتے ہیں جس کے قائل اس عہد کے استاد شعرا بھی رہے۔ مظفر حنفی کے کلام کا یہ نمونہ اس کی عمدہ مثال ہے۔

فرق نہیں پڑتا ہم دیوانوں کے گھر میں ہونے سے — ویرانی امڈی پڑتی ہے گھر کے کونے کونے سے
اپنی اس کم ظرفی کا احساس کہاں لے جاؤں میں — سن رکھا تھا الجھن کچھ کم ہو جاتی ہے رونے سے
بعد از وقت پشیماں ہو کر زخم نہیں بھر سکتے تم — دامن کے دھبے البتہ مٹ سکتے ہیں دھونے سے
کانٹے بونے والے سچ مچ تو بھی کتنا بھولا ہے — جیسے راہی رک جائیں گے تیرے کانٹے بونے سے
میرے تیکھے شعر کی قیمت دکھتی رگ پر کاری چوٹ — چکنی چپڑی غزلیں بے شک آپ خریدیں سونے سے
آنکھوں میں یہ رات کٹے تو ٹھیک مظفرؔ حنفی جی — رہزن جھنجھلایا بیٹھا ہے اک منزل سر ہونے سے

مظفر حنفی کے سینے میں ایک گداز دل تھا۔ ان کے کلام میں موضوعات اور کیفیات کا تنوع بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی ان کے کلام میں ملے جلے تاثرات بھی نظر آتے ہیں۔ مظفر حنفی کے کلام میں دہلوی داخلیت

اور لکھنوی خارجیت کا بہترین امتزاج بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ صاف ستھری اور بامحاورہ زبان استعمال کرتے ہیں۔ ان کے بیشتر اشعار میں عام بول چال اور محاروں کا استعمال ملتا ہے مثلاً زمانہ کا بدل جانا، پھلنا پھولنا، آباد رہنا، پاؤں کے نیچے زمین کا ٹھہرنا، زندگی بھر کا ساتھ چھوڑنا، باغ باغ ہونا، چار دن کی چاندنی، آنکھ کا پھرنا اور رنگ پر آجانا وغیرہ۔ ان کے نگار خانے میں دل کش اور نظر نواز تصویروں کی کوئی کمی نہیں۔ مظفر حنفی نے ان تصویروں میں سوز و گداز، دردمندی اور حسن پرستی کے بھی گہرے رنگ بھرے ہیں۔ ان کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت ہم ایک خوش گوار کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ مظفر حنفی کی سادہ، صاف اور سہل زبان ملاحظہ ہو۔ روانی و مضمون آفرینی کا جواب نہیں۔

ہاتھوں میں سجتے ہیں چھالے جیسی تیری مرضی — سکھ داتا دکھ دینے والے جیسی تیری مرضی
بستی بستی گھور اندھیرا یا انگارے برسیں — صحرا صحرا نرم اجالے جیسی تیری مرضی
برحق ہے تو پتھر پتھر پھول کھلانے والے — زرخیزی میں بنجر ڈالے جیسی تیری مرضی
بھرتے ہیں ہنکاری تیری آتے جاتے بادل — گونج رہے ہیں ندی نالے جیسی تیری مرضی
تیرا ہی اعلان کروں میں تیرے ہی گن گاؤں — میرے ہی ہونٹوں پر چھالے جیسی تیری مرضی

مظفر حنفی کے اشعار میں مختلف شعری فنون کا خوب صورت استعمال دیکھا جاسکتا ہے۔ چوں کہ اس مختصر مقالے میں تفصیلات کی گنجائش کم ہے اس لیے ان کے مختلف شعری فنون کی طرف صرف اشارے کیے گئے ہیں، جس کے مطالعہ سے ان کی قادرالکلامی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان کی نظر وقت، معاشرہ اور حیات و موت اور گرد و پیش کے مسائل پر زیادہ تھی۔ بحر اور ان کے انتخاب میں بھی مظفر حنفی نے ادراک و عمل کو محفوظ رکھا ہے، کیوں کہ شعر میں التزام وزن سے موسیقیت اور نغمگی ہی نہیں افادی پہلو بھی نمایاں ہوجاتے ہیں، جس کے نتیجے میں ایجاز و اختصار کی خوبی دوچند ہوجاتی ہے۔ موزوں و مناسب بحر و اوزان کی پابندی سے شعر کے اسلوب پر بھی خاصا اثر پڑتا ہے جو کہ حسن کاری اور سحر کاری میں اعانت کا حامل ہے۔ مظفر حنفی کی ذہانت شعر کی تخلیق میں موثر رول ادا کرتی ہے۔ ان کے انتخابی اوزان فکر و معنی کو منضبط رکھنے اور حسن تاثیر کو متحرک کرنے میں معاون ثابت ہوئے ہیں۔ انھوں نے ہر نوع کی بحروں میں طبع آزمائی کی ہے۔ طویل بحریں ہوں یا طویل ردیفیں، ان کو منضبط رکھنا اور فکر و معنی کو نثری کرختگی سے محفوظ رکھنا آسان نہ تھا۔ مگر انھوں نے شعری ادراک و عمل کی مدد سے ان مشکل اور پیچیدہ ہیئتی پیکروں کو مرتکز رکھا۔ ان کے کلام کا یہ انداز ملاحظہ فرمائیں۔

شاخوں پر ابہام کے پیکر لٹک رہے ہیں — لفظوں کے جنگل میں معنی بھٹک رہے ہیں
ملہاریں گاتے ہیں مینڈک تال کنارے — آسمان پر بھورے بادل مٹک رہے ہیں
مطلع پر یادوں کی پوسی پھوٹ رہی ہے — من پر کالے سانپ اپنے پھن پٹک رہے ہیں

خوشبو کی چوری کا داغ لگا ہے ان پر — سب گل بوٹے اپنے دامن جھٹک رہے ہیں
ایسی جدت سے ہم کو کیا مل جائے گا — پڑھنے والے ہر مصرع پر اٹک رہے ہیں

مظفر حنفی کی اپنی تہذیبی اقدار سے وابستگی اور عقیدت، ان کی شاعری کا دامن روایتی شاعری کی طرف کھینچتی ہے، لیکن ایک خارجی دباؤ ان کو اپنا نیا انداز اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ انداز خاص طور پر ان کی غزلوں میں صاف طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے، جہاں قدیم و جدید رنگ کا امتزاج موجود ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ مظفر حنفی کی غزل اپنے ارد گرد کے ماحول، مزاج، تہذیبی اور سماجی ڈھانچے، نفسیاتی اور جذباتی کیفیتوں سے رشتہ استوار کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ کلام میں جذبات، عشق کی تہ داریاں اور راز و نیاز موجود ہیں۔ ان کا عشق شفاف اور پاکیزہ ہے، جس میں اخلاقی گراوٹ اور ہوس پرستی کا شائبہ نہیں۔ ان کے کلام میں کہیں کہیں لطیف اور شوخ نوک جھونک ضرور موجود ہے۔ ان کی شاعری نہ صرف فکر و فلسفہ سے متصف ہے بلکہ روز مرہ کے معاملات و تجربات سے بھی ان کا رشتہ قائم ہے۔ اس طرح ان کی غزلوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں تفکر اور تغزل کا حسین امتزاج ہے۔ وہ نہ تو کلاسیکی روایت کی پوری طرح تقلید کرتے ہیں اور نہ ہی اس سے احتراز و انحراف کرتے ہیں، بلکہ متوازن رویہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ اعتدال پسند رویہ کے ساتھ روایتی شاعری کے مستحسن پہلوؤں کو اپنی شاعری کا جزو بناتے ہیں۔ اس لیے نفسیاتی اعتبار سے ان کی غزلیں تازہ کاری، شگفتگی اور فلسفہ طرازی کا نہایت خوب صورت مرقع کہی جاسکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل کا آہنگ نہایت شگفتہ ہے، جس میں ایک تازگی اور گہری معنویت کا شدید احساس ہوتا ہے۔

جو ہونٹوں پہ مہر خموشی لگا دی — تو مل کر نگاہوں نے تالی بجا دی
کسی کے لیے میں پریشاں نہیں ہوں — رقیبوں نے جانے کہاں کی اڑا دی
جنوں اپنی تقدیر سے کھیلتا ہے — مٹائی بنا دی، بنائی مٹا دی
ابھی نور و ظلمت میں چلتی رہے گی — نہ وہ اس کے عادی، نہ میں اس کا عادی
خبر کارواں کی نہ ہو رہزنوں کو — یہی سوچ کر میں نے مشعل بجھا دی

مظفر حنفی کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ فارسی تراکیب، مغلق الفاظ اور اضافت کی کثرت سے بڑی حد تک عاری ہے۔ استعارہ و تشبیہ بھی بڑے فطری انداز میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ الفاظ نہایت سادہ اور عام فہم ہیں۔ الفاظ کی نشست میں فن کاری ملتی ہے۔ کلام میں روانی اور سوز و گداز بہت ہے۔ یہاں تک کہ اکثر اشعار بے ساختہ پن اور روانی کی وجہ سے ضرب المثل ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ سہل ممتنع کی بیشتر مثالیں ان کے کلام میں جابجا دیکھنے کو ملتی ہیں۔ حالاں کہ سادگی کے باوجود معنی کی بلندی اور تاثیر کلام ہاتھ سے نہیں جاتی اور نہ صرف یہ کہ سادہ، آسان اور عام بول چال کا لہجہ ہے۔ وہ لمبی لمبی غزلیں، نئی زمین نکالنے اور مشکل طرحوں میں

غزل کہنے سے بھی نہیں چوکتے۔ انھیں ان کی بندش کی خوبی، نئی زمینوں کے اختراع، زبان کی سلاست، کلام کی پختگی اور مضامین کی بہتات نے بجا طور پر استاد کا مرتبہ عطا کیا۔ مجموعی اعتبار سے مظفر حنفی کی غزلوں میں جذبے کا خلوص، فکر میں گہرائی و گیرائی اور اسلوب بیان میں ندرت و جدت موجود ہے۔ گویا ان کی غزلیہ شاعری فکر و فن دونوں جہتوں سے کامیاب، توانا اور پر کشش ہے۔ ان کے کلام کے مطالعے سے ان کی شاعرانہ مہارت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ ان کی عظمت اور قادر الکلامی میں کوئی کلام نہیں۔ ان کا یہ نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیں۔

تنکوں کے ارمان لبیک لبیک　　طوفان طوفان لبیک لبیک
بے دست و پا میں بے دست و پا تو　　جنگل بیابان لبیک لبیک
وحشت کی بستی کوتاہ دستی　　میرا گریبان لبیک لبیک
آزاد دیدہ مردم گزیدہ　　آئینہ حیران لبیک لبیک
تتلی شگوفے، جگنو ستارے　　سب تیری پہچان لبیک لبیک
اونچا ہوا سر نیزہ بہ نیزہ　　یاروں کا احسان لبیک لبیک

اس عظیم الشان شاعر کی شاعری کا دائرہ یقیناً ایک وسیع موضوع ہے جسے چند صفحات میں سمیٹنا ممکن نہیں، پھر بھی حتیٰ الامکان یہ کوشش کی گئی ہے کہ اس شاعر کی شاعری کے مختلف گوشوں کو منظر عام پر لایا جا سکے۔ مختصر یہ کہ ان کی غزل روایت اور جدت کا ایک خوش رنگ امتزاج ہے۔ وہ روایت کے پاسدار بھی ہیں اور نئے مضامین کی تلاش میں سرگرداں بھی۔ جس کی وجہ سے ان کی غزل اردو غزل کی روایت میں وسعت پیدا کرتی ہے اور اس کو متنوع بناتی ہے۔ یہی وہ صفات ہیں جو مظفر حنفی کو دوسرے شعرا سے ممتاز کرتی ہیں۔

○○○

ڈاکٹر افضال عاقل
گارولیا، شمالی ۲۴ پرگنہ، مغربی بنگال، رابطہ نمبر: 6291473252

'یا اخی': جدید غزل کا منظر نامہ

نئی شاعری ایک نئے احساس کو جنم دیتی ہے اور عصری شعور کو آئینہ دکھاتی ہے۔ نئی شاعری نے قدروں کے زوال کی نوحہ گری کرتے ہوئے کائنات کی صداقت کو آئینے میں اُتارنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس کے وسیلے سے انسان کے ذہنی انتشار، تہذیب کی ٹوٹ پھوٹ اور کیفیات سامنے آتی ہیں۔ نئی غزل سماج کی ناقدری، زندگی کی پیچیدگیوں، ششدر و حیران کن حالات، خواہ وہ واضح ہو یا مبہم، کائنات کی حدود کی توسیع کرتی ہے اور خالق کے ذوق و جمال، کرب آگہی اور انسانی روابط کے احساس کو نمایاں کرتی ہے۔ عہد حاضر میں نئی غزل نہ صرف تیزی سے آگے بڑھی ہے بلکہ اس نے تخلیقی محرکات، تاریخی حالات اور ان کے ذہنی اور جذباتی رویوں کی تفہیم میں توازن و استدلال سے کام لیا ہے۔

مظفر حنفی کی غزلیں اس بات کی دلیل پیش کر رہی ہیں کہ انھوں نے نئی شعری تہذیب اور جمالیاتی حسن کی پاس داری کی ہے نیز جہاں وہ روایت کے امین ہیں، وہیں شعور و ابلاغ کے بل بوتے پر عصری حسیت کے ذریعے نئی شاعری کو اعتماد اور توانائی عطا کی ہے۔ انھوں نے نئے طرز احساسات، حیات و کائنات کے مسائل، تغیرات اور زندگی کے تضادات کو استعارے کے طور پر پیش کیا ہے۔ جدید غزل کو مستحکم کرنے میں ان کے منفرد مطمح نظر اور کاٹ دار لہجے کا مکمل دخل ہے۔ ان کی غزلوں سے چھن کر آنے والی روشنی میں نشتریت اور یہی نشتریت جدید غزل کی داخلی و خارجی فضا کو مجروح ہونے سے بچاتی ہے۔ گوپی چند نارنگ کے الفاظ کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا:

> ''مظفر حنفی ان تخلیق کاروں میں سے ہیں، جنھوں نے وادیٔ شعر میں اپنا سفر سینے کے بل طے کیا ہے۔ ان کا فن رسمی تزئین اور Gimmicry سے بے نیاز ہے۔'' (یا اخی، فلیپ)

مظفر حنفی کی غزلوں میں فلسفیانہ حقائق اور انسانی زندگی کے تجربات عمومیت اور تاثیر کے ساتھ مضمر ہیں، جن میں فکر اور اظہار کی گہرائی اور تہ داری پائی جاتی ہے۔ ان کی غزل میں خارجی، سیاسی اور سماجی موضوعات،

جذبے اور تخیل سے ہم آہنگ ہیں۔ ان کی غزل کے 'حسن لفظی اور انداز بیاں' کو نئی غزل کی 'حقیقت نگاری' سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی غزلیں تنوع، لہجے کی نشتریت، احساس کی شدت، مشاہدے کی باریک بینی کے وسیلے سے نئی لسانی جہتوں کو روشن کرتی ہیں۔ ان کی غزل کے نازک اور لطیف پیمانے میں بھی نیا انداز ہمک رہا ہے۔ ان کی غزلیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ انھوں نے ان کی تخلیق میں کارشیشہ گری سے کام لیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں کہ انھوں نے فطری بہاؤ کو نرم ونازک انداز میں کس طرح سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔

آ گیا میں کسی جگنو کی نظر میں کیسے ؟ | بوند بھر نرم اُجالا مرے گھر میں کیسے؟
سرخ آندھی نے بڑا شور مچایا کل رات | گھر بنائے ہیں پرندوں نے شجر میں کیسے؟

......

بلا سے بجھے یا بڑھے تشنگی | سمندر کو آداب کرتے رہو

محولہ بالا اشعار جو سوالیہ نشان (؟) کے ساتھ سامنے آئے ہیں، شاعر کو کشمکش میں مبتلا کر دیتے ہیں کہ جگنو بوند بھر نرم اُجالا لے کر گھر میں کیسے آ گیا جب کہ اس کا مسکن چمن ہے۔ ایسے حیرت انگیز حالات کے بعد جب پرندے شجر پر گھر بناتے ہیں تو سرخ آندھی ہنگامہ کھڑا کرتی ہے کہ تشنگی بڑھے یا بجھے، سمندر کے آداب واحترام کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس طرح کے کچھ اشعار اور ملاحظہ فرمائیں جو نیا لہجہ لیے ہوئے ہیں نیز قاری کو مسحور کرتے ہیں اور جدید غزل میں توسیعی کردار ادا کرتے ہیں۔

کچھ دیر تو نیزے پہ اُچھالو نہ سروں کو | بستی میں ابھی رقصِ شرر ختم ہوا ہے
شہکار کی تکمیل پہ کاٹے گئے بازو | کیا میرے ہی ہاتھوں پہ ہنر ختم ہوا ہے

......

بس کہہ دیا کہ ہم نہ چلیں گے کسی کے ساتھ | پیچھے پلٹ کے دیکھ رہا ہے زمانہ کیوں

یہی وہ اشعار ہیں، جن کی روشنی میں وزیر آغا کہتے ہیں:

''مظفر حنفی جدید غزل کے اس خاص انداز سے بھی آگے آ گئے ہیں اور انھوں نے بڑی دلیری سے غزل کو اس کے عمق میں چھپی کہانی سے اس طور متعارف کرایا ہے کہ فاصلے کم ہو گئے ہیں۔ ہر چند کہ غزل کی مخصوص خوشبو اور دھند بدستور موجود ہے مگر کہانی کے نقوش مدھم نہیں پڑے، جیسا کہ غزل میں عام طور سے ہوتا ہے۔'' (یا اخی، ص ۱۷)

وزیر آغا کے یہ الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ مظفر حنفی کی غزل انسانی معاشرے کا محاسبہ ومحاکمہ کرتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جو عہد حاضر کی شکست وریخت کی منظر کشی کر رہے ہیں۔

سائے مچل رہے ہیں چراغوں کی گود میں | سمجھے تھے ہم کہ گھر سے اندھیرا نکل گیا
ہونے لگا ہے ماں کی دعا میں غلط اثر | بیٹی تو گھر میں بیٹھی ہے بیٹا نکل گیا

مظفر حنفی ایک طرف شاعری کی فلسفہ آمیز فکر کو نیا آہنگ دے رہے ہیں تو دوسری طرف جدیدیت کے رجحان کو تیز دھار سے آشنا کر رہے ہیں۔ انھوں نے 'جدید غزل' میں لفظ 'جگنو' کو انتہائی شگفتہ انداز میں متعارف کرایا ہے اور جدید غزل کے نئے افہام وتفہیم کو نمایاں کیا ہے:

اُجالا بڑھادو کہ جگنو کے نام | ستارے کا پیغام آنے نہ پائے
ہم ستارے بنا کے نادم ہیں | آپ نازاں ہیں آبگینوں پر
جگنو بھی نارسا ہے اگر خوف دل میں ہو | ہمت بلند ہو تو ستارہ قریب ہے

مظفر حنفی ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی شاعری جدید رجحانات سے پُر ہے۔ انھوں نے پاس داری کی سطح سے بالاتر ہو کر ناقدانہ جمالیاتی ذوق کی اساس پر جدید غزل کی بنیاد رکھی ہے۔ وہ ایک زیرک نباض ہیں، جن کی غزل کی جدت عمیق ہے۔ ان کی غزل کا رویہ اور مزاج، ذات وکائنات کے ناہموار دائرے کو لطیف ترین کیفیات سے مملو کر کے غزل کے نئے ذائقے سے آشنا کر رہا ہے۔ مظفر حنفی نئی ردیفوں اور نئے قوافی کے استعمال پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں مضامین کی جدت، تخیل، تازگی اور شعریت کے ساتھ آب دار کھردرے الفاظ پائے جاتے ہیں لیکن ان الفاظ کی گہرائی میں تند، شیریں اور تلخ لہجے بھی موجود ہیں جو غزل کو نئی عبارت واشارت سے آراستہ وپیراستہ کرتے ہیں۔

غزل کو سینچنے کا استعارے توڑنے کا | اُٹھو کہ وقت یہی ہے ستارے توڑنے کا
خود اپنے آپ کو پایاب کرتی رہتی ہے | عجب جنوں ہے ندی کو کنارے توڑنے کا
سب نے چنگاریاں بو رکھی تھیں | تتلیاں کیسے اُگیں سن تو سہی
تم گھر جلانے آئے، تہ دل سے شکریہ | لیکن مرا اثاثہ تو سیلاب لے گیا
طوفان گستاخ، کشتی میں سوراخ | بوسیدہ پتوار، افسوس افسوس

محولہ بالا اشعار میں ستارے اور کنارے توڑنے، چنگاریاں بو کر تتلیاں اُگانے، اثاثہ سیلاب کی نذر ہونے، بوسیدہ پتوار پر افسوس کا اظہار کے برمحل استعمال نے جدید غزل کے وقار کو بڑھایا ہے۔ اس قبیل کے چند اور اشعار ملاحظہ فرمائیں، جن میں احساسِ زیاں کا کرب، عصری حالات اور تہذیب، قاری کے قلب وذہن پر دستک دے رہے ہیں۔

لہو کی بوند ہر اک لفظ کو عطا دل کی | بقیہ سب مری طبع رواں کا حصہ ہے

......

مری زمین رہی آسماں پہ چھائی ہوئی | مگر غزل کی کمائی کوئی کمائی ہوئی
ڈوب جاتا ہے یہاں تیرنا آتا ہے جسے | وہ کبھی ناؤ تھی دریا لیے جاتا ہے جسے
پر بریدہ، آبدیدہ، پھول کے غم سے نڈھال | یہ وہی خوشبو ہے، شہرت جس کی بستی بھر میں تھی

مظفر حنفی کے یہاں کچھ ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو بقول ڈاکٹر محبوب راہی: ''غالبؔ کے اشعار کی توسیع'' ہیں۔

یہ الگ بات مظفرؔ ہی نہ جانے خود کو ...... ورنہ غالبؔ کے طرف دار مرے گھر میں نہیں

ترا سخن تو مظفرؔ ہے دل لگی کے لیے ...... میاں، غزل اسد اللہ خاں کا حصہ ہے

مظفر حنفی کی غزلوں کے مقطعے پڑھنے کے بعد ایک سچا اور ایمان دار قاری بلا تامل کہہ اُٹھتا ہے کہ انھوں نے اپنے مقطعے میں حالات اور معاشرے کو قید کر دیا ہے۔ان کے مقطعوں سے زندگی کے معاملات، منقلب ہو کر ایک مخصوص دائرے پر سمٹ آئے ہیں جس میں کائنات کے اسرار مقفل ہیں، جس سے غزل پر جمی تجریدیت و مادّیت و ماورائیت کی دھند صاف ہو رہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے مقطعے گھٹن کے بجائے شادابی کا احساس دلاتے ہیں اور یہ مقطعے انسانی زندگی، جو آمرانہ عصبیت کا شکار ہے، کے خلاف احتجاج ہیں۔حتیٰ کہ انھوں نے انسانی زندگی کے واقعات و سانحات کی قاشیں چن کر مقطعے میں رکھ دی ہیں، جو غزل کو روانی عطا کرتی ہیں۔آیئے اب ان کے کچھ مقطعے ملاحظہ فرمائیں، جو غزلوں میں چڑھی کمانوں، سخت زمین پر رواں دواں آبشار کے سے لہجے اور ہاتھوں کے چھالے کو نمایاں کر رہے ہیں نیز دنیا کے ستانے پر قلم کو تیر اور غزل کو تیغ کرنے کی دعوت دے رہے ہیں اور فکر پر خون کی بوچھار ہونے پر ملک بھر میں کہرام کا سا منظر ہے، جس سے چشم پوشی کر کے بنگال میں خاموش رہنے کا پیغام دے رہے ہیں۔

شعروں کے یہ تیر مظفرؔ، چڑھی کمانیں غزلوں کی ...... تم جس لہجے میں کہتے ہو شمشیر اور سناں کیا ہے؟

زمیں تو سخت ہے مظفرؔ مگر تمھاری غزلوں کا لہجہ ...... رواں دواں آبشار جیسا طیور کی خوش نوائی سا کچھ؟

کافی ہیں مظفر کی غزل ہے تو جدید ...... اے روایت کے امیں سن تو سہی؟

قلم کو تیز مظفرؔ، غزل کو تیغ کرو ...... نہ باز آئے گی دنیا تمھیں ستانے سے

اے مظفرؔ ترے اشعار لہو میں تر ہیں ...... سوچ پر خون کی بوچھار، عدو ہے کہ اخی

ملک بھر میں ہے مظفرؔ کہرام ...... تجھ کو بنگال میں چپ رہنا ہے

ان مقطعوں میں جہاں تند و تیز موجیں پائی جاتی ہیں، وہیں سکون اور شانت مزاج بھی ہے۔یہی وہ چیز ہے، جو ان کے لہجے میں 'تلوار کی سی کاٹ' پیدا کرتی ہے اور پھر کائنات کی نا آسودگی، باغی ذہن میں خواب وحقیقت کی کشاکش مقطعے کے گرد چکر لگانے لگتی ہیں جس میں زندگی کی ہمک کے ساتھ سیاست کا کرب، حالات کے تغیرات اور روح فرسا مناظر کی منظر کشی جھلکنے لگتی ہے۔آپ خود ہی ملاحظہ فرمائیں کہ مظفر حنفی غزل کے

مصرعے کے لیے کبھی راتیں سیاہ کرتے ہیں تو کبھی سحر انگیز مقطعے کے لیے دہلیز پر چراغ رکھواتے ہیں اور جب ان کی غزلوں میں میرؔ کی نشتریت اترتی ہے تو غزل کی دوربینی کا پتہ دیتی ہے۔ایسا کیوں ہو رہا ہے؟اس لیے کہ وہ مندر مسجد معاملات سے دور رہ کر مسلسل غزلیں کہنا اور تمام اصناف سخن پر غزل کو فوقیت دینا اور نئی غزل کے وسیلے سے آپ بیتی پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔انھیں اس کا یقین ہے کہ وہ دلوں پر مکمل راج کریں گے، اس لیے کہ انھیں سلطنت کی جگہ شاعری ملی ہے۔مظفر حنفی کو یہ بھی احساس ہے کہ ان کے مقلد زیادہ ہیں اور ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو ان کی باتوں پر اپنا رنگ جمانے کی ناکام کوششیں کر رہے ہیں۔

راتیں تباہ کی ہیں مظفرؔ نے بے شمار ...... اک مصرعۂ غزل کے لیے کیا نہیں کیا

اب ہم مندر مسجد والے جو چاہیں کر سکتے ہیں ...... اچھا ہے یہ شوق مظفرؔ، پیہم غزلیں کہتے ہو

چلے ہیں قلب مظفرؔ پہ میرؔ کے نشتر ...... پتہ چلا کہ غزل دوربین کتنی ہے

بُری نہیں ہے مظفرؔ کوئی بھی صنفِ ادب ...... قلم غزل کے اثر میں رہے تو اچھا ہے

مختلف انداز رکھتی ہے مظفرؔ کی غزل ...... یہ ہماری آپ بیتی ہے خبرنامہ نہیں

صدیوں کریں گے راج مظفرؔ دلوں پہ ہم ...... حاصل ہے سلطنت کی جگہ شاعری ہمیں

کسی بھی نام سے غزلیں پڑھو مظفرؔ کی ...... پتے بدلنے سے چہرے نہیں بدل جاتے

مظفر حنفی نے غزلوں کے مقطعے میں 'تنقید' اور 'ناقدین' پر بھی خوب طنز کیے ہیں لیکن یہ طنز بہت ہی خوش گوار ہے، پھر بھی اس طنز کی گہرائی میں ان کی انانیت اور ناقدین کی کج ادائی سانس لے رہی ہے۔

تنقید کہہ رہی تھی، مظفر بہت ہوا ...... ایک آبشار تھا کہ روانی نہیں تھمی

مظفرؔ وہ مرے فن کی بلندی دیکھتی کیسے ...... ادھر تو دیکھ کر تنقید کی دستار گرتی ہے

عہد سازوں میں مظفرؔ کا کوئی ہمسر ہے ...... ایک ناقد سے مری فکر رسا نے پوچھا

کل تک ان کی تکراروں سے تیری غزلیں زخمی تھیں
آج مظفرؔ نقادوں کے جھگڑے میں دیوان گیا

مظفر حنفی نئی غزل کے منفرد شاعر ہیں۔اردو کی نئی غزل پر مظفر حنفی کے اثرات نمایاں ہیں۔ان کے نئے نئے استعارے، کنائے اور علامتیں جدید غزل کی راہیں ہموار کرتی ہیں اور ان کی غزلوں کا مجموعہ 'یا اخی' جدید غزل کا روشن منظر نامہ ہے۔

○○○

ڈاکٹر ظہیر حسن ظہیرؔ
مغل پورہ، مئو ناتھ بھنجن، مئو، رابطہ نمبر: 8736992810

’’قلم غزل کے اثر میں رہے تو اچھا ہے‘‘

بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی کے ایسے شعرا کی فہرست سازی کی جائے جن کی شاعری اپنے منفرد انداز و اسلوب، انوکھے خیالات اور مضامین و موضوع اور زبان و بیان کے اعتبار سے اپنے پیش رو شعرا سے مختلف ہو تو ان میں مظفر حنفی کا نام سب سے نمایاں ہوگا۔

مظفر حنفی ایک فطری تخلیق کار تھے۔ انھوں نے نظم و نثر دونوں اصناف میں اپنی تخلیقی بصیرت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ہمہ جہت لفظ کا اطلاق صحیح معنوں میں ان کی شخصیت پر صادق آتا ہے۔ کیوں کہ انھوں نے جس صنف میں اپنے تخلیقی جوہر کا استعمال کیا اسے اپنی کمال ہنرمندی، شعور و ادراک اور فطری صلاحیتوں کی بدولت حسن و وقار عطا کر دیا۔ موصوف میں بچپن ہی سے شعر گوئی کے آثار نظر آنے لگے تھے، اور انھوں نے غالباً پہلا شعر طالب علمی کے زمانے میں ہی کہا تھا۔ شاعری سے فطری دلچسپی کے سبب انھوں نے شاعری کا آغاز بچوں کے لیے نظمیں لکھنے سے کیا، لیکن درمیان میں ان کا میلان کہانی کی طرف ہو گیا، اور ان کے اندر کا شاعر کچھ عرصے کے لیے اچھا افسانہ نگار بن گیا، اور تقریباً دو دہائی تک انھوں نے ۵۰ / سے زائد افسانے لکھے، اور اینٹ کا جواب، دو غنڈے اور دیدۂ حیراں جیسے افسانوی مجموعے کے ذریعے ایک اچھے افسانہ نگار کے طور بھی سامنے آئے۔ لیکن مظفر حنفی کی اصل شناخت ایک غزل گو کی حیثیت سے قائم ہوئی۔ وہ اپنے ہم عصر شعرا وحید اختر، شہریار، زیب غوری، سلطان اختر، عمیق حنفی، شجاع خاور، مجروح سلطان پوری، مظہر امام، عرفان صدیقی اور بشیر بدر سے اپنے انوکھے اسلوبِ بیان، شعری اظہار کے نت نئے انداز کے سبب تا دیر یاد رکھے جائیں گے۔

مظفر حنفی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے جس صنف کو اپنایا اس کے فن کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ بچوں کا ادب تخلیق کیا تو اس میں بھی پوری دیانت داری اور ایمان داری سے معیاری تخلیقات پیش کیں۔ افسانے کی تخلیق میں بھی اپنی جدت پسند طبیعت کا جوہر دکھایا۔ تحقیق و تنقید، تراجم کے حوالے سے انھوں نے جو کام کیے ہیں وہ بھی قابل داد ہیں۔ ادبی صحافت کے ذریعہ بھی اپنی خدمات پیش کیں۔ لیکن جب صنف غزل کو اپنایا تو

پوری زندگی اس کا ساتھ نبھایا۔ اس مختصر مضمون میں مظفر حنفی کی مکمل ادبی خدمات کا احاطہ کرنا اس لیے ممکن نہیں ہے کہ ان کی خدمات ہمہ جہت ہیں۔ اس لیے اس میں محض ان کی غزلیہ شاعری پر اظہار خیال مقصود ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ مظفر حنفی نے اردو کی سب سے توانا ترقی پسند تحریک کے ابتدائی زمانے یعنی یکم اپریل ۱۹۳۶ء میں آنکھیں کھولیں، اور اس کے شباب کے زمانے میں شاعری کا آغاز کیا، اور دوسری اہم تحریک یعنی جدیدیت کے زمانے میں ان کی شاعری میں کافی پختگی آ چکی تھی اور وہ منفرد انداز و اسلوب کے سبب اردو شعر و ادب میں ایک مستحکم شناخت قائم کر چکے تھے، لیکن ان کی شاعری کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ان دونوں تحریکوں کے نظریات سے اپنی شاعری کو متاثر نہیں ہونے دیا۔ کیوں کہ شاعری اگر نظریاتی حد بندیوں میں جکڑ دی جائے تو پھر اس میں وہ لطف باقی نہیں رہتا جو آزادانہ طور پر اظہار خیال میں ہوتا ہے، اس لیے کہ ہر فرد کی فطرت میں خیال کے اظہار کی آزادی مضمر ہے، اور وہی شاعری دیر تک زندہ رہتی ہے جو کسی تحریک کے نظریات اور اس کے اصول و ضوابط کی پابند نہیں ہوتی۔ اس ضمن میں مظفر حنفی فرماتے ہیں:

> ’’میں ادب میں نظریاتی حد بندیوں کا قائل نہیں ہوں۔ آپ دیکھیں گے کہ حالی نے ضرورت کے تحت جو اصلاحی تحریک چلائی، جب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی تو لوگوں نے اس تحریک سے بغاوت کر کے دوسری طرح کی شاعری شروع کر دی۔ شاعری تو رنگا رنگ ہوتی ہے۔ اگر وہ زیادہ حد بندیوں میں جکڑ دی جائے تو پھر وہ شاعری نہیں رہتی۔‘‘

اردو کی غزلیہ شاعری کی تاریخ پر اگر ہم نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ولی دکنی سے لے کر میر تقی میرؔ تک شاعری کے موضوعات و مضامین میں کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آتی۔ وہی ہجر و وصال کی باتیں، محبوب کے خط و خال کی تعریف اور روٹھنے، منانے، محبوب کی بے وفائیوں کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن میرؔ کے ہی زمانے سے داخلی مسائل کے ساتھ ساتھ خارجی معاملات و مسائل کی ترجمانی غزل میں پائی جانے لگی تھی۔ تاہم غالبؔ تک آتے آتے غزل کا لہجہ یکسر تبدیل ہو گیا تھا۔ غالبؔ اپنے زمانے کے جدید شاعر تھے، انھوں نے اپنے پیش رو شعرا سے موضوعات و مضامین اور انداز و اسلوب کی سطح پر انفرادیت پیدا کرنے کی کوشش کی اور غزل میں نئے مضامین کو جگہ دی۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہر نئی نسل کا مزاج مختلف ہوتا ہے، اور وہ نئی راہ کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے، ورنہ میرؔ و غالبؔ کے زمانے میں بھی بہت سے شعرا تھے جو پرانی ڈگر پر چلتے رہے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میرؔ و غالبؔ کی طرح تا دیر اپنا اثر باقی نہیں رکھ سکی۔

اردو کی تمام اصناف شاعری میں غزل اس لیے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں فرد کی ذات کے داخلی و خارجی معاملات، عصری مسائل، عشق و محبت کی سحر انگیز روداد کے ساتھ ہی قوموں کے عروج و زوال کی داستان بھی موثر انداز میں بیان کی جاتی رہی ہے۔ اس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر عہد کی تہذیب و ثقافت،

تاریخ اور انسانی سماج میں رونما ہونے والے حادثات و واقعات شعر کے قالب میں ڈھل کر عیاں ہو جاتے ہیں۔اس ضمن میں معروف نقاد پروفیسر مولا بخش رقم طراز ہیں:

''غزل دراصل انسانی سرشت سے وابستہ شاعری ہے، جو ہمیشہ اس عنصری انسان (Elemental Man) کو سامنے سے لانا چاہتی ہے، جو دنیا کے مکر و فریب اور تعمیر و ترقی کے نام پر ٹھگ لیا جاتا رہا ہے۔ یہ ایک ایسی شاعری ہے، جس کا بنیادی ایجنڈا عشق و محبت، احترام آدمی اور روحانی ہم رشتگی ہے۔ اس کے ساختیوں میں ہی اجتماعیت اور انسانیت کا پیغام پوشیدہ ہے......غزل بذاتِ خود ایک ضابطۂ حیات اور مخصوص ثقافتی مدلولات پر اصرار کرنے والی صنف ہے۔اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں کہ غزل ہر عہد میں بدل جاتی ہے، بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ غزل کے قالب میں ہر عہد اپنے اعتبار سے سانس لے سکتا ہے۔''

مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں جب ہم مظفر حنفی کی غزلیہ شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ان کی شاعری میں طنز کا جو توانا اسلوب پایا جاتا ہے وہ دراصل ان کے عہد اور سماج میں پائی جانے والی ناہمواریوں کی دین ہے۔انھوں نے غزل کو صرف انوکھا خیال ہی نہیں بخشا بلکہ غزل کی شمع کو اشتعال دینے کے ساتھ ہی نئی زبان بھی عطا کی۔جدت و ندرت ان کے خمیر میں شامل ہے، وہ اپنی الگ راہ بنانا چاہتے ہیں، اس لیے کہ انھیں پرانی ڈگر پر چلنا گوارا نہیں۔ان کے اندر جو طنطنہ، حوصلہ اور بے باکی ہے وہی ان کی پہچان ہے۔ان کا شعری لب و لہجہ ہی مختلف نہیں ہے، بلکہ ان کا انداز فکر بھی مختلف ہے۔اس ضمن میں چند اشعار دیکھیں ۔

غزل کی شمع کو میں اشتعال دیتا ہوں	نئی زبان انوکھے خیال دیتا ہوں
بس کہہ دیا کہ ہم نہ چلیں گے کسی کے ساتھ	پیچھے پلٹ کے دیکھ رہا ہے زمانہ کیوں
عظمت سے ہٹ کے ندرت و جدت کو ناپیے	ہم اور چیز غالبؔ و میرؔ و فراقؔ اور
اس کھردری غزل کو نہ یوں منھ بنا کے دیکھ	کس حال میں لکھی ہے مرے پاس آ کے دیکھ
سوچ نئی ہے لہجہ تیکھا، لفظ کھرے آواز جدا	دانستہ رکھا ہے اپنے شعروں کا انداز جدا

کوئی بھی تخلیق کار جب اپنا خونِ جگر صرف کر کے کوئی تخلیق خلق کرتا ہے تو وہ شاہکار ہوتی ہے۔مظفر حنفی نے غزل کی تخلیق میں نہ صرف اپنا خونِ جگر صرف کیا ہے، بلکہ برسوں ریاضت بھی کی ہے، تب کہیں جا کر ان کے شعروں میں تاب و توانائی پیدائی ہوئی ہے۔مظفر حنفی کو لفظوں کو سلیقے سے برتنے کا ہنر بھی بخوبی آتا ہے۔انھوں نے لفظوں کے وسیلے سے کہیں حسن و عشق کے جذبات کو ابھارا ہے تو کہیں شعلہ و شرارہ جیسی کیفیت بھی پیدا کی ہے۔ان کے نزدیک شعر گوئی کا فن حباب کی طرح نازک ہے، لیکن اسے بھی وہ اپنے کمالِ ہنرمندی کے سبب اٹھانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔اشعار دیکھیں ۔

میں نے ڈبو کے نوکِ قلم اپنے خون میں	جس لفظ کو چھوا وہ شرارہ سا بن گیا
نازک ہے فن شعر مگر طرزِ نو کے ساتھ	ہم اس حباب کو بھی سلامت اٹھائیں گے
مرا کمال ہنر میری صاف گوئی ہے	صعوبتیں بھی اسی بات پر اٹھاتا ہوں

تقسیم ہند کے المیے کو ہر حساس شخص نے محسوس کیا، خصوصاً شعرا اور ادبا نے اس کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔اس المناک حادثے کے وقت مظفر حنفی نے عمر کی صرف گیارہ بہاریں دیکھی تھیں، اور اس حادثہ کا دردناک منظر ان کے ذہن و دل پر نقش ہو گیا، چنانچہ جب ان کا شعور بیدار ہوا، نیز اپنے احساسات و جذبات کو پیش کرنے کا تخلیقی ہنر آیا تو اس کرب کو انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ اجاگر کیا۔ان کے لہجے میں جو درد و سوز ہے اس سے ان کی داخلی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔چند اشعار دیکھیں ۔

کس لیے صحن میں دیوار ہے پوچھو ان سے	کون بٹوارے پہ تیار ہے پوچھو ان سے
اب جو بٹوارہ ہوا تو مورتی بھگوان کی	بانٹ لی جائے گی دو ٹکڑے برابر کاٹ کر
سائے مچل رہے ہیں چراغوں کی گود میں	سمجھے تھے ہم کہ گھر سے اندھیرا نکل گیا

کوئی بھی فن کار اپنے عہد کے مسائل سے روگردانی نہیں کر سکتا۔مظفر حنفی نے بھی اپنی شاعری میں اپنے عہد کی نارسائیوں، رشتوں کی پامالی، اقدار کی شکست و ریخت، تہذیبی زوال، ذہنی انتشار، سماجی ناہمواری، انسانی جذبات و احساسات کی ناقدری، سیاست کی کجروی، انسانوں کے ہاتھوں انسانیت کے سفاکانہ قتل عام، سرد پڑے ہوئے محبت و رواداری کے جذبے، معاشرتی نظام کے کھوکھلے پن اور انسانوں کے ذریعہ انسانوں پر کیے جا رہے بے دریغ ظلم و ستم، مکر و فریب، دوسروں کا استحصال کر کے اپنی زندگی کو خوش گوار بنانے اور بے بس و مجبور انسانوں کی حالت زار پر آنسو بہانے کے بجائے ان کا مذاق اڑانے جیسے غیر اخلاقی اور غیر انسانی رویے پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ان کے اشعار میں ان کے عہد کا سماجی رویہ مصور ہو گیا ہے۔اس بابت مولا بخش فرماتے ہیں:

''مظفر حنفی نے اپنی شاعری میں ہمارے زمانے یعنی اکیسویں صدی کو کچھ اس طرح سے پیش کیا ہے کہ ہم ان کی شاعری کو اپنے عہد کے زندہ سوالوں سے جوڑ کر زندگی کی راہوں میں پھیلے اندھیروں سے نباہ کرنے کا ہنر حاصل کر سکتے ہیں۔ان کی شاعری واقعتاً زوال صدی کا ایک ایسا دل فگار رزمیہ ہے جس سے آنے والے عہد میں بھی قارئین روشنی حاصل کر سکتے ہیں۔مظفر حنفی ہمارے عہد کی شاعری میں ایک ایسا نام ہے جسے بھلانا ناممکن ہوگا۔''

مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں جب قاری مظفر حنفی کی شاعری کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے ان کی شاعری میں ہمارے عہد کی تمام کھردری سچائیاں پوری حسن و خوبی کے ساتھ دکھائی دیتی ہیں۔ان کے لہجے میں کہیں خوش گواری ہے تو کہیں طنز کی کاٹ بہت گہری ہے۔ان کی شاعری میں استعمال کی گئی لفظیات میں تیر و نشتر کی جو

تیزی در آئی ہے اس کے مختلف محرکات وعوامل رہے ہیں۔انھوں نے اپنے استاد شادؔ عارفی کا طنزیہ اسلوب ضرور اختیار کیا،لیکن اس میں ان کا اپنا تجربہ ومشاہدہ بھی شامل ہے۔چند اشعار دیکھیں ۔

میں قصبے کا بھولا پنچھی اندر باہر ایک
جس شہری نے ہاتھ ملایا کاٹ لیا پر ایک

طوفاں سے کیا باتیں کی ہیں پیارے مانجھی سچ بتلانا
دریا کو گروی رکھا ہے یا ساحل کو بیچ دیا

میں شاعر ہوں مری پرچھائیں مستقبل پہ پڑتی ہے
مگر تاریخ کی ہر چوٹ میرے دل پہ پڑتی ہے

ٹوٹتی رہتی ہے سینے میں مسلسل کوئی شے
درد مصروف ہے راتوں کو سحر کرنے میں

مختلف انداز رکھتی ہے مظفرؔ کی غزل
یہ ہماری آپ بیتی ہے خبرنامہ نہیں

ابھی درخت پہ پتھر چلا رہا تھا میں
گرے ہیں پھل تو انھیں چوم کر اٹھاتا ہوں

مذکورہ بالا اشعار پر غور کریں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مظفرؔ حنفی کا مخاطبہ نرالا ہے۔پہلے شعر میں معصوم انسان کے دکھ درد کو بیان کیا گیا ہے۔دوسرے شعر میں شاعر نے رہنماؤں سے سوال کیا ہے اور صورتِ حال سے آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔تیسرے شعر میں تعصب وتنگ نظری کی سخت جانی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ کس قدر بری شے ہے جو صدیوں میں بھی ختم نہیں ہوتی ،جس کا خسارہ بھروسے کی عمارت ٹوٹنے کی صورت میں سامنے آتا ہے۔علاوہ ازیں دیگر اشعار میں بھی مظفرؔ حنفی نے اپنے عہد کے انسانوں کے دکھ درد، بے حسی، بے چارگی اور غیر یقینی صورت حال کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

اردو شاعری میں کربلا کو بہ طور استعارہ استعمال کرنے کی ایک مستحکم روایت موجود ہے۔مظفرؔ حنفی نے موجودہ عہد کے المیے کو کربلا میں پیش آنے والے ظلم وجبر سے جوڑ کر دیکھنے کی کوشش کی ہے۔علاوہ ازیں انھوں نے غزل کے بنیادی موضوع کو بھی متنوع انداز میں پیش کیا ہے۔کلاسیکی روایت کی پاس داری بھی ان کی شاعری میں خوب صورت اور نئے انداز واسلوب میں پائی جاتی ہے۔تشبیہات واستعارات،تلمیحات ،علامات،نت نئ تراکیب،مروج اور رواں بحروں نیز نئ زمینوں میں شعر کہنے کا ہنر اور محاورے کا استعمال بھی انوکھے اور منفرد انداز میں پایا جاتا ہے۔ان سب کے باوجود ان کی غزلوں میں ان کا ذاتی درد وکرب،سماج میں انسانوں کے ساتھ کیے جا رہے ناروا سلوک جیسے مسائل پوری تب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔اس تعلق سے شمیم حنفی لکھتے ہیں:

”کلاسیکی شاعری کے مانوس رنگوں،لہجوں اور لسانی مضمرات کی آگہی کی سطح ان کے یہاں اتنی ہی نمایاں ہے جتنی کہ خلیل الرحمن اعظمی،حسن نعیم،ظفر اقبال اور عرفان صدیقی جیسے شاعروں کے کلام میں۔لیکن جو بات انھیں اپنے عہد کے دوسرے نو کلاسیکی شاعروں سے الگ کرتی ہے وہ سماجی برہمی،طنز اور تناؤ کی نوکیلی کیفیتیں ہیں۔“

اسی طرح مظفرؔ حنفی نے اپنی شاعری میں جن نئ زمینوں اور جدید انداز کے قوافی اور ردیف کا استعمال کیا

ہے، وہ بھی کافی متاثر کن ہے،اور قاری کو مطالعہ پر مجبور کرتا ہے۔انھوں نے جس انداز سے اپنی شاعری میں نئے الفاظ اور نئے مضامین کو برتا ہے وہ بھی ان کی فنی پختگی اور بالغ نظر ہونے کی دلیل ہے۔انھوں نے نئے موضوعات ومضامین کو برتنے سے گریز نہیں کیا بلکہ اس کو اس نداز سے برتا ہے کہ ان کی غزلوں میں زمانے کے مسئلے آکر رنگ رخِ بتاں کی طرح حسین ہو گئے ہیں۔ان کی شاعری سے متعلق شمس الرحمن فاروقی کی صائب رائے بھی بڑی معنی خیز ہے۔وہ لکھتے ہیں ۔

”مظفر حنفی نے انتہائی شگفتہ زمینوں میں رواں دواں شعر کہے ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ نئے نئے ردیف وقافیہ کا ایک فوارہ ہے جو ابلتا جا رہا ہے۔ان کی شاعرانہ چالاکی کہیں مات نہیں کھاتی...... غزل میں دنیا داری اور پنچایتی رنگ بھی ہوسکتا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ شاعر کو ندرت کی تلاش ہو، وہ نئے الفاظ اور مضامین کو ’مضر‘ نہ سمجھے،ان سے پرہیز نہ کرے، بلکہ انھیں غزل کے مزاج کے موافق بنائے۔“

مذکورہ بالا اقتباسات کے تناظر میں مظفرؔ حنفی کے غزلیہ اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

سر پہ تلوار لٹکنے کا مزہ کہتا ہے
اور کچھ دیر ابھی سر نہ ٹھایا جائے

سیراب ہو چکے ہوں اگر آپ تو چلیں
تشنہ لبی کا عرس منائیں فرات پر

آج تک آزما رہی ہے مجھے
کربلا پھر بلا رہی ہے مجھے

لائق دید وہ نظارہ تھا
لاکھ نیزے پہ سر ہمارا تھا

ایسا لگا سمٹ سی گئی ساری کائنات
اس نے کمر کے گرد جو ساری کو بل دیا

اگی ہے دوب بھی یہاں ترے بدن جیسی
کھلے ہیں پھول یہاں بھی ترے لبوں کی طرح

دیکھنا کیسے ہمکنے لگے سارے پتھر
میری وحشت کو تمھاری گلی پہچانتی ہے

صحن چمن کا تم کو جو نگراں بنا دیا
تم نے تو چار دن میں بیاباں بنا دیا

آنکھ سے دامن تک آنے میں یہ حالت ہوگئی
خون کا قطرہ بھی آدھا زرد آدھا سرخ ہے

مذکورہ بالا اشعار کی قرأت سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ مظفرؔ حنفی کا مطالعہ ومشاہدہ کس قدر عمیق ہے۔ان کی غزلوں میں عصری حسیت کی کارفرمائی بھی ہے اور تخلیقی وفنی حسن کی جلوہ گری بھی۔فکر وخیال میں تازگی بھی ہے اور لہجے میں کرختگی بھی۔ان کے نگار خانۂ شاعری میں زندگی کے مختلف رنگ پائے جاتے ہیں۔یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ان کی شاعری میں غزلیہ شاعری کی تمام خوبیاں موجود ہیں اور اس میں تادیر زندہ رہنے کے بھرپور امکانات بھی ہیں۔

○○○

سرور مہدی
ایچ۔ایس کالج مدھیپورہ، بہار، رابطہ نمبر: 9452259955

’دیپک راگ‘ کی روشنیاں

مظفر حنفی کا نام آتے ہی ذہن میں ان کی کثیر التعداد تصانیف گردش کرنے لگ جاتی ہیں۔ بسیار گوئی اور بسیار نویسی کو ناقدین اگر عیب نہ بھی گردانیں پھر بھی تصنیف کے ایک بڑے حصے پر خط تنسیخ کھینچ دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ مشاہدات اس بات پر دلیل ہیں کہ ناقدین ادب کہیں نہ کہیں اپنے اس عمل میں حق بجانب ہیں۔ ضخیم دواوین کے مطالعہ کے بعد مجموعی تاثر یہی ہوتا ہے کہ بے شمار خزف ریزوں کے درمیان چند گوہر آبدار ہیں۔ کثیر تعداد میں اشعار کہنے والے بعض شعرا نے اپنے دیوان کو شاید اسی خوف کے زیر سایہ مختصر سے مختصر تر کر دیا۔ غرض کہ بسیار گوئی اور بجا گوئی یا بسیار گوئی اور خوش گوئی کو جمع کر دینا جوئے شیر نکالنے سے کسی طور کم نہیں ہے۔ مظفر حنفی ایسے خوش نصیب شعرا میں سے ہیں جن کی خوش گوئی کو بسیار نویسی نے کہیں سے ضرب نہیں پہنچائی۔ انھوں نے خوب لکھا، شب و روز لکھا پھر بھی خوب سے خوب تر لکھا۔ ادب کی مختلف اصناف کی انھوں نے آبیاری کی اور ثمر ہائے گوناگوں سے ہر شاخِ ادب کو مالا مال کر دیا۔ غزل کو انھوں نے کئی جہات سے متاثر کیا۔ ان کی غزلوں کے کئی مجموعے دنیائے ادب میں مقبول خواص و عوام ہوئے۔ زیرِ نظر مقالے میں مظفر حنفی کی غزل گوئی پر ان کے صرف ایک مجموعہ ’دیپک راگ‘ کے حوالے سے گفتگو مقصود ہے۔ اس دیپک راگ میں معنی کی کتنی روشنی ہے اور بحور و اوزان کے کتنے ترنم پوشیدہ ہیں، یہی جائزہ لینے کے لیے فکر و فن کی پرتیں کریدی گئی ہیں۔

’دیپک راگ‘......ایک ایسا شعلہ ہے جس کی جانب دنیائے ادب کو بے ساختہ متوجہ ہونا ہی پڑا، جس نے اپنے ہونے کا پتہ بھی دیا اور سماج کو نشیب و فراز سے باخبر بھی کیا۔

’دیپک راگ‘......کسی غیرت ناہید کی تان نہیں ہے بلکہ اس سماج دیدہ شخص کے سلگتے ہوئے تاثرات ہیں جس نے عدم انصاف، نابرابری اور استحصال کے بے شمار مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ پھر اپنے سینے میں جمع چنگاریوں کو نغمے کا لباس پہنا کر ’دیپک راگ‘ کی شکل میں زیبِ قرطاس کیا۔ انھیں یقین ہے کہ ’دیپک راگ‘ کے اشعار اپنے پیراہن نغمگی کے اندر بھی رقص شرر کے مناظر پیش کریں گے۔ اس شرارہ کو وہ

بجھنے نہیں دینا چاہتے اور بڑی تمکنت کے ساتھ آواز دیتے ہیں۔

یوں ہی شعلے کو ہوا دیتے جا
اپنے ہونے کا پتا دیتے جا

’دیپک راگ‘ کی عنوانی ترکیب کے برعکس مجموعہ کے اشعار میں ہندی تراکیب خال خال ہی ملتی ہیں۔ اس طرح کی تراکیب عموماً چھوٹی بحروں کی غزلوں میں نظر آتی ہیں۔ اکثر اشعار عمدہ فارسی ترکیب، کلاسکی مضامین اور قدما کے اسلوب سے ضیافت کرتے ہیں۔ ایسے اشعار ہمیں یہ باور کراتے ہیں کہ مظفر حنفی کو ادب کا بالیدہ شعور ہے جس میں ان کے عمیق مطالعہ کو خاصا دخل ہے۔ جب حنفی صاحب قدیم تراکیب واصطلاح کو عصری مضامین کی ادائیگی میں صرف کرتے ہیں تو یقیناً قاری کو خوش گوار حیرت سے دوچار کرتے ہیں۔ داستانی کرداروں اور اساطیری اشیاء کو غزلوں میں صرف کرنا ایک جہت سے قارئین غزل کو نیا ذائقہ عطا کرنے کے ساتھ ساتھ کلاسکیت کو نئے پیرہن میں باز پیش (Re Present) کرنے کے مترادف ہے۔ ایسے بعض اشعار میں تلمیحات کا خوب صورت اور نادر پہلو ملتا ہے۔

خزانہ کب ملے گا عصر نو کے سندبادوں کو
سفر کے زعم میں پتھر اٹھا لائے خلا سے ہی

رشتوں کے مابین کھڑی ہے شیشے کی دیوار
رستم ہی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے سہراب

شہر تمنا کی صداؤں میں ہے
سلسلہ کوہ ندا دور تک

اس بار جانے کون سے رانجھے کا ہاتھ ہے
سنتے ہیں پھر کنویں میں کوئی ہیر گر پڑی

کلاسکی ادب کے گہرے مطالعہ کے باعث شعرائے متقدمین کے اثرات ان کی غزلوں کے موضوعات اور مضامین پر بھی پڑے ہیں۔ میرؔ، غالبؔ اور مومنؔ جیسے دہلوی شعرا کے رنگ کے ساتھ آتشؔ و ناسخؔ کے رنگ سخن سے بھی مضامین میں کافی تنوع اور رنگارنگی پیدا ہوئی ہے۔ ایسا کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ مظفر حنفی کی غزلیں ایسا نگار خانہ ہیں جس میں کئی دبستان اور کئی ادوار کی شکلیں بآسانی دیکھی جا سکتی ہیں۔ میر کے رنگِ سخن میں جو اشعار کہے ہیں ان میں غمنا کی بھی ہے اور میر جیسا خروش بھی ہے۔

لٹ پٹ کر بھی اتنا کچھ تو باقی ہے
جلتے آنسو، ٹھنڈا خون، سسکتی چیخ

اس شعر کو ذرا ٹھہر کر پڑھیے۔ پڑھ کر ٹھہریے اور غور کیجیے تو ہر ہر لفظ خون کی ایک بوند نظر آتا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں تین موصوف الفاظ اپنی صفات سے ملحق کر کے رکھ دیئے گئے ہیں لیکن یہ تین مرکب الفاظ ہر عہد کے مظالم کی ایک مکمل دستاویز ہیں۔ جہاں یہ شعر میر جیسی رقت قلبی کا مظہر ہے تو وہیں یہ شعر میر کے خروش اور مقابلہ با حالات کا منظر بھی پیش کرتا ہے۔

شکست کھا چکے ہیں ہم مگر عزیز فاتحو!
ہمارے قد سے کم نہ ہو فرازِ دار دیکھنا!

اس شکستگی میں وہی حوصلہ ہے جو میر کے بعض ان اشعار میں ہے جو شکستگی اور ریختگی کے ماحول میں دل

کو آمادۂ عمل کرتا ہے اور دلِ ناتواں کو مقابلہ کے میدان میں کھڑا کرتا ہے۔

ہر دور میں غالب نے ہر ذی علم اور با مطالعہ شخصیت کو متاثر کیا ہے۔ مظفر حنفی بھی اس عظیم شاعر سے غایت درجہ متاثر ہوئے ہیں۔ مضمون کی پیش کش ہی نہیں بلکہ زمینوں کے انتخاب تک میں جا بجا غالب سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ بعض مقامات پر تراکیبی اور اصطلاحاتی اشارے بھی قاری کو دیوانِ غالب کا سفر کراتے ہیں۔ مثلاً غالب کا یہ شعر لیجیے۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو   بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

عہدِ حاضر کے رموز نا آشنا شعرا جب تشبیہ واستعارہ کی بے جا 'جگت بندی' پر آمادہ ہو گئے اور تشبیہات و استعارات کے خالی از معنی ظروف سجانے شروع کر دیے تو مظفر حنفی اس شعر کی اصطلاحات کا سہارا لے کر تیکھا طنز کرتے ہوئے منصۂ شہود پر آتے ہیں۔

گفتگو حق پہ نہیں دخل تصوف میں نہیں   بے محل تذکرۂ ساغر و مینا کیسا

'دیپک راگ' کے سرسری مطالعہ سے بھی یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ صاحب مجموعہ غالب کی زمینوں پر بھی کئی خوب صورت عمارت تعمیر کر چکے ہیں۔

میں نے کہا حیات کے کٹنے کا حل بتا کہ یوں   بولا زبانِ حال سے بجھتے ہوئے دیا کہ یوں

اس شعر کا گہرائی سے تجزیہ کیا جائے تو قالب غالبؔ کا ہے اور روح میرؔ کی۔ غالب کی زمین پر کہا گیا یہ بلیغ شعر میر کے اندازِ بیان اور فکری عنصر کو بھی سمیٹے ہوئے ہے۔

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات   کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

مظفر حنفی نے اپنے مقطع میں معنویت اور جامعیت کے اعتبار سے مومن کے انداز کو جس طرح زندہ کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مقطع کے اکثر اشعار میں تعلّی آمیز انداز بیان ملتا ہے جو اردو کے کلاسیکی ادب کی ہی دین ہے۔ زمینوں کے انتخاب پر بھی مومن کی پرچھائیں نظر آتی ہے۔ فی الوقت ان کے جامع مقطعوں کا لطف اٹھایئے۔

کوئی زحمت نہ کرے غازۂ فردا کے لیے   رنگ اشعارِ مظفر سے نکل آئے گا
سفر کا خوف تم کو تجربوں سے باز رکھتا ہے   غزل نے رنگ بدلا ہے مظفر کی خطا سے ہی
مظفر میری غزلوں پر انہی کے رنگ ملتے ہیں   ہر اک نامہرباں پر مہربانی دیکھنا میری

مظفر حنفی کی غزلوں میں کلاسیکی رنگ کے غلبے کے باوجود بھی احتجاجی لہجہ مدھم نہیں ہو سکا ہے۔ اس احتجاج کی پیداوار وہ عصری ماحول ہے جس میں مظفر حنفی زندگی کر رہے ہیں۔ ظلم و زیادتی، تعدی، فریب دہی، استحصال، شقاوت وغیرہ بے شمار رذائل سے عبارت دنیا اور سماج ان کے پیش نظر ہے۔ ان کے قلم کا تیز و تند نشتر ان ناسوروں کو ابھار ابھار کر سامنے لاتا ہے۔ اس معاملہ میں مظفر حنفی کے قلم نے کہیں سے بھی رعایت نہیں سیکھی

ہے۔ ان کی حق گوئی اور بے باکی پوری سچائی اور دیانت داری کے ساتھ قلم کی انگلیاں تھام کر پیش پیش چلتی ہیں۔ اپنے گرد و پیش کے پورے ماحول کو ایک کامیاب مصور کی طرح وہ اپنی شاعری کے کینوس پر اتار دینے میں کامیاب رہے ہیں۔ جن حالات کو فن کار اپنے فن پارہ میں پیش کر رہا ہو جب وہ از حد تلخ ہوں تو پھر فن کار سے اس کے لہجہ یا زبان کی تلخی کی شکایت بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ مظفر حنفی کے لب و لہجہ کی طنزیت اور نشتریت ان کے اپنے ماحول کی پروردہ ہے۔ ان کے الفاظ و تراکیب میں احتجاج کے شعلے بار بار بھڑکتے ہیں اور مظالم پر مبنی نظام کو جلا کر خاکستر کر دینا چاہتے ہیں۔ احتجاج کو موثر بنانے کے لیے دنیائے ہست و بود کے عظیم معرکۂ خیر و شر یعنی سانحۂ کربلا کی علامات کا سہارا لیا ہے۔ 'دیپک راگ' میں ایسے اشعار کثیر تعداد میں موجود ہیں جن میں کربلائی علامات پائی جاتی ہیں بلکہ کربلائی کردار بھی استعاراتی پہلو سے ترغیبِ عمل دیتے ہیں۔ یہ انداز ہمیشہ سے اردو غزل میں وجود رکھتا رہا ہے۔ قدیم اردو ادب میں یہ انداز بیان اس قدر واضح نہیں تھا لیکن دھیرے دھیرے یہ علامات نکھرتی گئیں اور علامتوں کے پہلو بہ پہلو کربلائی کردار بھی استعارہ بن کر ہر عہد پر محیط ہو گئے۔ 'دیپک راگ' کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

تو کیوں فرات میں سرخی نظر نہیں آتی   اگر حسین ہے اطرافِ کربلا میں کوئی
پانی پناہ دے نہ ہوا راہ میں ملے   ایسے مقامِ کرب و بلا راہ میں ملے
اور ہم سب کو سرفراز کرو   نیزہ نیزہ گھماؤ سر سب کے

معنی و مفہوم کی ایسی قندیلوں سے یہ مجموعۂ کلام قدم قدم منور ہے۔ نغمگی کے حوالے سے بھی اس مجموعہ کی غزلیں بڑی مترنم ہیں۔ بحور کے نئے نئے تجربات شاعر کی علم عروض پر دسترس کے غماز ہیں۔ مروجہ بحروں کے علاوہ چھوٹی بحروں اور طویل ارکان کی مشکل بحروں پر خاصی غزلیں موجود ہیں۔ میر کی طرح مظفر حنفی اپنی غزلوں میں کبھی تکرار لفظی سے موسیقیت پیدا کرتے ہیں تو کبھی نادر اور پُر از ترنم ردیفوں کے استعمال سے۔

ہنگامہ ہائے شعلہ و شبنم سفر سفر   پرچھائیاں، تکان، شبِ غم سفر سفر
بیٹھے کہیں تو ریت ہمیں چاٹ جائے گی   چلیے اگر تو چشمۂ زمزم سفر سفر
قصہ یہ ہے اک شیشہ تھا، اک پتھر تھا، پھر کیا تھا   اس نے مجھ کو میں نے اس کو چھو کر دیکھا پھر کیا تھا

دشوار افاعیل و اوزان میں کہی گئی ان کی متعدد غزلیں اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتی ہیں کہ اس نواح میں کتنے ہی مجنوں برہنہ پا آتے رہیں گے اور سنگلاخ زمین پر سیاحت کے شغل سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔ یہ صحرائے پر آشوب دشت نوردوں سے خالی نہ ہوگا۔ دیوانے آتے رہیں گے اور مظفر حنفی کے پرچم کو بلند کرتے رہیں گے۔

وقت مجھے بکھیر کر کہتا ہوا نکل گیا   ایک شرار بھی ترے مشتِ غبار میں نہیں

مذکورہ شعر عروض پر ان کی مضبوط گرفت کا ثبوت ہے۔ اقبالؔ اور غالبؔ جیسے عظیم اور قدآور شعرا نے جن اوزان میں شگوفے کھلائے ہیں، اس بحر کو حنفی صاحب نے کتنی کامیابی سے برتا ہے۔ مشکل وزن کو برتتے ہوئے نہ شعر میں سقم پیدا ہوا ہے اور نہ حشو داخل ہوا ہے۔ ایک نتھرا ہوا، گتھا ہوا چست شعر ہے جس پر بندش کے ساتھ ساتھ معنی آفرینی بھی داد دیتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ دیکھیے...... محسوس کیجیے...... کس طرح شاعر اپنے دل وجگر کی آگ ہر دل میں منتقل کر دینا چاہتا ہے۔ کیسے اپنی دلسوزی کو بنی آدم میں تقسیم کر دینے کا خواہشمند ہے۔ کیسے حرارتِ عمل کو ہر فرد بشر کو ودیعت کر دینا چاہتا ہے۔ لہجہ انتہائی ہے، تاکیدی ہے۔ شاعر بنی نوع انسان کو خبردار کر دینا چاہتا ہے کہ اگر اس پیکر خاکی میں احساس وعمل کی چنگاریاں نہ موجود ہوئیں تو وقت کی تیز وتند ہوائیں ایسے پیکر بشر کو مشتِ خاک کی طرح بکھیر کر آگے بڑھ جاتی ہیں۔

لکھنوی دبستان کو زمین کی سنگلاخی اور گوناگوں بندش طبعی کی خامیوں کا ذکر کرتے ہوئے شعرا و ناقدین نے جس طرح نظر انداز کیا، اس کے باعث دبستان لکھنؤ کا رنگ سخن جدید عہد کے چمنِ شاعری سے یکسر مفقود ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس اسلوب نے سادگی اور برجستگی کو زک پہنچائی تھی لیکن کوئی رنگ یا اسلوب پوری طرح خارج بھی نہیں کیا جاسکتا۔ بعض تبدیلیوں کے ساتھ اس کے مفید پہلو سے استفادہ بھی کیا جاسکتا ہے نیز بعض مواقع پر اس پیرایۂ بیان کی احتیاج بھی ہوسکتی ہے۔ مظفر حنفی اپنی مشاقئ سخن دکھاتے ہوئے اس طرح کی سنگلاخ زمینوں میں بھی غزل کہتے ہیں لیکن یہاں بھی صرف قدرت کمال کا اظہار بھر نہیں کرتے نہ ہی سخت زمینوں میں روایتی مضامین پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان سخت زمینوں پر عصری مسائل کو بے طرح بیان کرتے ہیں اور یہ مظفر حنفی کا اپنا نایاب فن ہے۔ اس شعر کو ملاحظہ کیجیے اور محسوس کیجیے کہ شاعر زمین کی سنگلاخی کے باوجود اپنے نصب العین سے پیچھے نہیں ہٹا ہے۔ باغیانہ تیور بھی ہے، احتجاجانہ لہجہ بھی، کرخت اور نڈر زبان بھی ہے، عصری مضمون بھی ہے۔

مرا عمل ہے ترے خوب وزشت میں داخل　　　کسان ہی کا پسینہ ہے کشت میں داخل

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اس مجموعہ کے مطالعہ سے قاری کو بیک وقت کلاسیکی لذت، عصری حسیت، جمالِ غزل، جلالِ سخن سبھی کچھ فراہم ہوسکتا ہے۔ جہاں اشعار سے معنی کی روشنیاں پھوٹی پڑتی ہیں وہیں بحور کے ساز سے مشاقی کے نغمے بھی سنائی دیتے ہیں اور ان کے ساتھ کہیں سلگتا اور کہیں بھڑکتا ہوا احتجاجی تیور بھی ہے۔ یہی سب عناصر مل کر اسے 'دیپک راگ' بناتے ہیں۔



نجف علی
ریسرچ اسکالر شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، رابطہ: 7607531737

مظفر حنفی: منفرد غزل گو

اثر پذیری کے لحاظ سے اگر شعرا کی تقسیم بندی کی جائے تو ان کی دو قسمیں بنتی ہیں: ایک قسم ان شعرا کی ہے جو ماسبق شعرا کے اشعار اور دواوین کا مطالعہ کرتے ہیں پھر ان سے اثر قبول کرتے ہوئے انھیں کے نہج پر فرسودہ، متروک اور غیر متعلقہ مضامین کو اپنے اشعار میں برتتے ہیں۔ چوں کہ یہ اشعار زمانۂ حال سے مطابقت نہیں رکھتے اس لیے وہ قاری کی رگ حسیت کو بھڑکانے سے قاصر رہتے ہیں اور ان سے وہ تحریک وترغیب حاصل نہیں ہوتی جو ایک شاعر کا مطمح نظر ہوتا ہے۔

دوسری قسم ان شعرا کی ہے جو حالات وواقعات کا مشاہدہ کر کے ان کا تجزیہ کرتے ہیں اور زمانے میں رونما ہونے والے تغیرات وتحولات سے متاثر ہو کر ایک نئی طرز فکر کو جنم دیتے ہوئے نئے نئے مضامین تخلیق کرتے ہیں اور ان کے اظہار کے لیے جدید اسلوب اور پیرائے کا انتخاب کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے اشعار میں جدت، انفرادیت اور مطابقت پیدا ہو جاتی ہے۔

مظفر حنفی کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے رومانیت سے بھرپور غزل کے لہجہ کو ترک کر کے سخت اور درشت لہجہ اپنایا اور عشق ومحبت سے لبریز جذبات کو پس پشت ڈال کر پامال ہوتی ہوئی اخلاقی قدروں اور سماجی ومعاشرتی تنزلی کو تیکھے انداز اور کھردرے الفاظ میں اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

مظفر حنفی ان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے روایت پرستی اور فن شاعری کے جامد تصورات سے بغاوت کر کے ایک الگ اور منفرد نہج اور اسلوب اپنایا۔ وہ ان سنجیدہ اور عزم مصمم رکھنے والے شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اپنی ذات کو شاعری کے لیے وقف کر دیا اور اس ریاضت ومشقت سے گزرے ہیں جس کے بغیر شاعری میں الگ شناخت اور منفرد مقام پیدا کرنا ناممکن ہے۔ ان کے اشعار کا مطالعہ کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شاعری درجہ بہ درجہ ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔ اس لیے کہ ان کی ہر غزل سابقہ غزل کے مقابلہ میں ایک خاص قسم کی شگفتگی اور چبھن رکھتی ہے۔

بچپن کے زمانے سے ہی مظفر حنفی کو شعر و شاعری سے رغبت تھی۔ رغبت اور دلچسپی کی ایک وجہ آپ کی طرزِ تعلیم بھی ہے جہاں پر پانچویں کلاس سے ہی شعر گوئی کے لیے حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ وہ اس طرح رقم طراز ہیں:

"اردو میں مولانا محمد حسین آزاد کی ریڈریں چلتی تھیں، نہ صرف اشعار کی تقطیع ہم سے کرائی جاتی تھی بلکہ کبھی کبھی مصرع ہائے طرح دے کر ان پر ڈنڈے کے زور سے طبع آزمائی کے لیے مجبور کیا جاتا تھا۔ دوسری عالمگیر جنگ ختم ہوئی تھی تو ہمارے سامنے مصرع طرح تھا۔

ع: سمندر میں گرے گا خون کا دریا رواں ہوکر

میں نے بھی الٹے سیدھے چند اشعار کہے تھے جس کا ایک شعر یاد رہ گیا ہے۔ عرض کرتا ہوں۔

جوانی کی دعا بچوں کو ناحق لوگ دیتے ہیں
یہی بچے مٹاتے ہیں جوانی کو جواں ہوکر

یاد رہ جانے کی وجہ یہ ہے کہ اس پر برسرِ مشاعرہ (کلاس روم میں) میری خوب پٹائی ہوئی تھی کہ اکبرالہ آبادی نامی جج کا یہاں سرقہ کیوں کیا۔ ہمارے ایک کلاس فیلو کیشو کا انتقال ہوا......تو ایک مرثیہ لکھا، جس کا ٹیپ کا بند تھا۔

یاد کیشو کی جب ستاتی ہے   آنکھ کیا کیا لہو بہاتی ہے

اس طرح الٹے سیدھے شعر کہنے کی ابتدا میں نے نو سال کی عمر سے کی۔" (۱)

مظفر حنفی کے اشعار میں جو طنز و تشنیع اور برہمی کے عناصر پائے جاتے ہیں ان میں نامساعد حالات کا بھی دخل ہے اور شاد عارفی کی شاگردی کا بھی۔ ۱۹۶۲ء میں جب مظفر حنفی نے شاد عارفی کی شاگردی اختیار کی تو ان کی سفارش پر روایتی شاعری کو خیر باد کہہ دیا اور طنز و تشنیع، شوخی، بے باکی اور برہمی کا لہجہ اختیار کر لیا۔ ان کے دو شعری مجموعے 'تیکھی غزلیں' اور 'صریرِ خامہ' اس طرح کے اشعار سے پر ہیں۔ شاد عارفی سے متاثر ہونے کا واقعہ وہ یوں نقل کرتے ہیں:

"یوں تو وہ چالیس پینتالیس سال سے لکھ رہے تھے لیکن شاد عارفی کی تخالیق نے مجھے ۴۸ء سے اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ ہند و پاک کے تمام سہ ماہی، دو ماہی اور ماہانہ جریدوں کے ساتھ ساتھ روزناموں اور ہفت روزہ پرچوں میں ایک ہی شاعر اپنا مخصوص رنگ برقرار رکھتے ہوئے نئی تخالیق کے ساتھ کیسے چھپ لیتا ہے۔ ان پرچوں میں معیاری علمی و ادبی رسائل بھی تھے۔ تفریحی لٹریچر پیش کرنے والے کثیر الاشاعت رسائل بھی اور رسمی و فصلی پرچے بھی۔" (۲)

اس کے بعد شاد عارفی کی شاعری کی خصوصیات، انفرادیت، امتیاز، تلخ و ترش لہجے کے اسباب بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"اس مسلمہ حقیقت کو دہرانا غلط نہ ہوگا کہ موصوف اردو شاعری میں ایک مخصوص طرز کے موجد تھے اور گنتی کے ان چند شاعروں میں تھے جو اپنے لہجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے حالات زندگی اول تا آخر کچھ اس قسم کے رہے کہ مزاج کی تلخی ان کی روح میں رچ بس گئی تھی۔ اس کے باوجود ان کے اشعار میں خدا یا مذہب پر کوئی طنزیہ شعر تو کجا کہیں گستاخی کا پہلو بھی نہیں نکلتا بلکہ بسا اوقات میں اپنے اشعار میں خدا و مذہب یا بزرگان دین کے سلسلہ میں شوخ لہجہ اپنانے پر ان سے پھٹکار سن چکا ہوں۔" (۳)

لہجے میں تلخی اور ترشی پیدا ہوجانے کے جو اسباب مظفر حنفی نے اپنے استاد کے سلسلہ میں بیان کیے ہیں آپ خود بھی زندگی میں انھیں حالات سے دوچار رہے۔ یقیناً آپ کی شاعری میں جو طنز کے نشتر پائے جاتے ہیں ان میں آپ کی ناگفتہ بہ حالت اور مفلوک الحال زندگی کا بھی عمل دخل ہے۔ اگرچہ زندگی کے ابتدائی ایام خوشحالی اور کشادگی کے ساتھ گزرے لیکن ہوش سنبھالنے کے بعد کی زندگی نہایت عسرت و تنگدستی اور بدحالی میں گزری۔ اس کے علاوہ ملازمت تلاش کرنے کی جدوجہد میں مسلسل ناکامی نے آپ کے مزاج میں کڑواہٹ پیدا کردی۔ پھر بھوپال میں مڈل اسکول میں استاد کی حیثیت سے تقرری مل جانے کے باوجود متعصب اور تنگ نظر افسروں کی زیادتیوں کے خلاف احتجاجاً آپ کو مستعفی ہونا پڑا۔ پھر محکمۂ جنگلات میں کلرک کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی۔ لیکن قلیل تنخواہ میں والدین، بیوی بچوں اور بہنوں کے نان و نفقہ کا انتظام کرنا مشکل تھا۔ لہٰذا استاد کی سفارش کے علاوہ ان تمام ناموافق حالات کا اثر آپ کی شاعری پر پڑنا ناگزیر اور لازمی تھا۔ اس لیے استاد کی ممانعت اور پھٹکار کے باوجود خدا و مذہب اور بزرگان دین کے خلاف شوخ لہجہ آپ کے اشعار میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً مندرجہ ذیل اشعار۔

ایک سجدے کی سزا بھوگ رہے ہیں ہم لوگ   اب کہیں سر نہ جھکائیں گے قسم ہے ہم کو
پرورش ایک مظفرؔ کی نہیں کر سکتے   دعویٰ پرورش لوح و قلم ہے ہم کو

مظفر حنفی نئے شاعروں کی اس صف کے غزل گو ہیں جس میں ندا فاضلی اور شہر یار شامل ہیں۔ طلسم حرف، تیکھی غزلیں، صریر خامہ، دیپک راگ، پانی کی زبان، عکس ریز، یم بہ یم ان کے شعری مجموعے ہیں۔ جاوید اختر آپ کی انفرادیت اور جدیدیت کے سلسلہ میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

"مظفر حنفی کو اپنے پیش روؤں اور ہم عصروں میں سب سے نمایاں کرنے والی چیز ان کی آج کی نسل کی تصویر کشی اور ان کا طنزیہ انداز تخاطب ہے جس میں قنوطیت کے بجائے رجز کی شدت

ہے شکایت کے بجائے تمسخر ہے۔‘‘(۴)

آپ کے علمی، ادبی، تخلیقی، تنقیدی اور تصنیفی کارناموں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔آپ کی شخصیت کے گوناگوں پہلو آپ کی تخلیقات میں بھی نظر آتے ہیں۔لیکن آپ کی شخصیت کا سب سے ممتاز اور روشن پہلو آپ کی انفرادیت پسندی ہے۔آپ کے شعری آثار کا بیشتر حصہ جدیدیت کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ روایتی شاعری کو یکسر نظرانداز کر دیا ہو۔بقول آپ کے:

’’اپنے آپ کو نیا شاعر کہنے کے باوجود بدقسمتی سے میں ان لوگوں میں سے ہوں جو شاعری میں نئے پن کو بہت کچھ تو سمجھتے ہیں لیکن سب کچھ نہیں۔‘‘(۵)

لیکن یہ بات ہمیشہ پیشِ نظر رہی کہ آپ کی آواز بھیڑ میں گم ہو کر صدا بہ صحرا نہ بن جائے اور مثلِ غالبؔ آپ کو بھی اپنی انفرادیت کا احساس تھا جیسے یہ اشعار۔

راہ عام سے بچ کر شعر کہنے والوں میں — آپ کے مظفرؔ کا نام بھی ضروری ہے
ٹھپہ لگا ہوا ہے مظفرؔ کے نام کا — اس کا کوئی بھی شعر کہیں سے اٹھا کے دیکھ

آپ کی شاعری کی خصوصیات میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اپنے اشعار میں تملق اور چاپلوسی کو قطعی جگہ نہیں دی۔وہ لکھتے ہیں۔

جو مجھ سے چاہتے ہیں تملق پسند لوگ — اس کی مرے قلم سے توقع فضول ہے

اور بہت سے شعرا نے جن مضامین کو بیان کرنے کے لیے طنز و تشنیع اور تمسخر و تضحیک کا سہارا لیا ہے آپ نے ان مضامین کو دوٹوک لہجہ میں اظہار برہمی اور بے نیازی کے لیے استعمال کیا ہے۔

بجا نہیں یہ تکلف اگر حقیقت ہو — تو صاف کہہ کہ طبیعت اچٹ گئی مجھ سے
مت سوچیے کہ قوت برداشت آگئی — بس کیجیے کہ صبر کا یارا نہیں ہمیں
رسوائیوں کے خوف سے خاموش رہ سکیں — اتنا کسی کا نام بھی پیارا نہیں ہمیں
یوں نہ پھولیں حباب کی مانند — سینکڑوں ہیں جناب کی مانند

مظفرحنفی کے طنز کا دائرہ بہت وسیع ہے وہ کسی بھی شخصیت کے رعب وداب میں آئے بغیر بڑی جرأت اور جسارت سے حملہ آور ہوتے ہیں۔زندگی کا ہر پہلو جس میں ضعف و کمزوری پائی جاتی ہے وہ آپ کے طنز کا نشانہ بنا ہے۔جیسا کہ ہم اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ دورِ حاضر کی سیاست کی دیوار مکر و فریب، خوشامد، چاپلوسی، وعدہ خلافی، احباب نوازی، اقربا پروری، خودغرضی و مطلب پرستی اور فرقہ وارانہ اختلافات سے تعمیر ہوتی ہے۔سیاست کی ان خرابیوں اور آلودگیوں پر بھی مظفرحنفی نے نشتر برسائے ہیں۔

رہبر کا حلیہ لکھوادوں رنگ ذرا مدھم ہوگا — عقل ذرا کچھ موٹی ہوگی خود بھی بھاری بھرکم ہوگا

رہبروں کی ہر اک پول کھل جائے گی — راہزن سے اگر سامنا ہوگیا
صحن چمن کا تم کو جو نگراں بنا دیا — تم نے تو چار دن میں بیاباں بنا دیا

مظفرحنفی کی شاعری میں تخیل سے زیادہ حقیقت اور واقعیت کی ترجمانی ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ تغزل اور شعریت کو یکسر نظرانداز کر دیا ہو۔ان کے اشعار میں جذبات کی ولولہ انگیزی بھی ہے اور احساس کی شدت بھی جن کو پڑھنے کے بعد قاری کے اندر وہ ولولہ اور ہیجان پیدا ہو جاتا ہے جس کی کسی بھی معتبر شاعر سے توقع ہوتی ہے۔

اب اپنی ہی پرچھائیں سے میں خوفزدہ ہوں — یاروں کی نوازش ہے عنایت ہے کرم ہے
ہزار مصلحین قوم چیختے رہے مگر — سماج میں جو تھا وہ انحطاط برقرار ہے

کون ایسا شاعر ہے جو غزل کہتا ہو اور اس میں معشوق کے چشم و رخسار، زلف و ابرو، غمزہ و ناز و ادا اور حسن و عشق سے متعلق مضمون نہ باندھتا ہو، آپ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں۔

ان کی اتنی ہی عنایت کوئی کم ہے ہم کو
وہ سمجھتے ہیں کسی بات کا غم ہے ہم کو

اٹھنے دو شرابی آنکھوں کو کھل جائیں گے میخواروں کی طرح
فی الحال تو سب آتے ہیں نظر محفل میں طرحداروں کی طرح

خیال کا جو تجھ سے ارتباط برقرار ہے
شراب کے بغیر بھی نشاط برقرار ہے

مظفرحنفی نے کربلا کے میدان میں امام حسینؓ اور آپ کے اصحاب کی شہادت کو بے مثال ایثار اور بےنظیر قربانی سے تعبیر کیا ہے اور وہ واقعات کربلا پر اظہارِ غم اور ماتم کرنے کے بجائے اسے نمونۂ عمل کے طور پر دیکھتے ہیں۔ان کی نگاہ میں تاریخ عالم میں حق و باطل اور خیر و شر کے درمیان جتنے بھی معرکے ہوئے ہیں ان میں معرکہ کربلا بے مثال ہے اور کربلا کی روح فرسا صعوبتوں اور آزمائشوں کو علائم کے طور پر استعمال کر کے انھیں عصری حالات اور واقعات پر منطبق کرتے ہیں۔جیسے یہ اشعار۔

چاہتا یہ ہوں کہ دنیا ظلم کو پہچان لے — خواہ اس کرب و بلا کے معرکہ میں جان جائے
ہر سمت نیا مرحلہ ہر سمت نیا تیر — پانی کی تمنا ہے تو حلقوم پہ کھا تیر

مظفرحنفی نے اپنے اشعار میں دیہاتی زندگی کی بھی منظرکشی کی ہے۔گاؤں کی بارش اور بارش کے وقت مٹی سے اٹھتی ہوئی سوندھی سوندھی خوشبو، پھل سے لدے ہوئے درخت اور پھولوں کے بار سے جھکی ہوئی ڈالیاں، کوئل کی کوکتی ہوئی مدھر آوازیں اور مستی و مدہوشی میں ناچتے ہوئے مور، سرسبز و شاداب کھیت اور تاحدِ نظر

سرسوں کے زرد پھول، آم امرود کے باغات اور پرندوں کی چہچہاہٹ، بگلوں کی قطاریں، غرض ہر قسم کے خوشنما قدرتی مناظر جو دیہی زندگی کے جز ولا ینفک ہیں آپ نے ان کی منظر کشی کی ہے۔

سوندھی سوندھی سی مہکار آنے لگی ہل چلا تو زمیں کھلکھلانے لگی
موسم نے کھیت کھیت اگائی ہے فصل زرد سرسوں کے کھیت ہیں کہ جو پیلے نہیں رہے

بول چال کی زبان میں کھنکتے ہوئے لہجے اور گونجتے ہوئے قافیہ کے ساتھ ان کے اشعار چبھتے ہوئے طنز بن کر سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کے تلخ تجربات کو طنز کا لبادہ اڑھا کر اشعار کی صورت میں پیش کر دیا ہے۔ ان کے اشعار کی یہی خصوصیات ان کو پیش رو اور ہم عصر شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔

OOO

حوالہ جات:

۱۔ نقد ریزے، مظفر حنفی، ص ۹۱۔ ۹۲
۲۔ نقد ریزے، ص ۴۷
۳۔ نقد ریزے، ص ۵۳)
۴۔ مظفر حنفی، شخصیت اور فکر و فن، جاوید اختر، ص ۱۸
۵۔ نقد ریزے، ص ۸۲

''......آپ کی فہم کشادہ اور اسلوب چست ہے اور میرا خیال ہے کہ اظہار کی پیہم کھوج آپ کو ان گنت نئی نئی راہوں پر لیے پھرے گی۔ اگر کسی مصنف کا حال واقعی اُس کے مستقبل کا غماز ہے تو میرے نزدیک آپ کی آج کی آمادگی کل کی تکمیل کی نشان دہی کرتی ہے۔'' **(جوگندر پال)**

نظم

پروفیسر اعجاز علی ارشد
شریف کالونی، پٹنہ، رابطہ: 9334107757

مظفر حنفی کی نظمیں

(’پانی کی زبان‘ کے حوالے سے)

مظفر حنفی سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی یہ اب یاد نہیں۔ یہ ضرور یاد ہے کہ ۱۵/اپریل ۱۹۸۲ء میں خاصی تکلیف اٹھا کر میری دعوت پر وہ پٹنہ آئے تھے اور دستخط کے ساتھ اپنا شعری مجموعہ ’پانی کی زبان‘ مجھے عنایت کر گئے تھے۔ تب سے اب تک ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں جن کا شمار دشوار بھی ہے اور بے کار بھی۔ کبھی شاہد علی خاں (دہلی) کے دفتر میں، کبھی خود ان کے گھر پر، کبھی کلکتہ کی کسی ادبی محفل میں، کبھی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو میں۔ ان سے بار بار ملاقاتیں ہوئیں اور میرا یہ حال رہا کہ عام طور پر ان سے ہر ملاقات کے بعد ایک نئے لطف کا احساس ہوتا رہا۔ انگلینڈ میں ان کے فرزند پرویز مظفر نے ہم جیسے کارِزیاں کرنے والوں کے لیے اپنی کئی شامیں برباد کیں۔ میں نے ایک ملاقات میں اس کے لیے مظفر حنفی کا شکریہ ادا کیا تو ایک خاص انداز میں بس مسکرا کے رہ گئے۔ پھر میرا دہلی آنا جانا کچھ مختصر ہونے لگا اور ان سے ملاقاتیں بھی اسی اعتبار سے کم ہوتی گئیں مگر وہی کیفیت کہ۔

ایک مدت سے تِری یاد بھی آئی نہ ہمیں   اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

اس درمیان ان کا کلام (عام طور پر غزلیں) بھی پڑھنے کا موقع ملا۔ زود گوئی کے باوجود ان کی مسلسل تازہ کاری اور معیار سازی پر حیرت بھی ہوتی رہی اور مسرت بھی۔ موضوعات کے تنوع کے ساتھ ساتھ ان کے لب و لہجے کا ایک مخصوص تیکھا پن مجھے اکثر پسند آیا۔ اس لیے چند ہفتوں قبل جب ایک خصوصی شمارے کے لیے ان سے متعلق کچھ لکھنے کی فرمائش ہوئی تو میں نے چند ہی دنوں بعد ان کی غزلوں کے حوالے سے ایک مضمون ارسال کر دیا۔ شاید وہ مضمون قاصد کی خوش ذوقی یا ترسیل کی ناکامی کی نذر ہوا اور ’’مری یہ عادت نہیں کہ رکھوں کسی کی خاطر مئے شبانہ‘‘ کے انداز پر میں اپنے تحریر کردہ مضامین کی عام طور پر نقل نہیں رکھتا۔ اس لیے اب یہ دوسرا مضمون ان کی نظموں کے حوالے سے لکھ رہا ہوں۔

اس اچھی خاصی تمہید کے بعد یہ لکھنا غیر ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اردو شاعری کی دنیا میں آج مظفر حنفی کا مقام کیا ہے۔ مگر ان کی شاعری اپنی وسیع تر معنویت کے سبب خود کو ’حرفِ معتبر‘ سمجھنے کا تقاضا کرتی ہے۔ بہر حال ان کی شاعری خصوصاً نظم نگاری سے متعلق بعض عمومی نتائج تک پہنچنے سے قبل میں ’پانی کی زبان‘ کی چند نظموں کا موضوعاتی تجزیہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس مجموعے کی پہلی نظم ’یا اخی‘ ہے۔ ظاہر ہے کہ نظم کم و بیش نصف صدی پہلے کی ہے مگر محتویات کے اعتبار سے آج بھی گہری معنویت کی حامل ہے۔ کارخانوں، دفتروں، بازاروں اور فلک بوس فلیٹوں میں تو خیر حبس اور گھٹن کا عالم ناگفتنی ہے لیکن سانسوں کے جنگل سے نکل کر سکون کی خاطر کسی پارک کا رُخ کرنے والے کی ناامیدی بھی دیدنی ہے۔ وہی شور وغل، ہنگامہ، اضطراب، کاروباری ذہنیت، چیخ پکار اور بے پناہی کا احساس، جس سے انسان بھاگ رہا ہے، یہاں بھی ہے۔ تو کیا یہی اس کی تقدیر کا نوِشتہ ہے؟ یا پھر یہ تمام تر صورت حال اس کی اپنی ہی بداعمالیوں کا نتیجہ ہے، جس نے خود ہی اپنے آپ کو ’دائرے سے مربعے تک‘ مختلف حلقوں، ٹکڑوں اور خانوں میں قید کر کے اپنے لیے حبس، گھٹن، تنہائی اور دوسری دشواریاں پیدا کر لی ہیں؟ سچائی جو بھی ہو لیکن عہدِ حاضر کے عام انسان کی اس بے بسی اور نارسائی کے بیان میں فن کار کی ہنرمندی اپنی جگہ ہے۔ نظم کا پہلا مصرع ہے:

کارخانے سے نکل کر پارک میں آیا تو کیا

اور آخری دو سطریں یہ ہیں:

آج کا اتوار بھی ضائع گیا واحسرتا!
ہر طرف آواز دیتا ہے مجھے کوہِ ندا

اب یہ جو احساسِ زیاں ہے، یعنی نظم کا مرکزی خیال، اس کی وضاحت کے لیے یکے بعد دیگرے مختلف تصویریں سامنے آتی ہیں۔ یہ ساری تصویریں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہوئے بھی ہمارے عمومی مشاہدے کا ایک حصہ ہیں اس لیے ایک دوسرے سے نہ صرف مربوط ہیں بلکہ نظم کو ارتقائی کیفیت سے گزارتے ہوئے ایک بھرپور تاثر کے ساتھ اختتام تک لے جاتی ہیں۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ بظاہر یہ فن کار کا ذاتی تجربہ ہے اور وہ بھی کسی ایک دن کا مگر کیا دوسرے پارکوں یا دوسرے دنوں اور لوگوں کا حال اس سے مختلف ہے؟ جواب ہوگا کہ نہیں۔ میرے خیال سے یہی عمومیت نظم میں پیش کردہ تجربے کو اہم بناتی ہے۔

نئے زمانے کے اضطراب کی یہ صورت ’نئے خدا کا قہر‘ میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ شہر میں تو خیر امن و سکون کی تلاش ہی بے سود ہے، گاؤں کا حال بھی برا ہوتا جا رہا ہے۔ اور کیوں؟ یہاں پہلے مصرع کی وضاحت کے لیے زیادہ تصویریں نہیں ہیں مگر اس مصرع کو دہراتے ہوئے نظم کا پورا تاثر آخری دو مصرعوں میں سمیٹ دیا گیا ہے:

چپکے چپکے گھس آیا ہے میرے گاؤں میں شہر

سونگھ رہا ہوں کھیتوں کی شاداب ہوا میں زہر

فنی اعتبار سے یہ نظم بہت چست نہیں کہی جاسکتی چوں کہ درمیانی اشعار میں ترمیم واضافہ ممکن ہے مگر آج سے پچاس برس قبل کا زمانہ سامنے رہے تو مظفر حنفی کا یہ بیان ندرتِ فکر کا نمونہ ضرور کہا جاسکتا ہے۔

صارفیت کے بوجھ سے دبے ہوئے شہر کی بے پناہی کا ایک چھوٹا سا منظر 'صورِ اسرافیل' میں دیکھا جاسکتا ہے۔ کسی کارخانے کا بجتا ہوا سائرن ملازمین کو جلد سے جلد ڈیوٹی پر حاضر ہونے کی ہدایت دیتا ہے اور وہ عجیب وغریب افراتفری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس صورت حال کی تصویر کشی چند اضطرابی کیفیات کے بیان کے سہارے کامیابی سے کی گئی ہے۔ بنی نوع انسان کی عارضی اور مستقل بے بسی کے اور بھی مناظر ہیں جو 'ہنسی کا ڈر'، 'کال کوٹھری'، 'سونے کی کان کا حادثہ' اور 'گوتم کا خط' جیسی نظموں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان تمام نظموں میں بیان کردہ تجربات کا راوی بظاہر صرف شاعر ہے مگر یہ پھیلتے ہیں تو زمانہ بن جاتے ہیں۔ نظم 'آج کی بات' بھی ایک دردانگیز تجربے کو پیش کرتی ہے۔ پہلے وہ نظم ملاحظہ ہو۔

میں نے مرحوم دادا کی تصویر سے
باسی پھولوں کا گجرا اُتارا
مہکتے ہوئے تازہ پھول ان کے چرنوں پہ رکھتے ہوئے
اچانک نگاہوں میں وہ کیل آ ہی گئی
جو اکھڑنے کو تھی
جس پہ مرحوم دادا کھڑے تھے مرے
میں نے اس کیل کو
احتیاطاً ذرا زور سے جڑنا چاہا تھا
پتھر کی دیوار میں
غالباً زاویہ کچھ غلط ہو گیا
چوٹ میرے انگوٹھے پہ آ کر پڑی
اور مُنّا نے اک قہقہہ جڑ دیا

اب اس نظم کے مصرعوں پر غور کیجیے۔ ظاہر ہے کہ اپنے دادا کی تصویر پر جو شخص عقیدت کے پھول چڑھا رہا ہے وہ روایتوں کا پاسدار ہے۔ روایتیں پختہ دیوار میں جڑی ہوئی کیلوں کی طرح ہوتی ہیں مگر اب وہ کیل اکھڑنے کو ہے جس پر دادا کی تصویر آویزاں ہے۔ (روایتوں کے انہدام کا کس قدر بلیغ استعارہ ہے!) ظاہر ہے کہ وہ شخص کیل کو دوبارہ مضبوطی سے جڑنا چاہتا ہے اور اس کوشش میں خود کو زخمی کر لیتا ہے۔ (غالباً زاویہ کچھ غلط

ہو گیا، میں بھی ایک اشارہ ہے۔) لیکن اس پورے واقعے پر مُنّا (اسے نئی نسل کا نمائندہ سمجھیے) اظہار ہمدردی یا افسوس کی جگہ جس طرح قہقہہ لگاتا ہے اس کے سبب نظم ذاتی تجربہ نہیں رہ کر عمومی تجربہ بن جاتی ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ نئی نسل کے لیے روایتیں جس طرح بے معنی ہو چکی ہیں اس کی تصویر منّا کے رویّے میں بخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔ جب کہ پرانی نسل کے دل میں ماضی کا احترام اب تک باقی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ نظم جنریشن گیپ کی طرف ایک اشارہ ہے اور اس موضوع پر لکھی گئی پہلی نظم نہ سہی مگر اردو کی ابتدائی چند نظموں میں سے ایک ضرور ہے۔ یہاں نظم کا فنی تجزیہ میرا مقصد نہیں۔ پھر بھی اتنا یقینی ہے کہ ان کی دوسری کامیاب نظموں کی طرح یہ نظم بھی خاصی Compact اور مربوط ہے جس میں ترمیم واضافہ محال ہے۔

نہ جانے کیوں مجھے یہ نظم پڑھتے ہوئے مظفر حنفی کی ایک اور نظم 'بھیگی ہوئی تہذیب' یاد آئی۔ حالاں کہ وہاں تجربے کی نوعیت کچھ مختلف ہے۔ ایک راہ چلتے ہوئے شخص کی چھتری تیز ہوا کے زور سے الٹ جاتی ہے اور وہ شہر کے چوراہے سے گزرتا ہوا بارش کے پانی سے بھیگ جاتا ہے۔ اسے غم یہ نہیں کہ وہ بھیگ گیا ہے، دکھ یہ ہے کہ لوگ اس سے ہمدردی کرنے کی جگہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ انسانی تہذیب کے زوال کی یہ عجیب و غریب صورت ہے کہ دکھ درد اور پریشانی میں یہاں کوئی کسی کا معاون نہیں بنتا۔ یہ پیچیدگی احساس مختلف زاویوں سے 'ٹوٹی ہوئی کڑیاں'، 'پانی کی زبان' اور 'پریشانی کی ادائیگی' جیسی نظموں میں بھی بیان ہوئی ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ مظفر حنفی اس عہد حاضر سے اچھی طرح واقف ہیں جہاں ایثار بھی دکھاوا ہے اور صارفیت کے دباؤ سے آزاد نہیں۔ 'ہابیل کی زبان' کی یہ سطریں دیکھیے۔

کوٹھے سے حوّا کی بیٹی جھانک رہی تھی
اس نے اپنا بٹوہ دیکھا
لہجے میں ایثار سمو کر
وہ اپنے ساتھی سے بولا
پہلا حق تو تیرا ہے بھائی قابیل

صاف ظاہر ہے کہ ہابیل کا طرز اظہار ایثار پہ نہیں مفاد پرستی پر مبنی ہے اور یہ مفاد پرستی سماج کے بیشتر طبقوں میں اپنی جگہ بنا چکی ہے۔ 'ایک انمول پالیسی' کا بیمہ ایجنٹ تو خیر کسی حد تک صارفیت کے حصار میں رہنے پر مجبور ہے مگر 'اس کی سوچ کا سایہ' میں باپ کی جگہ بیٹے کی خدمت کرنے والا مرکزی کردار جو اپنا مستقبل سنوارنے کی فکر میں ہے، اس کی سوچ کو کیا کہا جائے؟ ظاہر ہے کہ ستیہ وادی ہریش چندر تو دوسرا کون ہو سکتا ہے لیکن آج کے بیٹوں کو یہ بھی توفیق نہیں کہ حسابِ سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر بیمار باپ کی تیمارداری کر لیں؟ 'فائلوں کا جادوگر'، ہو یا 'پاگل'، 'چاند اور چور' میں اپنا جرم چھپانے کے لیے دوسرے کو چور قرار دینے والے سبھی کسی

نہ کسی طور پہ ریا کار بھی ہیں اور مفاد پرست بھی، مگر شاعر کی نگاہ سے ان کی اصلیت پوشیدہ نہیں۔

نئے عہد کی اور بھی کئی جہتیں مظفر حنفی کی نظموں کا موضوع ہیں۔ ایک اور مختصر سی نظم 'دوسری جلاوطنی' یہاں نقل کرتا ہوں جس میں خاصی کامیابی کے ساتھ عہد حاضر کا ایک کرب اساطیر سے ہم آمیز ہے۔ نظم ملاحظہ ہو۔

جب گیہوں کا دانہ جنس کا سمبل تھا
اس کو چکھنے کی خاطر
میں جنّت کو ٹھکرا آیا تھا
اب گیہوں کا دانہ
بھوک کا سمبل ہے
جس کو پانے کی خاطر
میں اپنی جنت سے باہر ہوں

غور کیجیے کہ یہاں تجربہ کس قدر سامنے کا ہے۔ اس کے باوجود موضوع کے ساتھ فن کار کے Treatment کے سبب کتنی تاثیر اور درد انگیزی پیدا ہوگئی ہے۔ اپنے ملک، شہر، گاؤں اور رشتوں کو چھوڑ کر تلاش معاش میں دور دراز کے علاقوں کا سفر کرنے اور دربدری کا دکھ جھیلنے والے آج اپنی جنت سے باہر رہنے کے غم کو طرح طرح سے بیان کر رہے ہیں مگر آج سے پچاس برس قبل یہ موضوع اس سادگی اور پرکاری کے ساتھ کہاں پیش ہو رہا تھا۔

ظاہر ہے کہ مظفر حنفی کی اور بھی کئی نظمیں ایسی ہیں جن کا موضوعاتی اور فنی تجزیہ کیا جا سکتا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ نتائج وہی برآمد ہوں گے جو مذکورہ بالا نظموں کے تجزیے سے برآمد ہو رہے ہیں۔ اس سلسلے کی سب سے پہلی بات یہ ہے کہ 'جدیدیت' کے عہدِ خاص میں لکھے جانے کے باوجود یہ نظمیں صرف جدیدیت سے منسوب موضوعات تک محدود نہیں ہیں۔ ان میں کلاسیکیت سے آگہی کا شعور بھی ہے اور آنے والے دنوں کی تصویر بھی۔ شاید اسی لیے نظموں میں پیش کردہ تجربات خاصے متنوع ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان میں خیال آرائیاں کم اور حقیقت کی پرچھائیاں زیادہ ہیں۔ شاعر مجموعے کی ابتدا میں ہی یہ کہتا ضرور ہے کہ

ع: آج مظفرؔ کی باتیں بہکی بہکی ہیں

مگر سچی بات یہ ہے کہ یہ بہت ہوش مندی کی باتیں ہیں۔ بظاہر سامنے کی باتیں ذاتی تجربات و مشاہدات کے انداز میں بیان کی گئی ہیں مگر یہ بیان عہد حاضر کی عام حیات انسانی سے وابستہ کتنی ہی Cruel Realities تک پہنچتا ہے۔ گویا ذات کا غم کائنات کے غم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ غزل کا مزاج رہا ہے اس لیے مظفر حنفی کی نظموں میں اس کی موجودگی غزل گوئی سے ان کے ذہنی رشتوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ان کی نظمیں بے حد مربوط اور Compact ہوتی ہیں۔ حالاں کہ انھوں نے کچھ ایسے الفاظ بھی

استعمال کیے ہیں جو اب تک ہماری شعری روایت کا حصہ نہیں بن پائے۔ اس کے باوجود عام طور سے سیدھی سادہ، عام فہم زبان میں کہی گئی باتیں قاری کے نازک احساسات کے بند دروازوں پر بڑی آہستگی کے ساتھ دستک دیتی ہیں۔ یہ انداز خود کلامی کا نہیں مگر اس میں بلند آہنگی بھی نہیں۔ پہاڑیوں سے گرتے ہوئے پُرشور نالوں کی جگہ اس میں سبک خرامی سے بہتی ہوئی ندیوں کا انداز ہے جو تادیر اثر رکھتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کی بیشتر نظموں کی معنویت آج بھی برقرار ہے۔

شاعر کو تعلّی کا حق بھی حاصل رہا ہے، مگر مظفر حنفی کے اس بیان میں مجھے تعلّی سے زیادہ حقیقت گوئی دکھائی دیتی ہے۔

میں نہیں کہتا
کہ میری کھردری نظموں کو پڑھ کر
سنگ میل راہِ نو تسلیم کیجے
میری نظمیں تو
روایت کی بہت پامال وفرسودہ سڑک کے دونوں جانب
کنکروں اور پتھروں کے ڈھیر کی مانند ہیں
جن سے
آئندہ نئی راہیں بنائی جائیں گی

'پانی کی زبان' ۱۹۶۷ء میں شب خون کتاب گھر سے چھپی تھی۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ تقریباً نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی شاعر کا یہ دعویٰ درست ثابت ہوا یا نہیں لیکن میں توقع کرتا ہوں کہ نظم گوئی کے اس نئے آہنگ کی جانب مزید لوگ توجہ دیں گے۔

○○○

ڈاکٹر محمد عظمت الحق
اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، دگلور کالج، دگلور، رابطہ: 7020407042

مظفر حنفی کی نظم نگاری: ایک تاثر

(’پانی کی زبان‘ کے حوالے سے)

مظفر حنفی (پیدائش: یکم اپریل ۱۹۳۶ء۔ وفات: ۱۰/ اکتوبر ۲۰۲۰ء) جدید شعرا کے درمیان ایک نمایاں نام ہے اور اردو ادب کی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ مظفر حنفی کی ادبی خدمات کا دورانیہ تقریباً ساٹھ برسوں کو محیط ہے۔ ان چھ دہائیوں میں انھوں نے نظم و نثر کی کئی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اپنے خیالات و احساسات کے اظہار کے لیے مظفر حنفی نے نظم اور نثر کی مختلف اصناف کا بھرپور اور کامیاب استعمال کیا ہے۔ اپنے مخصوص غزلیہ اسلوب اور ڈکشن کے حوالے سے ان کا نام جدید غزل کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ مظفر حنفی گو کہ غزل کے اہم شاعر تھے مگر انھوں نے نظموں، رباعیوں کے علاوہ شخصی مراثی بھی کہے ہیں۔ میدانِ نثر میں انھوں نے افسانہ نگاری، ڈراما نگاری، تنقید نگاری اور تحقیق و ترتیب کے ذریعے ادب کی گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ادبِ اطفال کے میدان میں بھی انھوں نے اپنے روشن نقوش چھوڑے ہیں۔

مظفر حنفی نے شاعر، فکشن نگار، ناقد، محقق، مبصر، ترجمہ نگار، مرتب اور مدون کی حیثیت سے جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ اکثر ادیب خود کو محدود دائروں میں قید کر لیتے ہیں اور اسی دائرے میں رہ کر اپنے جذبات و احساسات، خیالات و مشاہدات اور افکار و نظریات کو پیش کرتے ہیں۔ مگر مظفر حنفی کی بات اور ہے۔ انھوں نے خود کو کبھی کسی ایک دائرے میں مقید نہیں کیا۔

مظفر حنفی کی غزلوں میں تازگی و توانائی تو ہے ہی، اس کے علاوہ ان کے اسلوب، اندازِ بیان، زبان اور لفظیات میں ندرت و جدت نظر آتی ہے۔ یہی ندرت و جدت انھیں شعرا کی بھیڑ میں منفرد مقام عطا کرتی ہے۔ مظفر حنفی کی شاعری کا ایک اہم اور نمایاں وصف ان کا طنزیہ اسلوب ہے جو ان کی شاعری میں جگہ جگہ دکھائی دیتا ہے۔ ان کی تخلیقات میں یہ صاف نظر آتا ہے کہ وہ بدلتے وقت اور ادب کے تقاضوں کو پورا کرنے کی سعی کرتے تھے۔

مظفر حنفی کی غزلیں ہی ہمیں متاثر نہیں کرتیں بلکہ ان کی نظمیں بھی قارئین کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں۔ بلاشبہہ وہ نظم کے بھی اہم شاعر تھے۔ ان کی زیادہ تر نظمیں علامتی انداز کی ہیں۔ انھوں نے اپنی بیشتر نظموں میں اشارے، کنائے سے کام لیا ہے، مگر کہیں کہیں احساس و خیال کے اظہار میں بیانیہ انداز بھی شامل ہو گیا ہے۔ ان کی نظموں میں کہیں کہیں تسلسل ٹوٹتا نظر آتا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی نظمیں نہ صرف متاثر کرتی ہیں بلکہ سوچ کے کئی دروازے بھی کھولتی ہیں۔ مظفر حنفی کی نظموں میں جدتِ ادا اور ندرتِ خیال کے باوصف زندگی کی تلخ حقیقت کی شاعرانہ توجیہہ بھی نظر آتی ہے۔

’پانی کی زبان‘ مظفر حنفی کا اولین شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا ہے۔ اس سے قبل ’عکس ریز‘ کے نام سے طنزیہ خاکوں پر مشتمل ان کی ایک طویل نظم شائع ہوئی تھی۔ ’پانی کی زبان‘ میں موجود نظموں پر غور کریں تو ایسا معلوم ہوتا ہے شاعر اپنے احساسات و تجربات کو اختصار کے ساتھ اور بڑے تیکھے اسلوب میں ہماری نذر کر رہا ہے، جس سے ہم لطف اندوز بھی ہوتے ہیں اور ان نظموں میں موجود چبھن کو محسوس بھی کرتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مظفر حنفی کے احساسات و تجربات کی گرفت میں محصور ہونے سے ہم خود کو بچا بھی نہیں سکتے۔ ’پانی کی زبان‘ مظفر حنفی کے ابتدائی دور کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس کے باوجود اس میں شامل نظمیں فنی پختگی کی مظہر ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے مظفر حنفی کو غزل گوئی کے ساتھ ساتھ نظم نگاری پر بھی اچھا خاصا عبور حاصل ہو چکا تھا۔ انھوں نے ابتدا ہی سے چونکانے والا اور انفرادیت کا حامل اسلوب اختیار کیا ہے۔

مظفر حنفی نے اگرچہ پابند اور معریٰ نظم بھی کہی ہیں لیکن ان کی زیادہ تر نظمیں آزاد نظم کی ہیئت میں ہیں۔ ان کی نظموں میں کہیں کہیں بیانیہ انداز بھی پایا جاتا ہے لیکن ان کی بیشتر نظمیں رمز و کنائے اور علامتی اسلوب کی حامل ہیں۔ ان کی نظمیں خیالی دنیا کی سیر نہیں کراتیں بلکہ روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات، تجربات اور مشاہدات کو پیش کرتی ہیں۔ یہی حقیقت نگاری قاری کو ان کی نظموں سے جوڑے رکھتی ہے۔ مظفر حنفی کی نظموں کا طرز و اسلوب قارئین کو ایک نئے ذائقے سے آشنا کراتا ہے۔ ان کے مطالعے کے بعد قاری کبھی خود کو طنز کے تیروں سے مجروح محسوس کرتا ہے، تو کبھی مزاح کے ہلکے پھلکے اور نرم بادلوں میں اڑتا ہوا پاتا ہے، تو کبھی غور و فکر کے دریا میں غرق ہو جاتا ہے۔ ان کی نظمیں قاری کے ذہن کے دروازے پر کچھ اس انداز سے دستک دیتی ہیں کہ یہ دستک سن کر قاری کو اپنے ذہن کا دروازہ کھولنا ہی پڑتا ہے۔ اس حوالے سے زیرِ نظر مضمون میں مظفر حنفی کی چند نظموں پر مختصر گفتگو کی گئی ہے۔

مجموعۂ کلام ’پانی کی زبان‘ کی پہلی نظم ’یا اخی.....‘ ایسی نظم ہے جو شہر کی مصروف ترین زندگی، خاص طور سے ملازم طبقے کی زندگی کی بہترین انداز سے آئینہ داری کرتی ہے جہاں انسان کی حیثیت ایک روبوٹ کی مانند ہو گئی ہے۔ اس ترقی یافتہ دور میں انسان بھی مشینوں کی طرح مصروف ہو گیا ہے۔ انسان اپنے چین و سکون

کے لیے دن رات محنت کرتا ہے اور جب اتوار کا دن میسر ہوتا ہے تو وہ دن بھی کسی نہ کسی وجہ سے ضائع ہو جاتا ہے۔ اگر وہ سکون کی تلاش میں پارک کا رخ بھی کرے تو وہاں بھی شور وغل، چیخ پکار، اور ہنگامے اس کا تعاقب کرتے پہنچ جاتے ہیں۔ یہ اور اس طرح کے ہنگامے دیکھ کر شہری انسان بڑے کرب، تاسف اور حسرت وغم کے ملے جلے جذبات میں کہہ اٹھتا ہے ۔

آج کا اتوار بھی ضائع گیا وا حسرتا! ہر طرف آواز دیتا ہے مجھے کوہِ ندا!

مظفر حنفی کی نظر صرف شہر اور شہر میں بسنے والے لوگوں تک ہی محدود نہیں بلکہ انھوں نے گاؤں اور دیہاتوں کے بدلتے مزاج، کلچر اور ماحول کو بھی اپنی نظم کا موضوع بنایا ہے۔ نظم 'نئے خدا کا قہر' میں بدلتی تہذیب، بدلتے مزاج، ماحول اور بدلتے طرزِ زندگی کو بیان کیا ہے۔ یہاں 'نئے خدا' سے مراد صنعتی ترقی بھی ہے اور مغربی تہذیب بھی۔ اس نظم کا پہلا مصرع دیکھیے ۔

سونگھ رہا ہوں کھیتوں کی شاداب ہوا میں زہر

گاؤں کے کھیتوں میں ٹھنڈی، شاداب وصحت بخش ہوائیں چلا کرتی تھیں مگر صنعتی ترقی کی وجہ سے ان شاداب وصحت بخش فضاؤں میں زہر گھل گیا ہے۔ ماحول زہر آلودہ ہونے لگا ہے۔ مظفر حنفی آگے کہتے ہیں کہ شہری کلچر اور مغربی تمدن قدیم ہندوستانی تہذیب کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ شہری کلچر اور مغربی طرزِ زندگی آہستہ آہستہ شہروں سے ہوتے ہوئے گاؤں اور دیہاتوں پر قبضہ جما رہا ہے۔ اس کی وجہ سے یہاں کی شرم وحیا کا ماحول بھی ختم ہو رہا ہے۔ اس نظم کے آخر کے مصرعے ملاحظہ کریں ۔

مندر کی دیوار پہ چسپاں نوٹنکی کا ناچ الھڑ دوشیزہ بھڑکاتی عطر حنا کی آنچ
شرمیلے بھولا نے آخر ڈال لیا پتلون چوپالوں پر بک جاتا ہے طاقت کا معجون
چپکے چپکے گھس آیا ہے میرے گاؤں میں شہر سونگھ رہا ہوں کھیتوں کی شاداب ہوا میں زہر

نظم 'ایک پرانی داستان کے بیچ میں' میں مظفر حنفی نے اشارے کنائیوں سے کام لیا ہے۔ اس نظم میں انھوں نے رات کے منظر کو قید کرنے کی کوشش کی ہے۔ رات تو ہر دن سورج کے غروب ہونے پر ہوتی ہے مگر ہر رات کسی کے گھر ظلمتیں ہوتیں ہیں تو کسی کے یہاں روشنی۔ ملاحظہ کریں:

پھر گلِ خورشید بھی مرجھا گیا / ہر طرف گہرا اندھیرا چھا گیا / اپنے اپنے طور پر / سب ہی کوشاں تھے / کسی صورت ذرا سی روشنی ہو / جگمگائے مفلسوں کے دل / امیروں کے ایاغ / اور یہ سارے چراغ / ایک دو پل ٹمٹما کر بجھ گئے

اس نظم میں مظفر حنفی نے امیر اور غریب کے رات گزارنے کے منظر کو بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔ جہاں ہر کوئی ظلمت کو دور کرنے کی کوشش میں لگا ہے۔ ایک طبقہ اندھیرے اور مفلسی کا مارا ہوا ہے تو وہیں

دوسرا طبقہ بھی ہے جو اپنی عیش کوشیوں کی محفلوں اور جلسوں کے موقعے پر اتنی روشنی کرتا ہے کہ یہ روشنی مفلسوں کو منھ چڑھاتی ہے۔ امیر اور غریب کے بیچ کی دیوار کو توڑنے کا جو خواب ہم نے دیکھا تھا اب وہ ایک قصۂ پارینہ بن گیا ہے، جو صرف لکھنے اور پڑھنے تک ہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔

یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ انسان کی تخلیق آگ، پانی، ہوا اور مٹی کی آمیزش سے ہوئی ہے۔ خالقِ حقیقی نے ان چاروں عناصر سے انسان کی تخلیق کی ہے۔ نظم 'انا الحق کی تفسیر' جتنی چھوٹی ہے اتنی ہی معنی خیز بھی ہے۔ اس نظم میں مظفر حنفی نے آگ، پانی، مٹی اور ہوا کی خاصیتوں اور ان کے افعال کا ایسا فکر انگیز نقشہ کھینچا ہے جس کو پڑھ کر غور وفکر کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ ملاحظہ کریں:

آگ پانی میں پڑی تو بجھ گئی / آگ پر پانی جو رکھا / بھاپ بن کر اڑ گیا / آگ میں مٹی جو ڈالی / راکھ بن کر رہ گئی / آگ جب مٹی میں آئی، سرد تھی / آب وگل مل کر غلاظت بن گئے / آگ، پانی اور مٹی / جب ہوا کے جال میں آئے / تو انسان بن گئے / یعنی...... / انسانی عناصر میں نمایاں وصف رکھتی ہے / ہوا!

اگر پانی میں ہر قسم کے خوب صورت اور خوشبودار پھولوں کو ڈال کر رکھا جائے تو وہ سڑ گل جائیں گے۔ صرف آگ کو پانی میں ڈال دیں تو وہ بجھ جائے گی۔ اسی طرح آگ میں مٹی کو ڈال دیں تو وہ راکھ بن جائے گی۔ مگر خالق نے اپنی قدرت سے آگ، مٹی، پانی اور ہوا کا ایسا آمیزہ تیار کیا اور اسے ایسے سانچے میں ڈھالا کہ اس سے انسان کی تخلیق عمل میں آئی۔

جیسا کہ پچھلی سطور میں بھی کہا گیا ہے کہ مظفر حنفی ایک اچھے اور کامیاب فکشن نگار بھی تھے۔ ان کی نظموں میں بھی کہیں کہیں فکشن کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ کچھ نظموں میں قصہ پن اور بیانیہ انداز صاف ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً 'لوہے کے راستے'، 'آج کی بات'، 'پچھلے فیصلے کی روشنی میں'، 'وقت کے حمام میں' اور 'ہنسی کا ڈر'۔ ان نظموں میں کہانی پن کے ساتھ سَسپینس بھی ہے۔ مگر ان نظموں کی خاص بات یہ ہے کہ ان کو پڑھتے وقت ایک ایسا تیز ہوا کا جھونکا ہمارے پاس سے گزرتا ہے جس میں ماضی کی کئی یادیں کروٹیں لیتی ہیں۔ مظفر حنفی کا یہ طرزِ تحریر قاری کو اپنے اندر جھانکنے کا معنی خیز پیغام دیتا ہے اور اسے اپنے ماضی سے جڑے رہنے کی تلقین بھی کرتا ہے۔

نظم 'ایک فساد زدہ رات' میں بھی کہانی پن، بیانیہ انداز اور سسپینس کو برتا گیا ہے۔ مظفر حنفی نے اس نظم میں آسان اندازِ بیان اور الفاظ کے ذریعے ایک واقعے کو نظم کیا ہے۔ اس واقعے میں طنز بھی ہے اور تلخ حقیقت بھی۔ نظم کے بین السطور یہ احساس اور مشاہدہ ابھر کر آتا ہے کہ آج انسان ڈرا اور سہما ہوا ہے۔ کیوں کہ انسانوں کے درمیان سے بھروسہ، ایمانداری، رواداری، احترامِ انسانیت، انسان دوستی، محبت اور آپسی اعتماد ختم ہوتا جا رہا ہے۔ یہ وہ عوامل ہیں جن سے انسان ایک دوسرے سے سہما ہوا ہے۔ خاص طور سے ایک مذہب کا آدمی

دوسرے مذہب کے آدمی سے خوف زدہ ہے۔ان کے درمیان کئی شکوک وشبہات پیدا ہو چکے ہیں۔جب فساد برپا ہوتا ہے تو انسان (خواہ اس کا تعلق کسی مذہب سے ہو) وہ نفرت کا علمبردار اور وحشی درندہ بن جاتا ہے جس کی وجہ سے خوف اور دہشت کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔نظم ملاحظہ کریں:

میں چلتے چلتے ٹھٹک گیا / سنسان گلی کے نکڑ پر
ایک سایہ سا لہرایا تھا / یہ تیری جان کا دشمن ہے
میری رگ رگ نے دہرایا / خوف ابھرا ریڑھ کی ہڈی سے
سردی میں پسینہ آنے لگا / دس بجنے میں تھے پانچ منٹ
وقت آہی لگا تھا کرفیو کا / اپنا بٹوہ، پن اور گھڑی
دے کر نکلوں میں نے سوچا / ان چیزوں کو ہاتھوں میں لیے
ڈرتے ڈرتے اس تک پہنچا / پھر آسماں جیسے ٹوٹ پڑا
وہ میرے پاؤں پر لوٹ گیا / اے بھیا! مجھ پر ترس کھاؤ!
مت مارو مجھ کو مت مارو!!

موجودہ دنیا کا ایک افسوس ناک اور کربناک پہلو یہ ہے کہ آج انسان اتنا سہا ہوا ہے کہ اسے خود اپنے سائے سے بھی ڈر محسوس ہونے لگا ہے۔اور ایسا کیوں نہ ہو؟ جہاں دیکھو وہاں انسان ہی انسانیت کا خون بہانے کے لیے تیار کھڑا ہے۔اسی لیے آج اعتماد، رواداری آپسی محبت اور یکجہتی جیسی چیزیں ہمارے درمیان سے اٹھتی جا رہی ہیں۔موجودہ دنیا کے انسان میں ان پاکیزہ احساسات اور جذبات کا فقدان اس نظم کی تخلیق کا محرک ہے۔نظم کی شروعات سے ہی مظفر حنفی نے تذبذب کو برقرار رکھا ہے۔جس میں قصہ پن اور بیانیہ انداز دونوں ہیں۔کسی فساد زدہ علاقے کی رات میں ایک تنہا آدمی پر جو خوف طاری ہوتا ہے اس کیفیت کو مظفر حنفی نے اس نظم میں نہایت خوبی سے پیش کیا ہے۔

نظم 'دوسری جلا وطنی' ایک مختصر نظم ہے۔یہ نظم صرف دو بند پر مشتمل ہے۔پہلے بند میں تین مصرعے اور دوسرے بند میں چار مصرعے ہیں۔اتنی مختصر نظم میں مظفر حنفی نے جو کمال دکھایا ہے وہ لاجواب ہے۔پہلے بند کے تین مصرعوں میں آدم کے جنت سے نکالے جانے کے واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے، جس میں آدم نے گیہوں کو چکھنے کی خاطر جنت کی تمام تر لذتوں، آرام اور آسائشوں کو ٹھوکر مار دی تھی۔ملاحظہ کریں:

جب گیہوں کا دانہ جنس کا سمبل تھا / اس کو چکھنے کی خاطر / میں جنت کو ٹھکرا آیا تھا

جو شے کل تک جنس کا سمبل تھی آج وہی شے بھوک کا سمبل بن گئی ہے۔جنت سے نکالے جانے کے بعد سے انسان روٹی کے لیے در بدر ٹھوکریں کھا رہا ہے تو کہیں گیہوں کی خاطر راشن کی دکانوں کے سامنے ہاتھ

باندھے کھڑا ہے۔انسان پیٹ کی آگ کو کبھی خود کے پسینے سے بجھانے کی کوشش کرتا ہے تو کبھی دوسروں کے خون سے بجھا رہا ہے۔دوسرا بند دیکھیں:

اب گیہوں کا دانہ / بھوک کا سمبل ہے / جس کو پانے کی خاطر / میں اپنی جنت سے باہر ہوں!

مظفر حنفی نے اپنی تنقیدی بصیرت اور مشاہدے کی قوت سے دنیا ومافیہا میں جو کچھ بھی دیکھا، سمجھا اور محسوس کیا اسے قارئین کے سامنے اپنے مخصوص اسلوب اور زبان میں پیش کیا ہے۔شعری مجموعہ 'پانی کی زبان' کی نظموں کے مطالعے کی روشنی میں بلاشبہہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مظفر حنفی جتنے اچھے نثر نگار اور غزل گو شاعر تھے اتنے ہی بہترین نظم گو شاعر بھی تھے۔انھوں نے جہاں غزل میں اپنی انفرادیت قائم کی وہیں نظم نگاری میں بھی اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کی ابتدا ہی سے کوشش کی اور اس میں وہ خاصے کامیاب بھی رہے۔

○○○

''مظفر حنفی کا خاندان کا تصور اتنا وسیع ہے جتنا ہمارے ملک اور ہماری پرانی تہذیب میں تھا۔یہ تصور جو اب خواب وخیال ہو گیا ہے، وہ انھیں نارمل اور نیچرل لگتا ہے۔اس لیے نہ وہ اس کی افادیت پر گفتگو کرتے ہیں نہ اسے رومینٹی سائز کرتے ہیں۔مظفر حنفی ایک اچھے استاد ہیں۔ایسے استاد جو واقعی پڑھاتے ہیں۔جنھیں پڑھانا اچھا لگتا ہے، جو علم کے بوجھ کے تلے دبے نظر نہیں آتے مگر طالب علموں سے بے حد لگاؤ رکھتے ہیں۔ان کو سختی سے ڈانٹتے ڈپٹتے بھی ہیں مگر لگاوٹ، ادا کے ساتھ۔جو لوگ کلاسس لینے میں سنجیدہ نہیں ہوتے اور طالب علموں کی نالائقی کا رونا روتے نظر آتے ہیں، یہ کبھی سنجیدگی اور کبھی زہر خند کے ساتھ ان کی سرزنش بھی کر دیتے ہیں۔ہمیں بڑا عجیب لگتا تھا کہ ان جیسا کھڑتل انسان اور جس طالب علم کو دیکھو ان ہی کی تعریف کر رہا ہے۔مظفر حنفی نے افسانے بھی لکھے ہیں اور تنقیدی مضامین بھی۔کتابیں بھی ایڈٹ کی ہیں۔ہم ان کی علمیت، ان کی ادبی اور تنقیدی صلاحیتوں کے دل سے قائل ہیں مگر بھئی ہم ان کو سمجھتے شاعر ہیں......ترچھے اور نوکیلے شاعر۔یہی ان کی انفرادیت ہے۔ان کے سارے طور طریقے شاعروں والے ہیں۔ان کی شخصیت پر میر کا یہ مصرعہ خوب چسپاں ہوتا ہے: ''تری بات روکھی تری چال ٹیڑھی'' دوسرا مصرع یوں نہیں کہ انھیں میر کی طرح کسی سے نہ سمجھنے یا کم سمجھنے کا شکوہ نہیں۔ان کی تو کلاہ کج ہے، اسی بانکپن کے ساتھ۔''

(پروفیسر صغریٰ مہدی)

محمد فرحان خان
ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، رابطہ نمبر:9870880090

مظفر حنفی کی نظم 'عکس ریز' کا تجزیاتی مطالعہ

پروفیسر مظفر حنفی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ بیک وقت وہ ایک شاعر، فکشن نگار، محقق اور ناقد تھے۔ ان کا ادبی سفر نصف صدی پر محیط ہے۔ انھوں نے باقاعدہ شعر و ادب کی مختلف مروجہ اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ بنیادی طور پر وہ اپنی غزلیہ شاعری کے حوالے سے جانے جاتے ہیں، علاوہ ازیں انھوں نے کامیاب نظمیں بھی سپرد قلم کی ہیں جن کی بنا پر نظم نگاری کا دائرہ وسیع ہوا ہے۔ مظفر حنفی کی شعری تخلیقات میں 'تیکھی غزلیں'، 'پانی کی زبان'، 'صریر خامہ'، 'طلسم حرف'، 'دیپک راگ'، 'یم بہ یم'، 'کھل جا سم سم'، 'پردہ سخن کا'، 'یا اخی' اور 'عکس ریز' وغیرہ قابل توجہ ہیں۔

مظفر حنفی کی نظم 'عکس ریز' طنزیہ خاکوں پر مشتمل ایک طویل نظم ہے جس میں تقریباً ایک سو چوبیس بند (خاکے) شامل ہیں اور ہر بند یا خاکے کا اپنا علیحدہ کردار ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک سو چوبیس کرداروں کی کہانی ہے یا یوں کہیں کہ نظم عکس ریز مختلف شعری خاکوں اور کرداروں کا مجموعہ ہے جس کا ہر بند آٹھ مصرعوں پر مشتمل ہے اور ہر کسی کے عنوانات بھی علیحدہ ہیں۔ مختصر یہ کہ مذکورہ نظم ایک منظوم ڈراما اور خاکے کا کامیاب نمونہ ہے جو کتابی شکل میں ۱۹۶۹ء میں شائع ہو چکی ہے۔

بنیادی طور پر نظم عکس ریز سماج کی حقیقی تصویر کشی کرتی ہے۔ یہ وہ کردار ہیں جو ہمارے گلی محلے، گاؤں، قصبات اور شہر میں چاروں طرف موجود ہیں لہٰذا مظفر حنفی نے ان کرداروں کے روزمرہ کے مسائل کو بخوبی محسوس ہی نہیں کیا بلکہ ان کرداروں اور ان کے ذاتی مسائل کا عکس ظاہر کیا ہے۔ مجموعی طور پر انھوں نے ان مسائل پر طنزیہ گفتگو کی ہے جن کو محسوس تو سب کرتے ہیں لیکن اپنا اپنا منھ بچاتے ہیں۔ وہ سماج کی گندگی اور کیچڑ سے ناک پر رومال نہیں رکھتے اور نہ ہی مٹی ڈالتے ہیں بلکہ اسے کرید کر گہرائی کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مذکورہ نظم میں جو خاکے بیان ہوئے ہیں وہ خود مظفر حنفی کے اپنے اردگرد کے لوگ ہیں جن میں کچھ غیر بھی ہیں اور ان کے دوست احباب اور رشتے دار بھی ہیں، لہٰذا سخت طنزیہ انداز میں تمام کرداروں کی پوشیدگیوں کو

ظاہر کرنا آسان کام نہیں۔ وہ خود یہ اعتراف کرتے ہیں کہ یہ کام خود اپنی کھال اتارنے سے کم تکلیف دہ نہیں ہے۔ بہر کیف مظفر حنفی کا مقصد سماجی اصولوں پر قدغن لگانا اور محض طنز و تضحیک کرنا نہیں بلکہ معاشرے کی اصلاح مقصود ہے۔ ان کے یہ تمام خاکے یا کردار جتنے ظاہر ہیں اس سے زیادہ کہیں پوشیدہ بھی ہیں۔ حسب ضرورت کہیں کہیں انھوں نے محض اشاروں اور کنایوں سے کام لیا ہے۔ یہ اشارے بجلی کے کرنٹ کی طرح ہیں کیوں کہ بجلی کے ننگے تار چھونا کوئی ہوشیاری نہیں۔ سید احتشام حسین نے واضح طور پر لکھا ہے کہ:

> ''یوں تو عکس ریز ایک ہی جذبہ اور تاثر کے تحت تخلیق کی ہوئی ایک طویل نظم ہے لیکن درحقیقت یہ چھوٹے چھوٹے مرقعوں کا ایک البم ہے جس میں بہت سی تصویریں یکجا کر دی گئی ہیں۔ مظفر حنفی نے یہاں نہ تو ناصح مشفق بننے کی کوشش کی ہے اور نہ اپنے کو ایک معلم اخلاق ہی کی حیثیت سے پیش کیا ہے بلکہ ایک شاعر کی طرح پڑھنے والوں کی رگ احساس کو چھیڑا ہے تاکہ وہ بھی سماج کی ان گندگیوں کو دیکھ لیں جنھیں انھوں نے دیکھا ہے اور جو اوپر سے صاف ستھرا دھلا دھلایا اور منظم نظر آ رہا ہے۔'' (عکس ریز، ص ۷)

مظفر حنفی شاد عارفی سے زانوئے تلمذ تہ کیے تھے اور انھیں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انھوں نے اپنے کلام کی بنیاد طنز و تضحیک پر رکھی ہے۔ جس طرح شاد عارفی کے کلام میں پھکڑ پن اور طنز کی گہری کاٹ ہے اسی شعری روش کی اتباع کرتے ہوئے مظفر حنفی نے طنز و نشتریت کو بطور فن برتنے کی کوشش کی ہے۔ انھیں کی زبان سے یہ اعتراف بھی سن لیجیے۔

ہم سے اس قسم کی امید نہ رکھے دنیا
ہم کسی شخص کی تعریف تو کرتے ہی نہیں

ظ۔ انصاری نے ان خاکوں کو کا بک کا نام دیا ہے۔ اس لیے کہ ہر ایک کردار کو کا بک کے برابر خانوں میں قید کرنا آسان کام نہیں ہوتا اور یہ امر واقعی بہت مشکل ہے کہ معمولی کردار کو بھی آٹھ مصرعوں میں قید کر دیا جائے۔ مظفر حنفی اپنے تخلیقی کرداروں اور خاکوں کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ:

> ''ان خاکوں پر مشتمل طویل طنزیہ نظم کا نام 'عکس ریز' یوں منتخب کیا گیا ہے کہ یہ طنز کے لینس پر حاصل کی ہوئی مختلف علامتی کرداروں کی عکس ریز فلمیں ہیں جن میں رنگ آمیزی نہیں کی گئی ہے''۔ (عکس ریز، ص۱۹)

دراصل نظم کی ابتدا سے ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ پیش آنے والے واقعات کس نوعیت کے ہوں گے۔ یہ نظم محض طنزیہ خاکوں تک محدود نہیں ہے اس سے بڑھ کر یہ منظوم ڈراما نگاری کا نمونہ کہی جا سکتی ہے۔ نظم کی تخلیقی تاثیر بلاشبہ ڈرامائی ہے لیکن حقیقت سے پر ہے۔ یہ وہ داستان ہے جو ہمارے معاشرے میں کسی وبا کی

طرح پھیل چکی ہے۔ یہ وہ زخم ہے جس پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔ نظم کا پہلا بند دیکھیے ؎

جس طرف دیکھو وہیں اک ٹیڑھ ہے — کوئی پونا ہے تو کوئی ڈیڑھ ہے
فلسفی یہ ہے وہ پاگل آدمی — کم ہی نکلیں گے مکمل آدمی
میں نے برتا ہے انھیں نزدیک سے — سب کی تعریفیں کروں گا ٹھیک سے
آپ کو دلچسپ لوگوں سے ملاؤں — آیئے اس دور کی جھلکی دکھاؤں

بنیادی طور پر اس نظم کے مختلف کردار متوسط گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ کچھ کردار مجہول ہیں اور کچھ شریف بصورت دیگر یہ جان کر حیرانی ہوتی ہے کہ شریف کردار محض دکھاوے کے ہیں لیکن فطرتاً دوغلے ہیں۔ ان میں عورتیں بھی ہیں اور بچے بھی۔ جوان بھی ہیں بزرگ بھی۔ سیٹھ ساہوکار بھی ہیں اور مزدور بھی۔ ہر خاکے کے پیچھے ایک کہانی ہے اور ہر کہانی کا اپنا پس منظر ہے جو اتنا صاف اور طویل ہے کہ بظاہر چھوٹی بحر کے آٹھ مصرعوں کے پیچھے ایک دنیا دیکھی جا سکتی ہے۔ معمولی سے معمولی کردار سے لفظی تصویروں کے نقوش اجاگر ہوتے ہیں جس میں شعریت اور نشتریت کی فنی نزاکتوں کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے براہ راست اپنے نوک قلم سے ندامت سے زیادہ ملامت کے نشتر چلائے ہیں۔ طنز آمیز حوصلہ افزائی اور ہمدردی کے جذبے کو قائم رکھا ہے۔ کہیں سنجیدہ مسائل پر گفتگو کی گئی ہے تو کہیں طنزیہ و تیکھے تبسم کے ساتھ اصلاح کرنے کی کوشش ہے۔

ہر خاکہ ایک نئے کردار کی حقیقی تصویر کو پیش کرتا ہے۔ سماج میں ایسے افراد کی کمی نہیں جو اپنے مسائل سے دوچار نہ ہوں۔ دراصل مختلف پہلوؤں سے پردہ کشی کرتا ہے۔ مثلاً گھریلو نوک جھونک، بچوں کی نفسیات، کثرت اطفال، بدمزاج، سخت اور بے مروت شوہروں کی لعن طعن، بے روزگاری، سماجی دھتکار اور استحصال، گالم گلوج جیسے مسائل کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

کرداروں کے حوالے سے ہر خاکے کا عنوان پہلے سے طے شدہ ہے پھر اس کے بعد کہانی اپنے انجام کو پہنچتی ہے لیکن درمیان میں جن مراحل سے گزر ہوتا ہے وہ تمام مرحلے مختصر سہی مگر مکمل ہیں۔ یوں تو عنوانات کی فہرست طویل ہے لیکن لفظی تاثیر میں تازگی کا احساس برقرار رہتا ہے۔ مظفر حنفی نے باقاعدہ ان کرداروں کو پیش کیا ہے جو معاشرے کا حصہ ہیں ساتھ ہی ان کے عادات واطوار کی عکاسی میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ مثال کے طور پر نظم کے چھٹے بند میں مکان مالکوں کا رویہ بیان کیا ہے تو وہاں کرائے دار پر پابندیوں کی قید ہے۔ بزرگ عورتوں کی بات کرتے ہیں تو انھیں محلے کی نگرانی اور مخبری سونپ دیتے ہیں۔ اسی طرح بزرگ مردوں کی جھوٹی باتوں اور جعلی کارناموں کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ جوان عورت کی نفسیات اور بوڑھے شوہر کی بعض کمزوریوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں ساتھ ہی 'کمزور اور معذور بیوی جو مار بھی کھاتی ہے، فاقہ کشی بھی کرتی ہے اور بچے جنتی ہے' کے المیاتی واقعہ کی طرف بھی نگاہ کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ تمام کردار مصنوعی نہیں حقیقی ہیں جن میں امیر و شریف،

افسر، چوکیدار، وکیل، کلرک، چپراسی، غنڈے بدمعاش، چور ڈکیت، طلبہ و طالبات، نوکرانی، مہترانی، انجینئر، بلڈر، لیڈر، مدیر، طوائف، پیر مرید، پنڈت، پٹواری، تاجر، منشی، سیٹھ، ٹھیکیدار، کنجوس، ملاوٹ خور، ٹیلر، ماسٹر، دھوبی، سرکاری نرس، سول سرجن، جیوتشی، جادوگر، فقیر، پہلوان، شاعر، ادیب اور نقاد کا حلیہ اور ان کے ذاتی مسائل و معاملات کو نہایت غور و فکر کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اردو ادب اور شاعری کے حوالے سے بھی آپ کا رویہ نہایت سخت ہے۔ براہ راست وہ ادب پر حکمرانی کے قائل نہیں اور نہ کسی تشہیر اور پرستاری کو قبول کرتے ہیں۔ یہاں بھی طنز کا پہلو غالب ہے۔ مثلاً ؎

جس کے سر سے وہ اٹھا لیتے ہیں ہات — وہ بڑا فن کار کھا جاتا ہے مات
تبصرے، تنقید، دیباچہ، غزل — نظم، افسانہ پہ حکم ان کا اٹل
سیکھنا چاہو جو گٹ بندی کا فن — یہ رہے اردو کے بابائے سخن

ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہیں۔ شعرا کی جہاں بات ہوتی ہے تو وہ ان کے متشاعر ہونے کا دعویٰ ٹھوک دیتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان کے چوری کے کلام کو بھی عیاں کر دیتے ہیں۔ ساتھ ہی شخصیت پرستی پر بھی طنز کرنے سے نہیں چوکتے۔

مظفر حنفی کی شاعری دیگر شعرا کے مقابلے زیادہ تیکھی اور تلخ ہے۔ لہجے کی کاٹ اور الفاظ کی چوٹ نمایاں ہے۔ مختلف ناقدین کا خیال ہے کہ مظفر حنفی کی شاعری شاد عارفی کے شعری اسلوب کی ہی توسیع ہے جس کا اعتراف خود مظفر حنفی نے بھی کیا ہے۔ انھوں نے اپنے شعری سفر کا آغاز ۱۹۵۶ء کے آس پاس کیا۔ یہ وہ دور تھا جہاں نئے رجحانات پنپ رہے تھے۔ انسانی اقدار و کردار صنعت و حرفت کے ماحول کی بھینٹ چڑھ رہا تھا۔ اخلاقی پستی اور تہذیبی انتشار کا بازار گرم تھا۔ ایسے پیچیدہ ماحول میں مظفر حنفی نے کسی خاص نقطہ نظر کو قبول نہ کر کے اجتماعی اور انفرادی رجحانات کی اتباع کی۔ وہ نہ ترقی پسند نظریے کے پابند تھے اور نہ ہی جدیدیت کے پرستار۔ مشترکہ طور پر وہ جدید ترقی پسند تخلیق کار تھے۔ بعض ناقدین ان میں ترقی پسند تصورات کو تلاش کرتے ہیں اور کوئی انھیں جدیدیت کا علمبردار ثابت کرتا ہے لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ فنی طور پر وہ تخلیقی مقصدیت کے قائل تھے۔

تخلیقی طور پر مظفر حنفی حقیقت پسندی اور غیر جانبداری کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ نظم 'عکس ریز' کی بات کریں تو یہاں بھی موقع بہ موقع انھوں نے صاف گوئی اور بے تکلفی کا انداز اختیار کیا ہے۔ خالص عوامی زبان جس میں اردو، ہندی، عربی، فارسی اور انگریزی کا براہ راست استعمال ہوا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ واقعات میں روانی اور دلچسپی اول تا آخر قائم رہتی ہے۔ جیسا کردار پیش آتا ہے ویسا ہی اس کا حلیہ اور انداز تکلم کا اظہار عمل میں آتا ہے۔ جس طرح یہ نظم ڈرامائی پہلوؤں کے ساتھ تخلیق کی گئی ہے اسی طرح مکالماتی انداز کا بخوبی خیال رکھا

گیا ہے۔ مکالمے کی صورت میں جگہ جگہ محاوروں کا استعمال مزید حسن پیدا کرتا ہے۔ نیز مظفر حنفی نے مکالماتی انداز کے سہارے خوب سے خوب تر استعاراتی اور علامتی زبان کو برتنے کی کوشش کی ہے۔ مکالمے کی صورت میں یہ بند ملاحظہ فرمائیں۔

کل مقدمہ ہے دعا فرمایئے ۔۔۔ بانجھ ہوں لڑکا عطا فرمایئے
عشق کو بے ربط کر دیجے حضور ۔۔۔ عقل اس کی خبط کر دیجے حضور
پھر گئی ہے مجھ سے کیوں چشمِ کرم ۔۔۔ آج کل رشوت ہمیں ملتی ہے کم
سب مریدوں کے خدائی باپ ہیں ۔۔۔ سینکڑوں کے پیر و مرشد آپ ہیں

تاہم نظم کا سب سے پر اثر پہلو یہ ہے کہ موضوعاتی تناظر میں کردار کی ادائیگی، بے تکلف زبان واسلوب اور لہجے کی تیکھی کاٹ یقیناً حقیقت کی ترجمان ہیں۔ نظم کے تمام شعری کردار مختلف معاشرتی پہلوؤں کے عکاس ہیں لہٰذا یہ نظم اردو شاعری میں طنز نگاری کی عمدہ مثال ہے اور اس نوعیت کی پہلی منفرد تخلیق بھی ہے۔ انداز بیان اور شعری اظہار کی بنا پر نظم کے ہر بند میں کہیں نہ کہیں سماج کی دکھتی رگوں کو چھیڑا گیا ہے۔ جہاں بھی انھیں کوئی خامی نظر آتی ہے وہیں ان کا قلم زہر اگلنے لگتا ہے۔ اخلاقی طور پر وہ سماجی رسم و رواداری اور انسانی رویے کے منکر نہیں ہیں اور نہ کوئی خبط ہے بلکہ چھوٹی چھوٹی برائی ان کے نزدیک بڑے خطرات کی بنیاد ہیں۔ ایسی صورت میں وہ چھوٹے چھوٹے مسائل پر غور کرتے رہتے ہیں اور پھر بے تکلف اس تصویر کو عیاں کر دیتے ہیں۔ مثلاً۔

ایملی زولا کا فن از بر انھیں ۔۔۔ دسترس کالج کے ہیرو پر انھیں
دسمہ و غازہ بہ ایں ٹیڈی لباس ۔۔۔ خود چلی آتی ہیں پروانوں کے پاس
اف یہ چہرے سے نقاب الٹا ہوا ۔۔۔ جیسے اک جام شراب الٹا ہوا
حد سے آگے بڑھ رہی ہیں لڑکیاں ۔۔۔ باپ خوش ہے پڑھ رہی ہیں لڑکیاں

مظفر حنفی کی نظم 'عکس ریز' کی خوبیاں ایک طرف، ان کے وسیع مطالعہ اور سماجی تجربات کا اعتراف بھی لازم ہے، کیوں کہ اظہار کی نوعیت طنزیہ ضرور ہے لیکن سماج میں پھیلے انسانی مسائل کی معنویت کو بھی محسوس کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ان کی قادر الکلامی اور وسیع النظری سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ انھوں نے کسی مخصوص طبقے اور مذہب کو نشانہ نہیں بنایا ہے بلکہ انھیں ہر کردار سے پوری ہمدردی ہے اور معاشرے کی اصلاح مقصود ہے۔ وہاب اشرفی لکھتے ہیں کہ:

''مظفر حنفی لب ولہجہ کی متانت انتہائی سنگین موقعوں پر بھی نہیں کھوتے۔ اس لیے ان کے طنز پر غصہ نہیں آتا بلکہ سوچنے سمجھنے کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔'' (مظفر حنفی: ایک مطالعہ، ص ۲۵۰)

نظم 'عکس ریز' کے تمام خاکے ایک دوسرے سے مربوط نہیں ہیں بلکہ جدا جدا ہیں۔ موضوعات کے

لحاظ سے بھی ہر خاکے کا عنوان علیحدہ ہے۔ حالاں کہ یہ کوئی تخلیقی علمیت نہیں لیکن بہتر ہوتا کہ تمام خاکے عنوانات کے لحاظ سے ترتیب دیئے گئے ہوتے۔ نظم میں مختلف کردار ایسے ہیں جو ایک جیسے ہیں۔ چوں کہ نظم کا ہر بند علیحدہ ہے اور آپس میں کوئی تخلیقی تعلق نہیں ہے، لہٰذا موضوعاتی سطح پر ہر بند کی معنویت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ عنوانات و موضوعات مخصوص زاویۂ نگاہ سے تخلیق کیے گئے ہیں جو عدم توازن، نااہلیت، افراد کے مغالطے اور طبقاتی المیہ کی عکاسی کرتے ہیں۔ غرض کہ مظفر حنفی کے شعری اظہار سے نفرت اور کراہیت کے احساسات نمایاں نہیں ہوتے بلکہ سماجی، سیاسی، مذہبی اور اقتصادی تخریب کاریوں کے خلاف غم و غصہ کا جذبہ ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

مظفر حنفی ان چند شعرا میں انفرادی حیثیت رکھتے ہیں جنھوں نے باقاعدہ طنزیہ شاعری کی روایت کو فروغ دیا ہے لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ اس طرح کے شعری اظہار میں تبدیلیاں ہی نہیں آئیں، طنز نگاری میں زوال بھی ہوا ہے۔ سوال یہ نہیں کہ خشک موضوعات اور تیکھے اسلوب سے اردو شاعری خالی نہیں ہے بلکہ سوال یہ ہونا چاہیے کہ مذکورہ شعری روایت کس طرح زوال پذیر ہوئی ہے۔

OOO

''.....آپ کو 'پانی کی زبان' کی اشاعت مبارک ہو۔ نہ صرف آپ کو بلکہ اردو کے ان گنے چنے لوگوں کو بھی، جو کسی اچھی کتاب کی اشاعت کو تاریخ کا ایک اہم واقعہ سمجھتے ہیں.....'پانی کی زبان' کے تیور بڑے زوردار ہیں، آپ کی گوناگوں ترقی دیکھ کر جی بہت خوش ہوتا ہے.....کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی لگن اور کچھ نہ کچھ کیے جانے کی ہمت قابلِ رشک ہے۔'' **(عمیق حنفی)**

ڈاکٹر مقبول احمد مقبولؔ
اودگیر، لاتور، مہاراشٹر، رابطہ نمبر: 9028598414

مظفر حنفیؔ کی رباعی گوئی

پروفیسر مظفر حنفیؔ کا شمار جدید لب و لہجے کے چند معتبر اور اہم قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے زرخیز قلم سے اردو زبان و ادب کے ذخیرے میں جو قابلِ قدر اضافہ کیا ہے وہ اردو ادب کی تاریخ کا روشن حصہ ہے۔ ہشت پہلو یا ہمہ جہت فن کار کا اطلاق صحیح معنوں میں مظفر حنفی جیسی شخصیات ہی پر ہوتا ہے۔ انھوں نے غزل، نظم، رباعی، افسانہ، تحقیق، تنقید، ترتیب، ترجمہ، سفر نامہ اور ادبِ اطفال جیسے گوناگوں اصنافِ نظم و نثر میں اپنے اشہب قلم کی خوب خوب جولانیاں دکھائی ہیں۔ مظفر حنفی کثیر التصانیف اور کثیر الاشاعت مصنف تھے۔ ان کا ذہن بے حد زرخیز اور طبیعت میں بلا کی روانی تھی۔ طبیعت کی یہ روانی ''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات'' کے مصداق بچپن ہی سے تھی۔ مظفر حنفی کو بھی اس بات کا احساس و ادراک تھا چنانچہ انھوں نے خود کہا ہے ؎

عہدِ طفلی سے طبیعت میں روانی ہے بہت		ناؤ کاغذ کی بہائی ہم نے پانی میں بہت

شاعری کے حوالے سے بات کی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ مظفر حنفی کو غزل اور نظم دونوں پر قدرت حاصل تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے شعری ذخیرے میں غزلوں کا حصہ زیادہ ہے۔ مظفر حنفی نے رباعیات بھی کہی ہیں لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ ساٹھ کے آس پاس ہوں گی۔ کثرت و قلت سے قطعِ نظر ان رباعیات کو فن اور معیار، اسلوب اور لہجے کی روشنی میں دیکھا جائے تو بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ غزل اور نظم کی طرح رباعی گوئی میں بھی مظفر حنفی نے اپنی انفرادیت کو قائم رکھا ہے۔ مظفر حنفی نے اپنی غزل کے بارے میں دعویٰ کیا ہے ؎

اس کا کوئی بھی شعر کہیں سے اٹھا کے دیکھ		ٹھپہ لگا ہوا ہے مظفر کے نام کا

یہ دعویٰ ان کی غزل کی طرح ان کی رباعیات کے بارے میں بھی کھرا ثابت ہوتا ہے۔ اصل میں ہر جینئس قلم کار اپنا اسلوب خود پیدا کرتا ہے۔ وہ پامال راستوں پر چلنے کے بجائے اپنا راستہ خود بنا لیتا ہے اور وہ ؎

براہِ دیگراں رفتن عذابست		تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش

کے اصول پر سختی سے کاربند رہتا ہے۔ مظفر حنفی کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ انھوں نے اپنا راستہ خود اپنے

رباعی

تیشے سے بنایا ہے۔

مظفر حنفی کی رباعیات ان کے مخصوص اندازِ بیان، لہجے اور لفظیات کی غماز ہیں۔ عرفان کی دھوپ، دیوارِ عقیدہ، مردار عقائد کے سنہرے پتے، کاجل کی کوٹھریاں، کاغذ کے معاشرے، فنا کا غار، دیوارِ جسم جیسے نئے نئے اور انوکھے استعاروں سے ان کی رباعیات میں ایک طرح کی جدت وندرت پیدا ہوگئی ہے۔ چند رباعیاں ملاحظہ فرمائیں۔

تریاق نہ لا، مار گزیدہ ہی نہیں   مرہم نہ لگا، زخم رسیدہ ہی نہیں
عرفان کی اُس دھوپ میں جلتا ہے یہ دور   جس میں کوئی دیوارِ عقیدہ ہی نہیں

......

ہر چند کہ امرت ہو ہزاروں کے لیے   پیادے ہی تو کٹتے ہیں سواروں کے لیے
مردار عقائد کے سنہرے پتو!   پت جھڑ بھی ضروری ہے بہاروں لیے

......

مرمر کی طرح سپید چاندی سے بدن   کاغذ کے معاشرے میں شیشے کے بدن
دیکھو یہ کھلی کوٹھریاں کاجل کی   شفاف، چمکتے ہوئے لو دیتے بدن

......

مرمر کے فن کا غار پاٹو یارو!   سانسوں کی یہ زنجیر بھی کاٹو یارو!
اس سے پہلے کہ روح گھٹ کر مرجائے   چاٹو، دیوارِ جسم چاٹو یارو

مظفر حنفی کی رباعیاں صرف لفظیات، استعارے، تراکیب اور اسلوبِ بیان ہی کی حد تک جدت وندرت کی حامل نہیں، بلکہ موضوعات اور خیالات کے اعتبار سے بھی ان میں نیا پن ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مظفر حنفی نے رباعیات کے مروجہ مضامین اور موضوعات سے شعوری طور پر اجتناب کیا ہے۔ احساس کی طاقت، شدت اور کیفیت کے موضوع پر اس سے قبل ایسی رباعی شاید ہی کسی نے کہی ہو۔ ملاحظہ کریں۔

احساس کی مت پوچھ عجب شے ہے یہ   ہر سانس پہ بجتی ہوئی اک نے ہے یہ
خنجر سے خیالات نہیں کٹ سکتے   احساس ہی مارے گا مجھے طے ہے یہ

مدرسے میں ننھے ننھے بچوں کے آموختہ پڑھنے کے منظر کو کس انوکھے پن سے درشایا ہے، دیکھیں۔

سمٹے ہوئے کوزے میں سمندر جیسے   اک تار میں گوندھے ہوے گوہر جیسے
آموختہ پڑھتے ہوئے چنچل بچے   پر جوڑ کے بیٹھے ہیں کبوتر جیسے

موت برحق ہے، اسے جب آنا ہے کسی حال میں بھی آجاتی ہے۔ موت سے بچنے کی اور محفوظ رہنے کی ہر انسان مقدور بھر کوشش کرتا ہے لیکن ناکام رہتا ہے۔ مظفر حنفی نے ایک رباعی میں ناامیدی، غیر یقینی صورتِ حال اور موت کے خوف کے موضوع پر جو رباعی کہی ہے اس کے مفہوم کو صرف سمجھا جاسکتا ہے، اس کو مکمل طور پر سمجھانا

بہت مشکل ہے، آپ بھی سمجھ لیجیے۔

گھنگھور گھٹاٹوپ اندھیرا اور موت   ہر سمت وہی آہنی گھیرا اور موت
گھبرا کے جو اندر سے چٹخنی کھولی   در آئے بہ یک وقت سویرا اور موت

آپسی کشت وخون اور جنگ وجدل پر بہت ساری نظمیں کہی گئی ہیں، اشعار کہے گئے ہیں، رباعیاں بھی کہی گئی ہیں جن میں بیشتر ناصحانہ انداز اور تنبیہ کا رنگ پایا جاتا ہے لیکن مظفر حنفی نے اس موضوع کو نہایت ہی انوکھے طرز واسلوب میں پیش کیا ہے جس میں ڈرامائیت کا عنصر بھی شامل ہوگیا ہے۔ دیکھیں۔

دیکھا کہ ہر اک شخص لہو میں تر تھا   اور بحرِ شجاعت مرا کف آور تھا
جب آنکھ کھلی چونک پڑا، یا حیرت   خود اپنی ہی گردن پہ مرا خنجر تھا

یہاں چوتھے مصرعے کے ذریعے شاعر یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ آپسی کشت وخون، جھگڑے اور فساد میں لوگ ایک دوسرے کا سر کاٹتے ہیں ایک دوسرے کا قتل کرتے ہیں لیکن شعور کی آنکھ سے دیکھا جائے تو دراصل وہ اپنا سر آپ کاٹ رہے ہوتے ہیں۔ آنکھ کھلنے پر چونک پڑنا اور حیرت سے اپنا خنجر اپنی گردن پر دیکھنا اس بات کی طرف نمکین اشارہ ہے کہ جب غصہ تھم جاتا ہے، انتقام کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے اور درندگی کا زور ختم ہوجاتا ہے، بالفاظِ دیگر جب اسے ہوش آجاتا ہے تو اسے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ میں نے کسی دوسرے پر نہیں بلکہ اپنے آپ پر خنجر چلایا ہے۔

مظفر حنفی کے خیال میں ابھی معاشرہ رنگ ونسل کے امتیازات سے پوری طرح آزاد نہیں ہوسکا۔ آج بھی معاشرہ رنگ ونسل کے بتوں سے چمٹا ہوا ہے۔ مساوات کے دعوے پر کیسا تیکھا طنز کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں۔ کہتے ہیں۔

اب تک وہی افسانۂ محمود و ایاز   سچ ہے کہ تضادات کی رسی ہے دراز
دامن میں وہ بُت خون کے، رنگوں کے صنم   ظاہر میں مساوات کی اونچی آواز

مظفر حنفی معاشرے کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنا خوب جانتے ہیں۔ پھر دنیا سے مخاطب ہوکر کہتے بھی ہیں کہ ایسا کرنا میری مجبوری ہے۔ کیوں کہ میں ایک بے باک قلم کار ہوں اور آئینہ دکھانا میرا کام ہے۔ اگر تو اپنی دکھتی ہوئی رگ چھپا سکتی ہے تو چھپا لے لیکن جب مجھے یہ رگ نظر آئے گی تو میں ضرور اس پر ہاتھ رکھوں گا۔ کیا خوب اندازِ بیان ہے، ملاحظہ کریں۔

بھڑکی ہوئی اک مشعلِ غم رکھتا ہوں   شبنم کی طرح دیدۂ نم رکھتا ہوں
دُکھتی ہوئی رگ اپنی چھپا لے دنیا   مجبور ہوں کاغذ پہ قلم رکھتا ہوں

دراصل سچا فن کار مصلحت کوشی کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ جسے برحق سمجھتا ہے بلاخوف وخطر اس کا اظہار کر دیتا

ہے۔مظفرؔ حنفی نے بعض رباعیات میں لفظوں کی تنگ دامنی اور کھوکھلے پن کی شکایت کی ہے۔بقول مظفر انھیں کہنا بہت کچھ ہے لیکن الفاظ میں نہ اتنی وسعت ہے نہ معنوی گہرائی جو ان کے مافی الضمیر کی ادئیگی میں بہتر طریقے سے معاونت کر سکے۔کہا ہے۔

جملوں میں مقید ہیں پریشاں الفاظ   منھ بند، سسکتے ہوئے حیراں الفاظ
افسانے گڑھے، شعر کہے، نظم لکھی   الفاظ نرے کھوکھلے بے جاں الفاظ

......

لفظوں میں نہ وسعت ہے، نہ گرمی نہ عمق   ترسیل کو ہر گام پہ سوسو خندق
کہنے کو بہت، اور کہا جائے نہ کچھ   جذبہ ہے کہ احساس میں پھولی ہے شفق

......

موتی نہ تھے دریا میں تو ہم کیا کرتے   آنسو ہی نہیں آنکھ میں غم کیا کرتے
ہاتھ آئے وہی کھوکھلے لفظوں کے صدف   گہرائی کی روداد رقم کیا کرتے

حیدرآباد کے شاعر مضطر مجاز نے بھی بڑے خوب صورت اور انوکھے انداز میں اس کمی کی شکایت کی ہے۔کہتے ہیں۔

اللہ کی پناہ کہ حجرے میں لفظ کے   جھانکا تو پیرِ معنی کوئی معتکف نہ تھا

......

حمل حروف کے ساقط ہیں روشنائی بانجھ   معانی قبر میں لیٹے ہیں، لفظ اکہرا ہے
دھواں اڑاتے ہوئے لفظ اور لفظ ہی لفظ   چہار سمت دھواں ہے، دھواں بھی گہرا ہے

بات دراصل یہ ہے کہ کبھی کبھی شاعر کو اپنے مافی الضمیر کی بہتر ادائیگی کے لیے مناسب ترین الفاظ دستیاب نہیں ہوتے۔بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جس زبان میں وہ اپنے خیالات پیش کرنا چاہتا ہے اس زبان میں ایسے الفاظ موجود ہی نہیں ہوتے۔ایسے موقعے پر شاعر بڑی محرومی محسوس کرتا ہے۔اسے اپنے خیال کو مناسب اور موثر ڈھنگ سے پیش کرنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے بلکہ وہ اپنا خیال اور تاثر پیش ہی نہیں کر سکتا۔یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ نے اپنی فکر اور اپنے فلسفے کو بہتر اور موثر طور پر پیش کرنے کے لیے اردو کے بجائے فارسی زبان کا سہارا لیا۔یہ سچ ہے کہ اقبالؔ نے اپنے افکار و نظریات اور فلسفے کو اردو زبان میں بھی پیش کیا ہے لیکن ان کا بیشتر فکری سرمایہ فارسی زبان میں ہے۔اقبالؔ اپنے فلسفے کو جس مربوط اور منظم انداز میں پیش کرنا چاہتے تھے اردو زبان اس کی متحمل نہیں تھی۔

مظفرؔ حنفی زود نویس شاعر و ادیب تھے۔انھوں نے نظم و نثر کی مختلف اصناف میں اس قدر لکھا ہے کہ اس کا آسانی کے ساتھ احاطہ کرنا مشکل ہے۔شاعری کے حوالے سے دیکھا جائے تو مظفرؔ حنفی کی تخلیقی زندگی کا دورانیہ تقریباً پینسٹھ برسوں کو محیط ہے۔اس دوران ان کے ہندی اور اردو میں قریب قریب ڈیڑھ درجن شعری مجموعے

شائع ہوئے۔ان کا تخلیقی وفور قابلِ رشک تھا۔ذرا سا احساس اور معمولی سا واقعہ بھی ان کے لیے تخلیقِ شعر کا باعث بنتا تھا۔بہتر سے بہتر اور نت نیا کہنے کی انھیں للک تھی۔یہ للک انھیں ہمیشہ بے چین و بے قرار رکھتی تھی۔درج ذیل رباعی ان کی اسی کیفیت کی غمازی کرتی ہے۔

گر خود کو سنبھالوں نہ میں آنسو کی طرح   یہ فن بھی ہے تاثیر میں جادو کی طرح
دن رات گھمائے مجھے صحرا صحرا   خوشبوئے سخن نافۂ آہو کی طرح

ایک دوسری رباعی میں کہا ہے کہ تخلیقی وفور کو دبائے رکھنا میرے لیے ممکن نہیں ورنہ میں گھٹن سے مرجاؤں گا۔

کہنے کے لیے صبر تو کر جاؤں گا   لیکن یہ گھٹن بڑھی تو مر جاؤں گا
فطرت سے میں بادل ہوں برس جانے دو   پھر جھیل کے اس پار اتر جاؤں گا

مظفرؔ حنفی کے ذخیرۂ شعر میں رباعیات کی تعداد کم ضرور ہے لیکن موضوعات، لفظیات اور اسلوبِ بیان کے اعتبار سے دامنِ دل کھینچتی ہیں۔ان کی رباعیات ایک نئے ذائقے کی حامل ہیں۔نئے انداز اور نئے لہجے کی شاعری کے دلدادگان کو مظفرؔ حنفی کی رباعیات یقیناً پسند بھی آئیں گی اور متاثر بھی کریں گی۔

مظفرؔ حنفی یقیناً جدید لب و لہجے کے اہم شاعر ہیں۔انھیں زبان و بیان اور فن پر بھی عبور حاصل تھا لیکن یہ بات حیرت انگیز ہے کہ ان کے کلیات 'کمان' میں شامل رباعیوں میں چار رباعیاں ایسی ہیں جن کے پانچ مصرعے ساقط الوزن ہیں۔ملاحظہ کریں۔

منظور نہیں تلخ نوائی مجھ کو   تو نے ہی عطا کی تھی کج ادائی مجھ کو
سر خم ہو بہر حال یہ سجدہ ہو کہ بوجھ   راس آ نہ سکی تیری خدائی مجھ کو

اس رباعی کا دوسرا مصرع ساقط الوزن ہو گیا ہے۔

ہو خام تو لفظوں میں اٹک جاتا ہے   کاغذ کے سفر سے قبل تھک جاتا ہے
جذبات ابلتے ہیں تو ہوتا ہے شعر   پکا ہوا پھل خود ہی ٹپک جاتا ہے

چوتھا مصرع وزن سے گر گیا ہے۔

ہاں نہ سنگِ مزار اونچا رکھنا   جتنا چاہو حصار اونچا رکھنا
تسلیم ہر اک جرم، مگر میرے لیے   اوروں سے صلیب و دار اونچا رکھنا

پہلا مصرع بے وزن ہو گیا ہے۔

ہر چند کہ منظور نہیں ہے آرام   آمد میں رکاوٹ ہے نہ جذبہ ہے خام
لیکن وہ بہت دنوں کے بعد یاد آئے ہیں   فی الحال تو اے فکرِ شعر، تجھ کو سلام

اس رباعی کا تیسرا مصرع بھی اور چوتھا مصرع بھی ساقط الوزن ہے۔ان نشان زد کیے گئے مصرعوں میں کتابت کی غلطی بھی ہوسکتی ہے لیکن بظاہر تو ایسا معلوم نہیں ہوتا۔البتہ آخری رباعی کے چوتھے مصرعے میں سہوِ قلم کا امکان ہے۔ہوسکتا ہے کہ اس مصرعے میں 'فکرِ سخن' کی جگہ 'فکرِ شعر' لکھ دیا گیا ہو۔کیوں کہ 'فکرِ شعر' کی جگہ 'فکرِ سخن' رکھ دیا جائے تو مصرع باوزن ہوجائے گا۔

ہر قلم کار کی یہ شدید خواہش ہوتی ہے کہ اس کے فکر وفن کا مختلف زاویوں سے تجزیہ کیا جائے اور اس کو سراہا جائے۔کسی قلم کار کی تخلیقات پر اس کے حینِ حیات میں بھی اور اس کی موت کے بعد بھی تنقید وتبصرے اور ان کی تشریح وتوضیح کی پوری پوری گنجائش ہوتی ہے۔تنقید وتبصرہ ہو کہ تشریح وتوضیح یہ تمام چیزیں اس کے فکر وفن کو سمجھنے اور سمجھانے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔قلم کار کی حینِ حیات میں اس کے فکر وفن کے بارے میں جو بھی لکھا جاتا ہے اسے وہ پڑھتا ہے۔اس لکھے پر یا تو وہ خوش ہوتا ہے یا ناراض، یا پھر مطمئن ہوتا ہے یا غیر مطمئن۔بہر حال قلم کار چاہتا ہے کہ اس پر لکھا جائے۔مظفر حنفی نے ایک رباعی میں یہ کہا ہے کہ میرے بعد نہ جانے مجھ پر کیا کیا لکھا جائے گا مگر افسوس ہے کہ میں ان تمام تحریروں سے محروم رہ جاؤں گا۔یہ اپنے آپ میں ایک نادر خیال ہے۔ملاحظہ کریں۔

ہر چند کہ فن کار کہا جاتا ہوں　　میں وقت کے دریا میں بہا جاتا ہوں
کیا کیا نہ لکھا جائے گا میرے پیچھے　　افسوس کہ محروم رہا جاتا ہوں

یہ بات تو ایسے ہی ہوئی جیسے غالب نے اپنے ذوقِ دشت نوردی کہ بارے میں کہا ہے:

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے، اندر کفن کے پاؤں

○○○

محمد خوشتر
ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد، رابطہ: 8341116397

مظفر حنفی اور ان کی رباعی گوئی

پروفیسر مظفر حنفی نے شاعری کی دنیا میں نہ صرف غزلیں رقم کی ہیں اور نہ ہی صرف نظمیں ہی تحریر کی ہیں بلکہ کچھ ترانے لکھے ہیں تو کئی مرثیے بھی ان کے نوک قلم سے تحریر ہوئے ہیں۔اسی طرح انھوں نے رباعی کی صنف میں بھی اپنے آپ کو ثابت کیا ہے اور انھوں نے درجنوں رباعی بھی قلم بند کی ہیں۔جیسا کہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ رباعی میں تو صرف اور صرف چار مصرعے ہوتے ہیں اور یہ لفظ رباعی ہی اس بات کے لیے کافی ہے۔اصل میں رباعی عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی چار کے ہوتے ہیں۔مثال کے لیے ایک رباعی کو رقم کرتے ہیں اور اسی سے مظفر حنفی کی رباعی پر دسترس کو بھی دیکھتے ہیں۔

مرنا ہے تو بے موت نہ مرنا بابا　　دم سادھ کے اس پل سے گزرنا بابا
سنتے ہیں کہ ہے موت سفر کا وقفہ　　اس پار ذرا بچ کے اترنا بابا

مظفر حنفی نے زیادہ رباعی نہیں لکھی ہے، مگر جتنی لکھی اسے کم بھی نہیں کہا جاسکتا۔ان کی شاعری کے دونوں مجموعوں یعنی کہ کلیات 'کمان' اور کلیات 'تیزاب میں تیرتے پھول' کا جب ہم بنظر غائر مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کے قطعات یا رباعی کی تعداد سو کے قریب ہے۔اس میں بھی انھوں نے موضوعات میں جدت اختیار کی ہے۔اس میں جہاں انھوں نے اپنا ذاتی تجربہ بیان کیا ہے وہیں ان کے دل کی دھڑکن کو بھی رباعی میں محسوس کر سکتے ہیں۔ظاہر سی بات ہے کہ رباعی میں طویل بات کو صرف چار مصرعوں میں ہی باندھا جاتا ہے اور آخری مصرعہ تینوں مصرعوں سے زوردار ہوتا ہے اور ان کا ماحصل بھی۔ایک رباعی نے تو میرے کم زور دل پر کچوکا لگایا۔آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

بھوکا تھا مگر چھوڑ دیا روٹی کو　　کس ڈھنگ سے سمجھاؤں میں اپنے جی کو
غلے کے تقاضے پر الجھ کر آخر　　ہمسائے نے پھر پیٹ دیا بیوی کو

رباعی اردو کے تقریباً تمام بڑے شعرا نے رقم کی ہیں مگر زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت اور فنی

ریاضت کے بعد ہی اس صنف سے کما حقہ انصاف کیا جا سکے گا۔ چوں کہ صرف چار مصرعے میں بات کو مکمل کی جاتی ہے اور پھر یہ کہ اس کے لیے مخصوص بحر بھی درکار ہوتی ہے اور سب سے اہم بات رباعی کے لیے ضروری ہے کہ چوتھے مصرعے میں پیش کیے گئے مضمون کو ارتقائی شکل دیتے ہوئے نقطۂ عروج پر پہنچانا ہوتا ہے جو کوئی آسان کام نہیں۔ میرؔ تقی میرؔ سے لے کر سوداؔ اور انیسؔ و جوشؔ سبھی نے رباعی کہی اور اسی رباعی گو شعرا کی صف میں ہم مظفر حنفی کا نام بھی شمار کر سکتے ہیں۔

ہاتھوں میں لیے تیغ و سناں بیٹھا ہے   ہمزاد نہیں، دشمن جاں بیٹھا ہے
جس جا بھی متاع فکر لے کر بیٹھوں   لگتا ہے کوئی اور وہاں بیٹھا ہے

ایک سچا، پکا، سلجھا ہوا اور عمدہ ادیب و قلم کار وہی ہوتا ہے جو کہ معاشرے سے گہرا ربط و تعلق رکھتا ہو، اور اپنے معاشرے میں ظہور پذیر ہر چھوٹے اور بڑے واقعات و سانحات کو کاغذ اور قلم کے ذریعے صفحۂ قرطاس پر رقم کرتا ہو۔ کائنات میں گھٹت گھٹنا کا مطالعہ شاعر و ادیب کے لیے ناگزیر ہے۔ مظفر حنفی معاشرے کی دکھتی رگ پر جہاں ہاتھ رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں، وہیں انھوں نے ناانصافی پر کھل کر لکھا ہے تو اسی کے ساتھ معاشی تنگدستی، غریبی، مفلسی، بے روزگاری، غربت و افلاس، فقیری، سیاسی بے راہ روی کو بھی رباعی میں جگہ دی ہے۔ مالداری پر اگر طنز کیا ہے تو اونچے اونچے محلوں کو بھی نشانہ بنایا ہے۔ ذرا اس رباعی کے طنز کو دیکھتے چلیں۔

اونچے محلوں میں بیٹھا ڈر میرا ہے   پتھر تکیہ مٹی بستر میرا ہے
ڈیرا ہے دنیا بھر کے آسیبوں کا   میں سمجھا تھا بے چارہ گھر میرا ہے

مظفر حنفی کی رباعیات کے تعلق سے علقمہ شبلی کلکتوی کا ایک مضمون ہے جسے مژگاں نے مظفر حنفی نمبر میں جگہ دی ہے تو یہی مضمون سہ ماہی روشنائی کراچی پاکستان کے خصوصی شمارہ میں بھی شامل ہے۔ انھوں نے ان کی رباعیات سے متعلق چند صفحات کو رنگین کیا ہے۔ ذرا انھوں نے ان کی رباعیات کے متعلق کن کن خصوصیات پر قلم چلایا ہے اسے جاننے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ہم مظفر حنفی اور رباعی کے حوالے سے ان کی خدمات کو بھی جان سکیں۔ تقریباً چار صفحے کے مضمون میں علقمہ شبلی نے ان کی کل ۱۲ رباعیوں کو شامل کیا ہے۔ انھوں نے ان کی رباعی سے متعلق بڑی خوب صورت باتیں رقم کی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

''محرومی و مایوسی انسان کا مقدر ہے۔ وہ اس کائنات کا ایک اہم حصہ ہونے کے باوجود ایک حقیر ذرے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ سائنسی ترقیوں اور مادی آسائشوں کے باوجود تشنگی کا ایک احساس ہے جو دل کو بے قرار اور روح کو بے چین رکھتا ہے۔ مظفر حنفی اس بے چینی اور بے قراری کو اپنی ذات کے نہاں خانوں میں جذب کر کے شعور و وجدان کی مخصوص کیفیات کے ذریعے ایسی رباعیوں میں پیش کرتے ہیں جو عرفان ذات کے بغیر ممکن نہیں۔

مرمر کے فنا کا غار پاٹو یارو!   سانسوں کی یہ زنجیر بھی کاٹو یارو!
اس سے پہلے کہ روح گھٹ کر مر جائے   چاٹو، دیوارِ جسم چاٹو یارو!''

(مظفر حنفی: فن اور فن کار، مژگاں، ص ۱۸۳)

مظفر حنفی نے ۱۹۵۳ء سے غزلوں کی دنیا میں قدم رکھا اور گاہے بہ گاہے نظمیں اور رباعی بھی قلم بند کرتے رہے مگر ایسا نہیں ہے کہ رباعی پر توجہ اور وقت صرف نہ کیا ہو اور ایسا بھی نہیں ہے کہ رباعی میں موضوع کی جدت نہیں ہے اور ایسا بھی نہیں ہے کہ رباعی میں طنز کے نشتر نہ چلائے ہوں۔ ذرا انہی باتوں کو ہم علقمہ شبلی کے مضمون سے دیکھتے ہیں:

''مظفر حنفی کی رباعیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ وہ اس پل صراط سے سلامتی کے ساتھ گزرے ہیں اور ان کی رباعیوں میں اس فن کی امتیازی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مظفر حنفی ایک سچے تخلیقی فن کار ہیں اس لیے جس طرح موضوع کا تنوع، بول چال کی زبان کا کھردرا پن، بے باک لہجہ اور طنزیہ کاٹ ان کی غزلوں کی خصوصیات ہیں اسی طرح یہ ان کی رباعیوں کو بھی جاندار اور پرکشش بناتی ہیں اور ہم ایک حیرت انگیز اور خوش گوار جمالیاتی تجربے سے دوچار ہوتے ہیں۔ طنز مظفر کی شاعری کا نمایاں وصف ہے۔ انھیں زندگی کی ناہمواریوں، گرد و پیش کی کھردری حقیقتوں اور معاشی کجیوں اور خامیوں کا گہرا احساس ہے۔ وہ طنزیہ پیرایۂ بیان میں ان کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ شدت مشاہدہ اور نفاست طبع نے اسے تلوار کی دھار بنا دیا ہے جس کا نشانہ دوسرے نہیں خود شاعر بھی ہے۔

ہر چند کہ فن کار کہا جاتا ہوں   میں وقت کے دریا میں بہا جاتا ہوں
کیا کیا نہ لکھا جائے گا میرے پیچھے   افسوس کہ محروم رہا جاتا ہوں''

(مظفر حنفی: فن اور فن کار، مژگاں، ص ۱۸۲)

مظفر حنفی کی رباعی میں بھی شاعری کی طرح ہی موسم کی باتیں کی گئی ہیں اور اسی کے ساتھ ہی شاعر کے اردگرد کے ماحول کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ شاعر و ادیب ایک حساس دل رکھتا ہے تو ظاہر سی بات ہے کہ وہ دھڑکتے ہوئے دل سے اس کے سامنے جو گزری ہوگی اسے موزوں کر کے خوب صورت الفاظ کا جامہ پہنا کر ایک نیا کارنامہ انجام دینے کی بہترین سعی کرتا ہے۔ پروفیسر صاحب ادیب و شاعر کی دنیا سے ماورا نہیں ہیں۔ انھوں نے بھی ان روایات کو برقرار رکھا۔ ان کی رباعیات میں بھی اس طرح کے نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے بھی ایسا ہی کیا ہے:

''آج افق دنیا پر جنگ و فساد کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ نسل و رنگ کا خوف ناک کھیل شباب

پر ہے۔قدم قدم پر انسانی عظمت کو پامال کیا جارہا ہے۔دنیا کی ایک بڑی آبادی غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزار رہی ہے اور ہمارا یہ حال ہے کہ سائنسی اور مادی ترقی کی دوڑ میں چاند تاروں پر کمندیں ڈال رہے ہیں۔ہماری نگاہیں اپنے گردوپیش کی بستیوں کو نہ دیکھ کر آسمان کی بلندیوں کو چھو رہی ہیں۔اس صورت حال کو کس سادہ اور پر اثر انداز میں شاعر نے اپنی رباعی میں پیش کیا ہے۔

موسم کے تقاضے پہ ذرا سوچو نا   انجام ہے مطلع کا مقدر ہونا
کھانے کی کوئی چیز اگا لو پہلے   پھر شوق سے کھیتوں میں ستارے بونا
......
تریاق نہ لا مار گزیدہ ہی نہیں   مرہم نہ لگا زخم رسیدہ ہی نہیں
عرفان کی اس دھوپ میں جلتا ہے یہ دور   جس میں کوئی دیوار عقیدہ ہی نہیں''

(روشنائی، کراچی، ص ۲۲۶-۲۲۷)

پروفیسر مظفر حنفی کی تمام رباعیوں کو پڑھا ان کی رباعیاں ان کے شعری مجموعے میں محفوظ کردی گئی ہیں مجھے ان کی یہ چند رباعی پسند آئی سوچا کہ آپ سے بھی شیئر کردیا جائے، تاکہ آپ بھی ان کی رباعی سے محظوظ ہوسکیں اور ساتھ ہی ان کی رباعی کی خدمات کو اپنے ماتھے کی آنکھوں سے مشاہدہ بھی کرسکیں۔

ثانی تھے نہ دارا و سکندر میرے   ہوتی یہ زمیں اور سمندر میرے
افسوس کہ یلغار کو جب اٹھتا ہوں   ہنستا ہے کوئی جسم کے اندر میرے
دیکھا کہ ہر اک شخص لہو میں تر تھا   اور بحر شجاعت مرا کف آور تھا
پھر آنکھ کھلی ، چونک پڑا یا حیرت   خود اپنی ہی گردن پہ مرا خنجر تھا

اور اس رباعی کو بھی ملاحظہ فرمائیں۔

شعلہ ہے اسے چوم رہا ہوں پھر بھی   خالی ہے سبو ، جھوم رہا ہوں پھر بھی
وہ مجھ سے گریزاں ہے ہوا کی مانند   پنکھے کی طرح گھوم رہا ہوں پھر بھی

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ پروفیسر مظفر حنفی نے رباعی جیسی مشکل صنف میں بھی کامیاب طبع آزمائی کی ہے اور اس میں کسی بھی طرح کا جھول نہیں دکھتا ہے، بلکہ رباعی گوئی میں بھی اپنی پہچان الگ بنائی اور ہمیں ان کی شاعری، غزلیات اور نظموں کی طرح ہی ان کی رباعی کو کامیاب ہوتے ہوئے دیکھنا نصیب ہوا۔ظاہر سی بات ہے کہ انھوں نے جو بھی لکھا بڑے ہی ذوق وشوق کے ساتھ لکھا اور اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے تند وتیز اور طنز والی کاٹ بھی ان کی رباعی میں دیکھنے کو ملتی ہے۔الفاظ کو بھی سلیقے سے استعمال کرتے ہیں۔شاعری کی بات چلے اور دل کی باتیں نہ ہو کیا یہ ممکن ہے۔انھوں نے اپنے

ذاتی تجربے کو اس طرح سے بیان کیا کہ ہر کسی کا دل اسے اپنے دل کی دھڑکن اور اپنے اوپر بیتا ہوا سمجھتا ہے۔اپنے اوپر بیتا ہوا اور اپنے اردگرد اور ماحول سے اخذ کر کے خوب صورتی کے ساتھ شعر کہنے کا ہنر انھیں خوب آتا ہے اسی لیے وہ رباعی میں بھی کامیاب ہیں اور رباعی گو شعرا کی چنندہ فہرست میں بھی اپنی جگہ بنانے اور بچانے میں کامیاب ہیں۔

مظفر حنفی نے غزلیں بھی لکھیں، نظمیں بھی تحریر کیں تو رباعیات اور مرثیے بھی قلم بند کیے اور ترانے بھی رقم کیے ہیں۔ان سب کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ حنفی الفاظ ومعنی کا توازن قائم رکھنے، ایجاز و اختصار سے بات کہنے، محاورے اور لفظی رعایتوں کا اہتمام کرنے اور اجزائے کلام کی اصلی ترتیب کو قائم رکھنے میں ماہر ہیں۔چنانچہ ان کی غزل کیا فکر، کیا جذبہ، کیا زبان، کیا بیان، ہر پہلو سے بلند ہے اور آج بھی وہ غزل کی دنیا میں اعلیٰ وارفع مقام رکھتے ہیں۔

بری نہیں ہے مظفر کوئی بھی صنف ادب   قلم غزل کے اثر میں رہے تو اچھا ہے

مظفر حنفی کا قلم بیک وقت بچوں کے دنیا پر چھایا رہا تو وہیں جوانوں کی پسندیدہ صنف شاعری اور خصوصیت کے ساتھ غزل پر بھی چلتا رہا۔کہانی کی دنیا میں وارد ہوئے تو تین افسانوی مجموعہ لکھ کر اور چھاپ کر ہی دم لیا۔ترجمہ کی حیثیت سے قدم بڑھایا تو اس میں بھی نام کمایا اور جب صحافت میں کودے تو کھنڈوہ جیسی اردو کے لیے بنجر زمین کو قابل کاشت بنا کر قابل رشک بھی بنا دیا۔تنقید کے میدان میں پیر بڑھایا تو اچھے اچھوں کے پیر کھسک گئے اور جب تحقیق کی وادی میں آئے تو اپنی نپی تلی اور خالص تحقیق کے لیے بھی جانے گئے.....مگر ان سب کے باوجود عشق تو غزل سے ہی رہا اور ایک نہیں کئی موقع سے ارشاد فرمایا تھا کہ میری پسندیدہ صنف سخن تو غزل ہی ہے اور جب بھی بیٹھا شعر ہو گئے۔

اردو ادب میں چند چنندہ نام ایسے ہیں کہ وہ اردو زبان وادب پر تحریر کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح سے اپنے قلمی جواہر سے اردو ادب کی خدمت میں لگے رہتے ہیں اردو ادب کی مختلف النوع طریقے سے خدمت کرنے میں ایک سنہرا نام فاروق ارگلی کا بھی ہے انھوں نے مضامین لکھے، کتابیں رقم کیں، کتابوں کو ترتیب بھی دیا تو وہیں شاعری بھی کی ہے۔اردو اخبارات اور میگزین میں چھائے رہتے ہیں اور ان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کے علاوہ ان کی شاعری میں سے غزلیات، نظمیں اور قطعات بھی اخبارات ورسائل اور جرائد میں شامل ہوتی ہیں۔اردو ادب کی بے لوث خدمت کرنے والوں کی خوب صورت، خوش نصیبوں کی فہرست میں ایک بڑا نام اور اہم ہے ان کا نام یعنی کہ فاروق ارگلی ہیں، وہ مظفر حنفی کی شاعری پر یوں رقم کرتے ہیں:

''دو ہزار سے زائد غزلوں کے ساتھ ساتھ دیگر اصناف سخن میں پورے فنی وفکری اجتہاد، جدت طرازی، غیر معمولی قوت مشاہدہ، انفرادی اسلوب اور شعری اقدار وروایات کی پاسداری کے

ساتھ طبع آزمائی دنیائے اردو سخن کے شناسوں کی نظر میں کھری اور یجنل تخلیقی شاعر کا درجہ پہلے ہی حاصل کر چکی ہے۔ اپنے حسن بیان، لفظیات، رفعت فکر و نگاہ، فنی اجتہا اور غزل کی نرم و نازک پنکھڑیوں میں ہیرے کے جگر کو کاٹ دینے والی تیز دھار پیدا کرنے والے مظفر حنفی کا کلام سنتے اور پڑھتے ہوئے یہ خیال اکثر سر اٹھانے لگتا ہے کہ مظفر حنفی کی تعلیمی، تنقیدی اور تخلیقی کامرانیوں اور شہرتوں نے ان کی شاعرانہ عظمتوں کو نقصان پہنچایا ہے لیکن ان کی شاعری کا کوئی بھی باشعور سامع یا قاری یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ مظفر حنفی کی شاعری کا اثر مرور وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جائے گا اور ایک دن وہ پورے عصری اردو ادب کو اپنے حصار میں لے لے گا۔ یہ اور بات ہے کہ ابھی شاعر مظفر حنفی کی پرت در پرت جہتوں کی دریافت اور شناخت کا کام ہونا باقی ہے۔'' (مظفر حنفی: شخصیت اور فن، مضمون نگار: فاروق ارگلی، ص ۹۷)

الغرض مظفر حنفی اردو ادب کی دنیا میں اپنے ادبی کام سے ادیبوں کے درمیان مشہور و معروف ہیں تو مشاعروں اور رسائل و جرائد اور اخبارات میں بکثرت چھپنے کی وجہ سے عوام میں بھی۔ بیک وقت آپ نثر و نظم میں یکساں مقبول ہیں۔ انھوں نے شاعری کی دنیا میں دو کلیات 'کمان' اور 'تیزاب میں تیرتے پھول' قارئین کی خدمت میں پیش کیا ہے دراصل ان دونوں کلیات میں گزشتہ جتنے شاعری کے مجموعے شائع ہوئے اب ان کو یکجا اور اکٹھا کر کے 'کمان' اور 'تیزاب میں تیرتے پھول' میں شامل کر دیا گیا ہے۔ مزید برآں ان کے لکھنے پڑھنے اور تخلیق سے لگاؤ کے ساتھ اب بھی شاعری کے لکھنے کا سلسلہ سرعت کے ساتھ ان کی وفات سے چند ماہ قبل تک جاری رہا۔ اسی طرح اپنی شاعری کے موضوعاتی اشعار کو بھی حروف تہجی کے اعتبار سے اکٹھا کر کے ایک دیوان بنام 'ہیرے ایک ڈال کے' لکھ مارا ہے اس مجموعہ میں کل ان کی غزلوں سے منتخب شدہ ۲۵۰۰ موضوعاتی اشعار ہیں۔ اسی طرح سے کھیل کھیل میں نظم و شاعری کے ذریعے بچوں کے قریب آنے کی کوشش کی ہے ویسے کتاب کا نام ہی بہت کچھ کہہ رہا ہے یعنی کہ کھیل کھیل میں، بچوں کو سکھانے کی عمدہ کوشش کی ہے اور وہ بھی آسان شاعری میں اس میں وعظ و نصیحت، ملک سے محبت، تعلیم سے لگاؤ، مستقبل کی فکر، ماں باپ کی خدمت کا جذبہ، استاد کا ادب، بڑوں کی عزت اور خوب موج اور مستی کا درس بھی دیا ہے، واضح ہو کہ یہ سبھی بالکل کھیل کے انداز میں۔ من جملہ ایں کہ اس طرح سے پروفیسر مظفر حنفی کی شاعری کی خصوصیات ان کی شاعری کی انفرادیت نیز تیز، تند، تیکھا پن اور طنز جیسی خصوصیات ان کی شاعری میں ملتی ہے۔

○○○

تحقیق و تنقید

مناظر عاشق ہرگانوی
بھاگلپور

مظفر حنفی کی تنقیدی جہتیں

مظفر حنفی کے قلم کی کئی جہتیں ہیں۔ وہ شاعر ہیں، تنقید نگار ہیں، افسانہ نویس ہیں اور مترجم ہیں۔ انھوں نے ترتیب و تدوین کا بھی کام کیا ہے اور تقریباً ڈیڑھ درجن کتابیں اردو کو دی ہیں۔ سفر نامہ بھی لکھا ہے اور ادبِ اطفال پر بھی ان کی کتابیں ہیں۔ شادؔ عارفی، محمد حسین آزاد، حسرتؔ موہانی اور میرؔ پر ان کی مستقل کتابیں ہیں۔ تنقیدی مضامین کے مجموعے الگ ہیں۔

مظفر حنفی کسی فن پارے کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں تو ذہن سے جملہ ذاتی اور نظریاتی تعصّبات کو خارج کر کے اس بات کو ملحوظ رکھتے ہیں کہ تنقید اگر فن پارے کی جمالیاتی چکاچوند میں اضافے کا موجب نہیں بن پاتی تو اس کا کوئی جواز موجود نہیں۔ اس طرح اپنے مطالعہ میں اولین حیثیت فن پارے کو دیتے ہیں اور اس کے اندر چھپے ہوئے امکانات کی روشنی میں اپنی تنقیدی حس کو بروئے کار لاتے ہیں نہ کہ اپنے نظریات یا تاثرات کا عکس فن پارے میں تلاش کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

کسی بھی نقاد کے لیے سخن فہم ہونا ضروری ہے۔ اس کے لیے اس روح تک پہنچنا ضروری ہے جو شاعری سے مختص ہے۔ وسیع ہمدردی کی، لچکدار ذہن کی اور اس ہمہ گیر طبیعت کی موجودگی ضروری ہے جو شاعر کی فضا میں، شاعر کے ساتھ بلکہ کبھی اس سے بھی آگے پرواز کر سکے۔ مظفر حنفی پہلے شاعر ہیں تب نقاد ہیں۔ اس لحاظ سے ان کا ذوقِ سلیم، ان کی بصیرت، ان کا شعورِ انتقاد، ان کا مطالعہ اور مشاہدہ حال کے آئینے میں فردا کا چہرہ دیکھ کر کسی تصنیف کی قدر و قیمت کے متعلق فیصلہ صادر کرتے ہیں۔

مظفر حنفی ادب کے بہترین اور پائیدار حصے کی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں اور انھیں تمدن کا جزو بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اجالے کو اندھیرے سے الگ کرتے ہیں۔ رنگ و بو اور کیف و کم کے غیر متعین دائرہ میں صرف قدم ہی نہیں رکھتے بلکہ ابہام میں توضیح کا جلوہ اور بے تعینی میں تعین کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ ان کی نظر تاریخ پر بھی ہے۔ بہادر شاہ ظفرؔ کے حوالے سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کے تمام نوابوں اور راجگان کو مختلف طریقوں سے اپنا مطیع بنالیا جن کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ کمپنی نے اپنے نوے سالہ دورِ اقتدار میں ہندوستان کے خواص و عوام، امیر و غریب، سرمایہ دار اور کسان اور سبھی مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ جس طرح ظلم و جبر کو روا رکھا اور ہر میدان میں ہندوستانیوں کا جس طرح استحصال کیا وہ ایک بہت طویل داستان ہے۔ مختصراً یہ کہ مختلف عوامل نے رفتہ رفتہ ہندوستانیوں کو انگریزوں سے اتنا متنفر کر دیا کہ نفرت کا یہ لاوا مئی ۱۸۵۷ء میں ابل پڑا اور میرٹھ کے فوجیوں کی بغاوت نے آگ کی طرح آناً فاناً پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دہلی کے تخت پر اس وقت برائے نام ہی سہی آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفرؔ متمکن تھے اور کمپنی سے ملنے والے معمولی وظیفے پر لال قلعہ میں اپنے لواحقین اور درباریوں کے ساتھ بادشاہت کا بھرم بنائے رکھنے کی ناکام کوشش کرتے تھے۔ مورخین کا خیال ہے کہ بیاسی سال کا یہ ضعیف العمر صوفی منش بادشاہ مغل سلاطین میں سب سے زیادہ شریف اور خوش خصال حکمراں تھا۔ اکبر شاہ ثانی کا یہ بیٹا ایک ہندو رانی لال بائی کے بطن سے تھا اور ایک نیک، پرہیزگار اور غیر متعصب انسان تھا۔'' (دو گز زمین ظفر کے لیے)

۱۸۹۱ء میں شائع شدہ ممتاز علی حافظ کی کتاب 'تذکرۂ آثار الشعرا' پر مظفر حنفی نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ۲۸۰ صفحے کی اس کتاب پر ان کی تنقید ملاحظہ کیجیے:

''جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، مذکورہ نسخے کے ابتدائی دس صفحات غائب ہیں۔ لیکن خوش قسمتی سے اس کتاب کی فہرست مضامین آخر میں ترتیب دی گئی ہے۔ اس سے بہ آسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ ضائع ہونے والے صفحات میں کیا تھا۔ فہرست کے مطابق ان دس صفحات میں 'حمد باری تعالیٰ عزّ اسمہٗ'، 'نعتِ رسولِ خدا'، 'سبب تالیف تذکرہ'، 'مقدمہ شعر و ایجادِ شاعری'، 'بیانِ شعرائے عرب' اور 'بیان شعرائے یونان' شامل تھے۔ موخر الذکر بیان کا بیشتر حصہ جو صفحہ ۱۱ تا ۱۴ پھیلا ہوا ہے، محفوظ ہے۔ بعد ازاں صفحہ بیس کے نصف تک 'بیان شعرائے یورپ'، 'بیانِ شعرائے فارسی'، 'بیان شعرائے ہند' اور 'بیان شعرائے اردو' جیسے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ یہ مختصر مختصر سے ادبی جائزے بڑے تشنہ، سرسری اور بعض مقامات پر ناقص ہیں۔ شعرائے اردو کے بیان میں عہد ولی سے لے کر مولف کے دور تک نمائندہ اور مشہور شعرا کی فہرست ترتیب دینے کی کوشش کی گئی ہے جس میں مومنؔ اور شیفتہ وغیرہ کے نام تو شامل ہیں لیکن غالبؔ کو برادری سے باہر رکھا گیا ہے جب کہ مولف کے ہم عصر سخن گویوں میں غالبؔ کے کئی

تلامذہ بھوپال ہی میں موجود تھے۔'' (تذکرہ آثار الشعرا)

انیسویں صدی کے اس تذکرہ کا مفصل جائزہ لینے کے بعد مظفر حنفی مجموعی رائے قائم کرتے ہوئے تنقیدی بصیرت کا ثبوت اس طرح دیتے ہیں:

> ''یہ تذکرہ 'گلستانِ سخن (قادر بخش صابر اور امام بخش صہبائی)' جس میں ایک خاص عہد کے دہلوی شعرا کے حالات اور نمونۂ کلام یکجا کر دیے گئے ہیں، کی قبیل سے ہے اور اواخر انیسویں صدی تک کے ان شاعروں سے متعلق ہے جو بھوپالی تھے یا ریاست بھوپال سے کسی نہج سے متعلق تھے۔ تذکرے میں شعرا کے حالات اور نمونۂ کلام وغیرہ پیش کرنے میں کوئی اصول مدنظر نہیں رکھا گیا ہے، چنانچہ بڑی ناہمواری کا احساس ہوتا ہے۔ ان شاعروں کے حالات اور نمونۂ کلام پیش کرنے میں بڑی دریا دلی اور تفصیل سے کام لیا گیا ہے جن کا کسی طرح مولف سے تعلق تھا۔ بقیہ لوگوں کا ذکر سرسری انداز میں کر دیا گیا ہے۔ مولف میں تنقیدی بصیرت کی بھی کمی نظر آتی ہے۔'' (تذکرہ آثار الشعرا)

لفظ، جملے کی ساخت اور گرمیٔ اظہار کے لیے زبان کی ترسیل وغیرہ پر مظفر حنفی نے فکر انگیز نظر ڈالی ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں زبان لفظوں کی ترتیب سے تشکیل پاتی ہے اور احساسات، جذبات اور تصورات کی صورت گری کے لیے ذریعہ بنتی ہے۔ استعاراتی، تاثراتی اور جذباتی استعمال الفاظ کے قرینہ سے ہی ممکن ہے۔ مظفر حنفی کا کہنا ہے کہ شاعری میں الفاظ کے تخلیقی اور غیر یقینی استعمال سے ان کے معانی میں کئی سطحیں پیدا ہوتی ہیں اور ایسا ابہام تخلیق پاتا ہے جس کی نوعیت یکسر طلسمی ہوتی ہے۔ غزل میں الفاظ کے انتخاب اور تخلیقی صلاحیت کی بابت وہ آتش تک پہنچتے ہیں اور لفظوں کے نگینے مرصع ساز کی طرح شعر میں جڑنے، چولیں بٹھا کر ترکیبوں کی شکل دینے اور تراش خراش کر گوہر آبدار بنانے کی بات کہتے ہیں اور اپنی رائے پیش کرتے ہیں:

> ''غزل گو انتہائی سبک، شیریں، لطیف، نرم اور نازک الفاظ ویسی متانت اور شائستگی کے ساتھ برتنے پر مجبور ہوتا ہے جیسی کہ خواتین کے ساتھ گفتگو کے دوران مہذب مرد استعمال کرتے ہیں۔ چوں کہ غزل عام طور پر داخلی کیفیات اور واردات قلب کی ترجمانی کے لیے وقف رہی ہے اور یہ داخلی کیفیات بھی زیادہ تر حسن و عشق کے معاملات سے متعلق ہوتی تھیں اس لیے موضوع کی عبارت بھی نرم و ملائم لفظیات کا تقاضہ کرتی تھی چنانچہ قصیدے، مرثیے، مثنوی، رباعی اور دوسری اصناف سخن کے مقابلے میں غزل کی زبان کے لیے صفائی، رچاؤ، سلاست، شیرینی اور ملائمت کی زیادہ کڑی شرطیں عائد کی گئیں اور غزل کے مخصوص مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے نرم و سبک الفاظ کے ساتھ ساتھ لہجے کی اس شائستگی پر بھی زور دیا گیا جس پر ضرورت سے زیادہ اصرار نے آگے چل کر انفعالیت کی شکل اختیار کی۔'' (غزل کی زبان)

اردو کہانی پر بات کرتے ہوئے مظفر حنفی تیکھا لہجہ اختیار کرتے ہیں اور ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کی دہائی میں لکھی جانے والی کہانیوں میں ذہنی رابطے کے ٹوٹنے کی بات انھوں نے کہی ہے۔ اس سے قبل کی کہانیوں میں مظفر حنفی سیاسی اور سماجی حالات، عوامی تہذیب، طرز بود و باش، عقائد و نظریات، انسان کے چھوٹے اور بڑے دکھ، باطنی اور ذہنی کیفیات، خارجی ماحول، فرد اور معاشرے کا تصادم، فطرت اور مشین کی کشمکش، گھریلو مسائل، جذبات حسن و عشق، فسادات، ہجرت، بدلتے ہوئے ماحول کی پیچیدگیاں، طبقاتی کشمکش، نئے سماج کی تشکیل، سیاسی استحصال، معاشرے میں فرد کی بے وقعتی، جاگیردارانہ نظام کی شکست و ریخت، سرمایہ داری کا ہولناک شکنجہ، جنسی اور نفسیاتی گتھیاں اور ایسے ہی ان گنت موضوعات پر انوکھے اور مناسب زاویے سے روشنی ڈالتے ہیں۔ علامتی اور تجریدی رنگ پر بات کرتے ہوئے اظہار کی پیچیدگی کی نشاندہی کرتے ہیں اور صوتی و صوری کیفیت کا بھی ذکر کرتے ہیں:

> ''جدیدیت کے بطن سے جنم لینے والے بیشتر افسانہ نگاروں میں جو خامیاں نظر آتی ہیں ان کا سرچشمہ یہ ہے کہ انھوں نے نثر میں شاعری کے حربے استعمال کیے اور شعوری طور پر جدید افسانہ لکھنے کی کوشش کرتے رہے جس کے نتیجے میں ان کے یہاں یکسانیت، سپاٹ پن اور تاریک سرنگ میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ جدیدیت کا تاریک ترین پہلو یہ ہے کہ ساتویں دہائی میں وہ کوئی خالصتاً جدید بڑا افسانہ نگار نہیں پیدا کر سکی۔'' (اردو کہانی: آج اور کل)

حالاں کہ ۱۹۶۰ء کے آس پاس جب جدیدیت کا رجحان اردو میں آیا تو مظفر حنفی نے اسے کشادہ قلبی سے لبیک کہا کیوں کہ ان کی نظر میں اس کا مثبت اثر غزل نے قبول کیا اور جدید علامتوں، استعاروں اور حسی پیکروں سے اس نے رنگ روپ خوب نکھارا۔ نظم میں بھی تجریدیت اور علامت پسندی نے اچھے اثرات مرتسم کیے۔ لیکن افسانہ میں منفی پہلو سامنے آیا۔ ابہام شعر میں تو پہلو داری، حسن اور وسعت پیدا کرتا ہے لیکن نثر میں وضاحت، افہام و تفہیم اور ابلاغ ضروری ہے۔ مظفر حنفی کی تنقید کی کسوٹی پر ساتویں دہائی کے افسانہ نگاروں کی اہمیت تاریخی زیادہ اور ادبی کم ہے۔ ایسے افسانہ نگاروں کو ایک عبوری دور کے تجرباتی کہانی کاروں سے زیادہ حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ ۱۹۷۰ء کے بعد اور ۱۹۸۰ء کے بعد کے کہانی کاروں سے متعلق مظفر حنفی کا کہنا ہے:

> ''اپنے پیش روؤں کے برعکس جدید ترین کہانی کاروں نے وحدتِ تاثر کی اہمیت کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ اسے اپنی کہانیوں میں کامیابی کے ساتھ برتا بھی ہے۔ اس نسل نے اپنی کہانی کو شعوری طور پر زیادہ سے زیادہ مبہم، غیر واضح اور پُراسرار بنانے کی کوشش نہیں کی جس کا ایک سبب غالباً یہ بھی ہے کہ اس کے سامنے افسانے کی ویسی پائیدار اور مستحکم روایت نہیں تھی جیسی کہ

ساتویں دہائی کے کہانی کاروں کے سامنے تھی، اور جس سے شعوری انحراف کر کے اپنی انفرادیت کو اجاگر کرنے کی کوشش میں ان کے افسانوں سے افسانویت جاتی رہی تھی اور روایت سے انحراف کی یہ لے اس حد تک بڑھی تھی کہ ہیئت اور تکنیک کے تجربات نے پڑھنے والوں سے ترسیل کا ناتا ہی توڑ لیا تھا۔ جدید ترین نسل نے اپنے پیش رو کہانی کاروں کے تجربات سے تخلیق کے بنجر علاقوں کی نشاندہی میں امداد حاصل کی ہے اور نئی کہانی کا رخ زرخیز میدانوں کی طرف موڑ دیا ہے۔'' (اردو کہانی: آج اور کل)

قرۃ العین حیدر کی افسانہ نویسی اور ناول نگاری پر مظفر حنفی نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اور ان کی تخلیقی کائنات اور تکنیک کی جہتوں پر، عمق، وسعت اور ہمہ گیری پر، عبارت کی دل کشی پر، تاریخ کے خلاقانہ شعور پر اور پُرتصنع تہذیب نو کے منظر نامے پر ان کے کارنامے کو اجاگر کیا ہے:

''عینی کے افسانوں میں سے بیشتر کے مرکزی کردار زمانے کی بے اعتباری، فریب خوردگی، شکست آرزو اور ہزیمت کے نمائندہ ہیں۔ 'جلاوطن' کی کنول رانی 'چائے کے باغ' کی راحت کاشانی، 'دلربا' کی گلنار، 'نظارہ درمیاں ہے' کی ثریا حسین اپنے اپنے افسانوں کے مرکزی کردار ہیں، اور ان میں سے اکثر مردوں کے مقابلے پر بڑی خود اعتمادی کے ساتھ اس انداز میں پیش کیے گئے ہیں کہ کہیں کہیں ان میں خود پسندی کی جھلک نظر آنے لگتی ہے۔ ان میں رومانیت، جذباتیت، ضد، سرکشی اور حق پسندی کے اوصاف نمایاں طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ اکثر یہ کردار زود حِس اور زود رنج بھی ہیں لیکن نرمی اور لطافت ان کے مزاجوں کا جزو لازم ہے۔ اس نکتے پر بھی دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ قرۃ العین حیدر کو بیانیہ پر مکمل قدرت حاصل ہے اور وہ شستہ، شائستہ، سلیس اور رواں دواں زبان استعمال کرنے پر عبور رکھتی ہیں۔ ان کے مکالمے برجستہ ہوتے ہیں اور لہجے میں حسبِ ضرورت نرمی یا کاٹ پیدا کرنے کا شعور بھی انھیں حاصل ہے۔ مختلف مواقع، مدارج، طبقات اور طبائع کے کرداروں سے مزاجی مطابقت و موافقت رکھنے والا طرز گفتار وہ بخوبی اختیار کرسکتی ہیں۔'' (عینی اور اردو فکشن)

اردو میں بچوں کے ادب کا جائزہ لیتے ہوئے مظفر حنفی نے تحقیق کو راہ دی ہے اور ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ ادب اطفال کے سرمائے سے روشناس کراتے ہوئے، افادیت اور مقبولیت کا جائزہ لیتے ہوئے اور بچوں کے رسائل کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دوسری ہندوستانی زبانوں کے مقابلے میں اردو میں بچوں کے رسالوں کی تعداد ہمیشہ محدود رہی اور ان کی طباعت اور پیش کش کا معیار بھی غیر اطمینان بخش رہا۔ کچھ مستثنیات کو چھوڑ کر ان میں سے بیشتر رسالے خوب صورت اور رنگین تصاویر اور دلچسپ کارٹونوں سے محروم ہوتے تھے۔ بیسویں صدی کے بالکل آغاز میں غالباً بچوں کا پہلا رسالہ شائع ہوا جس کا نام 'بچوں کا اخبار' تھا۔ لیکن یہ سلسلہ چند شماروں کے بعد ہی منقطع ہوگیا۔ بعد ازاں ۱۹۰۸ء میں بچوں کا مقبول ترین ہفت روزہ جریدہ 'پھول' جاری ہوا جسے لاہور سے سید ممتاز علی نکالتے تھے۔ بچوں کے اس محبوب رسالے کی ادارت وقتاً فوقتاً حفیظ جالندھری، عبدالمجید سالک اور احمد ندیم قاسمی جیسی نامور شخصیتوں نے کی۔ ان مدیروں نے جو بذاتِ خود بہت اچھے نثر نگار اور شاعر تھے نہ صرف رسالے کو خوب صورتی سے ترتیب دیا بلکہ اپنے ہم عصر اہم اور ممتاز فن کاروں کو 'پھول' کے لیے لکھنے پر بھی آمادہ کیا۔ بحیثیت مجموعی 'پھول' اور اس کے مدیران کی خدمات کو ادب اطفال میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔'' (اردو میں ادب اطفال)

مظفر حنفی کی تنقید میں خیال انگیزی ہے۔ وہ تخلیقات کا جائزہ لیتے وقت لفظی تصاویر سے فن کارانہ حسن پیدا کرتے ہیں۔ قابل قدر مواد کے بطون میں داخل ہوکر کیفیت کی وضاحت کرتے ہیں اور کھردری اور سفاک حقیقت کو سامنے لاکر معانی اور مفاہیم کو مرکزیت عطا کرتے ہیں۔



''مظفر حنفی کی موجودہ غزل کا سارا سیاق وسباق بڑا شور آگیں، کٹا پھٹا اور جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا ہے۔ تمام میمنہ اور میسرہ چیخوں اور فریادوں سے لبریز ہے۔ کہیں دھواں ہے کہیں آگ ہے، کہیں بگولے گردش میں ہیں تو کہیں خون کی ہولی کھیلی جارہی ہے۔ گنبد و مینار فریاد کناں ہیں تو محرابیں دعا بہ لب۔ مظفر حنفی کی غزل کا یہ وہ چہرہ ہے جو خاصا مسنخ ہے۔ 'یا اخی' سے پہلے کی غزلوں میں مظفر حنفی کے لفظوں نے اس تراوش اور تاثر سے کم ہی واسطہ رکھا ہے۔ چوں کہ طنز ان کے اسلوب میں ایک خاص اہمیت کا حامل تھا اس لیے موجودہ دہشت ناکیوں کو زیادہ موثر اور بے باکانہ طریقے سے ادا کرنے میں طنز کا جوہر بڑی خوبی سے کام آیا ہے۔ اسی اسلوب میں ان کی انفرادیت کا راز بھی مضمر ہے۔ مظفر حنفی بلاشبہہ ہمارے عہد کے ان قلیل ترین ناموں میں سے ایک ہیں جن کی غزل اپنے مفاہیم میں وسیع، اسلوب میں کاری اور تلفیظ میں قطعی مختلف ومنفرد ہے۔'' (**عتیق اللہ**)

ڈاکٹر رضیہ حامد
بھوپال

ڈاکٹر مظفر حنفی اور ان کی کتاب 'کچھ انٹرویوٗ'

اردو شعر و ادب کی نامور شخصیت ڈاکٹر مظفر حنفی کا ادبی سفر نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک جاری رہا۔ وہ یکم اپریل ۱۹۳۶ء کو کھنڈوہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد صاحب مدرّس تھے۔ شاعری کا ذوق تھا، ان کا تخلص منشی تھا، بچوں کی نظمیں لکھتے تھے۔ مظفر حنفی ان کے ساتھ روز اسکول چلے جاتے تھے۔ ۴ رسال کی عمر سے ہی ان کو ادب و شعر سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اپنی مختصر خودنوشت 'شیشہ ساعت میں سر دھنتی ہے ریت' میں لکھتے ہیں:

''اس زمانہ میں کھنڈوہ کے درجنوں اردو اسکولوں میں نظم خوانی کا ایک پیریڈ ہوا کرتا تھا جس میں (ان کے والد) منشی جناب کی نظمیں تکلی، جامن، بکری، آم وغیرہ باقاعدگی سے پڑھی جاتی تھیں۔ 'ایک اور ایک ہوتے دو'، 'آم ہیں میٹھے چکھ کر لو' قسم کی منظوم گنتی بھی ہوتی تھی۔ اس وقت میری عمر مشکل سے چار سال کی ہوگی۔ جس جماعت میں جی چاہتا جا بیٹھتا تھا لیکن کوشش یہ ہوتی کہ سبھی کلاسوں کی نظم خوانی میں شرکت رہے۔'' (ص ۲۰۳)

مظفر حنفی کا محبوب مشغلہ خوب پڑھنا اور خوب لکھنا تھا۔ وہ وضعدار، سنجیدہ مزاج، اُصول پسند اور خوددار انسان تھے۔ ان کی شخصیت ہمہ جہت تھی اور ان کا ادبی کردار متنوع۔ وہ شاعر، ادیب، محقق، مترجم، تبصرہ نگار، افسانہ نگار، ناول نگار، سفر نامہ نگار، بچوں کے شاعر اور انٹرویو، مصاحبہ کے ماہر تھے۔ وہ تقریباً ۸۵ رکتابوں کے مصنف، مولف اور مترجم تھے۔

انٹرویو پر مشتمل ان کی تین کتابیں شائع ہوئی ہیں، 'سوالوں کے حصار میں'، 'گفتگو دو بدو' اور 'کچھ انٹرویوٗ'۔ مظفر صاحب نے مختلف جہات اور عمر کے دانشوروں سے بہت سلیقہ اور خوداعتمادی سے دوٹوک گفتگو کی ہے، جو ان کی وسعت مطالعہ، علمیت، ذہانت اور جامعیت کا بین ثبوت ہے۔ ڈاکٹر مظفر حنفی کی جولان گاہ صرف اردو زبان و ادب تک محدود نہیں تھی، بلکہ وہ تعلیم، تہذیب، معاشرت، سیاست اور ثقافت کے مسئلوں کے عام انسان کی زندگی پر پڑنے والے اثرات سے بھی کماحقہٗ واقفیت رکھتے تھے۔

کتاب 'کچھ انٹرویوٗ' میں کل سات مضامین ہیں۔ باتیں فکر تونسوی سے، باتیں حسن نعیم سے، باتیں وزیر آغا سے، ساحر ہوشیارپوری سے باتیں۔ مظفر صاحب نے کتاب کے آخر میں اسداللہ کے ذریعہ لیا گیا اپنا انٹرویو اور اپنی خودنوشت 'شیشہ ساعت میں سر دھنتی ریت' بھی شامل کیے ہیں۔

انھوں نے یہ سب انٹرویو ہم عصر شخصیات سے لیے ہیں۔ ان انٹرویوز میں انھوں نے برابری کی سطح سے گفتگو کی ہے۔ وہ جس شخص سے بھی انٹرویو لیتے تھے، اس کے متعلق پوری معلومات حاصل کرنے کے بعد اپنے سوالات تیار کرتے تھے۔ ان انٹرویوز میں مکالمہ کی فضا پائی جاتی ہے۔ فکر تونسوی کے اصل نام سے اردو دنیا واقف نہیں۔ مظفر حنفی نے ان سے نام کے متعلق پوچھا تو انھوں نے بتانے سے گریز کیا۔ مظفر حنفی کے ایک سوال، ''مزاح اور طنز میں کس کو فوقیت حاصل ہے''؟ کے جواب میں فکر تونسوی نے فرمایا:

''مزاح جو ہے وہ ذرا نچلی سطح کا ادب ہے جو وجود میں آیا طنز کو خوش گوار بنانے کے لیے، طنز کافی تلخ چیز ہوتی ہے، بڑی گہرائی تک جاتی ہے، مشہور ہے کہ طنز نگار لوگوں کو ہنساتا ہے اور خود روتا ہے اندر سے۔ تو یہ رلانے والی چیز ہے لیکن اسے لوگوں کی خاطر گوارہ کرنے کے لیے، خوش گوار بنانے کے لیے مزاح کی مدد لی جاتی ہے۔'' (ص ۲۷)

حسن نعیم درویشانہ صفت کے حامل انسان تھے۔ مظفر حنفی حسن نعیم کی شاعری کے مداح تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ حسن نعیم سے نسبتاً کم درجہ رکھنے والے شاعر و ادیب مقبولیت کے اعتبار سے کچھ زیادہ ہی نمایاں ہوئے۔ مظفر صاحب نے جب یہ بات دورانِ گفتگو حسن نعیم سے کہی تو انھوں نے کہا:

''مجھے شہرت سے کچھ ہمیشہ ایک لنکڈ معلوم ہوئی، یہ بات کہ جن طریقوں اور ذرائع سے لوگ شہرت حاصل کرتے ہیں۔ میں نے ان کو قبول نہیں کیا۔ انھیں ردّ کر دیا...... ایک شعر سناتا ہوں۔

گردِ شہرت کو بھی دامن سے لپٹنے نہ دیا
کوئی احسان زمانے کا اُٹھایا ہی نہیں''

اردو شاعری کے متعلق مظفر حنفی سے گفتگو کرتے ہوئے حسن نعیم نے صنف غزل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا:

''میرا خیال ہے کہ غزل میں جب تک اپنے عصر کی روح کو کسی نہ کسی تہ داری کے ساتھ اور جو کچھ مشاہدات ہیں یا جہاں بینی ہے اسے آپ تغزل کی زبان میں پیش نہ کریں تو غزل میں بڑی شاعری کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔'' (ص ۶۰۔۶۱)

'باتیں وزیر آغا سے' میں مظفر حنفی اور وزیر آغا کی گفتگو زبان اور اس کے استعمال پر رہی۔ پاکستان اور ہندوستان میں زبان کے استعمال کا فرق واضح کیا گیا۔ وزیر آغا نے اپنی سوانح عمری نظم و نثر میں لکھی، اس کے

بارے میں وزیر آغا نے مظفر حنفی کو بتایا:

''یہ عجیب اتفاق ہوا کہ میں نے 'آدھی صدی کے بعد' شعر میں، نظم میں اپنی سوانح عمری لکھی اور پھر اس کے بعد میں نے نثر میں اپنی سوانح عمری لکھی 'شام کی منڈیر سے'۔ ورلڈ لٹریچر (World Litrature) میں کم از کم میری نظر میں کوئی ایسی بات نہیں آئی کہ شعر میں اور نثر میں بیک وقت دونوں میں سوانح عمری لکھی گئی ہو۔ نثر اور نظم میں مظفر حنفی صاحب یہ عجیب و غریب Phinomina ہے۔'' (ص ۸۱)

سمینار میں مقالے زیادہ ہونے کی وجہ سے مقالہ نگار کو پیش کرنے میں دقت ہوتی ہے تو سامعین کا ذہن بھی بوجھل ہو جاتا ہے۔ سمینار کے انعقاد اور موضوعات پر بات کرتے ہوئے وزیر آغا نے کہا کہ ''اس (ایسی صورت حال) میں یہ ہونا چاہیے کہ تھوڑے مقالے ہوں اور وہ مقالے پہلے پڑھ لیے جائیں اور انتخاب کر لیا جائے۔'' دورانِ گفتگو یہ بات بھی زیرِ غور رہی کہ کسی کے نام سے منسوب ادارے اس پر اپنے سمینار کرتے ہیں، جس کی وجہ سے بار بار ایک ہی سی باتیں دہرائی جاتی ہیں۔ مظفر حنفی نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ:

''اس طرح سطحیت بھی آجائے گی تو پھر کیوں نہ اس پلیٹ فارم سے موضوعات میں تنوع لانے کی کوشش کی جائے مثلاً موجودہ دور میں جو شاعری ہو رہی ہے اس میں غالب کے اثرات ہی دیکھیں۔'' وزیر آغا نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا ''یہ خیال بہت اچھا ہے۔'' (ص ۹۸۔۹۹)

ساحر ہوشیار پوری سے مظفر حنفی نے ان کے بچپن اور جوانی کی سماجی تہذیب اور اقدار کے بارے میں گفتگو کی، ساحر صاحب نے بدلتی اقدار پر دُکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ:

''مظفر صاحب یہ جواب روایاتِ خودداری اور بزرگی ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ...... پرانے زمانے میں جو کچھ ہوا کرتا تھا جیسے ہم اپنے استاد کے سامنے بیٹھتے تھے تو آنکھیں جھکی رہتی تھیں اور آنکھ اُٹھا کر بات نہیں کر سکتے تھے۔'' (ص ۱۳۳)

جانچ اور پرکھ مظفر حنفی کی فطرت کا خاصہ تھا، انھوں نے ساحر ہوشیار پوری سے ان کی غزل کے دو مختلف النوع شعر پڑھ کر دریافت کیا کہ ان کی شاعری کا اصلی رنگ کون سا ہے۔ ساحر صاحب نے واضح الفاظ میں جواب دیا:

''میرا اصلی رنگ جیسا کہ میں نے عرض کیا، میں داخلیت ہی کو مناسب سمجھتا ہوں، خارجیت کوئی چیز نہیں۔ جو مجھ پر بیتی ہے اسے میں ادا کرتا ہوں۔ جہاں تک جدید رنگ کا تعلق ہے

میں نے اپنی آنکھیں اور اپنے کان کھلے رکھے ہیں، میں پڑھتا بھی ہوں اور جدید ادب کو سنتا بھی ہوں۔'' (ص ۱۷۴)

مظفر حنفی صاحب نے 'جیلانی بانو سے باتیں' کے عنوان سے انٹرویو کیا ہے، اس دوران حالاتِ حاضرہ اور افسانوی ادب پر اس کے اثرات پر گفتگو ہوئی۔ جیلانی بانو نے کہا کہ:

''میں اپنے آس پاس سے متاثر ہو کر لکھتی ہوں۔ صرف یہ کہنا کہ شاعر یا افسانہ نگار تو آسمان پر رہتا ہے، خلاؤں میں بھٹکتا ہے، اس کے لیے تو ایسی فضا چاہیے، سکون چاہیے یا باقاعدہ پلاٹ ذہن میں رکھے، امن ہو، میں یہ سب نہیں جانتی، میں تو صرف یہی جانتی ہوں کہ میں خود اپنے آس پاس کے ماحول سے ہی کہانی لیتی ہوں۔'' (ص ۱۸۶)

مظفر صاحب جب یہ کتاب ترتیب دے رہے تھے اس وقت ڈاکٹر اسداللہ (امراوتی) نے ان کا انٹرویو لیا تھا جس کو انھوں نے اس کتاب کے آخر میں شامل کر دیا ہے۔ مظفر حنفی صاحب کو خیال گزرا کہ اتنے لوگوں کی حیات کے کوائف یکجا کیے ہیں تو کیوں نہ اپنی زندگی کی مختصر روداد سے قاری کو روشناس کرایا جائے، چنانچہ 'شیشہ ساعت میں سر دھنتی ہے ریت' کے عنوان سے اپنی مختصر خودنوشت شامل کر دی۔ اسداللہ نے مظفر حنفی صاحب سے کئی سوالات کیے۔ ان میں ایک سوال بچوں کے ادب کے بارے میں بھی ہے کہ بچوں کے ادب کی ترقی کے لیے کون سے اقدامات ضروری ہیں۔ مظفر حنفی صاحب نے فرمایا:

''بچوں کے لیے لکھتے وقت مصنف کو خود بچہ بن جانا چاہیے یعنی بچوں کی نفسیات سے اسے بخوبی واقف ہونا چاہیے۔ مصنف کا مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ وسیع اور متنوع ہونا چاہیے۔ تحریر میں بچوں کی دلچسپی کا وافر مواد ہونا چاہیے۔ ظرافت سے بھرپور کام لینا چاہیے۔'' (ص ۲۰۰)

'کچھ انٹرویو' میں شامل تمام انٹرویو بہت بصیرت انگیز ہیں۔ جن لوگوں سے انٹرویو لیے ہیں ان کی شخصیات اور فکر و نظر سے قاری کو واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کی گفتگو سے نئے نئے انکشافات بھی ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر مظفر حنفی نے اسّی سال کی عمر میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے شعر کہا ؎

عمر کے آٹھویں عشرے میں کرو سجدۂ شکر
طبع کو اس نے جو طغیانی میں رکھا ہے جواں

مظفر صاحب نے اپنی زندگی کے آخری پڑاؤ میں اپنی خودنوشت کے اس مضمون 'شیشہ ساعت میں سر دُھنتی ہے ریت' میں اپنی زندگی کا لب لباب بیان کیا ہے جو ہر ذی علم کے لیے راہِ ہدایت و مثال ہے۔ وہ اللہ پر بھروسہ اور علم کی بقا کے لیے جدوجہد کی دعا کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''عمر کی ۸۲ رویں منزل سے پلٹ کر گزشتہ برسوں پر نظر کرتا ہوں تو ہر چند کہ اس اعتبار سے

بے اطمینانی کا احساس ہوتا ہے کہ بہت سے بڑے ادبی کام کرنے کی خواہش تھی جو رہ گئے۔

شیشۂ ساعت میں سر دُھنتی ہے ریت
عمر کے اسّی برس گم ہو گئے

لیکن یہ سوچ کر قدرے تسکین ہوتی ہے کہ بے حد غریب خاندان اور نامساعد حالات میں رہ کر بھی زندگی یکسر رائیگاں نہیں گئی۔ ہمیشہ پڑھنے لکھنے اور پڑھانے سے واسطہ رہا۔ خدا کے سوا اور کے آگے سر نہ جھکایا، نہ اہلِ اقتدار کی خوشامد کی، کسی قسم کی سفارش کو اپنے آگے بڑھنے کا زینہ نہیں بنایا، لوگوں کے احسانات قبول نہیں کیے، قرض سے ہمیشہ دامن بچایا۔ حتی الوسع والدین کی خدمت کی، بہنوں کی اعانت اور اعزا کے ساتھ صلۂ رحمی کا رویہ اختیار کیا۔ باصلاحیت اور مستحق شاگردوں کی مدد کی بلکہ دو تین کو اپنے ساتھ رکھ کر پی ایچ۔ ڈی میں کامیابی سے ہم کنار کیا۔ چھوٹی بہن، بھانجے، بھانجیوں کی شادیاں کیں، بیٹوں اور بیٹی کو اعلیٰ تعلیم دلائی اور سب کے دلوں میں اردو سے محبت کا جذبہ پیدا کیا۔ اپنی محنت کی کمائی سے دہلی میں بچوں کے لیے دو مکان تعمیر کیے۔ دوستوں اور اعزا میں محبت اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہوں اور ادبی حلقوں میں صاف گوئی اور بے نیازی کے لیے مشہور ہوں۔ خداوند قدوس سے دعا کرتا ہوں کہ زندگی کی آخری سانس تک مجھے علمی و ادبی کام کرتے رہنے کی توفیق اور استطاعت عطا فرمائے اور اپنے علاوہ کسی غیر کے آگے سر نہ جھکنے دے۔“

مظفر حنفی نے ادبی دنیا کے لیے اپنی تصنیفات و تالیفات کا ایک بڑا اثاثہ چھوڑا ہے۔ وہ آخر عمر تک فعال رہے۔ قلم اور ذہن و دل پر ان کی حکمرانی قائم رہی، اس کے باوجود ان کے مزاج میں غرور نہیں تھا بلکہ فن کارانہ تمکنت کے ساتھ انکساری تھی۔ ۸۴/سال کی عمر میں اردو زبان و ادب کے شیدا اس مردِ مجاہد نے ۱۰/اکتوبر ۲۰۲۰ء کو رخت سفر باندھا۔ ایسے دانشور مرتے نہیں وہ اپنے کیے گئے کاموں سے لوگوں کے دلوں میں زندہ رہتے ہیں۔ بقول کسی کے۔

موت بھی ہے اِک نویدِ زندگی اس کے لیے
ذکر جس کا حلقۂ احباب میں زندہ رہے
......
تمھیں کہتا ہے مردہ کون تم زندوں میں زندہ ہو
تمہاری نیکیاں زندہ تمہاری خوبیاں باقی

○○○

محمد نعمان خاں
نئی دلی

مظفر حنفی کی نثری نگارشات

بحیثیت افسانہ نگار:

مظفر حنفی کے افسانوں کے تین مجموعے ’اینٹ کا جواب‘، ’دوغنڈے‘، اور ’دیدۂ حیراں‘ شائع ہو چکے ہیں۔ جس تیکھے پن، لہجہ کی تمازت اور طنزیہ انداز کا اظہار ان کی شاعری سے ہوتا ہے ٹھیک وہی انداز ان کے افسانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں منٹو کی طرح چونکا دینے والی کیفیت ضرور ہے لیکن کہانی کا ڈھنگ منٹو کی طرح نہیں۔ زندگی اور سماج کی بے راہ روی اور بے اصولی پر انھوں نے براہِ راست چوٹ کی ہے۔ وہ ادب میں وابستگی کے بجائے حقیقت بیانی کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں آرائش و زیبائش، رنگین بیانی اور افسانوی لوچ کے بجائے کھردرا پن، سادگی اور صاف گوئی کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں دو اور دو چار کا انداز نمایاں ہے۔ بقول کرشن چندر:

> ”مظفر حنفی نے اندھیرے کنوئیں میں ڈول نہیں ڈالے ہیں۔ لاشعور کی بھول بھلیوں میں گم نہیں ہوا ہے۔ حد سے بڑھی ہوئی دروں بینی کا شکار نہیں ہوا ہے۔ تجریاتی ٹامک ٹوئیوں میں الجھ کر نہیں رہ گیا ہے۔ وہ زبان و بیان کے الجھاوے دے دے کر زندگی سے آنکھیں چرانے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ آنکھیں چار کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ایک عجیب لاپرواتیقن کے ساتھ بظاہر سنگدل قریب قریب قنوطی پیرایۂ بیان کے ساتھ۔“(۱)

مظفر حنفی نے زندگی کی کریہہ المنظر حقیقتوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش میں کہیں کہیں افسانے کے رچاؤ اور نزاکت کو مجروح کر دیا ہے۔ ان کے افسانے سماج کے مختلف حالات و واقعات پر مبنی ہیں جن میں عموماً نچلے متوسط طبقے کی بے چارگی، بدحالی، مفلسی، بداخلاقی، بدمعاملگی اور بے انصافی پر سادگی اور سچائی کے ساتھ اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ مظفر حنفی کا پہلا مجموعہ ’اینٹ کا جواب‘ میں شامل افسانوں پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے فراق

گورکھپوری لکھتے ہیں:

''مظفر حنفی کے یہ افسانے اردو کے کئی اچھے رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان افسانوں کو ہزارہا شائقین ادب کی مقبولیت حاصل ہو چکی ہے...... مظفر حنفی ہمارے نئے افسانہ نگاروں میں ایک ہونہار ادیب ہیں...... ان کے افسانوں میں زندگی کے کئی پہلوؤں کی عکاسی ہے...... ان میں نیا پن ہے۔ ان کا انداز دل کش ہے، مکالمے فطری ہیں اور پلاٹ میں جدت ہے...... ان افسانوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اگر نوجوان مصنف نے اپنی کوششیں جاری رکھیں تو وہ ترقی کی نئی منزلیں کامیابی سے طے کرتے جائیں گے۔''(۲)

مظفر صاحب کے افسانوی مجموعہ 'دیدۂ حیراں' پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور طنز و مزاح نگار کنہیا لال کپور رقم طراز ہیں:

''مظفر حنفی محفلِ افسانہ نویسی میں نووارد ضرور ہیں لیکن نومشق اور نوآموز ہرگز نہیں۔ ان کے افسانے بڑے جاندار ہیں اور ان کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ بادی النظر میں وہ سہل ممتنع کے نمونے نظر آتے ہیں لیکن اس سادگی میں غضب کی پُرکاری ہے۔''(۳)

بہرحال مظفر حنفی بھوپال کے ایسے افسانہ نگار ہیں جن کی شہرت بھوپال کی حدود تک محدود نہیں رہی بلکہ نامور مشاہیر شعرا و ادبا نے بھی ان کی کوششوں کو سراہا ہے۔ انضمام ریاست کے بعد بھوپال میں انھوں نے سب سے زیادہ یعنی ڈیڑھ سو افسانے لکھے۔ ان کے علاوہ انھوں نے افسانچے (منی کہانیاں) جاسوسی کہانیاں اور بچوں کے لیے کہانیاں بھی تحریر کی ہیں جو مختلف رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔

مظفر حنفی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'اینٹ کا جواب' اگست ۱۹۶۷ء میں مرکز ادب بھوپال سے شائع ہوا۔ ۱۴۰/صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں ۲۱/افسانے شامل ہیں۔ افسانوں کا دوسرا مجموعہ 'دو غنڈے' نومبر ۱۹۶۹ء میں نصرت پبلشرز، لکھنؤ کے زیر اہتمام منظر عام پر آیا۔ ۱۸۰/صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں ۱۲/افسانے شامل ہیں۔ افسانوں کا تیسرا اور آخری مجموعہ 'دیدۂ حیراں' میں ۲۴/افسانے شامل ہیں جو کہ ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں مظفر حنفی نے صغر سنی (یعنی ۱۱ برس) سے بچوں کے لیے کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ ۱۹۵۰ء سے باقاعدہ طور پر افسانے لکھنے لگے۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ:

''میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز گیارہ سال کی عمر کے آس پاس کبھی کیا تھا۔''(۴)

''۵۰ء تا ۶۰ء میں بڑی تیزی کے ساتھ افسانے ہی لکھتا رہا ہوں۔(۵)

اس طرح ۱۹۶۰ء کے بعد مظفر حنفی نے اس صنف کو خیر باد کہہ دیا اور ان کے افسانوں کے تینوں مجموعے کئی سال بعد کتابی شکل اختیار کر سکے، اس وجہ سے بعض ناقدین نے ان کے افسانوں پر جو تبصرے کیے ہیں وہ

اس بات کو ملحوظ رکھ کر نہیں کیے گئے کہ یہ افسانے ۵۰ء سے ۶۰ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔

مظفر حنفی کے افسانے موضوع کے اعتبار سے جدید ضرور ہیں لیکن اسلوب بیان کے اعتبار سے نہیں۔ ان کے افسانے بیانیہ ہیں اور ان میں علامت و ابہام سے کام کم لیا گیا ہے۔ چنانچہ اس امر کی وضاحت وہ خود اس طرح کرتے ہیں:

''میرے افسانے اس عہد میں جدید کہے جاتے تھے۔ رومانیت سے اجتناب کرتے ہوئے ان میں حقیقت نگاری، کہانی پن اور طنز کے امتزاج سے بات کو الگ انداز میں کہنے کی کوشش کی گئی تھی۔''

اس سلسلے میں مزید لکھتے ہیں کہ:

''یہ وہ دور تھا جب آج کا جدید افسانہ وجود میں نہ آیا تھا۔ اردو افسانہ نگاری میں رام لال، ذکی انور، اقبال فرحت اعجازی، غیاث احمد گدی، ستیہ پال آنند اور راقم الحروف کی گنتی جدید افسانہ نگاروں میں ہوتی تھی۔ پھر کچھ ایسا ہوا کہ میں شاؔد عارفی کا شاگرد ہو کر شاعری کے چکر میں افسانہ نگاری کے کام کا نہ رہا۔ اسی زمانہ میں دوسری زبانوں کی طرح اردو افسانے کا مزاج بھی یک لخت بدل گیا اور آج رام لال تو کجا، اس کے بہت بعد کی پود جس میں جوگندر پال اور قاضی عبدالستار جیسے اہم نام شامل ہیں پرانی سمجھی جانے لگی ہے...... مختصر یہ کہ میں جدید شاعر تو ضرور ہوں، جدید افسانہ نگار ہونے کا دعویٰ نہیں رکھتا۔(۷)

اس طرح مظفر حنفی کے افسانوں کا جائزہ لیتے وقت ان کے زمانۂ تصنیف کو اس عہد میں رائج اردو افسانہ کے میلان و معیار کو ملحوظ و مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ اس اعتبار سے مظفر حنفی آج کے دور کے لحاظ سے نہ سہی لیکن اپنے عہد کے اعتبار سے جدید افسانہ نگاروں کے زمرے میں ہی شمار کیے جائیں گے۔ انھوں نے افسانہ کی عام مروجہ رومانوی اور خیالی فضا سے اجتناب کر کے حقیقی زندگی کو اپنے افسانوں میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

مظفر حنفی کے افسانہ 'ضرب کلیم' میں مزدوروں کی وطن سے محبت اور اس کے تئیں جذبۂ ایثار کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ 'الماس کا محبوب' کی فضا اگرچہ رومانی ہے لیکن اس میں عصر حاضر کے اقتصادی مسائل بھی زیر بحث آ گئے ہیں۔ 'ڈربہ' میں مکانوں کی قلت اور رہائشی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ 'چالیس کا خون' میں انسانی خود غرضی اور ہوسنا کی کو نفسیاتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

'دو غنڈے' ایک اچھا افسانہ ہے جس میں امراؤ اور فصیح دو کرداروں کو دو غنڈوں کی شکل میں پیش کر کے ان میں موجود بعض ایسی شریفانہ خصلتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ قاری کے دل میں ان سے نفرت کے بجائے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے کیوں کہ مذکورہ دونوں غنڈے سماجی بے حسی اور ظلم و زیادتیوں کے باعث غنڈہ گردی پر آمادہ ہو جاتے ہیں ورنہ فطرتاً وہ نیک و نرم دل واقع ہوئے ہیں۔ 'غبار آئینہ دل' میں انھوں نے کلرک اور

افسر شاہی کے درمیان کشمکش کو حقیقی روپ میں پیش کیا ہے۔ دراصل یہ ایک کلرک کی کہانی ہے جو ایماندار کلرک گپتا کی زبانی بیان کی گئی ہے۔ افسانہ نگار افسر شاہی کے خلاف گپتا کے ذریعے اس طرح اپنے دل کا غبار نکالتا ہے:

''اے دستخط کرنے والی مشینو! یہ جو فیصلے لکھے جاتے ہیں اور تحقیقات ہوتی ہیں اور احکامات صادر ہوتے ہیں اور جرمانے وصول ہوتے ہیں اور فائلیں آگے بڑھتی ہیں۔ یہ سب ہم کلرک کرتے ہیں اور تم لوگ دماغ پر زور دیے بغیر صرف دستخط کرتے ہو۔ تم ہفتے بھر میں صرف اتنا کام کرتے ہو جتنا ایک کام چور کلرک ایک دن میں کرتا ہے لیکن تنخواہ دس کلرکوں کی ملتی ہے۔''(۸)

افسانہ 'ٹی۔ اے بل' میں بھی دفتری ماحول کی بدعنوانیوں پر ضرب لگائی ہے۔ مظفر حنفی کی حقیقت بیانی، طنز اور تیکھے پن کے ساتھ سادہ اندازِ بیان ان کے ہر افسانے سے مترشح ہے۔ ان کے افسانے محض تفریح طبع یا دل بہلانے کے لیے نہیں لکھے گئے بلکہ ایک خاص مقصدیت کے حامل ہیں اور ان میں مظفر حنفی نے اپنی زندگی اور سماج سے حاصل شدہ تلخ تجربات اور ناگوار واقعات کو حقیقت کے آئینے میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ اکثر جگہ ان کے افسانوں کے کرداروں میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خود افسانہ نگار مرکزی کردار بن گیا ہے۔ سچی زندگی سے متعلق واقعات کے عکاس ہونے کے باعث ان کے افسانوں میں قدرے یاسیت اور تلخی پیدا ہوگئی ہے لیکن اس میں تصنع قطعی نہیں ہے۔ یہ افسانے ان حالات اور ماحول کی دین ہیں جس میں افسانہ نگار سانس لے رہا ہے۔ مظفر حنفی کامیاب افسانہ نگار ہیں لیکن اردو ادب میں جو مقام انھیں بحیثیت شاعر حاصل ہے۔ افسانہ نگار کی حیثیت سے نہیں ہو سکا۔

بحیثیت مترجم:

ڈاکٹر مظفر حنفی نے ترجمہ نگاری کے ذریعہ بھی اپنی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔ وہ مختلف زبانوں سے متعدد مضامین اور کہانیوں کو اردو کے قالب میں ڈھال چکے ہیں اور ملکی و غیر ملکی زبانوں کے معروف ادیبوں کی تیرہ کتابوں کا ترجمہ کر چکے ہیں۔ مظفر حنفی نے سب سے پہلے ۱۹۵۴ء میں ایک انگریزی جاسوسی ناول کا ترجمہ 'چوروں کا قاتل' کے نام سے کیا تھا جو مانسرور پبلشنگ اکیڈمی، الہ آباد سے شائع ہوا تھا۔

مظفر حنفی کے ترجمہ کردہ دیگر جاسوسی ناولوں میں اسٹانلے گارڈنر کا ناول 'دی کیس آف دی رولنگ بونس' کا ترجمہ 'پر اسرار قتل' (مطبوعہ نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۵۵ء)، 'شرلاک ہومز ہندوستان میں' (مطبوعہ نسیم بک ڈپو، لکھنؤ ۱۹۵۶ء)، 'دُہری سازش' (مطبوعہ نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۵۶ء یہ اگاتھا کرسٹی کا ناول ہے) شامل ہیں۔

ان کے علاوہ سیکسٹن بلیک سیریز کے تین اور جاسوسی ناولوں کے ترجمے 'تارِ عنکبوت'، 'بین الاقوامی لٹیرے' اور 'پیلی کوٹھی' کے ناموں سے شائع ہو چکے ہیں۔ مظفر حنفی کے ترجمہ کردہ غیر جاسوسی کتابوں میں روسی

سائنسداں سخاروف کی انگریزی کتاب Sakharov Spe کا بامحاورہ اُردو ترجمہ 'سخاروف نے کہا' کے عنوان سے کیا جسے ۱۹۷۶ء میں نیشنل اکادمی دلّی نے کتابی صورت میں شائع کیا۔

۱۹۷۷ء میں مظفر حنفی نے نوبل انعام یافتہ روسی مصنف الیگزنڈر سولنستین کی یادداشت کا ترجمہ 'گلاگ مجمع الجزائر' کے نام سے کیا جو تین جلدوں میں نیشنل اکادمی دلّی کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ نیشنل بک ٹرسٹ دلّی نے مظفر حنفی کی ترجمہ کردہ کتاب 'گجراتی کے یک بابی ڈرامے' ۱۹۷۷ء میں شائع کی۔

مظفر حنفی کی ترجمہ کردہ دیگر کتب میں 'اڑیا افسانے' (مطبوعہ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا (دہلی، ۱۹۸۰ء)، 'بیداری' (بنگالی ناول جاگری کا ترجمہ، مطبوعہ نیشنل بک ٹرسٹ، دہلی، ۱۹۸۰ء) اور میکسم گورکی کا ناول The Artamonov کا اردو ترجمہ 'طوفان' کے علاوہ ہندی کتاب 'بھارتیندو ہریش چندر' اور 'بنکم چند چٹرجی' کے ترجمے (مطبوعہ ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۱۹۸۴ء) کے نام شامل ہیں۔

مذکورہ فہرست اس بات کا ثبوت ہے کہ بھوپال سے تعلق رکھنے والے مترجمین میں مظفر حنفی نے سب سے زیادہ ملکی و غیر ملکی زبانوں کے فن پاروں کا ترجمہ کر کے اردو کے ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا ہے۔ ان کے ترجمہ کردہ جاسوسی ناول محض لفظی ترجمہ نہیں ہیں بلکہ اصل کہانیوں سے اہم کردار اور مرکزی خیال کو ہندوستانی ماحول میں پیش کرنے کی سعی کی ہے، جس کے سبب مذکورہ ناولوں کے ترجمہ میں تخلیقی انداز نمایاں نظر آتا ہے، مظفر حنفی نے ہر جگہ اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا ہے کہ ترجمہ کرتے وقت اصل زبان کے معنی و مفاہیم بھی متاثر نہ ہوں اور اصل عبارت کی خوبی بھی برقرار رہے۔ مظفر حنفی محض لفظی ترجمہ کے قائل نہیں ہیں۔ وہ بامحاورہ ترجمہ میں یقین رکھتے ہیں۔ انھیں خصوصیات کے باعث ان کی ترجمہ کردہ کہانیوں میں طبع زاد کہانی کا لطف پیدا ہو گیا ہے۔

بحیثیت محقق و نقاد:

مظفر حنفی کے تحقیقی مقالے کا عنوان 'شاد عارفی: شخصیت اور فن' ہے جسے انھوں نے پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی زیرنگرانی پہلے ایم۔اے سال آخر کے لیے تحریر کیا اور بعد میں اسی موضوع میں ترمیم و اضافہ کر کے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۷۷ء میں یہ مقالہ مکتبہ جامعہ، نئی دہلی سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔

۹ حصوں میں منقسم اس تحقیقی مقالے میں مظفر حنفی نے اپنے استاد شاد عارفی کے سماجی اور ادبی پس منظر، سوانح حیات اور شخصیت، غزلیں، نظمیں، متفرق شعری تخلیقات، مضامین، خطوط، اشاریے، شاگردوں کی فہرست، شاد عارفی کی غیر مطبوعہ تخلیقات غرضیکہ شاد عارفی کی شخصیت و شاعری سے متعلق تمام تر پہلوؤں کا احاطہ کر کے اردو شاعری میں نہ صرف یہ کہ ان کے مقام کا تعین کیا ہے بلکہ ان سے متعلق بعض ایسے نامعلوم گوشوں کا بھی انکشاف کیا ہے جو اس سے پہلے ادب کے بہت سے قارئین اور ناقدین کی نظروں سے اوجھل تھے۔ بقول

پروفیسر مسعود حسین خاں:

''میرا خیال ہے، اس مقالے کی اشاعت کے بعد اہل نقد و نظر دیکھیں گے کہ ابھی چند دہے قبل ہمارے درمیان سے جو سخنور خاموشی سے اٹھ گیا ہے اس کی شخصیت اور فن دونوں کس قدر تہ دار تھے۔ وہ تمام عمر 'دار السرور' میں مقیم رہا لیکن اس کے نصیب میں لذت خمار بھی نہ آئی۔ اس کی زندگی مسلسل دیوانے کا خواب رہی۔ وہ ہمیشہ مرمر کر جیا کیا، لیکن اپنی فن کارانہ انفرادیت کا سودا نہ کیا۔ نا مساعد حالات کے نیش کو اس نے فن کے ذریعہ گوارا بنا لیا۔ اس کی غیور و خود دارانہ انفرادیت نے کبھی ان سے پیار کیا، کبھی ان پر تلوار بن کر ٹوٹ پڑا لیکن ہار نہ مانی اور مانی تو اس طرح کہ اس کی شکست کی آواز عمل بانگِ شعر بن گئی!

میں سمجھتا ہوں کہ یہ تصنیف کئی لحاظ سے ڈاکٹر مظفر حنفی کا 'حاصل عمر' ہے۔ اسے قلم بند کر کے انھوں نے ایک ایسی ادبی شخصیت کو پھر سے تولا ہے جسے ناقد (رے) پاسنگ سمجھ بیٹھے تھے، اردو شعر و نثر کے ایک ایسے اسلوب سے روشناس کرایا جو اس صدی کے تیسرے اور چوتھے دہے کا سب سے چونکا دینے والا اسلوب ہے۔ ایک ایسی ادبی شخصیت کے نقوش کو ابھارا ہے جو مجبور ہے لیکن مغلوب نہیں، اس لیے کہ وہ زمانے سے ہمدردی کا طالب نہیں!''(۹)

شادؔ عارفی کی شخصیت اور فن پر لکھے گئے نقادوں کے مختلف مضامین کا مجموعہ مظفر حنفی نے 'ایک تھا شاعر' کے نام سے ترتیب دے کر ۱۹۶۷ء میں شائع کیا تھا۔ اس کے علاوہ مختلف رسائل میں مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن ضرورت اس بات کی تھی کہ اس منفرد و مخصوص لہجے کے شاعر کی حیات اور ادبی خدمات پر ازسرِ نو مبسوط و مکمل کام کیا جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر مظفر حنفی نے اس اہم کام کو دقّتِ نظر اور عرق ریزی کے ساتھ مکمل کیا۔

مظفر حنفی نے اس تحقیقی مقالے میں شادؔ عارفی کی شخصیت کے گونا گوں پہلوؤں کے علاوہ ان کی ہمہ جہت ادبی حیثیت سے بھی لوگوں کو روشناس کرایا اور بتایا کہ:

''شادؔ عارفی چومکھے فن کار تھے اور ان کی طبع رواں، نظم و نثر، تخلیق و تنقید، سنجیدہ اور غیر ثقہ مضامین، غرضیکہ کسی میدان میں بند نہ تھی۔(۱۰)

اس مقالے میں مظفر حنفی نے تحقیقی و تنقیدی توازن کو ملحوظ رکھتے ہوئے احتیاط اور ذمہ داری کے ساتھ شادؔ عارفی کی شخصیت اور فن پر مفید اور معلومات افزا مواد پیش کیا ہے۔ مظفر حنفی شادؔ عارفی کے شاگرد ہونے اور مزاجی مناسبت کے باوجود غیر جانب دارانہ طور پر اس کام سے عہدہ برآ ہونے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ انھوں نے شادؔ عارفی کے اچھے اور بُرے دونوں پہلوؤں پر بلا جھجک اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

''مقالے میں حتی الامکان معروضی انداز اختیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے باوجود اگر

کہیں یہ گمان گزرے کہ کسی پہلو کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے تو اسے میری شاگردانہ عقیدت پر محمول کرنے کی جگہ اس مزاجی مناسبت کا نتیجہ جانیے جو بقول خلیل الرحمن اعظمی مجھے شادؔ عارفی سے ہے اور اگر کہیں شادؔ کے ساتھ زیادتی محسوس ہو تو اسے غیر جانب دار رہنے کی کوشش کا نتیجہ سمجھیے۔''(۱۱)

بلاشبہ مظفر حنفی کا یہ تحقیقی مقالہ ہر لحاظ سے ایک وقیع اور معیاری مقالہ ہے جسے اردو کے ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر مظفر حنفی اس مقالے کے علاوہ مختلف موضوعات پر متعدد تنقیدی و تحقیقی مضامین تحریر کر چکے ہیں جو مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کے مضامین کے مجموعے 'نقد ریزے'، 'جہات و جستجو' اور 'تنقیدی ابعاد' کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ 'وضاحتی کتابیات' کے نام سے کتابوں کا اشاریہ کئی جلدوں میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے اشتراک سے شائع ہوا ہے۔

مجموعۂ مضامین 'نقد ریزے' میں اگرچہ تنقیدی مضامین کی تعداد زیادہ ہے لیکن اس میں شامل درج ذیل مضامین تحقیقی نوعیت کے حامل ہیں۔ 'شعرائے زنداں'، 'علاقائی زبانوں سے ادبی ترجمے اور قومی یکجہتی'، 'رامائن اردو میں' اور 'کلیات شادؔ عارفی: چند وضاحتیں' وغیرہ۔

اسی طرح دوسرا مجموعۂ مضامین 'جہات و جستجو' میں بھی بعض تحقیقی مضامین شامل ہیں جن میں 'اردو میں ادبِ اطفال'، 'نئی غزل کے بیس سال ہندوستان میں' اور 'تذکرۂ آثار الشعرا' کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ اول الذکر مضمون میں مظفر صاحب نے ادوار کے لحاظ سے امیر خسرو سے لے کر موجودہ عہد تک ادب اطفال سے متعلق ادیبوں اور شاعروں کا جائزہ پیش کیا ہے جب کہ آخر الذکر مضمون خالصتاً تحقیقی نوعیت کا حامل ہے جس میں بھوپال کے شعرا سے متعلق ایک قدیم و کمیاب تذکرہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے متعلق مظفر حنفی لکھتے ہیں:

''بھوپالی شعرا اور ان شاعروں کے جو بہ سلسلۂ ملازمت یا تجارت بھوپال میں مقیم تھے، حالات زندگی اور نمونۂ کلام پر مشتمل یہ تذکرہ ۱۳۰۶ھ (مطابق ۱۸۹۰ء) میں سید ممتاز علی المتخلص بہ حافظؔ نے ترتیب دیا تھا۔ اس وقت کی حکمراں ریاست بھوپال، نواب شاہجہاں بیگم کی خواہش کے مطابق منشی فدا علی فارغؔ نے اس پر نظر ثانی کی تھی اور یہ تذکرہ مطبع شاہجہانی میں ۱۳۰۷ھ میں زیور طبع سے آراستہ ہوا تھا۔''(۱۲)

مظفر حنفی نے مذکورہ تحقیقی مضمون کے ذریعہ بھوپال کے اس تاریخی تذکرے کو گمنامی سے نکال کر اہل نظر کے سامنے پیش کر کے اہم تحقیقی کام انجام دیا ہے۔

'وضاحتی کتابیات' کتابوں کا وہ اشاریہ ہے جو مظفر حنفی اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے اشتراک سے تحقیقی پروجیکٹ کے تحت دو جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ جلد اول ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی کتابوں پر مشتمل ہے جسے

ترقی اردو بورڈ نے ۱۹۸۰ء میں کتابی صورت میں شائع کیا۔ ۸۷۔۱۹۷۷ء کی مطبوعہ کتب پر مشتمل دوسری جلد بھی ترقی اردو بورڈ نے ۱۹۸۴ء میں شائع کی ہے۔

ڈاکٹر مظفر حنفی کے تحقیقی کاموں کے اس مختصر جائزے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ایک باکمال شاعر ہی نہیں باصلاحیت، غیر جانب دار اور باشعور محقق بھی ہیں۔ ان کی زود نگاری نے انھیں سرسری اندازِ نظر اختیار نہیں کرنے دیا بلکہ تحقیقی مضامین میں بھی وہ اعلیٰ معیار قائم رکھنے میں ہر جگہ کامیاب نظر آتے ہیں!

ڈاکٹر مظفر حنفی بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ ان کی تحقیقی و تنقیدی کتابوں میں 'شادؔ عارفی: شخصیت اور فن'، 'نقد ریزے'، 'جہات و جستجو'، 'وضاحتی کتابیات ۱۹۷۶ء تا ۱۹۸۴ء'، 'تنقیدی ابعاد' وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین اور کتابوں کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اردو شاعری کی طرح، اردو تنقید میں بھی انھوں نے ایک منفرد انداز اختیار کر کے لکیر کے فقیر بننے سے خود کو محفوظ رکھا ہے۔ ہم عصر ادب کو سمجھنے اور پرکھنے کے لیے انھوں نے خود اپنے اصول وضع کیے ہیں۔ وہ کسی خاص نظریے کے پیرو نہیں۔ ان کی تنقید میں غیر جانب داری، اعتدال پسندی اور صاف گوئی کے عناصر نمایاں ہیں۔ اپنے تنقیدی نظریات کے سلسلے میں اظہار خیال کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

'میں کسی فن پارے کو اس کے اندر سے برآمد ہونے والی روشنی میں پرکھنے کا قائل ہوں کہ نظریے کی عینک نگاہ میں بالغ نظری کی جگہ کج بینی پیدا کر دیتی ہے۔'' (۱۳)

''نئے ناقد کے لیے وسیع النظری اور غیر جانب داری پہلی شرط ہوگی۔'' (۱۴)

مظفر حنفی بنیادی طور پر تخلیق کار ہیں لیکن ہر تخلیق کار کے اندر ایک ناقد بھی چھپا ہوتا ہے جو اسے تنقید لکھنے پر مجبور کرتا ہے اور اسی سبب سے بعض تخلیق کار اچھے نقاد بھی بن جاتے ہیں اور ایسے ناقد اصول و نظریات کے جال میں قید رہ کر تنقیدی ضروریات و مطالبات کو فن اور تخلیق پر فوقیت دینا پسند نہیں کرتے۔ مظفر حنفی بھی اسی قبیل کے نقاد ہیں۔ انھوں نے ناقدین کی غیر منصفانہ روش، نظریاتی جکڑ بندی اور تنقید کی بے مروتی کے خلاف اپنے مضامین اور اشعار میں آوازِ احتجاج بلند کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کا خیال ہے:

''......میں کبھی کسی نظریاتی گروپ سے وابستہ نہیں رہا ہوں اور اپنے طور پر ہمیشہ آزادانہ اظہار خیال کی کوشش کی ہے۔ جہاں مجھے خامی نظر آئی ہے میں نے اس کے اظہار میں کوئی تکلف نہیں کیا، اور خوبی جہاں کہیں ملی ہے، اس کے اعتراف میں بخل سے کام نہیں لیا۔'' (۱۵)

تنقید کے سلسلے میں مظفر حنفی کے مذکورہ خیالات اور طریقۂ کار کی کارفرمائی ان کی تنقیدی کتب اور مضامین میں نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کا تحقیقی مقالہ 'شادؔ عارفی: شخصیت اور فن' کے بعض ابواب میں تنقیدی تجزیے بھی شامل ہیں۔ انھوں نے شادؔ عارفی کی شاعری پر ناقدین کی آرا کی روشنی میں موضوعات کے لحاظ سے

اشعار کی درجہ بندی کر کے ان کے محرکات اور پس منظر کو ملحوظ رکھ کر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

'شادؔ عارفی: شخصیت اور فن' میں شادؔ عارفی کی عشقیہ غزلوں، طنزیہ غزلوں اور نظموں کے سلسلے میں منظریہ نظمیں، عشقیہ نظمیں اور طنزیہ نظمیں کے عنوان سے اور ان کے علاوہ متفرق شعری تخلیقات مضامین اور خطوط کا تنقیدی تجزیہ کر کے ان کی ہمہ جہت ادبی خدمات کی روشنی میں اردو ادب میں شادؔ عارفی کے مقام کا تعین کرتے ہوئے مظفر حنفی لکھتے ہیں:

''ان تمام اوصاف کے پیش نظر شادؔ عارفی کی مجموعی ادبی حیثیت کا تعین کرنا ہو تو بہت محتاط رہتے ہوئے بھی انھیں میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے بعد اردو ادب کے گنتی کے ان چند بڑے اور ممتاز فن کاروں کی صف میں نمایاں جگہ دینی ہوگی جن کی تعداد دس پندرہ سے زیادہ نہیں ہے۔'' (۱۶)

'نقد ریزے' مظفر حنفی کے تنقیدی و تحقیقی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ مارچ ۱۹۷۸ء میں یوپی اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع شدہ ۲۰۶ رصفحات پر مشتمل اس مجموعۂ مضامین میں ۲۳ رمضامین شامل ہیں جن میں درج ذیل مضامین تنقیدی نوعیت کے ہیں:

شفا گوالیاری کا فن	کوثر چاند پوری شعلہ سنگ کی روشنی میں
آواز کا متلاشی خورشید احمد جامی	مجتبیٰ حسین بحیثیت خاکہ نگار
طنز اور بسمل سعیدی	گوپال متّل بحیثیت نثر نگار
نئی اور پرانی تنقید	اردو ادب میں ہندوستانی عناصر کی تلاش
اردو شاعری کے نئے ابعاد	غالبؔ اور نئے شاعر
تجریدی شاعری اور ترسیل کا مسئلہ	جدیدیت ایک تعارف

مذکورہ تنقیدی مضامین میں سے بیشتر اچھوتے موضوعات سے متعلق ہیں۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۷ء کے درمیان تحریر کیے گئے یہ مضامین مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں چار مضامین ریڈیو پروگرام کے لیے لکھے گئے ہیں جو مختصر بھی ہیں اور تشنہ بھی ہیں اور ان میں موضوع سے پورے طور پر انصاف نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن جو مضامین طویل ہیں، ان میں موضوع سے متعلق نئے انداز سے، مکمل طور پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے، جن کے مطالعہ سے مظفر حنفی کی تنقیدی بصیرت و صلاحیت کا معترف ہونا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر مظفر حنفی کے تحقیقی، تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ 'جہات و جستجو' میں درج ذیل مضامین تنقیدی نوعیت کے حامل ہیں:

اردو شاعری اور ہندوستانیت	نئی غزل کے بیس سال (ہندوستان میں)
غزل کی زبان	جنگل کے مناظر اردو شاعری میں

کیفی اعظمی: مثلث کا تیسرا زاویہ	ایک اور تنقید گزیدہ شاعر: اعزاز افضل
حسرت کی شخصیت	ڈاکٹر عابد حسین بحیثیت طنز و مزاح نگار

'جہات و جستجو' میں شامل مضامین پر اظہار رائے کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں کہ:

''یہ مضامین جو مختلف موضوعات و جہات پر مشتمل ہیں 'نقد ریزے' کی اشاعت کے بعد کی مختصر مدت میں معرض وجود میں آئے ہیں اور اسی سے ڈاکٹر مظفر حنفی کی محنت و لگن، تیز نگاہی اور زود نگاری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ زود نگاری اکثر سرسری اندازِ نظر کا باعث ہوتی ہے مگر مظفر حنفی کی پختگی نے ہر جگہ اعلیٰ معیار کو قائم رکھنے میں مدد دی ہے۔'' (۱۷)

ڈاکٹر مظفر حنفی کے تنقیدی مضامین کا تیسرا مجموعہ 'تنقیدی ابعاد' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعہ میں مختلف نئے موضوعات پر ۱۷ تنقیدی مضامین شامل ہیں جن میں نصف سے زیادہ تحریریں مختلف سمیناروں کے لیے لکھی گئی ہیں۔ ان میں بھی ان نکات پر روشنی ڈالی گئی ہے جن پر عام ناقدین کی نگاہ نہیں پہنچ سکی ہے۔

'تنقیدی ابعاد' میں شامل مضامین کے عنوانات سے ہی اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے موضوعات نئے ہیں اور ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مظفر حنفی نے پیشہ ورانہ تنقید سے ہٹ کر صاف ستھرے انداز میں موضوع سے متعلق نئے نئے گوشوں پر روشنی ڈالی ہے، اور ایک منفرد انداز سے قاری کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے۔

ان کی تنقیدی تحریروں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک متوازن اندازِ نظر کے حامل نقاد ہیں۔ انھوں نے تنقید کے لیے نظریہ کی پابندی کے بجائے فن پارے کی صفات کو ملحوظ رکھ کر اپنی آرا کا اظہار کیا ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں وہ کوثر چاند پوری سے متعلق اپنی متوازن رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''میں نہیں کہتا کہ کوثر صاحب نے بہت اچھا لکھا ہے لیکن انھوں نے بہت زیادہ لکھا ہے۔ بڑے خلوص کے ساتھ لکھا ہے۔ اس بات سے نہ میں انکار کر سکتا ہوں نہ کوئی ناقد، اب وہ اس منزل پر آ گئے ہیں کہ ان کے تخلیق کردہ تمام ادبی سرمائے کا جائزہ لیا جائے، چھان پھٹک کر اچھی اور بُری چیزوں کی نشاندہی کی جائے، ان کی اچھی چیزوں کا ان کے کل میں کیا اوسط ہے اور دوسرے اہم افسانہ نگاروں کی بہ نسبت انھوں نے کتنا کم یا زیادہ اچھا لکھا ہے اس کا فیصلہ کیا جائے کہ کسی فن کار کے مقام کا تعین کرنا اس کے بغیر ناممکن ہے۔ ظاہر ہے اس طرح چھان بین کرتے ہوئے کوثر صاحب کی خامیاں بھی منظرِ عام پر آئیں گی اور خوبیاں بھی۔'' (۱۸)

اس طرح مظفر حنفی کی تنقیدی تحریروں میں اعتماد، اعتدال، بے باکی، بے ساختگی اور سنجیدگی نمایاں

نظر آتی ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ان کے اشعار کی طرح ان کی تنقیدی تحریروں کا لہجہ و انداز بھی بالکل منفرد ہے۔

○○○

حوالہ جات:

۱۔ تعارف، کرشن چند، مشمولہ: دوغنڈے، ص ۹
۲۔ پیش لفظ، اینٹ کا جواب، فراق گورکھپوری، ص ۵
۳۔ پیش لفظ، دیدۂ حیراں، کنہیالال کپور، ص ۸
۴۔ پیش لفظ، دوغنڈے، ص ۳
۵۔ نقد ریزے، مظفر حنفی، ص ۱۵۲
۶۔ اعتراف، دیدۂ حیراں، مظفر حنفی، ص ۹
۷۔ نقد ریزے، ص ۱۵۲
۸۔ افسانہ غُبارِ آئینۂ دل، مشمولہ: اینٹ کا جواب، ص ۲۱
۹۔ شاد عارفی: شخصیت اور فن، پیش لفظ
۱۰۔ دیباچہ، شاد عارفی: شخصیت اور فن، ص ۱۲
۱۱۔ دیباچہ، شاد عارفی: شخصیت اور فن، ص ۱۲۔ ۱۳
۱۲۔ تذکرہ آثار الشعرا، جہات و جستجو، مظفر حنفی، ص ۱۰۲
۱۳۔ شرح گفتار، مشمولہ: نقد ریزے، ڈاکٹر مظفر حنفی، ص ۹
۱۴۔ شرح گفتار، مشمولہ: نقد ریزے، ڈاکٹر مظفر حنفی، ص ۹
۱۵۔ شرح گفتار، مشمولہ: نقد ریزے، ڈاکٹر مظفر حنفی، ص ۹
۱۶۔ شاد عارفی: شخصیت اور فن، ص ۳۷۹
۱۷۔ پیش لفظ، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، مشمولہ: جہات و جستجو، مظفر حنفی، ص ۷
۱۸۔ کوثر چاند پوری شعلہ سنگ کی روشنی میں، مشمولہ: نقد ریزے، ص ۳۵

○○○

تابش مہدی
نئی دہلی

مظفر حنفی کی 'کتاب شماری'

پروفیسر مظفر حنفی ہمارے عہد کے ممتاز رجالِ ادب میں ہیں۔ انھوں نے اپنی بے پناہ تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی کاوشوں اور متنوع علمی و ادبی سرگرمیوں سے اُردو دنیا کے ایک وسیع حلقے کو اپنی طرف متوجہ کرلیا ہے۔ شعر و ادب سے ان کی غیر مشروط وابستگی، مسلسل قلمی و فکری جد و جہد اور ان کے مزاج کی انفرادیت نے ان کی شہرت و ناموری کو غیر معمولی وسعت دے دی ہے۔ جہاں اور جس علمی و ادبی حلقے میں وہ پہنچتے ہیں اُنھیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے اور لوگ اُنھیں عزّت و وقار کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اربابِ علم و دانش کے لیے یہ بات مزید وجہِ کشش بنتی ہے کہ مظفر حنفی ادبی و تنقیدی حلقوں میں پائے جانے والے تحزبات اور گروہ بندیوں سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ وہ ادب میں کسی بھی قسم کی گروہ بندی یا تحزّب کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ حرّیتِ فکر سے کام لیا ہے اور آزادانہ طور پر لکھنے اور بولنے کی کوشش کی ہے۔ یہ حریتِ فکر ان کی شاعری میں بھی ملتی ہے اور نثر میں بھی۔ اُنھیں جس شاعر یا ادیب کے ہاں جو خوبی یا خامی نظر آتی ہے، اس کا وہ برملا اظہار کرتے ہیں۔ خواہ وہ شاعر یا ادیب کسی بھی طائفے سے تعلق رکھتا ہو۔ میرا خیال ہے کہ ان کے اِس رویّے نے انھیں نقصان بھی پہنچایا ہے۔ اس لیے کہ یہ تحزّب، گروہ بندی، انجمن پسندی اور ادارہ سازی کا دور ہے۔ ان سے کٹ کر کوئی شاعر یا ادیب فوائد حاصل نہیں کرسکتا۔

پروفیسر مظفر حنفی گرچہ بنیادی طور پر تخلیق کار ہیں، لیکن ان کی ادبی و فکری زندگی میں شاعری کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ فکر کا تنوع، اسلوب کی ندرت اور بیان کی تازگی ان کی شناخت بن چکی ہے۔ اُنھوں نے اُردو غزل کو جس بانکپن اور توانائی سے نوازا ہے اس کے لیے وہ پورے ہندوستان و پاکستان بلکہ اُردو کی ادبی دنیا میں شہرت رکھتے ہیں۔ لیکن ان کا دائرہ یہیں تک محدود نہیں ہے۔ شعر و غزل سے ہٹ کر اُنھوں نے علم و ادب کے دوسرے شعبوں میں بھی فکر و نظر کی قندیلیں روشن کی ہیں اور اپنی فہم و دانائی کا لوہا منوایا ہے۔ اب تک ان کی کم و بیش چھ درجن کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ ان کی بعض تنقیدی و تحقیقی کتابیں ادب و تنقید کی دنیا میں مراجع کی حیثیت حاصل

کرچکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ترتیب و تدوین کی منفرد صلاحیتوں سے بھی نوازا ہے۔ اس ذیل میں بھی ان کی متعدد کتابیں علم و ادب کی دنیا میں مقبول ہیں۔ بائیس جلدوں پر مشتمل 'وضاحتی کتابیات' ان کا ایسا تدوینی کارنامہ ہے جسے علم و ادب کی تاریخ میں تا دیر فراموش نہ کیا جاسکے گا۔ اس میں اُنھوں نے ۱۹۷۶ء سے ۱۹۹۹ء کے دوران ہندوستان میں اردو میں شائع ہونے والی تقریباً پچیس ہزار علمی، ادبی، تنقیدی، تحقیقی اور تاریخی کتابوں کے سلسلے میں جو ضروری معلومات فراہم کی ہیں، وہ مصنفین اور ریسرچ اسکالروں کے لیے ایک بیش بہا خزانہ ہے۔

ہم پروفیسر مظفر حنفی کی خواہ کوئی تخلیق دیکھیں، خواہ تصنیف یا تدوین و ترتیب، ان کی سوچ کی بالیدگی، مزاج کی انفرادیت اور طریق کار کی ندرت ہر جگہ جلوہ گر نظر آئے گی۔ ان کی جو چیز بھی سامنے آتی ہے، اچھوتی اور منفرد ہوتی ہے۔ ان سب کے ساتھ ساتھ اس میں سہلِ ممتنع کی سی کیفیت ہوتی ہے۔ ابھی حال ہی میں کچھ دنوں پہلے ان کی ایک کتاب 'کتاب شماری' کے نام سے آئی ہے۔ یہ کتاب بھی ان کے مزاج کی انفرادیت کی مظہر ہے۔

'کتاب شماری' چار سو چوبیس صفحات پر مشتمل صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے ایک نہایت اہم، جاذبِ نظر اور پرکشش کتاب ہے۔ اِسے دلّی کے معروف اِشاعتی اِدارے ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نے اپنے روایتی معیار اور گٹ اپ کے ساتھ بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ یہ دراصل بیسویں صدی عیسوی کے ربع آخر ۱۹۷۶ء سے ۱۹۹۹ء کے دوران اُردو زبان، ادب، تنقید، تحقیق، سوانح، لسانیات، سماجی علوم، سیاسیات، تعلیم، سائنس، طب اور مذہب سے متعلق شائع ہونے والی کتابوں کا اشاریہ ہے۔

پروفیسر مظفر حنفی کی یہ بات اپنے اندر غیر معمولی وزن رکھتی ہے اور غور و فکر کی دعوت بھی دیتی ہے کہ موجودہ ترقی یافتہ دور میں جب کہ چھوٹی سے چھوٹی بات چند سکنڈ میں ساری دنیا میں پھیل جاتی ہے اور یورپ و امریکا سے شائع ہونے والی ہر کتاب مختصر سی مدّت میں عام ہوجاتی ہے، اردو کتابوں کا معاملہ ناگفتہ بہ ہے۔ اِس مظلوم زبان کی تمام کتابوں کا حصول اور ان سے استفادہ تو بہت دور کی بات ہے۔ ان کے ناموں اور موضوعات تک سے واقفیت نہیں ہو پاتی۔ یہ چیز شائقین اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے بہر حال تکلیف دہ ہے۔ پروفیسر مظفر حنفی کا یہ بڑا اہم کارنامہ ہے کہ انھوں نے اردو زبان و ادب کے شائقین اور محققین و مصنفین کی دشواریوں کو شدّت کے ساتھ محسوس کیا اور کسی نہ کسی درجے میں ان کی تلافی کی کوشش کی۔ 'کتاب شماری' اس کی بہترین مثال ہے۔

پروفیسر مظفر حنفی نے کتاب کی ترتیب یہ قائم کی ہے کہ سب سے پہلے انھوں نے کتابوں کا مجموعی اعتبار سے سال بہ سال جائزہ لیا ہے، ہر سال کے جائزے میں انھوں نے اس بات کا التزام کیا ہے کہ کتابوں کی ترتیب انھوں نے حروفِ تہجی کے اعتبار سے رکھی ہے تاکہ استفادے میں سہولت رہے۔ اس کے بعد اُس سال کی کتابوں کے اندراجات کو شِقوں میں تقسیم کیا ہے اور بتایا ہے کہ کن کن شقوں میں کن موضوعات سے متعلق

کتابیں ہیں۔ اِس تفصیلی گفتگو کے بعد بتایا ہے کہ اِس سال شائع ہونے والی کتابوں کی مجموعی تعداد کیا ہے اور ان میں موضوعاتی اعتبار سے کتابوں کی کیا تعداد ہے اور ان میں اوّلیت کا درجہ کن موضوعات کو حاصل ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۷۶ء کو لے لیجیے:

۱۹۷۶ء میں مصنف کی تحقیق کے مطابق کل ۳۸۰ر کتابیں شائع ہوئیں۔ انھیں انھوں نے سولہ شقوں میں تقسیم کیا ہے۔ اولین نو (۹) شقوں میں اوّلیت ادبی تنقید کو حاصل ہے۔ اس کے بعد علی الترتیب شاعری، ناول، افسانہ، ڈراما، مضامین، انشائیہ، خاکہ، سفر نامہ، مکتوبات اور زبان کا نمبر آتا ہے۔ بعد کی سات شِقوں میں سماجی علوم، سائنسی علوم، تاریخ، تہذیب، سیاسیات، صنعت وحرفت، مذہبیات اور بچوں کے ادب سے متعلق کتابیں ہیں۔ پھر فہرست دے کر بتایا ہے کہ اس سال ادبی تنقید وتحقیق میں کل ۸۷ر کتابیں شائع ہوئیں، صنفِ شاعری میں ۱۰۱، ناول میں ۳۷، افسانوں کی ۳۴، ڈراموں کی ۹، مضمون، انشائیہ اور خاکہ کی صنف میں ۸، سفر نامے کے ذیل میں ۲، مکتوباتی ادب میں ۳ اور اُردو زبان کے موضوع پر ۱۷ر کتابیں شائع ہوئیں۔ اسی طرح تاریخ، تہذیب اور سیاست کے موضوع پر ۲۰ر کتابیں شائع ہوئیں۔ تعلیم کے موضوع پر ۳، صنعت وحرفت اور کامرس سے متعلق ۶، سائنسی علوم سے متعلق ۷، مذہبیات کے موضوع پر ۲۱، بچّوں کے ادب سے متعلق ۳۸ اور متفرقات کے ذیل میں ۶ر کتابیں شائع ہوئیں۔ اس طرح ان کی مجموعی تعداد ۳۸۰ ہوئی۔

ہر سال کی شائع شدہ کتابوں کے اشاعتی جائزے کے بعد پروفیسر مظفر حنفی نے ناشرین کی ترجیحات اور شائقینِ کتب کے ذوق ورجحان کو بھی موضوعِ گفتگو بنایا ہے اور اِن ترجیحات اور ذوق ورجحان کے اسباب وعلل پر روشنی ڈالی ہے۔ اپنے جائزے میں انھوں نے اس بات کو بھی دیکھا ہے کہ اِن شائع شدہ کتابوں میں کتنی کتابیں سرکاری اداروں اور ریاستی اردو اکادمیوں نے شائع کیں اور کتنی ان کے جزوی مالی اشتراک سے شائع ہوئیں اور یہ بھی کہ کتنی کتابیں شخصی یا پرائیویٹ اشاعتی اداروں نے شائع کیں اور کتنی مصنفین، مرتبین یا مترجمین نے۔

مذکورہ بالا تفصیلی جائزوں کے بعد موضوعاتی اعتبار سے مصنفین کے ناموں کے ساتھ کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔ یہاں بھی حروفِ تہجی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

بہ ظاہر ’کتاب شماری‘ ایک فہرستِ کتب ہے، تکنیکی اعتبار سے اِسے اشاریے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دی جاسکتی اور مصنف نے اسے تیار بھی اسی حیثیت سے کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب تیار کرکے پروفیسر مظفر حنفی نے شائقینِ مطالعہ، مصنّفین، محققین اور ریسرچ اسکالروں کو بہت بڑی مدد بہم پہنچائی ہے۔ اس کی صحیح قدر وقیمت کا احساس وہی لوگ کرسکیں گے، جو اس دشت کے سیاح ہیں اور جنھیں آئے دن اس قسم کی پریشانیوں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے جس کی کسی نہ کسی درجے میں تلافی کی کوشش اس کتاب کے ذریعے کی گئی

ہے۔ بلاشبہہ وہ اپنی اِس منفرد دریافت کے لیے پورے اہلِ علم طبقے کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں۔

پروفیسر مظفر حنفی نے اپنی اِس کتاب کا انتساب اپنے خالق ومالک رب ذوالجلال والاکرام کے نام کیا ہے۔ اِس کا اظہار اس طرح کیا ہے:

خدائے عزّ وجل تو جاوداں کرتا ہے لفظوں کو   مظفر اپنی ہر تخلیق تیرے نام کرتا ہے

اس انتساب سے بھی مظفر حنفی صاحب کی طباعی اور جودتِ فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس سے ان کی اس بلند خیالی، تعمیری سوچ اور ذہن وفکر کی سمت کا اندازہ کرنا مشکل نہیں رہتا جو ان کی اس علمی کاوش میں کارفرما رہی ہے۔ دراصل ان کی علمی، ادبی اور تحقیقی زندگی کا یہی وہ رویّہ ہے جو اُنھیں آج کے بے شمار تخلیق کاروں، ناقدوں اور محققوں کی بھیڑ میں ممتاز ونمایاں کرتا ہے۔



پروفیسر صغیر افراہیم
شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مظفر حنفی کی افسانہ نگاری

اکثر یہ ہوتا ہے کہ ممتاز شخصیتوں کی بعض دوسری تخلیقات ان کی تخصیصی شہرت کے سامنے ماند پڑ جاتی ہیں حالاں کہ وہ اُن کی مجموعی شخصیت کے اہم عناصر میں شامل ہوتی ہیں۔ اس کی ڈھیروں مثالیں ہیں۔ پروفیسر مظفر حنفی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ ان کا افسانوی ادب، غیر افسانوی ادب اور معروف اشعار کے جم غفیر میں دب کر رہ گیا ہے۔ مصنف کے نصف صدی کے ادبی سفر کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ابتداءً افسانے لکھے اور ۱۹۶۰ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ بعد میں انھوں نے اس صنف ادب سے چشم پوشی اختیار کر لی۔ آج کے ادبی منظر نامے پر وہ ایک ممتاز اور منفرد لب ولہجہ کے شاعر کی حیثیت سے چھائے ہوئے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ عہد حاضر کے اس قد آور فن کار کے غیر معروف گوشہ یعنی افسانہ نگاری پر بھی توجہ دی جائے تا کہ مظفر حنفی کی مجموعی تخلیقی شخصیت پر مزید تحقیقی اور تنقیدی کام کرنے میں آسانی ہو سکے۔

مظفر حنفی کا پہلا افسانوی مجموعہ 'اینٹ کا جواب' ہے جس میں اکیس افسانے شامل ہیں۔ تیسرا مجموعہ 'دیدۂ حیراں' چوبیس افسانوں پر مشتمل ہے۔ یہ ۱۹۷۰ء میں 'فن کدہ' سیہور سے شائع ہوا۔ ان میں شامل افسانوں کے علاوہ 'ڈربہ'، 'ملا کی دوڑ'، 'ستاروں کا کھیل' اور 'ہم شریف ہیں' ادبی حلقہ میں بہت پسند کیے گئے، جو موصوف کے افسانوں کے تیسرے مجموعے 'دوغنڈے' میں شامل تھے جسے ۱۹۶۹ء میں نصرت پبلشرز نے لکھنؤ سے شائع کیا تھا۔ کنہیا لال کپور 'دیدۂ حیراں' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ میں نے مظفر حنفی کا کلام دیکھا تھا، ان کے افسانے پڑھ کر میری نظروں میں ان کی توقیر دوچند ہوگئی۔ افسانوں کی فنی اور فکری خوبیوں کو وہ مظفر حنفی ہی کے اشعار سے واضح کرتے ہیں۔

اُس کے دل و دماغ کی دُنیا ہی اور ہے
ظالم کے سوچنے کا طریقہ ہی اور ہے
مرتے ہیں لوگ زُلف و لب و رُخ کے نام پر

افسانہ

حالات کا اگرچہ تقاضہ ہی اور ہے

واقعی مظفر حنفی کے سوچنے کا طریقہ منفرد ہے۔ وہ زندگی کو اُس کی تمام اچھائیوں ، بُرائیوں کے ساتھ دیکھتے ہیں اور ستم ظریفیوں کو بے نقاب کرنے کا جتن کرتے ہیں۔ اس کے لیے وہ اکثر افسانے کے اختتام کو ایک ناگہانی مگر موثر موڑ دیتے ہیں۔ براہِ راست یا بالواسطہ طور پر سماجی ناانصافی اور دقیانوسی اقدار پر تیکھے انداز میں طنز کے جواز تلاش کر لیتے ہیں جو قاری کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

'اینٹ کا جواب' کے اکیس افسانوں میں 'ایمان کی بات'، 'نقش فریادی'، 'غبار آئینہ دل'، 'مولا نا منے'، 'مہمان'، 'دو ٹکے کا آدمی'، 'موڑ' اور 'منت کی چادریں' کامیاب افسانے ہیں۔ ان میں حُسن بیان کی نغمگی، تخیّل کی بلند پروازی اور احساس کی لطافت جلوہ گر ہے۔ ان سبھی افسانوں میں واقعات کی خوب صورت ترتیب سے پلاٹ کی تعمیر کی گئی ہے۔ مناظر کی دل کش عکاسی ہے۔ زبان میں سلاست اور روانی کے ساتھ محاورات اور تشبیہات کا بھی استعمال نظر آتا ہے۔ کردار متحرک اور ذہن و دل پر چھا جانے والے ہیں۔ خاص طور سے 'ایمان کی بات' کا 'نذیر بابا' اپنی شباہت، حماقت اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے قاری کے ذہن سے محو نہیں ہونے پاتا ہے۔ یہ افسانوی کردار فتح پور ہسوہ تک محدود نہ رہ کر، ہر بستی ، ہر محلہ کا کردار بن جاتا ہے اور قاری کو اپنے بچپن کی یاد دلاتا ہے:

''ہاں! یہ تھے نذیر بابا، جو بچپن میں ہمارے لیے کسی ہوّا سے کم نہ تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اُس وقت ہسوہ میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جس کے بچوں کے دل پر نذیر بابا کی ہیبت کا سکہ نہ بیٹھا ہو۔ ہم لوگ گولیاں کھیل رہے ہوتے اور اچانک نذیر بابا کہیں سے الہ دین کے طلسماتی دیو کی طرح برآمد ہوتے...... ''کیوں بچو! یہ کیا ہو رہا ہے؟'' کہہ کر کچھ ایسے خوف ناک انداز میں دیکھتے کہ بچے سٹی پٹی بھول جاتے اور گولیاں وغیرہ چھوڑ چھاڑ کر اپنی جان لے کر بھاگتے۔''

عوامی لب ولہجہ اور روزمرہ سے اُبھارا گیا نذیر بابا کا کردار قاری کے ذہن پر اپنی ایک الگ چھاپ چھوڑتا ہے جو کریہہ ہونے کے باوجود بے حد عزیز ہے۔ اردو فکشن میں ایسے بدہیئت کرداروں کی کمی نہیں ہے جو اپنی گوناگوں صفات کی بدولت منظر پر چھا جاتے ہیں، مثلاً پنڈت رتن ناتھ سرشار کا خوجی ؔبُزدل، پستہ قد اور کم رو ہے۔ اُسے اپنی جوانی پر ناز ہے اور اپنے حُسن پر آپ عاشق ہے۔ اس حد تک بدمزاج ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر لوگوں سے جھگڑا مول لیتا ہے اور قرولی بھونک دینے کی دھمکی دیتا ہے۔ مصنف نے اُس کا سراپا اس طرح بیان کیا ہے:

''پستہ قد، دم نہ خم، پیدائشی گنجا، آنکھیں تیکھی، بلا کا احمق، زبان میں روانی کہ لفظ پیچھے رہ جائے اور زبان آگے۔ دماغ میں شر، پلّے درجے کا ڈرپوک، مگر شرارتی چنڈو باز، پیش بندیوں میں

ماہر، منظر کشی میں طاق، تنک مزاج اور غصہ ور، جذباتی انداز سے سرشار، جنون اور غصہ کی حالت میں قرولی کی تلاش، بہادری کا جذبہ لیکن ڈرپوک۔''

اسی طرح کرشن چندر اپنے ناول 'شکست' میں ایک ثانوی کردار، دُرگا داس سے متعارف کراتے ہیں جسے 'اختیار کی تصویر اور مصر کی ممی نے مل کر جنم دیا تھا'۔ ملاحظہ ہو:

''اُس کے شانے فراخ تھے لیکن دھڑ سوکھا ہوا۔ کسی سوکھے ہوئے درخت کی جڑوں کی طرح جس کے پتے ابھی تک سبز ہوں۔ بائیں ٹانگ سے لُنجا، ایک آنکھ اور اُس میں سے ہر وقت پانی رستا تھا۔ اوپر کا ہونٹ پتلا اور خوب صورت طریقے پر خمیدہ، نچلا بے حد بے ہنگم اور موٹا جس میں سے دو دانت باہر کو ہر وقت نکلتے رہتے تھے۔''

مظفر حنفی کے نذیر بابا میں بدصورتی اور بدہیئتی پر خوب صورتی کا ہلکا سا پرتو بھی نظر آتا ہے:

''قد چھ فٹ کے قریب، بدن پر گوشت برائے نام ہی رہ گیا تھا لیکن اس کے باوجود ہڈیاں کچھ اتنی چوڑی تھیں کہ دیکھنے میں دُبلے نہ معلوم ہوتے تھے۔ چوڑے چکلے شانوں پر اتنا بڑا سر جو کاندھوں کی تقریباً تمام چوڑائی گھیرتا تھا۔ جبڑے کافی اُٹھے ہوئے جن کے درمیان پھولی پھولی موٹی سی ناک، جس کے نتھنے دُور سے کھلے ہوئے تھے، عجیب کریہ المنظر سی معلوم ہوتی تھی۔ ہونٹ کافی موٹے جن میں بالائی، جوانی کے کسی ہنگامہ کی یادگار کے طور پر کٹا ہوا اور نچلا تقریباً ٹھوڑی تک لٹکا ہوا، سر انڈے کی طرح مونڈا ہوا، رہی سہی کسر دو ٹوٹے ہوئے دانت اور دو لمبے لمبے کان پوری کرتے تھے جن کی لویں بدن کی ذرا سی حرکت پر گوشواروں کی طرح لرزنے لگتی تھیں۔''

خوجیؔ لکھنؤ کی زوال پذیر معاشرت کا نمائندہ بن کر اُبھرتا ہے۔ دُرگا داس ڈوگرہ شاہی اور سرمایہ داری میں پروان چڑھنے والا ایک ایسا حسّاس کردار ہے جو غربت و افلاس کے خلاف کھڑا ہوتا ہے تو کچل دیا جاتا ہے، جب کہ نذیر بابا کی مضحکہ خیز شبیہ آہستہ آہستہ ہمدردی اور اپنائیت کی شکل اختیار کرتی جاتی ہے۔ مظفر حنفی کا یہ کمال مجموعہ 'دیدۂ حیراں' میں اور بھی نکھرا ہے۔ وہ عموماً اپنے کرداروں کو فضا اور ماحول میں تحلیل کرتے ہوئے اُس کی اچھائیوں اور بُرائیوں کا عکس غیر جانب داری سے اُبھارتے ہیں۔

یکم اپریل ۱۹۳۶ء میں مظفر حنفی نے اس دنیا میں آنکھ کھولی تو ملک میں نئے ادبی انقلاب کا اعلان ہو رہا تھا کہ اب وہ ادب کھرا ہوگا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تفسیر کی روح ہو اور زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو۔ اس فضا میں ہوش سنبھالتے ہوئے ۱۹۵۳ء میں انھوں نے پہلا افسانہ لکھا جو اپنے عہد کی بدلتی ہوئی صورت حال کی نمائندگی کرتا ہے۔ ترقی پسند ادبی تحریک سے بے حد متاثر، مظفر حنفی کے تمام افسانے مارکسی یا

اشتراکی منشور نامے سے نہیں مگر سماجی اور اقتصادی اثرات سے ضرور متاثر ہیں۔ انھوں نے ہندوستانی تہذیب وثقافت کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہوئے انسان دوستی، امن، مساوات اور خیر سگالی جیسی قدروں کو احاطۂ تحریر میں لیا ہے اور انسانی کرب کو ہر زاویے سے اُجاگر کیا ہے۔ اس کرب کو مصنف نے اس شدّت سے محسوس کیا ہے کہ بیانیہ میں اکثر راوی، مصنف کی شکل میں آجاتا ہے۔ 'نقش فریادی' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''میں اپنے فن کے ساتھ غدّاری کیسے کروں؟ مجھے اپنے ماحول میں تو حقیقی مسرت کہیں نظر نہیں آتی۔ ہر فرد اپنی جگہ مضطرب ہے اور رنجور۔ آنسو نہیں نکلتے تو بے چارگی سے ہنستے ہیں اور ہنسی نہیں آتی تو رونے لگتے ہیں۔ سرور کیا ہے؟ کیف کیا چیز ہے؟ نشاط کس چڑیا کا نام ہے؟ پھر میں کیسے لکھوں؟ جیتی جاگتی دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر کے حقیقت پسندی کا گلا کیسے گھونٹ دوں۔''

فکری اور فنی اعتبار سے ہمکنار، مظفر حنفی کا مشہور افسانوں کا مجموعہ 'دیدۂ حیراں' ۱۹۷۰ء میں منظر عام پر آیا جب کہ اس میں شامل سبھی افسانے ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۸ء کے دوران لکھے گئے تھے اور اسی درمیان مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوئے۔ ان افسانوں کی فضا رومانی ہوتے ہوئے بھی حقیقت اور فطرت کا امتزاج ہے۔ افسانہ نگار نے سادہ اور سلیس زبان میں جو سوالات قائم کیے ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں کہ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ حقیقت اور واہمہ کے درمیان کیا تعلق ہے؟ انسانی خواہشات، نفسیات اور محبت کے مابین کیا رشتہ ہے؟ سمجھتے ہوئے بھی انسان اپنے چاروں طرف بچھے ہوئے جال سے نکلنے کی کوشش کیوں نہیں کرتا؟

'دیدۂ حیراں' کی کئی کہانیاں قاری کو حیرت واستعجاب میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ 'محبوب بانہہ کٹا' کا مرکزی کردار محبوب ہے۔ کہانی واحد متکلم میں بیان ہوئی ہے۔ راوی اور مرکزی کردار کے وسیلے سے ثقافتی منظر نامے کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ عنوان میں اختراع ہے۔ لہجہ میں ایمائیت اور طنز نمایاں۔ 'بوجھل پردہ۔ ننگی ذہنیت' میں اس طبقہ پر بالواسطہ طریقہ سے روشنی ڈالی گئی ہے جو مہذب معاشرے میں معتوب ہے۔ دلچسپ انداز اور حسین مناظر کے سہارے 'کوٹھے' پر حصول علم کی للک کو اس طرح واضح کیا گیا ہے کہ نفسیاتی گرہیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ 'دل اور دل' کا موضوع تلاش معاش ہے۔ نئی نسل کے دو شاعر کس طرح ملازمت کے حصول میں سرگرداں رہتے ہیں، اسی تگ ودو کو مصنف نے نہایت دلچسپ انداز میں افسانوی رنگ میں ڈھال دیا ہے۔ پلاٹ چُست، فضا پُر اثر اور زبان بامعنی ہے۔ افسانہ 'احسان مند' دیہی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ پریم چند کے عہد میں استحصالی نظام نہایت مضبوط تھا جسے کولونیل سسٹم کی سرپرستی حاصل تھی۔ آزادی کے بعد اُس نے اپنا چولا بدل لیا۔ بدلے ہوئے نظام میں رامو مویشیوں کو چرا رہا ہے لیکن وہ اس کی ملکیت نہیں۔ اس کی اپنی چراگاہ بھی نہیں۔ گوجر جابر ہے البتہ پٹواری کی سوچ بدل گئی ہے۔ آزاد ہند کے دیہی معاشرے کی اس ترقی پذیر

صورت میں ان گنت سوالات ہیں جو اس طرح قائم کیے گئے ہیں کہ حسّاس قاری ششدر رہ جاتا ہے۔ 'رات کا گاہک' صنعتی شہر کانپور کے مُول گنج کی عالیشان عمارت کی تیسری منزل سے شروع ہوتا ہے۔ جسم فروش کملا ہر روز اپنی دوکان سجاتی ہے۔ طرح طرح کے گاہک آتے ہیں اور اُس کے جسم کو روندتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ مصنف نے یہ نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

''عام طور پر جو خریدار اس کے یہاں آتے تھے وہ اگر باذوق ہوتے تو پہلے اس سے داغؔ یا غالبؔ کی ایک آدھ غزل سنتے اور ساتھ ہی ساتھ اسکاچ وہسکی سے شغل فرماتے، پھر جب سرور میں آتے تو اس سے اپنے والہانہ عشق کا اظہار کرتے۔ رفتہ رفتہ بے تکلف ہو جاتے اور آخر کچھ دیر بعد جب جذبات نفسانی خواہشات کی بھٹّی میں تپ کر سرخ ہو جاتے تو وہ انسانیت اور تہذیب کا لبادہ اُتار کر بالائے طاق رکھ دیتے اور کسی وحشی درندے کا روپ دھارن کر لیتے۔ اُسے مسلتے، نوچتے اور وہ دل میں آہوں اور سسکیوں کا طوفان اور ہونٹوں پر تبسم نمایاں کیے یہ سب زیادتیاں برداشت کیے جاتی۔ حتیٰ کہ خریدار یا تو تھک ہار کر ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے زینوں سے نیچے اُتر جاتا یا پھر شراب کا بڑھتا ہوا نشہ اس کے حواس معطل کر دیتا، اور نشے میں دھت وہیں فرش کے کسی کونے میں اوندھے منہ پڑ جاتا اور وہ اپنی جسمانی کوفت اور روحانی کرب کو دور کرنے کے لیے بستر پر پڑ جاتی اور دوسرے دن دوپہر تک پڑی رہتی۔''

تکان تو مجبوراً دور ہو جاتی ہے مگر روح بے چین رہتی ہے۔ ایک دن صبح لاؤڈ اسپیکر پر، پُرشور انداز میں اعلان کیا جاتا ہے کہ دیش کے مشہور لیڈر شوبھت چند، جو خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے ہمیشہ سرگرم رہے ہیں، آج دس بجے دن میں تقریر کریں گے۔ سب سے درخواست ہے کہ پریڈ گراؤنڈ پر جمع ہو کر اُن کے بصیرت افروز خیالات سے مستفید ہوں۔ کملا تھکن اور نیند بھول جاتی ہے۔ بے چینی اور اضطراب بڑھتا ہے۔ بلکہ جھنجلا کر کراہنے لگتی ہے۔ وہ رات والے وحشی گاہک کو دل ہی دل میں کوستی ہے کہ جس نے اُس کی بوٹی بوٹی نوچ کر جسمانی اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔

پبلک کی سہولت کے لیے جگہ جگہ لاؤڈ اسپیکر لگا دیے گئے تھے جن پر شوبھت مہاراج کی تقریر شروع ہوتی ہے۔ وہ عورتوں کی کسمپرسی اور پھر طوائفوں کی المناک زندگی کا خاکہ بیان فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ مجھے اپنے دیش کی ماؤں کی یہ تذلیل ہرگز گوارہ نہیں ہے۔ کملا کا چہرہ فرط مسرت سے کھل اُٹھتا ہے اور جب تقریر میں انھوں نے:

''ایک ایسے نظام حکومت کی تمنا ظاہر کی جس پر عمل کرتے ہوئے ایک قریبی ملک نے اپنے یہاں عصمت فروشی اور سیاہ کاری کو دیش سے نکال دیا تھا تو بے اختیار کملا کا جی چاہا کہ کاش اُس

کے پر نکل آئیں اور اسی وقت اُڑ کر نیتا جی کے پاس پہنچے اور اُن کے چرن پکڑ کر کہے۔’ دیوتا مجھے بھی اس دیش میں پہنچادو‘!‘‘

لاؤڈ اسپیکر پر شوبھت چند کی تقریر سن کر اس کا روم روم ناچ رہا تھا۔ اسی بیچ اعلان ہوا کہ مہاراج کا جلوس شہر کی خاص خاص سڑکوں سے گزرے گا جس میں مُول گنج کا وہ حصّہ بھی شامل تھا جہاں کملا رہتی تھی۔ اس اطلاع پر کہ شوبھت مہاراج کی سواری اِدھر سے گزرے گی، وہ کھِل اُٹھتی ہے۔ گلاب کے بھاری گجرے لیے ہوئے جھروکے میں آجاتی ہے۔ شور سنتے ہی اپنی عقیدت سمیت گلاب کے ہار اُن کی موٹر پر پھینک دیتی ہے، لیکن پھر ان کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اُسے اپنے دل کی حرکت بند ہوتی ہوئی محسوس ہوئی اور اندر ہی اندر یہ آواز اُبھری۔ ’’ہے بھگون! یہ تو رات والا گاہک ہے۔‘‘ زبان وبیان کے اعتبار سے یہ منفرد افسانہ ہے۔ رشتوں کی اہمیت اور ضرورت حد سے تجاوز کر جاتی ہے، یہ افسانہ اُس کی بہترین مثال ہے۔ باپ بیٹی، بھائی بہن، شوہر، بیوی اور پھر اولاد کا رشتہ۔ یہ سب بہت مضبوط ہونے کے باوجود پابند ہیں رسم ورواج، رہن سہن اور طور طریق کے۔ پسند مانع ہوتی ہے، حق کے مطالبات، انصاف کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ مرضی، ہٹ دھرمی بن جائے تو رشتے ٹوٹتے ہیں۔ ذاتی مفادات اور انا کی تسکین، احساسات وجذبات کو فنا کر دیتے ہیں۔ واحد متکلم کے صیغہ میں لکھا گیا یہ افسانہ انھیں تمام رشتوں کو پامال کرنے اور احساسِ تقدس کو دفنانے کی داستان ہے، جسے مظفر حنفی نے نہایت سلیقہ سے صفحۂ قرطاس پر اُتار دیا ہے۔ انداز طنز آمیز، اسلوب سادہ اور عام فہم ہے۔ اس سادگی میں جمالیاتی تاثر کے ساتھ پُرکاری کے بہت سے امکانات پوشیدہ ہیں۔

’سارا لہو گلاب کے چہرے پہ مل دینے‘ والے فن کار کے افسانوں میں سیدھا سادہ بیانیہ انداز بھی ہے اور پیچیدہ مسائل ونفسیاتی کشمکش کے اظہار کے لیے علامتوں کا استعمال بھی۔ پلاٹ کی بُنت بھی اور کردار نگاری کی مرکزیت بھی۔ معنی خیز اشارے بھی اور درمیانی کڑیوں کو ملانے کا سلسلہ بھی۔ بہرحال دو دہائیوں تک اپنے قرب و جوار کے دیہی اور شہری اطراف کے شاخسانوں، حسن وقبح اور احتجاجی منظروں سے افسانوں کے تانے بانے بُننے والے مظفر حنفی نے نہ جانے کیوں اپنی تخلیقی بصیرت کے اظہار کے لیے صنف افسانہ نگاری سے چشم پوشی اختیار کرلی۔ اسباب کچھ بھی ہوں ’اینٹ کا جواب‘، ’دوغنڈے‘ اور ’دیدۂ حیراں‘ کے افسانوں کی قرأت سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مشق جاری رہتی تو پروفیسر مظفر حنفی آج کے معتبر اور مستند افسانہ نگار بھی ہوتے۔

OOO

ابواللیث جاوید
۱۷۔ ایچ، علی اپارٹمنٹ، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی، رابطہ: 9873070412

مظفر حنفی کی افسانہ نگاری

اردو ادب میں افسانوں کی روایت بہت پرانی نہیں ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں افسانہ نگاری نے داستان گوئی کی جگہ لے لی۔ داستانوں کا رواج شاہوں کے درباروں، جاگیرداروں کی محفلوں میں عام تھا اور تفریح کا یہی واحد وسیلہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے تواتر سے اس کا سلسلہ مہینوں تک جاری وساری رہتا تھا۔ عالمی سطح پر جب سیاسی انقلابات رونما ہونے لگے تو بادشاہت کا بھی خاتمہ ناگزیر ہوگیا اور اس طرح درباروں اور محفلوں کا بھی تصور تقریباً معدوم ہوگیا۔ ان حالات میں ادب بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ نہ داستان گو رہے اور نہ انھیں داد وتحسین دینے والی شخصیتیں۔ اسی درمیان فرانس میں صنعتی انقلاب (۱۷۶۰-۱۸۳۰ء) رونما ہوا جس نے پوری دنیا پر اپنے اثرات ثبت کیے۔ ظاہر ہے اس کا اثر دنیا کی بڑی زبانوں کے ادب پر بھی پڑا۔ عام زندگی تیز رفتار ہو چلی اور دنیا کی معیشت بھی متاثر ہوئی۔ اس کے بالواسطہ اثرات فرانسیسی ادب کے علاوہ جرمنی، امریکا، برطانیہ کے ادیبوں پر بھی پڑے۔ انگریزی ادب میں جو کلیسائی اقدار کی بالادستی تھی، اس پر بھی آنچ آئی اور اس کے قدآور مصنّفین جیسے ورڈس ورتھ، کیٹس، شیلی نے اس تحریک میں عملی حصہ لیا اور اقدار کے خلاف آوازیں بلند کیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نپے تلے پیمانہ سے ہٹ کر آزادانہ طور پر تخلیقات خلق کی گئیں۔ یہ رومانوی تحریک کہلائی اور اس نے دنیا کی تمام بڑی زبانوں کے ادب کو متاثر کیا اور اپنے دائرۂ کار میں لے لیا۔

صنعتی انقلابات نے عام انسانی زندگی میں بھی نمایاں تبدیلیاں کردی تھیں۔ روزمرہ کے معمولات میں دفعتاً تبدیلی نے زندگی کے ہر شعبہ کے معمولات میں ایک Abrupt تبدیلی لادی تھی، اس لیے زندگی تیز رفتار ہوگئی تھی۔ یہیں سے افسانہ یعنی Short Story کا جنم ہوا اور اردو ادب میں اس کا استقبال بھی گرم جوشی سے کیا گیا۔ سرسید احمد خاں کا افسانہ ’گزرا ہوا زمانہ‘ کو اردو کا اولین افسانہ کہا جاتا ہے، مگر یہ مصدقہ طور پر تسلیم شدہ نہیں ہے۔ بادشاہت کے زوال پذیر ہونے کا سبب عالمی سطح پر اشتراکیت کے فلسفہ کا عام ہونا تھا۔ اس نظریہ نے سرمایہ داری نظام کا خاتمہ کردیا اور پوری دنیا میں مفلسی، بے روزگاری اور محنت کشوں کے استحصال کے خلاف

نعرے بلند ہونے لگے۔اس سیاسی تبدیلی کا بھی اثر ادب پر ترقی پسند تحریک کی صورت میں پڑا اور افسانوی/شعری حتیٰ کہ تنقیدی ادب پر بھی اس کے نمایاں اثرات رونما ہوئے۔اب ساری ادبی کاوشیں اسی سیاسی نظریہ کے گرد گھومنے لگیں۔اردو ادب میں سب سے پہلے یہ نظریہ سجاد ظہیر اور ان کے چند ہم نواؤں نے پیش کیا جنھیں پریم چند جیسے ادیب کی حمایت حاصل تھی۔۱۹۳۶ء میں ایک اجلاس پریم چند کی صدارت میں منعقد ہوا اور یہی اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا نقطۂ آغاز تھا۔رفتہ رفتہ اس ادبی قافلہ میں سردار جعفری، کیفی اعظمی، مخدوم محی الدین، ساحرؔ، مجروحؔ، پرویزؔ شاہدی، مظہر امامؔ، منظرؔ شہاب، خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، بیدی، منٹو، عصمت چغتائی وغیرہ بھی شامل ہوگئے۔۱۹۳۶ء سے ۱۹۶۰ء تک اس تحریک کے ذریعہ ایک قابلِ قدر ادبی سرمایہ خلق ہو گیا اور ان تمام نثری اور شعری تخلیقات کے ذریعے سماج میں پھیلی ہوئی تمام تر انسانی کلفتوں سے لڑنے کا حوصلہ پھونکنے کی کوششیں کی گئیں۔

مظفرؔ حنفی کا ادبی سفر ۱۹۵۰ میں افسانہ نگاری سے شروع ہوا۔یہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا وقت تھا۔مظفرؔ حنفی نے ۱۹۵۰ سے ۱۹۶۲ تک پانچ درجن سے زائد افسانے لکھے جو ملک و بیرونِ ملک کے موقر رسائل میں شائع ہوئے۔ان کے ہم عصروں میں رام لعلؔ، ذکیؔ انور، اقبالؔ فرحت اعجازی، غیاثؔ احمد گدی، ستیہؔ پال آنند وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔مظفرؔ حنفی نے اپنے افسانوں میں سماج میں پھیلتی ہوئی لاسمتی، بے اعتباری، مفلوک الحالی اور ذہنی کرب و آلام کا نہایت خوب صورتی اور فنّی چابک دستی سے احاطہ کیا ہے۔یقیناً ان کے افسانے آج کے سماج کی منھ بولتی تصویر نظر آتے ہیں۔ان کے افسانوں کے تین مجموعے 'اینٹ کا جواب'، 'دو غنڈے' اور 'دیدۂ حیراں' منظر عام پر آچکے ہیں جسے مظفرؔ حنفی نے یکجا کر کے 'بھولی بسری کہانیاں' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ان تمام ستاون (۵۷) کہانیوں کا مطالعہ کرنا یقیناً ایک کیف آور احساس کا ضامن ہے۔

مظفرؔ حنفی کے پہلے افسانوی مجموعہ 'اینٹ کا جواب' کے پیش لفظ میں فراقؔ گورکھپوری نے ان کی افسانہ نگاری کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے:

''......مظفرؔ حنفی صاحب ہمارے نئے افسانہ نگاروں میں ایک ہونہار ادیب ہیں۔یہ ان کا پہلا مجموعہ ہے۔ان کے افسانوں میں زندگی کے کئی پہلوؤں کی عکاسی ہے۔بیان نہایت سلجھا ہوا ہے۔ان میں نیا پن ہے۔ان کا انداز دل کش ہے، مکالمے فطری ہیں اور پلاٹ میں جدّت ہے۔پڑھنے والوں کو یہ افسانے کہیں سے گراں نہیں گزریں گے۔ان افسانوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اگر نوجوان مصنف نے اپنی کوششیں جاری رکھیں تو وہ ترقی کی نئی منزلیں کامیابی سے طے کرتے جائیں گے۔ایسی مختصر افسانہ نگاری جسے ہم حقیقت نگاری بھی کہہ سکیں دنیائے ادب میں سب سے نئی صنف ادب ہے......'' (۱۵ جولائی، ۱۹۵۷)

مظفرؔ حنفی کی افسانہ نگاری سے متاثر ہو کر فراقؔ گورکھپوری کا ایسے الفاظ میں اظہارِ خیال کرنا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان کی یہ ادبی کاوش، اردو ادب کے لیے ایک نیک فال ہے۔

اسی طرح مظفرؔ حنفی کے دوسرے افسانوی مجموعہ 'دو غنڈے' کے پیش لفظ 'تعارف' میں کرشن چندر کچھ اس طرح اپنی قیمتی رائے دیتے نظر آتے ہیں:

''......ان افسانوں میں ظلم کوئی حادثہ نہیں، روزمرہ کی حقیقت ہے۔مصنف اس ظلم پر خود چونکتا ہے نہ پڑھنے والے کو چونکاتا ہے۔ظلم، افلاس، بے کاری، ناامیدی، قحط سالی، دھوکا، فریب، جعلسازی جیسے موجودہ زندگی کے شب و روز ہوں، ان کا وجود اتنا ہی ناگزیر ہے جتنا ماہ و سال کا چکر، مصنف کہیں پر احتجاج کرتا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔یہ اس کی فن کاری کی دلیل ہے کہ احتجاج نہ کرتے ہوئے بھی پورا افسانہ بولتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔اسی احتجاج کی داستان جس کا سارے فسانے میں ذکر نہیں......لگتا ہے مصنف نے اس زندگی کو خود جھیلا ہے۔اس زندگی کے بیچ میں بیٹھ کر یہ افسانے لکھے ہیں۔کسی اوپر کے ٹیلے پر بیٹھ کر نیچے بہنے والی زندگی کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔صرف اس کا خامہ خونچکاں نہیں ہوا ہے، اس کی انگلیوں کی پوروں سے یہ لہو بہا ہے۔خود اس کا دل جھلسا ہے، ممکن ہے حقیقت اس کے برعکس ہو مگر زندگی پر حنفی کی بے تکان گرفت کچھ یہی کہتی ہے......''

فراقؔ گورکھپوری اور کرشنؔ چندر جیسے صفِ اول کے اہلِ قلم نے مظفرؔ حنفی کی افسانہ نگاری کی تعریف و توصیف کی ہے اور ان سے بہت ساری امیدیں وابستہ کی ہیں۔یقیناً مظفرؔ حنفی نے بہت ہی قلیل مدت میں ادب میں یہ مقام حاصل کر لیا ہے۔ان کے افسانوں کے پردے میں بے شمار سماجی مسائل کی پرچھائیاں تیرتی ہوئی نظر آتی ہیں خواہ وہ کسی تعلیم یافتہ نوجوان کی بے روزگاری کا مسئلہ ہو، کسی مفلس کی مجبوریاں ہوں یا کسی سیٹھ ساہوکار کی ہوس کاریوں کا مسئلہ۔یہ تمام مسائل قاری کے وجود کو جھنجھوڑ ضرور دیتے ہیں۔مسئلہ کسی کی محبت کا ہو یا زمانے کے ظلم و ستم کا، مظفرؔ حنفی کا قلم خون کے آنسو روتا بھی ہے اور رلاتا بھی ہے۔مذہب کے نام پر اوڑھے ہوئے لبادہ کے اندر کی غلاظت کو بے نقاب کر کے سماج کے سامنے رکھنے کا بھی کام مظفرؔ حنفی نے بڑے سلیقے سے کیا ہے۔'مولانا منّے' سے ایک اقتباس:

''......بھگوان کی قسم جلیل بھائی'' مدن نے زور دے کر کہا: ''وہ سوراخ سے جھانک رہے تھے۔جب میں جھانکنے لگا تو لاحول پڑھ کر مجھے ہٹا دیا اور ننگی نہانے والی عورت پر لعنت بھیجتے ہوئے اپنی ٹوپی اس سوراخ میں ٹھونس دی۔اب تم جا کر دیکھ لو، مکان کے سب سوراخوں میں کپڑے ٹھونستے پھر رہے ہیں۔مجھے سو فیصد یقین ہے کہ ان کے پڑوس میں حسن ہی حسن ہے۔''

پارسائی کا ڈھونگ رچنے والوں کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ ہے۔ سماج اس علت سے قطعی پاک نہیں ہے۔ مظفرؔ حنفی سماج کی ہر برائی کا سدِ باب چاہتے ہیں۔ صدائے احتجاج بلند کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا قلم اس سرد جنگ میں مصروف ہے جس جنگ سے سبھی برائیوں کا خاتمہ ہوگا اور امن کا پرچم بلند ہوگا: ''......بھوک، بے کاری، افلاس، ظلم اور مصیبت کے خلاف لڑی جانے والی اس جنگ کے بعد پھر امن کا جو پرچم لہرائے گا، اس کے بعد کوئی جنگ نہ ہوگی۔ ہر چہار سمت امن ہوگا امن ہی امن!'' (بھیک)

گناہ و ثواب کا تصور عام طور پر ظاہری عمل سے طے کیا جاتا ہے۔ کوئی سماج میں بڑی پاکیزہ زندگی بسر کر رہا ہے، کسی کی برائی نہیں کر رہا ہے، نیک اعمال کی ادائیگی میں دن رات لگا رہتا ہے اور کوئی شب و روز اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانیاں کر رہا ہے، دنیا پہلے کو نیک اور دوسرے کو گناہ گار، سیہ کار اور نہ جانے کیا کیا تصور کرنے لگتی ہے، مگر اللہ کی نظروں میں کون کیا ہے اسے کوئی نہیں جانتا۔ افسانہ 'خدا اور انسان' میں مظفرؔ حنفی نے اسی مسئلہ کا احاطہ کرنے کی نہایت خوب صورت کوشش کی ہے۔ ایک نیک اور پاک باز بندے مولانا اویس ہندی کی عبادتوں کا تحفہ جس میں سترہ ہزار نمازیں، چھ ماہ کے روزے، ایک حج اور ڈیڑھ سو شب بیداریاں شامل ہیں، جب فرشتہ نے بارگاہِ ایزدی میں پیش کیا تو حکم الٰہی اس تحفہ کو فضولیات کی کوٹھری میں پھینک دینے کا صادر ہوجاتا ہے۔ فرشتہ حکم بجالاتا ہے مگر سخت تعجب میں رہتا ہے۔ دفعتاً اس کی ملاقات حضرت موسیٰ سے ہوجاتی ہے۔ فرشتہ کو مغموم دیکھ کر وجہ دریافت کرنے پر فرشتہ سب واقعہ بتادیتا ہے۔ حضرت موسیٰ اس فرشتے کے ہمراہ دربار ایزدی میں جاتے ہیں اور تمام تر جرأتوں، ہمتوں کو یکجا کر کے اللہ پاک سے سوالی ہوتے ہیں۔ وہاں انھیں بتایا جاتا ہے کہ ان کے اعمال تو اکارت گئے مگر کالے خاں جو بدنامِ زمانہ شخص تھا اور ہر طرح کے جرم میں ملوث رہتا تھا اسے جنت نصیب ہوجاتی ہے۔ اس کی وجہ:

> ''......تم یہی جاننا چاہتے ہونا کہ مولانا اویس ہندی کی عبادتیں قبول کیوں نہیں کیں۔ اچھا تو آنکھیں بند کر کے دیکھو۔ یہ جو حجرے میں آنکھیں بند کیے ہوئے تسبیح پڑھ رہا ہے، یہی تمہارا اویس ہندی۔ یہ میری یاد میں دنیا سے بےگانہ ہوچکا ہے اور یہ جو تمھیں رونے کی آواز سنائی دے رہی ہے، اس کے پڑوس کا بھوکا بچہ ہے جس کا باپ مجبور ہو کر غلط طریقوں پر روپیہ کمانے گھر سے نکلا ہے اور وہ عورت جو غیر مرد کے ساتھ مصروفِ اختلاط ہے اسی مولانا اویس ہندی کی بیوی ہے۔ برے اعمال کا حساب رکھنے والے فرشتوں کے ہاتھ دیکھو کس تیزی کے ساتھ اس بچے کے باپ، مولانا کی بیوی اور اس کے ساتھ دادِ عیش دینے والے مرد کے اعمال ناموں پر چل رہے ہیں۔ فرشتے ایک انسان کے ساتھ دوسرے انسان کے مربوط تعلقات کو کیا جانیں لیکن میں تو سب کچھ دیکھتا ہوں۔ کیا تم اب بھی نہیں سمجھ پائے کہ اس مولانا اویس ہندی کے آس پاس

> ہونے والے تمام گناہ دراصل اس کے اپنے گناہ ہیں۔ اس کا سب سے بڑا گناہ تو یہی ہے کلیم کہ اس نے خدا کی تلاش میں انسان کو بھلا دیا ہے۔''
> ''میں سمجھ گیا خداوندا! میں سمجھ گیا۔ مجھے معاف فرمادے میرے پروردگار!''
> ''......اور موسیٰ سجدے میں گر گئے۔'' (خدا اور انسان)

مظفرؔ حنفی کی باریک بیں نگاہیں سماج کے ہر روشن اور تاریک گوشوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ انھوں نے بلند و بالا عمارتوں کے جگمگاتے شبستانوں میں بھی جھانکا ہے اور غریب و نادار کی کٹیا کے تاریک گوشے کا بھی دیدار کیا ہے۔ ہر جگہ سے اپنے بے چین دل کی تسکین کے لیے کچھ نہ کچھ مواد نکال کر افسانے کا جامہ پہنایا ہے اور سماج کے سامنے رکھ کر اسے آئینہ دکھانے کا کام کیا ہے۔ ایک فن کار کا سماج کے لیے اس سے بڑا اور کیا عمل ہوسکتا ہے۔ مظفرؔ حنفی اپنے اس ادبی فریضہ کو انجام دینے میں بہت کامیاب ہیں۔

مظفرؔ حنفی نے ترقی پسند تحریک کے منشور کو بخوبی اپنی افسانہ نگاری میں برتا ہے۔ ان کے افسانے انھیں سماجی مسائل کے ارد گرد گھومتے نظر آتے ہیں جن کا اعادہ اس تحریک میں کیا گیا ہے۔ کہیں تعلیم یافتہ نوجوان کی ملازمت کے لیے دربدری کا ذکر ہے تو کہیں بڑے میل مالکوں، سرمایہ داروں کے ظلم و استبداد کا تذکرہ۔ گویا کوئی ایک بھی ایسا افسانہ نہیں ہے جس میں کوئی بے حد پیچیدہ سماجی مسئلہ نہ ہو۔ مظفرؔ حنفی کی روح ان کے سدِ باب کے لیے بے چین نظر آتی ہے۔ یہی جذبہ افسانہ نگار کی بہت بڑی پونجی ہے۔

افسانہ 'رات کا گاہک' ایک ایسی طوائف کی روداد پیش کرتا ہے جو اپنی جہنم جیسی زندگی سے تنگ آ گئی ہے اور اس سے فرار چاہتی ہے۔ ایک روز ایک ایسا گاہک آیا جس نے رات بھر اپنی درندگی کا ثبوت دیا۔ صبح جب ہوئی تو کملا جیسے نیم مردہ ہوگئی۔ اس کا بدن چور چور ہوگیا تھا۔ اسی اثنا میں شہر میں ایک لیڈر کے تقریر کرنے کی خبر آئی اور لاؤڈ اسپیکر سے اعلان ہوا کہ شام میں نیتاجی کا بھاشن ضرور سنیں۔ خاص کر خواتین کو توجہ دلائی گئی کہ وہ بھاشن سنیں۔ کملا نے پوری تیاری سے بھاشن ہمہ تن گوش ہو کر سنا۔ پہلے نیتاجی نے ملک کی غریبی، بڑھتی ہوئی بے کاری، گرانی، غلے کی کمی اور اسی نوعیت کے دوسرے مسائل کا ذکر کیا پھر بھاشن کے دوسرے دور میں طوائفوں کی زندگی کا خاکہ کھینچا۔ انھیں دیش کی ان ماؤں اور بہنوں کی یہ تذلیل قطعی گوارا نہیں تھی اور وہ اس نظام کے کٹر دشمن تھے۔ قریبی ملک نے جس طرح اپنے یہاں سے عصمت فروشی اور سیاہ کاری کو دیس نکال دیا تھا ویسا ہی نظام اپنے یہاں چاہتے ہیں جس کے لیے برابر کوششیں بھی کر رہے ہیں۔ کملا نے نیتاجی کے لیے اپنے دل میں عقیدت اور احترام کا جذبہ محسوس کیا۔ جب نیتاجی کا جلوس کھلی جیپ میں اس کے بالاخانہ کی طرف سے گزرا تو کملا نے پھول بھی پھینکے۔ اقتباس دیکھیے:

> ''......کملا کا دل زور سے دھڑکا۔ کئی لوگوں نے اسے دیکھ کر قہقہے بلند کیے پھر نیتا شوبھت چندنے

بھی نگاہیں اوپر اٹھائیں اور دفعتاً کملآ کا آنچل سر سے ڈھلک کر شانوں پر آ رہا اور اس کی سونی مانگ کسی اجاڑ پگڈنڈی کی طرح چمکنے لگی۔ کملآ کو اپنے دل کی حرکت بند ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''ہے بھگوان وہ تو رات والا گاہک تھا!'' (رات کا گاہک)

افسانہ کا یہ کلائمکس چونکانے والا تو ضرور ہے لیکن ہمارے سماج کی ایک نہایت ہی گھناؤنی سی تصویر بھی پیش کرتا ہے۔ مظفرؔ حنفی کے افسانوں کی زبان نہایت رواں دواں اور پُر کشش ہے۔ الفاظ ان کی پوری گرفت میں ہیں اور زبان ان کے ذہن و دل کی غلامی کرتی نظر آتی ہے۔ قدرتی مناظر کی تصویر کشی، الفاظ کے برمحل استعمال اور زبان کی روانی و سادگی ان کی تحریروں کو منفرد بناتی ہیں۔ مقامی اور علاقائی اصطلاحوں کا بے تکلف استعمال ان کے افسانوں کا حسن ہے۔ بہت سی ایسی اصطلاحیں جو عام طور پر مستعمل نہیں ہیں، انھیں بھی نہایت خوب صورتی سے استعمال کر کے حسن پیدا کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر گندا کپڑا کے لیے چکٹ، کوڑے کی جگہ کوگھورا، کسی چیز کے بہت خراب ہو جانے کو چھیچھا لیدر جیسی اصطلاحیں جا بجا استعمال کی گئی ہیں جو کہانی کے پس منظر اور ماحول کی مناسبت سے بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ مظفرؔ حنفی کی علاقائی زبان سے انسیت ہے اور زبان کے مختلف فورم سے محبت کا بھی ثبوت ہے۔ قدرتی مناظر کی تصویر کشی کی ایک مثال دیکھیے:

''......اپنے ذہن میں ایک ایسے مقام کا تصور کیجیے جو چاروں طرف سے نیلے نیلے سبز پوش ٹیلوں سے گھرا ہوا ہو، چمکیلے آبشار جن کی بلندیوں سے کود کر زمین کو چومتے ہوں، خوشبودار خودرو پھولوں کے تختے جن کی فضا کو رنگین و معطر رکھتے ہوں۔ شفاف میٹھے پانی کی جھیلیں جس کے سینے پر نگینوں کی طرح جڑی ہوں، خوش رنگ، خوش گلو، شوخ پرندے جہاں چہچہاتے پھرتے ہوں، ندی کے حسین کنارے پر جہاں خوب صورت پودے حسین دوشیزاؤں کی طرح پانی میں جھک جھک کر اپنا عکس دیکھنے کی کوشش کرتے معلوم ہوتے ہوں۔ جہاں قوس قزح اپنے تمام رنگ فراخ دل سے بکھیر دیا کرتی ہو اور گلابی شفق اپنے سہاگی رنگ میں رنگ کر فضا کو ایک نئی نویلی شرمیلی دلہن بنایا کرتی ہو، جہاں شب کو تارے اپنی پوری تابانی سے جگمگا کر لوگوں کے دلوں میں سنہرے سپنوں کی جوتیں جگاتے ہوں اور مہتاب اپنی چمکیلی نرم کرنوں سے وادی کو نور میں نہلائے رکھتا ہو اور جہاں سورج چمک چمک کر جھرنوں کے روپہلے پانی میں اپنی مہربان سنہری کرنوں سے چاندی گھولا کرتا ہو، لطیف عطر بیز ہوائیں جہاں دلوں کو تازگی اور طراوت بخشتی ہوں، مزید ارلطیف اور رسیلے پھولوں کی بو سے آسودگی حاصل ہوتی ہو اور حدِ نگاہ تک ہری بھری لہلہاتی ہوئی کھیتیاں اور پکے ہوئے اناج کی سنہری بالیاں بھولے بھالے کسانوں کے دلوں کو پھول کی طرح کھلائے رکھتی ہوں۔ سنہری جلد والے شوخ ہرنوں کی ڈاریں کلیلیں کرتی

پھرتی ہوں۔ جہاں کے باشندے مکر و ریا کے نام سے بھی نا آشنا ہوں، محبت جن کی زندگی ہو، جن کے دل خلوص سے معمور ہوں، جہاں ہندو مسلمان نہیں صرف انسان بستے ہوں، جہاں کی بھولی بھالی سلونی لجیلی دوشیزائیں محبت، عفت اور پاکیزگی کی زندہ مجسمے ہوں، جہاں ہر چہار طرف خوشی ہو، محبت، سکون، حرارت اور زندگی ہو اور امن ہو......'' (الماس کا محبوب)

اس میں کوئی شک نہیں کہ مظفرؔ حنفی نے افسانوں میں بھرپور زندگی کی تصویریں ان کی تمام تر آلائشوں کے ساتھ نہایت فن کارانہ چابک دستی کے ساتھ سمودی ہیں اور زندگی کا کوئی گوشہ ان کے قلم سے اچھوتا نہیں رہ گیا ہے۔ اتنی فنی ریاضت اور جگر سوزی کے بعد بھی انھوں نے افسانہ نگاری کی طرف سے اپنی توجہ یکسر ہٹالی۔ اپنی کتاب 'بھولی بسری کہانیاں' کے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں:

''میں شادؔ عارفی مرحوم کا شاگرد ہو کر شاعری کے چکر میں افسانہ نگاری کے کام کا نہ رہا۔ اسی اثنا میں دوسری زبانوں کی طرح اردو افسانے کا مزاج بھی یک لخت بدل گیا اور آج رام لعل تو کجا اس کے بعد کی پود جس میں جوگیندر پال، اور قاضی عبدالستار جیسے اہم نام شامل ہیں پرانی سمجھی جانے لگی......''

یہ اس بات کا اشاریہ ہے کہ جدیدیت کی تحریک سے مظفرؔ حنفی قطعی متفق نہیں تھے اور انھیں علامتی، تجریدی افسانوں کی ساخت میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جدیدیت کے موقف پر ان کی سرد مہری نے انھیں شاعری کی طرف رجوع ہونے پر مجبور کر دیا۔ ان کے یہاں علامتی یا تجریدی افسانے کی ایک بھی مثال نہیں ملتی۔ جہاں جدیدیت نے مظفرؔ حنفی کو ایک بلند پایہ افسانہ نگار بنے نہیں رہنے دیا وہیں اسی تحریک نے مظفرؔ حنفی کی شکل میں ایک صفِ اول کا شاعر ضرور عطا کر دیا۔ آج مظفرؔ حنفی کا شمار ملک کے نامور شاعروں میں ہوتا ہے۔

مظفرؔ حنفی نے ۱۹۵۰ سے ۱۹۶۲ کے درمیان ہی افسانے لکھے ہیں۔ ان افسانوں پر تبصرے یا تنقید زمانۂ تخلیق، اس وقت کی افسانوی روش کو ہی ذہن میں رکھ کر کرنا چاہیے تب ہی ان افسانوں کے معیار، فنی و ادبی اہمیت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ بلاشبہہ مظفرؔ حنفی زمانۂ تخلیق میں ایک نہایت اہم اور فعال افسانہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے تھے اور آج بھی ایک معروف نثر نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان کے افسانے اردو کے افسانوی ادب میں ہمیشہ یاد کیے جاتے رہیں گے اور اپنی اہمیت منواتے رہیں گے۔

○○○

آصف پرویز
عالیہ یونیورسٹی، کولکاتا، رابطہ نمبر: 9804511171

مظفر حنفی کی افسانوی جہات: ’دیدۂ حیراں‘ کے حوالے سے

ہمیں جینے کی خواہش ہے کوئی تدبیر کرنے دو
اگر مرنا ہے مر جائیں گے، تیاری نہیں کرتے

انھی جینے کی خواہش کی تکمیل کے لیے ایک کامیاب اور صحت مند زندگی گزار کر ’’اگر مرنا ہے مر جائیں گے‘‘ کے مصداق دنیائے شعر و ادب کے آنگن کو سونا کر کے مظفر حنفی صاحب گزشتہ ۱۰/ اکتوبر ۲۰۲۰ کو داغ مفارقت دے کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

مظفر حنفی ایک جامع شخصیت کا نام ہے جو خداداد صلاحیتوں کی مالک تھی۔ انسان کامل وہی ہے جس کی سوچ میں Vision ہو اور یہی Vision شخصیت سازی اور انسانی شعور و آگہی کو نہ صرف مستقل اور صحیح سمت کی جانب گامزن کرتی ہے بلکہ تخلیقی اظہار کو بھی سلیقہ مندی، انسانی تجربات، عصری آگہی، لسانی تفکرات اور قوت بیان سے مزین و آراستہ بھی کرتی ہے۔

اردو افسانے کی روایت طویل تر نہ سہی لیکن اسی مختصر عرصے میں کئی ایسے نام افق افسانہ نگاری پر چمکے کہ افسانوی ادب پر چھا گئے۔ زود نویس افسانہ نگاروں کی فہرست گو خاصی طویل ہے مگر چند ایک ایسے بھی ہیں جنھوں نے بطور شاعر اپنی شناخت اور پہچان بنائی اور مطلع ادب پر نمودار ہوتے ہوئے شاعری کے ساتھ بطور افسانہ نگار بھی اپنے قلم سے تازہ دم تخلیقات پیش کر گئے۔ ایسے ہی لکھنے والے قلم کاروں میں مظفر حنفی کا نام کم مگر عصری مسائل و حالات نیز تضادات و اختلافات کو فکری پیکر عطا کرنے والوں میں خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

مظفر حنفی نے بطور افسانہ نگار اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ ’اینٹ کا جواب‘ ان کے اکیس (۲۱) افسانوں کا اولین مجموعہ ہے جو ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ مظفر حنفی کا دوسرا افسانوی مجموعہ ’دوغنڈے‘ کے نام سے ۱۹۶۹ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں شامل کل افسانوں کی تعداد بارہ (۱۲) ہے۔ اس مجموعے میں شامل تمام افسانے زندگی اور اس کی الجھنیں نیز اس کی کشمکش کا بیان ہے۔ بیشتر افسانے موضوعاتی ہیں بالخصوص متوسط طبقہ

کی سماجی، معاشرتی اور معاشی زندگی سے وابستہ مسائل کو فنی چابک دستی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ان کا تیسرا اور آخری افسانوی مجموعہ ’دیدۂ حیراں‘ جو میرے مضمون کا عنوان ہے، میں شامل چند افسانوں کی روشنی میں مظفر صاحب کی افسانوی جہات پر خامہ فرسائی مقصود ہے۔

زیر بحث افسانوی مجموعہ ۱۹۷۰ء میں اشفاق ہاشمی کی مدد سے فن کدہ، سیہور (ایم۔ پی) سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں شامل افسانوں کی تعداد بیس (۲۰)، مشاہدات ارسطو ثانی کے عنوان کے تحت بیس (۲۰) افسانچے، ایک فنطاسیہ اور دو ریڈیائی تمثیل ہیں۔ مجموعہ میں شامل افسانوں کے عنوانات درج ذیل ہیں:

پیش لفظ از کنہیا لال کپور؛ ۱۔ بوجھل پردہ۔ ننگی ذہنیت؛ ۲۔ نہلے پہ دہلا؛ ۳۔ محبوب بانہہ کٹا؛ ۴۔ دل اور دل؛ ۵۔ مشاہدات ارسطو ثانی (افسانچے)؛ ۶۔ پتلون کی مد؛ ۷۔ اسرار خداوندی؛ ۸۔ گندی چادر؛ ۹۔ مول گنج کی صحبتیں؛ ۱۰۔ مرنے دو؛ ۱۱۔ دیدۂ حیراں؛ ۱۲۔ بھکاری؛ ۱۳۔ بجھتے دیے، ابھرتے تارے؛ ۱۴۔ خدا اور انسان (فنطاسیہ)؛ ۱۵۔ رات کا گاہک؛ ۱۶۔ احسان مند؛ ۱۷۔ ٹی۔ اے بل؛ ۱۸۔ اونچی دوکان؛ ۱۹۔ گاندھی میموریل ہاسپٹل؛ ۲۰۔ سبز روشنی؛ ۲۱۔ اٹھارہویں لڑکی؛ ۲۲۔ کالا آٹا؛ ۲۳۔ طمانچہ (ریڈیائی تمثیل)؛ ۲۴۔ کالا چور (ریڈیائی تمثیل)۔ اس مجموعے میں شامل چنندہ اور اہم افسانوں کا تجزیہ پیش نظر ہے۔

انسانی اقدار کی شکست و ریخت اور مروجہ رسوم و عقائد نے سماج کی کھوکھلی تصویر عیاں کر دی ہے۔ آج تعلیمی اعتبار سے جتنی ترقی اور بالیدگی آئی اتنی کسی دور میں بھی نہ تھی۔ اس مجموعے میں ایک اہم افسانہ ’محبوب بانہہ کٹا‘ ہے جس میں مظفر صاحب نے انسانیت سے عاری سماج کو موضوع بنایا ہے، اور اس توہم پرستی کا قلع قمع کیا ہے جہاں اندھی تقلید اور جہالت کے نتیجے میں انسانیت اپنے درجے سے گر کر شیطنت کے درجے تک پہنچ جاتی ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ جو ہر زمانے میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے لیکن ان کے خیالات پژمردہ ہیں۔ اس کا ذکر اس افسانے میں کیا گیا ہے:

’’حضرت آپ کو افسانہ نگار ہونے کا دعویٰ ہے لیکن معلومات کا یہ عالم ہے کہ فقیروں کی ذات بانہہ کٹوں سے ناواقف ہیں؟‘‘
’’خیر! آج معلوم ہو گئی ذات بھی۔ بہر حال یہ تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ وہی بانہہ کٹا آپ سب حضرات کے ساتھ آج سے دس پندرہ سال پہلے گلی ڈنڈا اور گولیاں کھیلا کرتا تھا!‘‘
وہ لوگ چیخ اٹھے۔۔۔
’’وہ بچپن کی باتیں تھیں۔‘‘
’’یہ انسانیت کی باتیں ہیں۔‘‘(۱)

بیانیہ تکنیک میں لکھا گیا یہ افسانہ سماج کی کراہت اور تنگ نظری کا عکاس ہے جہاں سادگی میں تصنع،

لطافت میں طنز، معصومیت میں ریا کاری اور مکر وفریب، کینہ، بغض، خود غرضی، حسد، بناوٹ اور خود ستائی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اگر کہیں خلوص ہے تو بقول افسانہ نگار:

''خلوص میرے لیے صرف ان خطوط سے فراہم ہوتا ہے جن میں نیم پاگل محبوب گھما پھرا کر ہر بار یہ ضرور لکھتا ہے۔ بابو جی! آپ کب آئیں گے؟ میں بانہہ کٹا کی انگریزی بھول گیا ہوں!''(۲)

آج کا دور انسانی اقدار سے عاری ہے۔ جہاں کے کھوکھلے سماج میں ذات پات اور چھوت چھات کے سبب انسانیت اور ہمدردی وخلوص سے زیادہ ریا کاری اور فریب کاری نظر آتی ہے۔ اس مجموعے میں شامل ایک اہم افسانہ 'پتلون کی مدٗ' ہے۔ اس افسانے میں واحد متکلم کے صیغے میں پوری کہانی بیان کی گئی ہے۔ شہری زندگی اپنی آسائش اور رنگا رنگی سے گھری ہوئی ہے لیکن تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے جہاں غربت وافلاس کا دردناک چہرہ نوکری پیشہ لوگوں کو ڈراتا رہتا ہے۔ افسانے کا راوی کہتا ہے:

''دونوں بچے کب سے جان کھا رہے ہیں بستوں کے لیے اور میں کتنے بہترین بہانے تراش لیتا ہوں انہیں بہلانے کے لیے۔''(۳)

یہ ایک مختصر لیکن اثر انگیز کہانی ہے جو ہمیں متوسط طبقہ کے معاشی حالات سے کما حقہ واقف کراتی ہے۔ افسانے کا راوی جو ایک اہم اور انتہائی مقدس پیشے سے وابستہ ہے لیکن وہ اپنی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے سے عاجز ہے حتیٰ کہ ایک 'پتلون' خریدنے کے لیے بھی اسے ماہانہ خرچ سے ۱۷/روپے بچانے کے لیے کتنی تگ ودو کرنی پڑتی ہے اور وہ عاجزی وانکساری سے اپنی شریک حیات سے مخاطب ہو کر اپنا دکھ اس کے سامنے یوں رکھتا ہے:

''بھلا یہ بھی کوئی تک ہے کہ ایک اینگلو اسکول کا ہیڈ ماسٹر پھٹا ہوا پائجامہ پہن کر ڈیوٹی پر جائے، ڈوب مرنے کی بات ہے۔ انگریزی اسکول نہ ہوا یتیم خانہ ہو گیا۔ لیکن سب سے بڑی مشکل تو یہ ہے کہ انہیں صاحب کا معائنہ پرسو پھر ہونے والا ہے۔ اس لیے اے میری شریک زندگی! (اور شریک موت) میری جان ابھی سے نکلی جا رہی ہے۔ کیوں کہ میرے پاس اس پھٹے ہوئے پینٹ کے علاوہ کوئی پتلون نہیں ہے۔''(۴)

مظفر صاحب پیش کش کا خوب سلیقہ رکھتے ہیں۔ نثر میں شاعری کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ الفاظ کو برتنے میں بڑی فنی مہارت اور چابک دستی سے کام لیتے ہیں۔ جملہ نپا تلا لیکن زور آور ہوتا ہے جس سے ان کی فنی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔

فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجے میں انسانیت اور آدمیت کے لوٹے جانے کی کہانی بہت پرانی نہیں اور یہ کبھی پرانی ہو بھی نہیں سکتی کیونکہ ہر دن اخباروں کو زینت بخشنے کے لیے بے قرار ایسی سرخیاں انسانیت کی نباض و

دستاویز ہیں جو اپنے اندر آنسو اور دردمندی کا اتھاہ سمندر رکھتی ہیں۔ فرقہ پرستی وفسادات پر مظفر حنفی کا افسانہ 'اسرار خداوندی' ہے۔ اس افسانے میں تقسیم ہند کے نتیجے میں رونما ہونے والے ایک ایسے فسانے کا ذکر کیا ہے، جس نے نہ صرف لوگوں کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا تھا بلکہ مذہبی اور اعتقادی عناصر بھی متزلزل کر دیئے تھے نتیجتاً خدا پر ان کا ایمان بھی کمزور پڑ گیا تھا۔ بالخصوص وہ لوگ جو کسی قدر مالی اعتبار سے تو محتاجوں میں سے نہ تھے لیکن فسادات کے نتیجے میں ان کا سب کچھ نیست ونابود ہو چکا تھا۔ اس افسانے کا مرکزی کردار مولانا شیر خان ہیں جو ایک شعلہ بیان مقرر ہونے کے ساتھ ہی اسم بامسمیٰ ہیں۔ یعنی ان کا ڈیل ڈول اور جسم کی ساخت کسی رستم سے کم نہیں۔ بولتے تو لگتا شیر دہاڑ رہا ہو:

''خلافت تحریک، عدم تعاون اور تحفظ ناموس رسول کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً جتنی ہنگامی تحریکیں شہر میں اٹھیں ان میں ان کا نام نامی ہمیشہ پیش پیش رہتا تھا۔ میں ان کی دھواں دھار تقاریر سننے کا شرف بھی بارہا حاصل کر چکا تھا۔ گھونسہ تان تان کر منہ سے کف اڑاتے ہوئے ایسی جوشیلی تقریر فرماتے کہ سماں سا بندھ جاتا۔ معلوم ہوتا کہ ایک برہنہ شمشیر چمک رہی ہے جس کی روانی کے سامنے دشمن کے چھکے چھوٹ جاتے۔''(۵)

لیکن فساد کی دہشت نے گویا ساری قوت گویائی ہی چھین لی ہو۔ اب اس کے خلاف احتجاج تو دور خود کو ہی بچانے تک کی طاقت نہ تھی۔ بلکہ سراپا موم بن چکے تھے۔ کہانی کے دوسرے حصے میں راوی ایک ایسے شخص کو دیکھتا ہے جسے لوگ پاگل سمجھ کر مار رہے ہیں۔ راوی کسی طرح وہاں پہنچ تو جاتا ہے لیکن اسے اپنی احساس ذمہ داری کا پاس ولحاظ بھی ہے۔ وہ یوں گویا ہوتا ہے:

''تجسس بری شے ہے۔ مجھے یاد نہ رہا کہ میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں اور بڑی ذمہ داریاں میرے سر ہیں۔ اس لیے خطرے سے دور رہنا چاہتا ہوں۔''(٦)

لیکن جب وہ اس شخص کو مجمع میں دیکھتا ہے جو چیخ چیخ کر خدا کا انکار کر رہا تھا اور یہ کہہ رہا تھا کہ خدا کی صفتوں کی مار صرف غریب ہی کیوں برداشت کرتا ہے؟ خدا کے غیض وغضب کا شکار صرف غریب ہی کیوں ہوتا ہے؟ راوی یہ خیال کرتا ہے کہ:

''کیا خدا اتنا ہی کمزور ہے کہ ایک دکھیارے مظلوم، پاگل، بوڑھے کو اپنا معترف بنانے کے لیے اسے سینکڑوں لوگوں سے پٹواتا ہے۔ پھر خیال آیا کہ اس کی ایک صفت قہار بھی ہے۔''(۷)

مگر اس وقت راوی کی حیرانی کا ٹھکانہ نہیں رہتا جب ایک موقع پر شہر واپس لوٹنے پر اسے احساس ہوتا ہے کہ کل تک وہی شہر جو فرقہ واریت کی بدترین مثال پیش کر چکا تھا آج ہندو مسلم اتحاد ان دیکھا نظارہ بھی پیش کر سکتا ہے:

''تفتیش سے معلوم ہوا کہ مجذوب شاہ اف باورے بابا وہی پاگل تھا۔ دماغ نے دل سے سوال کیا یہ

سب کیا ہے؟ اور اس نے بغیر سوچے جواب دیا؟ ''خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔'' (۸)

افسانہ استفہامیہ موڑ پر کھڑا ہو جاتا ہے اور قاری حیران و ششدر یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ ''خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔'' مظفر حنفی صاحب کا لہجہ حیران کن ہے۔ ویسے تو فرقہ پرستی پر بہت سے افسانے لکھے گئے لیکن حنفی صاحب کا انداز مختلف ہے۔ لفظی کفایت شعاری سے کام لیتے ہوئے قاری تک اپنا پیغام پہنچانا جانتے ہیں اور یہی ان کی انفرادیت بھی ہے۔ اس مجموعے میں شامل ایک اہم افسانہ 'مرنے دو' کا ذکر کرنا بہتر ہوگا۔ یہ افسانہ راوی کی ان تلخ یادوں کا مجموعہ ہے جس میں افسانہ نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ فریب وجعل سازی کے اس دور میں خلوص و ہمدردی، شفقت و محبت جیسے الفاظ اپنی حیثیت و وقعت کھوتے جا رہے ہیں، اور انسانی اقدار ان پامال راہوں کی ڈگر پر چل پڑی ہیں جہاں کسی کی مدد کرنے کا مطلب خود آپ ہی کسی فریب یا جعل سازی کا شکار ہو جانے کے مترادف ہے۔ افسانے کا راوی جب ایک دن صبح سویرے اخبار کی ورق گردانی کر رہا ہوتا ہے تو اس کی نظر ایک ایسی خبر پر پڑتی ہے جس میں کسی کے جعل سازی کا شکار ہونے کی اطلاع دی گئی ہے۔ اسے پڑھ کر راوی یادِ ماضی کی ورق گردانی کرنے لگتا ہے تو سب سے پہلے اسے وہ نوجوان یاد آتا ہے جو خود کو فیروز آباد کا رہنے والا کہہ کر روپے اینٹھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے:

''اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میرا ہاتھ بے اختیار جیب میں چلا گیا۔ رسالے خریدنے اور متفرق اخراجات کے لیے جیب میں چودہ روپے چھ آنے پڑے تھے، اسے تھماتے ہوئے لرزتی آواز میں کہا: ''معاف کیجیے گا میرے پاس اس وقت یہی کچھ ہے۔ مجھے آپ سے بے حد ہمدردی ہے۔ خدا آپ کی مدد کرے۔'' (۹)

اسی طرح انہیں وہ خوبصورت عورت یاد آئی جو راوی کو بے وقوف بنا کر ڈیڑھ سو روپے کا چونا لگا جاتی ہے۔ اس نے یہ کہہ کر راوی سے روپے طلب کیے کہ اس کے بوائے فرینڈ نے اسے ہیروئن بنانے کا دھوکہ دے کر کپڑے اور ساڑھے باون ہزار لوٹ لیے۔ لہٰذا اگر وہ اسے مطلوبہ رقم دے دے تو گھر کا کرایہ ادا کر پائے گی۔ اس کے بعد اپنا ملمع کا کڑا راوی کے حوالے کرتے ہوئے کہتی ہے کہ اسے جلد ہی روپے لوٹا دے گی۔ پھر کچھ ہی دنوں کے بعد وہ ایک کوٹھے پر نظر آتی ہے۔ ابھی راوی ان زخموں سے بار آوری بھی نہ کر پایا تھا کہ ایک ایسا واقعہ اسے اپنے دوست کے تعلق سے یاد آتا ہے جس نے مسجد کی تعمیر کی جھوٹی رسید دکھا کر ۲۵ / روپے وصول کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اس شخص نے اور بھی دوسری جگہوں سے روپے جمع کیے جنہیں اس نے اپنی لڑکی کی شادی کے موقع پر خرچ کر دیئے:

''معین بھائی مسجد کی مرمت کب ہوگی؟'' ''کس مسجد کی؟'' اس نے متعجبانہ لہجے میں سوال کیا''
وہی جس کے بارے میں تم کہہ رہے تھے کہ فوری مرمت نہ ہوئی تو ایک دو سال میں کھنڈر ہو

جائے گی۔ اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔'' (۱۰)

آج انسان کی سادہ لوحی اور شرافت کا لوگ ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور جب ایسے ہی لوگ دھوکہ کھاتے ہیں تو مثل کہاوت دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے کے مترادف اب اس کا انسانیت ہی پر سے بھروسہ اٹھ جاتا ہے اور اب ایسے شخص پر کسی کی لاچاری اور مجبوری بھی کوئی اثر نہیں کر سکتی:

''انہیں خیالات میں کھویا ہوا فٹ پاتھ پر بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک کسی نے پاؤں پکڑ لیے۔ میں گرتے گرتے بچا، غصے سے اس طرف دیکھا، پھٹے چیتھڑے پہنے ایک بدصورت سیاہ فام بھکارن جس کی آنکھیں اندر دھنسی جا رہی تھیں، ایک گھناؤنے، مکروہ بچے کو لیے بیٹھی تھی۔ بچے کی گردن لٹکی پڑ رہی تھی۔ شاید بیمار تھا۔ جھنجھلا کر کہا۔ ''یہ کیا بدتمیزی ہے؟''......

''بابو جی......!'' بھکارن کی آواز بمشکل نکل رہی تھی، میرا بچہ...... میرا لال...... چھ آنے سرکار......دوا لاؤں گی۔'' (۱۱)

مگر اس بار راوی گزشتہ واقعات سے سبق لیتے ہوئے پہلے سے کہیں زیادہ ہوشیار ہو چکا تھا۔ اس کے ہاتھ جیب تک پہنچ ہی چکے تھے کہ اسے فیروز آباد کے مصیبت زدہ نوجوان، صراف کی طوائف بیٹی اور معین الدین یاد گئے۔ لیکن اس نے بڑی دانش مندی سے کام لیتے ہوئے ہاتھ جیب سے نکال لیے۔

''میں نے جلد ہی ہاتھ جیب سے نکال لیا اور آگے بڑھنے لگا۔ بھکارن نے پھر پیر پکڑ لیے۔ ''بابو جی! صرف چھ آنے......میرا لال مر جائے گا!''

''مرنے دو!'' میں اسے جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔''

افسانہ نگار کا طنز یہاں ابھرتا ہے کہ آج جھوٹے اور مکار لوگوں کی دنیا ہے اور اسی کا سہارا لے کر وہ اپنی عیاری اور مکاری سے معصوم اور شریف لوگوں کو لوٹ رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو واقعی ضرورت مند اور حق دار ہیں ہم انہیں بھی شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

''دو دن بعد اسی سڑک سے پھر گزر ہوا۔ دیکھا وہی بھکارن اپنے بچے کی گھناؤنی لاش کو سینے سے چمٹائے بلک بلک کر رو رہی تھی۔ قدم منوں وزنی ہو گئے۔ محسوس ہوا کوئی انجانی آواز میرے کانوں کے پاس مسلسل چیخ رہی ہے......

''بابو جی......صرف چھ آنے......میرا لال مر جائے گا۔''

اس مجموعے میں شامل افسانوں میں میرا پسندیدہ افسانہ یہی ہے۔ اس کی وجہ مظفر صاحب کا منفرد و متحیر کر دینے والا انداز بیان ہے۔ وہ صاف گوئی کو پر گوئی میں برتنے کا سلیقہ بھی جانتے ہیں، اور پیش کش میں بنا کسی الجھاؤ کے قاری تک اپنا مطلب پہنچانے میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ اس افسانے میں طنز کی کاٹ

تیز تر نظر آتی ہے جو ہمیں کہیں نہ کہیں زندگی کے حقائق کا از سرِ نو مطالعہ کرنے کی دعوت فکر دیتی ہے۔ مظفر صاحب کا افسانہ ’خدا اور انسان‘ کا تعلق فنطاسیہ سے ہے۔ بقول ڈاکٹر ممتاز احمد خاں:

”فنتاسی کی تعریف ہم کچھ یوں کر سکتے ہیں کہ ایک ایسے قصے کا نام ہے جہاں عقل اور منطق کے بجائے ایک ایسی صورت احوال پر یقین کیا جائے جس کا وقوع پذیر ہونا ناممکن ہو لیکن اس کی تخلیق ہو اور وہ بھی اس طرح کہ اس کے عقب میں ہمارے زمانے میں پیدا ہونے والے واقعات کا تصور بیدار رہے۔ اس میں ایک اخلاقی نظام کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اس کے طنز کے پیچھے زندگی کی معنویت کا احساس پنہاں ہوتا ہے جو مختلف وجوہات کی بنا پر ہمارے عہد میں ختم ہوتی نظر آتی ہے، مگر فنتاسی اس کا اثبات کراتی ہے۔“ (۱۲)

زیر بحث فنتاسی میں افسانہ نگار نے انسانی اعمال و افعال پر مبنی ان نتیجہ خیز خیالات کا ذکر کیا ہے جو انسانی تخلیق کا سب سے اہم ذریعہ ہیں۔ انسانی تخلیق کا مقصد نیک صفات اور عمدہ اخلاق پیدا کرنا ہے۔ انھیں مقاصد کے حصول کے لیے خدا نے انسان کو دنیا میں بھیجا ہے تاکہ وہ خدا کی عبادت اور خدمتِ خلق کے ذریعہ خدا کو راضی کر لے، اور اپنی آخرت سنوار کر اپنی تخلیق کے مقصد کو پانے میں کامیاب ہو جائے۔ لیکن کیا اپنی آخرت کو کامیاب بنانے کے لیے ہی انسان اعمال انجام دے؟ اور اگر ایسا ہے تو پھر ایسی عبادت کی خدا کو کوئی پروا نہیں۔ بلکہ خدا کے نزدیک مقبول ترین عبادت خدمتِ خلق ہے اور یہی اول ترین عبادت بھی ہے:

”پروردگار مولانا اویس تو عبادت و پاکیزگی میں ہم فرشتوں سے بھی اوپر اٹھتا جا رہا ہے۔ اس سال اس نے بارگاہ ایزدی میں ستر ہزار نمازیں، چھ ماہ کے روزے، ایک حج اور ڈیڑھ سو شب بیداریاں ارسال کی ہیں۔“ ”ہوں۔“ کرسی سے ایک طنزیہ آواز بلند ہوئی۔ ”ان سب کو اٹھا کر فضولیات کی کوٹھری میں پھینک دو۔“ (۱۳)

خدا کے اس غیر متوقع فیصلے پر فرشتے بھی متعجب و ششدر نظر آتے ہیں۔ حتیٰ کہ جب اس بات کی خبر موسیٰ کلیم اللہ تک پہنچتی ہے تو وہ بھی بارگاہ ایزدی میں یہ سوال کرنے سے گریز نہیں کرتے کہ ”یہ کیسا اندھیر ہے ربِ سماوات! کیا بدلتی ہوئی دنیا کے ساتھ ساتھ تیرے اصول بھی بدلتے جا رہے ہیں؟“

خدا موسیٰ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:

”ہم خوش ہوئے کلیم! آج کے انسان میں بھی انسانیت کے لیے ہم ایسا ہی درد دیکھنا چاہتے ہیں جو تمہارے دل میں ہے۔ ارے میاں جبریل! ذرا کلیم کے سامنے کالے خاں کا اعمال نامہ پیش کرو......“

موسیٰ کالے خاں کے اعمال نامے کی ورق گردانی کرتے ہوئے جب اس کی بداعمالیوں کے

نتائج کے بارے میں پوچھتے ہیں تو جواب ملتا ہے۔ ”ہم نے آج اسے فردوس بریں کے ایک حسین خطے میں پہنچا دیا ہے!“ (۱۴)

خدا کے اس فیصلے پر جب موسیٰ اپنی حیرانی کا اظہار کرتے ہیں تو پردے کے پیچھے سے آواز آتی ہے کہ دنیاوی اور خدائی عدالت میں بڑا فرق ہے۔ بظاہر کالے خاں مجرم ہے اور اس جرم کی پاداش میں اسے سزا بھی مل چکی ہے لیکن کالے خاں ایسا نہ کرتا تو نہ جانے کتنی زندگیاں تباہ ہو جاتیں۔ اس کے برعکس اویس ہندی کے اعمال حج، نماز، زکوٰۃ، صدقات و خیرات سے بھرے ہونے کے باوجود خدا کی نظر میں اس کی کوئی قدر نہیں۔ خدا موسیٰ سے ہم کلام ہوتے ہیں:

”تم یہی جاننا چاہتے ہو نا کہ میں نے مولانا اویس ہندی کی عبادتیں قبول کیوں نہیں کیں؟ اچھا تو آنکھیں بند کر کے دیکھو، یہ جو حجرے میں آنکھیں بند کیے ہوئے تسبیح پڑھ رہا ہے یہی ہے تمہارا اویس ہندی، یہ میری یاد میں دنیا سے بے گانہ ہو چکا ہے اور یہ جو تمہیں رونے کی آواز سنائی دے رہی ہے یہ اس کے پڑوسی کا بھوکا بچہ ہے جس کا باپ مجبور ہو کر غلط طریقوں پر روپیہ کمانے کے لیے گھر سے نکلا ہے، اور وہ عورت جو غیر مرد کے ساتھ مصروف اختلاط ہے اسی مولانا کی بیوی ہے۔ برے اعمال کا حساب رکھنے والے فرشتوں کے ہاتھ دیکھو کس تیزی کے ساتھ اس بچے کے باپ، مولانا کی بیوی اور اس کے ساتھ دادِ عیش دینے والے مرد کے اعمال ناموں پر چل رہے ہیں۔ فرشتے ایک انسان کے ساتھ دوسرے انسان کے مربوط و مبسوط تعلقات کو کیا جانیں لیکن میں تو سب کچھ دیکھتا ہوں۔ کیا تم اب بھی نہیں سمجھ پائے کہ اس مولانا اویس ہندی کے آس پاس ہونے والے تمام گناہ دراصل اس کے اپنے گناہ ہیں، اس کا سب سے بڑا گناہ تو یہی ہے کلیم کہ اس نے خدا کی تلاش میں انسان کو بھلا دیا ہے۔“ (۱۵)

افسانے کا انجام قاری کو چونکا دیتا ہے اور ہمیں اپنا محاسبہ کرنے کی ترغیب دیتا ہے کہ ہم اپنے اعمال پر اترائیں نہیں اور فرائض الٰہی کو ادا کرنے کی کوشش میں اس کے بندے کو فراموش نہ کر دیں۔ حقوق العباد کا پورا پورا خیال رکھیں کیونکہ خلق خدمت ہی سب سے بڑا مذہب ہے۔

اس مجموعے میں شامل دیگر کامیاب افسانوں میں بھکاری، ٹی۔ اے۔ بل، سبز روشنی، کالا آٹا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس مجموعے میں ’طمانچہ‘ اور ’کالا چور‘ نام کے دو ریڈیائی ڈرامے بھی شامل ہیں جو فن ڈراما سے بھی ان کی وابستگی کا پتہ دیتے ہیں۔ بیانیہ تکنیک میں لکھے گئے ان کے افسانے بہت اچھے نہ سہی لیکن افسانہ نگاری کی روایت میں اپنی پہچان بنانے میں ضرور کامیاب ہوئے ہیں۔

ان کا کلیات افسانہ ’بھولی بسری کہانیاں‘ کے نام سے منظر عام پر آ چکا ہے جس کے ابتدائیہ میں خود

مظفرحنفی صاحب نے اس بات کا اقرار کیا ہے:

''بھولی بسری کہانیاں' میں شامل سبھی افسانے ۱۹۵۰ سے ۱۹۶۲ کے دوران لکھے گئے ہیں اور اسی درمیان مختلف ادبی رسائل میں شائع بھی ہوئے۔ یادش بخیر! یہ وہ دور تھا جب آج کا جدید افسانہ وجود میں نہ آیا تھا اور افسانہ نگاروں میں رام لعل، ذکی انور، اقبال فرحت اعجازی، غیاث احمد گدی، ستیہ پال آنند اور راقم الحراف وغیرہ کی گنتی جدید افسانہ نگاروں میں ہوتی تھی پھر کچھ ایسا ہوا کہ میں شاد عارفی کا شاگرد ہو کر شاعری کے چکر میں افسانہ نگاری کے کام کا نہ رہا۔''

یہ ایک طرح کا اعتراف شکست بھی ہے اور تغیرات فن سے آنکھیں چرانا بھی۔ خیر افسانہ نگاری مظفرحنفی صاحب کا میدان نہ ہونے کے باوجود ان کے افسانے، اردو افسانے کی روایت میں ایک باب کا اضافہ ضرور ہیں۔

OOO

حوالہ جات:

۱۔ بھولی بسری کہانیاں، مظفرحنفی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۵ء، ص ۳۰۱۔ ۳۰۲
۲۔ ایضاً، ص ۳۰۲
۳۔ ایضاً، ص ۳۲۲
۴۔ ایضاً، ص ۳۲۱۔ ۳۲۲
۵۔ ایضاً، ص ۳۲۳
۶۔ ایضاً، ص ۳۲۴
۷۔ ایضاً، ص ۳۲۵
۸۔ ایضاً، ص ۳۲۶
۹۔ ایضاً، ص ۳۳۸
۱۰۔ ایضاً، ص ۳۴۲
۱۱۔ ایضاً، ص ۳۴۳
۱۲۔ اردو ناول کے چند اہم زاویے، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، ص ۶۳
۱۳۔ بھولی بسری کہانیاں، مظفرحنفی، ص ۳۶۵
۱۴۔ ایضاً، ص ۳۶۸
۱۵۔ ایضاً، ص ۳۷۰

OOO

سرور ندیم
ہاوڑہ

ڈاکٹر مظفرحنفی بحیثیت افسانہ نگار

ڈاکٹر مظفرحنفی بنیادی طور پر ایک شاعر کی حیثیت سے ادبی دنیا میں زیادہ متعارف ہیں اور اپنے بنیادی لب ولہجہ اور جداگانہ رنگ و آہنگ کی بنیاد پر اپنے ہم عصر شعرا میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن شاعری کے علاوہ بھی کئی ادبی میدانوں میں مظفرحنفی کا قلم رواں دواں رہا ہے اور انھوں نے جس صنف پر قلم اٹھایا ہے اس میں اپنی انفرادیت کے نقوش اجاگر کیے ہیں۔ افسانہ نگاری کے میدان میں بھی لکیروں کی فقیری سے احتراز کرتے ہوئے انھوں نے ایک منفرد اور جداگانہ روش اختیار کی اور دنیائے افسانہ میں شہرت اور ناموری کی بلندیوں پر فائز ہوئے۔

مظفرحنفی نے جس وقت افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا اس سے پہلے ہی ترقی پسند افسانہ نگاری کی بنیاد پریم چند ڈال چکے تھے۔ افسانہ نگاری کے اس ابتدائی زمانے میں دو میلانات سامنے آتے ہیں، ایک حقیقت نگاری اور اصلاح پسندی کا رجحان جس کی قیادت پریم چند سنبھالے ہوئے تھے، دوسرا رومانیت اور تخیل پرستی کا میلان جس کی نمائندگی سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری کر رہے تھے۔ اس زمانے میں مظفرحنفی کم سن ترین معروف افسانہ نگار سمجھے جاتے تھے۔ عظیم ذہن، خداداد صلاحیت اور کچھ کر دکھانے کی لگن۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پانچ چھ سال کی مشقت نے انھیں اس قابل بنا دیا کہ اپنے ابتدائی افسانوں کی اشاعت کے بعد ہی ان کا شمار ہند و پاک کے مقبول و معروف افسانہ نگاروں میں ہونے لگا۔

اس زمانے میں مظفرحنفی کے ساتھ مشہور جاسوسی ناول نگار ابن صفی کی مزاحیہ اور نفسیاتی کہانیاں شائع ہوتی تھیں۔ گویا جاسوسی کہانیاں لکھنے کی ابتدا مظفرحنفی اور ابن صفی نے ساتھ ساتھ کی تھی۔ یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ جاسوسی ادب کی تخلیق کے معاملے میں مظفرحنفی، ابن صفی کے ہم عصر تھے اور اس زمانے میں خاصے مقبول بھی۔ اس حقیقت کی روشنی میں یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ اگر مظفرحنفی سنجیدگی اور یکسوئی سے صرف جاسوسی ادب کی تخلیق کرتے تو آج اس میدان میں یقیناً ابن صفی کی طرح مشہور و مقبول ہوتے۔ لیکن انھیں تو شعر و ادب کے میدان میں دوسرے بڑے معرکے سر کرنے تھے۔ انھوں نے جاسوسی ادب سے دامن چھڑایا اور سنجیدگی

کے ساتھ خالص ادبی تخلیقات کی جانب متوجہ ہوگئے۔ اردو کے معتبر اور نامور افسانہ نگار کرشن چندر نے مظفر حنفی کا تعارف اس طرح پیش کیا ہے:

''مظفر حنفی کو بات کہنے کا ڈھب آتا ہے اور افسانے کی تخلیق کے سارے لوازم معلوم ہیں۔ کون سی بات قاری سے کس وقت کہنی ہوگی، کون سی بات چھپا کر رکھنا ہوگی اور صرف آخری سطر میں مٹھی کھول دینا ہوگی، حالاں کہ آج کل قاری بہت ہوشیار ہو چلا ہے اور افسانہ ختم ہونے سے پہلے ہی اس کا انجام معلوم کر لیتا ہے مگر مظفر حنفی مصنف اور قاری کی اس شطرنجی لڑائی میں اکثر و بیشتر اپنے قاری کو مات دے جاتے ہیں...... وہ زبان و بیان کو الجھاوے دے دے کر زندگی سے آنکھیں چرانے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ آنکھیں چار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔''

مظفر حنفی نے افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۵۰ء میں کیا اور پہلا افسانہ 'منّت کی چادریں' کے عنوان سے ۱۹۵۰ء میں لکھا، لیکن حقیقت میں ان کا پہلا شائع شدہ افسانہ 'اونچی دوکان' ہے۔ اس کے بعد کے شائع شدہ افسانوں میں 'دیواریں اونچی ہو گئیں'، 'موت کا سایہ'، 'سوار'، 'مرنے دو' وغیرہ ہیں۔ آپ کو یہ بات جان کر حیرت ہوگی کہ مظفر حنفی کے تینوں افسانوی مجموعے 'اینٹ کا جواب'، 'دو غنڈے' اور 'دیدۂ حیراں' اس وقت شائع ہوئے جب انھیں افسانہ نگاری ترک کیے ہوئے خاصہ عرصہ گزر چکا تھا اور وہ ایک جدید صاحب طرز طنز نگار شاعر کی حیثیت سے ادبی دنیا میں معروف ہو چکے تھے۔ اکثر لوگوں کو ان کی افسانہ نگاری کا علم بھی نہیں تھا۔ ان کے یہ افسانوی مجموعے منظر عام پر آتے ہی ناقدین اور مبصرین نے ان کی افسانہ نگاری و شاعری دونوں حیثیتوں پر بڑے دلچسپ تجزیاتی تبصرے کیے ہیں۔ مظفر حنفی کی افسانہ نگاری کے تعلق سے پروفیسر احتشام حسین کی رائے ملاحظہ فرمائیے:

''مظفر حنفی موجودہ اُردو ادب کی دنیا میں اپنی تیکھے لہجے والی شاعری اور افسانہ نگاری کے ساتھ داخل ہوئے ہیں۔ شاید میری طرح آپ بھی حیرت کریں گے کہ مظفر حنفی نے گرد و پیش کو کتنی گہری نظر سے دیکھا ہے۔''

'اینٹ کا جواب' مظفر حنفی کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے، اس میں ۲۱/افسانے شامل ہیں۔ 'دو غنڈے' دوسرا افسانوی مجموعہ ہے اس میں ۱۲/افسانے شامل ہیں۔ 'دیدۂ حیراں' مظفر حنفی کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس تیسرے افسانوی مجموعے میں ان کے چوبیس منتخب افسانے شامل ہیں۔ مظفر حنفی کے یہ افسانے زندگی کے مختلف موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ پریم چند اور سعادت حسن منٹو کی روایات کو آگے بڑھاتے ہوئے حقیقت نگاری اور بے باکئ اظہار پر ان کہانیوں کی بنیادیں رکھی گئی ہیں۔ دُھلی دھلائی، صاف شفاف، سلیس، عام فہم بول چال کی بامحاورہ زبان، دل کش پلاٹ، اچھوتی تکنیک، منظر نگاری اور ہمارے اڑوس پڑوس میں رہنے بسنے والے کردار ان افسانوں کو حقائق سے قریب لاتے ہیں۔

مظفر حنفی کی ہر کہانی عام زندگی کی مکمل اور واضح تصویر ہے۔ ہر کہانی ان کے اندر سے ابھری ہے جس میں ان کا درد اور آس پاس کی بکھری ہوئی زندگی کی تلخ و شیریں حقیقتیں زبان حال سے اس طرح بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں کہ ہر پڑھنے والا ان آوازوں کو ایک نئے مفہوم کے ساتھ سنتا ہے۔ ان میں زندگی کے ان موضوعات کو انتہائی جسارت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، جن تک سعادت حسن منٹو اور چند دوسرے افسانہ نگاروں کے علاوہ کوئی رسائی حاصل نہ کر سکا۔ انھوں نے رنگین بیانی اور مرصع عبارت سے اپنی کہانیوں کو سجانے سے گریز کرتے ہوئے پریم چند کی طرح ہمیشہ مقصدیت کو پیش نظر رکھا ہے۔ 'نقش فریادی' میں انھوں نے افسانہ نگار کی حیثیت سے حقیقت نگاری پر مبنی اپنے تخلیقی رجحان کو انتہائی وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ کہانی کا آغاز کچھ اس طرح ہوتا ہے:

''میں سوچتا ہوں میں یہ کہانی کیسے لکھ سکوں گا۔ دراصل میں بے حد اُداس ہوں، پریشانیوں نے مجھے بری طرح گھیر رکھا ہے، مجھ پر بہت ذمہ داریاں ہیں، اس بھری دنیا میں میں اپنے آپ کو یک وتنہا پاتا ہوں۔ کوئی مونس نہیں، کوئی غم خوار نہیں، غیرت مند اور حساس بھی بہت ہوں۔ ذرا سی بات کو گھنٹوں محسوس کرتا ہوں۔ وہ معمولی تکلیف جو دوسروں کو قطعی متاثر نہیں کرتی میرے دل میں عرصے تک کسکتی رہتی ہے۔ مجھے روپیوں کی ضرورت ہے، میری بیوی بیمار ہے اس کے علاج کے لیے، میرا بھانجہ ذہین ہے اس کی تعلیم کے لیے، میرے والدین ضعیف ہیں ان کی ضرورت کے لیے۔ میں ادیب ہوں اپنی عزت بنائے رکھنے کے لیے واقعی مجھے روپیوں کی سخت ضرورت ہے۔''

کہانی کیا ہے، سیدھے سچے اور بے لاگ انداز میں مظفر حنفی نے تلخ حالات کی عکاسی کی ہے۔ ان کے بیشتر افسانے ان کے ذاتی تجربات و مشاہدات کے تانوں بانوں سے بُنے گئے ہیں۔ حنفی نے اپنے گرد و پیش کے حالات، واقعات و کیفیات کے خمیر کو اپنے تخیل میں گوندھ کر کہانیوں کے ایسے خوب صورت دل کش اور متحرک مجسمے گڑھے ہیں جو آپ کے ہمارے ساتھ ساتھ چلتے پھرتے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں زندگی کی کربناکیوں کے پہلو بہ پہلو عشق و محبت کے خوش گوار عناصر بھی حقیقت پسندانہ توازن کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ رومانی افسانوں میں اسلوب اور مواد کے اعتبار سے مظفر حنفی، منٹو سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ وہی حقیقت نگاری کا رجحان یہاں بھی کارفرما ہے، حالاں کہ ان کی حقیقت نگاری اس حد و منزل تک نہیں پہنچتی جہاں منٹو فحش نگاری اور عریانیت پسندی کے جرم میں معتوب ٹھہرائے جاتے ہیں۔ ان کے افسانوں سے شوخی اور شرارت آمیز رومان کے نرم و گرم اور حقیقی جذبے کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیے:

''پنگھٹ پر وہ رونق رہتی کہ خدا کی پناہ۔ گاؤں بھر کا حسن پانی بھرنے مولانا منّے کے مکان کے سامنے آ جمع ہوتا۔ ایک سے ایک حسین دوشیزہ گاگر لیے جھومتی مٹکتی کنویں پر آتی اور پانی بھر کر مٹکتی ہوئی چلی جاتی۔'' (مولانا منّے)

اپنے افسانوں میں مظفر حنفی نے طنز کے نشتروں کا استعمال سماج کے رستے ہوئے ناسوروں پر نشتر چلانے کے لیے کیا ہے۔ ایسا سماج جو ضمیر فروش ہے، پست کردار اور نمائش پرست ہے۔ لیکن پرخلوص طنز معاشرے پر صحت مند اثر بھی مرتب کرتا ہے۔ ان کا طنز گہرا اور دیر پا ہوتا ہے۔ زندگی کے تلخ حقائق اور روزمرّہ کے ناخوش گوار مسائل پر مظفر حنفی نے اپنے منفرد طنزیہ اسلوب میں بڑی بے باکی سے نشتر زنی کی ہے۔ رشوت خوری پر ان کا طنز ملاحظہ فرمائیے:

''جنگل کے ٹھیکیداروں سے آڑے وقتوں میں کچھ مل جاتا تھا۔ رشوت نہیں، یہ تو بہت کریہہ لفظ ہے، نذرانہ کہیے۔'' (دو ٹکے کا آدمی)

واقعہ نگاریوں اور معاشرہ کی ناہمواریوں پر طنز کے بعد مظفر حنفی کی کہانیوں میں سب سے نمایاں اور قابل ذکر چیز سیکس (جنس) پر ان کا بے باکانہ اظہار ہے۔ آج کی بات چھوڑیے کہ اب تو حالات نے کچھ ایسی چھوٹ دے رکھی ہے کہ ایرا غیرا کھلے بندوں مرد وزن کے اختلاط پر بے لگام اور بے تکان لکھ رہا ہے اور سستی شہرت سمیٹ رہا ہے۔ ۱۹۵۰ء تا ۱۹۶۰ء کے حالات آج سے یکسر مختلف تھے۔ سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی اور اس قبیل کے اور ایک دو افسانہ نگار، فحش نگاری اور عریاں پسندی کے جرم میں معتوب قرار دیے جا رہے تھے۔ مظفر حنفی نے اس زمانے میں بھی سیکس پر بڑی جسارت سے لکھا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:

''رنڈیوں کا گھر ہے تو کیا ہوا۔ جب تک ان طوائف زادیوں کی نتھ نہیں اترتی، یہ اتنی ہی عصمت مآب ہوتی ہیں جتنی کہ اچھی اچھی گھرانوں کی دوشیزائیں بلکہ بعض اوقات تو اونچے گھرانوں کی لڑکیاں بھی جذبات کی رو میں بہ کر اپنا جوہرِ عصمت گنوا بیٹھتی ہیں لیکن ان طوائف زادیوں کی مائیں اور استاد جی بڑی جانفشانی کے ساتھ ہر لحہ اُن کی پاسبانی کرتے ہیں کیوں کہ انھیں اس کی زیادہ قیمت وصول کرنی ہوتی ہے۔'' (مُول گنج کی صبحیں)

''شرم کی ماں کا...... امراؤ نے ایک گندی سی گالی دی۔ اتار کپڑے، اور پھر عورت کی سسکیوں کی آواز مجھے سنائی دی اور میں دھڑکتے دل کے ساتھ باہری کمرے میں بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور لنگوٹ پہنے ہوئے امراؤ باہر نکلا۔ پھر سکڑتی سمٹتی اس کی بیوی بھی باہر آ گئی۔ اب اس کے جسم پر کپڑے کے نام پر صرف ایک پھنسی پھنسی سی چولی اور 'تنگ چڈّی تھی۔'' (دوغنڈے)

ان مثالوں سے جہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مظفر حنفی نے جنس پر انتہائی بے باکی سے لکھا ہے وہیں اس بات کی طرف واضح اشارے بھی ملتے ہیں کہ انھوں نے سیکس کو صرف لذّت کوش اور شہوانی جذبات کی تسکین کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ یہاں بھی اصلاح کا مقصد کارفرما دکھائی دیتا ہے۔

○○○

استوتی اگروال
سرونج، رابطہ نمبر: 9340710963

مظفر حنفی کی کہانیوں کا تجزیہ

دنیائے ادب میں میر تقی میر کے بعد سب سے زیادہ غزلیں جس نے کہی ہیں ان کا نام مظفر حنفی ہے۔ جس طرح مظفر حنفی کو غزلوں پر عبور حاصل ہے اسی طرح دیگر اصناف پر بھی۔ غزل میں مظفر حنفی نے ایک منفرد لہجہ اختیار کیا ہے۔ انسان کو اپنا خود کا لہجہ بنانے میں زندگی گزر جاتی ہے، لیکن انھوں نے اپنا وہی لہجہ ہمیشہ قائم رکھا۔ مظفر حنفی کے افسانے اکثر و بیشتر پڑھنے کو ملتے رہے ہیں، کیوں کہ انڈو پاک کا ایسا کوئی بڑا رسالہ نہیں جس میں مظفر حنفی نہ چھپے ہوں۔ اگر کسی عام قاری کے سامنے ان کا افسانوی مجموعہ رکھ دیا جائے تو اسے حیرت ہوگی کہ مظفر حنفی افسانہ نگار بھی ہیں؟ ہم نے اکثر دیکھا اور سنا ہے کہ ایک صنف پر ہی ہمیں اچھی گرفت ہونا چاہیے اور جو شخص بہت سی اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ کسی بھی صنف پر عبور حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا، چوں کہ کسی نے سچ کہا ہے کہ ایک اچھا شاعر کبھی اچھا نثر نگار نہیں ہو سکتا اور ایک افسانہ نگار اچھی شاعری نہیں کر سکتا۔ کئی ایسی مثالیں ہیں جیسے کرشن چندر، منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی وغیرہ جنھوں نے صرف افسانے ہی لکھے ہیں۔ ہمارا ماننا ہے کہ افسانے کا آغاز بیسویں صدی کی ابتدا میں ہوا، لیکن بقول فراق گورکھپوری فنِ افسانہ نگاری ہزار سال پرانا ہے، 'رگ وید' جو ہمارا سب سے پرانا وید ہے اس میں دیوی دیوتاؤں کی شکل میں کہانیاں ہی بیان کی گئی ہیں، لیکن یہاں میرا مقصد افسانے کی تاریخ پر گفتگو کرنا نہیں، بلکہ مظفر حنفی کی کہانیوں کا تجزیہ پیش کرنا ہے۔

اس وقت میرے سامنے مظفر حنفی کا کلیات 'بھولی بسری کہانیاں' ہے۔ اس سے پہلے ان کے تین افسانوی مجموعے اور بھی شائع ہو چکے ہیں جن کے نام 'اینٹ کا جواب'، 'دوغنڈے' اور 'دیدۂ حیراں' ہیں۔ 'بھولی بسری کہانیاں' میں مظفر حنفی کے تینوں مجموعوں کے افسانے شام ہیں۔ اس کلیات میں ۵۶ر افسانے ہیں۔ کتاب کافی ضخیم اور ۴۴۰ر صفحات پر مشتمل ہے۔ یوں تو میں اس کلیات کے ۱۰ سے زیادہ افسانے پڑھ چکی ہوں، لیکن کچھ افسانے بہت متاثر کرتے ہیں۔ غبار آلود آئینہ، دل کے آئینے میں ہے، موڑ، سنگ دل، کہتے

ہیں جس کو عشق، ہم شریف ہیں، بچیاں تم کیوں روتی ہو، مہمان، دل خانہ، منت کی چادریں، وہ لوگ!، ستاروں کا کھیل وغیرہ نمایاں نام ہیں۔ لیکن مجھے منّت کی چادر، رات کا گاہک، اونچی دوکان، اٹھارہویں لڑکی اور گندی چادر زیادہ پسند آئے۔ اس مجموعے میں کچھ کہانیاں مختصر ہیں تو کچھ طویل بھی، لیکن کہانی کی طوالت نہیں بلکہ اس کا بیانیہ معنی رکھتا ہے۔ مظفر حنفی نے افسانچے بھی لکھے ہیں اور کئی افسانچے مشہور اخبار و رسائل میں بھی شائع ہوئے ہیں۔

مظفر حنفی کا افسانہ 'گندی چادر' میں نے چھ مہینے پہلے پڑھا تھا۔ میں بہت سی کہانیاں پڑھ چکی ہوں اور ان پر مضمون اور تبصرے لکھ چکی ہوں، لیکن چند کہانیاں ایسی ہوتی ہیں جو ذہن پر دیرپا اثر چھوڑتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ آپ مصنف کی سوچ سے کس حد تک متفق ہیں۔ کہیں نہ کہیں وہ موضوع ہماری حقیقی زندگی سے بھی تعلق رکھتا ہے، لیکن اس افسانے نے واقعی مجھ پر ایک سکتہ سا طاری کر دیا۔ سب سے پہلے افسانے کا آغاز ایک افسانہ نگار سے ہی ہوتا ہے جس کا نام انوپ چند ہے۔ انوپ چند ایک ایسی جگہ پر رہتا ہے جہاں زیادہ ہلچل نہیں، بلکہ سکون و اطمینان ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آسانی سے اپنا افسانہ مکمل کر لیا کرتا تھا۔ وہ ایک طنزیہ افسانہ لکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک باہر سے کئی آوازیں اسے پریشان کرنے لگیں۔ کچھ گلی کے بچے ایک پاگل برہنہ عورت کو چڑھا رہے تھے۔ کوئی اسے پگلی کہتا، کوئی اس کے بال پکڑتا، کوئی کچھ کہتا۔ افسانہ نگار کھڑکی میں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا، اچانک کلّو موچی آ گیا اور اس نے اس عورت کو ان بچوں سے بچایا۔ پتہ نہیں کیوں وہ عورت ہمیشہ بال بکھیرے، گندی اور برہنہ ہی پھرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ اسے مندر کے باہر بھی بھیک نہیں مانگنے دیتے تھے۔ اس کے بعد انوپ چند کو وہ کئی جگہ دکھائی دی۔ ایک دن انوپ چند کسی اچھے افسانے کی تلاش میں تھا۔ وہ اُن رسالوں کے لیے افسانہ لکھ رہا تھا جن کا معاوضہ وہ پہلے ہی لے چکا تھا، لیکن اس کا افسانہ لکھنے کا Mood نہیں تھا۔ اس کا دوست ویدسرین آیا اور اسے باہر گھمانے لے گیا۔ وہ شیلانگ کی سڑکوں پر گھوم رہے تھے، اچانک انھیں وہی عورت دکھائی دی جو گندی، سیاہ اور برہنہ کسی سے لپٹی ہوئی تھی۔ کچھ لوگوں نے اس آدمی کی مدد کی اور اس عورت سے چھڑایا۔ افسانہ نگار دیکھتا ہے کہ عورت حاملہ ہے اور کسی بچے کو جنم دینے والی ہے۔ یہ دیکھ کر وہ گھر کی طرف بھاگا اور جلد ہی ایک بہترین افسانہ لکھ کر رسالے کو پوسٹ کر آیا۔ چوں کہ اس کے دوست نے کہا کہ اِس عورت کو اچھا موضوع بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن جب وہ افسانہ پوسٹ کر کے واپس لوٹ رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ فٹ پاتھ پر وہیں اس عورت نے ایک بچے کو جنم دیا اور ایک بوڑھی بھکارن ایک چادر ڈال کر اس عورت کا جسم ڈھک رہی ہے۔ آخر میں ایک جملہ جو ہمارے دل کو بھی دہلا دیتا ہے، وہ یہ ہے:

"تمہارا افسانہ اس پگلی کے کس کام آیا؟ تم نے تو اسے اور بھی ننگا کر دیا افسانہ نگار! اس کا پردہ تو اس بھکارن کی پھٹی چکٹ چادر ڈھانکے ہوئے ہے۔"

اس افسانے میں مظفر حنفی نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ایک اچھا شاعر، ادیب یا افسانہ نگار وہ نہیں جو صرف اور صرف سماج کو نصیحت دے، یعنی کہ بڑے بڑے دعویٰ کرے اور خود عمل نہ کرے، بلکہ ایک سچا ادیب تو وہ ہے جو اپنے اندر ایک دردمند دل رکھتا ہو اور انسانی جذبات کو محسوس کرتا ہو۔ اسے پڑھ کر نریش کمار شاؔد کا ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ ایک مرتبہ نریش کمار شاد کو پہلی تاریخ کو تنخواہ ملی۔ تنخواہ اور آٹا وغیرہ لے کر رات کے وقت گھر واپس آ رہے تھے کہ اچانک راستے میں انھیں ایک بوڑھا شخص سردی میں ٹھٹھرتا ہوا نظر آیا۔ اسے دیکھتے ہی انھوں نے اُس بوڑھے آدمی کو اپنا کوٹ تو نکال کے دے ہی دیا، لیکن ساتھ ہی ساتھ جو تنخواہ اور گھر کا سامان تھا وہ بھی دے آئے۔ بیوی انتظار میں تھی کہ وہ آئیں اور گھر میں کھانا پکے۔ جب بیوی نے خالی ہاتھ دیکھا تو سوال کیا۔ سوال کے جواب میں نریش کمار شاد نے کہا، "میں تو تنخواہ، کوٹ اور سامان ایک ضرورت مند بوڑھے کو دے آیا۔" آج نریش کمار شاد جیسی مثالیں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتیں۔

مظفر حنفی کے لکھنے کا انداز بالکل سادہ ہے جو قاری کو آسانی سے سمجھ میں بھی آ جاتا ہے۔ کہانیوں میں زندگی کے کئی لمحات، کئی پہلو قید کر لیے جاتے ہیں۔ اگر اچھے افسانے یوں ہی مسلسل لکھے جاتے رہیں گے تو ہمیں ہماری زندگی کے کئی پہلوؤں کو سمجھنے میں بھی آسانی ہو گی۔

افسانہ 'رات کا گاہک' میں اُس موضوع پر قلم اٹھایا گیا ہے جس پر سعادت حسن منٹو نے اپنی آواز بلند کی تھی۔ منٹو کے زیادہ تر افسانے طوائفوں اور رنڈیوں پر ہی ہیں۔ اِس موضوع پر لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ دل پر پتھر رکھ کر ایسے الفاظ استعمال کرنا جو آپ نہ چاہتے ہوں، لیکن مظفر حنفی نے لکھنے کی اچھی کوشش کی ہے، وہ اس میں کس حد تک کامیاب ہیں یہ آپ ہی افسانہ پڑھ کر طے کیجیے۔ میں تو صرف اپنا View شیئر کر رہی ہوں۔ اس افسانے میں کملا ہی افسانے کا خاص کردار ہے۔ کملا جسم فروشی کے پیشے سے منسلک تھی۔ ہر رات کوئی نیا شخص آتا، اس کی عزت لوٹتا، پیسے دیتا اور چلا جاتا۔ کئی گاہک تو ایسے بھی آتے جو پہلے غالبؔ یا ذوقؔ کی غزل سنتے، اس کے بعد کچھ کرتے۔ کملا بہت تھک چکی تھی، لیکن ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ مجھے کل اس شہر سے روانہ ہونا ہے۔ کملا نے نہ چاہتے ہوئے بھی ہاں کر دیا اور اس نے بھی ایک وحشی درندے کی طرح ۱۲/بجے سے رات ۴/بجے تک کملا کو نہیں چھوڑا۔ اس کے جاتے ہی کملا کی آنکھ لگ گئی۔ لیکن ایک آواز نے اس کی آنکھ کھول دی۔ مشہور نیتا شری شوبھت چند کی آمد کا اعلان تھا۔ کملا بھی اس نیتا کی تقریر سننے گئی، حالاں کہ اس کہانی میں تقریر کا ذکر کہیں نہیں ملتا کہ نیتا نے کیا تقریر کی، لیکن بڑی بڑی باتیں کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے طوائفوں کی زندگی پر بھی بات کی کہ وہ بھی تو ہماری مائیں، بہنیں ہوتی ہیں۔ کملا کو چند منٹوں کے لیے بہت خوشی کا احساس ہوا کہ کوئی تو ہے جو ہم جیسی عورتوں سے ہمدردی رکھتا ہے۔ لیکن جب وہ اسے قریب سے دیکھتی ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے نکلتا ہے، "ارے یہ تو رات والا گاہک ہے۔"

مظفر حنفی کہانی کا منظر نامہ بھی اتنی خوب صورتی سے پیش کرتے ہیں کہ قاری ان کے جملوں میں ہی گرفتار ہوجاتا ہے۔ دیکھیے ان کی کہانی 'احسان مند' کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

''مینھ کے ہلکے ہلکے چھالے پڑ رہے تھے جن میں خنک ہوا کے جھونکے ادھر اُدھر بھٹکتے پھرتے تھے۔ ساگون، ساج اور تنساب کے تناور درختوں سے پانی کے قطرے بڑی ہم آہنگی کے ساتھ پتھریلی زمین پر ٹپک رہے تھے۔ مینڈکوں کی ٹرٹر اور جھینگروں کی ریں ریں نے سماں باندھ رکھا تھا۔ کہیں کہیں خود رو پھولوں کی جھاڑیاں کسی تناور درخت کو اس طرح گھیرے کھڑی دکھائی دیتیں جیسے قدرت نے اپنے ہاتھ سے تیار کرکے بہت بڑا گلدستہ وہاں پھینک دیا ہو۔ مخملی گھاس ڈھلان کے آغاز سے لے کر پہاڑی کی چوٹی تک لہلہا رہی تھی۔''

مظفر حنفی کی کہانی 'اونچی دوکان' میں نچلے طبقے پر ہونے والے ظلم و زیادتیوں کو پیش کیا گیا ہے۔ افسانہ ہماری زندگی کی سچائیوں سے ہی بنتا ہے، کئی بار ہم ایسے مسئلے بھی پیش کردیتے ہیں جو دوسروں کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن اچھا افسانہ نظریے کو پیشِ نظر رکھ کر نہیں لکھا جا سکتا، بلکہ زندگی کو ہی پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔ مظفر حنفی کی اِس کہانی میں بیان کی سچائی نظر آتی ہے۔ مسز انجم ایک رئیس گھرانے کی خاتون ہیں جو خریداری کے لیے بازار جاتی ہیں۔ سب سے پہلے کہانی میں مارکیٹ کا منظر نامہ پیش کیا گیا ہے۔ مسز انجم کی کار ہارن مارتی ہوئی ایک غریب بساطی کی دوکان کو الٹاتی ہوئی گزر جاتی ہے اور وہ بے چارہ اپنی قسمت پر روتا رہتا ہے۔ اس کے بعد مسز انجم ایک ساڑی کی عالی شان دوکان پر جاتی ہیں اور چھ ساڑیاں خرید کر الگ رکھوا دیتی ہیں۔ پھر آکر کار میں بیٹھ جاتی ہیں اور رسالے کا ایک افسانہ پڑھنے لگتی ہیں، اچانک ڈرائیور سے کہتی ہیں کہ مجھے اپنی بچّی کے لیے چاکلیٹ لینی تھی وہ تو میں بھول ہی گئی۔ ایسا کرو اس بوڑھے سے انگور خرید لو۔ بوڑھا من ہی من بہت خوش ہوتا ہے کہ آج تو اس کے سارے انگور بِک جائیں گے۔ وہ پندرہ روپے کہتا ہے، لیکن مسز انجم دس روپے ہی دے کر جاتی ہیں۔ خیر بوڑھا خوش ہوجاتا ہے، لیکن کار میں بیٹھتے ہی مسز انجم ایک انگور اٹھا کر کھاتی ہیں جو میٹھا نہیں ہوتا اور اس کے ہاتھ سے دس کا نوٹ چھین کر انگور سڑک پر پھینک دیتی ہیں۔ بوڑھا منھ تکتا رہ جاتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ غریب طبقے کو ہمیشہ نہ صرف پیسے والوں کی، بلکہ ہر اس شخص کی زیادتیاں برداشت کرنی پڑتی ہیں جو اعلیٰ طبقے کا ہو، چاہے وہ مسز انجم ہوں یا ہمارے ملک کے نیتا۔ ہمیشہ ان کا حق مارا جاتا ہے۔ اس بات سے متعلق برناڈ شا نے بالکل صحیح لکھا ہے:

''کیا یہ دنیا کا عجیب گورکھ دھندا نہیں ہے کہ سال بھر تک سخت محنت کرنے اور گرمی، سردی، برسات وغیرہ کی سختیاں برداشت کرنے کے باوجود ایک کسان یا مزدور تو مشکل سے اتنے پیسے کما سکے جس سے وہ اپنے اہل وعیال کی پوری طرح پرورش بھی نہ کر سکے، مگر ایک وکیل عدالت

میں صرف آدھ گھنٹے کی بحث سے ایک خونی قاتل کو بچا کر اور انصاف کے گلے پر چھری چلا کر ہزاروں کما لے۔''

افسانے میں مظفر حنفی نے مکالمے اچھے انداز میں پیش کیے ہیں۔ دیکھیے:

''اچھا سب ہی لے لیں گے۔ دس روپیوں میں دے گا؟''

دام کم تھے بوڑھے کو صرف چھ آنے بچ رہے تھے لیکن اس نے سوچا رات ہو رہی ہے اور کل بیوپاری بغیر پیسے لیے مال نہ دے گا۔ چلو یہی غنیمت ہے۔ بولا:

''نقصان ہے لیکن خیر لائیے......''

مسز انجم نے پرس سے دس روپے کا نوٹ نکال کر بوڑھے کو دیتے ہوئے انگور دانتوں سے توڑ لیا۔ انگور قدرے ترش تھا۔ بوڑھا جا ہی رہا تھا کہ ہاتھ بڑھا کر نوٹ اس سے چھین لیا اور انگور کی ٹوکری اٹھا کر باہر پھینک دی...... ''دغاباز کمینے! دھوکا دیتا ہے......''

اسی طرح مظفر حنفی کا افسانہ 'منت کی چادریں' بھی ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ کم الفاظ میں زیادہ بات کہنے کی اچھی کوشش کی گئی ہے۔ افسانے میں دادا میاں کے مزار کا ذکر کیا گیا ہے۔ دادا میاں کا مزار ایک ایسا مزار تھا جہاں ہر شخص کی منتیں پوری ہوجاتی تھیں، اگر کوئی اپنی زندگی سے مایوس ہے یا کاروبار میں نقصان ہو رہا ہوتا تو وہ ضرور مزار پر جاتا اور پھر منت پوری ہونے پر ایک چادر ضرور چڑھاتا۔ اسی طرح ایک لکھپتی کو کاروبار میں بہت بڑا نقصان ہوتا ہے۔ لکھپتی تو دور کی بات گھر میں کھانے تک کو کچھ نہیں بچتا۔ ویسے وہ مزاروں وغیرہ پر بھروسہ نہیں رکھتا، لیکن اپنی بیوی کے زور دینے پر وہ بابا صاحب کی مزار پر جاتا ہے اور منتیں کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ اگر میں اپنا سارا قرض چکا دوں گا تو آپ کے مزار پر پانچ ہزار روپے کی چادر چڑھاؤں گا۔ ایسا ہی ہوا۔ اسے دھندے میں خاصا منافع ہوا اور اس نے مزار پر ایک قیمتی ریشمی چادر بھی چڑھائی۔ ایسے ہی ایک دن ایک چور مزار پر گیا۔ اس نے بابا صاحب سے کہا کہ جتنی بھی جیبیں کترتا ہوں پکڑا جاتا ہوں، ایسا کچھ کیجیے کہ میری کچھ کمائی ہوسکے۔ ایسا ہی ہوا اس نے بھی چادر چڑھائی۔ ایک دن ایک عورت اولاد کی بھیک مانگنے مزار پر گئی کہ بابا صاحب میری اولاد نہیں ہے۔ مجھے اولاد سے نوازیے۔ ایسا ہی ہوا۔ ایک مرتبہ ایک بیوہ گئی جس کی بیٹی کی شادی نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے بھی دعا مانگی وہ بھی قبول ہوئی۔ لیکن ایک واقعہ بے حد عجیب ہوا۔ ایک شخص جوتے پہنے ہی مزار پر جا کر گڑگڑانے لگا اور کہنے لگا کہ مجھے نوکری نہیں مل رہی ہے اس لیے کہ میرے پاس رشوت دینے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ میں تیری سبھی چادریں لے کر جا رہا ہوں شاید یہی میری مدد کریں گی۔ کچھ دن بعد وہ ایک بڑا افسر بن گیا۔ ۳؍مہینے بعد وہ سبھی چادریں واپس لے آیا اور پکڑا گیا اور اسے جیل ہوگئی۔ افسانے میں یہ پیغام دیا گیا ہے کہ اوپر والا سب کی دعائیں قبول کرتا ہے، لیکن صبر وسکون سے کام لینا چاہیے۔

مظفر حنفی کا یہ افسانوی مجموعہ ’بھولی بسری کہانیاں‘ نئی نسل کے لیے ایک قیمتی تحفہ ہے۔آخر میں مظفر حنفی کی کہانیوں سے متعلق کرشن چندر کی رائے کا ایک اقتباس پیش ہے:

’’مظفر حنفی کو بات کہنے کا ڈھب آتا ہے اور افسانے کی تخلیق کے سارے لوازم معلوم ہیں۔کون سی بات قاری سے کس وقت کہنی ہوگی، کون سی بات چھپا کر رکھنی ہوگی اور صرف آخری سطر میں مٹھی کھول دینا ہوگی۔ حالاں کہ آج کل قاری بہت ہوشیار ہو چلا ہے، اکثر اوقات افسانہ ختم ہونے سے پہلے ہی اس کا انجام معلوم کر لیتا ہے، مگر مظفر حنفی مصنف اور قاری کی اس شطرنجی لڑائی میں اکثر وبیشتر اپنے قاری کو مات دے جاتے ہیں۔‘‘

○○○

عائشہ انصاری
ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، رابطہ نمبر:9520424082

مظفر حنفی بحیثیت افسانہ نگار

مظفر حنفی جدید اردو ادب کے علم بردار اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔انھیں نظم اور نثر دونوں اصناف پر قدرت حاصل تھی۔ان کے ادبی سفر پر تحقیقی نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ افسانہ نگار کی حیثیت سے اردو ادب میں داخل ہوئے اور تقریباً ایک دہائی نثری اصناف میں اپنا لوہا منوانے کے بعد صنف شاعری میں قدم رکھا اور جلد ہی ایک شاعر کی حیثیت سے بھی اردو ادب میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ ان کے تخلیق کردہ افسانوں کی اہل ادب نے کھلے دل سے پذیرائی کی۔شاعر اور افسانہ نگار کے علاوہ نقاد اور مترجم کی حیثیت سے بھی اردو ادب میں اپنی چھاپ چھوڑی ہے۔لیکن افسانے اور شاعری میں انھیں جو مقام حاصل ہوا وہ کسی دوسری اصناف ادب میں حاصل نہ ہوسکا۔اس مقالے میں ہم مظفر صاحب کی افسانہ نگاری کے حوالے سے گفتگو کریں گے۔

مظفر حنفی کی افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۵۰ء سے ہوتا ہے۔وہ اپنے دوسرے افسانوی مجموعے ’دو غنڈے‘ کے پیش لفظ میں اپنے افسانوی سفر سے متعلق کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

’’۵۰ء تا ۶۰ء میں بڑی تیزی کے ساتھ افسانے ہی لکھتا رہا ہوں۔‘‘(۱)

افسانوی مجموعے ’اینٹ کا جواب‘ کے پیش لفظ میں فراق گورکھپوری نے بحیثیت افسانہ نگار مظفر حنفی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

’مظفر حنفی کے یہ افسانے اردو کے کئی اچھے رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ان افسانوں کو ہزار ہا شائقین ادب کی مقبولیت حاصل ہو چکی ہے......مظفر حنفی ہمارے نئے افسانہ نگاروں میں ایک ہونہار ادیب ہیں۔ یہ ان کا پہلا مجموعہ ہے۔ان کے افسانوں میں زندگی کے کئی پہلوؤں کی عکاسی ہے۔ بیان نہایت سلجھا ہوا ہے۔اس میں نیاپن ہے۔ان کا انداز دل کش ہے، مکالمے فطری ہیں اور پلاٹ میں جدّت ہے۔ پڑھنے والوں کو یہ افسانے کہیں سے گراں نہیں گزریں

گے۔ان افسانوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اگر نوجوان مصنف نے اپنی کوششیں جاری رکھیں تو وہ ترقی کی نئی منزلیں کامیابی سے طے کرتے جائیں گے۔‘‘(۲)

مذکورہ بالا اقتباس سے مظفر حنفی کی افسانہ نگاری کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔مظفر حنفی نے تین افسانوی مجموعے تخلیق کیے ہیں۔جس میں پہلا افسانوی مجموعہ ’اینٹ کا جواب‘ اگست ۱۹۶۷ میں مرکز ادب بھوپال سے شائع ہوا۔اس مجموعے میں کل ۲۱/افسانے شامل ہیں۔دوسرا افسانوی مجموعہ ’دوغنڈے‘ نومبر ۱۹۶۹ء میں نامی پریس لکھنؤ کے زیر اہتمام منظر عام پر آیا جو کل ۱۲/افسانوں پر مشتمل ہے۔تیسرا اور آخری افسانوی مجموعہ ’دیدۂ حیراں‘ کل ۲۴/افسانوں پر مشتمل ۱۹۷۰ میں شائع ہوا۔

جس وقت یہ افسانے منظر عام پر آئے اس وقت حنفی صاحب شاعر کی حیثیت سے ادبی دنیا میں مشہور و معروف ہو چکے تھے اور یہ بات نہ صرف ایک فن کار کے لیے بلکہ اردو ادب کے لیے قابل فخر ہے کہ ایک ادیب نثری اور شعری دونوں میدانوں میں بازی لے گیا۔لیکن اپنی اسی خوبی کے باعث وہ ناقدین و مبصرین کے تجزیاتی تبصروں کا نشانہ بنے۔اسی نوع کا ایک تبصرہ کلام حیدری نے کیا ہے جس میں انھوں نے حنفی صاحب کی شاعرانہ حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے افسانوں میں چند خامیوں کی نشاندہی کی ہے:

’’دراصل افسانہ نگاری مظفر حنفی کا میدان نہیں ہے۔اس سے میری مراد یہ ہے کہ پیش نظر مجموعے (دوغنڈے) میں جو کہانیاں ہیں، اس سے کچھ آگے بڑھ کر کہانی ’بنانے‘ کا پتہ چلتا ہے لیکن آپ ہی آپ ابلتا ہوا چشمہ نہیں ہے......ہمیں مظفر حنفی کی کہانیوں کا انتظار کرنا چاہیے، کیوں کہ مظفر حنفی کے پاس تخلیق کار ذہن ضرور ہے۔کیا پتہ آگے چل کر افسانوں ہی میں یہ ذہن پوری طرح ابھر آئے۔‘‘(۳)

حنفی صاحب کے افسانوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے افسانے حقیقت نگاری پر مبنی ہیں۔ ان کے افسانوں کے موضوعات نہ صرف زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں بلکہ ان کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کا جو پہلو انھوں نے افسانوں میں بیان کیا ہے وہ بچشم دید ہے۔ جس طرح پریم چند اور منٹو نے افسانہ نگاری کی بنیاد حقیقت نگاری اور بے باکانہ اظہار پر رکھی ہے، حنفی صاحب بھی اسی طرز تحریر کے مالک ہیں۔ان کی کہانیوں کے دل کش پلاٹ، سلیس و عام فہم زبان، گرد و نواح میں دیکھے جانے والے معمولی کردار، پر تاثر منظر نگاری افسانوں کو حقیقت سے قریب تر لانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن نے بہترین کہانی کی چند خوبیوں کی نشاندہی کی ہے۔ اگر اس پیمانے پر حنفی صاحب کے افسانوں کو تولا جائے تو ان کی کہانیاں ان تمام معیارات پر پوری اترتی ہیں جس کا ذکر ڈاکٹر محمد حسن نے کیا ہے:

’’کہانیوں کی سچی پہچان نہ تہذیبی فضا میں ہے نہ کردار کے بیان میں۔نہ سبک طرز میں نہ

چھوٹی چھوٹی باتوں کی نرمی اور گہرائی میں۔بات دراصل یہ ہے کہ کہانی کس حد تک (Socially Significant) سماجی طور سے بامعنی ہے۔کس حد تک وہ اپنے زمانے کے احساس (Sensibility) کو پیش کرتی ہے اور اسے کس حد تک سنوارتی اور پروان چڑھاتی ہے اور کس حد تک وہ زندگی کا نیا وژن دیتی ہے۔اس نئے وژن سے مراد یہ ہے کہ انسان اس کہانی سے آس پاس کی زندگی کی طرف نیا اور صحیح رویہ اپنا سکے۔گویا ہر اچھی کہانی زندگی کی تصویر بھی ہے اور زندگی کی نئی تصویر بنانے والی بھی ہے۔اچھی کہانی وہ ہے جو اپنے لکھنے والے کے اندر سے ابھری ہو، اور اس میں اس کا دور، اس کے اردگرد کی پوری زندگی بولتی ہو اور جسے پڑھ کر پڑھنے والے کو ایسا لگے جیسے اس نے زندگی کو ایک نئے رخ سے دیکھا ہے۔‘‘(۴)

مذکورہ بالا اقتباس میں محمد حسن نے مثالی کہانی کے لیے جن شرائط کو بیان کیا ہے، ان سبھی نکات پر مظفر حنفی کی کہانیاں کسی حد تک پوری اترتی نظر آتی ہیں۔ان کے افسانے مکمل طور پر سماجی ہیں بلکہ یوں کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کے افسانوں میں موجود واقعات اسی دنیا سے بلکہ آس پاس کے ماحول اور کرداروں سے اخذ کیے ہوئے ہوتے ہیں جو نہ صرف اپنے عہد کی عکاسی کرتے ہیں، بلکہ طرز احساس کی ترجمانی بھی کرتے ہیں۔ان کی ہر کہانی عام زندگی سے منسلک نظر آتی ہے اور اس کی مکمل تصویر پیش کرتی ہے۔حنفی صاحب کی بہت سی کہانیوں میں وہ خود ایک کردار بلکہ مرکزی کردار کی شکل میں موجود رہتے ہیں ساتھ ہی ہر کردار کے مکالمے اور منظر نگاری اس خوبی اور تاثر کے ساتھ پیش کرتے ہیں جیسے وہ ان ہی کی زندگی کا حصہ ہوں یا جنھیں انھوں نے بہت قریب سے محسوس کیا ہو، ان میں ان کے عہد اور معاشرے کے تلخ و شیریں حقائق افسانوں کے کرداروں کے ذریعے اس طرح منظر عام پر آتے ہیں کہ قاری کے دل پر دیرپا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔انھوں نے ہمیشہ رنگین و مسجع عبارت سے گریز کیا اور اپنی بات کو آسان و سلیس انداز میں پیش کیا ہے۔

مظفر حنفی کے افسانوں میں زندگی کے تضادات، وقت کی چیرہ دستیاں، بلاؤں اور آفتوں کے ستم، عموماً نچلے طبقے کی بے چارگی، بدحالی، بداخلاقی، مفلسی، بے انصافی، پابندیوں میں آزادی پر سادگی اور سچائی کے ساتھ اظہار خیال کیا گیا ہے۔ان کے بیشتر افسانے حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں جو زندگی کے تلخ حقائق کو پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی کہانیوں کے کرداروں کے نام اور واقعات کو بھی تبدیل کرنے سے گریز کیا ہے۔تخلیق کی مقصدیت و افادیت بھی حنفی صاحب کے نزدیک اہمیت کی حامل تھی جس کے ساتھ انھوں نے کبھی تغافل نہیں برتا۔

ان کے افسانے ’کہتے ہیں جس کو عشق‘ اور ’ایمان کی بات‘ میں وہ بہ ذات خود اپنے حقیقی نام کے ساتھ نہ صرف کردار کی شکل میں موجود ہیں بلکہ انھوں نے اپنی زندگی کے حقیقی واقعات بھی بیان کیے ہیں، جس طرح وہ

افسانہ ’غبار آئینہ دل‘ میں ایک کلرک ’گپتا‘ کی شکل میں خود موجود ہیں۔ محکمۂ جنگلات میں کلرکی کے دوران افسران سے ملنے والی اذیتوں اور پریشانیوں کی روداد کو انھوں نے اس افسانے میں ایک کلرک کے ذریعے پیش کیا ہے جو زبان سے تو کچھ نہیں کہہ پاتا لیکن اس کے احساس کو گویائی مل جاتی ہے۔ اسی طرح وہ اپنے بیشتر افسانوں میں کبھی حقیقی تو کبھی مختلف ناموں سے مرکزی کردار کی حیثیت سے موجود ہوتے ہیں۔ ’غبار آئینہ دل‘ سے اقتباس ملاحظہ ہو:

’’اے دستخط کرنے والی مشینوں! یہ جو فیصلے لکھے جاتے ہیں اور تحقیقات ہوتی ہیں اور احکامات صادر ہوتے ہیں اور جرمانے وصول ہوتے ہیں اور فائلیں آگے بڑھتی ہیں یہ سب ہم کلرک کرتے ہیں اور تم لوگ دماغ پر زور دیے بغیر صرف دستخط کرتے ہو۔ تم ہفتے بھر میں اتنا کام کرتے ہو جتنا ایک کام چور کلرک ایک دن میں کرتا ہے، لیکن تمہیں تنخواہ دس کلرکوں کی ملتی ہے۔‘‘ (۵)

مظفر حنفی کے زیادہ تر افسانے ان کے ذاتی تجربات و مشاہدات کا نتیجہ ہیں۔ ان کی کہانیوں کے کردار، واقعات و موضوعات حقیقی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں جنھیں وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے ذریعے کہانی کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ وہ اپنے گردونواح میں پیش آنے والے حادثات و واقعات کو بہت ہی خوب صورت اور دل کش انداز میں کہانی کے پیرائے میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اس کے کردار و واقعات حقیقی اور بولتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ عشق و محبت اور رومان زندگی کی حقیقت ہے اور چوں کہ حنفی صاحب حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں اس لیے وہ بھی اس موضوع سے بچ کر نہ نکل سکے۔ جنسی موضوع پر لکھتے ہوئے بھی انھوں نے حقیقت پسندی کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ رومانی افسانوں میں وہ حقیقت نگاری سے ضرور کام لیتے ہیں لیکن ان کا کلام ان حدود تک نہیں پہنچتا جہاں پہنچنے سے منٹو جیسے قابل افسانہ نگار کی تخلیقات کو فحاشی کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا۔ اس نوع کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

’’پھر اچانک امراؤ دہاڑنے لگا۔

’’ارے میں کہتا ہوں اتار کپڑے!‘‘

’’پاگل ہوئے ہو کیا؟ مجھے شرم آتی ہے۔‘‘

’’شرم کی ماں کا......‘‘ امراؤ نے ایک گندی سی گالی دی۔ اتار کپڑے۔ پھر عورت کی سسکیوں کی آواز مجھے سنائی دی اور میں دھڑکتے دل کے ساتھ باہری کمرے میں بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور لنگوٹ پہنے ہوئے امراؤ باہر نکلا۔ پھر سکڑتی سمٹتی اس کی بیوی بھی باہر آ گئی۔ اب اس کے جسم پر کپڑے کے نام پر صرف ایک پھنسی پھنسی سی چولی اور تنگ چڈی تھی۔‘‘ (۶)

مزید:

’’اس نے اٹھ کر بلب روشن کیا اور قد آدم آئینے میں اپنا عکس دیکھنے لگی۔ اب ایسی بری شکل بھی

نہیں، کہ کوئی ......شرم کے کارن وہ پوری بات بھی نہ سوچ سکی اور بستر پہ آ گئی۔ رات اسے خواب میں پھر خالد دکھائی دیا۔‘‘ (۷)

مظفر حنفی کے افسانوں میں محبت و رومانیت بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کی کہانیوں کی بنیاد عموماً مقصدیت اور اصلاح معاشرے پر رکھی ہوئی ہوتی ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حنفی صاحب نے جنس پر نہایت بے باکی سے لکھا ہے لیکن انھوں نے جنس کے بیان کو قاری کے شہوانی جذبات کی تسکین کے لیے نہیں بلکہ حقیقت نگاری اور مقصدیت کے پیش نظر جہاں اس کی ضرورت محسوس ہوئی ہے وہیں اس کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے جنس کا بیان اپنے افسانوں کو رنگین اور دلچسپ بنانے کے لیے نہیں کیا بلکہ ان کا مقصد معاشرے کے گھناؤنے چہروں کو سامنے لانا ہے جنھیں پڑھ کر قاری کو جنسی تسکین نہیں ہوتی بلکہ ایسے سماج سے دل میں نفرت اور کراہیت پیدا ہو جاتی ہے۔

حنفی صاحب اپنے طنزیہ لہجے کے ذریعے معاشرے کی خامیوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ وہ فقط طنز تک ہی نہیں رکتے بلکہ ان کے تلخ جملے سماج کے ناسوروں پر مرہم کا کام کرتے ہیں۔ زندگی کے تلخ حقائق اور روزمرہ کے مختلف مسائل پر انھوں نے اپنے منفرد طنزیہ اسلوب میں بڑی بے باکی سے نشتر زنی کی ہے۔ ’مہک‘، ’دو غنڈے‘، ’محبوب بانہہ کٹا‘، ’ٹی۔ اے بل‘، ’ایمان کی بات‘، ’ضرب کلیم‘ وغیرہ افسانوں میں ان کی زندگی کے مختلف ادوار کی جھلکیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ مظفر حنفی کی حقیقت بیانی، طنز اور تیکھے پن کے ساتھ سادہ و سلیس انداز بیان ان کے ہر افسانے سے مترشح ہے۔ مظفر حنفی ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں لیکن اردو ادب میں جو مقام انھیں بحیثیت شاعر حاصل ہے، افسانہ نگار کی حیثیت سے نہیں ہو سکا۔

○○○

حوالہ جات:

۱۔ پیش لفظ دو غنڈے، مظفر حنفی، ص ۳

۲۔ اینٹ کا جواب، مظفر حنفی، مرکز ادب، بھوپال، ۱۹۶۷، ص ۵

۳۔ تبصرہ دو غنڈے، کلام حیدری، مشمولہ: آہنگ، گیا، ۱۶/اکتوبر ۱۹۷۱ء، ص ۷۰۔۶۹

۴۔ آج کی ہندی کہانی، ڈاکٹر محمد حسن، مشمولہ: سالانہ شاعر، بمبئی ۱۹۷۲ء، ص ۸۷

۵۔ اینٹ کا جواب، مظفر حنفی، مرکز ادب، بھوپال، ۱۹۶۷ء، ص ۲۲۔۲۱

۶۔ دو غنڈے، مظفر حنفی، نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۶۹، ص ۱۰۰

۷۔ دو غنڈے (افسانہ تشنگی دل کی)، مظفر حنفی، نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۶۹، ص ۱۳۱

○○○

ڈاکٹر محبوب راہی
بارسی ٹاکلی

مظفر حنفی کی مکتوب نگاری

''خانگی خطوں میں اور خاص کر ان خطوں میں جو اپنے عزیز اور مخلص دوستوں کو لکھے جاتے ہیں ایک خاص دلچسپی ہوتی ہے، تکلف کا پردہ بالکل اُٹھ جاتا ہے اور مصلحت کی دراندازی کا کھٹکا نہیں رہتا۔'' (خطوط کی اہمیت، مولوی عبدالحق، بحوالہ شاد عارفی: شخصیت اور فن)

مولوی عبدالحق کے اس اقتباس سے وابستہ سب سے پہلے میں پروفیسر مظفر حنفی اور اپنے مابین رشتے کی نوعیت واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں تا کہ اس کی روشنی میں قارئین کے لیے خاکسار کے نام موصوف کے مکتوبات گرامی کی ٹھیک ٹھیک تشریح و تعبیر ہونے میں سہولت رہے۔ حقیر فقیر نے جب سے طلسم کدۂ ادب میں قدم رکھا ہے مظفر حنفی صاحب کے گنجینۂ معنی کے طلسم سے معمور دل کش طنزیہ لہجے، منفرد طرز اسلوب، دلفریب رنگ و آہنگ اور ایک نئے اور اچھوتے ذائقے کی حامل نگارشات کی سحر طرازیوں سے متاثر رہا ہے۔ **انما الاعمال بالنیات** کے مصداق کارساز حقیقی نے موصوف سے بالمشافہہ ملاقات کا ایک موقع اتفاقاً فراہم کر دیا اور ہوتے ہوتے یہ ملاقات خلوص و یگانگت کے بے تکلف رشتوں میں تبدیل ہوگئی۔ ہوا یوں کہ ملاقات سے کوئی ڈیڑھ دو برس پیشتر کھنڈوہ کے ارباب قلم سے ایک رسالے 'علم و شعور' کے اجرا کے تعلق سے برائے مشورہ ملاقات دوستانہ تعلقات استوار ہونے کا بہانہ ہوئی اور ان حضرات نے اپنے شہر میں اقبال صدی تقریبات ۱۱ رفروری ۱۹۷۷ء میں شرکت کے لیے خاکسار کو مدعو کر لیا۔ نووارد بساط شعر و ادب ہونے کے ناتے یہ میری ادبی زندگی کی اولین بڑی کامیابی تھی اور میرے لیے موجب اعزاز و افتخار بھی۔ پاکستان سے قتیل شفائی اور دلاور فگار کے علاوہ ہندوستان سے ظ۔ انصاری اور مخمور سعیدی جیسے جید قلم کاروں کی شرکت نے اس تاریخی پروگرام کو میرے لیے طلسم کدۂ حیرت و استعجاب بنا کر رکھ دیا تھا۔ مسرت و استعجاب کا احساس دگنا ہو گیا یہ جان کر کہ ڈاکٹر مظفر حنفی اس پروگرام کے نگراں اور سرپرست ہیں نیز یہ کہ کھنڈوا موصوف کا مولد و مسکن ہے اور قاضی حسن رضا وغیرہ آپ کے بچپن کے یار غار ہیں اور یہ بھی کہ دلی جیسے شہر کے تکلفات کا گرد و غبار صاف کر کے اپنے آپ کو ہلکا پھلکا کرنے

مکتوب

کے لیے مظفر صاحب اکثر کھنڈوا کی کھلی ڈلی فضاؤں میں بے تکلف دوستوں میں چند روز گزارنے کے لیے تشریف لاتے رہتے ہیں۔ یاد اقبالؔ پروگرام میری توقعات سے کئی گنا زیادہ کامیاب رہا۔ اس سے بھی کئی گنا کامیابی کا احساس مجھے مظفر صاحب کے ساتھ چند روز گزارنے کی سعادت پا کر ہوا۔ مرعوب کن تاثر زائل ہو کر ایک کھلے پن کے احساس نے ذہن و دل کو کیف آگیں بشاشت سے دو چار کر دیا۔ موصوف کی طنز آلود تحریروں سے جو ایک نوع کی غصہ ور شخصیت کی شبیہ عالم تصور میں ابھرتی ہے برتاؤ میں اس کے قطعی برعکس پایا۔ بات بات میں بذلہ سنجی، لطیفہ بازی، بے تکلفی، حاضر جوابی، فقرہ بازی، لہجے میں شوخی، لطافت، شگفتگی، شائستگی اور شستگی، چہرے پر ایک دل کش مسکراہٹ، حسبِ ضرورت باتوں میں علمیت، ذہانت اور فطانت، مختصر یہ کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی، کا سا عالم تھا، تین چار روز کب گزر گئے پتہ ہی نہیں چلا۔ ۱۵؍فروری کو مظفر صاحب دلی کے لیے اور میں اپنے گھر کی طرف لوٹا، میں کہ ویسے بھی تاثر پذیری میری فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہونے کے باعث معمولی سے معمولی غیر معمولی پن میرے ذہن و احساس پر انمٹ نقوش مرتسم کر جاتا ہے۔ اپنی پہلے ہی سے پسندیدہ شخصیت مظفر حنفی کی انتہائی غیر معمولی یادداشتوں کو کیوں کر فراموش کر پاتا۔ گھر آتے ہی شدت تاثر کے تحت موصوف کے نام اپنے اولین خط میں نہ جانے کیا لکھا۔ اس کا جو جواب موصول ہوا اس کی داد ہی دیتے بنتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

”دہلی

یکم مارچ ۱۹۷۸ء

برادر عزیز   خلوص اور یادیں!

اچانک آپ کا خط پا کر بے حد مسرت ہوئی۔ اگر آپ نے اسی طرح چند اور تعریفی خطوط مجھے بھیج دیے تو یقین کیجیے ہائی بلڈ پریشر میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ بھائی میرے، آپ میرے عزیز ترین دوست (۱) کے ساتھ ملے تھے، کسی قسم کا پردہ رکھ کر ملاقات کرنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا تھا۔ پھر میں اس زمین (۲) سے تعلق رکھتا ہوں جہاں خلوص اور صفائی قلب کی دولت خدا نے لوگوں کو افراط سے عطا کی ہے۔ دراصل دونوں آئینے مجلّا ہوں تو نقوش تہ در تہ گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔ آپ کے اور میرے درمیان وہی معاملہ ہوا۔ آپ کا خط میں نے (۳) وحید صاحب کو پڑھوا دیا تھا۔ غالباً جلد ہی خط لکھیں گے یا ممکن ہے لکھ چکے ہوں۔ کل رضا حسن کا خط بھی آیا۔ بڑا جذباتی آدمی ہے، خط ایسا ہے کہ جواب اسے ہضم کرنے کے بعد ہی لکھ سکوں گا۔ انشاء اللہ ہم لوگ گرمیوں میں کھنڈوا میں ضرور ملیں گے اور کھل کر باتیں ہوں گی، مشاعروں اور جشن ہائے مسرت کی تفصیلات بھی تیار کریں گے۔ البتہ اگر کھنڈوا والے گرمیوں سے قبل کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں تو دوسری بات ہے۔

خدا کرے آپ بعافیت ہوں۔

مظفر حنفی“

کمترین کے نام ڈاکٹر مظفر حنفی جیسے بلند قامت شاعر و ادیب کا یہ پہلا خط ہے۔ ہر قسم کے تکلف اور رکھ رکھاؤ کے گرد و غبار سے پاک شفاف محبت اور اپنائیت سے لبالب مجلّا، آئینے کی طرح تہ در تہ گہرائیوں تک جس کے نقوش اترتے چلے گئے کہ برسوں بعد آج بھی اسی طرح اپنی جگمگ بکھیر رہے ہیں، ظاہر ہے مظفر صاحب کے تئیں میری عقیدتمندانہ جذباتی وابستگی کے پیش نظر اپنے لیے محبت اور اپنائیت بھری اس مخاطبت سے مزین موصوف کا نامۂ شفقت پا کر میری مسرت کا عالم دیدنی تھا، بواپسی ڈاک جذبۂ تشکر سے لبریز عریضہ خدمت مظفر حنفی میں ارسال کیا جس کا جواب قدرے تاخیر سے ۳۰؍مارچ ۱۹۷۸ء کو بذریعہ پوسٹ کارڈ اپنے پتے سمیت مرحمت فرمایا گیا جو کچھ یوں ہے:

”۵۸۔۳۔ بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

۳۰؍مارچ ۷۸ء

برادر عزیز   خلوص!

تاخیر جواب کا باعث یہ ہے کہ اب میں نئے اور اپنے مکان میں منتقل ہو گیا ہوں۔ تمام کاغذات گڈ مڈ ہو گئے تھے۔ امید ہے آپ محسوس نہ کریں گے اور خوش ہوں گے کہ دہلی میں آپ کے قیام کرنے کا ایک بندوبست خدا نے کر دیا ہے۔ جی ہاں! کھنڈوا کے احباب اکثر پاسبان عقل کو دل سے دور رکھتے ہیں اور آتش نمرود میں اکثر بے خطر کود پڑنے کے عادی ہیں چنانچہ ابھی تو آپ دیکھیں گے کہ وہ اپنے مخلصین کو کس کس طرح پریشان کرنے کے حیلے نکال سکتے ہیں۔ اس وقت آپ کا خط سامنے نہیں ہے کہ ہر بات کا جواب لکھ سکوں، بہر حال خط میں تاخیر ہو یا جواب میں اختصار سے کام لیا جائے، ہر موقع پر یہ یقین رکھیے کہ آپ کے لیے دل میں خاص جگہ ہے۔ آج ہی رضا حسن کو خط لکھ رہا ہوں۔ احباب کو آداب!

آپ کا: مظفر حنفی“

اپنے اتاولے پن کے زیر اثر ظاہر ہے خاکسار تقلید غالبؔ میں:

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں وہ جو لکھیں گے جواب میں

بواپسی ڈاک جواب ارسال کر چکا تھا جس کا اندازہ حنفی صاحب کے ۲۳؍اپریل ۱۹۷۸ء کے

مکتوب گرامی سے ہوتا ہے جس میں تاخیر جواب کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی کتاب 'نقد ریزے' پر ملنے والے انعام کے سلسلے میں میری مبارک بادی پر کس زہر خند کے ساتھ حق گوئی و بے باکی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

'' مبارکباد کا شکریہ۔ میری کتاب میں صدر اکادمی اور ججوں میں سے بیشتر کے بارے میں تفصیل کے ساتھ ایسے ابواب ہیں جن کی سزا میں جرمانہ ہونا چاہیے تھا۔ حیرت ہے الٹے یہ ایک ہزار کیسے مل گئے۔'' (۲۲/اپریل ۸۷ء)

متذکرہ بالا خط کے بعد میرے پاس موجود حنفی صاحب کے ذخیرۂ مکتوبات میں ستمبر ۸۷ء کی کسی تاریخ کو پوسٹ کیا گیا خط ملتا ہے۔ اپریل تا ستمبر چار ماہ کا یہ خلا کچھ غیر فطری سا لگتا ہے۔ ممکن ہے اس عرصے کے خطوط میری افراتفری اور بے ترتیبی کی نذر ہو گئے ہوں جس پر جتنا ماتم کروں کم ہے۔ بہر حال آیئے لگے ہاتھوں موصوف کے مکاتیب کی تفصیلات کے ساتھ میرے تیئں موصوف کے رویوں پر مختصراً عرض کرتا چلوں جن کی روشنی میں ہمارے مابین رشتوں کے درجۂ حرارت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سابقہ سطور میں کھنڈوا میں ہمارے اولین تعارف کے بعد اس تعارف کے آہستہ آہستہ موانست میں تبدیل ہونے کا اندازہ قارئین کو ہو چکا ہوگا۔ اس کے بعد سے لے کر تا حال اس داستان لطیف ولذیذ کی تفصیل کا اجمال یہ ہے کہ میں چوں کہ تعلقات کی استواری کے بعد ۱۹۷۹ء میں ایم۔اے کر چکا تھا۔ موصوف کی نگارشات کی تہوں میں اترنے اور شخصیت کی پرتیں الٹ پلٹ کر نزدیک سے ان کا مطالعہ کرنے کی غرض سے پی ایچ۔ ڈی کے لیے تحقیق کرنے کی خواہش کا اظہار میں نے حنفی صاحب کے روبرو کیا۔ موصوف پہلے بوجوہ راضی نہ ہوئے بالآخر ہم دونوں کے مشترکہ دوست مرحوم قاضی حسن رضا کی یقین دہانی پر کہ خاکسار موصوف کے تیئں پورا پورا انصاف کرنے کی اہلیت رکھتا ہے، مظفر صاحب نے اجازت دے دی۔ ناگپور یونیورسٹی میں استاذی مرحوم منشاء الرحمن منشا کی زیر نگرانی رجسٹریشن کے لیے درخواست دی جو منظور کر لی گئی۔ مقالے کی تیاری کے اولین مرحلے میں رہنمائی حاصل کرنے کی غرض سے منشا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے نہایت شفقت کے ساتھ میری صلاحیت پر اعتماد کرتے ہوئے مجھے مقالہ کی تکمیل کے بعد حاضر ہونے کے لیے کہا۔ لاکھ عرض کیا کہ حضرت والا، ہیچمداں کی تخلیقی صلاحیتوں پر مشفقانہ اعتماد کا شکریہ لیکن پی ایچ۔ ڈی تو میں پہلی بار کر رہا ہوں۔ کم از کم طریقۂ کار تو بتا دیجیے۔ حضرت کا وہی جواب پا کر اور کوئی راستہ نہیں سوجھا تو میں سیدھا دلی جا پہنچا۔ صورت حال مظفر صاحب کے روبرو پیش کی۔ پہلے تو پتہ نہیں کیا نتیجہ اخذ کیا۔ مجھ پر برس پڑے۔ ''کیا تم سمجھتے ہو میں اپنے آپ پر تمہیں مقالہ لکھواؤں گا جس کے لیے ساری دلّی بدنام ہے۔'' اس وقت تو چپ رہا بعد میں عاصمہ بھابھی کا سہارا لے کر صورت حال ان پر واضح کرتے ہوئے کہ حنفی صاحب جس طرح اپنی زیر نگرانی ریسرچ اسکالر کو گائیڈ کرتے ہیں مجھے ابتدائی طور پر آغاز کار کے تعلق سے سمجھا دیں، ایسی سفارش کے لیے ان سے کہا،

موصوف راضی بھی ہوئے تو اس طرح کہ ایک سفارشی خط دے کر اپنے استاد مرحوم عبدالقوی دسنوی کے پاس بھوپال بھیج دیا۔ مرحوم کی خوش اخلاقی اور حسن سلوک کے چرچے سن رکھے تھے۔ اس سے کئی گنا نوازشات و التفات سے فیض یاب کرتے ہوئے انھوں نے اپنی نگرانی میں کی جانے والی پی ایچ۔ ڈی اور ایم فل کی فائلیں دکھلا کر ابواب کی تقسیم سے لے کر دوران مطالعہ کتب ورسائل سے مطلوبہ نوٹس کی نقلیں متعلقہ ابواب کی فائلوں میں نقل کرنے اور آخر میں جملہ نقل شدہ تمام مواد کو یکجا کر کے اسے آخری شکل دینے کے بارے میں کچھ اس انداز سے رہنمائی کی کہ مجھ پر مقالے کی تکمیل تک کے سارے راستے روشن ہو گئے۔ بھوپال سے گھر لوٹ کر کچھ اس انہماک کے ساتھ اپنے مقالے کی تکمیل میں لگا کہ معینہ مدت کے اندر اندر ساڑھے پانچ سو صفحات کی ضخامت کا مقالہ یونیورسٹی میں داخل کر کے ہی دم لیا۔

مظفر حنفی صاحب سے اولین تعارف سے پی ایچ۔ ڈی کی تکمیل تک کم وبیش چھ سات برسوں پر محیط واقعاتی تسلسل کو مذکورہ بالا سطور میں اجمالی طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس دوران تحریر کردہ حنفی صاحب کے خطوط، مقالے سے متعلق مطلوبہ معلومات، وقتاً فوقتاً دستیاب مواد کی فراہمی، ماخذات سے متعلق ضروری ہدایات کے ساتھ ساتھ ذاتی امور پر رہنمایانہ مشوروں، تبصروں اور تجزیوں پر مبنی ہیں۔ موصوف کے خطوط میں مشمولہ مضامین سے اندازہ ہو جائے گا کہ تحقیقی مقالے کے علاوہ بھی میرے بیشتر معاملات میں حنفی صاحب کا رویہ میرے ایک مشفق رہنما، استاد یا برادر بزرگ ومحترم کا رہا ہے۔ جب کہ خود انھیں محض ایک بے تکلف دوست ہونے پر اصرار رہے۔ ابتدائی چند خطوط میں موصوف نے میرے لیے آپ، جناب، کا پر تکلف تخاطب روا رکھا ہے۔ ۱۷/اپریل ۷۹ء کے مفصل مکتوب سے تکلفات کے پردے ہٹا کر اپنائیت کا رسیلا لہجہ اختیار کرتے ہوئے ''تمہارے اور رضا حسن کے خطوط ایک ساتھ ملے'' سے آغاز کلام کیا...... مظفر صاحب کے خطوط کی تفصیلات سیاق وسباق کے ساتھ پیش کرنے سے قبل اعداد وشمار کی ایک مختصر جھلک پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ پچھلے صفحات میں پیش کردہ ۳۰/مارچ ۷۸ء کے خط سے شروع ہو کر یہ سلسلہ نامہ وپیام ۹/اکتوبر ۲۰۰۵ء پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ خوش گوار سلسلے آج بھی بادی النظر میں کچھ بہتر صورت میں جاری وساری ہیں۔ ''جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی'' کے مصداق بس ذرا موبائل آن کیا اور جب تک جی چاہا گفت وشنید کے مزے لوٹ لیے لیکن یہ مزے محض چند ثانیوں کے لیے ہوتے ہیں۔ سلسلۂ گفتگو ختم، سب کچھ ختم۔ ان خطوط کی طرح کہاں کہ گزشتہ کم وبیش ساڑھے ستائیس برسوں کے دوران حنفی صاحب نے کب کب، کیا اور کس سیاق وسباق میں کہا ایک ایک لفظ جوں کا توں موجود۔ عالم تصور میں تحریر کو تقریر میں ڈھال کر جب جی چاہے موصوف کی آواز اور لب ولہجہ سے اکتساب لطف وسرور کرتے رہیے۔ افسوس صد افسوس سارا کچھ نیست ونابود کر کے رکھ دیا اس جدید موبائل اور انٹرنیٹ کلچر نے، ایک شاندار، جاندار اور مستحکم تہذیب

ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو کر رہ گئی۔ خیر تو عرض کر رہا تھا مظفر صاحب کے کم و بیش ساڑھے ستائیس برسوں کے دوران اپنے نام مختصر، طویل اور طویل تر مکتوبات گرامی کے بارے میں جن کی تعداد ایک سو چالیس ہے۔

اس سلسلہ جنبانی کی شروعات بھلے ہی رسماً ہوئی ہو لیکن دو سال کی قلیل مدت کے بعد ہی یہ سلسلہ ایک اہم مقصد یعنی پی ایچ۔ڈی سے وابستہ ہو گیا، لہٰذا خطوط کی غالب تعداد اور ان میں مشمولہ تحریریں تحقیق کے ضمن میں استفسارات کے جوابات نیز درپیش مسائل کی تشریح و تفہیم پر مبنی ہیں۔ لہٰذا ۷۸ء کے تمام خطوط رسمیات اور آپ، جناب کے تکلفات کے آئینہ دار ہیں۔ ۲/اگست ۷۹ء کا دوسرا اور تفصیلی خط میری ایم۔اے کی کامیابی پر مبارکباد کے ساتھ میرے لیے اپنے آپ پر پی ایچ۔ڈی کرنے کا اجازت نامہ ہے۔ اس سے قبل ۱۷/اپریل ۷۹ء والے خط میں میرے اولین مجموعۂ غزلیات 'ثبات' کی اشاعت کے لیے مہاراشٹر اردو اکادمی کی گرانٹ ملنے پر تہنیت ہے۔ پی ایچ۔ڈی کے لیے اجازت مرحمت فرماتے ہوئے مظفر صاحب نے لکھا ہے:

''بات یہ ہے کہ اس موضوع پر کام کرنے کے لیے تا حال میں افتخار احمد، رشید آثار اور اختر فراہی کو منع کر چکا ہوں۔ آپ سے خلوص اور بے تکلفی کا جو تعلق قائم ہو گیا ہے اس کے تحت دوسرے رخ سے بھی سوچنا پڑا...... یہ بھی ہے کہ مذکورہ بالا اشخاص کے مقابلے میں سب سے زیادہ باصلاحیت بھی آپ ہیں اور سب سے زیادہ حق بھی آپ ہی کو پہنچتا ہے۔ پھر یہ بھی کہ شاعر ہونے کے ناتے فنی نزاکتوں کے ساتھ بہتر انصاف آپ ہی کر سکیں گے۔'' (مکتوب ۲/اگست ۷۹ء)

بعد ازاں آغاز تحقیق ۷۹ء تا تکمیل مقالہ ۸۴ء تک تعداد اور طوالت کے اعتبار سے خطوط کا سال بہ سال فزوں تر ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ سلسلۂ نامہ و پیام ایک خاص مقصد کی تکمیل کے لیے جاری و ساری رہا۔ مرحوم منشا صاحب کی رہنمائی محض دعاؤں کی صورت میں شریک کار رہی۔ مظفر صاحب سے محبت اور بے تکلفی کے رشتوں کو میں تکمیل مقالہ تک درپیش مراحل میں، ان کی رہنمائی اور معاونت کی شکل میں کیش کرتا رہا۔

عرض کر چکا ہوں کہ تکمیل مقصد کے بعد بھی حنفی صاحب سے تعلقات کی حرارت میں ذرّہ بھر تخفیف نہیں ہوئی اور نہ انشاء اللہ تا دم زیست ہونا ہے۔ تاہم ۲/اگست ۷۹ء تا ۱۵/مارچ ۸۴ء لکھے گئے خطوط اس محنت طلب، صبر آزما، حوصلہ شکن معرکۂ کوہکنی کی باہم دگر مسلسل اور مربوط کڑیاں ہیں جو پانچ برسوں کی محنت شاقہ کے ثمر شیریں 'مظفر حنفی: حیات، شخصیت اور کارنامے' کی شکل میں ساڑھے پانچ سو صفحات پر مشتمل تحقیقی مقالے کو تکمیل دے کر مجھے حاصل ہوا جس پر ۱۹۸۵ء میں ناگپور یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی سند تفویض کی۔ فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی نے اشاعت کے لیے گراں قدر رقم عطا فرمائی اور شائع ہونے پر مہاراشٹر اردو اکادمی نے تحقیق کے اول انعام سے نوازا۔ (۴)

مظفر حنفی صاحب کے ان خطوط میں تحقیقی مقالے کی تلخیص، درکار کتب کی نشاندہی، رجسٹریشن سے

تکمیل تک قدم بہ قدم گراں قدر رہنمایانہ مشورے، طریقۂ کار اور اس سلسلے میں درپیش ضروریات کے اعتبار سے وہ سارے نسخہ ہائے کیمیا درج ہیں جن کا حسبِ ہدایت استعمال میری سرخروئی پر منتج ہوتا ہے۔ لہجہ بیشتر اپنائیت آمیز مشفقانہ اور مخلصانہ ہے۔ کہیں کہیں قدرے تلخ بھی ہو جاتا ہے جو موصوف کے فطری مزاج کا حصہ ہے۔ تیکھے، نکیلے، کٹیلے طنز کی نشتریت کبھی لطف دے جاتی ہے تو کبھی کبھار اس کی چبھن قدرے تکلیف دہ بھی ہوتی ہے۔ موصوف کے خنک مرہم جیسے پرخلوص الفاظ جس کی خراشوں کو فوراً مندمل کر دیتے ہیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

''کتابیات وغیرہ کی تیاری کے لیے آپ کو مجھ سے مسلسل رابطہ رکھنا ہوگا اور کئی بار ملاقاتیں کرنی ہوں گی۔ یہ ظاہر ہے کہ میٹر تک آپ کی دسترس میرے توسط سے بہ آسانی ہوگی۔ تبصرے اور تنقیدی مضامین کافی تعداد میں میرے پاس محفوظ ہیں۔'' (مکتوب ۳/اگست ۷۹ء)

''اس قسم کا کام کرنے کے لیے مندرجہ ذیل چند کتابیں دیکھ لینی چاہئیں: سوداؔ (شیخ چاند)، ذوق: سوانح اور انتقاد (تنویر علوی)، حسرت: حیات اور کارنامے (احمر لاری)، حیاتِ جاوید (حالیؔ)، میرؔ: حیات اور شاعری (خواجہ احمد فاروقی)، شاد عارفی: شخصیت اور فن (مظفر حنفی)، مقدمہ کلام آتش (خلیل الرحمن اعظمی)۔'' (مکتوب ۹/اکتوبر ۷۹ء)

''یہ تمام کتب یونیورسٹی کی لائبریری میں دستیاب ہیں، متعلقہ شاعر کے تمام مجموعہ ہائے کلام اور دیگر تحریروں کا بار بار مطالعہ بھی نئے نئے امکانات روشن کرتا ہے۔'' (مکتوب ۲۳/اکتوبر ۷۹ء)

''جب بھی پی ایچ۔ڈی کا کام سنجیدگی سے شروع کرنے کا ارادہ ہو اس کی ابتدا میری نثری تصنیفات پڑھ کر کر سکتے ہو، خصوصاً 'شاد عارفی: شخصیت اور فن'......اور 'نقد ریزے' تمہیں جلد از جلد دیکھ لینی چاہیے۔ اس سے تحقیقی کام کرنے کے سلسلے میں بہت سی باتیں صاف ہو جائیں گی۔'' (مکتوب ۶/دسمبر ۷۹ء)

''تمہیں اپنی پی ایچ۔ڈی کے لیے کام شروع کر دینا چاہیے، رجسٹریشن کے سلسلے میں تمام ضابطوں کی تکمیل ہو جائے تو مجھے لکھو، کتابیات کی فہرست تیار کر کے بھیج دوں گا۔ ایک دو بار تمہیں دہلی بھی آنا ہوگا کھنڈوا سے بہت سا نایاب میٹر ملے گا، بھوپال میں ہمارے استاد عبدالقوی دسنوی معاون ہوں گے۔'' (مکتوب ۱۲ جنوری ۸۰ء)

(اس وقت منظر عام پر آ چکی ۳۵/کتابیں جن میں امتیاز علی عرشی، فراقؔ گورکھپوری، احتشام حسین، مسعود حسین خاں، ظ۔انصاری، کرشن چندر، کنہیا لال کپور، خلیل الرحمن اعظمی، مخمور سعیدی، عمیق حنفی، خلیق انجم جیسے اکابرین کے پیش لفظ شامل ہیں) ان کے علاوہ اس دور کے ہندو پاک کے بیشتر ثقہ ارباب قلم کے ناموں کی

فہرست بھی حنفی صاحب نے فراہم کی ہے جنھوں نے مستقل مضامین یا تبصروں کی شکل میں ان کے فن پر اظہار خیال کیا ہے۔اس طویل چار صفحاتی خط کے اگلے حصے میں موصوف نے لکھا:

’’اپنے متعلق بات کرنے میں مجھے بڑا تکلف ہوتا ہے اور تمہاری خاطر اتنی لن ترانیاں ہانکنی پڑیں۔تم کو سب سے پہلے میری کتابیں پڑھ کر نوٹ اپنے طور پر تیار کرنے چاہئیں۔فن اور شخصیت پر کئی کتابیں پڑھو بطور خاص فانیؔ پر مغنی تبسم کی کتاب، محمد حسین آزاد پر اسلم فرخی کی کتاب، ذوق پر تنویر علوی کی کتاب اور شادؔ عارفی پر میری کتاب، اس طرح شخصیات پر کام کرنے کا طریقہ معلوم ہو جائے گا۔‘‘

مزید چند ہدایات کے بعد......

’’میری کتابوں کا مکمل سیٹ حاصل کرو۔میرے پاس اپنی کتابوں کی صرف ایک ایک ریکارڈ کاپی ہے۔یہیں ان سے استفادہ کر سکتے ہو، اور اب اس سلسلے میں مزید گفتگو پھر کبھی...... ہاں! اصول تحقیق پر لکھنؤ یونیورسٹی کی ’رہبر تحقیق‘، خلیق انجم کی ’متنی تنقید‘ رشید حسن خاں کی ’اصول تحقیق‘ اور تنویر علوی کی ’ترتیب متن‘ وغیرہ تمہیں ضرور پڑھنی ہیں۔’یم بہ یم‘ پر خلیق انجم کا پیش لفظ تعارفی نوعیت کا ہے...... یوں بھی نقاد مجھ سے خوش نہیں ہیں۔اپنے مضامین اور مقطعوں میں انھیں چھیڑتا رہتا ہوں۔ترقی پسند مجھے جدید شمار کرتے ہیں اور جدید لوگوں کو میں ترقی پسند نظر آتا ہوں۔بات یہ ہے کہ کبھی خوشامد اور تعلقات استوار کرنے کی روش اختیار کی نہ گروپ بندی کی، اس کے باوجود لوگ اگر کسی نہ کسی طرح اعتراف کرتے ہیں تو دراصل یہ ان کی مجبوری ہے۔‘‘

(۲؍مارچ ۸۰ء کے طویل مکتوب سے)

’’کھام گاؤں آؤں گا۔وہ لوگ کہتے ہیں جگن ناتھ آزادؔ کو ان کے لیے رضا مند کروں۔معاملہ یہ ہے کہ ان سب سے سابقہ پڑتا رہتا ہے۔میرے لکھنے سے ذرا سی رعایت ایک بار کر دیں گے اور مجھے کافی دنوں تک مفت خدمت کرنی ہوگی اس لیے احتیاط برتتا ہوں۔‘‘ (۴؍اپریل ۸۰ء)(۶)

’’کھام گاؤں والے ملیں تو کہنا ۷؍مئی کے لیے (جو قانون کے مطابق بھساول میں رات کو بارہ بجے کے بعد آٹھ مئی ہوگا) میرے لیے دہلی کی برتھ ریزرو کر رکھیں...... بواپسی ذرا وہ تینوں طرحی مصرعے لکھ بھیجو جن پر مشاعرے میں غزلیں پڑھی جائیں گی۔‘‘ (۷)(۲۰؍اپریل ۸۰ء)

’’ادھر ودربھ نامے کی تحریروں اور آنے والے ایک خط (جو منسلک ہے) سے اندازہ ہوا کہ شاید کھام گاؤں کے مشاعرے پر کچھ اعتراضات تم لوگوں نے کیے ہیں۔مناسب سمجھو تو اسی موقع پر میرے ساتھ کھام گاؤں میں جو واقعہ پیش آیا تھا وہ بھی عوام کے سامنے لاؤ کیوں کہ اس

کے چشم دید گواہ تم رہ چکے ہو۔‘‘ (۵؍فروری ۸۳ء)(۸)

’’مضمون میری مرضی سے چھپا ہے کہ میرا خیال ہے لوگوں کو اپنے بارے میں بے باکانہ اظہار خیال کا موقع دینا چاہیے۔‘‘(۹)

’’بھائی جتنا کچھ اس دور ابتلا میں کہیں سے مل جائے غنیمت جانو کہ آج کل متاع سخن کے خریدار کہاں ہیں اور خوشامد وغیرہ جیسے حربے استعمال کرنے کے لیے بھی ظرف چاہیے جو ہمارے پاس نہیں۔(۱۰)

’’مہاراشٹر اردو اکادمی کا پہلا انعام (ثبات پر) مبارک ہو۔امید ہے اعلان جلد ہو جائے گا۔‘‘ (۲۵؍نومبر ۸۰ء)

’’مبارکباد قبول کرو البتہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پہلے کی جگہ دوسرا انعام کیوں دیا گیا۔بات شاید قبل از وقت کھل گئی۔‘‘ (۳۰؍مارچ ۸۱ء)

’’مدیران رسائل کی نگاہ میں ٹیڑھی امیج بنی ہوئی ہے، اسے برقرار رکھنا چاہتا ہوں۔اپنی کسی کتاب پر تبصرے کے لیے ایک کے بعد دوسرا خط کسی مدیر کو نہیں لکھا۔‘‘(۱۱)

’’پھر کہتا ہوں تم نے ریسرچ کے لیے بہت گندے آدمی کا انتخاب کیا ہے۔‘‘(۱۲)

’’میں جانتا ہوں کہ یہ سب باتیں پڑھ کر تم کو الجھن ہوتی ہوگی کہ عجب بے ڈھب آدمی سے سابقہ پڑا ہے جو اپنی تعریف سے بھی خوش نہیں ہے۔‘‘(۱۳)

’’تحقیق میں بار بار کہا ہے کہ یادداشت پر بھروسہ کم کیا جاتا ہے۔ریسرچ اسکالر کے پاس ہر وقت کاغذ اور قلم ہونا چاہیے اور اس سے کام لینے کا حوصلہ بھی۔‘‘ (۱۵؍جنوری ۱۹۸۳ء)

’’نظامؔ کے لیے پیش لفظ کی سفارش تم نے کی، ساغر اعظمی کے لیے مضمون کی تمہارے دوست نظر ایٹوی نے، جوگیندر پال بالی صابرؔ کے مقدمے کے لیے رازؔ اٹاوی نے، تم اور تمہارے دوست مجھ خاکسار کو اتنی بلندیوں پر کیوں لے جانا چاہتے ہیں، میں اپنی اوقات میں رہنا چاہتا ہوں۔لوگوں کے خطوں میں تمہارے حوالے سے فرمائشیں مجھے سخت ناپسند ہیں۔‘‘ (۲۵؍اپریل ۱۹۸۳ء)

’’میری سفارش کا طریقہ وہ نہیں ہوتا جو تم یا رضا حسن پسند کرتے ہو کہ براہ راست سفارش سے سبکی کا پہلو نکلتا ہے، کوشش کرتا ہوں کہ متعلقہ شخص کا وقار بھی قائم رہے۔بظاہر سفارش بھی نہ معلوم ہو اور نتیجہ خاطر خواہ نکلے۔‘‘ (۵؍فروری ۱۹۸۳ء)

’’دیکھو بھائی! بحث کرنے کے لیے بھی مخاطب صحیح کی ضرورت ہوتی ہے، سخن شناسوں کی تحسین حاصل کرنے کے لیے کاوش کرنا تو سمجھ میں آتا ہے نا آشنایان ادب سے تکرار میں وقت ضائع

کرنا مناسب نہیں۔ اپنی ہی راہ کھوٹی ہوتی ہے۔'' (۱۱/ اپریل ۸۳ء)

''حسن رضا اور تم مجھے معلوم نہیں کیا سمجھتے ہو۔ بے اثر سا کھردرا آدمی ہوں۔ جس حد تک ممکن تھا۔ اگلے برس کا وعدہ پھر فضل تابش نے کیا ہے...... تمھیں صورتِ حال کو سمجھنا چاہیے۔ اس پیچیدگی میں خود مجموعی خدمات والا میرا انعام رک چکا ہے۔ عہدیداران نے پخ لگائی کہ یہ شخص ایم پی کا نہیں، یو پی کا ہے۔'' (۲۶/ جون ۱۹۸۴ء)

(قاضی حسن رضا کے مجموعے میثاق کے لیے کہا تھا جو مدھیہ پردیش اکادمی نے آئندہ سال شائع کر دیا لیکن حنفی صاحب نے جن مجموعی خدمات کا ذکر کیا ہے، افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ موصوف کی پیدائش ایم۔ پی کے شہر کھنڈوہ میں ہوئی۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم وہیں ہوئی۔ ابتدائی ملازمتیں اور اعلیٰ تعلیم ایم۔ پی کی راجدھانی بھوپال میں ہوئی۔ اس روشن حقیقت سے واقف ہونے کے باوجود ایم۔ پی کے ارباب بست و کشاد بار بار اقبالؔ سمان کے سلسلے میں مظفر صاحب کو مسلسل نظر انداز کر رہے ہیں جب کہ ادبی قامت میں ان سے بہت چھوٹے اس اعزاز سے سرفراز کر دیے گئے ہیں)

''کوشش کروں گا کہ ظ۔ صاحب تمھارے فنکشن میں آجائیں۔'' (۲۹ فروری ۱۹۸۸ء)

''چند روز ہوئے شارجہ، بحرین اور دبئی سے تین مشاعروں کے دعوت نامے آئے ہیں۔ عاصمہ بضد ہیں کہ رضامندی بھیج دوں۔ لیکن وہاں کون محبوب راہی بیٹھا ہے میرے لیے۔'' (۲/ دسمبر ۸۸ء)

''نیشنل اسکیم بہت اچھی اور بروقت ہے لیکن تم بیگم کے بغیر اس سے استفادہ ہرگز نہیں کرو گے۔ ان کے لیے کچھ انتظار کر لو۔ مئی کی جگہ جون میں نکلو، انھیں اور بچوں کو ساتھ لاؤ، وہ جو شعر ہے:
''بہر گامے تو برداری زتو پائے زمن چشمے'' تمھاری بیگم کے لیے سنبھال رکھا ہے۔ انھیں مطلب سمجھا دینا۔'' (۴۰/ مئی ۱۹۸۹ء)

''پیارے! جب آدمی بے نیاز ہوتا ہے تو خداوند کریم اسے توکّل کی دولت سے بھی نوازتا ہے اور خود اعتمادی بھی عطا کرتا ہے۔ زیادہ انعام، اعزاز، کرسیاں اور عہدے حاصل کرنے والے فن کار پہلے خود کو اور پھر اپنے فن کو بیچتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہر ہر سانس پر ادا کرو، ہم نے یہ سودا کبھی نہیں کیا پھر بھی اس نے ہمیں مخالفین کے ہجوم میں سرخرو اور سربلند رکھا۔'' (۱۰/ اپریل ۱۹۸۹ء)

''تمھاری بیگم کے بارے میں جو کچھ کہتا یا لکھتا ہوں اس میں ہرگز کوئی بناوٹ نہیں ہوتی کہ میں اس ڈھب کا آدمی ہی نہیں ہوں۔ ان کی قدر کرو اور ان کے ساتھ مل بیٹھنے کا وقت نکالو۔ تمھاری ترقی میں ان کا نصف سے زائد حصہ ہے بخدا۔'' (۱۴)

''تمھارے لیے کتابیں انجمن ترقی اردو نے وی۔ پی سے بھیج دی ہوں گی...... ضروری کتابیں اور

ریسرچ کے بارے میں پلان وغیرہ پر تمھاری آمد کے بعد غور کر لیں گے...... میرا خیال ہے جو میٹر تمھارے پاس ہے اور جتنے عرصے تک تم میرے ساتھ رہے ہو ان کو بنیاد بنا کر شروع کے دو ابواب (سوانح حیات اور شخصیت) مکمل کر سکتے ہو۔'' (مکتوب ۱۶/ ستمبر ۱۹۸۰ء)

''منشاء الرحمن آئے تھے، چند پاکستانی رسائل لے گئے ہیں۔ ماہ نو کراچی، اکتوبر ۱۹۸۹ء میں شاؔد عارفی پر ایک مضمون میں میرا تفصیلی ذکر منفی انداز میں آیا ہے۔ ان سے کہا تھا کہ پرچہ تمھیں بھیج دیں۔ حاصل کر لو تو ایک حوالہ اور بڑھے گا۔ ہندی کا جو اقتباس تم لے گئے تھے وہ 'آدھونک اُردو اتہاس' مرتبہ دیویندر اسّر کے ص ۳۰ میں شامل ہے۔ اس کا حوالہ دینا بہتر ہوگا۔ انجمن ترقی اردو پاکستان سے عبدالقوی دسنوی صاحب کی کتاب 'عبدالحق بنام محوی' میں بھی میرا ذکر ہے۔'' (۴/ ستمبر ۸۱ء)

''اوراق' میں 'طلسم حرف' پر نارنگ صاحب کا مضمون آیا ہے، پھر انور سدید کا تبصرہ۔ مضمون تم کو مل چکا ہے۔ تبصرے کی نقل بھیج رہا ہوں۔ منشا صاحب جو پرچے ماہ نو کے لے گئے تھے اس میں شاؔد عارفی مرحوم کے خطوط پر بشارت فروغ کا مضمون تھا۔ (انھیں چار پرچوں میں سے کسی میں) مضمون میں مجھے مغلظات سے نوازا گیا تھا۔ چاہتا تھا تم دوسرا رخ دیکھ لیتے، سلسلے دور سے جڑتے ہیں۔ تمھارا امتحان بھی ہو جاتا۔'' (مکتوب ۱۲/ دسمبر ۱۹۸۱ء)

''ہماری زبان میں 'کھل جا سم سم' پر نارنگ صاحب کا تبصرہ تم نے دیکھ لیا ہوگا...... 'طلسم حرف' پر ظ۔ انصاری کا تبصرہ جو پہلے 'بلٹز' میں آیا تھا اب ان کی 'کتاب شناسی' میں (ص ۳۰۸ سے ۳۱۴ تک) شامل ہے۔ اس میں 'وضاحتی کتابیات' پر بے حد منفی تبصرہ بھی شامل ہے۔'' (مکتوب ۱۲/ دسمبر ۸۱ء)

''ریسرچ تمھیں کرنی ہے۔ مجھے مفت پریشان کرتے ہو اور شرمندہ بھی۔ بحیثیت دوست دہلی میں میرا گھر تمھارا گھر ہے۔ جب چاہے آجاؤ۔'' (۳۰/ دسمبر ۸۲ء)

''پھر لکھتا ہوں۔ تمھیں اپنے مقالے کی تکمیل پر زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ منشاء الرحمن صاحب ریٹائرڈ ہو چکے ہیں۔ اس طرح کے لوگ اس کے تعلق سے نامناسب فائدے اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں زیادہ مصلحت شناس نہیں ہوں۔ کبھی بھی میں کسی کو زیادہ سخت سست کہہ سکتا ہوں۔ لیکن تمھارے لیے مشکل ہو جائے گی۔'' (مکتوب ۱۱/ اپریل ۸۳ء)

''معاصرین کے مجموعوں کی ضرورت نہیں۔ تمھارے پاس 'جہات و جستجو' ہے، جس کے کئی مضامین میں ان کے اشعار اور ان پر رائیں ملیں گی۔ دو ایک انتخابات اور رسائل کے نمبر بھی

تمہارے پاس ہیں۔ان سے کام چلا سکتے ہو۔اشعار بہر حال دینے ہوں گے۔سب کے نہیں، چند ناموں کو اہم قرار دے کر ان سے موازنہ کر ڈالو۔غیر اہم لوگوں کو زیر بحث لانے کی ضرورت نہیں۔'' (مکتوب ۱۵/جون ۸۳ء)

''اپنا مقالہ سنہ ۸۳ء تک محدود رکھو۔مجھے مزید لکھنے سے باز نہیں رکھ سکتے اور سب کا ذکر کرنا چاہو تو مقالہ کبھی مکمل نہیں ہو سکے گا۔'' (مکتوب ۱۴/اکتوبر ۸۳ء)

''مقام شکر ہے کہ مقالہ لکھا گیا۔کتابیات میں تمہیں ہر وہ کتاب شامل کرنی ہے جو اس مقالے کی تیاری کے دوران تمہارے مطالعے میں آئی۔(مکتوب ۱۵/مارچ ۸۴ء)

''مقالہ تم نے اپنی طرف سے مکمل کر دیا ہے۔یونیورسٹی کو اپنا کام کرنے دو۔اس سلسلے میں میرا کسی سے کچھ کہنا مناسب نہیں۔'' (مکتوب ۷/مئی ۸۴ء)

''مقالہ دیکھ چکا ہوں......واقعی تم نے حق ادا کر دیا۔''(۳۱/جنوری ۸۵ء)

''ناگپور کی کیا خبر ہے۔ڈاکٹریٹ کب تک ایوارڈ ہوگی۔''(۳۱/مارچ ۸۵ء)

''۱۹/اپریل ۸۵ء کے ناگپور یونیورسٹی نوٹیفکیشن کے مطابق تم کو پی ایچ۔ڈی تفویض کر دی گئی ہے اور اب با قاعدہ ڈاکٹر ہو گئے ہو۔بہت بہت مبارک ہو۔عاصمہ بھی بہت خوش ہیں اور مبارکباد کہتی ہیں۔''(۲۱/اپریل ۸۵ء)

اقتباسات کے اس طولانی سلسلے کو سمیٹتے ہوئے اجمالاً عرض ہے کہ میری درخواست کو شرف قبولیت عطا فرماتے ہوئے مظفر حنفی صاحب نے ایک مشروط اور محدود دائرے میں رہتے ہوئے درکار مشوروں کے علاوہ مواد کی فراہمی کے معاملے میں جتنی اور جیسی معاونت فرمائی اس کا اندازہ موصوف کے خطوط کے پیش کردہ اقتباسات سے لگایا جا سکتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ مظفر حنفی کی شخصیت اور فن جیسے عمیق، وسیع اور بسیط موضوع پر پی ایچ۔ڈی کرنے کا خواب دیکھنا تو آسان تھا لیکن اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے حقائق کے جن خارزاروں سے گزر کر منزلِ کامرانی تک پہنچنے کا معاملہ تھا اس کے لیے جو اسباب و وسائل درکار تھے ان کا میرے پاس فقدان تھا۔دلی، بھوپال، سیہور، کھنڈوہ، فتح پور، کانپور، جیسے شہروں کے بار بار اسفار، متعلقہ افراد، اداروں، کتب خانوں وغیرہ سے روابط پیدا کر کے ان سے مواد کی فراہمی، ہزار ہا ہزار روپیے کی کتابوں وغیرہ کے لیے میری پرائمری مدرسی کی معمولی تنخواہ میں سات آٹھ افراد پر مشتمل خاندان کی کفالت کے بعد گنجائش ہی کہاں سے نکل سکتی تھی۔ بلا مبالغہ اگر مظفر حنفی صاحب، درپیش کم و بیش تمام مراحل میں قدم بہ قدم میری مشفقانہ معاونت نہ فرماتے تو میرے لیے اس آگ کے دریا کو عبور کرنا کسی طرح ممکن ہی نہیں تھا۔موصوف نے موضوع سے متعلق بیشتر کتابیں، رسائل، تراشے، خطوط اپنی ذاتی لائبریری سے مہیا کیے، جامعہ نگر کی ڈاکٹر ذاکر حسین

لائبریری سے مجھے مراعات دلوائیں کہ میں گھنٹوں آزادانہ کتابوں کی چھان بین، ورق گردانی اور ان سے ضروری نوٹس لے سکوں۔دلی، بھوپال، سیہور، کھنڈوہ وغیرہ کے احباب و متعلقین سے بشمول قیام وطعام وہ تمام سہولتیں فراہم کرا دیں جو میرے مقالے کی تکمیل کے لیے درکار تھیں۔ان تمام سہولیات کی فراہمی کے باوجود مجھے مقالے کی تکمیل کے لیے جتنی مشقتیں جھیلنی پڑیں جن جن آزمائشوں اور امتحانوں سے گزرنا پڑا، ان کی حقیقت ایک تو میں جانتا ہوں۔دوسرے میرا اللہ اور تیسرے خود مظفر حنفی صاحب۔اس کا ثمر بھی ویسا ہی لذیذ اور شیریں ملا۔جب مقالہ زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا تو وزیر آغا اور ظ۔انصاری جیسے ناقدین نے اسے شخصیات پر کام کرنے والوں کے لیے قابل تقلید قرار دیا۔ماڈرن پبلشنگ ہاؤس کو اس کے ایک سے زائد ایڈیشن شائع کرنے پڑے۔مہاراشٹر، یو۔پی، بہار اور بنگال کی صوبائی اکادمیوں نے اسے انعامات سے نوازا۔

سابقہ صفحات میں مظفر صاحب کے خطوط سے محض تحقیق کے سلسلے میں رہنمائی پر مبنی اقتباسات پیش کیے گئے ہیں۔موصوف سے جس نوع کے تعلقات کا ذکر میں سابقہ سطور میں کر چکا ہوں ان کے مختلف رنگوں کی جھلکیاں آپ کے خطوط میں جا بجا نظر آتی ہیں۔وہ جو کسی نے کہا ہے دوستوں کے نام خطوط میں مکتوب نگار اپنا دل نکال کر رکھ دیتا ہے۔کوئی پردہ دونوں کے درمیان نہیں ہوتا کمترین کے نام حنفی صاحب کے خطوط کی کئی خصوصیات میں سب سے اہم خصوصیت میرے تئیں ان کا بے پناہ اخلاص، بے لوث محبت اور بے انتہا اپنائیت کا جذبہ ہے جو ان کے ہر ہر لفظ میں ٹھاٹھیں مارتا ہے۔چند مثالیں دیکھیے:

''یقین جانو'ثبات' کی اشاعت سے مجھے اتنی ہی خوشی ہوئی جتنی اپنی کسی کتاب کے منظر عام پر آنے پر ہوتی ہے۔'' (مکتوب ۱۳/اکتوبر ۷۹ء، میرے اولین شعری مجموعے 'ثبات' کی اشاعت پر) ''تمہاری بھابھی کتاب دیکھ کر بہت مسرور ہیں اور مٹھائی کا تقاضہ کر رہی ہیں۔'' (۹/اکتوبر ۷۹ء، ثبات دیکھ کر)

''تمہارے پروگرام سے واپسی پر جو دشواریاں پیش آئیں وہ سر آنکھوں پر۔دوستوں کے لیے میرے بس میں ہو تو پیدل سفر کر کے ان کی تسکین قلب کا سامان فراہم کروں۔''(۱۵)

''یہاں انسان کو سانس لینے کے لیے وقت نکالنا بھی دشوار ہوتا ہے، خطوط کے جواب میں تاخیر ہوا کرے تو بدگمانی کی جگہ مجھ پر ترس کھایا کرو۔''(۲/مارچ ۸۰ء)

''یہ بچوں کے لیے نظمیں اور دوسری مزاحیہ'مذہبی نوعیت' کی چیزیں لکھنا اب بند کر دو۔اچھے ادبی رسائل میں چھپو، جتنا لکھتے ہو اس سے دس گنا زیادہ پڑھو۔میری بات فی الحال تمہیں اچھی نہ لگے گی لیکن دس سال بعد اس کا احساس ہوگا کہ سچ کہا تھا۔''(۱۶)

''مجھے چھوڑ کر گھر بھر تمہارا خط پڑھ کر بہت خوش ہوا۔صبا تسنیم، بفضلہ اچھی ہے۔تیزی سے

بڑھنے کی کوشش کررہی ہے تاکہ تمہاری آمد تک بڑے سے سوٹ کی مستحق ہوجائے۔'' (۱۷)

''تمہاری خوبیاں اور خامیاں دونوں مجھ پر کھلی کتاب کی طرح عیاں ہیں اور میں اپنے دوستوں کی کمزوریوں کو بھی عزیز رکھتا ہوں۔ البتہ ایک بات گرہ میں باندھ لو اور ہمیشہ یاد رکھو کہ شہرت اور عزت کا نشہ بہت خطرناک ہوتا ہے۔ برداشت کرنے کے لیے سمندر جیسا ظرف چاہیے۔ یہ چیز اگر چھلکنے لگے تو تریاق سے زہر ہلاہل بن جاتی ہے، مختلف کاموں کی اہمیت کے پیش نظر انھیں ردّ و قبول کرنے کی صلاحیت بھی اب تمہیں پیدا کرنی چاہیے۔'' (۴ر مئی ۸۱ء)

''تمہاری غزلیں دھڑا دھڑ چھپ رہی ہیں۔ دیکھ کر بیک وقت خوشی اور جھلاہٹ ہوتی ہے۔ ملاقات ہونے پر آخرالذکر تمہارے حصے میں آئے گی۔'' (۲ر دسمبر ۸۱ء)

''مضمون کے لیے انھیں ٹال چکا تھا۔ اب تم نے پھر سفارش لکھی۔ تم جانتے ہو میرے لیے احباب کی فرمائش کو رد کرنا دشوار ہوتا ہے۔'' (۱۸)

''جی! میں تمہاری تحریریں دیکھ رہا ہوں، اسباق، اردو ٹائمز، مورچہ، قومی آواز اور نکھار سب نگاہ سے گزرے، تمہارا خلوص مجھے جی بھر کر رسوا کر رہا ہے یقین مانو۔ مجھے فرشتے زیادہ پسند نہیں (کہ انھیں میں منکر و نکیر، عزازیل، کراماً کاتبین بھی ہیں) ہاروت و ماروت کا حشر سامنے ہے، خدا کے لیے مجھے ایک جیتا جاگتا معمولی آدمی رہنے دو۔'' (۶ر فروری ۸۲ء)

''سمینار اور سیاحت سے آج اتنی فرصت نکالی ہے کہ تمہیں خط لکھ سکوں۔

''مسافر تا حال سفر میں ہے، سری نگر کا لکھا ہوا خط ملا ہوگا۔'' (۱۹) (۲۱ر جون ۸۲ء)

''میں جو تمہارے ساتھ قربت کی بنا پر کبھی تلخ اور کبھی ترش رویہ اختیار کرتا ہوں اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیشہ تم سے ناراض رہتا ہوں۔ اب یہ دیکھو کہ اس اثنا میں گاندھی کی نظم اور کتاب پر تبصرے سے لے کر متعدد غزلیں تمہاری اچھے برے پرچوں میں دیکھیں اور تمہیں کچھ نہیں لکھا۔ بے شک تم خوب لکھتے ہو اور ثقلین حیدر جیسے ناقدین ان باتوں سے یقیناً خوش ہوں گے۔ بقول ظ۔ انصاری احتیاط لازمی ہے۔ (۲۰)

''اگر تم نے تا حال 'ثبات' پر آنے والا خرچ اس کی فروخت سے وصول نہیں کیا تو دوسرا ایڈیشن پیارے راہی کس توقع پر چھاپنے جا رہے ہو۔ رنگا رنگ سے اتنے ہنگامے اور دو تین ماہ کے بعد اگر صرف نو سو روپیے کما سکے ہو تو یہ تضیع اوقات کیوں۔'' (۲۱)

''تمہارے پچھلے دو تین خطوط نے مجھے بُری طرح جھلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا، تمہیں معلوم ہے کہ ایسے مواقع پر میں رضا حسن جیسے اپنے بے تکلف دوست کی خوش فہمیوں تک کو بڑھنے سے

روکتا اور بُرا مانتا ہوں۔'' (۲۲)

مزید چند تلخ و ترش اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

'' مجھے صرف مقالے کے سلسلے میں خط لکھو۔ مختصر اور اپنی کھال میں رہ کر۔ مرعوب کرنے والوں کی کمی دہلی میں بھی نہیں ہے۔ دور کے احباب یہ زحمت فضول کرتے ہیں۔'' (۲۸ر اپریل ۸۳ء کے طویل خط سے)

دوسرے ہی روز لکھا:

''تم شاید ضرورت سے زیادہ کھال میں آ گئے ہو۔ جانتے ہو مجھے بہت جلد اور بہت شدید غصہ آتا ہے اور بھڑاس نکال لینے پر کوئی سابقہ اثر باقی نہیں رہتا۔ اس لیے تمہیں بھی دیر تک محسوس نہیں کرنا چاہیے۔'' (۲۹ر اپریل ۸۳ء)

''اس بار تمہارے خط کا جواب خفگی کی بنا پر نہیں رکا۔ یوں بھی تم نے اپنے تئیں مجھے مفت ہوّا بنا رکھا ہے...... مکرر: صبا آ گئی ہے سلام لکھوانے، بہت بولتی ہے، سنو گے تو حیرت ہوگی۔ آج کل میرا آدھے سے زیادہ وقت لیے لیتی ہے۔ رات کو بھی دو تین بار جگا کر خیریت دریافت کرتی ہے۔'' (۱۴ر اکتوبر ۸۳ء)

''برادرم شکیل اعجاز کے خط سے معلوم ہوا کہ تمہاری صحت ٹھیک نہیں ہے۔ کسی بڑے بوجھ کے سر سے اتر جانے پر اعصاب بُری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ ایک آدھ سفر تفریحی کر ڈالو۔ ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' (۲۳) (۷ر مئی ۸۴ء)

''میں کیا لکھوں۔ میں اور تمہاری بھابھی دونوں تمہارے لیے فکرمند ہیں۔'' (۳ر نومبر ۸۴ء)

''تمہاری حالت کے بارے میں معلوم کر کے میں اور مجھ سے زیادہ عاصمہ پریشان ہیں۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرو، چند تفریحی سفر کر ڈالو اور جی چاہے تو کچھ دنوں کے لیے یہاں آ جاؤ، آج کل میری بھی چھٹیاں ہیں۔ رضا حسن کو ساتھ لیتے آؤ۔ گھومو پھرو۔ خدا کرے اس خط کے جواب میں تمہاری صحت یابی کی اطلاع ملے۔ ہم لوگ دعا کرتے ہیں۔'' (۱۱ر دسمبر ۸۴ء)

''تمہارا خط پا کر واقعی بڑا سکون ملا۔ آج کل میں تمہیں بہت سنبھل کر خط لکھتا ہوں کہ جذباتیت نہ آنے پائے اور تم کوئی منفی اثر قبول نہ کر لو۔ اس کے باوجود شاید پچھلے خط میں پریشانی کا کچھ اظہار ہو گیا۔ شرمندہ ہوں۔ تم نے اپنے خلوص، منکسر المزاجی اور اخلاق و رویّے سے مجھ جیسے بہت سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے، اور کئی مقامات پر تمہارے مخلصین تمہارے لیے دعائے خیر کرتے ہیں اور متفکر ہیں۔ اطمینان رکھو کہ صاف ستھرے لوگوں کے لیے ہر پریشانی

عارضی ہوا کرتی ہے۔ میں بھی دو ایک دن کا موقع نکال کر تمہیں دیکھنے آتا لیکن بوجوہ ہمت نہیں پڑی۔ بہر حال نارمل حالات میں کبھی بھی ٹپک سکتا ہوں۔ عاصمہ حالاں کہ صابھی تمہارے لیے دعا مانگتی ہے۔ متعلقین کو میری جانب سے واجبات کہو۔ وہ لوگ (خصوصاً بھابی) بالکل پریشان نہ ہوں۔ انشاء اللہ تم بحال رہو گے۔ گھر میں سکون کا ماحول رہے۔'' (۲۱ر دسمبر ۸۴ء)

''بہت پیارے راہی! امید ہے تم بالکل نارمل اور صحت مند ہو گے۔ دنیا بھر کی الٹی سیدھی باتوں پر جی کڑھانا بے کار ہے۔ زندگی ہنس کھیل کر احباب اور متعلقین کے ساتھ خوش رہ کر گزارنے میں بڑا مزہ ہے۔ یہ بھی کر دیکھو۔'' (۳۱ر جنوری ۸۵ء)

''خدا کرے تم اب بالکل نارمل ہو۔ خوب خوش رہو اور مستقبل سے اچھی توقعات رکھو۔'' (۱۵ر فروری ۱۹۸۵ء)

''خدا کرے تم اسی طرح خوش اور تندرست رہو۔ عاصمہ تمہارے خط سے بہت خوش ہیں اور دعا کرتی ہیں۔'' (۳۱ر مارچ ۸۵ء)

''خط ملا۔ یہ بات میرے لیے بڑی تسکین دہ ہے کہ اب تمہاری حالت قطعی نارمل ہے۔ ''محبت کرو اور محبت پاؤ'' کی پالیسی پر عمل پیرا رہو۔ انشاء اللہ زندگی خوش گوار رہے گی۔'' (۱۲ر اپریل ۸۵ء)

مذکورہ بالا خطوط سے میری بیماری کے باعث میرے تئیں مظفر صاحب اور عاصمہ بھابی کی مسلسل فکرمندی اور تشویش اور صحت یابی پر اطمینان و مسرت کے مخلصانہ اظہار سے ان کی بے پناہ چاہتوں اور بے مثال محبتوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دردمندی اور اپنائیت کے چھلکتے ہوئے جذبات سے لبریز ایسے خطوط کہ ایک بار مردہ بھی پڑھ پائے تو دوبارہ جی اٹھے، میرے دن بدن صحت مندی اور تندرستی کی طرف بڑھنے کے لیے بڑا سہارا ثابت ہوئے اور تمام مخلصین کی دعاؤں کے طفیل بفضلہٖ تعالیٰ میں اپنے سابقہ معمولات کی طرف لوٹ آیا۔ ڈاکٹریٹ اور صحت مندی حاصل ہو جانے کے بعد بھی مظفر حنفی صاحب کی محبتوں کے نامہ ہائے اخلاص و محبت کا سلسلہ برابر جاری و ساری رہا۔ مثلاً:

''صاحب عالم کی واپسی اور اکلوتی بیٹی کی خوشی بہت بہت مبارک، عاصمہ بھی دونوں اطلاعات پر مسرور ہیں اور میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہیں کہ چلو۔۔۔'' (۱۹ر اگست ۸۵ء، میری صحت کامل اور میری اکلوتی بیٹی ناظمہ کی شادی کی خبر پڑھ کر)

اسی خط میں یونیورسٹی کھلنے اور بچوں کے داخلوں وغیرہ کی مصروفیات کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے......

''اگر یہ بیڑیاں اتر گئیں تو مجھے آیا سمجھو ورنہ جی مسوس کر رہ جاؤں گا اور خود کو مدتوں مجرم تصور

کروں گا، تم اور تمہاری بیگم ناراض ہونے کا پورا حق رکھتے ہیں، گزارش صرف یہ ہے کہ اسے عذر لنگ نہ سمجھا جائے۔''

''امید کہ شادی بخیر و عافیت ہو گئی ہو گی۔ میں نے محض مبارکبادی تار بھیج کر کام چلایا۔ اب اپنی کوتاہی اور نفسیاتی کمزوری پر سخت جھنجھلاہٹ ہے کہ ایسے موقع پر دل کی جگہ عقل کے بہکانے میں کیوں آ گیا...... اب تم شادی کی تفصیلات لکھو۔ بچی کہاں ہے؟ (۲۴) کیا وہ سعودیہ جائے گی؟ (۲۵)...... سنا ہے تم کانووکیشن میں شرکت نہ کر سکے۔ (۲۶) یہ بھی خبر ہے کہ ہائر سیکنڈری میں آ گئے ہو۔'' (۲۷) (۲۱ر ستمبر ۸۵ء)

''بھائی اِدھر بھی سکون نصیب نہیں۔ سوائے اس کے کہ ہم ایک دوسرے کی دل دہی کرتے رہیں اور کوئی چارہ نہیں۔ امید ہے احمد آباد سے اعزا کی خیریت کے خطوط مل گئے ہوں گے۔'' (۲۸)

''کچھ تم سے خفا بھی تھا کہ تم نے رضا حسن جیسے دوست کو مجھ سے بدظن کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ لیکن رشتہ مضبوط ہے ہل کر رہ گیا۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ مجھے کبھی تمہاری نیت پر شبہہ ہوا ہو۔ تم نے بھی اسے جو کچھ لکھا ہو گا از راہ خلوص ہی لکھا ہو گا لیکن پھر بھی۔'' (۲۹)

''گھر والوں کی شکایت سر آنکھوں پر۔ اس بار کھنڈوا آنا ہو گا تو بارسی ٹاکلی بھی چند دن قیام رہے گا۔ ویسے ان سے عاصمہ اور میری شکایت تم نے کہہ دی ہو گی۔ دہلی والے اعزاز کے موقع پر مسز راہی کی عدم موجودگی بہت کھلی، انھیں سال بھر پہلے سے مدعو کر رکھا تھا۔'' (۳۰)

''تمہیں چھوٹے چھوٹے پچڑوں میں پڑ کر اپنی ذہنی صحت متاثر نہیں کرنا چاہیے۔ دنیا اس طرح چلنے سے رہی جیسی ہم چلانا چاہتے ہیں۔'' (۱۱ر دسمبر ۸۷ء)

''دادا بننے کی بہت مبارکباد۔'' (۲۹ر فروری ۸۸ء، پہلے پوتے مجاہد الاسلام کی پیدائش پر)

''جس طرح موڈ میں آ کر تم نے لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس طرح کی مصروفیات سے تمہاری طبیعت میں بشاشت رہتی ہے۔ پوسٹر میں نام دے چکے ہو اور میں کھنڈوا آ بھی رہا ہوں۔ اس لیے بے تکلف حاضر ہو جاؤں گا۔'' (۲ر دسمبر ۸۸ء)

''تمہارا اُبجھا بجھا سا خط ملا، اچھا ہوا کہ تم کوئلوں کی دلالی سے بچ گئے...... میں ۱۱ر دسمبر کو کھنڈوا پہنچ رہا ہوں۔ انشاء اللہ۔ پروگرام کیا کیا بنائے ۲۵ر اور ۲۶ر دسمبر کو شادی کی مصروفیات ہوں گی۔ ایسا کرو کہ بھابی سمیت آ جاؤ کھنڈوا، یا کہ ہم لوگ بارسی ٹاکلی تم لوگوں کو لینے آئیں۔ جو مزاج یار میں ہو یار بتا دے۔ خدا کرے تم رونی صورت بنا کر زیادہ دیر بیٹھے نہ رہو کہ مسئلہ زیادہ گمبھیر نہیں ہے۔'' (۷ر دسمبر ۸۸ء)

''آخرتم کوئلے کی دلالی کرکے رہے، میں تو سمجھا تھا بآسانی نجات مل گئی، خیر آج قاضی صاحب باصرار بیٹھ کر خط لکھوا رہے ہیں۔ میں انھیں اور احباب کو ساتھ لے کر ۱۶/ یا ۱۷/ کو بن بلائے مہمانوں کی طرح بارسی ٹاکلی پہنچ رہا ہوں۔''(۳۱، ۳۲، ۳۳) (۱۳/ دسمبر ۸۸ء)

''اردو اکادمی کی رکنیت بہت بہت مبارک ہو۔ عاصمہ بھی خوش ہیں۔ انشاء اللہ یہ سب ابتدائی زینے ہیں۔ کامرانیاں اور قدم چومیں گی، نظر بلند رکھو، حق پرستی شعار کرو، کسی کے سامنے سر جھکاؤ نہ کسی کے ساتھ بے انصافی کرو۔''(۱۰/ اپریل ۸۹ء)

''تمھارے ساتھ سفر اور چند دن خوش گزرے، امید ہے بعافیت گھر پہنچ گئے ہوں گے۔'' (۱۵/ اکتوبر ۹۱ء)

''اچھا کیا اکادمی سے مستعفی ہو گئے۔ یہاں ہم لوگوں نے بھی استعفیٰ دے رکھے ہیں۔ حکومت میٹنگیں کر رہی ہے کہ واپس لے لیں۔''(۳۴)

''قبل ازیں خط لکھ چکا ہوں، تمھیں کلکتہ یونیورسٹی کے اردو بورڈ آف اکزامنرس کا ممبر منتخب کیا گیا ہے۔ مبارکباد......رضا حسن اور دیگر احباب سے رابطہ قائم کرکے اکولہ، برہانپور، مانڈو وغیرہ (بڑواہا اور کھرگون مقصود باوا نے تجویز کیے تھے) میں تفریحی پروگرام مرتب کرو گے۔''(۲۵/ ستمبر ۹۳ء)

''میں ملتمس ہوں بیگم سمیت ۲۸/ مئی ۹۴ء کو سہیل کی شادی میں شرکت کیجیے۔ احباب کھنڈوا اور اکولہ کو ساتھ لائیے دہلی کی طرف۔ آپ لوگوں کے قدموں تلے میری آنکھیں بھی ہوں گی اور دل بھی۔''(۱۰/ مئی ۹۴ء)

''کھنڈوا والے اپنے ڈھنگ کے بہت پیارے پیارے لوگ ہیں۔ اصل میں اب انھیں صحیح مشورے دینے والے نہیں رہے۔ قاضی جتنا مخلص اور پیارا آدمی ہے اتنا ہی جذباتی اور ناسمجھ بھی ہے۔ کس سے مشورہ کرنا ہے اور کس سے کام لینا ہے اس کا فیصلہ بعض اوقات نہیں کر پاتا۔ بہرحال دوست ہے دیوتا نہیں ہے وہ۔ بخش دو۔''(۱۸ دسمبر ۹۴ء کسی غلط فہمی کی بنا پر قاضی صاحب کی شکایت کر دی ہوگی۔)

''مہاراشٹرا اکادمی کا انعام مبارک ہو۔ وہ اعزاز یا انعام چاہے چھوٹا ہو یا بڑا۔ پہلا ہو یا دوسرا جو بغیر سفارش اور جوڑ توڑ کے حاصل ہو، واقعی انعام ہوتا ہے۔''(۳/ اگست ۹۵ء)

''کیسے ہو! حبس دم ہی میں مزہ ہے کہ ہوا چاہتے ہو! سفر کی یادیں ابھی مہک رہی ہیں۔ دسمبر میں حسن رضا سے طے کرکے اپنی آمد کی تاریخوں سے مطلع کرو۔''(۹/ نومبر ۹۵ء)

''نئے مکان میں منتقلی بہت بہت مبارک ہو۔ حالاں کہ بقول غالب:

''ع: کی مِرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ''

دعا ہے کہ اس مکان میں اہل وعیال کے ساتھ خوش وخرم طویل زندگی بسر کرو۔ ذہنی اور جسمانی اعتبار سے صحت منداور شادکام رہو، بیگم راہیؔ کو ہم دونوں کی طرف سے مبارکباد۔ کہو تازہ بہوؤں کی تلاش میں کتنی کامیابی ہوئی۔ ورنہ آجاؤ ابھی ہگلی چلتے ہیں......گوا کے لیے تیار رہو۔''(۳۵)

''واقعی تمھارے صاحبزادے اپنے بارے میں زیادہ خوش فہمی رکھتے ہیں۔ یہ عمر بھی ویسی ہی ہے۔ انھیں ان کے حال پر چھوڑ کر بقیہ بیٹوں کی شادیاں کر دو۔ وہ حضرت جب خود اپنی پسند کا اظہار کر دیں اس وقت سوچ لینا۔''(۲۷/ مارچ ۹۶ء)

''خوب دلجمعی، اطمینان اور بشاشت کے ساتھ لکھو پڑھو اور خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے کروڑوں لوگوں میں تمھیں ممتاز اور صاحب اولاد بنایا ہے۔''(۱۲/ اگست ۹۶ء)

''میرا مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ کسی بھی معاملے کو اس حد تک نہ الجھاؤ کہ ذہنی سکون درہم برہم ہو۔''(۲۵/ جنوری ۹۷ء، کالج انتظامیہ سے دھوکا دہی کے بارے میں جان کر) ''اپنے آپ کو مصروف رکھو، گھریلو الجھنوں میں پڑے تو بیمار ہو جاؤ گے۔''(۱۴/ جنوری ۲۰۰۰ء)

''تم کو خداوند کریم خوش رکھے۔ ایسے ہی ایک موقع پر انیس نے امام حسین کی زبان سے کہلوایا تھا ''کس کس طرح شبیر کو خوش رکھتے ہیں عباس''(۳۶)

''یکمشت ایک نہ دو پورے تین نسخے اسباق کے ملے۔ سیراب کر دیا دل منت گزار کو' سرورق کی تصویر ہی اتنی پیاری ہے۔ ایسا شگفتہ شاعرانہ چہرہ، اول تا آخر ساری تحریریں جو تمھارے گوشے میں شامل ہیں بہت پسند آئیں۔''(۲۰/ جنوری ۲۰۰۵ء، اسباق کا گوشۂ محبوب راہی دیکھ کر)

''تم اپنے لیے مضمون کی فرمائش کرکے خود کو بھی اور مجھے بھی نقصان میں ڈالو گے۔ پیش لفظ اور تقریظ کا معاملہ کچھ اور ہوتا ہے مستقل مضمون میں نہج بدل جاتی ہے، ویسے انٹرویو اور مضامین میں تمھیں ہمیشہ یاد رکھتا ہوں۔ سعودی عرب ریڈیو سے انٹرویو میں اور سفارت خانہ ہند جدہ کے یادگار مجلّے میں جو باتیں کہیں وہاں تم بھی موجود تھے۔ فاروقی وغیرہ کی طرح میرا بھی وہی مضمون لگالو۔''(۹/ اکتوبر ۲۰۰۵ء)

مظفر حنفی صاحب کے اس شفقت آمیز، حوصلہ افزا اور تسلی بخش آخری خط پر نامہ و پیام کا یہ خوش گوار سلسلہ اختتام پذیر ہوا۔ اس کی جگہ بظاہر ایک جدید، متاثر کن اور سہولت بخش ٹیلی فونک رابطے نے نعم البدل کی صورت پیدا کی کہ جب چاہیں ایک دوسرے سے شرف ہم کلامی حاصل کر لیں لیکن سچ پوچھیے تو وہ بات کہاں مولوی مدن والی سی، سلسلۂ گفتگو ختم ہوا اور آوازیں ہواؤں میں تحلیل ہو کر خلاؤں میں گم ہو گئیں۔ بیٹھے رہیے تصورِ جاناں کیے

ہوئے جب کہ خط وکتابت کے مزے ہی کچھ اور ہیں۔اب یہی دیکھیے نا آج سے کوئی چونتیس برس قبل گزشتہ صدی کی مظفر حنفی صاحب کی محبتوں کی خوشبوؤں سے معطر، چاہتوں کی کھٹی میٹھی لذتوں سے لبریز تحریروں سے لفظ لفظ اکتساب کیف ونشاط کررہا ہوں اور گنجینۂ معنی کے طلسم اس تمام خزینۂ بے بہا کو فیض رسانی کے لیے آئندہ نسلوں تک پہنچانے کے لیے کتابی شکل میں محفوظ کردینے کی سعادت بھی حاصل کررہا ہوں کہ یہ خطوط محض یک رنگی نہ ہو کر بیک وقت رنگا رنگ، کثیر الجہات اور کثیر المعانی ومفاہیم ہیں۔ان میں نہ تو محض ہجر ووصال کی تلخ وشیریں حکایتیں ہیں نہ ہی ستم ہائے روزگار کی شکایتیں، یہ نہ تو کسی سیاسی، مذہبی، ادبی اور تہذیبی وثقافتی نظریہ تحریک کے پرچارک ہیں نہ کسی تجارتی یا کاروباری مشن کے مبلغ، ان میں نہ تو پند ونصائح کے دفتر ہیں نہ وحدت الوجود شہود جیسے کسی فلسفے کی تشریح وتفہیم۔ یہ محض خطوط ہیں۔سادگی وسلاست کے آئینہ دار لیکن ایسی سادگی اور سلاست کے حامل جو اپنے اندر نئے نئے مفاہیم اور نو بہ نو معنویت کے دروازے کھول کر مقصدیت کے کئی پہلوؤں اور افادیت کے کئی زاویوں سے روشناس کراتے ہیں۔ان میں مکتوب نگار کی شخصیت کے کئی روپ ہیں۔وہ اپنے مخاطب (مکتوب الیہ) کی کبھی ایک مشفق استاد کی شکل میں، کبھی تلخ وترش تو کبھی شیریں لہجے میں اپنے گراں قدر مشوروں سے رہنمائی کرتا ہے تو کبھی ایک بڑے بھائی کی طرح اپنے تجربوں کی روشنی میں اسے زندگی کے نشیب وفراز سے مطلع کر کے لڑکھڑاہٹوں، لغزشوں اور گمراہیوں سے بچاتا ہے جب کہ بیشتر ایک بے تکلف دوست کی طرح تکلفات کے سارے پردے ہٹا کر اسے رزم گاہ حیات میں معرکہ آرائیوں کے رموز ونکات سے آگاہ کرتا ہے۔

ان خطوط میں جہاں حق گوئی و بے باکی، آئین جوانمرداں پر ثابت قدمی، اولوالعزمی، علوہمتی، استحکام اور استقامت کے ساتھ کار بند رہنے کی حوصلہ افزا مثالیں ملتی ہیں، وہیں انسان دوستی، بھائی چارگی، اخوت، ہمدردی، ملنساری، یگانگت، اخلاص، بے ریائی، جیسی ارفع اور پاکیزہ اخلاقی قدروں کی پاسداری کے روشن ثبوت بھی فراہم ہوتے ہیں۔ان انسانی اوصاف کے علاوہ مظفر حنفی صاحب کے خطوط اپنے اندر ایک ادبی شان بھی رکھتے ہیں، ان میں جا بجا مکتوب نگار کی تبحر علمی، نکتہ رسی، بے تکلفی، فقرہ بازی، بذلہ سنجی، بے ساختگی، معنی آفرینی جیسے فن کارانہ اوصاف جھلکتے ہیں جن کی شمولیت سے یہ خطوط انشا پردازی کے منفرد مرقعوں کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ان میں زبان کی نفاست، بیان کی لطافت، طرز اظہار کی جدت، اسلوب کی ندرت، احساس کی شدت، جذبوں کی حرارت، لب ولہجے کی دل کشی اور شگفتگی نیز محاوروں کی بے ساختگی اور برجستگی کے کرشمے ’دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست‘ کے مصداق ہر قدم پر جلوہ گر ہیں۔

متذکرہ بالا خوبیوں نیز اپنی ہمہ گیر اہمیت وافادیت کی بنا پر مظفر حنفی صاحب کے یہ خطوط اردو مکتوب نگاری کی دنیا میں ایک خوش گوار اضافے سے تعبیر کیے جائیں گے اور جس طرح موصوف کی شاعری اپنے تیکھے ترچھے طنزیہ اسلوب، ایک اچھوتے رنگ وآہنگ اور منفرد لب ولہجے کے پیش نظر اپنی الگ پہچان رکھتی ہے۔نثر

میں جیسے ان کا اپنا مخصوص انداز اور تنقید کے میدان میں جو جداگانہ زاویۂ نقد ونظر ہے اپنے مخصوص اسلوب نگارش کی بنا پر مکتوب نگاری میں بھی موصوف کو غالبؔ کی طرح اپنے ایک طرز خاص کا موجد کہا جائے گا۔

OOO

حواشی:

۱۔قاضی حسن رضا جن کا گزشتہ دنوں انتقال ہو چکا ہے۔

۲۔شہر کھنڈوا

۳۔میرے ماموں زاد بھائی وفات پا چکے ہیں۔

۴۔اس کتاب پر توصیفی تبصرے کرتے ہوئے وزیر آغا اور ظ۔انصاری نے اسے زندہ شخصیتوں پر تحقیق کے لیے رہنما کتاب قرار دیا۔

۵۔معروف نقاد ڈاکٹر محمد حسن کے حنفی صاحب کی کسی کتاب پر منفی تبصرہ کے تعلق سے میرے استفسار کے جواب میں۔

۶،۷،۸۔کھام گاؤں کا کل ہند طرحی مشاعرہ جس میں حنفی صاحب نے جگرؔ کے مصرعے ’’جس دل پہ مجھ کو ناز تھا وہ دل نہیں رہا‘‘ پر غزل پڑھی تھی، میرے اصرار پر موصوف تشریف لائے تھے۔جگن ناتھ آزاد کو صدارت حنفی صاحب کے انکار کرنے پر پیش کی گئی۔دوسرے روز ایک تو ان لوگوں کے ریزرویشن نہ کرنے پر حنفی صاحب خفا بھی تھے اور پریشان بھی پھر جب منتظمین نے نذرانے کی رقم آزاد صاحب کے مقابلے میں کم پیش کی تو حنفی صاحب اس میں سبکی کا پہلو محسوس کر کے رضا مند نہ ہوئے۔منتظمین کے یہ کہنے پر کہ آپ کو گھر کا آدمی سمجھ کر کم دے رہے ہیں۔حنفی صاحب نے خوشدلی سے رقم لوٹا دی کہ گھر کا آدمی کہتے ہو تو میری طرف سے مشاعرے میں چندہ رکھ لو اور زبردستی نوٹ منتظم مشاعرہ کی جیب میں ٹھونس دیے اور صورت حال یہ ہے کہ نہ تو دلی کا ٹکٹ موجود ہے نہ کرایہ کی مناسب رقم جیب میں (جس کا علم مجھے کھام گاؤں سے کھنڈوہ والی بس میں سوار ہونے پر ہوا جس کے دو ٹکٹ مجھ سمیت حنفی صاحب نے نکالے) کھنڈوا پہنچنے پر حنفی صاحب نے اپنے بے تکلف یار غار سے دلی کے ٹکٹ کا بندوبست کرنے کے لیے کہا تب جا کر مجھے حقیقت حال کا علم ہوا۔وہاں سے لوٹ کر میں نے جھلاہٹ میں اخبارات میں مراسلہ بازی کی اور کھام گاؤں والوں کی پول کھول کر رکھ دی جن میں عبدالرحیم نشتر کا پندرہ روزہ ودربھ نامہ بھی شامل تھا۔حنفی صاحب کی اعلیٰ ظرفی اور کشادہ قلبی کا وہ واقعہ آج تک ذہن پر نقش کالحجر ہے۔)

۹۔۱۶؍ستمبر ۸۰ء صریر خامہ پر وزیر آغا کے منفی تبصرے مشمولہ اوراق کے تعلق سے استفسار کرنے پر۔

۱۰۔۱۷؍اپریل ۷۹ء ’ثبات‘ کی اشاعت کے لیے مہاراشٹر اردو اکادمی کی جزوی مالی اعانت ملنے پر۔

۱۱۔۲؍اپریل ۸۱ء ’یم بہ یم‘ پر راست اوراق کو تبصرہ بھیجنے کی ہدایت کرتے ہوئے۔

۱۲۔ ۶؍فروری میرے توصیفی مضامین لکھنے پر سرزنش کرتے ہوئے۔

۱۳۔ ۱۳؍اپریل ۸۲ء۔ حنفی صاحب کے بچپن اور جوانی کے دوستوں جناب ہاشمی الٰہ آباد، قاضی حسن رضا کھنڈوہ وغیرہ سے میں نے خطوط کے ذریعے حنفی صاحب کے تعلق سے کچھ رازہائے دروں جاننے چاہے تھے۔ احباب نے معاملہ حنفی صاحب کے سامنے پیش کر دیا۔ اس کے ردِ عمل میں۔

۱۴۔ ۱۰؍اپریل ۸۹ء، بخدا مظفر صاحب کے خطوط میں اپنی طرفداری پر مبنی اس قسم کے جملے بیگم نے ہمیشہ اپنی مدافعت میں استعمال کیے اور بحث و مباحثہ میں کامیابی کے پرچم لہراتی رہیں۔

۱۵۔ ۲۴؍اکتوبر ۸۹ء، ثبات کے اجرائی جشن سے لوٹتے ہوئے ریزرویشن غلط ہوجانے کی بنا پر حنفی صاحب کو بغیر ریزرویشن دلی تک کے سفر میں ناقابل بیان زحمتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

۱۶۔ ایضاً۔ شرمندہ ہوں اپنی افتادِ طبع کی بنا پر حنفی صاحب کے زریں مشوروں پر عمل نہ کیا، آج ۳۲؍برس گزر جانے پر اس کا احساس ہے۔

۱۷۔ یکم اگست ۸۱ء ڈاکٹر صبا تسنیم، مظفر حنفی صاحب کی اکلوتی بیٹی، اس وقت بمشکل دو برس کی ہوگی۔ اب بفضلہٖ دو بچوں کی ماں ہے۔

۱۸۔ ایضاً۔ اسباق پونہ کے سال اولیں نمبر کے لیے مضمون کی فرمائش کی گئی تھی۔

۱۹۔ ۱۲؍جون ۸۲ء سری نگر سے، مظفر صاحب جہاں بھی جائیں مجھے خط لکھنا یا فون کرنا بھولتے نہیں، اپنے بیٹوں پرویز مظفر اور عرفان مظفر کے پاس برمنگھم اور دبئی گئے وہاں سے بھی مجھے برابر یاد کیا۔

۲۰۔ طنزِ ملیح کا دل کش چٹکی لینے والا انداز آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ تیرِ نیم کش جیسا۔ ثقلین حیدر کلکتہ کے مشہور ناظم مشاعرہ، غضب کا حافظہ پایا تھا۔ ثبات کے مشاعرے میں میرا پورا مجموعہ زبانی سنایا اور میری تعریف و توصیف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے۔

۲۱۔ ۵؍فروی ۸۳ء رنگارنگ طفلی نظموں کا مجموعہ جس کے تین ایڈیشن شائع ہوئے اور ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔

۲۲۔ ۱۱؍اپریل ۸۳ء کا سخت و سست پر مبنی یہ طویل تلخ و ترش خط من و عن پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

۲۳۔ گزشتہ دو برس رات دن ایک کر کے مقالہ مکمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپریل ۸۴ء میں ناگپور جا کر یونیورسٹی میں مقالہ داخل کیا۔ وہاں سے لوٹا تو گھر پہنچتے پہنچتے اعصاب پوری طرح معطل ہو چکے تھے۔ چھ برقی شاک لگائے تھے، دو ماہ دنیا و مافیہا سے یکسر بے خبر رہا، مدتوں ذہن تقریباً مفلوج رہا۔ اللہ کا شکر ہے مسلسل علاج اور پر خلوص دعاؤں سے کچھ دنوں بعد ٹھیک ہو گیا۔ اس دوران مظفر حنفی صاحب نے اپنے مشفقانہ خطوط سے ڈھارس بندھائی۔ اس کا اندازہ ذیل کے اقتباسات سے لگایا جا سکتا ہے:

’’خدا کرے اب تمہاری صحت ٹھیک ہو ورنہ مندرجہ ذیل شعر کا تعویذ بنا کر سینے پر آویزاں کر لو:

بے دست و پائی کا تو یہی اک علاج ہے   آوازۂ جرس پہ دمادم سفر سفر

۲۴، ۲۵۔ ناظمہ میرے حقیقی بھانجے یونس ساکن پونہ کو بیاہی گئی تھی جو سعودیہ میں برسرکار تھا۔ بعد میں لوٹ آیا۔ ان دنوں پونا کارپوریشن میں ملازم ہے۔

۲۶۔ پی ایچ۔ڈی کی سند کے لیے کانووکیشن میں شرکت نہیں کی۔

۲۷۔ مقامی ہائر سیکنڈری میں چند ماہ کام کیا۔ نباہ نہ ہو سکا۔ پرائمری میں لوٹ آیا۔ بعدہ مقامی غلام نبی آزاد ڈگری کالج میں دس برس تک پرنسپل رہا۔ وہاں بھی انتظامیہ سے تنازعات رہے۔

۲۸۔ ۲۴؍جولائی ۸۶ء، فسادات کے بعد احمد آباد میں بسے میرے افراد خاندان کی خیر و عافیت دریافت کرتے ہوئے۔

۲۹۔ ۴؍مارچ ۸۶ء، کچھ غلط فہمیاں تھیں، بہر حال حنفی صاحب نے میری نیت پر شبہہ نہیں کیا۔

۳۰۔ ۲۵؍ستمبر ۸۷ء۔ مجھے مثالی مدرس کا قومی اعزاز دینے کے لیے سال بھر قبل مدعو کیا گیا تھا۔ صدر جمہوریہ کے ہاتھوں بیگم کے ساتھ ۵؍ستمبر ۸۶ء کو میرا اعزاز ہونا تھا جس کے لیے حنفی صاحب اور بھابی نے دعوت دی تھی اور خوب تیاریاں بھی کر رکھی تھیں۔ میری سادہ لوح بیوی اپنی کم آمیزی کی بنا پر پہنچ نہیں سکی۔

۳۱، ۳۲، ۳۳۔ ۱۷؍دسمبر کے مجوزہ کل ہند مشاعرے میں شرکت کے لیے میرے کہنے پر حنفی صاحب کو مدعو کیا گیا تھا۔ درمیان میں کچھ ایسا ہوا کہ میں نے اس میں اپنی اور حنفی صاحب کی سبکی محسوس کی، لہٰذا پہلے جھلاہٹ میں موصوف کو مشاعرے کے التوا کی غلط اطلاع دے دی۔ جب منتظمین معاملے پر پروقار طریقے سے رضامند ہوئے تو میں نے موصوف سے دوبارہ تشریف آوری کی درخواست کی اور آٹھ دس احباب کے ہمراہ بذریعہ جیپ حنفی صاحب غریب خانہ پر تشریف فرما ہوئے۔

۳۴۔ ۱۸؍فروری ۹۳ء، ۶؍دسمبر ۹۲ء کے بابری مسجد سانحہ پر خاکسار نے مہاراشٹر اردو اکادمی کی رکنیت سے احتجاجاً استعفیٰ دے دیا تھا۔

۳۵۔ ۵؍مارچ ۹۶ء، سفر کلکتہ بلکہ چند روزہ قیام کلکتہ کے دوران ہگلی کے کنارے واقع ایک قدیم ترین چرچ دیکھ کر ہگلی شہر کی طرف لوٹتے ہوئے بس میں ایک حسین ترین بنگالی لڑکی پر نظر پڑی۔ میرا دوسرے نمبر کا بیٹا شفیق جس کے تعلق سے حنفی صاحب کے علم میں تھا کہ شادی کے لیے حسین ترین لڑکی کی تلاش میں کئی لڑکیوں کو رد کر چکا ہے، مجھے اُدھر متوجہ پا کر فرمایا کہو تو شفیق کے لیے بات چلائی جائے۔ خط میں اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے۔

۳۶۔ ۲۲؍ستمبر ۲۰۰۲ء، کلکتہ سے اپنی کتابوں پر میرے توصیفی تبصرے پڑھ کر

○○○

پروفیسر مشتاق اعظمی
آسنسول

پروفیسر مظفر حنفی: سفرناموں کے تناظر میں

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہیں

متذکرہ بالا شعر 'سفرنامہ' پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ صنفِ غزل اسی لیے مقبول و محبوب ہے کہ اس کا ہر شعر ایک جہانِ بیکراں اپنے اندر سمیٹے رہتا ہے۔ یہ سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا فن ہے۔ اس ایک شعر میں پورے سفر کی تفصیل پوشیدہ ہے۔ حالاں کہ عام طور پر سفر کا تصور ہی پریشان کن اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ لاکھ سہولت سہی، لاکھ آرام و آسائش کا اہتمام و انتظام ہو سفر سفر ہی ہوتا ہے۔ سکون و اطمینان کہاں، لیکن جن کا قلم اور کاغذ سے رشتہ ہوتا ہے جو آتے جاتے لمحات کو قید کرنا جانتے ہیں اور جن کے قلم کی نوک چاندنی بکھیرتی رہتی ہے اُن کے لیے یہی سفر بڑے کام کی چیز ہو جاتا ہے کہ سفرنامہ دیکھی، خود پر بیتی اور ذاتی تجربات و مشاہدات کی خوب صورت، دلچسپ اور حقیقی تفصیلات و روداد بن کر سامنے آتا ہے۔ یہاں سچ کی حکمرانی ہوتی ہے جھوٹ کی نہیں، یہاں رات کو دن اور دن کو رات کہنا گناہ ہے۔ یہ صداقت پہ مبنی محسوسات کی ایک جیتی جاگتی، چلتی پھرتی، ہنستی بولتی دنیا ہے جو دل و نگاہ کو مسحور و محصور اور مسرور کرتی ہوئی مائل رقص سفر ہوتی ہے۔ جو زندگی اور زندگی سے وابستہ و ہم رشتہ خوب صورت اور دل پذیر کہانی بیان کرتی ہے۔ یہاں ماضی اور حال گلے ملتے ہیں اور مستقبل تماشائی ہوتا ہے۔ دورانِ سفر جن حالات و واقعات سے سابقہ پڑتا ہے، جنھیں سیاح جھیلتا ہے، جن سے دو چار ہوتا ہے اور جن سے متاثر ہوتا ہے انھیں اپنے کاغذ قلم کی زینت بناتا ہے اور اپنے اسلوب و انداز میں پیش کرتا ہے۔ یہیں اس کے قلم کی آزمائش ہوتی ہے۔ یہیں اس کی قوت مشاہدہ و تجزیہ اور تجربہ کی پرکھ ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی شگفتہ مزاجی اور حقیقت نگاری کا راز کھلتا ہے۔ اس کی تحریر کی ہم آہنگی و ہمہ گیری کا اندازہ ہوتا ہے کہ سفرنامہ لکھنا کوئی بازیچۂ اطفال نہیں ہے۔ یہاں ہمہ وقت چوکنا رہنا پڑتا ہے اور لمحہ لمحہ بیدار کہ یہ سونے والوں کا کام نہیں، بیدار اور ہوشیار لوگوں کا کام ہے۔ انتہائی معمولی اور چھوٹی باتیں بھی ان کی آنکھوں سے

سفرنامہ

پوشیدہ نہیں رہتی ہیں۔

دنیا کی تقریباً ہر زبان و ادب میں سفرنامے کا سراغ ملتا ہے۔ یہ کسی زبان و ادب میں ہو اس کی اہمیت وحقیقت ایک ہی ہے۔ اردو میں سفرنامے لکھنے کا رواج انیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے شروع ہوا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شکست کے بعد ہندوستان پر پوری طرح انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ اس جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد انگریزوں نے ہندوستانیوں پر جی کھول کر مظالم ڈھائے۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری کو قید کر کے انڈمان جیل میں بھیج دیا گیا۔ مولوی صاحب کا سفرنامہ 'تواریخِ عجیب' موسوم بہ 'کالا پانی' انگریزوں کے اسی ظلم و ستم کی ایک دستاویز ہے۔ سرسید نے ۱۸۶۹ء میں لندن کا سفر کیا تھا۔ وہاں ڈیڑھ سال انھوں نے قیام کیا، واپس آکر 'مسافرانِ لندن' کے نام سے ایک کتاب ترتیب دی۔ علامہ شبلی نے انیسویں صدی کی آخری دہائی میں اسلامی ممالک کا سفر کیا۔ واپس آنے پر دوسروں کے اصرار پر حالاتِ سفر تحریر کیے۔ اس طرح اردو ادب میں ایک وقیع سفرنامے 'سفرنامہ روم ومصر وشام' کا اضافہ ہوا۔ یہ چند مثالیں ہیں ورنہ درحقیقت اردو میں اچھے سفرناموں کی ایک لمبی فہرست ہے۔

اب تک کے باقاعدہ اردو سفرناموں کی فہرست خاصی طویل ہے جس میں اولیت کا شرف یوسف خاں کمبل پوش کے سفرنامے 'تاریخ یوسفی' معروف بہ 'عجائباتِ فرنگ' کو حاصل ہے۔ یوسف خاں کمبل پوش نے ۱۸۳۷ء میں انگلستان کا سفر کیا۔ یہ سفرنامہ اسی سفر کی روداد ہے۔

اس وقت ہمارے پیش نظر پروفیسر مظفر حنفی کا سفرنامہ 'چل چنبیلی باغ میں' ہے۔ یہ سفر انھوں نے خانگی ضرورت کے تحت کیا تھا۔ اگر چہ یہ سفر موصوف کی ذاتی اور خاندانی ضرورت اور مقصد کے تحت پیش آیا لیکن اس کی شگفتہ اور باغ وبہار تحریر نے اسے ممتاز ومقبول بنا دیا ہے۔ اردو کے سفرناموں میں شاید یہ پہلا سفرنامہ ہے جس میں تخلیقی اپج اور نمو کا بھی احساس ہوتا ہے۔ یہ یقیناً موصوف کے قلم کا کمال ہے جو ان کی انگلیوں کی گرفت میں ہے، جس کی خصوصیت یہ ہے کہ سفر میں قاری بھی نہ صرف شریک ہوتا جاتا ہے بلکہ ان کی شیریں بیانی کے لطف ولذت میں کھو کر خود بھی سفر کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ اس سفر میں تین نفوس (موصوف خود، ایک صاحبزادی صبا اور شریک حیات عاصمہ) ساتھ تھے۔ اس طویل سفر کا مقصد سیاحت نہیں تھا بلکہ اس سفر کو ہم ذاتی اور کچھ حد تک ادبی بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ جہاں انھوں نے سفر کی تفصیلات تحریر کی ہیں وہیں اپنے منجھلے صاحبزادے پرویز مظفر کی تقریب شادی، ادبی مجلسوں، مشاعروں، ادبی جرائد میں دیے گئے انٹرویوز اور دوست احباب کی نشستوں کا ذکر بھی کیا ہے جس سے ان کی ذاتی اور مجلسی زندگی کی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے اور ان کی شخصیت کے وہ پہلو بھی سامنے آتے ہیں مثلاً خلوص، انکساری، محبت، ہمدردی، مہمان نوازی، گفت وشنید کا فطری سلیقہ اور عزیز داری وغیرہ جو ایک مثالی انسان کے لیے ضروری ہیں۔ ان کی تحریر کی ایک

نمایاں خوبی یہ ہے کہ ان کی نگاہوں اور قلم کی گرفت سے کوئی شے چھپتی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بڑے ہی خوب صورت اور دل نشیں انداز میں مختلف مناظر کا ذکر کیا ہے۔ شادی کی رسم، نئے پرانے احباب کی آمد اور ان سے ملاقات، سفر کی تیاری سے لے کر شادی کی تیاری، خرید وفروخت اور پھر وطن واپسی تک کے واقعات مندرجات میں ہیں۔ غیر ممالک میں کیا کیا دشواریاں ہوتی ہیں، ویزا کی حصولیابی میں کن کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، دوران سفر کیسے کیسے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے، کیسا ماحول ہوتا ہے، کس طرح وقت گزرتا ہے، ایر ہوسٹس کا حسن سلوک اور اس کی کارگزاریوں پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ یہ سفرنامہ ایک طرح سے گائڈ پیپر (Guid Paper) ہے۔

اس سفرنامے میں موصوف نے اپنی تحریر کی چاندنی بھر دی ہے اور اسے اپنے فطری اسلوب اور رجحان کا غماز بنا دیا ہے۔ کاغذ پر بکھرے ہوئے الفاظ ان کی روح کے ترجمان محسوس ہوتے ہیں اور آنکھوں میں فرحت بخش نور بھرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور تہذیبی اقدار کا گہرا عکس جھلکتا ہے جس سے موصوف کا خاندان جڑا اور وابستہ ہے۔ اس کا اندازہ مختلف جگہوں پر ہوتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہر حالت میں انھیں اپنی مشرقی تہذیب سے حد درجہ محبت وعقیدت ہے۔ بالخصوص جب رشتہ دار اور سارے متعلقین انھیں رخصت کرنے آتے ہیں تو مشرقی تہذیب کی خوش بو متاثر کیے بغیر نہیں رہتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

''ادھر اعزا کو خبر ملی کہ میں اپنے دوسرے بیٹے پرویز مظفر کی شادی کرنے کی غرض سے انگلینڈ جا رہا ہوں تو ان میں اکثر تہنیت کے لیے دہلی آگئے۔ کان پور سے چھوٹی بہن انیس اور اس کے شوہر بشارت حسین جو ہمارے سمدھی بھی ہیں اپنے بچوں کے ساتھ آگئے۔ اٹاوا سے منجھلی بہن کی بیٹی شمیم اور اس کے بچے آئے، بھوپال سے بڑی بہن کا بیٹا اشفاق ہاشمی اپنے اہل وعیال کے ساتھ وارد ہوا اور اس کے خسر نیز میرے دوست محمود عمر سیہور سے تشریف لائے۔ موصوف کے ہمراہ ان کی بیگم جمیلہ بھی تھیں جو عاصمہ کی گہری دوست ہیں۔ ہمارا گھر ماشاءاللہ کافی بڑا ہے پھر بھی مکینوں سے لبالب بھر گیا۔''

ایک دوسری جگہ اپنائیت، خلوص اور رواداری کی راحت بخش فضا ملاحظہ فرمائیے:

''تم لوگ آئی، ایس، ڈی پر بھی اس طرح گفتگو کرتے ہو جیسے لوکل فون پر۔ اکثر میں دہلی اور کلکتہ سے بھی پرویز کو سمجھاتا تھا کہ آدھ آدھ گھنٹہ فون پر بات کر کے اپنا پیسہ ضائع نہ کیا کرے۔ بلاناغہ وہ ہر ہفتے دس دن بعد فون کرتا اور دیر تک باتیں کر کے تیس چالیس پاؤنڈ کا بل ادا کرتا۔ ماں، بہن، بھائی حتیٰ کہ اپنے چھوٹے چھوٹے بھتیجوں (ایمن، زمن، فیضی) کی آواز سننے کے لیے بھی اصرار کرتا۔ مجھ سے تو ہمت نہیں ہوئی، اکثر صبا اور عاصمہ کی خوشامد کرتا کہ پاپا

کی بیاض کھول کر نئی غزل کے شعر اسے سنائیں۔ایک بار اس نے کہا تھا پاپا! آپ کو معلوم نہیں ہے کہ یہاں کتنا اکیلا پن محسوس کرتا ہوں۔ کچھ خرچ کر کے اپنے لوگوں سے باتیں کرتا ہوں تو بڑی تسلی ہوتی ہے اور گھبراہٹ ختم ہو جاتی ہے۔''

متذکرہ بالا اقتباس میں پروفیسر صاحب نے یہ دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ جسے وطن سے محبت ہوتی ہے اور جسے پردیس میں اپنوں کی یاد آتی ہے اس کا اضطراب اسے کبھی چین سے نہیں رہنے دیتا ہے۔اسے اسی وقت چین آتا ہے جب وہ اپنوں سے گفتگو کر چکا ہوتا ہے۔ وطن کی محبت اور وطن کی مٹی کی سوندھی خوش بو کب پرسکون رہنے دیتی ہے۔اس کا خیال ہمیشہ مضطرب رکھتا ہے۔ بہر حال کوئی پہلو پروفیسر صاحب نے تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔سفر نامے کی اس محبت وعقیدت کی دل کش فضا میں ان کی ظرافت اور طنز کی آمیزش نے فضا کو مزید خوش گوار کر دیا ہے۔ دیکھیے ان کی رگِ ظرافت کس طرح پھڑکتی ہے:

''اب اسے کیا معلوم کہ میں خود تنہا سفر کرنے کے خیال سے بھی پریشان تھا۔صبا کمسن ہے اور عاصمہ بہت اچھی شریک حیات ہونے کے باوجود شریک سفر کی حیثیت سے زیادہ معاون نہیں ہو پاتیں بلکہ اپنے مزاج کی سادگی اور بھولپن کی وجہ سے ہم سفر کے بجائے زحمتِ سفر بن جاتی ہیں۔''

ایک دوسری جگہ مزاح کا اس طرح پہلو نکالتے ہیں:

''یہ مٹھائی لیجیے''...... مجھے کیک اچھا نہیں لگتا، میں نے بتایا۔موصوفہ نے بے تکلفی سے کہا'' تو آپ کی اجازت سے میں کھا لیتی ہوں۔''اس نے میرے کیک کا ایک ٹکڑا سرے پر بیٹھی ہوئی آئرش خاتون کی خدمت میں بھی پیش کیا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی'' یہ کیلا بھی آپ لے لیجیے''،''کیک کا بدل کیلا......لڑکی میں دوران سفر تجارت نہیں کرتا۔''

دہلی کی گرمی سے متعلق کہتے ہیں:

''جون کے مہینے میں گرمی یوں بھی اپنے شباب پر ہوتی ہے پھر یہ تو دہلی تھی۔ یہاں تو گرمی پڑتی نہیں جھلساتی ہے۔''

ہندوستان میں اگر آپ سفر کریں تو معمولی افسر سے لے کر بڑے افسر تک کی جھڑکی، سخت کلامی، بدسلوکی اور عدم اشتراک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔لیکن دیکھیے غیر ممالک کے سفر میں کس طرح افسران حسن سلوک سے کام لیتے ہیں۔اس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے:

''خیال تھا کہ یہاں چوں کہ کاغذات کی جانچ پڑتال ہو گی اور امیدواروں سے سوال جواب کیے جائیں گے اس لیے ہمارا نمبر آتے آتے کافی وقت لگے گا لیکن یہاں بھی ہائی کمیشن کے اہل کاروں نے بڑی مستعدی دکھائی اور چند منٹ ہی گزرے تھے کہ ہم لوگ ایک ویزا آفیسر

کے سامنے تھے۔ یہ ایک تیس بتیس سال کی خوبرو انگریز خاتون تھی...... ہمارے پاسپورٹ اور ویزا کی درخواستوں پر ایک سرسری نظر ڈال کر ویزا افسر نے مسکرا کر پوچھا'' آپ انگلینڈ کیوں جا رہے ہیں......'' میں نے فائل موصوفہ کی طرف بڑھائی جس میں پرویز مظفر کی برمنگھم میں رہائش، ملازمت اور ہم لوگوں کو اسپانسر کرنے کے قانونی کاغذات، کلکتہ یونیورسٹی میں میری ملازمت، تنخواہ، انکم ٹیکس، رخصت کی منظوری، نو آبجکشن سرٹیفکیٹ، بینک اکاؤنٹس سے متعلق دستاویزات وغیرہ شامل تھے۔ویزا افسر نے فائل کھولے بغیر بے نیازی کے ساتھ میری طرف سرکا دی اور خوش گوار لہجے میں کہا'' آپ ایک پروفیسر ہیں۔آپ کے کسی بیان کی صداقت کے لیے ثبوت کی ضرورت نہیں۔''

متذکرہ بالا جملوں سے ایک تو دو ملکوں کے افسروں کے سلوک کا پتہ چلتا ہے اور دوسرے یہ کہ ویزا کے لیے کن کن کاغذات کی ضرورت پڑتی ہے اس کا بھی پتہ چلتا ہے۔ایک اہم بات یہ کہ غیر ممالک میں ایک مدرس کی کیا حیثیت ہے اور ہمارے ملک میں کیا حیثیت ہے؟ اس پر بھی روشنی پڑتی ہے اور اس کی تصدیق متذکرہ بالا جملوں سے ہو جاتی ہے۔ دوران سفر انھوں نے کچھ اہم موضوعات کی طرف بھی ہمارا دھیان کھینچا ہے۔ٹیچروں کی تنخواہ، ان کی حیثیت اور ان کی زندگی پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

''میں ٹیچر آدمی ہوں بہت زیادہ پیسے نہیں خرچ کر سکتا۔''

ایک جگہ یوں رقم طراز ہیں:

''قطار کا جائزہ لیا تو اس میں اکثر سکھ خاندان نظر آئے جن میں ستر سالہ مرد اور عورتیں بھی شامل تھیں اور چھ سات سال کے بچے اور بچیاں بھی۔''

ان جملوں سے اس بات کی طرف اشارہ بھی ہوتا ہے کہ عام ہندوستانی میں سفر کے نام سے الرجی پیدا ہو جاتی ہے اور گھبراہٹ کی وجہ سے بال بچوں کے ساتھ سفر نہیں کرتے ہیں لیکن سکھ قوم کے بچے اور عورتیں بھی طویل سے طویل سفر کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ایک اور مقام پر بیٹھے ہوئے مسافروں سے متعلق جس پس منظر میں اپنے قلم کو اذنِ سفر دیا ہے۔ملاحظہ فرمایئے:

'' ہمارے والے حصہ میں تیس سے چالیس نشستیں تھیں جن پر مختلف ملکوں کے باشندے براجمان تھے۔بوڑھے، جوان، مرد، بچے، عورتیں، فرانسیسی، عربی، انگریزی اور دوسری زبانیں بولتے ہوئے بھانت بھانت کے کپڑے پہنے ہوئے کوئی سنجیدہ، کوئی اداس، کوئی چنچل، کوئی قہقہہ بردوش اور کوئی اپنی نشست پر نیم خوابیدہ۔خداوندا یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی!''

ان جملوں سے انسان کی ایک اہم خصوصیت پر روشنی پڑتی ہے کہ انسان جب سفر میں ہوتا ہے تو نہ

مسلمان قوم کی ردا اوڑھتا ہے اور نہ ہندو یا عیسائی مذہب کا ڈنڈا گھماتا ہے۔ نہ رنگ، نہ طبقہ، نہ مسلک اور نہ نسل و قوم بیچ میں آتی ہے۔ یہ سب مسافر ہوتے ہیں، مسافر کی ایک ذات ہوتی ہے، ان کا ایک خاندان ہوتا ہے اور سب بھائی بھائی ہوجاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے غم وخوشی میں شریک، ایک دوسرے کا دکھ درد بانٹنے کے لیے تیار۔ اس شعر کی مثال:

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

اس طرح مظفر حنفی صاحب نے اس سفر کی تفصیلات، حالات اور کیفیات بیان کرتے ہوئے انگلینڈ سے واپسی تک کے معاملات پر پوری نظر رکھی ہے اور انھیں اپنے سفر نامے میں جگہ دی ہے۔ شادی سے فراغت پانے کے بعد ادبی حلقوں میں گھرے اور وہاں کے ادبی ماحول کی تفصیل پیش کی ہے اور اپنے ادبی حلقوں کے جانے پہچانے، دیکھے ان دیکھے ملنے والوں کی پر لطف گفتگو سے ہمیں واقف کرایا ہے۔ مشاعروں اور اعزازی نشستوں اور انٹرویوز کے سوال و جواب سے ہمیں مستفیض کیا ہے جس سے موصوف کی سرگرمیوں اور علمی وادبی حیثیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ سفر نامہ پروفیسر مظفر حنفی صاحب کا ایسا کارنامہ ہے جسے اردو زبان وادب کا قیمتی سرمایہ کہا جا سکتا ہے۔ اس کی چمک دمک جب تک اردو قائم ہے، باقی رہے گی اور سفر نامہ لکھنے والوں کی راہ نمائی کرے گی۔

○○○

ترجمہ

ڈاکٹر سید الفت حسین
جی۔ڈی کالج، بیگوسرائے، بہار، رابطہ نمبر: 6201788749

مظفر حنفی بحیثیت مترجم

(’بھارتیندو ہریش چندر‘ کی روشنی میں)

پروفیسر مظفر حنفی کا ادبی اور تخلیقی سفر کئی دہائیوں پر محیط ہے۔ وہ اردو ادب میں شاعری، تنقید، تحقیق، افسانہ، ادب اطفال اور سفرنامے کے لیے مشہور ہیں۔ انھوں نے ایک منفرد صحافی کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت بنائی۔ ان کے ترجمہ کردہ کارنامے اس امر کے مظہر ہیں کہ انھیں ترجمہ نگاری میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ انھوں نے ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے مضامین، کہانیوں، ناولوں اور سوانحی تحریروں کو اردو کا ملبوس عطا کیا۔ ان کے ادبی و شعری کارنامے بڑی اہمیت و افادیت کے حامل ہیں اور ترتیب و تدوین کے کام بھی قابل قدر ہیں۔

مظفر حنفی کی فکری نہج اور علمی صلاحیت کا اندازہ ان کے بیش بہا ادب پارے سے کر سکتے ہیں، مگر افسوس کہ ادب، سماج اور تہذیب کا یہ شناور آج سے چند ماہ قبل ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گیا۔ ان کی کمی اردو دنیا میں ایک عرصے تک محسوس کی جاتی رہے گی۔ ان کے جو علمی و ادبی اثاثے ہیں وہ انھیں مرنے کے بعد بھی امر رکھیں گے۔ ان میں شعر و ادب کے تئیں جو عرفان تھا اس کا اندازہ انہی کے اس شعر سے ہوتا ہے:

میں خود کو ڈھونڈتا تھا خدا مل گیا مجھے   بابِ طلسمِ ہوشربا مل گیا مجھے

جس طرح مظفر حنفی کے احساسات و جذبات اور تخلیقی توانائی اور بلند خیالی انھیں جدید شعرا کی صف میں لا کر کھڑا کر دیتے ہیں اور نقد و انتقاد کے میدان میں ان کی عالمانہ صلاحیت اور گہرے تنقیدی شعور کو ظاہر کرتے ہیں، اسی طرح افسانہ نگاری، سوانح نگاری اور ترجمہ نگاری میں بھی وہ کمال کی منزل پر نظر آتے ہیں۔ مظفر حنفی نے ایک خاص ذہن پایا تھا۔ اگر ترجمہ نگاری کی بات کریں تو اس فن میں بھی انھیں ملکہ حاصل تھا۔ حالاں کہ ترجمہ نگاری کا کام جس قدر اہم ہے اسی قدر مشکل بھی ہے جس کا انھیں بخوبی احساس رہا۔ لیکن ان کے تراجم کا جائزہ لیجیے تو اندازہ ہوگا کہ مظفر حنفی دیگر ادبی اصناف کی مانند ترجمہ نگاری میں بھی اس کے متعین اصول و ضوابط کا پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ ان کی ترجمہ کردہ کتابیں، اس فن کے تئیں مترجم کے اندر پائے جانے والے خلوص، ریاضت اور مہارت کو

ظاہر کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مترجم کے لیے دونوں زبانوں کے عبور پر خاص زور دیتے ہیں اور ایسا نہیں ہونے پر اصل زبان کی خوبیاں ترجمے میں زائل ہونے کے خدشات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کی رائیں بھی بہت قیمتی ہیں۔ انھیں یہ بھی احساس ہے کہ بیشتر کم استعداد رکھنے والے مترجم ترجمہ کی جگہ ماخوذ لکھ کر کام چلا لیتے ہیں۔ تن آسانی کے اس رجحان کے وہ کبھی قائل نہیں رہے۔

مظفر حنفی کی ترجمہ کردہ کتابیں ترجمہ نگاری کے سرمایے میں اہم اضافہ ہیں۔ ان کا اولین ترجمہ کردہ کارنامہ ’چوروں کا قاتل‘ ہے۔ یہ ایک انگریزی جاسوسی ناول کا ترجمہ ہے۔ یہ ناول اس وقت سامنے آیا جب ابن صفی کے جاسوسی ناول لوگوں کی نظروں میں تھے اور مظفر حنفی اپنے افسانوں کی وجہ سے جاسوسی ادب کی دنیا میں بھی متعارف ہو چکے تھے۔ انھوں نے کئی ناولوں کے تراجم کیے جن میں چوروں کا قاتل، شرلاک ہومز ہندوستان میں، دوہری سازش، پراسرار قتل، تارِ عنکبوت، بین الاقوامی لٹیرے اور پیلی کوٹھی قابل ذکر ہیں۔ مظفر حنفی نے جن تصانیف کو اردو میں منتقل کیا ان کے نام اس طرح ہیں۔ سخاروف نے کہا، گلاک مجمع الجزائر (دفتر اول)، گلاک مجمع الجزائر (دفتر دوم)، گلاک مجمع الجزائر (دفتر سوم)، گجرات کے یک بابی ڈرامے، اڑیا افسانے، بیداری، طوفان، بھارتیندو ہریش چندر، رنگیلے نواب، بنکم چندر چٹر جی وغیرہ۔

انھوں نے ہندی اور انگریزی افسانوں کا بھی اردو میں ترجمہ کیا۔ ’کنواں‘ ہندی افسانے کا اردو ترجمہ ہے۔ ایچ جی ویلس کی انگریزی کہانی ’جراثیم کی چوری‘ اور ’اضطراب‘ اینٹ سن چیخوف کی روسی سے انگریزی میں ترجمہ کی ہوئی کہانی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ مظفر حنفی کے ترجمہ کردہ ناول اور افسانے مانسرور الٰہ آباد، نکہت الٰہ آباد، پگڈنڈی امرتسر، نسیم بک ڈپو لکھنؤ، شبنم دہلی، اردو ترجمہ نیشنل اکادمی وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔ ان کارناموں کے اعتراف میں ملک کی مختلف اکادمیوں اور علمی و ادبی اداروں نے انھیں انعامات و اعزازات سے نوازا جن میں بنگال اور بہار کی اردو اکادمیاں بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر محبوب راہی نے ان کی ترجمہ نگاری کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ”سات جاسوسی ناولوں پر مظفر حنفی نے اپنا نام مترجم کی حیثیت سے درج کیا ہے لیکن یہ ناول لفظی یا ہو بہو نہیں بلکہ ماخوذ ہیں۔ اصل کہانیوں سے صرف مرکزی خیال لے کر انھیں ہندوستانی ماحول اور معاشرت میں ڈھال کر پیش کیا گیا ہے۔ ان ناولوں میں بیشتر واقعات بھی تبدیل کیے گئے ہیں۔ غالباً بڑھی ہوئی احتیاط اس احساس کے تحت کہ انھیں جاسوسی ناول نگاروں کے زُمرے میں شامل نہ کر لیا جائے، مظفر حنفی نے ان ناولوں پر اپنا نام مترجم کی حیثیت سے ہی پیش کیا ہے۔ ورنہ عام روش یہ ہے کہ ایسی چیزیں طبع زاد کہہ کر شائع کی جاتی ہیں اور بہت ہوا تو کتاب کے آخر میں ’مرکزی خیال انگریزوں سے‘ جیسے فقرے لکھ کر حفظ ماتقدم کر لیا جاتا ہے۔“

(ڈاکٹر مظفر حنفی: حیات، شخصیت اور کارنامے، ڈاکٹر محبوب راہی، ۱۹۷۸ء، ص ۴۸۲)

مظفر حنفی کا ترجمہ نگاری میں کمال یہ ہے کہ وہ جس تصنیف کو اردو زبان میں منتقل کرتے ہیں، ان کی اپنی تخلیق معلوم ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے یہاں ترجمہ نگاری جیسے مشکل فن کے اصول اور نظریوں کی پاسداری ملتی ہے۔ یہ تبھی ممکن ہے جب کسی مترجم میں دیگر زبانوں پر بھی اچھی اور مضبوط گرفت پائی جائے گی۔ مظفر حنفی کی کسی بھی کتاب کو پڑھ جائیے جس زبان کا بھی ترجمہ پیش کرتے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ انھیں اس زبان پر یکساں قدرت ہے۔ ترجمہ نگاری میں 'بھارتیندو ہریش چندر' ان کی ایک اہم کتاب ہے۔ یہ بھارتیندو کی سوانح حیات ہے جو ہمارے اس مضمون کا عنوان ہے۔

مدن گوپال کی کتاب 'بھارتیندو ہریش چندر' ہو یا ایس سی سین گپتا کی 'بنکم چندر چٹرجی' کی سوانح، یہ مترجم کی ادبی صلاحیتوں اور اس فن میں مہارت اور استعداد کی غماز ہیں۔ ترجمہ سے متعلق ان کی دیگر کتابیں بھی جہاں ان کی فن کارانہ بصیرت کو ظاہر کرتی ہیں وہیں ان کی مختلف علاقے کی زبان اور تہذیب سے دلچسپی کو ثابت کرتی ہیں، نیز ان زبانوں کے فروغ میں مترجم کے کردار کا بھی پتہ دیتی ہیں۔ مظفر حنفی اس بات کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ اردو زبان و ادب ہو یا دیگر کوئی زبان۔ اس کی ترقی میں ترجموں کا اہم کردار ہے۔

جیسا کہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ بھارتیندو جدید ہندی ادب کا ایک اہم نام ہے۔ یہ نام اس لیے بھی اہم ہے کہ انھیں سے ہندی ادب کے جدید دور کا آغاز ہوا، اسی لیے وہ جدید ہندی کے باوا آدم کہے جاتے ہیں۔ بھارتیندو ہندی تھیٹر کے موجد بھی تسلیم کیے جاتے ہیں۔ جب کہ ان سے قبل بھی ناٹک لکھے گئے لیکن انھوں نے باقاعدہ طور پر کھڑی بولی میں ناٹک لکھ کر ہندی ناٹک کی تاریخ میں ایک اہم باب کا اضافہ کیا۔ بھاتیندو ایک دو زبان نہیں بلکہ کئی زبانیں جانتے تھے۔ سنسکرت، اردو، انگریزی کے علاوہ پنجابی، مراٹھی، بنگلہ، گجراتی زبانیں بھی سیکھی تھیں۔ انھوں نے ناٹک نویسی کا آغاز ایک بنگلہ ناٹک 'ودھیا سندر' کے ترجمہ سے کیا۔ اس کے بعد اس میدان میں نمایاں ہوئے۔ مدن گوپال کی تصنیف 'بھارتیندو ہریش چندر' کو جو ایک سوانحی کتاب ہے، مظفر حنفی نے اردو کا لباس عطا کیا۔ چنانچہ وہ اس کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''زیر نظر کتاب میں بھارتیندو ہریش چندر کی علمی و ادبی خدمات کا عمومی جائزہ اس نقطۂ نظر کے تحت پیش کیا گیا ہے کہ تحقیقی و تنقیدی موشگافیوں سے دلچسپی نہ رکھنے والے عام قاری کو ان کے مجموعی کارناموں اور ادبی قامت کا اندازہ ہو جائے۔ ہندی کے تئیں بھارتیندو کی وسیع خدمات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اس ضمن میں ان کی حیثیت اردو کے سرسید احمد خاں کی طرح پہلو دار، ہمہ گیر اور متاثر کن تھی۔'' (بھارتیندو ہریش چندر، مترجم، مظفر حنفی، اشاعت ۱۹۸۴ء)

مظفر حنفی کی ترجمہ کردہ یہ سوانح جہاں ہریش چندر کی علم و ادب دوستی، ان کی ذات و صفات اور کمالات کو

مجموعی طور پر پیش کرتی ہے وہیں اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ انیسویں صدی کے اس ادیب اور مصنف کا ان کی نظر میں کتنا احترام تھا۔ مظفر حنفی کی اس کتاب کے مطالعے سے ہریش چندر کے اردو زبان سے شغف اور دوستی کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں پر وہ ہریش چندر کی اردو شاعری، معیاری مضامین اور فارسی آمیز اردو مزاحیہ مضمون کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ بھارتیندو کے دوستوں کے تذکرے میں انیسؔ کا بڑے احترام کے ساتھ نام آیا ہے۔ ایک عبارت سے ہم ہریش چندر کی فکری اقدار کے ساتھ اردو زبان و ادب سے ان کے بے پناہ ذوق و شوق کا اندازہ لگا سکتے ہیں:

> ''اپنے دور کے کئی اردو ادیبوں اور شاعروں سے ان کے قریبی روابط رہے۔ ان کے قریبی دوستوں میں انیسؔ اور وزیرؔ جیسے اکابرین اردو کے نام شامل ہیں۔ بھارتیندو ہریش چندر کی اردو تخلیقات نثر و نظم کو مرتب کر دیا جائے تو کم و بیش سو صفحات سے زائد کا مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔ (ایضاً)

مظفر حنفی کے اس ترجمے سے پتہ چلتا ہے کہ بھارتیندو ہندی کے ساتھ نہ صرف اردو بلکہ فارسی میں بھی نظم و نثر لکھا کرتے تھے۔ ہریش چندر کی حیات اور کارنامے کے جائزے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ بھی سرسید کی طرح ہندوستان میں بیداری کی شمع روشن کرنے والوں میں سے تھے۔ ان کی تخلیقات غلامی، غریبی، افلاس اور استحصال کے خلاف آوازیں بلند کرتی رہیں۔ انھوں نے اپنے دور کے حالات اور مسائل پر خاص نظر رکھی اور تقاضائے زندگی کا احترام کرتے ہوئے زمانے کے مسائل کو اپنی تحریروں کے قالب میں ڈھالتے رہے۔ غور طلب ہے کہ بھارتیندو کے ہندی زبان پر ہمیشہ باقی رہنے والے احسانات اور وسیع خدمات کے پیش نظر ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک کے زمانے کو 'بھارتیندو یگ' سے موسوم کیا جاتا ہے۔

کتاب بھارتیندو ہریش چندر دراصل بھارتیندو کے احوال و آثار پر مبنی ہے لیکن اس سے یہاں کی سماجی اور تہذیبی زندگی نیز زبان و ادب پر فارسی اور اردو کے کیا اثرات مرتب ہوئے، اس کی بھی جھلک ملتی ہے۔ اس دور کے بڑھتے ہوئے انگریزی کے اثرات اور منفی نتائج کی طرف بھی اس میں اشارے ملتے ہیں۔ یہ وہی زمانہ ہے جب ادب میں برج بھاشا کا بول بالا تھا اور فارسی نما اردو رائج ہو چکی تھی۔ ایسے میں بھارتیندو نے عوامی زبانوں اور خالص اردو کی بنیاد پر کھڑی بولی کو فروغ دینے کا کام کیا۔ آج ہندی کا استعمال زندگی کے ہر شعبے میں ہو رہا ہے۔ اس زبان کے لکھنے، پڑھنے اور بولنے والے پورے ملک میں موجود ہیں۔ علمی، ادبی، تہذیبی، سیاسی اور سماجی سطح پر آج ہندی جس مقام پر ہے، یہ بھارتیندو ہریش چندر کی دین ہے۔ اسی لیے وہ تجدید ہندی کے مبلغ سمجھے جاتے ہیں۔

بھارتیندو نے سوچنے کے نئے انداز کو اپنا کر ادب میں اپنے زمانے کے مسائل کو جگہ دی، یعنی ہندی ادب کو زندگی سے جوڑنے کی کوشش کی۔ اردو حلقہ میں ہریش چندر کی شہرت کا سبب اردو، فارسی زبان اور ان

زبانوں کے ادبا وشعرا سے بے پناہ عقیدت اور محبت ہے۔ ہریش چندر بھی اس زمانے میں فارسی اور اردو کے ایک کلاسیکی طرز کے شاعر کے طور پر جانے گئے۔ ان کے یہاں اردو شاعری میں ریختہ کے نمونے ملتے ہیں۔ ہریش چندر کی ہندی کے علاوہ اردو اور فارسی سے جس قدر رغبت رہی ہے اس کا ذکر اس کتاب میں ملتا ہے۔

مظفر حنفی کے اس ترجمے کا مطالعہ کرنے سے بھارتیندو کی زندگی کے بہت سے پہلو سامنے آجاتے ہیں جن سے ان کی قد و قامت، طبیعت، مزاج، بچپن، ان کی علمی صلاحیت، نیز نثر، شاعری، ڈراما، ظرافت، ادب اور صحافت کی دنیا میں ان کی تاریخی حیثیت کا علم ہوتا ہے۔ مظفر حنفی نے اس کتاب کا ترجمہ پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ ان کی نظر میں کسی شخصیت کی نہیں بلکہ اس کے علمی وفنی کمالات کی قدر ہے۔ مظفر حنفی غیر اردو داں ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں سے بہت قریب رہے اور ان کی تخلیقات کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے جس کا اندازہ ہم 'بھارتیندو ہریش چندر' اور دیگر سوانحی تراجم سے بھی کر سکتے ہیں۔ اردو ادب سے مانوس غیر اردو داں ادیب اور فن کار کی تصنیف وتخلیق کا وہ خصوصی مطالعہ کرتے تھے اور اپنے تاثرات بھی پیش کرتے تھے۔ ایسے فن کاروں کے درمیان مظفر حنفی کی ہندی میں شائع تخلیقات بھی بہت دلچسپی سے پڑھی جاتی رہیں۔

مظفر حنفی نے ترجمہ سے قبل بھارتیندو ہریش چندر سے متعلق دیباچے میں ان کی ذہانت وفطانت اور افکار ونظریات کے تذکرے کے ساتھ ہریش چندر کی اردو تخلیقات کا بھی ذکر کیا ہے، جن میں 'درلبھ بندھو'، 'ودیا سندر'، 'رتناولی' اور 'مدراراکشش' جیسی ترجمہ کردہ کتابوں اور اردو کی معیاری غزلوں کی تخلیقی صلاحیت نیز اردو شاعری کے مرتب کردہ دو انتخابات 'گلستانِ پُر بہار' اور 'چمنستانِ پُر بہار' کا بھی ذکر کیا ہے۔ ہریش چندر اردو میں رسا تخلص کرتے تھے۔ اردو حلقے میں بھی بھارتیندو کی ذات کس قدر محترم اور مقبول ہے اس کا اندازہ ہم ماہرین کی آرا سے کر سکتے ہیں۔ ان کی برسی کے موقع پر اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے اپنے کلام کے ذریعہ انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا:

کسی پہلو نہیں چین آتا ہے عشاق کو تیرے تڑپتے ہیں فغاں کرتے ہیں اور کروٹ بدلتے ہیں
اسیرانِ قفس صحن چمن کو یاد کرتے ہیں بھلا بلبل پہ یوں بھی ظلم اے صیاد کرتے ہیں

مختصر یہ کہ بھارتیندو ہریش چندر کی سوانح ہو یا دیگر ترجمہ کردہ کتابیں یہ مظفر حنفی کی فن کارانہ بصیرت پر دال ہیں۔ وہ ترجمہ نگاری کے اصولوں اور اس کی باریکیوں سے خوب واقف تھے۔ مظفر حنفی کی اردو میں ترجمہ کردہ تحریریں بیش بہا خزانے سے کم نہیں۔ شرط یہ ہے کہ اسے دیدہ ریزی سے پڑھا جائے۔ کتاب ہریش چندر مترجم کا اہم اور نہایت خوب صورت کارنامہ ہے۔ ترجمہ نگاری کے میدان میں مظفر حنفی پر ہنوز سنجیدہ ہو کر کام کرنے کی ضرورت ہے تا کہ ترجمہ نگاری کے فن میں ان کا صحیح مقام متعین کیا جا سکے۔

○○○

راکیش کمار
ریسرچ اسکالر (اردو) جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، رابطہ نمبر: 9682562091

پروفیسر مظفر حنفی اور ان کے اردو تراجم

اردو ادب کی تاریخ میں اس سے قبل کوئی ایسا سانحہ نہیں گزرا کہ جب ایک ساتھ اتنی علمی وادبی شخصیات دنیائے ادب کو داغ مفارقت دے گئی ہوں۔ ۲۰۲۰ء میں اردو ادب کو گلزار دہلوی، راحت اندوری، اشوک ساحل، نشتر امروہوی، پروفیسر مظفر حنفی، شمس الرحمٰن فاروقی، عرش صہبائی اور عظیم امروہوی جیسی عظیم شخصیات سے محروم ہونا پڑا۔ یہ سلسلہ پھر ۲۰۲۱ء میں بھی چل پڑا اور اردو ادب کی کئی مایہ ناز شخصیتیں رخصت ہو گئیں۔ اس سال رخصت ہونے والوں میں شمیم حنفی، ترنم ریاض اور پروفیسر مولا بخش کے نام نامی بھی شامل ہیں۔

پروفیسر مظفر حنفی نے ۱۹۵۰ء سے لے کر ۲۰۲۰ء تک مسلسل اردو ادب کی خدمت کی ہے۔ انھوں نے اردو زبان وادب کی مختلف اصناف پر تقریباً ۱۰۰ سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں جن میں تحقیق وتنقید کی ۲۴ کتابیں، ترجمے کی ۱۵، بچوں کے ادب کی ۹، سفر نامہ ۱، شعری مجموعے ۲۴، افسانوی مجموعے ۴ اور ۱۹ ترتیب وتدوین کردہ کتابیں شامل ہیں۔ ان کی اپنی شخصیت اور ادبی کارناموں پر ۷ کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ یہی نہیں ان کی شخصیت پر ہندو پاک کے موقر ادبی رسائل نے ۹ خصوصی شمارے بھی شائع کیے ہیں۔

مظفر حنفی کے مختلف الجہات اور وسیع و دقیق تخلیقی، تنقیدی اور دیگر شعری وادبی کارناموں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے دنیائے ادب میں ان کے مقام ومرتبے کا تعین کیا جائے تو وہ ایک طرف اپنے تمام ہم عصر جدید شعرا میں نمایاں مقام پر نظر آتے ہیں تو دوسری طرف ایک خاص دور کے افسانہ نگاروں کی اولین صف میں بھی شامل ہیں۔ تحقیق وتنقید، ترتیب وتدوین اور تراجم کے ابواب میں ان کے منفرد کارناموں کی ایک طویل فہرست انھیں آج کے محققین، ناقدین، مرتبین اور مترجمین میں ایک باوقار مقام کا مستحق ٹھہراتی ہے۔ ان سب کے علاوہ دو اہم خصوصیتوں کی بنا پر وہ دنیائے شعر وادب میں ایک منفرد وممتاز حیثیت کے مالک قرار پاتے ہیں۔ اول یہ کہ جدت اور طنز کی آمیزش سے جو اچھوتا اور منفرد رنگ وآہنگ انھوں نے ایجاد کیا وہ انھیں دوسروں سے ممتاز بناتا ہے۔ خالص شاعری کی بات کریں تو وہ یگانہ اور شاد عارفی کے سلسلے کی اگلی کڑی ہیں اور اسی سبب

سے ان کے ہمعصروں میں کوئی بھی شاعر اس مقام و مرتبے کو نہیں پہنچا جہاں وہ ہیں۔ اردو شاعری اور تحقیق و تنقید کے حوالے سے ان کی گراں قدر خدمات اردو زبان میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اپنے ہمعصروں میں سب سے ممتاز ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بیک وقت کئی اصناف شعر و ادب پر مبنی تصنیفات و تالیفات کا اس قدر پھیلاؤ اور اس کا اتنا اعلیٰ معیار کسی دوسرے شاعر یا ادیب کے یہاں نہیں ملتا۔ اردو کی کئی دیگر اصناف ادب کی طرح اردو ترجمہ نگاری میں بھی مظفر حنفی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

ترجمہ کو اطلاقی لسانیات کا ایک اہم شعبہ مانا جاتا ہے۔ اس حقیقت سے سب لوگ واقف ہیں کہ دنیا میں زبانوں کی تعداد بے شمار ہے اور ان تمام زبانوں کو سیکھا نہیں جا سکتا جس کی وجہ سے ایک ترسیلی رکاوٹ کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس ترسیلی رکاوٹ کو ختم کرنے کا واحد طریقہ ترجمہ ہے۔ یہ وہ طریقۂ کار ہے جس کی مدد سے ایک متن کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اس منتقلی کے کئی لسانی مسائل ہیں، لہٰذا ترجمہ نگاری کا فن لسانیات کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ مظفر حنفی ایک اعلیٰ پایہ کے زبان داں تھے۔ انھیں اردو کے علاوہ اور کئی زبانوں پر مہارت حاصل تھی۔ ترجمہ کے میدان میں ان کے کارناموں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ۱۹۵۴ء سے لے کر ۲۰۲۰ء تک مختلف رسائل و جرائد میں ان کے مختلف زبانوں میں ترجمہ کردہ کئی مضامین ملتے ہیں۔ انھوں نے دوسری کئی زبانوں کی کہانیوں کو اردو زبان کا ملبوس عطا کیا ہے۔ انھوں نے ملکی اور غیر ملکی مشہور مصنّفین کی کتابوں کو اردو زبان میں منتقل کر کے اردو کے ادبی سرمائے میں اضافہ کیا ہے۔

مختلف اور متضاد نظریات کے حامل مصنّفین مثلاً میکسم گورکی، چیخوف، الیگزنڈر رسولنسٹن وغیرہ کی مشہور زمانہ تصانیف کو اس خوبی سے اردو میں منتقل کیا ہے کہ دونوں زبانوں کے مابین تاریخی، جغرافیائی، سماجی، معاشی اور سیاسی ابعاد کے باوجود زبان و بیان اور مزاج و ماحول کے اعتبار سے یہ اردو کی تخلیقات معلوم ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے ہندوستان کی علاقائی زبانوں کے شہ پاروں کو اردو میں منتقل کر کے زبانوں کے مابین مروجہ تعصب، تنگ نظریوں اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کے سلسلے میں اہم اقدامات کیے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے بنگالی، گجراتی، اڑیا زبان کے شاہکار ادب پاروں کو اردو میں منتقل کر کے ان علاقائی ادب پاروں کے توسط سے اردو والوں کو ان علاقائی تہذیب، طرز معاشرت، رسم و رواج اور رہن سہن سے روشناس کرایا۔

مظفر حنفی کے سات مطبوعہ جاسوسی ناولوں کے ترجموں میں چوروں کا قاتل، شرلاک ہومز ہندوستان میں، دہری سازش، پراسرار قتل، تارِ عنکبوت، بین الاقوامی لٹیرے اور پیلی کوٹھی وغیرہ شامل ہیں۔ ان سات مطبوعہ ناولوں کے علاوہ انھوں نے کئی مشہور دوسرے ناولوں اور کتابوں کو اردو میں منتقل کیا ہے جن کے نام سخاروف نے کہا، گلاگ مجمع الجزائر (دفتر اول)، گلاگ مجمع الجزائر (دفتر دوم)، گلاگ مجمع الجزائر (دفتر سوم)، گجراتی یک بابی ڈرامے، اڑیا افسانے، بیداری، بھارتیندو ہریش چندر، بنکم چندر چڑ جی، طوفان اور رنگیلے نواب ہیں۔ یہی نہیں

مظفر حنفی نے تین افسانے بھی انگریزی اور ہندی سے اردو میں منتقل کیے ہیں۔ ان افسانوں میں 'کنواں' ہندی ادب سے اردو میں، 'جراثیم کی چوری' ایچ۔ جی۔ بلس کی انگریزی کہانی The Stolen Basillus سے اور 'اضطراب'، انٹن چیخوف کی روسی سے انگریزی ترجمہ کردہ کہانی A Nervous Btreakdown سے اردو میں ترجمہ ہیں جو بالترتیب ماہنامہ 'نکہت' الہ آباد اور 'پگڈنڈی' امرتسر میں شائع ہوئیں۔

مظفر حنفی کے تمام تراجم کا اگر تفصیلی جائزہ پیش کرنا ہو تو ایک مکمل کتاب تحریر کی جا سکتی ہے۔ بہر حال ان کی تصانیف کی تفصیلات میں سب سے پہلے ان کے انگریزی جاسوسی ناولوں کے تراجم کا جائزہ لیتے ہیں۔ 'چوروں کا قاتل' مظفر حنفی کا سب سے پہلا انگریزی سے اردو ترجمہ ہے۔ اس ناول کو مظفر حنفی نے انگریزی کی سیکسٹن بلیک سریز سے اردو زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی تہذیب و کلچر اور ماحول میں ایسے ڈھالا ہے کہ جیسے یہ ان کی اپنی ایجاد کردہ تخلیق ہو۔ مظفر حنفی کا ناول ۱۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ وہ اپنے ابتدائی دور میں چوں کہ اپنی افسانہ نگاری کی وجہ سے اردو دنیا میں ایک پہچان بنا چکے تھے۔ اس لیے مانسرور پبلشنگ اکیڈمی الہ آباد نے ان کا ترجمہ کردہ ناول 'چوروں کا قاتل' ۱۹۵۴ء میں شائع کیا جو خاصا مقبول ہوا اور ادارے کی ساکھ بنانے میں معاون ثابت ہوا۔

ناول 'دا ریڈر از وارنڈ' (The reader is Wraned) امریکی مصنف جان ڈکسن کار کا پراسرار ناول ہے جس نے اسے کارٹر ڈکسن کے نام سے شائع کیا۔ یہ ایک ووڈنت (Whodunit) ہے اور اس میں سیریز کے جاسوس سر ہنری میری ویلے (Sir Henry Merrivale) شامل ہیں۔ مظفر حنفی کا ترجمہ کردہ ناول 'شرلاک ہومس ہندوستان میں' کا مرکزی خیال یہی ناول ہے۔ مظفر حنفی نے اس ناول کو ذیلی عنوانات، دھندلکا، ہوائی قتل، خوف و ہراس اور طلوعِ صبح کے نام سے چار مختلف ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ اس ناول کا انتساب انھوں نے اپنے چچازاد بھائی سیٹھ مظہر الدین مظہر کھنڈوی کے نام کیا ہے۔ یہ ناول نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے ۱۹۵۶ء میں شائع کیا تھا جس کی ضخامت ۸۴۳ صفحات ہے۔ ترجمہ چوں کہ ایک ایسا فن ہے جو زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے اس میں اپنی زبان کی مہارت کے ساتھ ساتھ اصل متن کی زبان سے بھی مکمل وقفیت ہونی چاہیے۔ زبان کے علاوہ اصل تصنیف کے ادب اور تہذیب و ثقافت سے واقفیت بلکہ دلچسپی اور ہمدردی ہونا بھی ضروری ہے۔ اس سلسلے میں اگر ہم مظفر حنفی کی بات کریں تو ان کے کئی کارنامے ایسے ہیں جن کی بدولت وہ دو مختلف زبانوں اور دو قومی تہذیبوں کے درمیان ایک لسانی اور ثقافتی سفیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مظفر حنفی نے اگاتھا کرسٹی کے ایک انگریزی ناول An Over Dose of Death کا بھی انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے جو ضخامت کے اعتبار سے ۲۷۰ صفحات پر مبنی ہے۔ یہ ناول بھی نسیم بک ڈپو لکھنؤ کے زیر اہتمام ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ 'پراسرار قاتل' بھی مظفر حنفی کا ۲۸۲ صفحات پر مشتمل ایک جاسوسی ناول ہے جسے انھوں نے انگریزی کے مشہور ناول نگار آرلے اسٹانلے کارڈنر (Erle Stanley Gardner) کے دلچسپ

اور سنسنی خیز ناول The Case of The rolling Bones سے اردو میں اخذ کیا ہے۔اس ناول کا سن اشاعت ۱۹۵۵ء ہے اور یہ بھی نسیم بک ڈپو کے زیر اہتمام شائع ہوا ہے۔ یہ مظفر حنفی کا چوتھا جاسوسی ناول ہے۔

یہاں اس بات کی مزید وضاحت کرتا چلوں کہ مظفر حنفی نے جاسوسی ناولوں کو انگریزی سے اخذ کر کے اردو میں منتقل کیا ہے۔انھوں نے ان کا لفظی یا ہو بہو ترجمہ کرنے سے اجتناب کیا ہے۔اصل کہانیوں سے صرف مرکزی خیال کو لے کر انھیں ہندوستانی تہذیب وثقافت اور ماحول ومعاشرت میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ چوں کہ یہ انگریزی کے جاسوسی ناولوں سے ماخوذ کیے گئے ہیں اس لیے ان کے بعض واقعات کو مصنف نے ضرورت کے مطابق تبدیل بھی کیا ہے تا کہ انھیں بھی کہیں جاسوسی ناولوں کے زمرے میں نہ شامل کر دیا جائے۔

ان تمام ناولوں کو موصوف نے طبع زاد کہہ کر شائع نہیں کیا بلکہ ان سب میں اپنا نام بطور مترجم درج کیا ہے۔ یہ روش اکثر اردو قلم کاروں کے یہاں عام ہے کہ اصل متن کا اگر لفظی ترجمہ بھی کیا گیا ہو تو بھی اسے طبع زاد کہنے میں اجتناب نہیں کرتے بلکہ اگر کہیں ذکر کرتے بھی ہیں تو کتاب کے آخری میں چند سطروں میں لکھا ہوا ملتا ہے کہ مرکزی خیال فلاں تصنیف سے ہے۔لیکن مظفر حنفی اپنی زندگی میں ہر قسم کے معاملات ومعمولات میں حق پسند، صاف گو، غیر مصلحت پسندانہ اور بے باک رویوں پر کار بند رہے ہیں۔انھوں نے سیکسٹن بلیک سیریز کے دیگر جن تین اور جاسوسی ناولوں کو ہندوستانی زبان کا جامہ پہنایا ہے ان میں سے ایک ناول ’تار عنکبوت‘ ہے جو ماہنامہ ’شعلہ وشبنم‘ دہلی میں ۱۹۵۶ء میں قسط وار شائع ہوا، جب کہ دوسرے ناول ’بین الاقوامی لٹیرے‘ اور ’پیلی کوٹھی‘ دونوں بھی الگ الگ شماروں میں شائع ہوئے۔

مظفر حنفی نے جہاں انگریزی کے کئی جاسوسی ناولوں کو انگریزی سے ہندوستانی ماحول میں ڈھالا ہے وہیں دوسری جانب انھوں نے کئی ملکی وغیر ملکی غیر جاسوسی ادبی شہ پاروں کو بھی دوسری مختلف زبانوں سے اخذ کر کے اپنی زبان میں پیش کیا ہے۔اردو ترجمہ اکادمی دہلی نے مشہور نوبل انعام یافتہ روسی سائنس داں آندری ڈی سخاروف (Andrei D Sakharov) کے ۱۵ر سنسنی خیز بیانات اور تحریروں پر مشتمل انگریزی کتاب Sakharov Speaks کا بامحاورہ اردو ترجمہ مظفر حنفی سے کرایا ہے۔سخاروف سوویت یونین کے آر ڈی ایس (RDS) کے مشہور ڈیزائنر کے طور پر مشہور ہوئے جو سوویت یونین کے تھرمونیوکلیئر ہتھیاروں کی ترقی کا کوڈ نام ہے۔

سخاروف بعد میں سوویت یونین میں شہری آزادیوں اور شہری اصلاحات کے وکیل بنے جس کے لیے انھیں ریاستی ظلم وستم کا سامنا کرنا پڑا۔ان کی انھیں کوششوں کی بدولت ۱۹۷۵ء میں امن کا نوبل انعام ملا۔مظفر حنفی کی کتاب ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب ملک میں ایمرجنسی نافذ تھی۔ یہ کتاب جب اشاعت کے لیے گئی تو ناشر نے مخلصانہ جذبے کے تحت غلطی سے مترجم کا نام مظفر حنفی کی جگہ ستیہ پرکاش چھاپ دیا۔ نیشنل اکادمی دہلی نے ایک اور نوبل انعام یافتہ مصنف Aleksendr Solzhenitsyn کی تین جلدوں پر مشتمل غیر افسانوی

تخلیق The Gulag Archipelago کو ’گلاگ مجمع الجزائر‘ کے نام سے اردو ترجمہ مظفر حنفی سے کرایا ہے۔ مظفر حنفی نے اس کتاب کی پہلی جلد ’گلاگ مجمع الجزائر‘ (جلد اول) ۱۹۷۵ء میں شائع کیا تو ناشر نے غلطی سے مترجم کا نام مظفر حنفی کی جگہ پریم گوپال متل لکھ دیا۔اس کتاب کو مظفر نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔حصۂ اول کو ’صنعت زنداں‘ کا نام دیا اور حصۂ دوم کو ’پیہم روانی‘ کہا ہے۔اس کے دونوں حصے کو بھی مختلف نام دے کر بالترتیب ۱۲ر اور ۸ر ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ مکمل شاہکار ۵۸۰ر صفحات پر مشتمل ہے۔

مظفر حنفی نے Aleksendr کی The Gulag Archipelago Volume-2 کے ترجمہ ’گلاگ مجمع الجزائر‘ (دفتر دوم) کی اشاعت ۱۹۷۸ء میں کی ہے۔ یہ کتاب جلد اول اور جلد سوم کے مقابلے میں زیادہ ضخیم ۶۲۴ر صفحات پر مشتمل ہے۔اسے بھی مصنف نے دو حصوں میں تقسیم کر کے حصہ سوم اور چہارم نام دیا ہے۔اس کے حصہ سوم کو مصنف نے ’غار مشقتی کیمپ‘ کا نام دیا جسے کل بائیس باب میں اور حصہ چہارم کو ’روح اور کانٹے دار تار‘ نام دے کر چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ان دونوں حصوں کے تمام ابواب کو بھی انھوں الگ الگ نام دیئے ہیں۔حصہ سوم کے ۲۲ر ابواب کو، آوارہ کی انگلیاں، سمندر سے مجمع الجزائر کا طلوع، مجمع الجزائر کی توسیع، مجمع الجزائر سختی آتی ہے، مجمع الجزائر کی اساس، وہ فاشسٹوں کو لے آئے، مجمع الجزائر کے باشندگان کا طرز زندگی اور رسم و رواج، کیمپ میں خواتین، معتمد قیدی، سیاسی قیدیوں کے نا پر، وفادار قیدی، کھٹ کھٹ کھٹ، اپنی دوسری کھال بھی مرے حوالے کرو، قسمت کی تبدیلی، سزائیں، سماجی اعتبار سے دوست عناصر، مجرم بچے، گلاگ کی فنون لطیفہ کی دیویاں، قیدیوں کی قوم، کتوں کی خدمات، کیمپوں کے قرب وجوار میں، ہم مصروف تعمیر ہیں، نام دئے ہیں اور حصہ چہارم کے چاروں ابواب کے نام، چڑھائی، یا گروٹ، ہماری پابہ زنجیر آزادی، الگ الگ کہانیاں ہیں۔

مظفر حنفی نے اس کتاب کی تیسری جلد کا اردو ترجمہ ’گلاگ مجمع الجزائر‘ (جلد سوم) ۱۹۸۱ء میں شائع کیا ہے۔اس کتاب کو بہار اردو اکادمی نے انعام سے بھی نوازا ہے۔ یہ کتاب ۵۲۰ر صفحات پر مشتمل ہے جسے مصنف نے تین حصوں حصہ پنجم، حصہ ششم اور حصہ ہفتم کو بالترتیب ۱۲، ۷، ۳، ابواب میں تقسیم کیا ہے۔اس جلد کے حصے کتاب ’گلاگ مجمع الجزائر‘ کی جلد اول اور دوم کے حصوں سے مربوط ہیں۔اس جلد کے حصوں کے تمام ابواب کو بھی الگ الگ نام دیئے ہیں لیکن مضمون کی طوالت کا خیال رکھتے ہوئے انھیں نظر انداز کرنا ضروری ہے۔علاوہ ازیں مظفر حنفی نے روسی ادب کے معروف وممتاز ناول نگار Maxim Gorky کے ناول The Artomonovs کو بھی انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔اس کتاب میں گورکی نے کردار کو تخلیق کرنے کی بہترین طاقت دکھائی ہے۔ ناول ’قانون‘ کے علاوہ انھوں ایک اور روسی ادیب انٹن چیخوف کے ناول کا ’رنگیلے نواب‘ کے نام سے ترجمہ کیا ہے لیکن اس کی اشاعت کے متعلق کہیں کوئی ثبوت نہیں ملتا کیوں اس

سے قبل ان کے ناول 'طوفان' کا مسودہ نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے منظور کرنے کے باوجود بھی ۲۰ رسال تک روکے رکھا اور شائع نہیں کیا۔

مظفرؔ حنفی نے جہاں انگریزی ادب کی ایک کے بعد ایک بڑی بڑی ہستیوں کی مشہور تصانیف کو اردو کا ملبوس عطا کیا وہیں انھوں نے ہندوستان کے مختلف مصنّفین کی علاقائی زبانوں کی تصانیف کو بھی اردو میں منتقل کر کے زبانوں کے مابین تعصب اور غلط فہمیوں کو دور کیا۔ بنگالی زبان کے مشور ناول نگار ستی ناتھ بدوری کا ایک مشہور ناول 'جاگری' (Jagari or Jagori) ہے جو ہندوستان چھوڑ و تحریک (۱۹۴۲ء) کے پس منظر میں ۱۹۴۵ء میں لکھا گیا۔ یہ ناول ہندستان کی آزادی کی تحریک میں عام بنگالی لوگوں کی شمولیت کو بیان کرتا ہے۔ اس ناول کو مظفرؔ حنفی نے 'بیداری' کے نام سے بنگالی زبان سے اردو میں منتقل کیا، جسے نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا نے ۱۹۸۰ء میں شائع کیا۔ ۲۱۴ رصفحات پر مشتمل اس ناول کو مغربی بنگال اردو اکادمی نے پہلے انعام سے بھی نوازا ہے۔

اڑیا زبان کے مشہور شاعر و ادیب پٹھانی پٹنائک نے اڑیا زبان کے مختلف افسانہ نگاروں کے ۲۱ ر شاہکار افسانوں کو ایک مجموعے میں ترتیب دے کر شائع کیا۔ اس مجموعے کا مظفرؔ حنفی نے اردو ترجمہ کیا اور نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا (دہلی) سے ۱۹۸۰ء میں شائع کیا۔ اس کتاب کے آغاز میں اڑیا افسانے کی مختصر تاریخ درج ہے۔ اس کتاب میں درج افسانوں میں، ریتی (فقیر موہن سیناپتی)، نیل ماسٹرنی (گوداوریش مہاپاترا)، گوشت کا لوحہ (کالندی چرن پانی گراہی)، اندھر دہ (سچد انند راوت راؤ)، گوپی ساہو کی دوکان (اننت پرساد پنڈا)، کالا پہاڑ (راج کشور رائے)، اندھیرے کا آسیب (پران بندھوکر)، بے موسم بادل (نتیہ نند مہا پاتر)، ٹھگ (راج کشور پٹنائک)، ٹڈپا (گوپی ناتھ مہانتی)، کاٹھ کا گھوڑا (سریندر مہانتی)، حلقۂ ایمان (باما چرن متر)، ٹوٹے کھلونے (کشور چرن داس)، چاند کی بددعا (اکھل موہن پٹ نائک)، ستمبر کی ہنسی (مہا پاتر نیل منی ساہو)، عام دعوت (بسنت کمار پٹ نائک)، جنگل میں (منوج داس)، چندن ہار (وبھوتی بھوشن ترپاٹھی)، جنگل اور باغیچہ (کرشن پرساد مصر)، ضرب کاری (شانتو کمار اچاریہ) اور ساحل کی تشنگی (دینا پانی مہانتی) شامل ہیں۔ اسی کتاب کے آخر کے چند صفحات میں اس مجموعے میں شامل افسانہ نگاروں کا مختصر تعارف بھی موجود ہے۔

'گجراتی کے یک بابی ڈرامے' بھی مظفرؔ حنفی کی اہم ترجمہ کردہ تصنیف ہے جسے نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا (دہلی) نے ۱۹۷۷ء میں شائع کیا ہے۔ مظفرؔ نے اس کتاب کو ایم۔ ایم راول کی مرتب کردہ کتاب سے اردو میں ڈھالا ہے۔ یہ کتاب گجراتی زبان کے ۱۳ رمشہور ڈراموں کا انتخاب ہے۔ اس کتاب میں، مینا گوجری (رسک لا چھوٹا لال پاریکھ)، سون (چندرون مہتا)، اوس کے موتی (یشونت پنڈیا)، ہنسار (بٹو بھائی امرادیا)،

گونج (اماشنکر جوشی)، پرانا جوڑا (درگیش شکل)، گٹو کی ماں (چنی لال مڑیا)، مائیکے کا پڑوسی (پشکر چندرواکر)، ایسے نہیں تو ویسے (پنالال پٹیل)، سوئی کی نوک (جینتی دیال)، جھلملاتی روشنی (کرشن لال شری دھرانی)، تاریخ کا ایک صفحہ (گلاب داس بروکر)، گل آزادی (شوکمار جوشی) کے ڈرامے شامل ہیں۔ جناب ایم۔ ایم راول نے اس کتاب کے آخر میں اس میں شامل ڈراما نگاروں کا مختصر تعارف بھی پیش کیا ہے۔

آخر میں ہم مظفر حنفی کی ترجمہ نگاری کے میدان میں آخری تخلیق کا ذکر کر کے اس مضمون کا اختتام کرتے ہیں۔ انھوں نے دیگر زبانوں کے مختلف شہ پاروں کے علاوہ مدن گوپال کی ہندی تصنیف 'بھارتیندو ہریش چندر' کا بھی اردو میں با محاورہ ترجمہ کیا ہے۔ بھارتیندو ہریش چندر ایک ہندوستانی شاعر، مصنف، مترجم اور مشہور ڈراما نگار کے تھے۔ وہ کئی ڈراموں، زندگی کے خاکوں اور ٹریول اکاونٹس کے مصنف تھے۔ قلمی نام 'رسآ' کے تحت لکھتے تھے۔ ہریش چندر نے اپنی تخلیقات میں ملک کی غربت، لوگوں کی اذیتوں، غیر انسانی استحصال، متوسط طبقے کی بدامنی اور ملک کی ترقی جیسے مسائل اٹھائے ہیں۔ مدن گوپال کی یہ کتاب بھارتیندو ہریش چندر کی سوانح حیات ہے۔ مظفرؔ حنفی کی اس کتاب کو ساہتیہ اکادمی نئی دہلی نے اہتمام کے ساتھ ۱۹۸۴ء میں شائع کیا ہے۔

مختصر یہ کہ مظفرؔ حنفی جہاں ایک بہترین ادیب، شاعر، نقاد اور محقق ہیں وہیں ایک لاجواب مترجم بھی ہیں۔ انھوں نے مختلف زبانوں سے افسانوں، ناولوں، ڈراموں اور دیگر تخلیقات کو دوسری زبانوں سے اردو زبان میں بڑی کامیابی سے منتقل کیا ہے۔ ان تراجم میں ایسی زبان استعمال کی ہے کہ پڑھنے والے کو مطالعہ کے وقت تخلیق کا اندازہ ہوتا ہے۔ ماہرین ادب نے ترجمے کے جو اصول و ضوابط قائم کیے ہیں مظفرؔ نے ان تمام اصولوں کو مدنظر رکھ کر یہ تراجم کیے ہیں۔



ڈاکٹر شکیل احمد
ڈومن پورہ، مئوناتھ بھنجن، مئو، رابطہ نمبر: 9236722570

مظفر حنفی کی شاعری میں بچوں کی حصہ داری

مظفر حنفی کی شخصیت ہمہ گیر ہے۔ آپ کی تدریسی خدمات جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے کلکتہ یونیورسٹی تک وسیع ہیں۔ آپ کی تصنیفی خدمات کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ پینتیس کتابوں پر ملک کی کئی اردو اکادمیوں نے انعامات دیئے ہیں۔ مختلف اصناف میں تقریباً اسی (۸۰) کتابیں آپ کی ہمہ جہت علمی، ادبی، تحقیقی اور شعری خدمات کی مظہر ہیں۔ آپ نے تراجم بھی کیے۔ صحافت اور نشریات کے محکمہ سے بھی رابطہ رکھا۔ آپ کے شعری سرمایہ میں بڑا حصہ غزلوں کا ہے۔ ان میں بھی آپ کی شاعری کا قدرے تیکھا، شوخ اور بے باک لہجہ غالب نظر آتا ہے جس کی ہر سمت میں قدر کی گئی۔ ان تمام کے باوصف آپ کی شاعری کا ایک حصہ 'بچوں کی شاعری' پر مشتمل ہے۔ افسانہ نگاری اس پر مستزاد۔ آپ نے بچوں کے لیے اور ان سے متعلق جتنی نظمیں کہی ہیں وہ یک جا آپ کی شعری کلیات (جلد اول) 'کمان' میں 'کھیل کھیل میں' کے عنوان سے شائع ہوئی ہیں۔ اس کلیات کے مرتب آپ کے فرزند فیروز مظفر صاحب ہیں۔ تقریباً پانچ سو صفحات کی اس کلیات میں پینسٹھ صفحات 'کھیل کھیل میں' کے لیے وقف ہیں۔ جن میں آپ کی ۱۹۵۲ء سے ۲۰۱۲ء تک کی بچوں سے متعلق تمام نظمیں شامل ہیں، جن کی تعداد ستاسی ہے۔ حالاں کہ آپ نے خود صفحہ ۲۴ پر ان کی تعداد نواسی تحریر فرمائی ہے۔

مظفر حنفی کی زندگی تجربات و مشاہدات سے عبارت ہے۔ آپ نے فعال زندگی گزاری۔ وقت کی قدر کی جس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ یونیورسٹی کی تدریسی ذمہ داریوں کے ساتھ تصنیفی اور شعری سرگرمیوں کا ایک جہان بھی آباد کیا، جو آپ کی تصنیفات کی تعداد کے ساتھ تحقیقی اور تخلیقی معیار سے عیاں ہوتا ہے۔ ان تمام سرگرمیوں کے دوران بچوں کے لیے سوچنا، ان کی حرکات و سکنات کا مطالعہ کرنا، ان کی نفسیات کے مطابق نظموں کے عنوانات منتخب کرنا اور شعری پیرایے میں ڈھال کر رسائل میں اشاعت کے بعد اب پہلی بار کلیات میں جگہ دینا، بچوں سے متعلق آپ کے احساس ذمہ داری کا روشن پہلو ہے۔

بچوں کے لیے نظم یا نثر میں جو بھی لکھا جائے خود کو بچوں کی عمر میں پہنچ کر اپنے مشاہدے اور تجربے کو

ادب اطفال

بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ گئے دنوں کی خوشبوؤں کو سونگھنے کی صلاحیت پیدا کرنا پڑتا ہے۔ بچوں اور بچوں کی مشترک اور منفرد نفسیات اور سوچ کا تجربہ بھی اجاگر کرکے انھیں شعری پیرایے میں ڈھالنا پڑتا ہے۔ شاعر کے مطابق 'کھیل کھیل میں' میں تو ساٹھ برس کی شاعری شامل ہے۔ مگر نظموں کا مطالعہ کیجیے تو ماہ و سال کی قید نظر نہیں آتی۔ ہر نظم، ہر ریمس بچوں کے لیے اور بچوں کی زبان میں ہے۔ آپ نے بیس برس کی عمر میں بچوں کی زبان میں اور بچوں کے لیے نظمیں لکھیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب آپ کی عمر شریف ستر برس سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اسے کمالِ فن کہا جائے گا جب شاعر نوجوانی اور بڑھاپے کے امتیاز کے بغیر بچوں کے لیے ایک جیسی تخلیقات پیش کرتا رہے، جب کہ اس کی زندگی میں نت نئے تجربات اور مشاہدات ہر صبح و شام آتے رہتے ہیں لیکن وہ اپنے ہر تجربے، ہر مشاہدے کو 'بچہ' بنا کر پیش کرنے پر مہارت رکھتا ہے۔

'کھیل کھیل میں' میں مختلف ذوق وشوق کی نظمیں ہیں۔ ان تمام میں بچوں کے ذہن کے مطابق چیزوں کے نام، کھیل کود کی تفصیل، شرارتیں اور شوخیاں نیز دلچسپ باتیں پیش کی گئی ہیں۔ اکثر نظمیں مختصر چار چھ اشعار پر مشتمل ہیں۔ چند میں اشعار کی تعداد زیادہ ہے اور بات قدرے تفصیل سے کی گئی ہے۔ مگر نظمیں خواہ مختصر ہوں یا قدرے تفصیلی، ان میں بچوں کے لیے نصیحت اور دل کشی دونوں موجود ہیں۔ بعض نظمیں بالکل تفریحی بھی ہیں لیکن ان میں الفاظ یا چیزوں کے نام ایسے نظم کیے ہیں جن سے نونہالوں کے علم میں اضافہ ضرور ہوتا ہے۔ تمام نظمیں تفریحی ہونے کے ساتھ بامقصد اور بچوں کی ذہنی سطح کے عین مطابق ہیں۔ میں چند نظموں کے بارے میں اختصار کے ساتھ اپنی بات رکھنا چاہوں گا جس سے 'کھیل کھیل میں' میں مظفر حنفی صاحب کے وہ خیالات سامنے آجائیں جو وہ نونہالوں کی ذہنی تربیت اور ان کی ذہنی سطح کے مطابق پیش کرنا چاہتے ہیں۔

'چوہے کی بارات چلی' مفید اور دلچسپ نظم ہے۔ اس میں شاعر نے بچوں کی دلچسپی اور ان کی معلومات میں اضافہ کے لیے بتیس چرند و پرند کے نام شامل کیے ہیں جو چوہے کی بارات میں شامل ہوئے اور ہر ایک اپنی بساط اور توفیق کے مطابق نذرانہ یا نوید بھی لے کر آیا ہے۔ یہ نظمیں باہمی تعاون کے جذبے کو فروغ دینے میں بچوں کے لیے خاص معاون ہے۔ نمونتاً چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

مرغی آئی انڈا لے کر — بندر آیا ڈنڈا لے کر
بلبل آئی گجرا لے کر — کوّا آیا کجرا لے کر
خرگوش آئے دلائی لے کر — اور گدھے شہنائی لے کر
چوہے کی بارات چلی
دلی سے میوات چلی

بچوں میں مساوات اور ہمدردی کے جذبے کے فروغ کے لیے 'ہر انسان برابر ہے' اچھی نظم ہے۔ اس

نظم میں انسانی معاشرے کے اہم افراد اور کلیدی کردار ادا کرنے والے اشخاص سے بچے متعارف ہوتے ہیں۔ اس میں مختلف طبقوں، پیشوں اور کام دھندوں میں مصروف لوگوں کے پہناوے اور رہن سہن سے بھی بچے اپنی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر افراد سے بچے آشنا بھی ہیں مگر سب کے ساتھ برابری اور احترام کے جذبے کے ساتھ رہنا اور سلوک کرنا اس نظم کی اہم تعلیم ہے۔ دو تین بند کے مطالعے سے اس نظم کی خوبی سامنے آجاتی ہے۔

چپراسی ہو یا افسر — موچی ہو یا سوداگر
کھینچ رہا ہے جو رکشا — جو بیٹھا ہے رکشا پر
سب کا مان برابر ہے
ہر انسان برابر ہے
پنجابی ہو یا سندھی — اردو بولے یا ہندی
دھوتی پہنے یا شلوار — پھول سجائے یا بندی
سب کا مان برابر ہے
ہر انسان برابر ہے

بچوں میں تعلیم اور اس کی برکتوں سے فائدہ اٹھا کر ڈاکٹر، انجینئر، ایئر ہوسٹس، چانسلر، پولس کمشنر، بیرسٹر اور ضلع کلکٹر وغیرہ بننے کے خواب کو عملی شکل دینے کی ترغیب نظم 'صبا ڈاکٹر بنی' میں موجود ہے جس میں اپنی محنت اور لگن کی بدولت صبا کے ساتھ زمن، ثمر، فیضی، ارقم، نبیلہ، ایمن اور حنا وغیرہ کے لیے باعزت عہدوں کو پانے اور ان پر متمکن ہونے کا سنہرا سپنا موجود ہے۔

بنے گی ثمرہ پولس کمشنر
نبیلہ سکریٹری لگے گی — وجیہہ ڈی آئی جی بنے گی
حنا کہیں لکچرر رہے گی — اور عائشہ آرمی کی افسر
اریب سائنس داں بنے گا

'مزدور کی عظمت' ایک مترنم اور سبق آموز نظم ہے۔ بچوں کے ذہن میں محنت اور لگن کی عادت ڈالنے کی ترغیب اس نظم سے ضرور دی جاسکتی ہے۔ انسانی زندگی کی سرگرمیوں میں مزدوروں، فن کاروں اور ماہر انسانوں کے تعاون کو دل نشیں پیرایے میں نظم کیا گیا ہے۔

مِل میں کپڑا بنتے ہیں — یہ دیواریں چنتے ہیں
ہم ٹی وی اور ٹیلی فون — ان کے دم سے سنتے ہیں

بے شک دنیا قائم ہے
مزدوروں کی محنت پر

یہ ناویں تیراتے ہیں اور جہاز اڑاتے ہیں
سُکھ دیتے ہیں دُکھ سہ کر روکھی سوکھی کھاتے ہیں

بے شک دنیا قائم ہے
مزدوروں کی محنت پر

بچوں کی شناخت، ان کی البیلی حرکتیں اور شرارتیں ہوا کرتی ہیں۔ شاعر نے متعدد نظموں میں بچوں کے اس رخ کو نظم کیا۔ نظم اور رائمس کے پیرایے میں بچوں کی شوخیوں اور شرارتوں کو پیش کیا۔ آپ نے اکثر نظموں میں بچوں کے نام بھی نظم کیے ہیں جس سے بچوں کی اپنائیت بڑھ جاتی ہے۔ ایسی نظموں میں 'سڑک پر کرکٹ'، 'گھر کی مرغی'، 'جی حامد نے' اور 'ہلّہ بولنے والے' جیسی متعدد نظمیں شامل ہیں۔ سڑک پر کرکٹ کا منظر اور تباہ کاری ملاحظہ فرمائیں۔

بچے کرکٹ کھیل رہے ہیں لوگ مصیبت جھیل رہے ہیں
سری ناتھ کی تھی نقالی اس نے ایسی گیند اچھالی
سیدھے جس نے دیکھی نالی رہ گیروں پر کیچڑ ڈالی
سبزی والے کا سر پھوڑا پھر کھڑکی کا شیشہ توڑا

بچے کرکٹ کھیل رہے ہیں
لوگ مصیبت جھیل رہے ہیں

'جی حامد نے' کیا اچھی حرکتیں کی ہیں۔ گھر والوں کے ساتھ آپ بھی منظر ملاحظہ کریں۔

کل مہمانوں کے کھانے میں، کس نے ملا دیا تھا چارا؟............جی حامد نے
اندر والی الماری سے، کس نے اڑایا سیب ہمارا؟............جی حامد نے
کس نے اس نعمت خانے کا، چٹ کر ڈالا سارا حلوہ؟............جی حامد نے

ان نظموں کے علاوہ جو متعدد سبق آموز نظمیں بچوں کی زندگی سنوارنے اور ان کی تربیت میں معاون ثابت ہوں گی، ان میں 'مدد'، 'بے موسم فٹ بال'، 'سب نے مینا کو چوما'، 'نصیحتوں کا پٹارا'، 'میں ذمہ دار بنوں گا'، 'گندے راجا کا اشنان'، 'چور چوہے اور بچے'، 'باغیچہ بچوں کا' اور 'چھوٹا کنبہ اچھا ہے' جیسی نظمیں شامل ہیں۔ چند نظمیں اشیا کا نام جاننے اور انھیں پہچاننے میں بھی معاون ہیں۔ 'سبزی بھاجی کا ٹھیلہ' ایسی ہی نظموں میں سے ایک ہے۔ دیکھیے کہ اس ایک نظم میں بچوں کو کتنی سبزیوں کے نام سیکھنے اور ان سبزیوں کو پہچاننے کا موقع مل گیا۔

موٹی گوبھی والا آیا/ گُھیّا اروی والا آیا/ سویا میتھی والا آیا/ سبزی بھاجی والا آیا/
تازہ تازہ لوکی لے لو/ نرم ملائم بھنڈی لے لو/ پتلی پتلی ککڑی لے لو/ لے لو میتھی مولی
لے لو/ لایا ہوں میں پیلے لیمو/ نئی فصل کے عمدہ آلو/ اودھے بیگن اچھے کدو/ لال ٹماٹر
لے لو بابو/ خوشبو والا پودینہ ہے/ ہرا بھرا تازہ دھنیا ہے/ یہ چولائی یہ کھیرا ہے/ ماں شلجم
لے لو سستا ہے/ ہیں جل کمبھی کے ڈنٹھل بھی/ مٹر پھلی ہے پرول بھی/ کھٹی کیری بھی کٹھل
بھی/ ساگ چنے کا پانی پھل بھی/ گلگی اور کریلا بھی ہے/ بیٹی کچلا کیلا بھی ہے/ پھر
گڑیوں کا میلہ بھی ہے/ یہ سبزی کا ٹھیلہ بھی ہے۔

مظفر حنفی صاحب نے بچوں کے لیے جو نظمیں لکھی ہیں ان میں الفاظ عام فہم اور ان کے ارد گرد کے ماحول کے ہیں۔ بچوں کو جو چیزیں اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں اور انھیں جانی پہچانی لگتی ہیں ان لفظوں کا ایک نمونہ ذیل میں درج کر رہا ہوں جس کی مدد سے بچوں کی نظمیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں جانوروں، چڑیوں اور گھریلو استعمال کی اشیا شامل ہیں:

کھڑکی، آنگن، کیچڑ، چھتری، ہانڈی، جھاڑو، صوفہ، جھنڈا، ساڑی، صابن، بالٹی، چاند، ستارے، پانی، گملا، پیالی، تکیہ، تھرمس، کرکٹ، کرسی، البم، بندر، چوہا، کویل، طوطا، گوریّا، بلبل، کوا، گرگٹ، مکڑی، چیونٹی، بلی، تتلی، سانپ، ہاتھی، بھالو، چیتا، ہرن، ہاتھی، گھڑیال، کچھوا، مورنی، شیرنی، گائے، ٹڈی، جھینگر، نیولا، خرگوش، گدھا، اونٹ، بیل، کتا اور گھوڑا جیسے تمام ناموں اور چرند و پرند سے عموماً بچے آشنا ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شے ان کے مشاہدے میں نہیں آئی تو اس کی جانکاری کے ساتھ ان کی معلومات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

مظفر حنفی صاحب کی بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں کا دورانیہ پچاس برس کا ہے۔ اس دوران حالات اور ضروریات میں تبدیلیاں بھی رونما ہوتی رہیں لیکن بچوں کا بچپن ایسا سدا بہار منظر نامہ ہوتا ہے جس پر ہمیشہ تازگی چمکتی رہتی ہے اور ہر روز بچپن آگے بڑھتا رہتا ہے مگر پیچھے سے نئے بچپن کی آمد کا سلسلہ تو ابتدائے آفرینش سے آج تک جاری ہے۔ ان شاء اللہ ہمیشہ بڑھتا رہے گا۔

بچوں سے متعلق نظموں کی خوبی یہی ہوتی ہے کہ وقت انھیں دھندلا نہیں کر پاتا۔ ہر نئے بچپن کو ان نظموں میں اپنا بچپن جلوہ فگن نظر آئے گا۔ 'کھیل کھیل میں' ایسی ہی نظموں کا گلدستہ ہے جس کے رنگ برنگے پھول ہمیشہ تازہ و سرسبز رہیں گے اور ہر نئی نسل، نیا بچپن ان گلدستوں میں اپنی دلچسپی کی چیزیں مہیا پائے گا۔ 'کھیل کھیل میں' کا سلسلہ بدستور چلتا رہے گا۔

○○○

ڈاکٹر جاوید اختر
دربھنگہ

مظفر حنفی کی نظموں میں بچوں کی نفسیات کی عکاسی

مظفر حنفی کا نام اردو دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ آپ بہ یک وقت شاعر، افسانہ نگار، نقاد اور بچوں کے ادیب تھے۔ بچوں کے تعلق سے ان کی ساری تخلیقات نظم ونثر بچوں کے دلوں کو چھوتی ہیں۔ بچوں کی آپسی نوک جھونک، محبت ونفرت، شرارتیں، کھیل کود، تماشے اور ایک دوسرے سے تکرار وغیرہ مظفر حنفی کے موضوعات رہے ہیں۔ کم وبیش پچاس برسوں سے وہ بچوں کے لیے شعر وادب تخلیق کرتے رہے۔ ان کی تخلیقات میں فطری شوخیاں، شرارتیں، نفسیاتی پیچیدگیاں، اور بچوں کے ذاتی مسائل بے حد خوب صورت انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ بچوں کے لیے لکھی جانے والی تحریروں میں انھوں نے کبھی بڑا بننے کی کوشش نہیں کی۔ بچوں کی تحریروں میں بچوں کی ہلکی پھلکی اور سیدھی سادی زبان استعمال کرتے ہیں۔

فٹ بال، گھی شکر، ناچ میرے بندر، چنوں ماموں، مداری کا بندر، مزدور کا نغمہ، برابری کا گیت، چار پھول، گیند کھوگئی نالی میں، شرارتیں اور بھولا رام گئے بازار میں وغیرہ مظفر حنفی کی مختلف موضوعات پر لکھی گئی دلچسپ نظمیں ہیں جو ہندو پاک کے بچوں کے مختلف رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔

مظفر حنفی نے اپنی زیادہ تر نظموں میں بچوں کی نفسیات کا خاص خیال رکھا ہے۔ بچوں کی ضرورتوں اور ان کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو مدنظر رکھ کر انھوں نے بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ بچے ایک ساتھ کھیلتے ہیں، آپس میں جھگڑتے ہیں لیکن پھر ایک ساتھ کھیلنے لگتے ہیں۔ ان کے دل میں نہ کسی طرح کی کدورت ہوتی ہے اور نہ کوئی انتقامی جذبہ۔ گڈے گڑیا کے کھیل میں بچوں کے درمیان اکثر تنازع پیدا ہو جاتا ہے اور ایک دوسرے سے تکرار ہوتی ہے۔ مظفر حنفی کی بچوں کے لیے لکھی گئی نظم 'ہائے اللہ' میں بچے کی شرارت اور بچی کے واویلا کو بڑے خوب صورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ٹانگیں ٹوٹی گھوڑے کی / درگت گڑیا کے جوڑے کی / کھول کے میری الماری کو / کس نے اس پر بولا ہلہ / کوئی دوڑو ہائے اللہ

بچوں کو کھیل بے حد پسند ہے۔ بچے کیا بڑے بھی کھیل کو پسند کرتے ہیں۔ کھیل بچے اور بڑے سب کی ذہنی اور جسمانی ورزش ہے۔ بچوں کی نشوونما میں کھیل کود بڑے معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی بچوں کو کھلاڑی بننے کے لیے ان کے گارجین بالکل آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے، دیکھیے اس بندوں میں۔

اور نہ مانو بڑوں کا کہنا / کیچڑ میں ہی لیٹے رہنا / ہم نے منع کیا تھا منے / مت کھیلو فٹ بال / کیسا چھل گیا سارا گال

اس میں ہے اپنی ہی بھلائی / کہنا بڑوں کا مانو بھائی / مرہم لگوالو اور جا کر / لیٹو اوڑھ کے شال / کیسا چھل گیا گال

اس نظم 'فٹ بال' میں شاعر نے بچوں کی فطرت کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اکثر بچے کھیلتے کھیلتے تھک جاتے ہیں۔ جب ماں باپ انھیں روکتے ہیں تو ان کی بات نہیں مانتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تھک کر گر جاتے ہیں اور زخمی ہو جاتے ہیں۔

مظفر حنفی نے 'تاک دھنا دِھن' میں مداری کے تماشے کو اس طرح نظم کے پیرائے میں ڈھالا ہے کہ بندر کا تماشا نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ بچے مداری کے تماشے کو دیکھ کر پسند ہی نہیں کرتے بلکہ اس کے ساتھ دور تک نکل جاتے ہیں۔ شاعر کی یہ نظم جدید شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔

پہن کر نیکر / لاٹھی لے کر / کاندھے پر رکھ کر / دلی جا / دلی جا کر / اپنے واسطے / ایک چاند سی بیوی لانا / تاک دِھنا دِھن دِھنک دھنا / چل میرے بندر ناچ دکھا

اس نظم میں مداری کے تماشے یعنی بندر سے مختلف طرح کے کام کی تکمیل کروا کر شاعر نے بچوں کے سامنے بندر کا تماشہ پیش کر دیا ہے۔ بچوں کی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر مظفر حنفی نے ان کے اندر آپسی بھائی چارہ، مساوات، مذہبی رواداری، قومی یکجہتی اور حب الوطنی کے جذبے کو فروغ دینے والی نظمیں بھی لکھیں ہیں۔ بچوں کے دلوں سے نفرت کا جذبہ دور کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ 'سب انسان برابر ہیں' ان کی ایک ایسی نظم ہے جس میں انھوں نے بچوں کو بتانے کی کوشش کی ہے کہ ملک کے سبھی فرقوں، ذاتوں، زبانوں اور علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی حیثیت برابر ہے۔

کشمیری ہو یا سندھی / اردو بولے یا ہندی / دھوتی پہنے یا شلوار / پھول سجائے یا بندی / سب کا مان برابر ہے / ہر انسان برابر ہے

انور ہو یا اربند و ہو / مریم ہو یا اندو ہو / مسلم ہو یا عیسائی / وہ سکھ ہو یا ہندو ہو / سب کا مان برابر ہے / ہر انسان برابر ہے۔ (انسان برابر ہے)

'سرزمین ہند' ایک ایسی نظم ہے جس میں مظفر حنفی نے حب الوطنی کا درس دیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ وطن کی

محبت سب سے افضل واعلیٰ ہے۔ دیش کی خاطر لوگ اپنی جان قربان کر دیتے ہیں۔ بچوں کو اس نظم کے ذریعہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ حب الوطنی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے:

حقیقتاً بہشت سے کئی گنا حسین ہے
جواب اس کا روس ہے نہ مصر ہے نہ چین ہے
یہی ہمارا دھرم ہے یہی ہمارا دین ہے
کہ دو جہاں میں سرزمین ہند بہترین ہے

’ذمہ دار بنوں گا‘ ان کی ایک ایسی نظم ہے جس میں انھوں نے ملک کے نونہالوں کو ہندوستان میں پھیلی رشوت خوری، بے راہ روی، جھگڑے، لڑائی، فسادات اور بے روزگاری جیسے مسائل سے آگاہ کرا کر ان کے دل میں ذمہ داری کا جذبہ پیدا کرانے کی کوشش کی ہے:

آمدنی کم کنبہ بھاری / بچے بھوکے ماں دکھیاری / لاحق روز نئی بیماری / سب کا باعث ہے
بے کاری / میری بھی ہے ذمہ داری

ہر شعبہ میں رشوت خوری / بازاروں میں سینہ زوری / دن میں جھگڑے رات میں چوری /
سب کا باعث ہے بے کاری / میری بھی ہے ذمہ داری

اس نظم میں مظفر حنفی نے ان ساری خرافات کی جڑ بے کاری کو قرار دیا ہے اور بچوں سے مخاطب ہو کر کہا ہے کہ وہ پڑھ لکھ کر اچھے شہری بنیں اور کامیابی حاصل کریں۔ مظفر حنفی نے اپنی نظموں کے ذریعہ بچوں کے ادب میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ وہ صرف بچوں کے ادیب اور شاعر ہی نہیں بلکہ وہ بچوں کے ڈراما نگار، محقق اور نقاد کی حیثیت سے بھی اردو ادب میں بلند و بالا مقام حاصل کر چکے ہیں۔ وہ ہمیشہ ادب اطفال کے مسائل اور ان کی ضروریات پر غور کرتے رہے ہیں۔ بچوں کے ادیب و شاعر کی حیثیت سے وہ اردو ادب میں ہمیشہ یاد کیے جاتے رہیں گے۔

○○○

ڈاکٹر فیضان جعفر علی
پورہ معروف، کرتھی جعفر پور، مئو، رابطہ نمبر: 8874669937

اردو ادب اطفال پر مظفر حنفی کا فیضان

کسی فن کار کی اچھی بات اور اس کی ادبی و علمی خدمات کا فیضان نہ صرف ان کی زندگی ہی میں جاری رہتا ہے بلکہ اس کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی جاری و ساری رہتا ہے اور اہل علم حضرات، مختلف پہلوؤں سے فن کار کے فن پارے کا تجزیہ کرتے رہتے ہیں۔ بقول مظفر حنفی ؎

اے مظفر شعر ہیں افکار کی قوس قزح   ایک اچھے شعر کی ہوتی ہیں تفسیریں بہت

جس طرح ایک اچھے شعر کی تفسیریں بہت ہوتی ہیں اسی طرح فنی اور علمی فن پارے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا بھی جاتا ہے اور اس کی مختلف پہلوؤں سے تفسیر و تشریح بھی کی جاتی ہے۔ یقیناً ادب اطفال سے متعلق مظفر حنفی کے ادبی کارناموں پر لکھا جاتا رہا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ زیر نظر مضمون بھی اسی سلسلے کی ایک مختصر کوشش ہے۔

اردو ادب اطفال، زبان و ادب کا ایک ایسا گوشہ ہے جس کی اہمیت و ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے مظفر حنفی نے اس ادبی گوشے پر بھی قلم فرسائی کی اور جو سرمایہ چھوڑا ہے وہ ان کی شاعری، افسانہ نگاری، سفرنامہ نگاری وغیرہ جیسے کاموں کی طرح مستحکم رہا ہے اور اتنا مستحکم کہ مظفر حنفی اردو ادب اطفال میں اپنی ایک شناخت قائم کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ مظفر حنفی کی ادبی زندگی کا آغاز بچوں کے شاعر اور ادیب کی حیثیت سے ہوا تھا اس لیے ان کو اردو ادب اطفال کا ایک اہم ستون قرار دیا جا سکتا ہے کیوں کہ انھوں نے بچوں کے لیے صرف شاعری ہی نہیں کی اور نہ ہی صرف کہانیاں اور ڈرامے ہی لکھے بلکہ ان کی متعدد تحریریں اس بات کی بھی شاہد ہیں کہ وہ اردو ادب اطفال کے محقق اور نقاد بھی ہیں اور ان کے متعدد تنقیدی اور تحقیقی مضامین بچوں کے ادب میں حوالہ جاتی اہمیت رکھتے ہیں یا یوں کہا جائے کہ انھوں نے ادب اطفال کے معیار کو اپنی تمام تر تخلیقات میں برقرار رکھا ہے۔

اردو میں ادب اطفال کی جھلکیاں ہمیں امیر خسرو کی ’خالق باری‘، مرزا غالب کے ’قادر نامہ‘ اور

نظیرا کبرآبادی کی شاعری میں نظر آتی ہیں، مگر اس صنف ادب کا آغاز ۱۸۵۷ء کے غدر کی ناکامی کے بعد سرسید احمد خاں کی اصلاحی تحریک کے زیر سایہ ہوا۔مولانا الطاف حسین حالی،شبلی نعمانی،محمد حسین آزاد اور دیگر رفقائے سرسید نے بچوں کے اخلاق وعادات اور ان کی ذہنی نشوونما سے متعلق اخلاقی کہانیاں، قصے اور نظمیں تخلیق کرکے ادب اطفال کی داغ بیل ڈالی۔اس ادب کو پروان چڑھانے میں اور اسے ایک صنف ادب کا درجہ دینے میں سب سے اہم کام مولانا محمد اسماعیل میرٹھی نے انجام دیا اور مظفرحنفی کے بقول ''اسماعیل میرٹھی نے اپنی کوششوں سے انیسویں صدی کے ادب اطفال کو مجموعی اردو ادب کا ایک اہم جز بنادیا۔''(۱) ڈاکٹر خوشحال زیدی نے اپنی کتاب 'اردو میں بچوں کا ادب' میں اردو ادب اطفال کے آغاز اور ارتقا کے تاریخی پس منظر کو واضح کرنے کے لیے اس کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے پہلا دور ابتدا سے لے ۱۸۵۷ء تک،جس میں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کے علاوہ بچوں کے ادب سے تعلق رکھنے والے پانچ ادیب وشاعر کی تخلیقات کا تجزیہ شامل ہے اور دوسرا دور ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کو قرار دیتے ہوئے اشاعتی اداروں کے علاوہ بچوں کے ادب سے متعلق تقریباً ۵۵ ادیب وشاعر کی تخلیقات کا تجزیہ کیا ہے اور تیسرا دور جو ۱۹۴۷ء سے لے کر موجودہ دور تک کا ہے،جس میں تقریباً ادب اطفال سے متعلق ۸۷ ادیب وشاعر کی تخلیقات کا جائزہ لیا ہے۔اس کے علاوہ ہر دور میں بچوں کے ادب سے متعلق رسالے اور مجلّے بھی شائع ہوتے رہے ہیں البتہ بقول مظفر حنفی ''دوسری ہندوستانی زبانوں کے مقابلے میں اردو میں بچوں کے رسالوں کی تعداد ہمیشہ محدود رہی اور ان کی طباعت اور پیش کش کا معیار بھی غیر اطمینان بخش رہا۔''(۲)

مذکورہ بالا ادوار کے مطالعے سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ اردو ادب اطفال کا سرمایہ بھی کم نہیں ہے لیکن پھر بھی یہ شکایت رہی ہے کہ اردو میں ادب اطفال پر کم توجہ دی گئی ہے یہ شکایت غالباً اس لیے کی جاتی رہی ہے کہ معیاری ادب کو وجود میں لانے پر کم توجہ کی گئی ہے اور مظفر حنفی کے بقول ''نقاد تو ادب اطفال کو آج بھی اہمیت نہیں دیتے۔''(۳) اگر کمیت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ادب اطفال کی کمی نہیں ہے لیکن کیفیت کے لحاظ سے یقیناً کمی رہی ہے جس کی وجہ سے ادب اطفال کے معیار پر سوالات اٹھتے رہے ہیں۔مظفر حنفی نے ادب اطفال کے نثری حصہ کو کسی حد تک ادبیت کا حامل قرار دیا ہے مگر شاعری کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ ''شاعری کی حالت خستہ ہے اور ۹۵ فیصد لکھنے والے اسکولوں کے اساتذہ ہیں جو پند وموعظت سے مملو ایسی سپاٹ قسم کی تک بندیاں پیش کرتے ہیں جنھیں پڑھ کر ابکائی آتی ہے۔''(۴)

مظفر حنفی نے ادب اطفال میں معیار کو وجود میں لانے پر بہت توجہ دی ہے۔انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۷ میں بچوں کے ادیب کی حیثیت سے کیا۔اس وقت ان کی عمر صرف گیارہ سال تھی۔(۵) انھوں نے بچوں کے لیے نظمیں،کہانیاں اور ڈرامے لکھے جو اس دور میں شائع ہونے والے بچوں کے رسائل

میں شائع ہوتے رہے ہیں۔بچوں کی نفسیات، ان کی بے لوث محبت، باہمی نوک جھونک، شرارتیں، آپسی ناراضگی، قطع تعلق اور پھر کچھ ہی دیر بعد ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے خوشی سے کھیلوں میں محو ہونا، ہم عمروں کے ساتھ ان کا رویہ، چھوٹوں کے ساتھ ان کا سلوک اور ایک دوسرے سے حسد وغیرہ جیسے موضوعات ان کی نظموں، کہانیوں اور ڈراموں کا حصہ رہے ہیں۔

بچوں کے لیے لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے، بچوں کے ادیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ علم نفسیات سے باخبر ہو یا اگر علم نفسیات کا باضابطہ مطالعہ نہ بھی کیا ہو تو ضروری ہے کہ وہ بچوں کی دلچسپیوں، ضرورتوں، ان کی پسند وناپسند اور قوت فہم وادراک سے بخوبی واقفیت رکھتا ہو۔تب جاکر بچوں کے لیے بہتر مواد تخلیق کیا جاسکتا ہے۔ڈاکٹر قمر رئیس بچوں کے ادیب کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ ''دراصل بچوں کے ادیب دو طرح کے ہوتے ہیں اک وہ جو جرم، جاسوس یا تخیلی قصہ کہانیوں میں بچوں کا دل بہلاتے ہیں یا ان کے ذوق تجسس کی تسکین کرتے ہیں، دوسرے وہ جو قومی، تعلیمی اور تہذیبی ضرورتوں کے تحت اپنے بچوں کو اپنی حیات افروز تحریروں کی شکل میں ایسی غذا بہم پہنچاتے ہیں جو ان کے ذہن، شعور، حیات اور جذبات کی تربیت کرتی ہے اور ان کی بہترین صلاحیتوں کو اجاگر کرکے ان کے کردار کی تشکیل کرتی ہیں۔''(۶) مظفر حنفی کا شمار ان دوسری خاصیت کے حامل ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی تخلیقات میں پوری آب وتاب کے ساتھ کوشش کی ہے کہ قومی، تعلیمی اور تہذیبی ضرورتوں کے تحت بچوں کے ذہن وشعور کو بیدار کیا جائے، ان کی کردار سازی کی جائے اور ان کی رہنمائی کی جائے۔اس حوالے سے ان کی نظمیں دنیا اینڈی بینڈی، ہر انسان برابر ہے، سردی، برسات کی بہار، دور کی کوڑیاں، میں ذمہ دار بنوں گا، چھوٹا کنبہ اچھا ہے، مزدوروں کی عظمت، قوالی، سچائی کی جیت وغیرہ قابل توجہ ہیں۔نظم 'میں ذمہ دار بنوں گا' کا دو بند ملاحظہ کریں:

ہر شعبہ میں رشورت خوری
بازاروں میں سینہ زوری
دن میں جھگڑے رات میں چوری
سب کا باعث ہے بے کاری، میری بھی ہے ذمہ داری

لاچاری کا باعث کیا ہے
بیماری کا باعث کیا ہے
ناداری کا باعث کیا ہے
سب کا باعث ہے بے کاری، میری بھی ہے ذمہ داری(۷)

ادب اطفال سے متعلق مظفر حنفی کی تخلیقات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انھیں بچوں کے

مزاج اور نفسیات اور زبان و بیان سے اچھی واقفیت تھی۔ بچوں کے لیے مظفر حنفی کی شائع شدہ نظموں کی تعداد ان کی صرف ایک کتاب 'بول میری مینا' کے مطابق تقریباً ۱۱۹ تک جاتی ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں ہر عمر کی سطح کے بچوں یعنی چار سے سات برس، آٹھ سے دس برس، گیارہ سے چودہ برس، پندرہ سے اٹھارہ برس کے نونہالوں اور بچوں کے اعتبار سے نظمیں کہیں ہیں اور ہر عمر اور ہر سطح کے بچوں کی نفسیات، زبان، فہم و سمجھ، شرارت، پسند و ناپسند کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے عمدگی کے ساتھ نظمیں کہی ہیں۔ نظم 'شیطان کی خالہ' میں بچوں کی شرارت ملاحظہ کریں:

دودھ نمک میں گھولا اس نے / میرا پرس ٹٹولا اس نے / کمپیوٹر تک کھولا اس نے
ٹیلیفون کا تارا کھاڑا / قلم دان آٹے میں گاڑا / پاسپورٹ ابو کا پھاڑا
صوفے پر سیاہی لڑھکا دی / ٹی وی پر تصویر بنا دی / بریانی میں کھیر ملا دی
صابن دانی پان پہ رکھی / جوتی دسترخوان پہ رکھی / ایش ٹرے جزدان پہ رکھی
آندھی ہے مہمان نہیں ہے / بچی ہے طوفان نہیں ہے / نوری ہے شیطان نہیں ہے (۸)

'بول میری مینا' کتاب میں موجود نظموں کے علاوہ بھی انھوں نے بہت ساری نظمیں کہی ہیں۔ چند نظمیں جنھیں خصوصی مقبولیت حاصل ہوئی ہے ان میں فٹ بال، پتنگ کا مرثیہ، گھی شکر، ناچ میرے بندر، چنو ماموں، ادریس سے میں نے کہا، وغیرہ شامل ہیں۔ وہ اپنی نظموں میں بچوں کی سطح پر آ کر ان سے ہم کلام ہوتے ہیں اور بچوں کو ان کی زندگی کی صحیح سمت دکھانے اور اس پر رہنمائی کرنے کا سلیقہ بھی ان کو آتا ہے۔ اس ضمن میں ان کی نظمیں شرارتیں، نٹ کھٹ، جی حامد نے، تین شوخ بندر، بھولا، رام گئے بازار، مداری کا بندر، اور وہ رونے لگا، ہماری فریاد، برسات، گیند کھو گئی نالی میں، میں سوچتا ہوں، چار پھول، ادریس کی ماں نے کہا، پتنگ کا مرثیہ، گھی شکر، ناچ میرے بندر، چنوں ماموں، امتحان ہال، مزدور کا نغمہ، فٹ بال وغیرہ مظفر حنفی کی بے حد دلچسپ اور دل کش انداز میں لکھی گئی نظمیں ہیں۔ اسی طرح ان کا فنطاسیہ 'بندروں کا مشاعرہ' ایک لطیف تمثیل ہے جس میں بچوں کی شرارتیں نظر آتی ہیں۔ بندر ایک مزاحیہ مشاعرہ منعقد کرتے ہیں جس میں بندر بچوں کی طرح شوخیاں کرتے، اچھلتے کودتے نظر آتے ہیں۔ اس میں نظم و نثر کا خوب صورت امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔

مظفر حنفی نے اپنی نظموں میں بچوں کی صحیح تربیت اور اصلاح کو ضرور ملحوظ خاطر رکھا ہے اور ہر سطح کے بچوں کو ان کے ہی مزاج اور ان کی زبان میں سمجھانے کی بہترین کوشش کی ہے۔ ان کی نظموں کے حوالے سے ڈاکٹر محبوب راہی لکھتے ہیں کہ ''مظفر حنفی بچوں کے مزاج اور زبان کے تقاضوں سے آشنا ہیں، وہ بچوں کی سطح پر آ کر ان کے ذہن و دماغ کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور روشن مستقبل کے لیے صحیح منزلوں کی جانب ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ بچوں کو پیش آنے والے چھوٹے موٹے اور روزمرہ کے واقعات کو مظفر حنفی نے بے حد دلچسپ انداز میں نظم کیا ہے۔'' (۹)

جس طرح انھوں نے اپنی نظموں میں ہر عمر کے بچوں کی ذہنی سطح، ان کی نفسیات، عادات و اطوار اور ان کے مزاج کو مدنظر رکھتے ہوئے بچوں کی تربیت اور رہنمائی کا خاص خیال رکھا ہے اسی طرح اپنی کہانیوں اور ڈراموں میں بھی اس بات کا خیال رکھا ہے۔ کہانیوں میں ان کی نمائندہ تخلیقات میں حلوہ چور، نرالا گھوڑا، نیلا ہیرا، خزانے کا بھوت، چنچل پری، بدلا، پر اسرار قیدی، اچھی سی کہانی، جھنجھنا، سائیکل ریس اور جنگ نہ ہونے پائے، خلیل کا غصہ وغیرہ ہے۔ کہانی 'خلیل کا غصہ' کے بارے میں ڈاکٹر محبوب راہی لکھتے ہیں کہ ''چھوٹے چھوٹے اور برجستہ جملوں پر مشتمل یہ دلچسپ لطیفہ نما کہانی مکمل ہے اور بلندی فن کی جانب مظفر حنفی کے پرواز تخیل کی نشاندہی کرتی ہے۔'' (۱۰) کہانی 'جھنجھنا' بچوں کی نفسیات کی عمدہ مثال ہے جس میں مدن اور کسم جو بھائی بہن ہیں میلے میں جاتے ہیں اور مدن اپنے لیے لکڑی کا گھوڑا اور کسم جھنجھنا خرید کر لاتی ہے۔ اس پوری کہانی میں ان بھائی بہن کی باہمی نوک جھونک، شرارتوں اور چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کو بچوں کے مزاج اور زبان کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر ہی بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح 'جنگ نہ ہونے پائے' میں بچوں کے درمیان ہونے والی چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بیان کی گئی ہیں۔ مظفر حنفی کو بچوں کی شرارتوں کو کہانی کی شکل دینے میں کتنی مہارت حاصل ہے اس مثال سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

''باہر برآمدے میں خالد کی چیخ بلند ہوئی، امی......! اس بار امی غسل خانے میں تھیں ان کے آتے آتے اسلم نے خالد کا سر کئی بار دیوار سے ٹکرایا 'اف میں مر گیا' خالد نے دہائی دی، امی جھپٹ کر تولیے سے سر پونچھتی ہوئی غسل خانے سے باہر نکلیں اور برآمدے میں آئیں 'بیٹا' اسلم اب تک تمھیں سمجھ نہیں آتی اتنے بڑے ہو گئے ہو، 'چھوڑ و اسے۔'' اسلم پر اس وقت شیطان سوار تھا، اس نے خالد کو پھر دیوار سے دھکا دیا ''دو گھنٹے تک میں بالنگ کرتا رہا تو یہ چوے چھکے اڑاتا رہا اب میری باری آئی تو جان چراتا ہے۔'' ''کل تم بھی مری گولیاں لے کر بھاگ گئے تھے۔'' خالد نے کہا۔ تم اس طرح چھوٹ نہیں سکتے بالنگ کرو چل کر۔ خالد دھم سے زمین پر بیٹھ گیا۔''

انھوں نے بچوں کے لیے دو یک بابی ڈرامے 'مچھلی کا شکار' اور 'تاج کی درگت' بھی لکھے ہیں۔ ڈراما 'مچھلی کا شکار' میں اختصار کے ساتھ بچوں کو نمائش پسندی سے بچنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ ڈراما 'تاج کی درگت' میں بالواسطہ طور پر بچوں کو توہم پرستی سے دور رہنے کا درس دیا گیا ہے اور یہ ایک روایتی ڈراما ہے جس کا آغاز بچوں کے کھیل سے ہوتا ہے جس میں پہیہ چلاتے ہوئے وہ شاہی قلعے کے پھاٹک تک پہنچ جاتے ہیں۔ ڈرامے کو تین منظروں پر پھیلایا گیا ہے۔ پہلے منظر میں شام کا وقت ہے، شاہی محل کے پھاٹک پر دو سنتری پہرہ دے رہے ہیں، دوسرے منظر میں دونوں سنتری شاہی پھاٹک پر پہرہ دیتے ہوئے باتوں میں مشغول ہیں اور بادشاہ سلامت کی سواری آتی ہے۔ تیسرا منظر سورج نکلنے سے پہلے کا ہوتا ہے جس میں لڑکا ہاتھ میں پہیہ لڑھکانے والا

دستہ لیے پھاٹک کے سامنے آتا ہے اور ڈرامے میں بادشاہ کی آمد کا اعلان روایتی انداز میں ہی ہونے لگتا ہے جس سے بچے بے حد متاثر ہوتے ہیں۔

اردو ادب اطفال کو بہتر بنانے اور اس کو وسعت بخشنے کو لے کر مظفر حنفی کی فکر مندی اور کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ان کو اردو ادب اطفال کی نمائندگی حاصل تھی جس کو انھوں نے بخوبی انجام دیا ہے۔ پبلی کیشن ڈویژن دہلی نے جب 'چلڈرن لٹریچر ان انڈین لنگویج' نام سے پورے ہندوستان میں سروے کیا تھا تو اس میں اردو ادب اطفال کی نمائندگی ڈاکٹر مظفر حنفی کے سپرد کی گئی تھی اور ان کی انھیں خدمات کے پیش نظر 'انڈین نیشنل کونسل فار چائلڈ ایجوکیشن دہلی' نے ماہ نومبر ۱۹۸۵ میں ادب اطفال کے نمائندے کی حیثیت سے انھیں قومی اعزاز کا مستحق قرار دیا۔ اس کے علاوہ این سی ای آر ٹی (NCERT) اور نیشنل بک ٹرسٹ جیسے اداروں کی جانب سے منعقدہ سمیناروں اور ورکشاپ میں آپ اردو ادب اطفال کی نمائندگی کرتے رہے ہیں۔

یقیناً مظفر حنفی کا کام ناقابل فراموش ہے، انھوں نے اپنے علم و فن اور ادب سے بے پناہ لگاؤ اور ادبی مہارت کے ذریعہ اپنے سخن کو اتنا مستحکم بنا دیا ہے کہ جس کا فیضان ہمیشہ جاری رہے گا اور زمانے کی گردش کے ساتھ ساتھ محققین ان کے ادبی کارناموں کی تفسیر و تشریح کرتے رہیں گے۔ یہ بات سچ ہے کہ ''فیضان سخن رائگاں نہیں جاتا'' اور یہی فیضان سخن ہر ادیب کو زندہ و تابندہ رکھتا ہے، چاہے وہ دنیا میں موجود رہے یا نہ رہے۔

OOO

حوالہ جات:

۱۔ جہات و جستجو، مظفر حنفی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی ۱۹۸۲ء، ص ۸۹
۲۔ ایضاً، ص ۹۰
۳۔ گلزار جاوید، براہ راست، مجلہ چہار سو، ص ۱۵، جلد ۱۸، شمارہ نومبر و دسمبر ۲۰۰۹
۴۔ اردو میں بچوں کا ادب، مذہبی تکنیکی کتابیں اور تراجم، ماہنامہ قومی زبان کراچی ۱۹۸۵ء، ص ۶۷
۵۔ جہات و جستجو، مظفر حنفی، ص ۹۶
۶۔ بچوں کا ادب از ڈاکٹر قمر رئیس، ماہنامہ آج کل، دہلی، بابت جون ۱۹۸۰ء، ص ۴۵
۷۔ بول میری مینا، مظفر حنفی، رحمانی پبلی کیشنز، ناسک، ۲۰۱۸ء، ص ۹۰
۸۔ ایضاً، ص ۷۷
۹۔ ڈاکٹر مظفر حنفی: حیات، شخصیت اور کارنامے، محبوب راہی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص ۳۱۴
۱۰۔ ایضاً، ص ۱۴۱

OOO

ڈاکٹر رضیہ حامد
بھوپال

مظفر حنفی اور بچوں کا ادب

قصّے کہانیاں کہنا اور سننا ابتدائے آفرینش سے انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اپنے دل میں آئے خیالات، اپنے ساتھ پیش آئے واقعات و حالات کو دوسروں سے بیان کر کے دل و دماغ کو فرحت پہنچانا ایک نفسیاتی عمل ہے۔ مختلف قوموں کی ادبی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے جب سے اجتماعی زندگی گزارنی شروع کی اس وقت سے کہانیاں ان کی زندگی کا حصہ بن گئیں۔

کام کاج میں پورے دن مصروف رہنے کے بعد فارغ اوقات میں لوگ مجلسیں منعقد کرتے تھے جن میں وہ اپنے اسلاف کے کارنامے بیان کرتے، ان کی بہادری اور شجاعت کے قصّے سناتے تھے۔ ان میں عموماً جنگ، بہادروں کی دلیری اور شجاعت کے کارنامے بیان کیے جاتے تھے۔ سیدھی صاف زبان میں بات کرنے کے ساتھ ہی لوگوں کی دلچسپی منظوم قصے کہانیوں کی طرف مبذول ہوئی، ابتدا میں نثر و نظم میں زیادہ تر جادو اور طلسم کے قصے لکھے جاتے تھے، جو صرف خیالی ہوتے تھے۔ یہ روایتی قصے اپنے زمانہ کی فکر سے مطابقت رکھتے ہیں۔

عربی، فارسی اور اردو زبان میں حکایات کا چلن صرف خیالی قصوں اور کہانیوں تک محدود نہ رہ کر صحیح اور سچّے، سبق آموز و دلچسپ واقعات کو بھی لکھنے کا رواج اور چلن رائج ہوا۔ ان میں حکایات الاغانی، الف لیلہ و لیلہ، مقامات حریری، کلیلہ و دمنہ، حکایات گلستاں و بوستاں، طلسم ہوش ربا، یوسف وزلیخا، قصہ چہار درویش المعروف بہ باغ و بہار وغیرہ وہ مشہور زمانہ کتب ہیں جو قصّے کہانیوں سے بھری ہوئی ہیں۔ یہ قصّے کہانیاں جن کو ادب میں داستان اور مثنویوں کے نام سے پہچانا جاتا ہے، ماضی کا سب سے بڑا تحفہ ہیں۔ یہ سب روایتیں فرد کا رشتہ فرد سے اور زمانہ کا رشتہ زمانے سے قریب کرتی رہی ہیں۔

دھیرے دھیرے فرصت کے اوقات میں کمی آتی گئی تو قصّہ خوانی کی مجلسیں کم ہوتی گئیں اور کتب بینی کا رواج بڑھ گیا۔ اس کے باوجود بزرگ خواتین میں بچوں کو کہانی اور قصّے سنانے کا چلن قائم رہا۔ رات کو بچے اپنی نانی یا دادی کے بستر میں ان کے گرد جمع ہو کر کہانی سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ ان قصّوں میں جہاں سبق آموز

باتیں ہوتی تھیں وہیں زبان کا روزمرہ بھی بچوں کے کانوں میں پڑتا رہتا تھا اور وہ غیر شعوری طور پر اپنی زبان کی گہرائی اور گیرائی سے واقف ہوتے جاتے تھے۔ یہ سب مشترکہ خاندان کا خصوصی وصف تھا کہ قصّے کہانیاں سنتے ہوئے بچے اپنی تہذیب وتمدن میں ڈھلتے جاتے تھے۔ ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بڑھتی جاتی تھی۔

آج کے سائنسی دور میں بچوں کو اسکول کی ڈھیر ساری کتابوں کے پڑھنے کے بعد جو وقت ملتا ہے وہ ریڈیو اور ٹی۔وی کی نذر ہو جاتا ہے۔ ٹی۔وی نے بچوں سے ان کا بچپنا، معصومیت اور چلبلا پن چھین لیا ہے۔ کھیل کے لیے ان کے پاس وقت نہیں۔ ٹی۔وی دیکھتے دیکھتے کھانا کھانا اور سونا ان کی عادت ثانیہ بنتی جا رہی ہے۔ ایسے میں قصّے کہانیوں کے لیے وقت کہاں سے آئے؟

وقت نے اپنی طنابیں کھینچ لیں اور انسان کے پاس ذہنی بالیدگی، تفریح کے مواقع کم ہوتے چلے گئے، جس کا اثر ان قصّے کہانیوں، چھوٹی بڑی نظموں کے سننے اور پڑھنے پر پڑنا ناگزیر تھا۔ ان سب کے باوجود شاعر و ادیب اپنے فرض سے غافل نہیں رہے۔ مشترکہ خاندان کا تصور ختم ہو جانے سے بچوں کے لیے ان کہانیوں اور قصّوں کا بدل ضروری تھا۔ شاعروں اور ادیبوں نے بچوں کے لیے چھوٹی چھوٹی نظمیں کہیں اور دلچسپ کہانیاں لکھیں۔ انھوں نے کوشش کی کہ بچوں میں ان کا بچپنا موجود رہے اور وہ دنیا سے واقف ہوتے جائیں۔ بچوں کی معلومات میں اضافہ اور صحیح راہ کے تعین کے ساتھ دلچسپی قائم رہے، یہی ان کا مقصد رہا ہے۔

اردو میں بچوں کے لیے نظمیں لکھنے کا سلسلہ دورِ قدیم سے جاری ہے۔ ان شاعروں میں اسمٰعیل میرٹھی، قلقؔ میرٹھی، شفیع الدین نیّرؔ، شوکت پردیسیؔ اور حامد اللہ افسرؔ کے نام نمایاں ہیں۔ آج کے دور میں بھی ان کی نظمیں وقت کی مطابقت کے ساتھ بچوں کی دلچسپی کا باعث ہیں۔ مظفرؔ حنفی نے بچوں کے ادب نظم ونثر میں مزید اضافہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنی عمر کے ابتدائی ماہ وسال یعنی چودہ سے انیس سال کے درمیانی عرصہ میں بچوں کے لیے کہانیاں اور ڈرامے لکھے۔ ابتدا میں لکھی کہانیوں میں بھی کسی قسم کا سقم نہیں پایا جاتا۔ ان کہانیوں کے کردار اپنے سماج میں آس پاس گھومتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کہانیوں کی زبان صاف، سادہ اور آسان ہے، جس میں بچوں کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔ مظفرؔ حنفی نے ایک بندر کے انسانی قید سے آزاد ہونے پر بندروں کی طرف سے ایک استقبالیہ تقریب اور مشاعرہ کی روداد 'بندروں کا مشاعرہ' میں بڑے دلچسپ انداز میں بیان کی ہے۔ ان کی کہانیوں کا انداز بیان پرلطف، بچپن کی شوخیوں اور معصوم حرکتوں سے بھرا ہوا ہے۔

مظفرؔ حنفی نے بچوں کی نفسیات کا مطالعہ بڑے غور وفکر سے کیا ہے۔ باریک بینی سے بچوں کی حرکات و سکنات، ان کے مابین ہونے والی گفتگو کا مشاہدہ کرنے کے بعد انھوں نے بچوں کے لیے نظمیں لکھیں اور ان میں بچوں کی پسند اور شوق کو مدنظر رکھا ہے۔ ان کی نظموں کا انداز بہت دلچسپ اور برجستہ ہے۔ انھوں نے بچوں کے انداز میں ہی نظمیں کہیں ہیں۔ ان میں معصومیت، شوخی اور چلبلا پن ہے، جو بچوں کو جلد اپنی

جانب متوجہ کرتا ہے۔

چھ دن بعد آیا اتوار / بند کرو سب کاروبار / دن بھر موج کریں گے یار (موج مستی کا دن)

☆

ٹانگیں ٹوٹی ہیں گھوڑے کی / درگت ہنسوں کے جوڑے کی / آپا توڑ کے میری پنچی / ان پر کس نے بولا ہلّہ / کوئی دوڑو ہائے اللہ (ہائے اللہ)

☆

ٹافی کس دن برساؤ گی؟ بولو نا دادی / چاند ستارے کب لاؤ گی؟ بولو نا دادی / کب تک ہم کو ٹرخاؤ گی؟ بولو نا دادی (دادی سے باتیں)

بچوں کو بڑوں کی نصیحتیں، روک ٹوک بہت بری محسوس ہوتی ہیں۔ مظفرحنفی نے اپنی نظموں میں خاص طور سے نصیحت کرنے سے گریز کیا ہے۔ کھیل کھیل میں اپنی نظموں کے ذریعہ بچوں کو غیر شعوری طور پر سبق آموز باتیں سکھائی اور بتائی ہیں۔ انھوں نے بڑی محبت اور اپنائیت سے بچوں کو بڑوں کا کہنا ماننے کی ترغیب دی ہے اور کہنا نہیں ماننے کے نقصانات بتائے ہیں۔ بچے عموماً کرکٹ اور فٹ بال کھیلنا پسند کرتے ہیں۔ اس زمانہ میں گھروں میں صحن کا تصور ہی نہیں۔ بند گھر میں، کمروں میں کرکٹ یا فٹ بال کھیلنے سے سامان کی ٹوٹ پھوٹ ہو جاتی ہے۔ مظفرؔ حنفی نے اپنی نظموں کے ذریعہ بچوں کی توجہ دوسرے کھیلوں کی طرف کر دی ہے۔

اور نہ مانو بڑوں کا کہنا / کیچڑ میں ہی لیٹے رہنا / ہم نے منع کیا تھا منّے / مت کھیلو فٹ بال / کیسا چھِل گیا سارا گال

اس میں ہے اپنی ہی بھلائی / کہنا بڑوں کا مانو بھائی / مرہم لگوا لو اور جا کر / لیٹو اوڑھ کے شال / کیسا چھِل گیا سارا گال (بے موسم فٹ بال)

مظفرحنفی نے اپنی نظموں کے ذریعہ بچوں میں جذبۂ ہمدردی، انسان دوستی، رواداری، مساوات اور حب الوطنی کے جذبات کو ابھارنے اور فروغ دینے کی کوشش کی ہے۔

انور ہو یا اربند ہو / مریم ہو یا آنند ہو / مسلم ہو یا عیسائی / وہ سکھ ہو یا ہندو ہو / سب کا مان برابر ہے / ہر انسان برابر ہے (انسان برابر ہے)

☆

جین، پارسی، سکھ، عیسائی، ہندو، مسلم سارے / تیرے راج دلارے / بنگالی، پنجابی، اردو، ہندی اور ملیالم / ایک گیت کے سرگم / تری ذات عظیم ہے سب سے تیری بات مہان / میرے ہندوستان، میرے ہندوستان (میرے ہندوستان)

انسانی ہمدردی کی بہترین مثال مظفر حنفی کی نظم 'اپنے چاروں جانب دیکھو' ہے۔ اس پوری نظم میں دلی کرب اور درد کا اظہار ہے۔ اس کو پڑھ کر جہاں انسان کے حالات پر دل دکھی ہوتا ہے وہیں ان لوگوں کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ بھی ابھرتا ہے۔ مظفر حنفی نے نظم کے آخری بند میں بچوں کو ہمدردی کا درس دیا ہے۔

اپّی وہ دن کب آئیں گے / جب گھر میں چاول پکیں گے / سوندھی سوندھی دال بنے گی / ہم جی بھر کے کھائیں گے

میرے سب ساتھی پڑھتے ہیں / میں اسکول نہ جاؤں گا کیا؟ / وہ سب راجا بن جائیں گے / میں ان پڑھ کہلاؤں گا کیا؟

اے میرے دل والو بچو! / اپنے چاروں جانب دیکھو / ایسے کنبے مل جائیں تو / ان کو بھی جینے کا حق دو (اپنے چاروں جانب دیکھو)

مشترکہ خاندان میں بچوں کی سب سے پسندیدہ شخصیت ان کی دادی اماں ہوتی ہیں جو ان کے لاڈ اٹھاتی ہیں اور ان کی فرمائشیں بھی پوری کرتی ہیں۔ بچوں کو کہانیاں سناتی، نظمیں سناتی ہیں اور ساتھ ہی گھر کے کاموں میں بہو کا ہاتھ بھی بٹاتی ہیں۔ ایسی مثالی دادی کی تصویر 'مکھن گیت' نامی نظم میں مظفر حنفی نے کھینچی ہے۔ یہ نظم بلاشبہ بچوں کی پسندیدہ نظم ہونا چاہیے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ آشکار کرتا ہے کہ مظفر حنفی کی خانگی زندگی خوش گوار ہے۔ اس میں خوشیاں، دلی سکون اور اطمینان ہے۔ شخصیت کی پیکر تراشی کے ساتھ فعّال دادی کی محبت بھی اس میں جھلکتی اور چھلکتی محسوس ہوتی ہے۔ اس کا عنوان 'مکھن گیت' بڑا معنی خیز ہے۔

لمبا چہرہ، بھولی صورت / ممتا کی اک زندہ مورت / گوری چٹی سیدھی سادی / گڈو پپو کی اماں / میرے ایمن کی دادی

اب اس پوتے کو چمکارا / پھونک دیا اس کا غبارہ / خوش قسمت بوڑھی شہزادی / چھوٹو دمّو کی اماں / میرے زمّو کی دادی

مظفر حنفی نے کئی نظموں کے ذریعہ بچوں کی معلومات میں اضافہ کیا ہے۔ اس طرح وہ بتاتے ہیں کہ خورجہ کی کھرچن، متھرا کے پیڑے اور میرٹھ کی قینچی مشہور ہے۔ جانوروں کی بولیوں سے بچوں کے کان آشنا ہوں، اس سلسلہ میں انھوں نے 'اپنی اپنی بولیاں' نظم میں کوّا، کبوتر، مینڈک، جھینگر، بکری، گیّا، گھوڑا، مچھر، بندر اور کتّے کی آوازوں کو بتایا ہے۔

کوّا بولے کاؤں، کاؤں / بلّی کرتی میاؤں میاؤں / مرغا بولے ککڑوں کوں / چڑیا کرتی چوں چوں

مظفر حنفی نے اپنی ایک نظم میں بندر کے ناچ کا تذکرہ اس خوبی سے کیا ہے کہ بچے تو بچے بڑے بھی اس کو پڑھ کر مسکرائے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس پر 'تاک دھنا دھن دھنک دھنا' کا اضافہ نظم کے لطف کو

دوبالا کر دیتا ہے۔

پہن کے نیکر / لاٹھی لے کر، کاندھے پر رکھ دلّی جا / دلّی جا کر رہنے واسطے / ایک چاندسی بیوی لا / تاک دھنا دھن دھنک دھنا / چل مرے بندر ناچ دکھا

مظفر حنفی نے اپنی ایک نظم میں بتایا ہے کہ مزدور کیسے کیسے اور کیا کیا کام کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ مزدور کی عظمت بیان کرتے ہیں۔

یہ ناویں تیراتے ہیں اور جہاز اڑاتے ہیں / سکھ دیتے ہیں دکھ سہہ کر / سوکھی روٹی کھاتے ہیں / بے شک دنیا قائم ہے / مزدوروں کی محنت پر (مزدور کی عظمت)

مظفر حنفی ایک انٹرویو میں بچوں کے ادب تخلیق کرنے کے متعلق اپنا نظریہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''میں سمجھتا ہوں کہ بچوں کے لیے انھیں لوگوں کو لکھنا چاہیے جو کسی طور پر اپنے اندر وہ مادّہ پیدا کر سکیں کہ وہ حلول کر جائیں کسی بچے میں...... یا اپنے بچپن میں پلٹ سکیں۔ کسی طور پر۔ اس وقت دس بارہ سال کے جس بچے...... کے لیے وہ لکھ رہے ہیں۔ اس عمر کے بچوں کی طرح وہ سوچ سکتے ہیں یا نہیں اور یہ کہ اس عمر کا بچہ کس طرح کی چیزیں پڑھنا پسند کرتا ہے۔ جب آپ فن کار ہو جاتے ہیں تو پھر آپ کے قابو کی بات ہے کہ آپ ان کے لیے اس طرح کی چیزیں لکھیں جو انھیں اچھی بھی لگیں۔ اس کے اندر کچھ اس طرح کی اخلاقی باتیں ڈال دیں کہ بظاہر نظر نہ آتے ہوئے بھی بچے کی طبیعت ادھر مائل ہو جائے۔'' (دوبدو، صغرا مہدی)

مظفر حنفی نے بچوں کے لیے لکھی اپنی تخلیقات میں بچوں کی فہم و فراست اور ان کی عمروں کا لحاظ رکھتے ہوئے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ وہ الفاظ کے مزاج داں ہیں اور ان کو برتنے کا فن بھی جانتے ہیں۔ ان کا انداز بیان دل کش اور دل نشین ہے۔ وہ بچوں کو جو بات بھی ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں اُس پیرایہ میں بیان کرتے ہیں کہ کانوں سے سن کر یا آنکھوں سے پڑھ کر بچوں کے ذہن و دل میں نقش ہو جاتی ہے۔ مظفر حنفی کی تحریر کی بڑی خوبی یہی ہے۔ بلاشبہ مظفر حنفی بچوں کے منفرد شاعر، ڈراما نگار، کہانی نویس اور مضمون نویس کہے جانے کے مستحق ہیں۔

○○○

تقابلی مطالعہ

وسیم حیدر ہاشمی
بی ۴۳/ ۱۰۱، شوالہ، وارانسی، رابطہ نمبر: 9451067040

دو ہم عصر ادبی تشخص کا تقابلی جائزہ

(پروفیسر مظفر حنفی اور علامہ ناوک حمزہ پوری)

پروفیسر مظفر حنفی کی ولادت یکم اپریل ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم فتح پور اور پھر مزید تعلیم مدھیہ پردیش کے کھنڈوا میں ہوئی۔ موصوف کو محض ۱۹ ر برس کی عمر یعنی ۱۹۵۵ء میں مدھیہ پردیش کے محکمہ تعلیم میں ٹیچر کی ملازمت ملی۔ اسی عمر میں موصوف کو اردو ادب سے اتنا زیادہ لگاؤ ہو گیا کہ انھوں نے ۱۹۵۹ء میں کھنڈوا سے 'نئے چراغ' کے نام سے ایک ادبی ماہنامہ جاری کیا۔ موصوف کا تحقیقی سفر ۱۹۶۰ء سے شروع ہوا۔ وہ ایک منفرد شخصیت کے مالک تھے۔ یہ انفرادیت ان کی شاعری کے توسط سے اردو ادب میں ایک الگ پہچان کی حامل ہے۔ مقدار کے ساتھ معیار برقرار رکھنا بہت مشکل کام ہے مگر موصوف نے دو ہزار سے زائد معیاری غزلیں لکھ کر یہ بھی ثابت کر دیا جو قابل تعریف ہے۔ یہ انفرادیت موصوف کو شاعری کے ساتھ نقد و تحقیق کے میدان میں بھی حاصل ہے۔ 'طلسم حرف' میں انھوں نے ثابت کر دیا کہ وہ اپنا تشخص اپنی عمیق شاعری کے حوالے سے ثابت کرتے ہیں۔ اردو کے علاوہ موصوف کی انگریزی اور بنگالی ادب پر بھی گہری نظر ہے۔

موصوف شاد عارفی سے بہت متاثر تھے چنانچہ برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال سے شاد عارفی کی فکری اور فنی جہات پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کرنے والے وہ اولین ریسرچ اسکالرز میں سے ہیں۔ شاد عارفی کا مزاج کچھ ایسا تھا کہ اپنے تلامذہ میں بیشتر کو وہ خاطر میں نہ لاتے تھے مگر مظفر حنفی کی چند ذاتی خصوصیات ایسی تھیں کہ جن کی بنا پر شاد عارفی، حنفی صاحب کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ شمس الرحمن فاروقی اس ضمن میں فرماتے ہیں کہ:

> ''شاد صاحب میں تنگ نظری، کم علمی، احساس کمتری، چڑچڑاپن، انتہائی سخاوت، ذہنی اور قلبی فراخ دلی اور فیاضی، جرأت مندی، اعلیٰ ذہانت و جودت طبع جیسی خصوصیات ایک ساتھ پائی

جاتی تھیں۔ وہ واقعی ایک زندہ اور حرارت سے بھرپور شخصیت کے مالک تھے...... مظفر حنفی، شادؔ عارفی کے آخری عمر کے شاگردوں میں سے تھے۔ جس طرح بُڑھاپے کی اولاد سب کو عزیز ہوتی ہے اسی طرح مظفر حنفی بھی شاد صاحب کو بہت زیادہ عزیز تھے...... خدا شاد عارفی جیسا استاد اور مظفر حنفی جیسا شاگرد سب کو نصیب کرے۔'' (۱)

غزل گوئی میں پروفیسر مظفر حنفی اپنے خاص لب و لہجے اور انفرادیت کے مالک ہیں۔ ہر چند کہ غزل گوئی کے آغاز میں انھوں نے اپنے استاد شادؔ عارفی کی طرز کو اپنایا مگر یہ طرز آغاز کے کچھ عرصہ بعد ہی اختتام پذیر ہو گیا اور جلد ہی وہ لب و لہجہ از خود ابھر کر سامنے آ گیا جس انفرادیت کے لیے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ ان کا مشہور زمانہ شعری مجموعہ 'آگ مصروف ہے' جو ۵۹ ؍غزلوں اور ۱۰۸ ؍آزاد نظموں پر مشتمل ہے، کی سبھی غزلوں میں کلاسیکیت کی غمازی ہے۔ ان غزلوں میں شاید ہی کوئی شعر ایسا ہو جو ان کے منفرد لب و لہجے سے عاری ہو۔ مظفر حنفی جو کچھ اپنی غزلوں میں دکھلاتے ہیں وہ دیدہ و بصیرت دوسروں کو میسر نہیں۔ 'صریر خامہ' پروفیسر مظفر حنفی کی طنزیہ شاعری کا خوب صورت اور ہر دل عزیز گلدستہ ہے۔ موصوف کے چند اشعار بطور نمونہ پیش خدمت ہیں۔

چند کھیتوں کے مقدر میں نہیں ہے پانی ...... ورنہ بادل تو بہرحال برستے ہوں گے

کیا کریں دھبے انھیں کی آستیں پر مل گئے ...... جن کی پیشانی پہ لکھا تھا کہ ہم قاتل نہیں

کہہ رہی ہے مورتی بھگوان کی ...... کم نہیں ہیں نقش فریادی سے ہم

طنز کے ساتھ ان کی شاعری میں ایسا تیکھا پن بھی ہے جس سے ہر قاری محظوظ ضرور ہوتا ہے۔ مثال کے لیے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مصلحت ہے کہ عداوت ہے کہ ہے سچائی
سو نقابوں میں ہے چہرہ کوئی پہچانے کیا
گھوم پھر کر وہی اک بات کہ برحق ہو تم
سب سمجھتا ہوں، مجھے آئے ہو سمجھانے کیا
دل جہاں آپ ہی جھکتا ہو مظفرؔ جھک جاؤ
آنکھ والوں کو حرم کیا ہے، صنم خانے کیا
......
بجھانی ہوگی ہمیں خود ہی اپنے گھر کی آگ ...... کہیں سے آئے گی امداد، جان پڑتا نہیں

رونق دید تھا منظر مری غرقابی کا
کوئی تنکا نہ بنا، محو تماشہ تھے سب

کیا گزرا ہوا زمانہ کیا دور حاضر، مقطع ہر دور میں ہر شاعر کو عزیز رہا ہے۔ مقطع کے توسط سے ہر شاعر اپنے بارے میں بہت کچھ کہہ جاتا ہے، وہ تمام باتیں بھی جو بیچ کے اشعار میں نہیں کہہ پاتا۔ اکثر و بیشتر کلام میں تخلص ہی اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ یہ کلام کس شاعر کا ہے۔ مگر یہ صرف اس بات کا اعلان ہی نہیں ہوتا کہ یہ اشعار کس کے ہیں بلکہ اکثر کلام کے مقطعے میں تخلص ہی مرکزی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اکثر ان سے شعرا کی اصل

شخصیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر مظفرؔ صاحب کے چند مقطعے ملاحظہ ہوں۔

مظفرؔ آپ کی ترِچھی اُڑانیں کام آئیں ...... سنا ہے فن کے دروازے پہ پہرے بیٹھتے ہیں

اپنے اشعار کے لہجے سے مظفرؔ صاحب ...... بھیڑ میں دور سے پہچان لیے جاتے ہیں

مظفرؔ ہمیں تجربہ ہو چکا ہے ...... کہ آساں ہے شاعر سے نقاد ہونا

اگر عوام سے نزدیک ہوں مظفرؔ میں ...... تو اک خفیف سا کج بھی میری کلاہ میں ہے

سرکس دکھا رہے ہیں مظفرؔ جب اہل فن
بازار میں کمال ہنر کون دیکھتا
مظفرؔ شاعری میں عمر ضائع ہوگئی لیکن
مری آواز الگ ہے، منفرد آہنگ ہے میرا

کسی ایک ادبی شخصیت پر مقالہ یا مضمون لکھنا قدرے آسان ہوتا ہے بہ نسبت دو پایہ کے ادیبوں کے تقابلی جائزے یا موازنے کے۔ کچھ کشمکش اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب یہ حضرات ہم عصر ہوں کیوں کہ ناقد یا مبصر کا ذاتی لگاؤ کسی ادیب کے ساتھ زیادہ تو کسی کے ساتھ کم بھی ہو سکتا ہے۔ جائزہ لیتے وقت اکثر ادیب اس بات کا خیال نہیں رکھ پاتے۔ یہ صورت حال بہت نازک ہوتی ہے۔ ادبی دیانت داری کا تقاضا ہے کہ منصفانہ اور مدلل بحث ہونا چاہیے نہ کہ ذاتی لگاؤ۔

دور حاضر میں صف اول کے جتنے بھی شعرا اور ادبا موجود ہیں ان میں پروفیسر مظفر حنفی اور علامہ ناوک حمزہ پوری کی ادبی قدریں تقریباً برابر ہیں۔ ان حضرات کی فنی اور ادبی حیثیت کا جائزہ لیا جائے تو اس نتیجے پر پہنچنا دشوار ہوگا کہ دونوں میں بہتر کون ہے کیوں کہ ان حضرات میں جس نے بھی جس ادبی مضمون پر قلم اٹھایا، ہر نقطۂ نظر سے حق ادا کیا۔ پروفیسر مظفر حنفی اور علامہ ناوک حمزہ پوری کے فکر و فن میں مشابہت کی جستجو محض ایک عالمانہ اور مدلل بحث اور صرف ذہنی مشق ہی نہیں بلکہ ان حضرات کی اعلیٰ نظم و نثر کی خصوصیات کی تلاش ہے جو عصری زمان و مکان کے باوجود فکری اعتبار سے کہیں مختلف ہیں تو کہیں ایک سی۔ درج بالا سطور میں عرض کیا جا چکا ہے کہ چوں کہ غیر جانب دار تقابلی جائزہ دشوار ہوتا ہے اس لیے واضح کر دینا ضروری ہے کہ ان دونوں حضرات کے ادبی اور فنی تقابل کے ساتھ ان کے فکری توسن خیال کی وسعتیں بھی مطمح نظر ہوں گی تا کہ دونوں حضرات کے خواص کا محاکمہ بحسن و خوبی کیا جا سکے۔ ہر چند کہ ایک کا تعلق سیاست اور ادب کی راجدھانی دہلی سے ہے تو دوسرے کا تعلق بہار جیسے پسماندہ صوبے کے ایک غیر معروف قصبے 'حمزہ پور' سے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان کے لاکھوں چھوٹے چھوٹے قصبوں کے مانند حمزہ پور آج بھی تاریکیوں کے گوشے میں گم ہوتا اگر یہاں ناوکؔ حمزہ پوری جیسا جید عالم پیدا نہ ہوا ہوتا۔ ناوک صاحب کا نام منسوب ہو جانے کے بعد ہی حلقۂ علم و ادب نے جانا کہ ہندوستان کی سرزمین پر حمزہ پور نام کا بھی کوئی مقام ہے۔ اس کے برعکس دہلی ہندوستان کا وہ

مقام ہے جو بین الاقوامی شہرت کے ساتھ وہ اثر رکھتا ہے جس کے نام کے سہارے اکثر لوگ اپنا قد اونچا کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ چہ جائے کہ پروفیسر مظفر حنفی صاحب تو علم و ادب کا ٹھاٹیں مارتا سمندر رہیں۔ پھر بھی یہ کہنا غیر ضروری نہ ہوگا کہ دہلی کی دانش گاہوں اور کتب خانوں سے موصوف نے بہت فائدہ اٹھایا جب کہ ناوک صاحب کو ان کے والد گرامی علامہ قوس حمزہ پوری کے علاوہ ان کے ذاتی کتب خانے کے ساتھ ان رسائل، جرائد اور ڈاک کے ذریعہ موصول ہونے والی کتب کے استفادے نے نفع پہنچایا جو ان تک آسانیوں یا دشواریوں سے پہنچ سکیں۔

نظم اور نثر دونوں میں ہی ان حضرات کی فکری اور فنی زبان اردو کی اعلیٰ ادبی زبان ہے۔ دونوں حضرات کی فکری ،فنی اور تنقیدی بصیرت کا اظہار کہیں نظم کی صورت میں تو کہیں نثر کی صورت میں ہوتا ہے۔ بحیثیت شاعر یہ دونوں حضرات جو کچھ بھی بیان کرتے ہیں وہ ان کے تجربے اور مشاہدے کی ترجمانی ہوتی ہے۔ان کے کلام انسانی جذبات کے ساتھ حقیقت نگاری کا سر چشمہ ہوتے ہیں۔ دونوں حضرات کی شاعری کے تعلق سے ایک اہم بات اور بھی یہ کہی جاسکتی ہے کہ ان حضرات کے غور و فکر کے طریقے میں بھی جا بجا یکسانیت نظر آتی ہے۔ بین المتون کے فرق کے باوجود ان کے قارئین کے دل و دماغ پر ان حضرات کی شاعری تقریباً ایک ہی جیسے اثرات چھوڑتی ہے۔راقم کے اس دعوے کی دلیل کی صورت دونوں استاذ الشعرا کی غزلیہ شاعری کے چند ایسے اشعار پیش خدمت ہیں جن میں تغزل، بے ثباتی عالم اور جذبات و تجربات جس جاذب و جالب پیرائے میں پیش کیے گیے ہیں وہ محسوسات سے تعلق رکھتے ہیں۔ پروفیسر مظفر حنفی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

ستمگر ہے و لے اس کی ادائیں بھی نرالی ہیں   کہ وہ تنہا کوئی بھی دکھ مجھے سہنے نہیں دیتا

......

قریب آؤ کہ مہندی رچے ہتھیلی میں   ستارہ دیدۂ نمناک سے اتارا جائے

آپ کی راہ میں تھرتھری ہے میاں   پیار کی راہ کانٹوں بھری ہے میاں

......

پتہ چلا کہ ہواؤں کی سنسناہٹ تھی   مجھے گمان یہ گزرا کہ تو بلاتا ہے

بعد ازاں علامہ ناوک حمزہ پوری کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

ٹیررِسٹوں میں ہے شمار اپنا   ڈاڑھی والا ہوں، طالباں ہوں میں

کپکپاتے ہوئے یہ ہاتھ، یہ تھراتے پاؤں   گم کہاں جا کے ہوئی ہائے جوانی میری

قطروں کو تو بس اپنے تشخص پہ ہے اصرار   دریا انھیں کیوں کہتا ہے، احسان فراموش

اب آگے کیا ہو ظلوم و جہول سے امید   ابھی تک آدمی زادہ جب آدمی نہ ہوا

پروفیسر مظفر حنفی کی نثر خود ساختگی اور روانی سے جس درجہ مرصع ہے وہ بھی قابل ذکر ہے۔نثر میں لہجے کی

ایسی سادگی اور روانی کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے کیوں کہ آج کا بیشتر ادیب اپنی نثر میں ثقیل سے ثقیل الفاظ ضم کر کے اسے معیاری بنانے کی کوشش میں اس کی روانی اور فصاحت دونوں کو قربان کر بیٹھتا ہے جب کہ موصوف اس سے قطعی پرہیز کرتے ہیں۔ان کی نثری زبان عام بول چال کی زبان سے قریب تر ہے۔اپنے استاد شاد عارفی کی غزل گوئی کے بارے میں موصوف کا ایک ارشاد ملاحظہ ہو:

> ''شاد کی عشقیہ نظموں میں نہ کہیں فلسفۂ عشق پر بحث کی گئی ہے نہ اس کے بارے میں مفکرانہ موشگافیاں ملتی ہیں۔ سیدھی سادی، روزمرہ کی گھریلو محبت ان نظموں کا محور ہے۔ دونوں جوان دل جس طرح محبت کرتے ہیں اور انھیں اس میں جو کیفیات پیش آتی ہیں، بعینہٖ وہی باتیں نمک مرچ لگائے بغیر نظموں میں ڈھال دی گئی ہیں۔ان میں خلوص، صداقت، گرمی اور جان ہے۔ یہ نظمیں صناعانہ گل بوٹوں سے پاک ہیں کہ خود قبائے گل ہیں۔ان کی زندگی کے عمیق فلسفیانہ تجربات اور فکر کی گہرائیاں تلاش کرنا، ہرن پر گھاس لادنے کے مترادف ہوگا۔ان کا اپنا ایک حسن ہے جو شاد کی سادگی اور طرز ادا کا تخلیق کردہ ہے۔ ہر نظم اپنی جگہ ایک افسانہ ہے۔''(۲)

جس حد تک کوتاہ نظر راقم السطور کو پروفیسر حنفی صاحب کی نثری خدمات سے واقفیت ہے اس کے پیش نظر یہ بات بآسانی کہی جاسکتی ہے کہ شاید موصوف کو بھی اس بات کا صحیح اندازہ نہ ہو کہ اب تک انھوں نے کتنے تحقیقی مقالات، مضامین، تراجم، انشائیے، فکاہیے، فیچر وغیرہ اور دیگر نثری کام انجام دیئے ہیں۔اب تک موصوف کی تقریباً ۹۱ر کتابیں (نثر اور نظم میں) زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔ان سب کے ذکر کے لیے ایک چھوٹا سا مضمون ناکافی ہے۔ دراصل ان کے کاموں کے ذکر پر ایک پوری کتاب تصنیف کی جاسکتی ہے جس کے لیے اچھی خاصی تگ و دو کی ضرورت ہے۔ چوں کہ یہ تقابلی جائزہ ایک چھوٹا سا مضمون ہے اس لیے کافی غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچ سکا ہوں کہ موصوف کی نثری خدمات کا جائزہ ان کے تازہ ترین مضمون 'عینی اور اردو فکشن' ، ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ ، قرۃ العین نمبر ،فروری۔ مارچ ۲۰۰۹ء کا جائزہ ہی کتابچہ کی صورت اختیار کر جائے گا اور پھر بھی تشنگی باقی رہ جائے گی۔اس مضمون کا خیال راقم کو اس لیے بھی آیا کہ موصوف نے اس میں ہر نقطۂ نظر سے فکشن کے عنوان سے قرۃ العین حیدر کے ۸ر ناولوں، ۱۸ر مختصر افسانوں اور ۶ر طویل افسانوں کا جائزہ اس طرح سے لیا ہے کہ ان کی فکشن نگاری کی نہ تو ایک بھی خوبی کو نظر انداز ہونے دیا نہ ہی خامیوں کو درگزر کیا۔ گیارہ صفحات پر مشتمل اس بھرپور مضمون میں جہاں موصوف نے دل کھول کر قرۃ العین حیدر کے افسانوں اور ناولوں کی تمام خوبیوں پر تبصرہ کیا وہیں ان کے فنی نکات کی چند ضمنی خامیوں پر مدلل بحث بھی کی ہے۔

موصوف نے اپنے اس مضمون کا آغاز 'افسانہ نگاری' کے عنوان سے کرتے ہوئے تمہید کے طور پر ہندو پاک کے سرفہرست افسانہ نگاروں کا ذکر کرتے ہوئے منٹو، احمد ندیم قاسمی، علی عباس حسینی، خواجہ احمد عباس،

انتظار حسین کے ساتھ ڈاکٹر علیم مسروؔر کو بھی انھیں افسانہ نگاروں کی فہرست میں شامل کر لیا ہے جب کہ ڈاکٹر علیم مسروؔر مرحوم اردو دنیا میں اپنے صرف ایک مشہور ناول 'بہت دیر کر دی' کے مصنف کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ راقم کو مسروؔر صاحب کی ہم نشینی کا شرف بھی حاصل ہے۔ اس کے علاوہ موصوف ایک بہترین شاعر بھی تھے اور افسانہ نگار بھی، مگر افسانہ نگاری میں اس درجہ پر فائز نہ تھے کہ ان کا نام منٹو اور احمد ندیم قاسمی کی فہرست میں شامل کیا جائے۔

قرۃ العین حیدر کے مختصر افسانوں کا جائزہ لینے کے لیے پروفیسر حنفی صاحب نے ان کے جن ۱۸/ افسانوں کا انتخاب کیا ہے ان کے عناوین یہ ہیں: ''رقص شرر، مونا لیزا، جہاں کارواں ٹھہرا تھا، پرواز کے بعد، جلاوطن، پت جھڑ کی آواز، ملفوظات حاجی گل بابا بیکتاشی، آئینہ فروش شہر کوراں، نظارہ درمیاں ہے، یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے، کہرے کے پیچھے، روشنی کی رفتار، لکڑ بگھے کی ہنسی، آوارہ گرد، یاد کی ایک دھنک جلے۔'' ان کے بارے میں حنفی صاحب کا خیال بجا ہے کہ ''یہ اردو افسانوں کے ہر اچھے انتخاب میں شامل کیے جانے کے لائق نگارشات ہیں۔'' (۳) قرۃ العین حیدر کے مختصر افسانوں پر موصوف کے ایسے جاذب و جالب تبصرے کو پڑھ کر یہ اندازہ کر سکنا ہمہ شما کے لیے بھی مشکل نہیں ہے کہ موصوف نے ان کے افسانوں کا کتنا عمیق مطالعہ کیا ہے۔ تبصرہ کرتے وقت موصوف نے افسانوں کی ہر باریک سے باریک خوبی اور خامی کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ موصوف کے بیش قیمتی جملے ملاحظہ ہوں:

> ''قرۃ العین حیدر کا کمال یہ ہے کہ وہ تاریخ کے حوالے سے ماضی کے کرداروں کی سوانح حیات کو پُش کر دینا ہی کافی نہیں سمجھتیں بلکہ کہانی کو گزشتہ تہذیبی اقدار کی باز آفرینی کا وسیلہ بنا دیتی ہیں۔ عینی کے افسانے تاریخی حیثیت کے حامل ہیں تو اس کا سبب محض ان کا وسیع مطالعہ و مشاہدہ ہی نہیں، اصل قوت وہ تخلیقی جوہر ہے جس کے لمس سے ماضی اور حال، مستقبل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ عینی کے افسانوں میں سے بیشتر کے مرکزی کردار زمانے کی بے اعتباری، فریب کردگی، شکست آرزو اور ہزیمت کے نمائندہ ہیں۔'' (۴)

مختصر افسانوں پر تبصرے کے بعد پروفیسر مظفر حنفی نے قرۃ العین حیدر کے ۶/ عدد طویل افسانوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اپنے تبصرے میں انھوں نے ''سیتا ہرن، ہاؤسنگ سوسائٹی، چائے کے باغ، دلربا، اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو اور سنٹ فلورا آف جارجیا'' کو عنوان بنایا ہے۔ ہندوستان کے صف اول کے ۹/ افسانہ نگاروں کے نام لینے کے بعد موصوف نے علی الاعلان کہہ دیا کہ معیار و تعداد کے اعتبار سے اس میدان (طویل افسانہ) میں قرۃ العین حیدر کا پلہ سب پر بھاری نظر آتا ہے۔ ان کے افسانوں میں کہیں ایک زمانہ دوسرے سے ملحق نظر آتا ہے تو اسی حسن و خوبی کے ساتھ دوسرے زمانے کو تیسرے کے ساتھ علاقہ بھی ہوتا ہے۔ ان کے طرز بیان

میں وضاحت کے ساتھ اس درجہ روانی ہے کہ اکثر قاری زمانوں پر غور کیے بغیر ذہنی طور پر قرۃ العین حیدر کے ساتھ ہی ہو لیتا ہے۔ اسی باریک بینی اور حسن و خوبی سے مختلف زمانوں میں اپنے کرداروں اور سہل بیانی کے ساتھ قارئین کو سیر کراتی ہیں۔ پروفیسر حنفی ان کی اس خوبی کو اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ ''حال سے ماضی میں لمبی چھلانگ لگانا اور ماضی کے تناظر میں دیکھنا قرۃ العین حیدر کا محبوب مشغلہ ہے اور وہ حال کو مستقبل سے جوڑنے میں بھی طاق ہیں، جس کی ایک تابناک مثال عینی کا افسانہ 'روشنی کی رفتار' ہے۔'' (۵)

قرۃ العین حیدر کے مختصر اور طویل افسانوں پر تبصرہ کرنے کے بعد پروفیسر حنفی نے ان کے ناولوں اور ناول نگاری پر تبصرہ کرنے کے لیے ان کے ۷/ ناولوں کا انتخاب کیا ہے۔ ان کے یہ ناول ''میرے بھی صنم خانے، سفینۂ غم دل، آگ کا دریا، کار جہاں دراز ہے، آخر شب کے ہم سفر، گردش رنگ چمن اور چاندنی بیگم'' ہیں۔ قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری کا سفر ۱۹۴۹ء میں ان کے پہلے ناول 'میرے بھی صنم خانے' سے شروع ہو کر ۱۹۹۰ء 'چاندنی بیگم' پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ ناول نگاری کے اپنے اس چالیس سالہ سفر میں وہ سدرۃ المنتہیٰ تک جا پہنچیں۔ قرۃ العین حیدر کی وسیع معلومات اور خلاقانہ قدرت کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر حنفی ان کے آرٹ پر یوں گویا ہوتے ہیں۔ ''ان کی معلومات وسیع ہیں اور ان کی ایک بہت بڑی قوت یہ ہے کہ وہ شعور کی رو کے خلاقانہ استعمال پر قدرت کامل رکھتی ہیں۔ جس طرح قدیم داستانوں میں بعض کردار بندر یا طوطے کے قالب میں اپنی روح منتقل کر سکتے تھے، اسی طرح عینی شعور کی رو کے فن کارانہ استعمال سے کسی زمانے یا علاقے کے قالب میں اپنی روح کو منتقل کر سکتی ہیں اور اس قلب ماہیت یا روح کے حلول سے انھیں وحشت اس لیے نہیں ہوتی کہ تبدیل شدہ زمانہ یا ماحول ان کے لیے اجنبی نہیں ہوتا۔'' (۶)

قرۃ العین حیدر کے ناولوں پر تبصرہ کرتے وقت پروفیسر حنفی نے ان کی کسی بھی خوبی یا خامی کو نظر اندار نہیں کیا نہ ہی کسی بھی قابل غور پہلو سے بے اعتنائی برتی۔ ایک معیاری ناقد کے مانند اگر موصوف نے ان کے ناول کی خامیاں گنوائیں ہیں تو خوبیوں کی تعریف بھی دل کھول کر کی ہے۔ دیکھیے، ان کی فن کاری، کردار سازی اور حفظ مراتب پر کیا اعلیٰ نکات پیش کرتے ہیں:

> ''......قدرت نے عینی کو بے پناہ قوت متخیّلہ اور تحقیقی جوہر سے نوازا ہے جسے ان کے بے حد وسیع مطالعہ اور عمیق مشاہدے نے مزید قوت عطا کی ہے۔ تلازمۂ خیال کی آزادی اور شعور کی رو کے وسیلے سے عینی اپنی داستان کے لیے جو انوکھی تکنیک استعمال کرتی ہیں وہ ماضی کو حال اور حال کو مستقبل تک پہنچانے اور اسی برق رفتاری کے ساتھ پلٹنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے......ناول میں عینی کی کردار سازی کا ہنر بلندیوں کو چھوتا ہے۔ انھوں نے بیلا، ذکی، قنبر، صفیہ، گلاب، موگرے، بہار، پھولپوری، چکوترا، گڑھوالی، پنکی، فیروزہ، چنبیلی بیگم، شہلا، طاہر علی، پروین، مانک بائی، کیلا،

سروش جیسے جیتے جاگتے رنگا رنگ متنوع کرداروں سے چاندنی بیگم کی آرٹ گیلری سجائی ہے اور سینکڑوں نہیں تو درجنوں کردار پسماندہ طبقے سے تعلق رکھنے والے ملازموں اور خادموں کے ہیں۔ ہر کردار منفرد خصوصیات کا حامل اور مخصوص انداز میں گفتگو کرنے اور سوچنے پر قدرت رکھتا ہے۔تمام مکالمے برجستہ،شستہ اور ناول نگار کا بیانیہ بھی رواں دواں ہے۔''(۷)

اگر علامہ ناوکؔ حمزہ پوری کی ادبی خدمات کا ذکر مقصود ہو تو شاعری کے تعلق سے کہا جا سکتا ہے کہ غزل، نظم، رباعی، قصیدہ، نعت، حمد، منقبت گو کہ صنف شاعری میں ایسی کوئی صنف نہیں جس پر علامہ ناوکؔ حمزہ پوری نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔صرف طبع آزمائی نہیں بلکہ مکمل شاعرانہ کمال کے ساتھ ان کی شاعری ہر صنف سخن میں کمال کے درجہ پر فائز نظر آتی ہے۔ان کی شاعرانہ خصوصیات پر جس زاویۂ نگاہ سے بھی نظر ڈالی جائے ان کا ہر مصرعہ شاعری کے لوازمات سے اکثر و بیشتر پر نظر آتا ہے۔نہ فصاحت میں کمی نہ بلاغت میں کجی۔سلاست اور روانی ایسی کہ قارئین عرصہ تک محظوظ ہوتے رہیں۔ضرورت کے مطابق تمام شعری صنعتوں سے مرصع، موصوف کے اشعار میں وہ تمام خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں جن کی امید ہر استاد شاعر کے کلام میں کی جاتی ہے۔موصوف کی غزلیں اگر حسن تغزل، بے ثباتی عالم، جذباتی عناصر، طنز و مزاح، فکری عناصر اور پند و نصائح سے پر ہیں تو وہ رباعی گوئی میں بھی کمال کی منزل پر نظر آتے ہیں۔اردو شاعری میں منفرد مقام حاصل کر چکے علامہ ناوکؔ حمزہ پوری گزشتہ چھ دہوں سے اردو شاعری کی کہکشاں میں ایک روشن ستارے کے مانند درخشاں نظر آتے ہیں۔ صرف رباعیات پر ہی موصوف کے چار مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔

موصوف نے حیرت انگیز طور پر سینکڑوں رباعیاں کہی ہیں۔اس صنف سخن کے لیے موصوف کی مجموعی خدمات قابل داد و تحسین ہیں۔نمونے کے طور پر درج ذیل چند رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

دیکھو تو ذرا فطرت انساں کا تضاد	مجموعۂ اضداد ہے یہ آدم زاد
پل بھر میں یہ جبریلِ امیں کا شاگرد	دم بھر میں یہ ابلیسِ لعیں کا استاد
……	
اوہام کے صید ہیں تساہل کے اسیر	قسمت کے ہیں نوحہ خواں جواں ہوں کہ پیر
سیاروں کو تسخیر کیا غیروں نے	ہم لوگ لکیر کے ابھی تک ہیں فقیر
……	
یہ ٹال مٹول، اگر مگر جانے دے	یہ پیش و پس، زیر و زبر جانے دے
یا تو ہی آ کے مرے دل میں بس جا	یا اپنے دل میں گھر کر جانے دے
……	
کلیوں کے چٹکنے کی صدا لگتی ہو	پھولوں کے مہکنے کی ادا لگتی ہو
لگتا ہے کبھی یوں کہ ہو ساون کی گھٹا	پھاگُن کی کبھی مست ہوا لگتی ہو

علامہ ناوکؔ حمزہ پوری اگر کہیں اپنی رباعیات کا عنوان انسان کی صالح مزاجی کو بناتے ہیں تو کہیں انسانوں کے غیر انسانی رویہ کو اپنے طنز کا ہدف اور مزاح کے اظہار کا وسیلہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔اس کی بہترین مثال درج بالا پہلی رباعی ہے۔موصوف کی تخیل پرواز اتنی زود رفتار ہے کہ کبھی تو وہ اس کے توسط سے سدرۃ المنتہیٰ پر نظر آتے ہیں تو کبھی تحت الثریٰ کی گہرائیوں تک کی خبر لاتے ہیں۔بہر حال رباعی کا تعین مخصوص اوزان میں ہی کیا جاتا ہے جو''لاحول ولاقوۃ الا باللہ'' کا ہم وزن ہے اور جس کے لیے علم عروض سے بہتر واقفیت کے ساتھ ذہنی یک سوئی بھی بڑی اہمیتوں کی حامل ہے۔

کسی بھی شہر میں ایسا کوئی گلی محلہ نہ ہوگا جہاں درجنوں ایسے شاعر نہ مل جائیں جن کی شاعری صرف زبان دانی اور قافیہ پیمائی کی محور ہوتی ہے۔یہ شعرا اصول شاعری اور اس کے دیگر لوازمات تک سے واقف نہیں ہوتے چہ جائے کہ علم عروض۔یہی وجہ ہے کہ قصیدہ اور رباعی جیسی اصناف ہمیشہ سے بڑے اور مستند شعرا کا ہی حصہ رہی ہیں۔جدید رباعی گویان میں علامہ ناوکؔ حمزہ پوری کا نام بہر حال سرفہرست ہے کیوں کی موصوف کی رباعیات کے مجموعہ میں تلاش کرنے پر بھی کوئی ایسی رباعی نہیں ملتی جو سطحی ہو یا رباعی کے اصول کے معیار پر کھری نہ اترتی ہو۔

دیگر شعری اصناف کے مانند ہندوستان میں یہ صنف بھی فارسی شعرا کے ساتھ آئی۔عہد مغلیہ میں اس صنف کو بہت عروج ہوا اور یہ تحت الثریٰ سے سدرۃ المنتہیٰ تک جا پہنچی۔فارسی شعرا کی پیروی اور ان سے استفادہ کرتے ہوئے اردو والوں نے بھی اس صنف سخن کو اپنایا۔عام قارئین کے درمیان اس کی بڑھتی شہرت نے اردو شعرا کے درمیان اس صنف سخن کو عام کر دیا۔پھر جلد ہی وہ زمانہ بھی آ گیا جب اردو شعرا کے درمیان قصائد کے مانند قطعہ تاریخ سے بھی شعرا کا معیار طے کیا جانے لگا۔ان شعرا نے تاریخ گوئی کے فن میں ایسی ایسی صنعتیں اور باریکیاں پیدا کیں کہ جسے پڑھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔عروج کی تمام منازل طے کر چکنے کے بعد فن تاریخ گوئی اب زوال پذیر ہو چکا ہے لیکن ہنوز مرا نہیں ہے بلکہ علامہ ناوکؔ حمزہ پوری اور انھیں جیسے معیاری شعرا کی وجہ سے اب بھی اس کے جسم میں حرارت باقی ہے۔اردو والوں کو قطعۂ تاریخ کے آغازی دور میں ہی کئی الجھنوں سے روبرو ہونا پڑا ہوگا کیوں کہ 'ابجد' کے اعداد میں 'ٹ، ڈ، ڑ، اور تائے مدورہ کے ہمراہ 'بھ، تھ، پھ' جیسے الفاظ سے بھی دو چار ہونا پڑا جس کا عربی میں کوئی عدد مقرر نہیں۔عام مقولہ ہے کہ''ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔'' چنانچہ اردو شعرا نے اپنی سہولت کے مطابق 'ٹ' کو 'ت' کے برابر، 'ڈ' کو 'ذ' کے برابر 'ڑ' کو 'ر' کے برابر تسلیم کر لیا یعنی ٹ = ۴۰۰، ڈ = ۴، ڑ = ۲۰۰ طے کر لیے گئے ہوں گے اور اسی حساب سے بھ (ب + ھ) = (۲ + ۵ = ۷) جھ (ج + ھ) = (۳ + ۵ = ۸) کو اپنا لیا ہوگا۔ جہاں تک تائے مدورہ کا سوال ہے تو اس کے لیے بھی ۴۰۰/عدد طے ہوا۔ مثلاً محمد رضا علی نے 'حمالۃ' میں اور نعمتؔ خان عالی نے 'قرۃ العین' میں اور مولوی فائق نے 'خزینۃ الاصول' میں 'ۃ' کے لیے ۴۰۰ عدد ہی لیے ہیں اور یہی اب تک رائج اور مستند قرار پایا ہے۔

قطعۂ تاریخ کی اصولی بحث سے ہٹ کر اب حضرت ناوک حمزہ پوری کے قطعاتِ تاریخ کا ذکر پیش خدمت ہے۔علامہ نے شاعری کا آغاز ۱۹۴۵ء میں کیا تھا اور چھپنے چھپانے کا زمانہ بھی وہی ہے۔شاعری کے آغاز سے اب تک موصوف نے تقریباً ۱۰۰ سے زائد قطعات مع تاریخ کہے ہوں گے۔اس کے علاوہ انھوں نے بہت سی تعزیتی اور شخصی نظمیں بھی کہی ہیں۔سید فرد الحسن فرؔد کی مایۂ ناز پیش کش 'مصحف تاریخ' جو اصلاً ناوکؔ صاحب کے قطعات کا مجموعہ ہے، ۲۰۰۸ء میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا۔اس مجموعے میں کل ۹۷ رقطعات مع تاریخ شامل ہیں۔بقول فرؔد صاحب یہ قطعات انھوں نے خود جمع کیے۔کچھ ناوک صاحب کی بیاض سے تو کچھ ان کے حافظے سے اور بہت سے قطعات حمزہ پور کے ان باسیوں سے جنھوں نے تعمیر، شادی بیاہ، پیدائش اور وفات کے موقع پر ناوکؔ صاحب سے فرمائش کر کے قطعات کہلوائے تھے۔ان لوگوں سے گزارش کر کے فرؔد صاحب نے علامہ ناوک حمزہ پوری کے ۹۷ رقطعات تاریخ یکجا کر کے شائع کروا دیئے جو ان کا قابل تعریف کام ہے، ورنہ یہ قطعات تاریخ قارئین تک پہنچنے سے رہ جاتے۔۸۱ رکتابوں کے مصنف، مولف اور مترجم علامہ ناوک حمزہ پوری کے چند ایسے قطعات تاریخ ملاحظہ ہوں جن میں علامہ کی شاعری تمام تر شعری اور فنی عروج کے ساتھ نظر آتی ہے:

شکیلؔ بدایونی (۱۹۷۰ء=۱۳۹۰ھ)

عیسوی و ہجری دونوں میں ہے سال ارتحال　　"میر بزم شعر و نغمہ" "عالم آرائے غزل"

علامہ جمیلؔ مظہری (۱۹۸۰ء)

بہ بست و سہ ز جولائی، چہار شنبہ بود　　"جمیلؔ یافت ز قید حیات آزادی"

سید حرمت الاکرام (۱۴۰۳ھ)

چوں مرد برائے سال فوتش ناوکؔ　　ہاتف گفتہ کہ "فخرِ دوراں اکرامؔ"

ساحرؔ لدھیانوی (۱۹۸۰ء)

ہاتف نے کہا از پے تاریخ وفات　　"سحرِ دُر افشانِ ساحرؔ ٹوٹا"

جوشؔ ملیح آبادی (۱۹۸۲ء)

برخاست شورِ نوحہ در بزم ادب　　"شبیر حسن ملیح آبادی رفت"

علامہ ناوک حمزہ پوری نے صرف اردو میں شاعری نہیں کی بلکہ ان کا شمار ہندوستان کے بہترین فارسی شعرا میں بھی ہوتا ہے۔راقم السطور کی حقیر معلومات کے مطابق علامہ نے اب تک تقریباً ۶۰ رچھوٹی بڑی نظمیں اور تعزیتی و شخصی نظمیں فارسی میں کہی ہیں۔چھ اشعار پر مشتمل علامہ کی ایک چھوٹی سی تعزیتی نظم ملاحظہ ہو۔یہ نظم موصوف نے حضرت عبدالقیوم حسرتؔ وارثی صاحب کے ارتحال کے بعد تصنیف کی تھی۔

حیف گم شد گوہر نایاب حسرتؔ وارثی　　شد خزاں دیدہ گل شاداب حسرتؔ وارثی
از غم فوتش عزیزان و اقارب سوختند　　دم بخود از داغ ہجر احباب حسرتؔ وارثی
حسرتا! وا حسرتا! خاموش شد سازِ سخن　　شد شکستہ ناگہاں مضرابِ حسرتؔ وارثی
آفتابِ زندگی مشفقِ من شد غروب　　در خسوفِ مرگ شد مہتاب حسرتؔ وارثی
وا دریغا تابِ گویائی ندارم از غمش　　گویم اے نشترؔ چہ من در باب حسرتؔ وارثی
از برائے کتبۂ لوحِ مزارش ناوکاؔ　　ہاتفِ غیبی بگفتا "خوابِ حسرتؔ وارثی"

(۱۹۹۴ء)

مضمون کے آغاز میں عرض کیا جا چکا ہے کہ علامہ ناوکؔ حمزہ پوری نے اردو نظم اور نثر کی تقریباً تمام اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔انھوں نے صرف سینکڑوں رباعیاں ہی نہیں کہیں بلکہ اس صنف شاعری پر ان کی گہری نظر بھی ہے۔موصوف نے ایک کتاب بعنوان 'ساگر منتھن' (رباعی کا ایک تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ) بھی تصنیف فرمایا ہے۔اس کتاب کی اشاعت ۲۰۰۷ء میں ہوئی۔علامہ کی اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں انھوں نے رباعی کی قسموں، اوزان و اقسام اور تقطیع پر بھی نہایت مدلل بحث سپرد قلم کی ہے۔اس کتاب کی زبان بہت رواں اور عام فہم ہے۔رباعی کے عنوان سے موصوف نے متعدد پیرایوں سے"رباعی اور غزل، رباعی اور قطعہ، رباعی اور چوپائی، رباعی اور سانٹ اور رباعی اور ترائیلے" کے عناوین سے پر مغز تقابلی اور وضاحتی جائزہ بھی پیش کیا ہے جو خاص طور سے ان طالب علموں کے لیے نہایت سودمند ثابت ہوگا جو غزل، رباعی، قطعہ اور سانٹ وغیرہ کے فرق، اوزان اور تقطیع سے نابلد ہیں۔اس کتاب کو پڑھ کر بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ناوکؔ صاحب صف اول کے عروضی ہیں۔عروض سے متعلق باریک سے باریک نکتے کی وضاحت موصوف کی اس کتاب کی ایک اہم خاصیت ہے۔خاص طور پر اس کتاب کے صفحہ ۴۸ پر ایک رباعی کے ہر مصرعے جداگانہ وزن کے حامل ہیں۔اس رباعی کے چاروں مصرعوں کو تحریر فرما کر موصوف نے ان چاروں کی تقطیع کر کے واضح کر دیا ہے۔اسی طرح کی وضاحتیں مع مثال بعد کے دیگر صفحات پر بھی موجود ہیں۔اس کتاب کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کام موصوف نے نہایت عرق ریزی سے کیا ہے۔رباعی کے ۲۴ رمروجہ اور عام اوزان بھی موصوف کی اسی کتاب میں درج ہیں۔مثال کے طور پر انھوں نے ۲۴ ررباعیاں تحریر فرمائی ہیں جن میں سے چند بطور نمونہ پیش ہیں۔

جلوت میں بھی در جان وفا کا نہ کھلا　　خلوت میں بھی بند اس کی قبا کا نہ کھلا
ہر سعی پہ اک اور گرہ پڑتی گئی　　کچھ راز مگر ذات خدا کا نہ کھلا

......

منکر کہتے ہیں اتفاقی ہے خدا　　سادہ لوحوں کی خوش مذاقی ہے خدا

موت آئے گی سامنے تو ہوگا معلوم — فانی ہے ہر اک چیز، باقی ہے خدا

......

اس دور میں کیا لکھتا کبوتر نامہ — ہے حکم کہ ''لکھ خون سے ہر سرنامہ''
بارود کے ڈھیرے پہ ہے زیتون کی شاخ — یہ عہد جدید کا ہے منظرنامہ

......

اتنی بھی کسی کے دل میں کد ہوتی ہے ؟ — اس طور بھی آتش حسد ہوتی ہے؟
سہتے جائیں تمھیں کہو کب تک — سہنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے؟

......

حاجی کہلائے اور دولت بھی کمائے — کوئی پھر کیوں نہ ہر برس حج کو جائے
گھر گھر ہے یہ موضوع سخن پھر امسال — حاجی جمّن مکّے سے سونا لائے

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے غزل کو اردو شاعری کی آبرو شاید اسی خیال کے تحت کہا تھا کہ یہ وہ واحد صنف سخن ہے جس میں دنیا کے ہر موضوع کو بآسانی سمویا جا سکتا ہے اور اس کا ہر شعر ایک اکائی ہوتا ہے۔ اس میں تعداد اشعار کی بھی کوئی قید و بندش نہیں ہوتی اور شاعر صرف ایک شعر میں اپنا مفہوم بخوبی واضح کر لیتا ہے، اس لیے ایک سے دوسرے شعر کی نسبت بھی ضروری نہیں ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل ہر قسم کے شاعر کو خوب راس آتی ہے۔ اس صنف سخن کی مقبولیت کا شاید سب سے بڑا راز یہ ہے کہ ہر نقطۂ نگاہ سے سہل ترین صنف شاعری ہے۔ غزل گوئی میں حضرت ناوکؔ حمزہ پوری کا انداز اردو ادب میں منفرد ہے۔ علامہ کی بیشتر غزلوں کے اشعار تمام شعری لوازمات سے پر ہیں۔ ان کے بیشتر اشعار سلاست، روانی اور بلاغت کا سرچشمہ ہیں۔ ہر شعر کی تخلیق میں علامہ شاعری کے باریک سے باریک نکات کا خیال رکھتے ہوئے شاعری کی تمام تر خصوصیات اپنے ہر شعر میں سمو دیتے ہیں۔ موصوف نے کبھی کسی کی مصاحبت پسند نہیں کی اس لیے جو کچھ بھی کہا بے خوف کہا۔ موصوف کی شاعری کی یہی خوبیاں ایسی ہیں جو انھیں دیگر شعرا سے منفرد بناتی ہیں۔ موصوف کی تازہ غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نہیں، ہجرت پسِ ہجرت نہ ہوگی — اگرچہ لاکھ تغلق بولتا ہے
زمیں سے ربط ٹوٹا آدمی کا — خلا میں اب معلق بولتا ہے
اسے بھی آپ عارف ہی کہیں گے — مرا طوطا 'ھوالحق' بولتا ہے
ہوئی ہیں بستیاں شہر خموشاں — بیابان لق و دق بولتا ہے
کبھی جا کر سنو ناوکؔ کو تم بھی — پتے کی بات احمق بولتا ہے

......

نکلتے جاتے ہیں تہذیب کے نقوش جمیل — در آئے شہر سے ہر گاؤں میں مشین کے سانپ
زمینیں خوف زدہ ہیں کہ کتنی فصل اگائیں — چہار سمت ہیں منھ پھاڑے صارفین کے سانپ

گنواتے ہم نہ عصائے کلیم گر ناوکؔ — نہ ہوتے درپے آزار ساحرین کے سانپ

......

کوئی اس کی خدائی سے جو بھاگے تو کہاں جائے — اسی کے بس میں ہے انجام، جو آغاز دیتا ہے
عطا کرتا ہے جو شہباز کو ذوق فلک پیما — ممولے کو کہاں وہ وسعت پرواز دیتا ہے
سراپا امن و صلح و آشتی پیغام ہے جن کا — انھیں گجرات تحفے میں بتِ طناز دیتا ہے

......

ٹیررسٹوں میں ہے شمار اپنا — ڈاڑھی والا ہوں، طالباں ہوں میں
پھر الکشن قریب کے ناوکؔ — آج کل زیب داستاں ہوں میں

......

سند وہ مجھ سے وفاداریوں کی چاہتے ہیں — مری طرح نہ ہو رسوا کوئی وطن میں کبھی
خدا کا شکر ہے ناوکؔ بہ فیض حضرت قوسؔ — نہ جھول آنے دیا میں نے فکر وفن میں کبھی

......

صبح ہے کیا شے؟ ترے رخسار کی تصویر ہے — شام ہے کیا چیز؟ عکس گیسوے شب گیر ہے
ہم تو اتنا جانتے ہیں کل تھی وہ جنت نظیر — آج تم بتلاؤ کیسی وادئ کشمیر ہے
روکتا ہے تجربہ، فریاد سے ناوکؔ مجھے — یوں تو آویزاں یہاں بھی عدل کی زنجیر ہے

تقابلی جائزے کے لحاظ سے راقم السطور کو ان دونوں حضرات کی ایک ایک ایسی غزلیں دستیاب ہیں جو ایک ہی بحر و وزن میں ہونے کے ساتھ ایک ہی قافیہ اور ردیف میں بھی ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

پروفیسر مظفر حنفی۔ ماہنامہ 'اردو' نومبر ۲۰۰۹، ص ۱۸۲

تجھے کیسے بتاؤں، کیا طریق جنگ ہے میرا — ترے ہاتھوں میں لرزش ہے، پریدہ رنگ ہے میرا
انا کا نشہ ہے مجھ کو، زمیں ہم رقص ہے میری — تمہارا آسماں اس رقص میں سردنگ ہے میرا
ہمیشہ آئینے کے سامنے محسوس ہوتا ہے — کہ یہ چہرہ نہیں ہے آئینے پر زنگ ہے میرا
ترے ناموس پر کچھ حرف آتا ہو تو البتہ — نہیں تو عشق میں کیا چیز، نام و ننگ ہے میرا
غزل فریاد ہے میری، ترے نقارخانے میں — مگر فریاد میں اسلوب، شوخ و شنگ ہے میرا
مسلسل زلزلہ سا کیوں مرے سینے میں رہتا ہے — خدایا، جسم کا یہ نیم جامہ تنگ ہے میرا
مظفرؔ شاعری میں عمر ضائع ہوگئی لیکن — مری آواز الگ ہے، منفرد آہنگ ہے میرا

علامہ ناوکؔ حمزہ پوری۔ مجموعہ 'فانوس'

نہ پوچھیں آپ، کیا طرز سخن، کیا رنگ ہے میرا — کہ دنیائے ادب میں مدتوں سے رنگ ہے میرا
کسی سے کوئی چشمک ہے نہ ان بن ہے نہ دل میلا — جو رشک صلح ہے ایسا طریق جنگ ہے میرا

بھلی ہو یا بری، صد رشک، اک آواز ہے اپنی
نہ کوئی ساز و مضراب و رباب و چنگ ہے میرا

لیے ہوں سر ہتھیلی پر، کفن بر دوش پھرتا ہوں
مرے شوق شہادت پر، عدو بھی دنگ ہے میرا

شکم میں آنت سالم ہے نہ منہ میں دانت باقی ہے
ہے مفروضہ کہ اک معشوق شوخ و شنگ ہے میرا

معالج میرے اس کو دل کی بیماری بتاتے ہیں
تنفس کے لیے مدت سے سینہ تنگ ہے میرا

خدا محفوظ رکھے حاسدوں کے شر سے اے ناوکؔ
یہ بے پر کی خبر ہے، قافیہ ہی تنگ ہے میرا

درج بالا غزل میں دونوں حضرات نے سات سات اشعار کہے ہیں۔ پروفیسر مظفر حنفی نے ان سات اشعار میں کل آٹھ قوافی (مطلع میں دو) کا استعمال کیا ہے جب کہ علامہ ناوکؔ حمزہ پوری نے کل چھ قوافی صرف کیے ہیں۔ ناوکؔ صاحب نے مطلع میں ایک ہی قافیہ دونوں مصرعوں میں نظم کیا ہے جو کہ قدرے مشکل کام ہے جسے علامہ نے بڑی خوب صورتی سے نبھایا ہے۔ مظفر صاحب نے مطلع کے اولیٰ مصرعے میں جنگ کا قافیہ اپنے طریق جنگ کی وضاحت کے ساتھ نظم کرتے ہوئے ثانی مصرعے میں جس حسن و خوبی کے ساتھ حملہ آور کے ہاتھوں میں لرزش اور خالی ہاتھ مغلوب کے چہرے کے اڑے ہوئے رنگ کی تصویر کشی کی ہے، وہ منفرد ہے۔ اس مقام پر تغزل کا ایک انوکھا رنگ صاف جھلکتا ہے جو ایسے حالات میں قاری کے تصور میں ایک صاف تصویر بناتا ہے۔ علامہ نے بھی اپنی اس غزل کے دوسرے شعر میں طریق جنگ کا قافیہ استعمال کیا ہے۔ اپنی اس طرح کی انوکھی جنگ کی علامہ کی وضاحت بھی ایک دم منفرد ہے۔ اس شعر میں موصوف کی صلح اور امن پسندی کے ساتھ انکساری کے جو جذبات ابھر کر سامنے آتے ہیں، وہ لائق داد و تحسین ہیں۔ گو کہ دونوں حضرات کے طریق جنگ منفرد ہیں۔ علامہ نے تیسرے شعر میں چنگ کا قافیہ صرف کیا ہے۔ (چنگ = ستار جیسا ایک ساز، جو اب رائج نہیں) یہاں موصوف کا اشارہ اپنے منفرد آہنگ و اسلوب کی طرح ہے جسے انھوں نے بہت خوب صورتی سے نظم کیا ہے۔ نہ تو حنفی صاحب نے دنگ کا قافیہ صرف کیا نہ ہی حضرت ناوکؔ نے سر دنگ کا۔ اپنی غزل کے دوسرے شعر میں پروفیسر حنفی نے سر دنگ کا قافیہ جس خوب صورتی اور پر اثر طریقے سے نظم کیا ہے وہ بہت عمدہ ہے۔ کوتاہ نظر راقم نے کبھی ایسے امتزاج کے ساتھ یہ لفظ نہ تو نثر میں دیکھا ہے نہ ہی نظم میں۔ الفاظ کی یہ ترکیب بے شک موصوف کی اپنی ایجاد ہے جو لائق ستائش ہے۔ پہلے مصرعے میں زمین کا اپنا ہم رقص اور دوسرے میں آسمان کا ان کے ساتھ ہم رقص ہونا، تمام دیگر شعری صنعتوں کے ساتھ ایک الگ طرح کا سرور و کیفیت اور تلذذ کا محور نظر آتا ہے۔ اپنی غزل کے چوتھے شعر میں حضرت ناوکؔ نے دنگ کا قافیہ ایسی حسن و خوبی سے نظم کیا ہے کہ عدو کی قید کیا، قارئین بھی دنگ رہ جائیں۔ شوق شہادت کا ایسا جذبہ دل اور دماغ کی گہرائیوں کی ہی آواز ہو سکتا ہے۔ موصوف کا یہ شعور شاعری ''از دل خیزد بر دل ریزد'' جیسی کیفیت رکھتا ہے۔ پروفیسر مظفرؔ کی غزل کا چوتھا شعر تغزل کی بہترین مثال ہے۔ اردو شاعری میں تغزل کی مثال کے لیے ایسے ہی

معیاری اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔ ''رنگ، آہنگ وغیرہ کے ساتھ زنگ ایک عام سا قافیہ ہے مگر اس قافیہ کو پروفیسر حنفی صاحب نے درج بالا غزل کے تیسرے شعر میں آئینے کے ساتھ استعمال کیا ہے، جو اس کی مناسبت کے موافق ہے۔ علامہ نے مقطع کے خوب صورت شعر میں حریفوں کی جانب سے قافیہ کی تنگی کا جو الزام محاورے کے ساتھ نظم کیا ہے وہ اس شعر کی روانی بڑھاتا ہے۔ جب کہ زنگ جیسے عام قافیہ سے بے اعتنائی برتی ہے۔ قیاس ہوتا ہے کہ اگر علامہ نے یہ قافیہ نظم کیا ہوتا تو ان کی فکر بھی آئینے کو ہی درمیان لاتی۔ محترم مظفرؔ صاحب نے نام و ننگ کا قافیہ جس تغزلانہ حسن اور الفاظ کے بہترین امتزاج کے ساتھ پیش کیا ہے وہ ہر کسی کو نصیب نہیں۔ اس درجہ سلاست اور روانی کے ساتھ البتہ کے روزمرہ کا استعمال قابل داد و تحسین ہے۔ علامہ نے نہ جانے کیوں نام و ننگ کا قافیہ صرف ہی نہیں کیا جب کہ یہ لفظ عام ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر انھوں نے بھی یہ قافیہ نظم کیا ہوتا تو بے شک ان کا شعر بھی اس قافیہ کے ساتھ منفرد رنگ و آہنگ رکھتا۔ اس کے بعد دونوں حضرات کی غزل کا پانچواں شعر ملاحظہ ہو جس میں دونوں حضرات نے شوخ و شنگ کا قافیہ نہایت خوش اسلوبی سے نظم کیا ہے۔ پروفیسر مظفر حنفی کے شعر کے اولیٰ مصرعے میں کسمپرسی کو محاورہ 'نقار خانے کی طوطی' کے ساتھ مصرعہ ثانی میں غزل کا فریادی اسلوب جس شوخی و ظرافت اور دیگر شعری صنعتوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے وہ طرز بیان موصوف کی منفرد تخیلی پرواز سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ یہ شعر کس قدر ڈوب کر کہا گیا ہے، اس کا اندازہ صرف محسوسات اور غور و فکر پر ہی مبنی ہے۔ علامہ کا انداز بھی کیا خوب اور منفرد ہے۔ کس اعلیٰ درجہ کا تغزل اس صورت پیش کیا ہے کہ خود لب گور اور قیاس آرائی کہ معشوق بے باک و طرار ہے۔ اس غزل کے چھٹے شعر میں دونوں حضرات نے تنگ کا قافیہ نہایت حسن و خوبی سے ضم کیا ہے۔ اگر پروفیسر حنفی نے سینے میں اٹھتے زلزلے کے ساتھ خداوند کریم سے جسم کے جامے کی تنگی اور بے کس کی فریاد کے ساتھ اس شعر کو خوش رنگ بنایا ہے تو علامہ نے اسی طرح خوب صورت مناسبت کے ساتھ دل کا مرض اور سانس لینے کے دو بھر ہونے کا حسین امتزاج پیش کیا ہے۔ ('تنفس' کے معنی ہی 'دمہ' کا مرض ہوتا ہے) غزل ہو یا نظم، قصیدہ ہو یا نعت شریف، بیشتر کے مقطع میں شعرا حضرات اپنے تعارف، اپنی دلی کیفیت کا بیان، دعائے خیر یا پھر اسی قسم کی روداد بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں دونوں حضرات نے اپنے مقطع کے اشعار میں وہی روایت دہرائی ہے۔ جناب مظفرؔ صاحب نے اولیٰ مصرعے میں غزل گوئی پر طبع آزمائی میں اپنی عمر ضائع ہونے کی شکایت کے ساتھ اس کا اعتراف کیا ہے کہ غزل گوئی میں عمر تو ضائع ہو گئی مگر خوشی اس بات کی ہے کہ میں نے کسی کی تقلید نہیں کی۔ میری آواز، میرا آہنگ سب کچھ منفرد ہے جب کہ علامہ ناوکؔ صاحب حاسدوں کو نشانہ بنا کر فرماتے ہیں کہ جو لوگ میری شاعری کو کمزور تصور کرتے ہیں وہ غلط ہیں۔ اس مقام پر موصوف نے 'بے پر کی اڑانے' والی کہاوت کو بھی نہایت خوش اسلوبی سے اس غزل کے قافیہ میں ضم کیا ہے جو لائق داد و تحسین ہے۔

ہم عصر تشخص کا تقابلی جائزہ کوتاہ نظر راقم السطور کے لیے قدرے مشکل کام تھا۔ خاص طور پر ان حالات میں جب دونوں ادیب بڑے اور منفرد ہوں۔ ان حالات میں خود کو ناقدین اور مبصرین کے ہدف سے بچا لینا تقابلی جائزے سے بھی مشکل کام ہے۔ جب علامہ ناوک حمزہ پوری صاحب کو اس امر کی اطلاع ملی تو راقم کی مدد کی غرض سے موصوف نے اپنی درجن بھر کتب بذریعہ ڈاک ارسال فرمائیں اور متعدد مرتبہ فون کر کے اور خط کے ذریعہ بار بار ایک ہی ہدایت فرماتے رہے کہ: ''...... پروفیسر مظفر حنفی صاحب بڑے اور منفرد ادیب ہیں۔ ان کا رنگ و آہنگ خاص اور معیاری ہے۔ وہ پروفیسر ہیں اور متعدد بڑے عہدوں پر فائز بھی رہ چکے ہیں۔ تقابلی جائزے میں اس بات کا خیال ہر سطر میں رکھا جائے......''

علامہ نے یہ باتیں درست فرمائی ہیں جو موصوف کی منکسر مزاجی کی مستند دلیل ہیں۔ راقم السطور نے علامہ کے اس حکم کی تعمیل اور ہدایت پر عمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر چہ پروفیسر مظفر حنفی صاحب نے نظم و نثر میں تقریباً ۸۳ رکتب کی تخلیق کی ہے جس میں نقد، تبصرہ، ترجمہ، شعری مجموعے، افسانہ، فکاہیہ، غزل، نظم اور قطعات وغیرہ شامل ہیں، علامہ ناوک حمزہ پوری صاحب بھی ۸۱ بہترین کتب کے خالق ہیں۔ راقم نے جس حد تک علامہ کو پڑھا ہے اس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ موصوف سے اردو ادب کی کوئی پسندیدہ صنف سخن چھوٹی نہیں۔ انھوں نے اردو کی ہر اصناف پر کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے۔ ان سب کے علاوہ موصوف کی ایک اور منفرد خوبی یہ بھی ہے کہ وہ فارسی شاعری پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ موصوف کی فارسی بھی نہایت رواں اور سلیس ہونے کے ساتھ بامحاورہ ہے۔ ان کی فارسی شاعری میں بھی اردو کے مانند جا بجا سہل ممتنع کے بہترین نمونے بآسانی دستیاب ہو جاتے ہیں۔ دونوں حضرات یکتا ہیں۔ اپنے کلام پر صف اول کے ناقدین و مبصرین سے داد شہادت لکھوا لینے کی صلاحیت دونوں میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان کی صفائی بیان، لطافت، شوخی اور حسن تغزل کی دنیا قائل ہے۔ فصاحت ایسی جو کانوں میں امرت رس گھولے اور بامحاورہ زبان کو اس خوب صورتی سے شعری جامہ پہناتے ہیں کہ کلام میں کہیں بھی جھول نہیں آنے پاتا۔ ان حضرات کے بیشتر اشعار پر اساتذہ کی زبان سے بھی از خود 'واہ' نکل پڑتا ہے۔

اپنی فصیح و بلیغ زبان میں جہاں تہاں ضرورت کے لحاظ سے رائج الوقت فصیح و رواں ہندی الفاظ کا استعمال بھی اس حسن و خوبی سے کرتے ہیں کہ قارئین کو احساس تک نہیں ہوتا کہ ان کی نگاہوں سے ہندی الفاظ اور فارسی تراکیب کب گزر گئیں۔ دونوں حضرات نے بیشتر مضامین کو خوب صورت تشبیہات اور استعارے کے ساتھ اس طرح ادا کیا ہے کہ وہ اکثر معشوق کی ادا نظر آتے ہیں۔ ان حضرات نے اکثر مقام پر مطالب کو بھی اشاروں اور کنایوں میں صفحہ قرطاس کی زینت بنایا ہے۔ اپنے لیے علامہ کی شفقتوں اور کتابی امداد کے لیے میں ان کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اگر موصوف مجھے کتب ارسال نہ فرماتے تو صرف رسائل میں شائع ان کے

مضامین اور غزلوں کی مدد سے راقم کو مضمون لکھنے میں اتنی آسانی ہرگز نہ ہوتی۔ مضمون لکھنے میں آسانی کی غرض سے راقم نے پروفیسر حنفی صاحب سے بھی ٹیلیفون پر رابطہ قائم کرنا چاہا تو موصوف کے لائق و فائق صاحبزادے فیروز مظفر نے اطلاع دی کہ ''پاپا ملک سے باہر تشریف رکھتے ہیں۔'' فیروز میاں نے موصوف کے تعلق سے کچھ مواد راقم کو ای میل بھی کیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ ''پاپا کا ماننا یہ ہے کہ اگر وسیم کو مضمون لکھنا ہے تو وہ از خود سعی کریں، اس میں مدد کیا معنی رکھتی ہے۔'' چنانچہ راقم نے (ای میل پر موجود جو کچھ بھی رہا ہو، اسے دیکھے بغیر ڈیلیٹ کر دیا) انھیں کتب، رسائل میں موجود مضامین، غزلوں، نظموں اور دیگر مواد کی مدد سے یہ کام پورا کیا، الحمدللہ۔ پھر بھی اس مضمون کے اختتام پر میں فیروز میاں کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں، مگر نہیں۔ ان کے لیے تو دعا گو ہوں کہ خداوند کریم انھیں اچھی صحت اور کامیاب زندگی عطا فرمائے اور اپنی کارکردگی سے اپنے آبا و اجداد کے نام روشن کریں۔ آمین۔

OOO

حوالہ جات:

۱۔ ایک تھا شاعر، شمس الرحمن فاروقی، جدید ادب، جرمنی، شمارہ ۱۲، جنوری تا جون ۲۰۰۹ء، ص ۵۷

۲۔ شاؔد عارفی کی عشقیہ نظمیں، مظفر حنفی، کاروان ادب ۲۴، سہ ماہی، بھوپال، ص ۴۸

۳۔ ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ، قرۃ العین حیدر نمبر، فروری تا مارچ، ۲۰۰۹ء، مضمون: عینی اور اردو فکشن

۴۔ ایضاً، مضمون: عینی اور اردو فکشن

۵۔ ایضاً، مضمون: عینی اور اردو فکشن

۶۔ ایضاً، مضمون: عینی اور اردو فکشن

۷۔ ایضاً، مضمون: عینی اور اردو فکشن

مصاحبہ

گلزار جاوید
پاکستان

براہ راست

اب دل پر ہاتھ رکھیے یا تھامیے جگر کو، حقیقت یہ اپنی جگہ اٹل ہے کہ تیسری دنیا بلکہ کرۂ ارض کے کونے کونے میں لکھی، پڑھی، بولی جانے والی اردو زبان کا شمار کسی طور پر ترقی یافتہ زبانوں میں نہیں کیا جاتا، وگرنہ یہ کیوں کر ممکن تھا کہ جس زبان نے میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ جیسے نادر و نایاب نگینے تلاشے اور تراشے آج وہی زبان اپنے جواہر پاروں کو پڑھوانے اور منوانے کو ترس رہی ہو!

پروفیسر مظفر حنفی اپنے دور کے میرؔ ہیں نہ غالبؔ اور نہ پروفیسر صاحب کو اقبال کی ہمسری کا دعویٰ ہے۔ دعویٰ اگر ہے تو اپنے دور کے انسان اور اس پر گزرنے والی المنا کی کے بیان کا ہے جس کا انداز اچھوتا بھی ہے، انوکھا بھی ہے اور نرالا بھی۔ سوال پھر اس قدر اچھوتے، انوکھے اور نرالے ادب پاروں کی ترویج و ابلاغ کا ہمارے سامنے آ کھڑا ہے۔ کیا اردو ادب سے وابستہ انگلیوں پر شمار کردہ لوگ اس قدر علمی، ادبی اور شعری سرمائے کی امانت و دیانت کا بار اٹھانے کے متحمل ہو سکیں گے اور کب تک ہو سکیں گے۔

کچھ دیر کو مستقبل کے خدشات سے قطع تعلق کرتے ہوئے آج کی مہلت کو غنیمت جانیے اور پروفیسر مظفر حنفی سے کچھ اس طور پر ہم کلام ہو جائیے کہ ساٹھ دہائیوں کی فنی ریاضت کا ثمر حق بہ حق دار پہنچے اور کچھ دیر کے لیے ہمارے دل، دماغ اور اعصاب تازگی، تراوٹ اور توانائی سے فیض یاب ہو سکیں، اس کی ضرورت ہمیں جس قدر آج ہے شاید اس سے پہلے کبھی نہ تھی!!!

....

گلزار جاوید: بچپن، لڑکپن اور نوجوانی کے ان ایام کی تھوڑی سی جھلک دکھلایئے جن کے زیر اثر کھولتا ہوا لاوا سینے سے ابل ابل کر باہر آیا کرتا تھا؟

مظفر حنفی: میاں میرا بچپن، لڑکپن اور جوانی سبھی معاشرتی جبر اور سماجی بے انصافیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے گزرے ہیں، ان کی تفصیل آپ کے بہت سے صفحات گھیر لے گی۔ اجمالاً عرض ہے کہ پرائمری اور مڈل اسکول کا زمانہ انتہائی عسرت میں بسر ہوا۔ والد صاحب کھنڈوا میں پرائمری اسکول کے ٹیچر تھے۔ والدہ تین بیٹیوں اور ایک بیٹے کے ساتھ آبائی وطن ہسوہ (فتح پور) میں رہنے پر مصر تھیں۔ کھنڈوہ سے دس روپے کا منی آرڈر ہر مہینے آتا تھا جس میں ہم پانچ نفر مہینے بھر تنگی ترشی میں بسر کرتے تھے۔ اس افلاس زدگی کے عالم میں مڈل اسکول بورڈ کے امتحان میں ضلع کے پچیس ممتاز طلبہ کی لسٹ میں میرا نام بھی تیسرے مقام پر تھا۔ اس دوران میں خدا انھیں جوار رحمت میں جگہ دے، والد صاحب ملازمت سے ریٹائر ہو گئے۔ تایازاد بھائی کا کھنڈوہ میں بہت بڑا کاروبار تھا، مزید تعلیم دلانے کے بہانے موصوف نے مجھے اپنے ساتھ رکھ لیا اور پھر کم سنی میں ہی مجھے اپنے کاروبار کے کولہو میں جوت دیا۔ پڑھنے لکھنے اور اسکول کا کام کرنے کے لیے وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ یہ سلسلہ چھ برسوں تک چلا بمشکل ہائر سیکنڈری اسکول کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا اور ۱۹۵۲ میں کانپور چلا آیا جہاں بہت تکلیفیں جھیل کر دو برس تک ملازمت کی تلاش میں بھٹکنے اور ناکام رہنے کے بعد کہیں بھوپال میں مڈل اسکول ٹیچر کی حیثیت سے تقرر ملا۔ پوسٹنگ بے حد دور جنگلی اور دلدلی علاقہ میں ہوئی۔ متعصب اور تنگ نظر افسروں کی زیادتیوں کے خلاف احتجاجاً تین برس بعد میں نے استعفا دے دیا۔ کھنڈوہ میں تایازاد بھائی فضول خرچی اور جہالت کے سبب لاکھوں کے مقروض ہو گئے تھے، خوشامد کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ سخت محنت اور جانفشانی سے ان کا کاروبار دوبارہ مستحکم کیا پھر میری شادی ہو گئی اور والدین کی خواہش کے مطابق دوبارہ ملازمت کی۔ چودہ برس تک محکمۂ جنگلات میں کلرک رہ کر ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی اور پی ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ قلیل تنخواہ میں والدین، بیوہ بہن اور ان کے بیٹے نیز چھوٹی بہن کی کفالت کے ساتھ اپنے بیوی بچوں کی پرورش، مزید برآں منجھلی بہن کی افلاس زدہ حالت میں اعانت، پھر چھوٹی بہن کی شادی، خوشدامن کے کینسر کا علاج وغیرہ۔ خاصے پاپڑ بیلنے پڑے۔ کہیں ۱۹۷۴ میں جا کر بہتر ملازمت نصیب ہوئی تو چین کی سانس لی۔ ان حالات میں سینے سے کھولتے ہوئے لاوے کا ابلنا فطری تھا سو ابلا کرتا تھا۔

گلزار جاوید: حافظے پر زور دیتے ہوئے ان اسباب کی بابت کچھ بتلائیے جن کے تحت آپ نے ابتدا بچوں کے ادب سے کی۔ مثلاً کیا لکھا، کہاں چھپا اور کس قسم کا ردعمل ہوا؟

مظفر حنفی: کہانیاں، داستانیں پڑھنے کا شوق لڑکپن سے ہی جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ بارہ تیرہ برس کی عمر میں عین امتحان کے زمانے میں والد مرحوم نے طلسم ہوشربا پڑھتے ہوئے پکڑ لیا۔ خاصی سرزنش کی اور یہ بھی کہا کہ ایسا ہی شوق ہے تو پڑھ لکھ کر اس لائق بنو کہ تم لکھو اور دوسرے پڑھیں چنانچہ اسی وقت سے چل میرے خامہ بسم اللہ...... دہلی سے بچوں کا رسالہ 'کھلونا' نیا نیا جاری ہوا تھا۔ بچوں کے لیے میرے تحریر کردہ لطیفے، کہانیاں، نظمیں اولاً اسی پرچے میں چھپیں، پھر 'پھلواری' دہلی، 'ٹافی' مالیگاؤں، 'کلیاں' لکھنؤ، 'دوست' کراچی اور ہندو پاک کے دوسرے بچوں کے رسالوں کے لیے خوب خوب لکھا۔ لڑکپن میں ہی معروف ہو جانے کی وجہ سے جب ۱۹۵۳ کے آس پاس بڑوں کے لیے افسانے، غزلیں وغیرہ لکھنے کی ابتدا کی تو معیاری رسالوں میں کسی دشواری کے بغیر شائع ہونے لگا۔ نقاد تو ادب اطفال کو آج بھی اہمیت نہیں دیتے، لیکن مقام شکر ہے کہ حکومت ہند کی مطبوعہ درسی کتب سے لے کر دیگر کئی صوبوں کی درسی کتابوں میں میری تخلیقات شامل ہیں۔ ادب اطفال پر میرے متعدد تنقیدی اور تحقیقی مضامین کو حوالہ جاتی اہمیت حاصل ہے۔ اپنی نگرانی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بچوں کے ادب پر ایک ضخیم تحقیقی مقالہ بھی مکمل کرا چکا ہوں اور اب بھی بچوں کے لیے نظمیں وغیرہ لکھتا رہتا ہوں۔

گلزار جاوید: کھنڈوہ بوائز اسکول کی تحریک چلانے کے محرکات کیا تھے؟

مظفر حنفی: ۱۹۴۷ میں میں کھنڈوہ کے موتی لال نہرو مڈل اسکول کے اردو سیکشن میں پڑھتا تھا، آٹھویں کے امتحان میں تمام شہر کے مڈل اسکولوں کے اردو، انگریزی، ہندی، مراٹھی میڈیم سے آٹھویں پاس کرنے والے طلبہ میں اول پوزیشن حاصل کی اور سونی پرائز وصول کیا، لیکن تقسیم ہند کے بعد نویں جماعت میں اردو میڈیم سے پڑھنے کا سلسلہ بند ہو گیا۔ مجبوراً ہندی سیکشن میں داخلہ لیا اور ہائر سیکنڈری بمشکل سیکنڈ ڈویژن میں پاس کر سکا۔ میرے بہت سے ساتھیوں کی تعلیم کا سلسلہ ہی منقطع ہو گیا۔ اس تلخ تجربے کی یادیں بھی سینے میں لاوے کی طرح جوش کھا رہی تھیں، اس لیے ۱۹۵۸ میں جب دوبارہ کھنڈوہ پہنچا تو اپنے زخم خوردہ کچھ ساتھیوں کی مدد سے وہاں اردو کے لیے بڑے پیمانے پر تحریک چلائی اور بڑی جد و جہد کے بعد اردو بوائز سیکنڈری اسکول قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔ آگے چل کر وہاں میرے انھیں ساتھیوں میں سے قاضی حسن رضا نے جواہر لال اردو ہائی اسکول بھی قائم کیا۔

گلزار جاوید: 'نئے چراغ' کا اجرا کس تحریک اور تعاون پر ہوا اور اس کا انجام کیا ہوا؟

مظفر حنفی: اردو تحریک کو طاقتور بنانے کے لیے ہم لوگوں نے کھنڈوہ میں نیشنل اردو لائبریری قائم کی اور رسالہ 'نئے چراغ' کا اجرا عمل میں آیا۔ یہ ہندوستان میں (شب خون سے آٹھ برس پہلے) صحت مند جدیدیت کا ترجمان تھا۔ یہ محض ڈیڑھ دو برس جاری رہا اور شادی کے بعد میرے کھنڈوہ سے چلے آنے کی وجہ سے بند ہو گیا۔

گلزار جاوید: انجمن ترقی اردو (ہند) کی شاخ کھولنے کا خیال کیوں کر آیا اور اس تجربے میں کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے؟

مظفر حنفی: انجمن ترقی اردو (ہند) کی کھنڈوہ میں شاخ کھولنے کا سبب بھی اردو تحریک تھی۔ اس پلیٹ فارم سے میں نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے عوام میں اتنا جوش بھر دیا کہ کھنڈوہ کے قرب و جوار میں کئی ان پڑھ کسانوں نے اردو اسکول کھولنے کے لیے اپنی زمینیں وقف کر دیں اور ہم لوگ وہاں دیہاتوں میں درجنوں اردو

پرائمری اسکول اور چند مڈل اسکول کھولنے میں کامیاب ہوئے۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ ہمارے نوجوان ساتھیوں میں سے اکثر کی سائیکلیں، گھڑیاں اور دوسرا قیمتی سامان اردو تحریک کو جاری رکھنے کے لیے بکتا رہا۔

گلزار جاوید: اردو ادب کی تمام اصناف پر حاوی شخص کاشت کاری اور پولٹری فارمنگ کی جانب کیوں کر رجوع ہوتا ہے اور اس کا انجام کیا ہوتا ہے؟

مظفر حنفی: میاں گلزار! ابتدائی زندگی پریشانیوں اور بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں کا حال آپ پر روشن ہو چکا ہے اسی مالی پریشانی کو کم کرنے کے لیے میں نے تقریباً چالیس ایکڑ بنجر زمین کو آباد کرنے کی کوشش کی اور کئی سال تک جانفشانی کے بعد نقصان اٹھا کر وہ زمین فروخت کرنی پڑی۔ پولٹری فارمنگ تو کلکتہ یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد وقت گزاری کے لیے شروع کی تھی لیکن ضرورت سے زیادہ پرجوش ہونے کے باعث کام بڑے پیمانے پر شروع کیا اور تقریباً پچاس ہزار چوزے بیک وقت فارم میں ڈال لیے، نتیجہ ناتجربہ کاری کے صلے میں صفر رہا۔ اسی اثنا میں برڈ فلو کی آفت نازل ہوئی، کئی لاکھ کا نقصان اٹھایا لیکن زمین کی قیمت میں اضافے کی وجہ سے اس کی بھرپائی ہو گئی البتہ باور کیجیے کہ کاشت کاری اور پولٹری فارمنگ کرتے ہوئے جن تجربات سے گزرا انھوں نے میری تخلیقی صلاحیتوں کو بڑی تقویت پہنچائی۔

گلزار جاوید: آپ خود کو پانچواں درویش کن معنوں میں مانتے ہیں؟

مظفر حنفی: جواب میں دو شعر ملاحظہ ہوں۔

پانچواں درویش ہوں، مجھ سے سنو　　اک نیا افسانۂ باغ و بہار
اور پھر پانچویں درویش کی باری آئی　　باغ افسانہ میں ندرت کی سواری آئی

سو اس نئے افسانہ باغ و بہار کی تلاش اور تخلیقی ندرت کی جستجو نے پانچواں درویش بنا دیا۔ آپ جانتے ہیں روایتی چار درویش تو قدیم داستانیں ہی سنا سکتے تھے۔

گلزار جاوید: ڈاکٹر صاحب! آپ کی پوری زندگی کام اور کام سے عبارت ہے، اس کے باوجود آپ کے تجربات کا بڑا چرچا ہوا کرتا ہے۔ کب، کہاں، کیسے ان تجربات کا موقع میسر آیا، آپ کی شادی بھی کم عمری میں ہو چکی تھی؟

مظفر حنفی: اسے مبالغہ نہ سمجھیے، میرے لیے تخلیقی کام کے بغیر زندگی گزارنا دشوار ہے، بقول کسے اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے۔ شعر کہنا میرے تئیں سانس لینے کی طرح ناگزیر ہے۔ جب صورت حال یہ ہو تو وقت کی تنگی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اکثر یوں ہوا کہ رات کو سوتے سے چونک پڑے اور ڈھلے ڈھلائے شعر برآمد ہونے لگے، چنانچہ تخلیقی تجربات کے لیے پوری زندگی دستیاب تھی۔ شادی کے وقت میں تو پھر بھی تقریباً چوبیس برس کا تھا، بیگم محض پندرہ سال کی تھیں۔ یہ بھی ایک پرلطف تجربہ تھا۔

گلزار جاوید: غالباً ۱۹۵۳ میں آپ نے پہلا افسانہ تحریر کیا تھا۔ اس کی تحریک اور افسانے کے بقیہ سفر کی مختصر روداد کیا ہے نیز کرشن چندر جیسے ثقہ افسانہ نگار کی حوصلہ افزائی کے باوجود آپ اس سفر کو جاری کیوں نہ رکھ سکے؟

مظفر حنفی: جی، ادب اطفال کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری ۱۹۵۲ میں شروع کی۔ قیام کان پور میں تھا، وہاں پروفیسر ابوالخیر کشفی مرحوم کے خاندانی بزرگ دادا میاں کے مزار پر عرس ہوتا تھا۔ ملازمت کی تلاش کے دوران تلخ تجربے ہوئے تو دادا میاں کے مزار سے متعلق ایک افسانہ 'منت کی چادریں' بے ساختہ وجود میں آیا جو اس وقت کے برصغیر کے سب سے زیادہ کثیر الاشاعت رسالے 'شمع' دہلی میں چھپا، جس کے مدیر 'کھلونا' کے مالک تھے جس میں میں بچوں کے لیے تین چار برس سے لکھ رہا تھا۔ اس لیے پہلے افسانے کی اشاعت میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ۱۹۶۰ تک تقریباً ڈیڑھ سو افسانے تخلیق کیے جو ہند و پاک کے تقریباً سبھی معیاری رسائل میں شائع ہوئے ان کے تین مجموعے بھی منظر عام پر آئے جن پر توصیفی دیباچے فراق گورکھپوری، کرشن چندر اور کنہیالال کپور نے لکھے تھے۔ ۱۹۶۰ کے آس پاس جدیدیت کی رو چلی اور افسانے میں بھی پلاٹ اور کردار وغیرہ کو درکنار کرتے ہوئے تجریدیت، علامت اور رمزیت نے زور پکڑا۔ میں ان مطالبات کو غیر فطری سمجھتا تھا اس لیے غزل پر زیادہ توجہ صرف کرنے لگا جہاں رمزیت اور علامت پسندی سے حسن و خوبی پیدا ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ افسانہ نگاری سے بالکل دستبردار ہو گیا۔

گلزار جاوید: شاعری کی ابتدا اور شاد عارفی مرحوم سے تعارف، تعلق کے مراحل کب اور کیسے طے ہوئے نیز استادی شاگردی کا یہ سلسلہ کتنے عرصے پر محیط ہے اور اس عرصے میں آپ عارفی صاحب سے کیا کچھ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے؟

مظفر حنفی: جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں شاعری کی ابتدا تو لڑکپن سے ہی ہو گئی تھی لیکن زیادہ توجہ افسانہ نگاری پر تھی۔ ویسے شاد عارفی کی طنزیہ نظمیں اور غزلیں مجھے بہت پہلے سے بھاتی تھیں۔ ان سے خط و کتابت کا سلسلہ 'نئے چراغ' کی ادارت کے زمانے میں شروع ہوا۔ وہ ہمارے پرچے کے مستقل لکھنے والوں میں سے تھے۔ کچھ آگے چل کر جب میں نے افسانہ نگاری کے بجائے شاعری کو اپنا مرکز توجہ بنایا تو شاد عارفی کی باقاعدہ شاگردی اختیار کی اور نومبر ۱۹۶۲ سے فروری ۱۹۶۴ تک تقریباً چودہ مہینے ان سے اپنی تقریباً ڈیڑھ سو غزلوں پر اصلاح لی۔ یہ سب ڈاک کے وسیلے سے ہو رہا تھا۔ فروری ۱۹۶۴ میں وہ وفات پا گئے لیکن ان کی تحریروں سے آج تک سیکھتا رہتا ہوں، جو کچھ ہوں ان کی جوتیوں کے طفیل ہوں۔

ہے شاد عارفی سے مظفر کا سلسلہ　　اشعار سان چڑھ کے بہت تیز ہو گئے

تا حال سلسلہ شادیات کی نو کتابیں شائع کر چکا ہوں اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔

گلزار جاوید: آپ کے ہاں تلخی کا عنصر بہت نمایاں ہے جس کے باعث آپ کے کلام میں نوکیلا، کرارا

بلکہ مرچ مصالحے والا عنصر پایا جاتا ہے جس کے باعث احباب آپ کو طنزیات کا امام بھی کہتے ہیں۔ یہ خاص رویہ یا عمل کس چیز کا ردعمل ہے؟

مظفر حنفی: جاوید صاحب آپ نے درست فرمایا۔ بقول شاؔد عارفی ؎

دوسروں کے واقعاتِ عشق اپناتے ہیں وہ جن سخن سازوں کی اپنی داستاں کوئی نہیں

میری نگارشات میرے اپنے تجربات کی دین ہیں لیکن طرزِ اظہار وہ اختیار کیا ہے کہ آپ بیتی معلوم ہو، البتہ یہ ساری تلخی، ترشی اور کرارا پن نیم کے رس کی طرح معاشرے کی صحت کے لیے بے حد مفید ہے۔ ردعمل کے بارے میں پچھلے سوالوں کے جوابات ملاحظہ فرمائیں۔

گلزار جاوید: پروفیسر صاحب! آپ کی شاعری میں جا بجا کلاسیکی رنگ نمایاں ہونے کے باوجود آپ خود کو میرؔ، غالبؔ اور فراقؔ سے الگ گردانتے پر بضد ہیں، مگر شاؔد عارفی اور جگرؔ مراد آبادی کے اثرات سے پہلو تہی آپ کے لیے ممکن نہیں؟

مظفر حنفی: میں نے ہمیشہ کہا اور لکھا ہے کہ کوئی فن کار اس وقت تک جدید ہو ہی نہیں سکتا جب تک اسے یہ نہ معلوم ہو کہ قدیم ہے کیا۔ میرے ادبی مزاج کا خمیر اساتذہ کے کلام سے ہی اٹھا ہے جن میں میر و غالب بھی ہیں اور فراق و یگانہ بھی، لیکن جہاں تک اثر پذیری کا تعلق ہے ؎

اوروں سے تقابل نہ کرو ہے مری توہین ہاں شاد و مظفر میں کجا شاد کجا میں

گلزار جاوید: صدیوں سے اردو شاعری کی بنیاد 'عشق و محبت' پر استوار ہے۔ آپ اپنی عمارت کی نیو الگ رکھ کر ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں؟

مظفر حنفی: بقول فیض ''اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا'' میں اپنی شاعری کو دوسروں سے مختلف رکھنا چاہتا ہوں، اکثر دعا کرتا ہوں ؎

ویسے تو مظفر کی تمنائیں بہت ہیں آہنگ الٰہی مرا آہنگ الٰہی

گلزار جاوید: بسا اوقات آپ کی غزل کا لہجہ سپاٹ اور بسا اوقات کھردرا کیوں ہوا کرتا ہے؟

مظفر حنفی: سپاٹ کے لیے بسا اوقات، کی جگہ بعض اوقات کہیں تو بات بجا ہوگی۔ یوں ہے کہ لہجہ کا شعر اکثر نثری ساخت رکھتا ہے اور سہل ممتنع کا حامل ہوتا ہے نیز بادی النظر میں سادہ اور سپاٹ لگتا ہے لیکن غور کریں تو اس میں گہرے مفاہیم اور معنی کی پرتیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ کھردرے پن کا اپنا الگ ذائقہ ہے۔

گلزار جاوید: تمام تر جدت طرازی اور روشن خیالی کے باوصف کبھی کبھی روایت پرستی بھی آپ پر حملہ آور ہو کر اس طرح کے شعر کہلواتی ہے ؎

ہمیں اک نیا حوصلہ چاہیے پرانے عقیدوں پہ رندہ نہیں

مظفر حنفی: بھائی میرے اگر کوئی پرانے عقیدوں پر رندہ نہیں کرتا تو اسے روایت پرست نجار کیسے کہہ سکتے ہیں البتہ جس طرح کوئی پودا زمین چھوڑ کر خلا میں معلق نہیں رہ سکتا اسی طرح شاعر کتنا ہی منفرد اور جدید کیوں نہ ہو اپنی شعری روایت سے بے تعلق نہیں ہو سکتا۔ اہمیت برتاؤ کی ہے۔

گلزار جاوید: کئی مواقعوں پر آپ کا انداز اس قدر ناصحانہ ہوا کرتا ہے کہ اس پر مقدس صحائف کی نقل کا گمان ہونے لگتا ہے۔ مثلاً ؎

زمین تنگ پڑی میرے پائے وحشت کو تو اب خلائیں مرے نقشِ پا کی زد پر ہیں

مظفر حنفی: آپ کے حسن ظن کا شکریہ۔

گلزار جاوید: آپ غزل کی کونسی کمائی سے ناآسودہ ہیں اور ہیں تو آپ کے ہاں غزل کی کمائی کا تصور کیا ہے؟

مظفر حنفی: آپ نے میرے اس مطلع کو سوال میں تبدیل کر دیا ہے ؎

مری زمین رہی آسماں پہ چھائی ہوئی مگر غزل کی کمائی کوئی کمائی ہوئی

جواب میں ایک دوسرا مطلع سماعت فرمائیے ؎

تشویش اور زیاں کے پہلو عرضِ ہنر میں صاف
شہرت سے ہٹ کر دیکھا تو مطلع گھر میں صاف

گلزار جاوید: بقول آپ کے نئی زمین اور قافیوں کی تلاش میں آپ بڑی کاوش کیا کرتے ہیں۔ ذرا ان کی تفصیل تو بتلائیے؟

مظفر حنفی: میرا نظریہ ہے کہ غزل کا عمدہ شعر وہ ہوتا ہے جس میں کوئی نیا خیال باندھا گیا ہو یا پھر کسی نفیس پرانے مضمون کو نئے انداز میں پیش کیا گیا ہو۔ اردو میں غزل چار سو برسوں سے کہی جا رہی ہے اس لیے اب مضمون تازہ اور اسلوب نو کا حصول میرے خیال میں اسی وقت ممکن ہے جب شاعر نادر قافیوں اور انوکھی ردیفوں کے تال میل سے نئی نئی زمینیں تلاش کرے۔

گلزار جاوید: اس کے علاوہ ایک تصور یہ بھی ہے کہ آپ اپنی آواز کو بھیڑ میں گم ہونے سے بچانے کے لیے دانستہ کئی روایتی اور غیر روایتی جتن کیا کرتے ہیں؟

مظفر حنفی: جی ہاں یہ خیال حقیقت پر مبنی ہے۔

گلزار جاوید: اور ایک تاثر یہ بھی ہے کہ غزل تو آپ عام اور سادہ کہتے ہیں مگر بعد از تحریر کسی نہ کسی طور اس میں اپنا گاڑھا اور چوکھا رنگ ڈالنے کی کوشش ضرور کیا کرتے ہیں؟

مظفر حنفی: میں غزل میں زبان کو نثری ساخت سے قریب رکھ کر سہل ممتنع کی مدد سے اپنا لہجہ منفرد بنانے

کی کوشش کرتا ہوں اور تکمیل غزل کے بعد بھی اسے مسلسل مانجھتا اور چمکا تا ہوں۔ اب یہ آپ جیسے بالغ نظر اصحاب قلم بتائیں کہ رنگ کتنا چوکھا اور گاڑھا آیا ہے۔

گلزار جاوید: ''کئی بقراط شاعر پرتکلف شعر کہتے ہیں'' آپ کے فرمان میں اشارہ کس جانب ہے اور یہ پرتکلف شعر کس طرح کا ہوا کرتا ہے؟

مظفر حنفی: پرتکلف شعر سے میری مراد اس کلام سے ہے جسے شعوری طور پر صنعتوں اور رنگیں بیانیوں سے بہت زیادہ آراستہ کیا گیا ہو۔ ایسے شعروں کی تخلیق کرنے والے میرے خیال میں بقراط شاعر ہوتے ہیں۔

گلزار جاوید: کم ظرفوں کے ذکر کا تیر کس جانب چلایا کرتے ہیں؟

مظفر حنفی: جانب دار نقادوں کی طرف جو اپنے گروپ کے متشاعر کو بھی سچے اور اچھے شاعروں پر فوقیت دیتے ہیں، کیوں کہ کھرا شاعر کسی متشاعر کی طرح نقاد کی خوشامد کر ہی نہیں سکتا نہ ہی ناقدین کے جاری کردہ فرامین کو خاطر میں لاتا ہے۔

گلزار جاوید: ساری دنیا آج کے دور کو انتہائی Loud اور پرشور گردان رہی ہے جب کہ آپ اسے گونگوں بہروں کی بستی سے تشبیہ دے رہے ہیں؟

مظفر حنفی: اس چیخم دھاڑ والے نقار خانے میں سچ گفتار طوطی کی آواز نہ سننے والوں کو گونگا بہرا نہ کہوں تو کیا کروں؟ سچی اور کھری باتیں آسانی سے کون سنتا ہے اس زمانے میں۔

گلزار جاوید: ''قلم کو تیز مظفر غزل کو تیغ کرو'' کی ضرورت کب اور کیوں محسوس ہوئی؟

مظفر حنفی: ہمارے زخموں پہ دنیا نمک چھڑکتی ہے......تو ہم بھی مرچ غزل کی زباں پہ رکھتے ہیں۔ بے حسی اور سہل پسندی کے موجودہ تاجرانہ اور صنعتی معاشرے میں نشتر زنی کے بغیر کام نہیں چلنے کا۔ چکنی چپڑی عشقیہ شاعری سے سماجی معنویت کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔

گلزار جاوید: اشعار لہو میں ڈوبے ہوئے، سوچ پر خون کی بوچھار کن خدشات کی نشان دہی کر رہے ہیں؟

مظفر حنفی: ہمارے ملک کے فرقہ وارانہ فسادات اور معاشرے میں جاری وساری تعصب، بے انصافی اور تشدد پسندی کی طرف۔

گلزار جاوید: کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ اپنے معاشرتی اور سیاسی کرب کا سلسلہ اکثر کربلا سے جاملاتے ہیں، جب کہ یہ بیان ہوتا آپ کے گرد وپیش کا ہے مگر کوئی خوف ہے جس کے باعث آپ برملا اس کا اظہار نہیں کر پاتے؟

مظفر حنفی: بے شک کربلا کا استعارہ میری شاعری میں کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔ اکثر لوگ مجھے واشگاف لہجے کا شاعر کہتے ہیں پھر بھی غزل جیسی رمزیہ اور اشاریاتی صنف سخن میں باتیں اگر علامت کے وسیلے

سے نہ کی جائیں تو وہ وقتی اور ہنگامی نوعیت کی شاعری ہو جائے گی۔ ایسی شاعری کرنے والوں کو لوگ نعرے باز کہتے ہیں۔ برملا اظہار کے لیے میری نثری تحریریں کافی ہیں۔

گلزار جاوید: غیر جانب داری کو یار لوگ بڑی ڈھٹائی سے منافقت کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں پھر بھی آپ خود کو غیر جانب دار کہلانے پر بضد ہیں؟

مظفر حنفی: اب بقول آپ کے یار لوگوں کی ڈھٹائی سے ڈر کر، میں اپنے اصول سے کیسے منحرف ہو سکتا ہوں۔ غیر جانب دار رہنے میں سرتا سر نقصان ہے کیوں کہ ہر فریق ایسے آدمی کو فریق مخالف کا آدمی سمجھتا ہے اور کوئی اس کا حامی و مددگار بھی نہیں ہوتا۔ ایک فائدہ یہ ضرور ہے کہ آپ غیر جانب دار رہ کر وہ باتیں بے باکی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں جو آپ کے خیال میں صداقت پر مبنی ہیں۔

گلزار جاوید: ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت سے لاتعلقی کے بعد نظم جدید سے تعلق بھی تضادات والی کیفیت کا سماں پیدا کر رہی ہے؟

مظفر حنفی: کسی خاص ازم یا ادبی تحریک سے ناوابستگی کی وجہ سے ہی ممکن ہو سکا کہ ترقی پسندی، جدیدیت یا مابعد جدیدیت کی خامیوں سے محفوظ رہ کر اپنی شاعری میں اپنی بات کہی جا سکے اور ہر خوبی، خواہ وہ کہیں بھی ملے، اپنائی جا سکے۔ نظم جدید میں طبع آزمائی کرنا میرے خیال میں تو تضاد کی علامت نہیں ہے۔

گلزار جاوید: آپ کے تنقیدی رویے کی بابت ہم فقط ایک سوال آپ کے اپنے شعر کی روشنی بلکہ تشریح کے ذریعہ دریافت کرنا چاہیں گے؟

کئی نقاد عظمت بانٹتے ہیں
مظفر سر بسر انکار ہو جا

مظفر حنفی: ہمارے زمانے کے نقاد ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کے سر پر عظمت کا تاج رکھ دیتے ہیں۔ عظیم شاعر تو کہیں صدیوں میں ایک آدھ نکلتا ہے۔ اردو میں میر، غالب اور اقبال ہی عظیم شاعر ہیں چنانچہ میں نے سچے شاعروں کو مشورہ دیا ہے کہ نقاد کی عطا کردہ مصلحت آمیز عظمت کی پروا نہ کریں۔ اپنے تنقیدی مضامین میں بھی عظمتیں تقسیم کرنے کے خلاف ہوں۔ میرا مشہور شعر ہے۔

کھرا شاعر کبھی عظمت کے چکر میں نہیں رہتا
مظفر پستہ قد تنقید سر پر تاج رکھتی ہے

گلزار جاوید: شمس الرحمن فاروقی آپ کو برصغیر کا سب سے زیادہ کہنے اور چھپنے والا شاعر کہہ کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟

مظفر حنفی: اس طرح شاید میری حقیر خدمات کا اعتراف مقصود ہو۔ ویسے میں اب سے کوئی پچاس برس ادھر راولپنڈی کے بھی کئی رسالوں میں چھپتا رہا ہوں جن میں 'نیرنگ خیال' کا نام یاد آتا ہے۔ رشید امجد، سلطان رشک، ماجد الباقری مرحوم سے اسی زمانے میں آشنائی ہوئی تھی۔

گلزار جاوید: ہندی دیومالائی اور اساطیری ادب کی جانب آپ کی توجہ کب اور کیوں کر ہوئی اور اس میں آپ نے کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے اور آپ کو اس میں کس طرح کا اختصاص حاصل ہے؟

مظفر حنفی: جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے نویں جماعت کے بعد مجھے ہندی میڈیم سے پڑھنا پڑا، اس لیے ہندو دیومالا اور اساطیر سے واقفیت ہوئی۔ اسلام، صنمیات اور اساطیر کے خلاف ہے۔ اس لیے میں شاعری میں دیومالائی علامت اور ہندو اساطیر سے استفادہ کرتا رہا ہوں البتہ اس میدان میں کسی اختصاص کا دعویٰ ہرگز ہرگز نہیں ہے۔

گلزار جاوید: 'سخاروف' سے آپ کا تعارف کب اور کیسے ہوا اور ان کی کتاب کے ترجمے کا خیال کیوں کر آیا۔ اس کے علاوہ آپ کن غیر ملکی ادیبوں اور شاعروں سے ہم کلام ہوئے اور آپ کے ہاں ان کے افکار و خیالات کا برتاؤ کس رنگ میں ظاہر ہوا؟

مظفر حنفی: حضرت میں نے 'سخاروف' کے علاوہ انگریزی سے روسی مصنف سولنستین کے 'گلاگ آرچی پیلاگو' کے تین دفتر، گجراتی کے یک بابی ڈرامے، اوڑیا افسانے، بنگالی ناول اور ہندی سے کئی کتابیں اردو میں منتقل کی ہیں لیکن یہ سب معاشی ضرورتوں کے پیش نظر کیا تھا۔ افسانہ نگاری میں البتہ چیخف اور او۔ ہنری سے تاثر قبول کیا۔

گلزار جاوید: کلکتہ یونیورسٹی نے آپ کو کس اہلیت کی بنا پر اقبال چیئر کے لیے منتخب کیا۔ یعنی اس سے قبل اقبالیات کے حوالے سے آپ کے تجربات کی نوعیت کیا تھی نیز اقبال کی شاعری اور ان کے شعری مستقبل بالخصوص بھارت کے حوالے سے آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟

مظفر حنفی: مجھے بغیر کسی درخواست یا انٹرویو کے ۱۹۸۹ میں اقبال چیئر کی پروفیسری پیش کی گئی۔ اقبال پر چند مضامین میں نے ضرور لکھے ہیں لیکن مہارت کا دعویٰ نہیں کرتا البتہ کلکتہ یونیورسٹی میں میرا تیار کردہ اقبال پر ایک خصوصی پرچہ ایم۔ اے (اردو) کے نصاب میں شامل کیا گیا جو تمام طلبہ کے لیے لازمی تھا۔ کئی ریسرچ اسکالروں سے اس موضوع پر تحقیقی مقالات مکمل کرائے۔ اقبال کے نظریات اور کلام سے ۱۹۶۰ تک ہندوستان میں بلاشبہ بے اعتنائی برتی گئی لیکن اب تو ہماری سبھی دانشگاہوں میں سب سے زیادہ کام اقبال کے فکر و فن پر ہو رہا ہے۔ البتہ یہاں انھیں فلسفی اور مفکر سے زیادہ شاعر کی حیثیت سے اہمیت دی جاتی ہے اور ان کا شعری مستقبل ہندوستان میں بے حد روشن ہے۔

گلزار جاوید: اپنی ذات کی تلاش کا سفر آپ کے ہاں مدت سے جاری ہے مگر کوئی اس کے ثمر کی بابت نہیں جان پایا؟

مظفر حنفی: سچ کہا آپ نے۔ حکیم الامت نے بھی زندگی بھر کی تلاش کے بعد کہا تھا۔ اقبال بھی اقبال

سے آگاہ نہیں ہے۔ وہی حال میرا ہے البتہ ۔

طرز تعمیر کے کچھ نئے زاویے عصر نو کو مظفر نے بخشے تو ہیں
اپنی ہی ذات پر وار کرتے ہوئے اپنی ہستی کو مسمار کرتے ہوئے

گلزار جاوید: ڈاکٹر صاحب! کچھ اندازہ ہے کہ انڈیا اور انڈیا سے باہر آپ کی شخصیت اور فن پر کہاں کہاں کس نوعیت کا کام ہو رہا ہے اور آپ کا کلام کن زبانوں میں منتقل ہو سکا یا ہو رہا ہے؟

مظفر حنفی: جی، ہندوستان میں دو محققین کو پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری میری ناچیز شخصیت اور ادبی خدمات کے متعلق تحریر کردہ تحقیقی مقالوں پر مل چکی ہے جن میں سے محبوب راہی کا مقالہ کتابی صورت میں ۱۹۸۴ میں شائع ہوا تھا جو بقول وزیر آغا کسی ادبی شخصیت پر اس کے دوران حیات شائع ہونے والا پی ایچ۔ ڈی کا اولین مقالہ تھا۔ دو دیگر یونیورسٹیوں میں کام جاری ہے۔ پاکستان میں خواجہ طارق محمود نے میری تقریباً سوا سو غزلوں کو غزل کی ہیئت کے ساتھ انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ حسرت موہانی اور محمد حسین آزاد پر میری کتابیں انگریزی اور ہندی کے علاوہ چند دیگر علاقائی زبانوں میں ترجمہ ہوئی ہیں۔ بہت سی نظمیں اور غزلیں انگریزی، ہندی، گجراتی، مراٹھی، بنگلہ، پنجابی وغیرہ میں منتقل کی جا چکی ہیں۔ ایک آدھ مضمون اور غزل جرمن اور ترکی زبان میں بھی ترجمہ کی گئی ہے۔

گلزار جاوید: حنفی صاحب! جس قدر وقت اور توانائی آپ نے اردو ادب پر صرف کی اور جس قدر گراں مایہ کام سرانجام دیا اس کے بدلے آپ کیا توقعات باندھے ہوئے ہیں؟

مظفر حنفی: نادان ہوں، جریدۂ عالم پر دوام ما ثبت دیکھنا چاہتا ہوں لیکن یہ شعر بھی میرا ہی ہے ۔

پلٹ کر دیکھنے میں راہ کھوٹی ہوگئی میری
چراغاں سا یہ کیا سارے نقوش پا میں روشن ہے

گلزار جاوید: آنے والے وقت میں ہندوستان بلکہ برصغیر میں اردو زبان و ادب کا مستقبل کیا دیکھ رہے ہیں؟

مظفر حنفی: روشن اور خوش آئند، مجھے یقین ہے کہ آج نہیں تو کل ہندوستان بھر میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملے گا اور پاکستان میں یہ سرکاری زبان کے طور پر رائج ہوگی۔ دونوں طرف ادب میں ترقی کی رفتار اطمینان بخش ہے۔

گلزار جاوید: اردو کی نئی بستیاں امریکا، برطانیہ، کنیڈا، مشرق وسطیٰ وغیرہ سے کس قسم کی توقعات باندھی جا سکتی ہیں؟

مظفر حنفی: پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ۔ ہمارے نئی بستیوں میں بسنے والے تارکین وطن کے بچے عموماً اردو سمجھ تو لیتے ہیں، بولتے نہیں ہیں۔ اس طرف توجہ کی ضرورت ہے۔

گلزار جاوید: گزشتہ دنوں ڈاکٹر گیان چند جین نے اردو زبان کو ایک فرقے سے منسوب کرنے کی جو کوشش کی اس کی بابت آپ کی رائے اور اردو کے رسم الخط کو تبدیل کرنے کی جو مذموم کوششیں ہو رہی ہیں اس کی نسبت آپ کی پوزیشن کیا ہے؟

مظفر حنفی: جین صاحب سے میرے ذاتی مراسم رہے ہیں اور وہ میری شاعری کے مداحوں میں سے تھے۔ میں بھی ان کے تحقیقی کاموں کی قدر کرتا ہوں لیکن اپنی آخری کتاب 'ایک بھاشا، دولکھاوٹ، دوادب' میں انھوں نے انتہائی تعصب آمیز رویہ اختیار کیا جس کی میں نے بھی پرزور مذمت کی۔ رسم الخط کو تبدیل کرنے کی کاوشیں اب دم توڑ چکی ہیں۔ یہ ویسی ہی فرمائش تھی جیسے کسی زندہ انسان کی کھال اتار کر دوسری پہنانے کی کوشش کی جائے، افسوس تو اس بات کا ہے کہ دوسروں کے ساتھ کچھ اردو کے بڑے نام بھی رسم الخط کی تبدیلی کے حق میں تھے مثلاً پروفیسر احتشام حسین، سردار جعفری، کرشن چندر، عصمت چغتائی وغیرہ۔ ظاہر ہے میں نے اس تجویز کی جی توڑ مخالفت کی تھی۔ البتہ تقسیم ہند سے آٹھ دس سال پیشتر گاندھی جی نے تجویز رکھی تھی کہ آزاد ہندوستان کی سرکاری زبان ہندوستانی (اردو اور ہندی) ہو جو فارسی اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہاں اردو، ہندی پر حاوی رہتی لیکن مولوی عبدالحق نے اس تجویز کو تسلیم نہیں کیا۔ خیر یہ سب گزرے وقتوں کی باتیں ہیں۔

گلزار جاوید: ڈاکٹر صاحب! زیر نظر سوالنامہ ہم نے نہایت دیانت داری اور غیر جانب داری سے مرتب کیا ہے مگر اس کے نمائندہ ہونے کا ہرگز دعویٰ نہیں کر سکتے۔ کسی خاص موضوع یا نکتے کے حوالے سے اگر آپ اظہار خیال فرمانا پسند کریں تو چشم ماروشن، دل ماشاد۔

مظفر حنفی: جی ہاں! باتیں بہت سی رہ گئیں لیکن ایک انٹرویو میں سب کچھ ممکن بھی نہیں ہے۔ صرف اتنا اور عرض کرنا ہے کہ خاکسار کی کوشش سے حکومت ہند کے بہت بڑے اشاعتی ادارے قومی کونسل برائے تدریسی تحقیق و تربیت (این۔سی۔ای۔آر۔ٹی) کی تیار کردہ اردو کی درسی کتب کی قیمتیں ہندی کتابوں کے مساوی رکھی گئیں، ورنہ وزارت تعلیم کے سرکلر کے مطابق ان کی قیمت آٹھ گنا سے بھی زیادہ مقرر ہوئی تھی۔ دوسری اہم خدمت یہ ہے کہ میں نے دوسرے بڑے سرکاری ادارے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی فرمائش پر بیسویں صدی کے آخری ربع میں ہندوستان بھر میں شائع ہونے والی اردو کتابوں کی وضاحتی کتابیات بائیس جلدوں میں تیار کی ہے جو شائع ہو گئی ہے۔ ان جلدوں میں تقریباً بیس ہزار کتابوں کا مختصر تعارف ہے۔

○○○

آفرین حسین، مشتاق احمد

باتیں مظفر حنفی کی (مصاحبہ)

آفرین: آپ کیوں لکھتے ہیں؟ اور ادب کی جانب کیسے مائل ہوئے؟

مظفر حنفی: کسی مچھلی کو معلوم نہیں کہ وہ پانی کے بغیر کیوں زندہ نہیں رہ سکتی اور کوئی پرندہ نہیں بتا سکتا کہ وہ کیوں چہچہاتا ہے۔ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ لکھنا پڑھنا میری زندگی کے لیے ویسا ہی ناگزیر ہے جیسے سانس لینا۔ بچپن سے ہی پڑھنے کا جنون سا تھا۔ مڈل کا امتحان قریب تھا ایسے میں والد مرحوم نے 'طلسم ہوش ربا' پڑھتے ہوئے گرفتار کر لیا۔ سرزنش کرتے ہوئے یہ بھی کہہ گئے کہ ایسا ہی شوق ہے تو تعلیم حاصل کر کے خود کچھ ایسی کتابیں لکھو جنھیں زمانہ پڑھے۔ چنانچہ چل مرے خانہ بسم اللہ۔

آفرین: سینکڑوں افسانوں اور تین افسانوی مجموعوں کے باوجود آپ نے اس صنف کو خیر باد کیوں کہا؟

مظفر حنفی: بے شک ادبی زندگی کے ابتدائی گیارہ برسوں میں کہانیاں اور افسانے زیادہ تخلیق کیے۔ ۱۹۶۰ء کے آس پاس ادب میں جدید رجحانات کا بول بالا ہوا۔ جدیدیت نے تمام اصناف ادب میں مرکزیت، اشاریت، علامت اور ابہام پر زور دیا۔ لیکن ان کی شمولیت سے شاعری، خصوصاً غزل کے نئے پر و بال مل گئے۔ مجھے تخلیق کار ہونے کے ناتے شاید بروقت احساس ہو گیا اور میں نے افسانے کی جگہ غزل کو اپنا وسیلۂ اظہار بنا لیا۔ میرا ایک مقطع ہے ؎

بری نہیں ہے مظفر کوئی بھی صنف ادب
قلم غزل کے اثر میں رہے تو اچھا ہے

آفرین: افسانوی ادب آپ کی نظر میں کیا معنی رکھتا ہے؟

مظفر حنفی: ادب میں فکشن کی اہمیت اور افادیت سے کوئی فاتر العقل ہی منکر ہو سکتا ہے۔ ہمارے ادبی سرمائے میں ایک سے ایک اچھا ناول اور افسانہ موجود ہے لیکن یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ فکشن کی عمر شاعری کی ایک چوتھائی ہے اور اس اعتبار سے اردو کا شعری ادب فکشن سے کئی گنا زیادہ بھی ہے اور وسیع بھی۔ کیا سبب ہے کہ تا حال اردو کی تینوں منتظم شخصیتیں (میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ) شعری اصناف ہی سے تعلق رکھتی ہیں!

مشتاق: ادبی تحریکات اور رجحانات سے اردو ادب کو کیا فائدہ پہنچا ہے؟

مظفرحنفی: ادبی تحریکات اور رجحانات کے وسیلے سے یقیناً ادب کو بہت سے فائدے ہوئے لیکن اس کے مضرت رساں پہلو بھی تھے مثلاً سرسید تحریک نے اردو ادب کو نئی سمت و رفتار عطا کی۔ نثر کو عام فہم، آسان بنایا۔ مغرب سے اثر پذیری کا دروازہ کھولا، اور ناول نگاری کا آغاز اور نظم کا ارتقا اسی تحریک کی دین ہے لیکن اس کے مقصدیت پر زور نے غزل چھین لی۔ حالی خود اپنی شاعری کو ابالی کھچڑی سے تعبیر کرتے تھے۔ آگے چل کر ترقی پسند ادبی تحریک نے اردو افسانے کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ آزاد غزل پر شباب اسی تحریک کے زیر اثر آیا لیکن اس کی ندرت پسندی اور مخصوص نظریے کی پیروی نے نعرہ بازی کا روگ بھی پیدا کر دیا اور اردو زبان کی آبرو کہلانے والی غزل اس تحریک کے ہاتھوں بھی بے آبرو ہوئی۔ جدیدیت کے رجحان نے علامت اور اشاریت و رمزیت پر زور دے کر غزل کو اس کی آب و تاب لوٹائی تو افسانے کو منھ بند بنا کر اسے کہانی پن سے محروم کر دیا اور نظم کو بھی اتنا مبہم بنا دیا کہ اہمال کے نزدیک پہنچ گئی۔

مشتاق: مابعد جدیدیت سے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

مظفرحنفی: جدیدیت کے لیے کہا جاتا ہے کہ یہ چند سکہ بند نقادوں کی جکڑ بندی اور تنگ نظری کے نتیجے میں رونما ہوئی تھی۔ ہندوستانی مابعد جدیدیت اپنے عہد کے دو با اثر تنقید نگاروں کی باہمی رسہ کشی کے نتیجے میں منظر عام پر آئی ہے لیکن ہر تخریب میں تعمیر اور ہر تعمیر میں تخریب کے عناصر بھی شامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ توقع ہے کہ اس کے وسیلے سے بالکل نئی نسل کو اپنی شناخت بنانے میں سہولت ہوگی۔

آفرین: ایک عمدہ شعر کی پہچان کیا ہے؟ کیا اس کے اجزائے ترکیبی ہو سکتے ہیں؟

مظفرحنفی: آفرین، جس طرح ایک اچھے انسان کی پہچان معیارات، حالات اور زمانے کے تناظر میں متعین ہوتی ہیں اسی طرح جمالیات و شعریات ادب کا معاملہ ہے۔ پھر وہ مثنوی کا ہے، نظم کا ہے، قصیدے کا ہے یا غزل کا؟ ان باتوں سے بھی فرق پڑے گا۔ بحیثیت مجموعی میں غزل کے شعر میں نئے خیال اور طرز ادا کی ندرت کو سب سے بڑا معیار قرار دیتا ہوں بشرطیکہ شعر پر تاثیر بھی ہو۔ زبان کی صحت، اسلوب کی برجستگی، فکر کی تازگی اور احساس کی شدت کو بھی اجزائے ترکیبی کی حیثیت حاصل ہے۔ صنف سخن کا تعین ہو جائے تو ان کے اجزائے ترکیبی کو علمائے ادب نے بہت پہلے متعین کر دیا ہے، ان کی پابندی کرنا ہوگا۔

مشتاق: مغربی بنگال میں نئی نسل کے شعرا کہاں تک اپنی ذمہ داریوں کو نبھا رہے ہیں؟ کیا شعر گوئی کے معاملے میں وہ محتاط اور دیانت دار ہیں؟

مظفرحنفی: بھائی آپ کا سوال بہت خطرناک ہے اور بہتوں کو مجھ سے بدظن کر سکتا ہے۔ چوں کہ میری طبیعت میں منافقت نہیں ہے، اس لیے واضح باتیں بے خوف و خطر کرتا رہتا ہوں۔ اب بھی عرض کرتا ہوں کہ

چند شعرا کو چھوڑ کر یہاں کی نئی نسل شعر گوئی کے معاملے میں خاصی غیر محتاط ہے۔ زبان کی لطافتوں اور نزاکتوں سے اکثر عدم واقفیت کا ثبوت دیتی رہتی ہے اور ادبی و تخلیقی ذمہ داریوں کے تئیں بہت لاپروا ہے۔ لیکن اس کے لیے میں نوجوانوں سے زیادہ ان سینئر شاعروں اور ادیبوں، استادوں اور کہنہ مشق اہل قلم کو ذمہ دار قرار دیتا ہوں، جنھوں نے ناجائز مقبولیت حاصل کرنے کے لیے سچ کہنے اور غلطی پر ٹوکنے کا فریضہ بروقت انجام نہیں دیا اور بے جا حوصلہ افزائی کے نام پر نئی نسل کو خام کاری پر آمادہ کرتے رہے، جس کی وجہ سے ان کی زبان بگڑ گئی، تلفظ خراب ہو گیا، گرامر سے لاعلمی ہو گئی۔ اب خراب میدے، باسی دودھ اور نقلی گھی سے اچھی مٹھائی کیسے بنائی جا سکتی ہے؟ پھر بھی دو چار شاعر نئی نسل میں ضرور ایسے نظر آتے ہیں جن سے امیدیں وابستہ ہیں۔

آفرین: افسانہ اور کہانی میں کیا فرق ہے؟ بیش تر لوگ دونوں کو ایک ہی صنف تصور کرتے ہیں؟

مظفرحنفی: میرے خیال میں کہانی، قصے اور حکایتوں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے، جس میں کوئی پرلطف اور عبرت انگیز واقعہ بیان کیا جاتا ہے، جب کہ افسانہ کسی خاص نکتے پر زور دینے کے لیے نفسیاتی دروں بینی، جذبات کی عکاسی کے لیے یا سیرت کے کسی نمایاں پہلو کو اجاگر کرنے کے لیے جنم لیتا ہے۔ لیکن ادھر چند برسوں سے اردو والوں نے کہانی کو بہ طور اصطلاح افسانے کا مترادف تسلیم کر لیا ہے، کیوں کہ ہندی میں افسانے کے لیے یہی لفظ استعمال میں آتا رہا ہے۔ اس لیے جو لوگ انھیں ایک ہی صنف تصور کرتے ہیں ان سے تعرض نہیں کرنا چاہیے۔

مشتاق: درس و تدریس کے معاملے میں کلکتہ یونیورسٹی کی فضا کو آپ نے کہاں تک ساز گار پایا؟

مظفرحنفی: مشتاق میاں، فضا خراب کیا بہت خراب تھی۔ اسے ساز گار بنانے میں جان کھپائی ہے۔ میں نے ۱۹۸۹ء میں شعبۂ اردو کی اقبال چیئر پر بحیثیت پروفیسر جوائن کیا تو عالم یہ تھا کہ ایم۔ اے (اردو) میں کل پچیس طلبا و طالبات کو داخلہ ملتا تھا۔ مہینوں کوئی کلاس نہیں ہوتی تھی۔ اساتذہ کہتے تھے کہ اسٹوڈنٹ نہیں آئے، کسے پڑھانے کے لیے کلاس میں جائیں۔ طالب علموں کا رونا تھا کہ دن بھر روم میں بیٹھ کر چلے آتے ہیں کوئی استاد زحمت ہی نہیں کرتا، پھر یونیورسٹی میں حاضری دے کر وقت کیوں ضائع کیا جائے۔ ایم۔ اے اور بی۔ اے کا نصاب آزادی کے بعد سے وہی چلا آ رہا تھا اور ہندوستان کی دیگر یونیورسٹیوں کے مقابلے میں بہت ہی کمتر معیار کا تھا۔ اساتذہ میں ٹیوشن کی لعنت جڑ پکڑ رہی تھی۔ امتحانات کے پرچے تیار کرنے سے لے کر کاپیاں جانچنے اور نتیجہ تیار کرنے کا سب کام مقامی ٹیچر کرتے تھے۔ امتحانات تین سال پچھڑے ہوئے تھے اور امتحان ہال میں نقل عام تھی۔ پی ایچ۔ ڈی کے لیے رجسٹریشن بہت ہی سطحی بلکہ ایسے فضول موضوعات پر بھی ہو جاتا تھا جن پر اخبار میں ایک آدھ کالمی مضمون لکھ دینا کافی ہوتا ہے۔ شعبے میں استاد بھی ضرورت کے اعتبار سے بہت کم تھے۔ نیز استاد و شاگرد میں اس رشتہ کا سخت فقدان تھا، جس کے بغیر تعلیم و تربیت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ گزشتہ بارہ سالوں میں فضا کتنی تبدیل ہوئی ہے اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ اب ایم۔ اے (اردو) میں

پچیس کی جگہ ۸۰ ؍امیدواروں کو داخلہ ملتا ہے۔ کلاسس پوری باقاعدگی سے ہوتی ہیں اور ۶۵ ؍فیصد سے کم حاضری پانے والے طلبا کو امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ یونیورسٹی میں میرا تیار کردہ نصاب تعلیم جاری ہوا اور اس کے معیار کو نمونہ قرار دے کر اب ہندوستان کی کئی دوسری معتبر یونیورسٹیوں نے اپنا نصاب تیار کیا ہے۔ اس کے طرز پر کالج سروس کمیشن نے مجھ سے SLET کا نصاب تیار کرنے کی ذمہ داری تفویض کی۔ بہت سے مقامی سینئر اساتذہ کی مخالفت کے باوجود میں نے بی اے (آنرس) اور پاس کورس کا نصاب بھی یکسر تبدیل کر دیا اور ہر سطح پر بنگال کے ادیبوں اور شاعروں کو نصاب میں شامل کر کے ان پرچوں کو لازمی قرار دیا گیا۔ ٹیوشن پڑھانے کے سلسلے میں اپنے قول و عمل سے اتنی بیزاری اور نفرت کا اظہار کیا کہ اب شعبے کے اساتذہ اس کے نام سے بیزار ہو چکے ہیں۔ امتحانات کو باقاعدہ کیا اور ہر سال کا امتحان بروقت ہونے لگا۔ نقل کے سلسلے میں اصولوں پر اتنی شدت سے کاربند رہا کہ یہ لعنت تقریباً ختم ہوگئی۔ ہر چند کہ مجھ پر سخت گیری کے الزامات بھی عائد کیے گئے۔ امتحانوں کے پرچے بنانے، جانچنے اور نتیجہ تیار کرنے کا ایسا سسٹم رائج کیا، جس میں ہیر پھیر کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ (سنتا ہوں کہ میرے سبک دوش ہوتے ہی پھر وہی پہلا سا طریق کار رائج کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، کیوں کہ اس میں اساتذہ اور دفتری اہل کاروں کو سہولت رہتی ہے۔) پچھلے دس بارہ برسوں میں آدھے ممتحن ہندوستان کی دیگر دانش گاہوں کے ہوتے تھے۔ پرائیوٹ امتحان دینے والے طلبا نے بھی اس مدت میں اعلیٰ پوزیشنوں سے کامیابی حاصل کی ہے۔ پرچے کے سوالات آؤٹ ہونے اور Important بتانے کی علت ختم ہوگئی۔ پیروی کرنے والے امیدواروں کی سختی سے سرزنش کی گئی اور کچھ کو سزائیں بھی ملیں۔ ان برسوں میں پی ایچ۔ ڈی کمیٹی کا کنوینر میں رہا۔ سفارش کی بنا پر کسی غیر مستحق ریسرچ اسکالر کو اس مدت میں داخلہ نہیں مل سکا اور ہمیشہ معیاری موضوعات کو ہی تحقیق کے لیے منظور کیا گیا جس کی ہندوستان بھر میں شہرت ہے۔ شعبے میں اساتذہ کی کمی سے نمٹنے کے لیے مری تگ و دو کے نتیجے میں چھ جز وقتی لکچرر فی الفور مقرر کیے گئے اور انھیں نہ صرف ریگولر اساتذہ کی طرح اہم ذمہ داریاں اور اختیار تفویض کیے گئے بلکہ اعلیٰ کمیٹیوں میں مخصوص دعوت ناموں کے ذریعہ بلا کر مشاورت میں شامل کیا گیا۔ اساتذہ اور اسٹوڈنٹ کے درمیان خوش گوار تعلق قائم کرنے کے لیے نہ صرف ایک روزہ پکنک وغیرہ کا رواج عام کیا بلکہ شعبے میں پہلی بار تقریباً تیس اسٹوڈنٹ اور چھ اساتذہ دارجلنگ وغیرہ کے ہفتہ بھر کے تفریحی سفر پر گئے۔ مزید برآں مسلسل لکھنے پڑھنے کی ایسی فضا بنائی کہ ہر سال شعبے میں استادوں میں سے کئی اپنی تصنیفات کو زیور طبع سے آراستہ کرنے لگے ہیں۔ یہ سب کیسے ممکن ہو سکا اس کی طویل داستان کہیں اور بیان کی جائے گی لیکن شعبے کے رفقائے کار کی معاونت کے بغیر فضا کسی صورت میں ساز گار نہیں ہو سکتی تھی۔

مشتاق: آپ مغربی بنگال اردو اکیڈمی کے اہم رکن ہیں۔ کیا آپ اکیڈمی کی موجودہ کارکردگی سے

مطمئن ہیں؟ تقسیم ایوارڈ کے معاملے میں اکیڈمی کہاں تک غیر جانب دار ہے؟

مظفر حنفی: مطمئن تو خیر نہیں ہوں، کیوں کہ ہر جگہ ترقی اور تغیر کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ لیکن گورننگ باڈی کا ممبر ہونے کے باعث اس بات کی شہادت دے سکتا ہوں کہ اردو اکیڈمی کے کام اس کے لیے مقرر قواعد و ضوابط کے مطابق ہوتے ہیں۔ یہ فطری امر ہے کہ اس کے بعض فیصلوں سے باہر کے تمام لوگ اتفاق نہ کریں۔ اگر تعمیری تنقیدیں کی جائیں تو ان کی روشنی میں اکادمی کو اپنے ضوابط میں مناسب تبدیلیاں کرنی چاہئیں۔ مجھے اکثر امور میں جو اختلافات ہوئے ان کا اظہار متعلقہ کمیٹیوں کی میٹنگ میں کرتا رہا ہوں۔ لیکن فیصلے کسی خاص شخص کی مرضی سے نہیں بلکہ ممبران کی کثرت رائے سے ہوتے ہیں، اس لیے ان کا احترام کرنا لازم ہے۔ اس سے زیادہ وضاحت کرنا گورننگ باڈی کے رکن ہونے کے ناتے میرے لیے مناسب نہیں ہے۔

آفرین: آج کل اردو رسائل و جرائد کثرت سے شائع ہو رہے ہیں اور پھر چند شماروں کی اشاعت کے بعد ان میں سے بیش تر دم توڑ دیتے ہیں، آخر اس کا سبب کیا ہے؟

مظفر حنفی: آفرین، میں سمجھتا ہوں نا تجربہ کاری اس کا سب سے بڑا سبب ہے۔ حالات کا بغور جائزہ لیے بغیر محض شوق کی تسکین کے لیے پرچہ جاری کر لینا اور ہے، اسے جاری رکھنا، خود کفیل اور پھر منافع بخش بنانا، اس کی پالیسی متعین کرنا، سرکولیشن بڑھانا، اشتہارات حاصل کرنا، معیار کو مسلسل بلند کرتے رہنا نئے مدیران کو نہیں آتا۔ ایک ہی شخص مدیر سے لے کر پروف ریڈر اور نامہ بردار تک سب کام بغیر کسی پلاننگ کے کرتا ہے اور یہ سب کسی خاص مقصد، مناسب سرمائے اور خلوص کے ساتھ نہیں ہوتا۔ صرف ایڈیٹر کہے جانے اور زیادہ محنت کے بغیر ادبی حلقوں میں جلدی معروف ہو جانے کی سطحی خواہش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رسالے دو چار شماروں کے بعد پردۂ خفا میں چلے جاتے ہیں۔ اردو والوں کے پرچے خرید کر نہ پڑھنے کی ادا اس کمزوری کا ایک اور بڑا سبب ہے۔

آفرین: مغربی بنگال میں اردو زبان کا مستقبل کیا ہے؟ اردو سے متعلق ریاستی حکومت کے رویے سے آپ کہاں تک مطمئن ہیں؟

مظفر حنفی: چار پانچ برس پہلے بی بی سی (لندن) نے اس موضوع پر مجھ سے مفصل انٹرویو لیا تھا جو دو قسطوں میں نشر کیا گیا (اس کا متن میرے سفر نامے 'چل چنبیلی باغ میں' کے ضمیمے میں شامل ہے۔) یہاں مختصراً عرض کروں گا کہ اردو کی حالت ہندوستان کی ان ریاستوں میں زیادہ خستہ ہے جہاں کی سرکاری زبان ہندی ہے۔ غالباً یہ سمجھا جاتا ہے کہ اردو کی ترقی سے ہندی کی مقبولیت کم ہوگی۔ گجراتی، تیلگو، مراٹھی، بنگلہ وغیرہ زبانوں سے متعلق ریاستوں میں اردو کا حال یقیناً بہتر ہے اور وہاں مستقبل سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ بنگال کی ریاستی حکومت نے اردو کے لیے جو کچھ کیا ہے وہ دوسری ہندی ریاستوں کے مقابلے میں بہت بہتر سہی لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اردو اسکولوں کے اساتذہ کی اسامیاں بڑھنی چاہئیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں خالی

جگہوں پر تقرر جلد کیے جائیں اور کلکتہ یونیورسٹی کے علاوہ کم از کم دیگر یونیورسٹیوں میں بھی اردو میں ایم۔ اے کی تعلیم کا بندوبست ہونا چاہیے۔ دراصل اس ریاست میں عوام اردو کی تحریک اس جوش و خروش کے ساتھ نہیں چلاتے جیسا کہ مثال کے طور پر بہار والے چلاتے ہیں۔

آفرین: یہاں کے اردو والوں کا آپ کے ساتھ کیسا رویہ رہا؟

مظفر حنفی: کلکتہ اور ریاست بنگال کے دوسرے شہروں میں اردو والوں نے مجھے آنکھوں پر بٹھایا اور دلوں میں جگہ دی جس کے لیے میں عمر بھر ممنون و مشکور رہوں گا۔ یہاں اپنے بارہ سال قیام کے دوران یاد نہیں آتا کہ کوئی بڑا ادبی مشاعرہ یا تقریب ایسی ہوئی ہو جس میں مجھ کو بحیثیت صدر یا مہمان خصوصی مدعو نہ کیا گیا ہو۔ اپنی خرابیٔ صحت یا مصروفیت کی وجہ سے اکثر معذرت خواہی کر لیتا تھا۔ خصوصاً گزشتہ دو برسوں میں بہت کم جلسوں میں شرکت کی، کیوں کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے 'وضاحتی منصوبے' کے تحت بہت قلیل مدت میں بڑے پروجیکٹ کی بائیس جلدیں مکمل کرنی تھیں اور اسی دوران میں بلڈ پریشر اور ذیابیطس جیسے مرض کا شکار بھی ہو گیا تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ اردو داں اور اردو کے اہل قلم نے مجھے بے حد احترام، محبت، اپنائیت سے نوازا۔ میری حق گوئی اور بے باک مشوروں کو قبول کیا۔ نیز بڑی سے بڑی شخصیت کی ادبی خامیوں کو برسر جلسہ نشان زد کرنے کے باوجود میری نیت اور خلوص پر شبہہ نہیں کیا گیا۔ اس کا اس سے بڑا دوسرا انعام نہیں ہو سکتا۔ یونیورسٹی کے طلبا و طالبات اور اردو ڈپارٹمنٹ کے ساتھیوں سے بھی بے پناہ احترام ملا۔ سب کے دل سے دعائیں نکلتی رہیں۔ میری تلخ و ترش باتوں، اعتراضات اور بے لوث طرز عمل کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ پچھلی دہائی میں جتنی تعداد میں سہ ماہی رسائل اور ماہنامے شائع کیے گئے اتنے آزادی سے قبل یا آزادی کے بعد کی دہائی میں کبھی نہیں شائع ہوئے۔ اب شاعر بھی تبدیل ہوا ہے اور تقلید کی جگہ رفتار لے رہی ہے، اس علاقے کے شعرا اور ادبا اور ان کی کتابوں پر تبصرے ہندوستان کے معیاری پرچوں اور بعض پاکستانی جریدوں میں بھی چھپنے لگے ہیں۔ اب ادبی محفلوں میں شاعر کچھ احتیاط سے کام لیتے ہیں اور تلفظ کی صحیح ادائیگی کی کوشش کرتے ہیں۔ یعنی گاڑی حرکت میں آ گئی ہے، جلد ہی رفتار اور تیز ہو جانے کا یقین ہے۔

مشتاق: آپ کی نظر میں آزاد نظم کی حیثیت کیا ہے؟

مظفر حنفی: بھائی مشتاق حامی! آزاد نظم اردو کیا عالمی ادب کی ایک اہم اور کارآمد صنف سخن ہے، جس کے وسیلے سے بہت سے بڑے فن کار ابھرے ہیں۔ اس کی خرابی بس اتنی ہے کہ پابند شاعری کے مقابلے میں بہت آسان ہے۔ اس لیے اکثر فن سے نابلد متشاعروں نے اس کو اپنی تشہیر کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ اب تو ان لوگوں کے لیے نثری نظم بھی وجود میں آ گئی۔

آفرین: ہندوستانی ادب اور بیرونی ممالک کے ادب میں کہاں تک مماثلت پائی جاتی ہے؟

مظفر حنفی: میں بیرونی ملک کے ادب سے محض انگریزی کے ذریعہ واقف ہوں۔ اصناف ادب کے موضوعاتی اور ہیئتی تقاضے سے بالاتر ہو کر دیکھیں تو ہر ادب اپنی ہم عصر زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ خواہ یہ آئینہ اردو کے فریم میں جڑا ہو یا فرانسیسی طرز کا ہو، عکس اس میں زندگی کا ہی ہوگا۔

مشتاق: آپ اپنی شاعری سے کہاں تک مطمئن ہیں؟ اگر مطمئن ہیں تو پھر مزید شعر کہنے کی کیا ضرورت ہے؟

مظفر حنفی: آپ سے کس نے کہا کہ میں مطمئن ہوں اپنی شاعری سے؟ میرا ایک شعر ہے:

وحشت کب رہنے دیتی ہے / گھر پچیسوں بار بنایا

تا حال اٹھارہ سو سے زائد غزلیں، دو سو کے قریب نظمیں، سات آٹھ درجن رباعیاں اور دیگر تخلیقات وجود پا چکی ہیں۔ لیکن لگتا ہے اندر کا لاوا اور بڑھ گیا ہے۔ ابھی بہت کچھ کہنا ہے۔ آپ کی دنیا بھی تو کتنی ٹیڑھی میڑھی ہے!

مشتاق: کیا شاعر کے لیے زود گوئی اور بسیار نویسی بھی ضروری ہے؟

مظفر حنفی: قطعی ضروری نہیں۔ یہ تو شاعر کے ظرف اور افتاد و استعداد پر منحصر ہے۔ غالبؔ بہت کم کہہ کر عظیم کہلائے۔ میر تقی میرؔ اور اقبالؔ بھی عظیم شاعروں میں ہیں اور دونوں نے بہت کہا ہے لیکن ایک پیمانہ یہ ضرور ہے کہ اچھا کہو خواہ کم ہو۔ اچھا بھی ہو اور زیادہ بھی تو سبحان اللہ۔ نشان خاطر رہے کہ بہت کم کہنے والوں میں بہت خراب کہنے والے بھی موجود ہیں!

مشتاق: آپ کی نظر میں ہندوستان کا سب سے بڑا ناقد اور شاعر کون ہے؟

مظفر حنفی: میر تقی میرؔ نے تو ویسے ہی کسی سوال کے جواب میں سوداؔ کی ہجو نگاری کے خوف سے اپنے ساتھ ان کا نام بھی شامل کر لیا تھا۔ ہمارے دور میں تو بفضلہٖ سوداؔ جیسا کوئی ہجو گو موجود نہیں ہے۔ سنجیدہ جواب یہ کہ بھائی ابھی ہندوستان میں زندگی بسر کرنی ہے۔ ایسے سوالوں کے جواب دے کر جان خطرے میں نہیں ڈالوں گا۔ ہر گروپ کا اپنا بڑا بلکہ عظیم شاعر موجود ہے اور ہر جماعت نے قد آور نقاد کھڑے کر رکھے ہیں۔ فیصلہ آنے والی نسلیں کر دیں گی۔ ایک لطیفہ سنیے۔ پروفیسر وشنو کانت شاستری اس وقت کلکتہ یونیورسٹی میں صدر شعبۂ ہندی تھے۔ موصوف اجودھیا سے کار سیوا انجام دے کر لوٹے تو یونیورسٹی کے اسٹاف روم میں ملاقات ہوئی۔ بندگی کے بعد مصافحے کو ہاتھ بڑھایا تو بھائی نے کچھ اتنی زور سے اور ایسے رخ سے دبایا کہ جان ہی نکل گئی۔ عرض کیا حضرت، یہ غریب حنفی کا ہاتھ ہے آپ اسے بابری مسجد کیوں سمجھ رہے ہیں۔ آپ کا موجودہ استفسار بھی کچھ ایسے ہی رخ سے کیا گیا ہے!

آفرین: ایک اچھے شاعر یا تخلیق کار ہونے کے لیے کن لوازمات کا ہونا ضروری ہے؟

مظفر حنفی: پہلے تو وہ مادہ یا صلاحیت، 'تا نہ بخشد خدائے بخشندہ' کسی کاوش یا تربیت سے حاصل نہیں کی

جاسکتی۔ اگر یہ وہبی وصف موجود ہے تو شاعر یا تخلیق کار کو مسلسل کاوش، مطالعے، مشاہدے اور تجربے سے اسے بڑھاتے رہنا چاہیے۔ اظہار پر قدرت، زبان پر مہارت، احساس میں شدت، طرزِ ادا میں ندرت بھی شرط ہے۔ اپنی زبان کے ادب پر نظر ہونی چاہیے اور کسی دوسری بڑی عالمی زبان کی مدد سے بیرونی دنیا کے ادب کا مطالعہ بھی لازمی ہے۔

آفرین: بنگال میں اپنے ہم عصر شاعروں میں آپ کس سے زیادہ متاثر ہیں اور کیوں؟

مظفر حنفی: بیٹی! تم بھی ایک لطیفہ سنو۔ کلکتہ آمد کے تین سال بعد میرے وائس چانسلر نے پوچھا حنفی صاحب اب تو آپ کو بنگلہ زبان آ گئی ہوگی۔ میں نے کہا جناب میں اپنی اردو بچانے میں لگا رہتا ہوں بنگلہ کب اور کیسے سیکھتا؟ تمہارے سوال کا جواب بھی اس لطیفے سے نکلتا ہے۔

مشتاق: اقبالؔ کی حیثیت آپ کی نظر میں؟ کیا فیضؔ بڑے شاعر نہیں تھے؟

مظفر حنفی: بے شک اقبالؔ ہمارے تین شاعروں میں سے ایک ہیں۔ اردو نے اتنا بڑا نظم نگار تا حال نہیں پیدا کیا۔ ان کے فن اور شخصیت پر سینکڑوں کتابیں آ چکی ہیں۔ اس لیے تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ فیض یقیناً اچھے اور اہم شاعر ہیں لیکن انھیں عظیم نہیں کہوں گا۔

مشتاق: کیا مشاعروں کی افادیت آج بھی مسلم ہے اور آج کے مشاعرے بقائے اردو کے ضامن ہیں؟

مظفر حنفی: حال ہی میں ماہنامہ 'افکار' کراچی نے اس موضوع پر میرا مضمون بطور اداریہ شائع کیا ہے۔ تفصیل تو وہاں مل جائے گی لیکن مختصراً عرض ہے کہ اپنی سطحیت اور مضر اثرات کے باوصف آج بھی مشاعروں سے اردو کی بقا میں مدد مل رہی ہے کچھ اصلاح ہو جائے۔ ان سے متشاعروں، گویّوں، اداکاروں، ادبی طوائفوں، بھانڈ گردی کرنے والے مزاحیہ شعرا کو دور رکھا جائے تو مشاعروں کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ ہر مشاعرے میں عوامی مقبولیت کے حامل چند اچھے اور سچے شاعروں کے ہمراہ ادبی مرتبہ رکھنے والے شاعروں کی کثرت ہونی چاہیے۔ جیسا کہ جوشؔ و جگرؔ کے زمانے میں ہوتی تھی۔



فیضان عارف
لندن

گفتگو

برصغیر کے منفرد اسلوب رکھنے والے شاعروں میں مظفر حنفی کا نام نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ ان کی غزل عہد حاضر کی آشوب کی ایک ایسی تصویر ہے جسے احساس اور فکر کے رنگوں سے تخلیق کیا گیا ہے۔ انھوں نے موجودہ دور کے تلخ حقائق کو جس شاعرانہ انداز سے اپنی غزل میں سمویا ہے وہ ہر سخنور کے بس کی بات نہیں۔ ان کے درج ذیل اشعار اس بات کی گواہی دیں گے۔

ہمیں لوح و قلم تقدیر نے بخشے تو ہیں لیکن
ہمارا آب و دانہ لکھ دیا ہے چور ہاتھوں میں
عظیم المرتبت ماضی تھا شہزادوں کی قسمت کا
مرا رنگین مستقبل ہے رشوت خور ہاتھوں میں

مظفر حنفی کی پہچان کا بنیادی حوالہ ان کی شاعری ہے لیکن ایک نقاد اور اقبال شناس کے طور پر بھی ان کی شناخت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مظفر حنفی یکم اپریل ۱۹۳۶ء کو کھنڈوا مدھیہ پردیش میں پیدا ہوئے۔ والدین نے ان کا نام ابوالمظفر رکھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔ اے اور بھوپال یونیورسٹی سے ایم۔ اے، ایل ایل بی اور پی ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ڈاکٹریٹ کے لیے ان کی تحقیق کا موضوع شاد عارفی کی شاعری تھا۔ سرکاری ملازمت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کر کے وہ ۱۹۷۶ء میں جامعہ ملیہ کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہوئے اور ۱۹۸۹ء میں انھیں کلکتہ یونیورسٹی نے اقبال چیئر پر پروفیسر کی حیثیت سے فائز کیا۔ مظفر حنفی کی درجنوں کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور انھیں درجنوں اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ محبوب راہی کو مظفر حنفی کے فن اور شخصیت پر تحقیقی کام کے عوض ناگ پور یونیورسٹی نے ۱۹۸۴ء میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی۔ ان کا یہ مقالہ کتابی شکل میں چھپ چکا

ہے۔ڈاکٹر مظفر حنفی گزشتہ دنوں برطانیہ آئے تو ان سے مختلف ادبی موضوعات پر بات چیت ہوئی۔سب سے پہلے ہم نے ان سے بھارت میں اقبال کی شخصیت اور شاعری پر تحقیق کے حوالے سے مکالمے کا آغاز کیا۔

....

فیضان عارف: کلکتہ یونیورسٹی اور بھارت کی دیگر جامعات میں اقبال کے فن وفکر پر کیا کام ہورہا ہے؟

مظفر حنفی: کلکتہ یونیورسٹی سمیت بھارت میں اقبال پر بہت تحقیقی کام ہو رہا ہے۔اقبال پر پورے بھارت میں ۷۰ رسے زائد پی ایچ۔ڈی ہوچکی ہیں،اوراقبال کی شاعری اورشخصیت پر چارسو سے زیادہ کتابیں چھپ چکی ہیں۔یو جی سی کے تحت کلکتہ یونیورسٹی میں 'اقبالیات ہند و پاک میں' کے نام سے ایک ببلوگرافی ترتیب دی جارہی ہے جس میں اقبال پراب تک لکھی جانے والی تمام کتابوں کا حوالہ مختصر تعارف کے ساتھ شامل کیا جائے گا۔یہ کام ابھی جاری ہوا ہے اور میں اس تحقیقی کام کی نگرانی کا فریضہ انجام دے رہا ہوں۔

فیضان عارف: بھارت میں اردوزبان وادب کی بقااورارتقا کے کیاامکانات ہیں؟

مظفر حنفی: عام تاثر یہ ہے کہ بھارت میں اردوزبان ترقی نہیں کررہی ہے۔لیکن یہ بات مکمل طور پر درست نہیں ہے۔بھارت کے وہ علاقے مثلاً اتر پردیش اورراجستھان وغیرہ جہاں اسٹیٹ کی زبان ہندی ہے وہاں یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگراردوترقی کرے گی تو اس سے ہندی زبان کو نقصان پہنچے گا۔اس لیے مذکورہ علاقوں میں اردو کو حکومت کی طرف سے معاونت نہیں مل رہی ہے۔جب کہ بھارت کی دیگر ریاستوں مثلاً مہاراشٹر، آندھرا پردیش، بنگال، بہار اور کرناٹک میں اردو زبان بولنے والوں کی بڑی تعداد موجود ہے جہاں پرائمری جماعتوں سے لے کر یونیورسٹی تک اردو پڑھائی جاتی ہے اور تقریباً بھارت کی تمام یونیورسیٹیوں میں اردو کے شعبہ جات موجود ہیں۔

فیضان عارف: بھارت میں اردو پڑھنے کا رجحان کیا ہے؟

مظفر حنفی: دراصل اردوزبان کے لیے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اس کا روزی روٹی سے بہت کم تعلق رہ گیا ہے۔اب تو صرف تدریس اور ریڈیو کے شعبوں میں ہی اردو کے پڑھے لکھے لوگوں کے لیے گنجائش رہ گئی ہے۔

فیضان عارف: جولوگ کہتے ہیں کہ بھارت میں اردو کا مستقبل روشن ہے ان کی اس خوش فہمی کی بنیاد کیا ہے؟

مظفر حنفی: اگر ہم اردو کے مستقبل کا جائزہ لینے سے پہلے بھارت میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۵ء تک کے منظرنامے پرغور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ دور اردو کے حوالے سے بالکل تاریک تھا۔اردو کو بالکل نظرانداز کردیا گیا تھا جس کی وجہ سے یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ اب بھارت سے اردوختم ہوجائے گی۔لیکن ۱۹۷۰ء کے بعد سے

مختلف بھارتی ریاستوں میں اردو پڑھنے لکھنے اوراس کے تدریسی انتظامات کے رجحان میں جس طرح اضافہ ہوا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اردوزبان کے معاملے میں جولسانی تعصب تھا وہ رفتہ رفتہ کم ہوا ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ اب اردو کی بقا کے ضمن میں صورت حال اتنی پریشان کُن اور تشویش ناک نہیں ہے جتنی کہ پچاس کی دہائی تک تھی۔

فیضان عارف: کیا بھارت میں اردو کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کی زبان ہے؟

مظفر حنفی: متعصب لوگ اور تنظیمیں تو دنیا میں ہر جگہ موجود ہیں۔لیکن بھارت میں اردو کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ وہاں فلمیں اردو زبان میں بنتی ہیں اورلوگ اردو گیتوں اورغزلوں کو شوق سے سنتے ہیں۔بلکہ لوگ اپنے آپ کو زیادہ مہذب ثابت کرنے کے لیے اردو زبان بولتے ہیں اور اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی تخصیص نہیں ہے۔

فیضان عارف: اس وقت بھارت میں جوشاعری،خصوصاً غزل لکھی جارہی ہے اس کا آپ پاکستان میں تخلیق ہونے والی شاعری سے کیسے موازنہ کریں گے؟

مظفر حنفی: اردوغزل نے جس مٹی میں جنم لیا ہے وہ ہندوستانی مٹی ہے،چنانچہ آج پورے ہندوستان میں جوغزل لکھی جارہی ہے اس میں ورائٹی بہت ہے۔مثلاً مغربی بنگال میں رہنے والا اردو کا شاعر،مہاراشٹر کے شاعر کے مقابلے میں مختلف انداز سے شعر لکھ رہا ہے۔بہار کا شاعر، گجرات کے شاعر سے مختلف غزل کہہ رہا ہے۔جبکہ پاکستان میں شاعری تو بہت اچھی ہورہی ہے لیکن اس میں یکسانیت بہت ہے۔غزل ہی کی وجہ سے بھارت میں بڑے بڑے مشاعرے ہوتے ہیں۔البتہ نظم اورافسانہ پاکستان میں بہت اچھا لکھا جارہا ہے،اس کے برعکس تنقید اور تحقیق کا کام بھارت میں زیادہ اچھے انداز میں ہورہا ہے۔کیوں کہ تحقیق کے زیادہ مآخذ بھارت میں ہیں۔ویسے ادب اوراس کی تخلیق کا اس طرح موازنہ کرنا مناسب نہیں لیکن چوں کہ آپ نے پوچھا ہے تو میں نے اپنا مشاہدہ بیان کردیا ہے۔

فیضان عارف: آپ نے کہا کہ غزل کی وجہ سے بھارت میں بڑے بڑے مشاعرے ہوتے ہیں۔کیا ان بڑے بڑے مشاعروں کی کامیابی میں ترنم کا عمل دخل بھی ہے؟

مظفر حنفی: جولوگ صرف مشاعروں کے شاعر ہیں یا ترنم کا سہارا لیتے ہیں وہ درجہ دوم کے شاعر ہیں۔پہلے درجے کے شاعر وہ ہوتے ہیں جو ادبی رسائل میں چھپتے ہیں اور جن کی کوئی ادبی حیثیت ہوتی ہے۔کچھ شاعر ایسے بھی ہیں جن کی ادبی حیثیت بھی مستند ہے اوران کو مشاعروں میں بھی بلایا جاتا ہے،جیسے مجھے اور ندا فاضلی کو مشاعروں میں بھی بلایا جاتا ہے لیکن ہم مشاعروں کے شاعر نہیں کہلاتے۔

فیضان عارف: آپ کے نزدیک اچھی شاعری کی بنیادی صفت کیا ہے؟

مظفر حنفی: میں سمجھتا ہوں کہ شاعری کی بنیادی صفت ہی یہ ہوتی ہے کہ لکھنے والا کسی چیز کے بارے میں جس طرح محسوس کرے اسے مختصر الفاظ میں ایسے بیان کر دے کہ پڑھنے والا بھی ویسے ہی محسوس کرنے لگے۔ اچھی شاعری میں نیا خیال اور نیا اندازِ بیان بہت اہم صفات ہوتی ہیں۔

فیضان عارف: کیا وہ شاعری اچھی ہوتی ہے جسے نقاد سرٹیفکیٹ دیں یا وہ شاعری اچھی ہوتی ہے جسے عوام پسند کریں؟

مظفر حنفی: حضرت علی کا قول ہے کہ سچائی بین بین ہوتی ہے، یہ دو انتہاؤں پر نہیں ہوتی۔ سچی اور اچھی شاعری وہ ہوتی ہے جسے اہلِ نظر پسند کریں۔ ان اہلِ نظر میں نقاد بھی ہیں اور ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو نقاد نہیں، لیکن ادبی شعور رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں یگانہ، ناصر کاظمی، فیض احمد فیض اور شاد عارفی کی شاعری کی مثال دی جا سکتی ہے۔

فیضان عارف: آپ کے خیال میں اس وقت برصغیر پاک و ہند میں کون کون سے شاعر اچھی شاعری کر رہے ہیں؟

مظفر حنفی: بھارت میں شہر یار، ندا فاضلی، مخمور سعیدی، عرفان صدیقی، اعزاز افضل، محبوب راہی، منور رانا، اچھا شعر لکھ رہے ہیں جب کہ پاکستان میں وزیر آغا، شہزاد احمد، عبید اللہ علیم، افتخار عارف اور احمد فراز اچھی شاعری کر رہے ہیں۔ برطانیہ سے ساقی فاروقی کا نام اچھے شاعروں میں شامل ہے۔

فیضان عارف: آپ خود بھی نقاد ہیں تو کیا اچھا ادب نقادوں کی سند کا محتاج ہوتا ہے؟

مظفر حنفی: دراصل آج کل نقادوں نے یہ رویہ اختیار کر رکھا ہے کہ تخلیق کار کو اپنے پیچھے رکھیں، حالاں کہ ناقد کو تخلیق کار کے پیچھے رہنا چاہیے۔ جن شاعروں کو اپنے لکھے ہوئے پر اعتبار نہیں ہوتا وہ نقادوں سے سند لینے کے لیے ان کے آگے پیچھے گھومتے ہیں۔ اس لیے نقاد حضرات اچھے اور سچے شاعروں سے بھی یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کے آگے پیچھے پھریں گے۔ بڑا شاعر چوں کہ نقادوں کی خوشامد نہیں کرتا، اس لیے وہ ان کی نظر میں معتوب رہتا ہے۔ بڑے شاعر کو کبھی اس کے ہم عصر نقادوں نے تسلیم نہیں کیا۔ اس کی بڑائی کو ہمیشہ آنے والا وقت تسلیم کرتا ہے۔ بڑا تخلیق کار کسی نقاد کے سہارے کا محتاج نہیں ہوتا۔ بیشتر نقاد وہ ہیں جو شاعری اور افسانہ نگاری کے میدان میں ناکام ہونے کے بعد تنقید کی طرف آئے ہیں۔

فیضان عارف: آج کل پی ایچ۔ڈی کرنے کا رجحان بہت بڑھ گیا ہے جن شخصیات اور موضوعات پر پی ایچ۔ڈی ہو رہی ہے وہ ایک الگ بحث ہے۔ کیا پی ایچ۔ڈی کی ڈگری کی اتنی ارزانی تشویش ناک نہیں ہے؟

مظفر حنفی: آپ نے بہت نازک سوال کیا ہے جب محبوب راہی نے مجھ پر پی ایچ۔ڈی کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو میں نے انھیں تین برس تک اس کام کی اجازت نہیں دی، پھر انھوں نے بھوپال میں میرے استاد کو جا

کر شکایت کی تو میں نے کہا کہ اب تک جو میں نے تیس پینتیس کتابیں لکھی ہیں ان کے علاوہ بھی مجھے زندگی میں اور بہت سا کام کرنا ہے۔ پی ایچ۔ڈی سے پہلے میں اپنا تخلیقی سفر مکمل کرنا چاہتا ہوں۔ زندگی میں پی ایچ۔ڈی ان فن کاروں پر ہونی چاہیے جنھوں نے اپنا ادبی سفر مکمل کر لیا ہو جس طرح فیض اور فراق نے اپنی زندگی میں اپنے تخلیقی سفر کی تکمیل کر لی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ پی ایچ۔ڈی کے سلسلے میں یہ اصول بنا دینا چاہیے کہ زندہ شخصیات پر پی ایچ۔ڈی کی اجازت نہ ہو۔ دراصل بھارت میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے یونیورسٹی کے اساتذہ کے لیے پی ایچ۔ڈی ہونا لازمی قرار دے دیا تھا جس کی وجہ سے پی ایچ۔ڈی کے ساتھ ایسا ہوتا رہا۔ اب یو جی سی نے یہ شرط ختم کر دی ہے اس لیے معاملات کے بہتر ہونے کا امکان پیدا ہوا ہے۔

فیضان عارف: برطانیہ میں آپ کے اعزاز میں مختلف شہروں میں کئی تقریبات ہوئی ہیں ان میں شرکت کے بعد آپ یہاں کی ادبی فضا کے بارے میں کیا محسوس کرتے ہیں؟

مظفر حنفی: مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرانی ہوئی کہ برطانیہ میں مجھے کوئی ایک بھی شاعر ایسا نہیں ملا جس نے کسی دوسرے شاعر کی تعریف کی ہو۔ ہر بڑا چھوٹا شاعر اس میں ملوث ہے۔ بیشتر شاعر تخلیقی کام کی بجائے ایک دوسرے میں کیڑے نکالنے اور ایک دوسرے کو مسترد کرنے کی فکر میں مبتلا رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور تشویش ناک بات یہ ہے کہ برطانیہ میں پروان چڑھنے والی ہماری نئی نسل اردو زبان سے لاتعلق ہوتی جا رہی ہے اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ نئی نسل کے لیے اردو تعلیم کا خاطر خواہ بندوبست کیا جائے اور اس سلسلے میں کوئی موثر لائحہ عمل بنایا جائے ورنہ آنے والے بیس پچیس برسوں میں یہ ملک اردو کا تیسرا بڑا مرکز نہیں رہے گا۔



مطبوعہ روزنامہ 'جنگ'، لندن، ۱۷/اگست ۱۹۹۷ء

ڈاکٹر غضنفر اقبال
گلبرگہ

باتیں مظفر حنفی کی

پروفیسر حنفی (۱۹۳۶ـ۲۰۲۰) عصر ساز ادیب تھے۔ وہ مہذب، اُصول پسند اور کاٹ دار لہجہ کی وجہ سے عالم اُردو میں اپنی شہرت وقدر رکھتے تھے۔ ان کا ذہن وفکر ہمہ گیر شعور رکھتا تھا۔ ان کے قلم نے ادب وشعر کی کئی سمتوں میں نشانات چھوڑے ہیں۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے کہیں لکھا ہے:

''زندگی کے وسیع مشاہدے اور شدید سنگھرش نے اسے (مظفر حنفی) خاص اپنے زمانے کی کھردری حقیقتوں، روز مرہ کی ناہمواریوں اور بیان کی آڑی ترچھی لکیروں کا برتنا سکھایا۔''

پروفیسر مظفر حنفی نے اُردو کی نامور ہستیوں کے انٹرویو لیے تھے۔ ان کے پانچ انٹرویو اس تحریر کا مطالعہ ہیں۔ فکر تونسوی طنز وظرافت کے بڑے قلم کار تھے۔ موصوف سے پروفیسر مظفر حنفی نے عمدہ انٹرویو کیا تھا اور اُن سے یہ باتیں نکالی تھیں:

''مزاح جو ہے نا وہ نچلی سطح کا ادب ہے، وجود میں آیا طنز کو خوش گوار بنانے کے لیے، کہ طنز کافی تلخ چیز ہوتی ہے بڑی گہرائی تک جاتی ہے۔ مشہور ہے کہ طنز نگار لوگوں کو ہنساتا ہے خود روتا ہے اندر سے، یہ رلانے والی چیز ہے لیکن اسے لوگوں کی خاطر گوارا کرنے کے لیے، خوش گوار بنانے کے لیے مزاح کی مدد لی جاتی ہے۔''

حسن نعیم سے تفصیلی باتیں پروفیسر مظفر حنفی نے کی تھیں، اور یہ باتیں انکشاف کے طور پر حسن مرحوم سے کہلوائی تھیں:

''ہماری ساتویں پشت میں پیر امام الدین ایک بزرگ گزرے ہیں جو صاحب تصنیف بھی تھے۔ وہ راج گیر میں ایک درگاہ جو شرف الدین منیری کی ہے، وہ اس کے سجادہ نشین تھے۔ یہ درگاہ نالندہ ضلع میں ہے اور راج گیر کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ یہاں گوتم بدھ نے بھی کچھ عرصہ قیام کیا تھا اور مہا بیر بھی وہاں آئے تھے۔ اس کے علاوہ شرف الدین منیری نے بھی اپنا مسکن

راج گیر کے جنگلوں میں ہی بنایا تھا۔ غرض یحییٰ منیری صاحب تک ہمارا سلسلہ ۱۵ـ۱۴ پشتوں سے ان بزرگوں سے ملتا ہے کہ ہمارے دادا شاہ قاسم سجادہ نشین باضابطگی کے ساتھ ہوئے۔''

ڈاکٹر وزیر آغا سے مظفر حنفی نے قدرے طویل باتیں کیں ہیں۔ دونوں اصحاب کی باتوں کا حاصل یہ رہا:

''ہمارا مطالعہ جو ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ علوم کا علم ہونا چاہیے۔ دنیا کتنی آگے جا رہی ہے۔ دس سال کا بھی فرق پڑ جائے تو ہم ایک ہزار سال پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ تو ہمیں پتہ ہونا چاہیے کہ دوسری فیلڈس میں کیا ہو رہا ہے، جب ہی ہم ادب کا تجزیہ کر سکتے ہیں۔''

باتوں ہی باتوں میں فن انٹرویو کے متعلق ڈاکٹر وزیر آغا نے مظفر حنفی کے جواب میں کیا کہا ہے ملاحظہ کیجیے:

''مظفر حنفی: میں بھی سمجھتا ہوں کہ مناسب شخص کا ہی انٹرویو لینا چاہیے اور مناسب شخص انٹرویو لے رہا ہو۔ اکثر لوگ بڑی بلند آہنگی کے ساتھ باتیں کرتے ہیں اس لیے کہ ان کا انٹرویو لینے والا ناواقف یا مبتدی شخص ہے۔ اگر باتیں کسی اہم اور معقول آدمی سے ہو رہی ہوں تو گفتگو کی سطح بلند ہوگی۔

ڈاکٹر وزیر آغا: سچ فرمایا آپ نے۔ اس میں یہ ہے کہ اب صحافت جو ہے یا ادب جو ہے، اس میں Honesty جو ہے، اس کو تو بڑی مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اب مثال کے طور پر بہت سے لوگ ہیں جو یہاں آ کر انٹرویو دیتے ہیں۔ ادیبوں کے انٹرویو یہاں سے لیے جاتے ہیں۔ اب اس میں اس قسم کے Pointed سوالات کرتے ہیں جس سے ان کا کچھ مقصد حاصل ہوتا ہے۔''

مظفر حنفی کا ساحر ہوشیار پوری سے لیا گیا انٹرویو خاصے کی چیز ہے۔ مظفر صاحب کے ایک سوال کے جواب میں ساحر نے جو کہا وہ لا جواب ہے:

'' لکھنے والوں کی نئی نسل کے لیے یہی پیغام ہے حضور کہ جو کچھ وہ لکھیں با معنی لکھیں اور اس میں یہ کوشش کریں لکھنے کی کہ مضمون جو ہے وہ زیادہ مبہم نہ ہو، لوگوں کی سمجھ میں آ جائے اور اس کے اظہار کا احساس کے ساتھ ربط قائم رہے۔''

محترمہ جیلانی بانو خواتین افسانہ نگاروں میں مقبول ترین نام ہیں۔ محترمہ سے پروفیسر مظفر حنفی نے بے حد اہم باتیں کی ہیں۔ محترمہ جیلانی بانو نے اپنی باتوں میں یہ بات بھی کہی:

''جب بھی کوئی تجربہ ادب میں ہوتا ہے تو بہت خراب چیزیں آتی ہیں اور اس میں بہت کم اچھی چیزیں ہوتی ہیں۔ ہمارے یہاں افسانے کی ایک نئی رو آئی جس کو آپ تجریدی افسانہ کہتے ہیں۔ اس میں تجربہ ہوا۔ واقعی اس میں اچھے افسانے نہیں لکھے گئے اور قاری کی توجہ افسانے

سے ہٹ رہی ہے۔''

پروفیسر مظفر حنفی کے زیرِ بحث پانچ انٹرویو سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ انٹرویو تربیت یافتہ تخلیقی ذہن رکھنے والے فن کار پروفیسر مظفر حنفی کے لیے ہوئے ہیں۔ان میں نئی باتوں کی دلچسپ اور بامعنی وضاحت ہوجاتی ہے۔مظفر صاحب کے یہ انٹرویو باتوں کی ایسی مہک ہیں جس سے دل معطر اور مشام جاں مشک بار ہوجاتے ہیں۔انٹرویو حقیقت بیانی،صاف گوئی، بے باکی اور دوٹوک رائے کا مظہر ہیں۔ظاہر سی بات ہے کہ پروفیسر مظفر حنفی مذکورہ خوبیوں سے زندگی بھر کاربند رہے۔یہی باتیں ادب وشعر میں مظفر حنفی کے امتیازات اور انفرادیت کو قائم رکھتے ہیں۔انٹرویو میں فکر انگیز جملے اور برمحل اشعار کے استعمال نے خیال کی ندرت، بیان کی فصاحت اور نئی نئی باتوں کی وضاحت نے مظفر حنفی کی باتوں کو تاثر انگیز بنا دیا ہے۔

بہر کیف پروفیسر مظفر حنفی کی علمی وادبی باتیں ذہن وفکر کے نئے دریچے کھولتی ہیں جن میں جامعیت، ہمہ گیری اور بلندی ہے۔مظفر حنفی نے خاموشی سے کہا:

ترے سوا جو کوئی میرے دل کو چھیڑتا ہے
عجب سا ساز ہے آواز ہی نہیں دیتا

OOO

نظمیں

مولانا ارشاد حسین
پورہ معروف، کرتھی جعفر پور، ضلع مئو، رابطہ نمبر:8896740346

نظم تعزیت بسلسلۂ رحلت پروفیسر مظفر حنفی

جہانِ علم و ادب کا وقار ٹوٹ گیا
شعور و فکر کے پھولوں کا ہار ٹوٹ گیا
زمانہ کیوں نہ ہو بے نور ان کی رحلت سے
جہانِ دید کی آنکھوں کا تار ٹوٹ گیا
خزاں سے لگتی ہے ہر شے شکستگی کا شکار
چمن میں تھا کوئی جانِ بہار، ٹوٹ گیا
وہ کامیاب و مظفر تھا اپنی دنیا میں
سخن کے شہر کا محکم حصار ٹوٹ گیا
اسی کے دم سے غزل کا تھا مے کدہ روشن
یہ کیا ہوا کہ وہ جامِ شرار ٹوٹ گیا
کدھر گیا جسے نظریں تلاش کرتی ہیں
ادب کا سلسلۂ مشکبار ٹوٹ گیا
تھی کس کی وجہ سے محفل کی نغمگی قائم
فضا یہ کہتی ہے کوئی ستار ٹوٹ گیا

فلک سے اُس کی نہ دیکھی گئی حسین ادا
کہ سوزِ برق سے سازِ ہزار ٹوٹ گیا
کبھی جو دیتا تھا فن کی بلندیوں سے صدا
وہ نقدِ شعر کا روشن منار ٹوٹ گیا
فسانے جس کے تھے تعمیر فکر و فن کا عمود
سخنوری کا تھا جس پر مدار، ٹوٹ گیا
وہ کام کرگیا نازاں ہیں جس پہ اہل خرد
جنوں کی طرح ہیں ان پر نثار، ٹوٹ گیا
خزانہ دے گیا اردو کو اپنی کاوش سے
وہ دن بھی آیا قلم کا فشار، ٹوٹ گیا
ڈرامے ان کے تھے پیغام دل کا آئینہ
شکستہ عکس ہے، رخ کا سنگھار ٹوٹ گیا
یہ غمزدہ ہے زمانہ تو وجہ ہے ارشاؔد
تھا جس سے وجہِ ادب کا نکھار ٹوٹ گیا

○○○

ڈاکٹر محسن رضا رضوی
صدر شعبۂ اردو، اورینٹل کالج، پٹنہ سٹی، رابطہ نمبر: 9431443778

مظفر حنفی (توصیفی نظم)

وسعتِ فن کے نگہبان مظفر حنفی   فکر کے نیّرِ تابان مظفر حنفی
آپ کی ذات سے قائم رہی تہذیبِ غزل   اس میں پیدا ہوئے امکان مظفر حنفی
چاہے افسانہ ہو یا نظم کہ فکر و تحقیق   سب پہ ہے آپ کا احسان مظفر حنفی
روشنی علم کی قائم رہی تا حین حیات   شخصیت معدن عرفان مظفر حنفی
ناقدِ شعر وسخن آپ تھے، شاعر بھی آپ   ملک تحقیق کے سلطان مظفر حنفی
تھا جو جدت کے پیالوں میں روایت کا عرق   ایسے اسلوب کے قربان مظفر حنفی
آپ کے فن کی بھلا کون کرے گا تقلید   عقل ہے عقل پہ حیران مظفر حنفی
میں بھی مقتولِ سخن آپ کا بچپن سے رہا   مجھ پہ بھی آپ کا احسان مظفر حنفی
آپ کے فن کے مخالف جو رہے تا بہ حیات   اب خطا ان کے ہیں اوسان مظفر حنفی
آپ کے دم سے تھی آباد ادب کی محفل   اور اب شہرِ خموشان مظفر حنفی
آپ کی یاد میں رضویؔ جو ہوا نغمہ سرا   ہے یہ 'فیضان' کا فرمان مظفر حنفی

○○○

ظفر اقبال ظفرؔ
۱۷۰۔خیلدار، فتح پور (یو۔ پی)، رابطہ: 7398451805

منظوم خراج تحسین

(پروفیسر مظفر حنفی کے سانحۂ ارتحال پر)

جو مرکز نظر تھا وہ منظر نہیں رہا   دنیائے آب و گل میں مظفر نہیں رہا
شعروں میں جس کے کاٹ تھی تنقید تھی کھری   اُس جیسا آج کوئی سخنور نہیں رہا
کس درجہ اب یہ راہیں سخن کی اداس ہیں   شعر و سخن کی راہ کا رہبر نہیں رہا
شعر و ادب میں جس کے ہنر تھا کمال کا   حسنِ ادب کا اب وہ پیمبر نہیں رہا
ہر شخص آج شعر و ادب کا ملول ہے   افلاکِ فن کا مہر منور نہیں رہا
اس درجہ اشکبار ہوئیں آنکھیں رنج میں   آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر نہیں رہا
بزمِ سخن میں ہوتے ہیں اب جس کے تذکرے   افسوس ایسا آج سخنور نہیں رہا
احباب ہوں کہ بیٹے ہوں یا وہ عزیز ہوں   قابو کسی بھی شخص کو دل پر نہیں رہا
اب آنکھیں ڈھونڈتی ہیں انھیں ہر طرف ظفرؔ   تاجِ سخن کا قیمتی گوہر نہیں رہا

○○○

تنویر پھول
امریکا، برقی رابطہ:tanwirphool@gmail.com

قطعات تاریخ وفات

پھولؔ! افسوس، وہ گلزارِ سخن چھوڑ گئے
کشورِ شعر کے سلطان مظفر حنفی
شائقِ علم و ادب، شوق دلاتے بھی رہے
''علم کی شوقیہ پہچان مظفر حنفی''
(۲۰۲۰ء)

آج رخصت ہوئے اِک سچے ادیب و شاعر
پھولؔ! انساں تھے بہت اچھے مظفر حنفی
اُس نے دروازۂ جنت کو کیا وا فوراً
بولا رضوان یہ ''آ، سچے مظفر حنفی''
(۱۴۴۲ھ)

قطعات تاریخ

پروفیسر مظفر حنفی

غیر مطبوعہ غزلیں

۱

ہے مرے سر پہ تاج کانٹوں کا — اور دشمن سماج کانٹوں کا
آج ہم عیش کرنے والے ہیں — فصلِ گل ہے خراج کانٹوں کا
آبلے پاؤں میں ٹپکتے ہیں — پوچھنا ہے مزاج کانٹوں کا
پاؤں پھولوں کے داغتے سب ہیں — کون کرتا علاج کانٹوں کا
آگے سب کچھ خزاں کے ہاتھ میں ہے — ملک پھولوں کا راج کانٹوں کا
اے مظفرؔ غزل کہو تم بھی — بول بالا ہے آج کانٹوں کا

۲

میں کہ محوِ خواب تھا — شہر میں سیلاب تھا
ہم بھی چلتے ہی رہے — ہم سفر مہتاب تھا
ناؤ میں سوراخ تھے — سامنے گرداب تھا
سطح پر بہتے چراغ — پھول زیرِ آب تھا
ہم کہاں تھے دستیاب — تو اگر کمیاب تھا
میری خاموشی کے گرد — نرغۂ احباب تھا

۳

غزل کا آئینہ تُرشی سے صاف ہم نے کیا — روایتوں سے مگر انحراف ہم نے کیا
لطیفہ یہ ہے کہ وہ جرم جگمگانے لگے — انھیں برتنے کا جب اعتراف ہم نے کیا
ہمارا خیمہ بھی ریگ رواں ہی بنتی ہے — سفر ہمیشہ ہوا کے خلاف ہم نے کیا
سناؤ جاکے یہ مژدہ ہمارے دوستوں کو — کہ اپنا خون عدو پر معاف ہم نے کیا

غیر مطبوعہ غزلیں

خبر ملی کہ تراشے گا وہ ہمارے پر
تو آسمان میں جاکر شگاف ہم نے کیا

نہیں تھا حر کوئی، سب شمر و حرملہ نکلے
یزیدِ وقت سے جب اختلاف ہم نے کیا

ہوئی ہماری بھی توقیر کچھ زمانے میں
زمانے والوں سے جب اعتکاف ہم نے کیا

ہمارا سانس اُلجھتا تھا ان خلاؤں میں
پلٹ کے اپنی زمیں کا طواف ہم نے کیا

۴

جینے میں مزا نہیں رہا اب
کچھ اور گداز، دل کو یارب

اک شخص کی یاد میں مگن ہوں
کیا پوچھو ہو میرا دین و مذہب

گل کردیے سب چراغ میں نے
اب چاند ہے شاہزادۂ شب

سر جتنا قلم کروگے اس کا
خامہ اتنے دکھائے گا کرتب

۵

آگ بجھنے لگی ہے دریا پار
درد کردے گا آج بیڑا پار

عشق میں مرکے جی گئے ہم تو
موت سے ورنہ کس نے پایا پار

یہی نقشہ ادھر بھی ہے یارو!
اپنی سرحد کبھی نہ کرنا پار

تو بھی آلائشوں سے دنیا کی
پھیرلے آنکھ اور ہوجا پار

اپنے ہی خون میں نہالیے ہم
آگ کا دریا کون کرتا پار

اس سے مل کر نجات پانا ہے
یار بستا ہے میرا گنگا پار

۶

لازم ہے جینے کو سانس
آرے جیسی کھینچو سانس

روزِ حساب سر آنکھوں پر
لیکن گن کر مت لو سانس

دیکھو ٹوٹ نہ جائے ڈور
دل سے مت الجھاؤ سانس

نپٹا دیں گے آندھی کو
قابو میں آئے تو سانس

آنسو بھی نایاب ہوئے
اب کیسے ٹھنڈی ہو سانس

منزل بھی سر کرلیں گے
ہم سفرو! لینے دو سانس

۷

الزام کوئی یار طرح دار پر نہیں
مقبولیت غزل کی گلوکار پر نہیں

شہرت کی دھوپ کیسے چڑھی، کب اتر گئی
دھبّہ ذرا سا بھی مرے کردار پر نہیں

ہم ایسے وضعدار بھی اس قافلے میں ہیں
جن کو بھروسہ قافلہ سالار پر نہیں

جُھلسا دیا مجھے مرے اندر کی آگ نے
تہمت کسی کے سایۂ دیوار پر نہیں

ثابت کرے کوئی کہ محبت بھی ہے گناہ
بارِ ثبوت تیرے گنہگار پر نہیں

سب کو کھٹک رہی ہے مظفر کلاہِ کج
نقاد معترض ترے اشعار پر نہیں

۸

خنجر کو نیام دے سکو تو
اور اذنِ کلام دے سکو تو

بے نام سی اک خلش ہے دل میں
تم ہی کوئی نام دے سکو تو

انعام ہے نفسِ مطمئنہ
خواہش کو لگام دے سکو تو

یہ کام بھی کچھ بُرا نہیں ہے
بے کاروں کو کام دے سکو تو

اے چاند کے ہم سفر ستارو!
میرا بھی سلام دے سکو تو

مطلوب ہے آشتی کا پیغام
شعرائے کرام دے سکو تو

پاسنگ ہیں دو جہاں مظفر
دو جُرعہ کے دام دے سکو تو

۹

اولاد بھی ظالم کی دمساز نہیں ہوتی
اللہ کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی

اخلاص کہاں ہوگا تم سرد مزاجوں میں
برفیلی ہواؤں میں پرواز نہیں ہوتی

دل چیرے ہیں غنچوں کے پرنوچے ہیں پھولوں کے
حالاں کہ کوئی تتلی شہباز نہیں ہوتی

دم سادھ کے بیٹھے ہیں چوراہوں پہ سناٹے
بندوق چلائیں تو آواز نہیں ہوتی

دعوت میں بہت جھینپے پیوند تھے کپڑوں میں
ظاہر ہے کہ ہر بستی شیراز نہیں ہوتی

ہم عصروں کو یہ نکتہ سمجھاتے ہیں اکثر ہم
دولت کی گراں بخشی اعزاز نہیں ہوتی

۱۰

سبھی غنچوں کو تتلی چاہیے تھی
سزا بلبل کو ملنی چاہیے تھی

نمو کا شوق کرلیتے ذرا سا
ہمیں تھوڑی سی مٹی چاہیے تھی

ہمارے رہنماؤں کو بہر طور
قلمدان اور کرسی چاہیے تھی

نشیمن بن گیا ہوتا ہمارا
مگر اوپر کی مرضی چاہیے تھی

زمیں زرخیز ہے لیکن کریں کیا
پنپنے کو ہوا بھی چاہیے تھی

نہ کرتا کج روی کیسے مظفر
پیادے کو ترقی چاہیے تھی

۱۱

تقاضا ہے قضا کا، سکۂ ہستی بُھنا لیں گے
بہت ہونی کو بھگتا اب نہ ہونے کا مزا لیں گے

اٹھاؤ گے اگر تلوار، سینہ تان لیں گے ہم — جفا سے ہات اٹھاؤ گے تو سر اپنا جھکا لیں گے
ہماری شاعری کا سچ انھیں اچھا نہیں لگتا — زیادہ سے زیادہ جان لیں گے اور کیا لیں گے
کنارے آ کے لنگر ڈالنے سے کچھ نہیں ہوگا — نہ مانے گا تو ہم گرداب کشتی میں اُٹھا لیں گے
کبھی اُن کی جوانی بھی تو بے قابو ہوئی ہوگی — بغاوت کرنے سے پہلے بزرگوں کی دعا لیں گے
مظفرؔ جانے کیوں جاتی رہی مٹی سے وہ خوش بو — چلو اٹھاسیویں منزل پہ چلتے ہیں، ہَوا لیں گے

۱۲

خوابوں پر تعبیر کون رکھ دیتا ہے — گلدانوں میں تیر کون رکھ دیتا ہے
خوش تو ہوتی ہے دنیا سچ کہنے پر — گردن پر شمشیر کون رکھ دیتا ہے
سب کے آگے برتن تھوڑی ہوتے ہیں — ہر برتن میں کھیر کون رکھ دیتا ہے
سارے آئینوں میں ہر پس منظر میں — تیری ہی تصویر کون رکھ دیتا ہے
صبح کے مارے پھیکے پھیکے تاروں میں — دوبارہ تنویر کون رکھ دیتا ہے
اپنے بس میں اشکوں سے تر کرنا تھا — غزلوں میں تاثیر کون رکھ دیتا ہے

۱۳

جنگل نے اُٹھائے ہیں بیاباں نے اُٹھائے — پھر نازِ جنوں شہرِ نگاراں نے اُٹھائے
کھلتے ہیں وہاں پھول جہاں دھول اڑا دی — وحشی سے بڑے فیض گلستاں نے اٹھائے
یہ سچ ہے کہ فطرت سے میں آزار طلب ہوں — بہتان عبث مقتل و زنداں نے اٹھائے
دریا میں ہر اک موج تھی اکتائی ہوئی سی — طوفان مرے دیدۂ گریاں نے اٹھائے
خنجر نے تڑپ کر مجھے سینے سے لگایا — کچھ زخم ترس کھا کے نمک داں نے اٹھائے
محبوب کے رخ سے کبھی پردہ نہ اٹھایا — اہمال کے الزام غزل خواں نے اٹھائے

۱۴

بیش قیمت اس طرح غم ہوگئے — سب مرے اشعار میں ضم ہوگئے
شیشہ و ساعت میں سر دھنتی ہے ریت — عمر کے اسّی برس کم ہوگئے
آپ کو مسرور ہونا چاہیے — قید ہستی سے رہا ہم ہوگئے
ہے ہمارے گھر کی چھت نیچی بہت — جس میں شہزادوں کے سر خم ہوگئے
اَٹ گئے دلی کے کوچے ریت سے — میر کے دیوان بھی نم ہوگئے
خوب رو پھرنے لگے گیسو بدوش — کیا کریں آنچل تو پرچم ہوگئے

○○○

نقش ہائے رنگ رنگ

ڈاکٹر محمد اسرار الحق
استاد عظیم نیشنل اسکول، بہادر گنج، کشن گنج (بہار)، رابطہ نمبر: 7903683305

بہار میں فارسی کے فروغ میں اولیائے کرام اور خانقاہوں کا کردار

صوبۂ بہار میں فارسی شعر و ادب کا جائزہ لیا جائے تو بلاشک و شبہہ ہمیں اس بات کا ثبوت مل جائے گا کہ یہاں فارسی زبان و ادب کو فروغ دینے میں اولیائے کرام اور خانقاہوں نے نمایاں کردار انجام دیئے ہیں۔ طبقات ناصری کے حوالے سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۱۹۹ء میں بختیار خلجی نے بہار کو فتح کرنے کے بعد یہاں دارالعلوم اور مساجد قائم کیے۔ خلجی حکمرانوں کے امیروں اور حاکموں نے بھی اس پالیسی پر عمل کرتے ہوئے مساجد، خانقاہیں اور مدرسے قائم کیے تاکہ عام لوگوں میں فارسی و عربی زبان و ادب رائج ہو سکے۔ بہار میں انھیں حالات کے تحت فارسی زبان و ادب کو فروغ حاصل ہوا۔ اس زبان کو حکومت کے کاموں میں مقامی زبانوں کے ساتھ ساتھ استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ عوامی زبان نہ بن سکی اور خانقاہوں، مدرسوں اور اہلِ علم کی مجلسوں تک ہی محدود رہی۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ فارسی زبان و ادب کا تعلق اولیائے دین اور صوفیۂ کرام سے تھا۔ یہ صوفیہ اور اولیا اپنے وقت کے مشہور و معروف عالم و فاضل ہوا کرتے تھے۔ مذہبیات کے ساتھ ساتھ ادب پر بھی ان کو عبور ہوتا تھا۔ دینی اور متصوفانہ درس وہ فارسی زبان میں دیا کرتے تھے۔ اس کے فروغ کے لیے حکومتِ وقت سے انھوں نے مدد نہیں لی، بلکہ ذاتی طور پر فارسی نظم و نثر میں تخلیقات کا سلسلہ جاری رکھا۔ انھوں نے فارسی زبان کو نہ صرف ادب کے لیے استعمال کیا بلکہ مقامی حالات کو بھی فارسی زبان میں ڈھال دیا۔ لہٰذا اس دور کے فارسی شعرا کے کلیات و دواوین کا مطالعہ ہمارے لیے نہ صرف ادبی حیثیت سے اہم ہے بلکہ اس میں محفوظ خزانہ دورِ حاضر میں بھی قابل استفادہ ہے۔ ہمیں اس وقت کے فارسی ادب میں انسانی محبت و اخوت کی وہ جھلک ملتی ہے جس کو اولیائے کرام نے اپنے کردار و تعلیم سے نمایاں کیا تھا۔ فارسی ادب و شعر کے مراکز میں اس وقت منیر، بہار شریف، باڑھ، راجگیر اور شمالی بہار میں حاجی پور قابلِ ذکر ہیں۔ صوفیہ کرام اور اولیائے دین نے بہار میں تبلیغ دین کے لیے فارسی زبان کا سہارا لیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری (متوفی ۷۷۲ھ)

کا نام قابلِ ذکر ہے۔ بہار کے صوفی شاعروں اور ادیبوں میں ان کا نام سرفہرست ہے۔ ان کی پیدائش پٹنہ ضلع کے منیر گاؤں میں ہوئی۔ والد مخدوم یحییٰ منیری اپنے وقت کے مشہور صوفی بزرگ تھے۔ ان کی والدہ محترمہ کا بھی تصوف میں خاص مقام تھا۔ شیخ شرف الدین احمد نے تعلیم و تربیت بنگال کے سونار گاؤں میں حاصل کی تھی۔ انھوں نے اسلامی علوم و حکمت، شاعری، منطق اور فلسفہ میں بھی خاص مہارت حاصل کی تھی۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے دہلی گئے۔ یہاں انھوں نے شیخ نجم الدین کبریٰ فردوسی سے تعلیم حاصل کی۔ یہاں سے واپس ہو کر شاہ آباد ضلع کے بہیار کے جنگلوں میں اور راجگیر کے پہاڑوں میں عبادت کرتے رہے۔

شیخ شرف الدین احمد کی وفات ۱۳۸۰ء میں ہوئی۔ ان کی تصانیف کی زبان سادہ اور رواں ہے۔ انھوں نے تقریباً چھبیس کتابیں لکھیں۔ فارسی ادب میں ان کی عظمت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ اکبر بادشاہ کے دربار کے مشہور فارسی عالم ابوالفضل نے اپنی کتاب 'آئین اکبری' میں ان کی تصانیف کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ جناب احمد چرم پوش شیخ شرف الدین احمد کے خاندان کے دوسرے بزرگ صوفی، فلسفی اور شاعر تھے۔ چمڑے کا لباس پہننے کے سبب چرم پوش کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ بہار کے دوسرے صوفیہ کرام کی طرح انھوں نے مختلف مذاہب میں حقیقت کو پہچانا۔ فارسی میں ان کا دیوان موجود ہے۔ ان کا انتقال ۱۳۶۴ء میں ہوا۔

جناب مظفر شمس بلخی بھی اس زمانے کے مشہور و معروف شاعر و ادیب گزرے ہیں۔ ان کی پیدائش بلخ میں ہوئی۔ تعلیم و تربیت سے فراغت حاصل کرنے کے بعد یہ بہار آئے اور شیخ شرف الدین احمد کے زمرۂ شاگردان میں شامل ہو گئے۔ دہلی میں دو سالہ قیام کے دوران یہاں کے مشہور و معروف مدرسہ فیروز شاہی میں معلّمی کا کام انجام دیتے رہے۔ ان کی وفات ۱۳۸۶ء میں ہوئی۔ فارسی نظم و نثر میں ان کو بلند مقام حاصل ہے۔ ان کے کلام میں صوفیانہ اور فلسفیانہ رجحانات غالب ہیں۔

اس زمانے کے صوفیوں میں شیخ حسین عرف 'نوشۂ توحید' کا نام بھی قابلِ ذکر ہے۔ یہ بھی شیخ شرف الدین احمد کے شاگردوں میں تھے۔ انھوں نے دیگر کتابوں کے علاوہ فارسی میں ایک مثنوی بھی لکھی۔ عربی زبان میں وحدت الوجود کے موضوع پر ایک کتاب تصنیف کی اور اس کا نام 'حضرت الخمس' رکھا، جس کا ترجمہ بعد میں ان کے لڑکے جناب شیخ حسن نے فارسی میں کیا اور 'کاشف الاسرار' نام رکھا۔ یہ کتاب پٹنہ سے ۱۸۹۶ء میں شائع ہوئی۔ ایک اور صوفی بزرگ شیخ احمد لنگر دریا اس عہد کے فارسی علم و ادب میں خاص درجہ کے حامل ہیں۔ یہ اپنے کردار اور صوفیانہ مرتبے کی وجہ سے 'لنگر دریا' کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی تصانیف میں 'مونس القلوب' قابلِ ذکر ہے۔ اس کتاب کا طرز وہی ہے جو اس زمانے کے مکتوبات اور ملفوظات میں ملتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے اس زمانے کے صوفیہ کرام کے خیالات کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ان کا دیوان بھی مشہور ہے

جس میں تغزلانہ رنگ اور تصوف کی جھلک ہے۔ان شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ اس عہد میں بہار میں فارسی اور عربی کے دوسرے شعرا اور ادبا بھی موجود تھے جن کا ذکر مختصر طور پر ملتا ہے۔'مناقب الاصفیا' کے مصنف شاہ شعیب، فارسی نعت 'شرف نامہ' کے مولف ابراہیم قیام فاروقی اور 'مفتاح الفیض' کے خالق شیخ حسن طلافہمی وغیرہ کے نام مشہور ہیں۔

شمالی بہار میں بھی اس دور میں مشہور ومعروف صوفیہ کرام اور علمائے دین گزرے ہیں جنھوں نے تبلیغ دین کا کام اپنے ملفوظات ومکتوبات کے ذریعہ انجام دیا اور اس خطے کے لوگوں کو فیضِ عام پہنچایا۔ بہار کے ایک بڑے صوفی جناب قاضن شطاری ہیں جن کا مقبرہ ویشالی کے نزدیک بنیابساڑھ میں حاجی پور سے تقریباً ۲۲ رمیل جانب مغرب وشمال واقع ہے۔ان کا عہد مغلوں سے پہلے کا ہے۔آج بھی ان کے مزار پر ہر سال عرس اور میلہ لگتا ہے اور بلاتفریق مذہب وملت ہندو اور مسلمان دونوں زیارت کرنے جاتے ہیں۔ان کے اشعار 'مدن الاسرار' میں ملتے ہیں۔ان کے دولڑکے تھے، دونوں ہی صوفی اور ولی صفت تھے۔ایک سریا گنج مظفر پور کے جناب عبدالرحمن اور دوسرے موضع تین کول، حاجی پور کے جناب ابوالفتح ہدایت اللہ سرمست تھے۔ ان کے فرزندوں میں جناب رکن الدین جوشیوراجندرہا (حاجی پور) کے تھے۔اپنے زمانے کے مشہور صوفی تھے۔

جناب شیخ فتو اور شیخ برہان نام کے دو بزرگان دین فیروز شاہ تغلق کے دور میں سلیم آباد آئے اور شمالی بہار کے برگذر موضع میں شہید ہوئے۔حاجی پور کے میر ابراہیم چشتی بھی اسی عہد میں مشہور صوفی بزرگ گزرے ہیں۔ پندرہویں صدی عیسوی میں مخدوم سید احمد پیردمڑیا اور ان کے دو بھائی سید مبارک اور سید حسین حاجی پور کی برگزیدہ ہستیوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ چودہویں صدی عیسوی کے آخر اور پندرہویں صدی کے شروع میں سارن ضلع کے مشہور ومعروف بزرگ سید حسن دانش مند کا نام تصوف اور علم وادب کی تاریخ میں نہایت اہم ہے۔ان کے خسر محترم جناب میر ملک فتح اللہ بلند پایہ کے بزرگ تھے۔ دربھنگہ ضلع کے شیخ سلطان حسین، شیخ برکت اللہ قتال، شیخ شمس الدین عرف شیخ ثمن، پیر شاہ ناظر اور شیخ تاج الدین مداری وغیرہ اس زمانے کے روحانی بزرگوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ان حضرات نے اپنے اخلاق حسنہ اور افعال پسندیدہ کے ذریعہ رشد وہدایت کا کام اس علاقے میں نہایت حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیا۔

مغلوں کے عہد میں فارسی علم وادب اور شاعری کا سنہرا دور شروع ہوا۔اس زمانے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ خود مغل بادشاہوں نے فارسی علم وادب کی ترویج واشاعت میں حصہ لینا شروع کر دیا۔اکثر مغل حکمراں خود بھی اچھے شاعر اور مصنف تھے، جنھوں نے فارسی اور ترکی نظم ونثر میں اپنی تخلیقات پیش کیں۔ یہ رواج بابر کے وقت سے شروع ہوکر اس خاندان کے آخری بادشاہوں تک جاری رہا۔ بابر اور ہمایوں خود بھی فارسی اور ترکی کے اچھے عالم تھے۔اکبر نے فارسی علم وادب کو فروغ دینے کے لیے شاعروں،ادیبوں اور دانشوروں کی

بڑی حوصلہ افزائی کی۔ان کے دور میں 'ملک الشعرا' کا عہدہ قائم ہوا اور سب سے پہلے غزالی مشہدی اس پر نامزد ہوا۔اسی زمانے میں فتح پور سیکری، آگرہ اور دہلی میں تعلیمی اور ادبی مراکز باضابطہ قائم ہوئے۔ جہاں گیر بذات خود فارسی کا ایک اچھا عالم اور شاعر تھا۔شاہجہاں کو بھی فارسی ادب سے خاص لگاؤ تھا۔اورنگ زیب اور دوسرے مغل بادشاہوں نے بھی علم وادب کی ترویج کا سلسلہ اپنے زمانے میں قائم رکھا۔ان مغل بادشاہوں نے ملک کے مختلف صوبوں میں فارسی علم وادب اور تعلیم کو فروغ دیا۔ان کے زمانے میں بہار میں فارسی اور عربی کے کئی دینی اور تعلیمی مراکز کام کررہے تھے۔ان میں بہار شریف، حاجی پور اور بھاگلپور سب سے زیادہ اہم اور مشہور مراکز تھے، جہاں فارسی اور عربی کے علاوہ دینی تعلیم کا بھی عمدہ انتظام تھا۔اس کام کو اولیائے وقت اور علمائے کرام انجام دیتے تھے ،جن کی وقتاً فوقتاً امداد کے لیے شاہانِ وقت اور امرا کی طرف سے جاگیریں ملتی تھیں۔ بہار شریف اس وقت اسلامی ادب اور تہذیب وتمدن کا گہوارہ تھا۔ یہ خطہ ہندوستان کے جید عالم شمس الحق بدھ حقانی کا مولد و ماوا تھا۔چنانچہ ان کی تعلیم سے فیض یاب ہونے کے لیے ملک کے دور دراز حصوں سے طلبا بہار شریف آیا کرتے تھے۔

دوسرا اہم مرکز حاجی پور تھا۔دراصل حاجی پور دینی اور تعلیمی مرکز حسن پور عشری (سارن) کی ایک شاخ تھا، جہاں فارسی اور عربی کی تعلیم باضابطہ طور پر دی جاتی تھی۔ یہاں میر ملک فتح اللہ کا مدرسہ پورے ملک میں مشہور ومعروف تھا اور بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ جہاں علم وادب کے تشنگان ملک کے تمام حصوں سے آکر اپنی پیاس بجھاتے تھے۔حتی کہ دہلی جو ملک کا اہم تعلیمی مرکز تھا، وہاں سے بھی طلبا میر ملک فتح اللہ کی غیر معمولی علمی وادبی صلاحیت کی شہرت سن کر آتے اور علم ودانش سے فیض یاب ہوتے تھے۔ چنانچہ مخدوم سید احمد پیردمڑیا کے والد محترم جناب سید حسن دانش مند میرٹھ سے بغرض تعلیم سارن آئے اور اس مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ سید حسن دانش مند کی علمی اور ادبی ذہانت وفراست کو دیکھ کر میر ملک فتح اللہ بہت متاثر ہوئے اور اپنی لڑکی کی شادی ان سے کردی۔ واضح ہو کہ یہ وہی سید حسن دانش مند ہیں جو صاحبِ دیوان مخدوم سید قاسم حاجی پوری کے دادا تھے۔ میر ملک فتح اللہ کی وفات کے بعد سید حسن دانش منداس مدرسہ کے روح رواں ہوئے اور درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ان کا انتقال ۹۴۵ھ میں ہوا۔اس کے بعد ان کے لڑکوں میں مخدوم سید احمد پیردمڑیا حاجی پور خانقاہ کے سجادہ نشیں مقرر ہوئے اور اس خانقاہ سے متصل مدرسہ میں علم ودانش سے لوگوں کو مستفیض کرتے رہے۔سید حسن دانش مند کے دوسرے لڑکے مخدوم سید مبارک اپنے والد کی گدی (حسن پور عشری) سارن کے سجادہ نشیں ہوئے، اور ان کے تیسرے لڑکے مخدوم سید حسین بھاگل پور چلے گئے اور وہیں رہنے لگے۔مخدوم سید احمد پیردمڑیا کا انتقال حاجی پور میں ۹۷۲ھ میں ہوا اور میناپور میں مدفون ہوئے۔ان کا مزار سنگ مرمر کا اب تک حاجی پور میں ان کے علمی اور روحانی فضل کے گواہ کی حیثیت سے قائم ہے، جہاں

ہر سال لوگ زیارت کی خاطر جایا کرتے ہیں۔

سید احمد پیر دمڑیا کے صاحب زادے عبدالقادر عرف امیر بڑھ اپنے دادا سید حسن دانش مند کی گدی کے سجادہ نشیں ہوئے اور لوگوں کو روحانی وعرفانی تعلیم دیتے رہے۔ ان کا انتقال اپنے والد کی زندگی ہی میں ۹۵۵ھ میں ہوا۔ مخدوم سید قاسم اپنے والد سے بیعت وخلافت حاصل کرکے بیناپور (حاجی پور) کے خاندان کے سجادہ نشیں ہوئے۔ وہ فارسی سے خاص شغف رکھتے تھے۔ ان کا انتقال ۱۰۱۳ھ میں ہوا اور سید پور (حاجی پور) میں مدفون ہوئے۔ مخدوم سید محمد دمڑیا ثانی اپنے والد سے اجازت حاصل کرکے چند دنوں تک سیر وسیاحت کرتے رہے۔ اسی سیاحت کے دوران یہ راجگیر گئے اور شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کے حجرہ میں داخل ہوکر مراقبہ میں چلے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ حالت مراقبہ میں یہ شیخ موصوف کے روحانی فیض سے مشرف ہوئے اور ان کے ایما اور اشارے سے پٹنہ شہر کے مشرق سملی محلہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ اب یہ محلہ ان کے نام پر 'دمڑی' محلہ کہلاتا ہے۔ ان کا مزار اسی دمڑی محلہ میں دریا کے کنارے واقع ہے جو مرجع خاص وعام ہے۔

تیسرا اہم مرکز اس عہد میں بھاگلپور تھا، جس کے بارے میں کمیٹی آف ریئویو کے صدر جان شور نے اگست ۱۸۸۳ء میں فورٹ ولیم میں لکھا ہے۔ اس کے مطابق اس مدرسہ کو جہاں گیر کے زمانے میں مولانا شہباز نے قائم کیا تھا۔ آپ عالم باعمل ہونے کے ساتھ ایک بڑے روحانی پیشوا بھی تھے۔ ان کے روحانی کمالات کا شہرہ آج بھی چاردانگ عالم میں ہے اور رہتی دنیا تک باقی رہے گا۔ ان کے مدرسہ میں تقریباً دو سو طالب علم تھے، جن کے اخراجات ایک خاص فنڈ سے ادا ہوتے تھے۔ مولانا موصوف کے چار لڑکے تھے جن میں محمد سلام اپنے والد بزرگوار کے جانشین ہوئے۔ شاہ شجاع نے ۱۰۶۳ھ میں اس مرکز کے خرچ کے لیے ایک جاگیر دی تھی جو کہل گاؤں پرگنہ کے پانچ سو اور بھاگلپور کے صدر مقام کے چند بیگھے زمین پر مشتمل تھی۔ اس سلسلے کی رپورٹ محمد شاہ بادشاہ کے زمانے تک موجود ہے، جس کے وقت میں جناب مولانا عابد صاحب اس مرکز کے روحِ رواں اور نگہبان تھے۔ ان کے وقت میں طلبا کی تعداد گھٹ کر تیس رہ گئی تھی۔

متذکرہ بالا مراکز کے علاوہ سولہویں صدی عیسوی میں بہار کے مختلف شہروں میں کئی مدرسے اور دارالعلوم قائم ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک چشتیانہ میں تھا جس کے معلم 'مرغوب الذاکرین' کے مصنف عبدالمقتدر تھے۔ دوسرا مدرسہ مراد پور میں تھا۔ تیسرا امرداد محلہ میں قاضی ضیاء اللہ کے ماتحت تھا، جنھوں نے شیخ صالح کی شرکت میں مغل شاہزادہ عزیز الدین کو تعلیم دی جو بعد میں عالم گیر ثانی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس وقت باڑھ فارسی علم وادب کے لیے کافی مشہور تھا، جہاں کے عالم اللہ بہت دانش مند تھے۔ ان کی مسجد اور مقبرہ آج بھی قائم ہے جن پر شاہجہاں کے وقت کا کتبہ درج ہے۔ دوسرا مشہور مدرسہ راجگیر میں تھا، جہاں ملا دانش مند اور ان کے لڑکے ملا عبدالسمیع درس دیتے تھے۔ صوبہ میں اس طرح کے اور بھی کئی مدرسے چل رہے تھے۔

اس زمانے میں بہار میں بہت سے مشہور ومعروف معلّمین ہوئے جنھوں نے تیموری خاندان کے شہزادوں کو تعلیم دی۔ مولانا قاضی مجیب اللہ بن مولانا حفیظ اللہ نے جہاں دارشاہ کو پڑھایا۔ اکبر بادشاہ کے عہد میں مولانا امان اللہ بھی ایک مشہور عالم تھے جن کو شاہی خاندان کے شہزادوں کو پڑھانے کے عوض میں جاگیر ملی تھی۔ انھوں نے محمد معظم (بعد میں شاہ عالم بادشاہ ہوئے) کو بھی پڑھایا تھا۔ (تذکرہ علمائے بہار، ص ۱۳۱) ان کا انتقال اورنگ زیب کے زمانے میں نہایت ضعیفی کے عالم میں ہوا۔ شہزادہ معظم کو جن دوسرے بہاری عالموں نے تعلیم وتربیت دی ان میں ملا ضیاء الدین محدث اور فرید پور کے ملا سراج الدین احمد بن ملا سعید تھے۔

اس وقت بہار میں سب سے زیادہ مشہور ومعروف سیف خان کا مدرسہ تھا جو دریائے گنگا کے کنارے شیر شاہ کے قلعے کے مغرب میں واقع تھا۔ یہ مدرسہ بہار کے مغل گورنر 'سیف خان' کے ذریعہ قائم ہوا تھا۔ بہار کے دوسرے گورنر نواب زین الدین ہیبت جنگ کے زمانے میں یہ مدرسہ کافی عروج پر تھا۔ نواب مذکور نے اس مدرسہ سے ملحق ایک بڑا کتب خانہ قائم کیا۔ اس مدرسہ کے نصاب کے متعلق ابوالفضل نے لکھا ہے کہ یہاں ہر ایک طالب علم کو علم نجوم، اقلیدس، منطق، ریاضی، طبعیات، حکمت، تاریخ اور مذہبیات کی تعلیم درجہ بدرجہ دی جاتی تھی۔ بلاک مین نے بھی اس کے نصاب کی تفصیل پیش کی ہے۔ اس طرح کا نصاب مغلیہ عہد میں بہار کے مختلف مدرسوں میں رائج تھا۔ یہ نصاب 'درس نظامیہ' کے نام سے مشہور تھا۔ ان مدرسوں میں سائنس اور دینی تعلیم کے علاوہ علم سیاسیات کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان کی خاص خوبی یہ تھی کہ ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کے طلبا یہاں تعلیم سے مستفیض ہوتے تھے۔ اس ضمن میں بلاک مین نے لکھا ہے کہ سولہویں صدی سے ہندو لوگ بھی جوش وخروش کے ساتھ فارسی علم وادب سے شغف اور انہماک رکھنے لگے، اور اس شد ومد سے تعلیم حاصل کرنے لگے کہ دوسری صدی کے خاتمہ تک ان کی علمی اور ادبی صلاحیت مسلمانوں کے برابر ہوگئی۔ فارسی زبان وادب میں جن ہندو عالموں نے شہرت حاصل کی ان میں راجا رام نرائن موزوں، علی وردی کے دیوان راجا کرت سنگھ، بالمکند مسعود، مہاراجا کلیان سنگھ، حاجی پور کے لکشمی نرائن، پٹنہ کے رام پرشاد اور دیوان کانجی کے علاوہ ٹکاری کے مہاراجا متراجیت سنگھ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ٹکاری کے مہاراجا نے عربی وفارسی میں بڑی اچھی صلاحیت حاصل کی تھی۔ انھوں نے گیا ضلع کی زراعت سے متعلق ایک رسالہ بھی لکھا تھا۔ اس مجموعی جائزے سے بہار میں فارسی زبان وادب کے فروغ میں اولیائے کرام اور خانقاہوں کی خدمات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

○○○

منظر عباس زیدی
ریسرچ اسکالر جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، رابطہ نمبر: 8802829851

ایرانی معاشرے میں مرد سالاری کا وجود

جلال آل احمد کی داستانوں کے حوالے سے

انیسویں صدی کے وسط میں ایرانی معاشرے نے جدیدیت کی طرف قدم بڑھائے جس میں خواتین کے حقوق بھی شامل تھے۔ ایران میں آئینی تحریک نے ایرانی خواتین کو اپنے حقوق کے لیے لڑنے کی ترغیب دلائی۔ اس کے علاوہ دوسری جنگ عظیم کے وقوع اور اس کے نتیجے میں رضا خان کے خاتمے نے ایران میں خواتین کی تحریک کا ایک اور صفحہ کھول دیا۔ ایران میں قاچاری اور پہلوی سلطنت کے دور تک خواتین کا ملاً مردوں کے تابع و ماتحت زندگی گزارتی تھیں۔ ان کے پاس خاص اختیارات نہیں تھے۔ وہ مردوں کی تابع اور فرماں بردار ہوکر محرومیت اور لاچاری کی زندگی بسر کرتی تھیں۔

اسی موقع پر ایران میں برابری کے لیے خواتین کی جدوجہد کو منظوری دی گئی اور اس تحریک کی ایک بڑی تعداد میں ایرانی ادیبوں اور دانش وروں جیسے محمد علی حجازی، صادق ہدایت، علی دشتی اور بزرگ علوی نے بھی حمایت کی۔ فارسی ادب میں یہ دانش ور خواتین کے حقوق کو پہچاننے والے اولین افراد تھے اور انھوں نے ایران میں خواتین کی صورت حال کو مستحکم کرنے کی بھرپور کوششیں کیں۔

جلال آل احمد ان مشہور مصنّفین و مفکرین میں سے تھے جنھوں نے اس تحریک کی حمایت کی۔ وہ اپنے کارناموں میں خواتین کی صورت حال کو صحیح طریقے سے بیان کرنے کے قائل تھے۔ انھوں نے ہمیشہ ایران جیسے مرد سالار معاشرے میں خواتین کے حقوق کی حمایت کی۔ آل احمد کے مطابق ایرانی معاشرے میں خواتین کی اس پس ماندہ اور ذلت آمیز صورت حال کا ذمہ دار مرد سالاری کا وجود ہے۔ ان کی ابتدائی داستانیں معاشرے کی محروم خواتین کے مسائل کے بیان پر مشتمل ہیں۔

جلال آل احمد کی کہانیوں میں خواتین مرکزی مقام رکھتی ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں اکثر خواتین اور ان کے مسائل پر توجہ دی ہے۔ ان کی کہانیوں کے مجموعے 'زن زیادی'، 'سہ تار' اور 'پنج داستان' خواتین کے

مسائل سے لبریز ہیں۔ آل احمد کے نظریہ میں معاشرے میں مرد سالاری کا وجود، خواتین کی پس ماندگی کا سبب ہے۔ وہ اپنی داستانوں میں خواتین کا دفاع کرتے ہیں اور ان کی محروم اور محدود زندگی پر تنقید کرتے ہیں۔ آل احمد ایرانی خواتین کی ذلت و بدبختی کو نمایاں کرکے ان کی صورت حال کو بہتر بنانے کی ترغیب دلاتے ہیں۔ وہ مردوں اور عورتوں کے لیے مساوی حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں اور معاشرے میں ان کی پس ماندگی پر تنقید کرتے ہیں۔ رضا شاہ کے ذریعہ خواتین کے حجاب پر جبراً پابندی پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کیا آج مرد و عورت کے حقوق کاملاً برابر ہیں؟ ہم نے صرف اسی پر اکتفا کرلیا کہ جبراً ان کے سروں سے حجاب کو ہٹا دیا جائے اور ان کے لیے کچھ مدرسے کھول دیے جائیں۔ پھر اس کے آگے کچھ نہیں کیا۔ کیا اتنا ہی کافی ہے؟ حقیقتاً ہم نے کیا کیا؟ ہم نے خواتین کو صرف معاشرے میں دکھاوے اور نمائش کی اجازت دی ہے۔ جب تک مردوں اور عورتوں کی معاشرتی خدمات کی قدر اور ان کے کام کی اہمیت مساوی نہیں ہوگی، جب تک عورت مرد کے ہم دوش ہوکر معاشرے کے کاموں کو انجام دینے کی ذمہ داری قبول نہیں کرے گی، جب تک مرد اور عورت کے درمیان مادی و معنوی طور سے مساوات و برابری برقرار نہیں ہوگی، تب تک خواتین کو عملی آزادی دینے کے سلسلے میں سالوں بعد بھی ہم اپنے مقصد تک نہیں پہنچ سکیں گے اور خواتین صرف مغربی محصولات پاؤڈر اور لپسٹک کے خریداروں کی صفوں کو ہی بڑھاتی رہیں گی۔''(۱)

بعض مفکرین و مصنّفین کا یہ نظریہ ہے کہ آل احمد خواتین کے مخالف تھے اور انھوں نے اپنی کہانیوں میں خواتین کی تحقیر و تذلیل کی ہے۔ جواد اسحاقیان اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

جلال آل احمد کی داستانوں میں ماں کے علاوہ، کوئی ایسی خاتون کردار نہیں ہے جس کو زنے کہ (حقیر عورت) یا دخترہ (حقیر لڑکی) نہ کہا گیا ہو جو اس کی خواتین سے مخالفت اور بیزاری کو نمایاں کرتا ہے۔(۲)

درحقیقت آل احمد نے اپنی داستانوں میں اس دوران کی خواتین کی صورت حال کو صادقانہ طور سے بیان کیا ہے اور خواتین کے حالات بیان کرنے سے اس کا مقصد خواتین کی فلاح و بہبودی ہے۔ جلال آل احمد کی کہانیوں میں خواتین خود کو حقیر تصور کرتی ہیں اور مرد کے زیر اقتدار زندگی بسر کرتی ہیں۔ ان کے پاس نہ کوئی حق ہے اور نہ آزادی۔ آل احمد نے مردوں پر خواتین کے منحصر ہونے کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ذیل میں جلال آل احمد کی داستانوں سے کچھ اقتباسات بطور مثال ذکر کیے جاتے ہیں۔

داستان بچۂ مردم: یہ کہانی ایک ایسی خاتون کے بارے میں ہے جس کو اس کا سابق شوہر طلاق دے دیتا ہے اور وہ چوں کہ غریب و مفلس ہے اور زندگی گزارنے کے لیے مرد پر منحصر ہے اس لیے دوسری شادی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ دوسرے شوہر کے کہنے پر اپنے عزیز ترین رشتہ اور جگر گوشہ، اپنے

بیٹے کو بھی ترک کر دیتی ہے:

''تو میں کیا کر سکتی تھی؟ میرا شوہر مجھے بچے کے ساتھ رکھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ بچہ صرف میرا تو نہیں تھا، میرے سابقہ شوہر کا تھا جس نے مجھے طلاق دے دی تھی اور بچے کو لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو کیا کرتا؟ ٹھیک ہے مجھے بھی تو زندگی گزارنا تھی۔ اگر میرا یہ شوہر بھی مجھے طلاق دے دیتا، تو میں کیا کرتی؟ اس لیے میں مجبور تھی کہ کسی طرح بچے کو ترک کر دوں۔''(۳)

جلال آلِ احمد نے اپنی داستانوں میں وافر مقامات پر خواتین کی بے چارگی، غربت و مفلسی، محرومیت اور جنسی نابرابری کا ذکر کیا ہے اور وہ خواتین کی اس حالت سے بہت رنجیدہ ہیں۔

لاک صورتی: یہ داستان ایک خاتون کردار بنام ہاجر کے بارے میں ہے جو نیل پالش (Nail Polish) کو بہت پسند کرتی ہے اور اس کو لگانا چاہتی ہے لیکن غربت و مفلسی اور اپنے شوہر کے مذہبی اعتقاد کی وجہ سے اس کو پورا نہیں کر پاتی۔ اقتباس دیکھیے:

''آج تک اس خاتون نے اپنے ناخنوں کو پالش نہیں کیا تھا۔ لیکن وہ جب بھی مختلف طرح کے لباس پہننے والی خاتون کے پاس سے گزرتی یا اگر اپنے محلے میں شادی میں کام کرنے کے لیے جاتی تو نیل پالش کو ہی دیکھتی تھی۔ اس نے دیکھا تھا کہ خواتین مختلف رنگ کی نیل پالش کا استعمال کرتی ہیں۔ اس کو گلابی نیل پالش پسند تھی۔ ایک دو بار Lipstick کی بھی خواہش کی تھی مگر وہ قیمتی تھی۔''(۴)

کسی طرح ہمت کر کے ہاجر نیل پالش کو خرید لیتی ہے تو اس کا شوہر اس پر غصہ ہوتا ہے اور اس کو مارتا ہے:

''رجب علی ۱۵ر منٹ میں گھر آیا اور ہاجر کو بھی کمرے میں لے گیا۔ او کے! اپنی شرارت سے باز آ جاؤ یا مار کھا کر ہی مانو گی؟ ہاجر رونے لگی۔ روتی کیوں ہو؟ اے ذلیل اور کم عقل عورت تو نماز پڑھتی ہے، وضو بھی کرتی ہے مگر یہ ناخن پالش جو تو نے لگائی ہے، تیری نماز باطل ہے! نیل پالش کی وجہ سے پانی تو تیرے ناخن تک جائے گا ہی نہیں۔''(۵)

آفتابِ لبِ بام: ایک مذہبی اور روایتی فیملی کی کہانی ہے۔ یہ کہانی ماہ رمضان کی ہے۔ اس داستان میں ایک روایتی باپ کو، سخت گیر اور مرد سالار کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے جو خود کو فیملی کا سردار اور سربراہ سمجھتا ہے۔ گھر کا کوئی فرد بھی اس کے سامنے بولنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ یہ شخص دو لڑکیوں کا باپ ہے جو دس اور بارہ سال کی ہیں اور دونوں روزہ رکھنے کی وجہ سے خستہ حال بیٹھی ہوئی ہیں۔ کہانی دن کے سہ پہر میں واقع ہوتی ہے۔ باپ نماز کے بعد بچیوں کو چائے بنانے کے لیے بولتا ہے۔ بچیاں ناتوانی کے سبب کام کرنے کی ہمت نہیں کر پاتیں تو ان کی نافرمانی پر انھیں مارتا ہے۔ اس نے مصلے سے ہی آواز دی:

''صغریٰ! اٹھو اور سماور (ایک قسم کی کیتلی) کو اس طرف لے جاؤ۔ بچے روزہ کی وجہ سے ناتواں اور بے حال تھے...... والد کے کہنے پر کسی نے توجہ نہیں دی۔ باپ کا حوصلہ ختم ہو رہا تھا۔ اذان کہی اور اقامت دیتے وقت لڑکیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا تم سے ہی کہہ رہا ہوں! بتول تم اٹھو سماور کو ادھر رکھو۔ چائے تیار کرو...... صغریٰ! اٹھو، برف لے آؤ!

چھوٹی والی بچی نے تھوڑی جنبش کی اور کہا: ایش خدایا! اور چپ ہو گئی۔ اب ان کا باپ تحمل نہ کر سکا۔ تیزی کے ساتھ آنگن کی طرف دوڑا۔ بچیاں جان بچا کر بھاگنے لگیں...... لڑکیاں صحن خانہ کی طرف بھاگیں تو باپ بھی ننگے پاؤں ان کے پیچھے دوڑنے لگا۔ پدر سوختہ ہا! (فحش ایرانی) قبر پدر مادرتان سگ۔ (فحش)...... بچیاں ہر طرف بھاگ رہی تھیں۔ باپ صغریٰ کی طرف دوڑا اور اس کو مارنے لگا۔''(۶)

زنِ زیادی: آل احمد اس داستان میں ایک ۳۴ر سال کی خاتون کی بے بسی و لاچاری کو بیان کرتا ہے جس کے سر سے بال ختم ہو گئے اور وہ مصنوعی بال لگاتی ہے۔ اس کا شوہر باوجود اس کے کہ وہ شادی سے پہلے ہی یہ جانتا تھا، اس کو شادی کے چالیس روز بعد طلاق دے دیتا ہے۔ جب کہ اس شخص میں خود بھی عیوب ہیں لیکن چوں کہ وہ مرد ہے اس لیے اس کے عیوب کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ وہ خاتون طلاق کے بعد شوہر اور باپ کے گھر میں اپنی بے وقعتی کا احساس اس طرح کرتی ہے:

''میں کیسے یہ تحمل کروں کہ باپ کے گھر میں ۳۴ر سال رہنے کے بعد، شادی کے چالیسویں روز پھر اسی گھر میں واپس بھیج دی جاؤں اور دوبارہ باپ کی ذمہ داری اور بوجھ بن جاؤں؟''(۷)

جلال نے اس داستان میں ایرانی معاشرے میں خواتین کے ساتھ ہونے والی جنسی نابرابری، خواتین کے گھر کی چار دیواری میں قید رہنے، طلاق، باپ کے گھر میں اجنبیت کا احساس کرنے اور خود کو باپ پر بوجھ سمجھنے جیسے مسائل کو روشن کیا ہے۔ اس افسانے میں ایک جگہ وہ کہتے ہیں:

''مجھ جیسی لڑکی کے لیے جس نے ۳۴ر سال باپ کے گھر میں سوائے بھائی کے کسی کو نہ دیکھا ہو اور صرف اجنبی خواتین سے بات کی ہو وہ بھی حمام یا بازار میں، یہ کیسے ممکن ہے کہ جب کسی اجنبی مرد سے ملاقات کرے تو ہاتھ اور پیر گرم نہ ہوں؟''(۸)

پھر آگے لکھتے ہیں:

''آخر کیسے ممکن ہے کہ انسان خود کو اس عذاب کا باعث نہ سمجھے؟ کیسے انسان خود کو کسی گھر میں 'فالتو' محسوس نہ کرے؟''(۹)

جشنِ فرخندہ: جلال اس داستان میں ایسے ایرانی معاشرے کی عکاسی کرتا ہے جس میں مرد مسلط و

غالب، فعال اور حملہ آور ہوتے ہیں جب کہ اس کے مقابلے میں خواتین مغلوب، غیر فعال اور سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہوتی ہیں:

''ان کی (والد) یہ عادت تھی کہ جیسے ہی مجھے، میری ماں، چھوٹی بہن یا ہم میں سے کسی کو بھی دیکھتے فرمائشات شروع کر دیتے تھے۔''(۱۰)

اس داستان میں جلال نے یہ نمایاں کیا ہے کہ ہمارے معاشرے میں لڑکے بھی گھر کی خواتین پر غالب رہتے ہیں اور ان پر تشدد و جارحیت روا رکھتے ہیں۔ داستان میں لڑکا اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ جارحیت اور تشدد کا برتاؤ کرتا ہے اور اس کی چھوٹی بہن بھی ماں کی طرح ضعیف و ناتواں اور مغلوب ہوتی ہے۔ لڑکا اپنی بہن کو گالی دیتا اور مارتا ہے۔ اس داستان کا راوی ایک لڑکا ہے۔ وہ اپنی بیوی سے کہتا ہے:

''بوڑھی عورت! تو نے پھر میرے کام میں دخالت کی؟''(۱۱)

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں خواتین اپنے حقوق سے محروم تھیں۔ مرد خواتین پر غالب تھے اور ان کے ساتھ ظلم و تشدد کا برتاؤ کرتے تھے۔ جلال آلِ احمد کا شمار معاصر ایران کے ان مشہور مصنفین میں ہوتا ہے جنھوں نے حقوقِ نسواں کی تحریک کی حمایت کی۔ ان کے مطابق ایرانی معاشرے میں خواتین کی اس پسماندہ اور ذلت آمیز صورتِ حال کا ذمہ دار مرد سالاری کا وجود ہے۔ آلِ احمد مردوں اور عورتوں کے لیے مساوی حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں اور انھوں نے اپنی داستانوں کے ذریعے معاشرے میں ان کی پس ماندہ صورتِ حال کو اجاگر کر کے ان کی فلاح و بہبود کے لیے کوشش کی ہے۔ OOO

حوالہ جات:

۱۔ جلال آل احمد، غرب زدگی، نشر خرم، ۱۳۸۵ش، ص ۸۴
۲۔ جواد اسحاقیان، سایہ ہای روشن در داستان ہای جلال آل احمد، گل آذین، تہران، ۱۳۸۵ش، ص ۱۵۷
۳۔ جلال آل احمد، سہ تار، بچۂ مردم، انتشارات فردوس، ۱۳۷۱ش، ص ۲۳
۴۔ سہ تار، لاک صورتی، ص ۲۰ ۵۔ سہ تار، لاک صورتی، ص ۳۰
۶۔ سہ تار، آفتابِ لبِ بام، ص ۴۴
۷۔ جلال آل احمد، زن زیادی، انتشارات فردوس، ۱۳۷۱ش، ص ۱۶۹
۸۔ جلال آل احمد، زن زیادی، ص ۱۷۲ ۹۔ جلال آل احمد، زن زیادی، ص ۱۶۸
۱۰۔ جلال آل احمد، پنج داستان، جشن فرخندہ، انتشارات فردوس، ۱۳۷۱ش، ص ۱
۱۱۔ جلال آل احمد، پنج داستان، جشن فرخندہ ص ۴

OOO

تعارف و تبصرہ:

نام کتاب	: تنقیداتِ خوشدل		
مصنف	: ڈاکٹر فرحت حسین خوشدلؔ		
صفحات	: ۲۳۸	قیمت	: ۵۰۰/روپے
سال اشاعت	: ۲۰۱۶ء	مطبع	: تاج پبلی کیشنز، مٹیا محل، دہلی
ناشر	: حمد و نعت اکیڈمی، ہزاری باغ، جھارکھنڈ		
تبصرہ نگار	: فیضان حیدر (معروفی)		

ڈاکٹر فرحت حسین خوشدلؔ علامہ ناوک حمزہ پوری کے شاگردِ رشید ہیں۔ اگرچہ میں وقتاً فوقتاً خوشدلؔ کے کلام خصوصاً نعتوں کو مختلف رسائل و جرائد میں پڑھتا رہا ہوں لیکن ان سے کبھی بالمشافہہ گفتگو نہیں ہو سکی تھی۔ میں شکر گزار ہوں انجینئر فیروز مظفر کا جن کے توسط سے ایک زندہ دل انسان سے متعارف ہوا اور خوش قسمتی سے ان سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔ پہلی ہی ملاقات میں ان کے صرف نام کے خوشدل ہونے کا نہیں بلکہ حقیقی خوشدل اور زندہ دل ہونے کا قائل ہو گیا۔

موصوف کا شعری ذوق و شوق بہت نکھرا ہوا ہے لیکن ان کا اصل میدان حمد و مناجات اور نعتیہ شاعری ہے۔ اگرچہ انھوں نے حسن و عشق کی گلیوں کی بھی خاک چھانی لیکن صرف اسی وادی میں بند ہو کر نہ رہے۔ 'وجدان کے پھول' ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے جو ۲۰۱۴ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ حمد و مناجات اور نعتیہ شاعری پر مشتمل ان کے کئی مجموعے شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔

زیر نظر کتاب 'تنقیداتِ خوشدل' ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں قلم بند کیے گئے ہیں۔ ان مضامین میں انھوں نے چند معروف اور غیر معروف ادبا و شعرا کی تخلیقات اور اسلوب پر تنقیدی بحث و تمحیص کی ہے۔ البتہ دو مضامین مذہبی نوعیت کے بھی ہیں جن سے ان کی مذہبی بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب میں کل بائیس مضامین شامل ہیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ ان تمام مضامین پر تبصرے کی نہ یہاں گنجائش نہیں ہے اور نہ محل، اس لیے چند اہم مضامین کے پیشِ نظر اس پر تعارفی تبصرے پر اکتفا کی جاتی ہے۔

اس کتاب میں شامل پہلا مضمون 'علامہ اقبال کی شاعری میں قرآنی تعلیمات کی عکس ریزی' ہے۔ اس میں خوشدلؔ نے علامہ اقبال کے کلام میں قرآنی تعلیمات کے اثرات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ وہ اس بات کے قائل

ہیں کہ علامہ اقبال کے کلام کی واقعی افہام وتفہیم کا حق اسی کو حاصل ہے جو قرآنی تعلیمات کے ساتھ سنتِ پیغمبر کی بھی کما حقہ واقفیت رکھتا ہو۔ظاہر ہے کہ علامہ اقبال خود کو صرف شاعر نہیں بلکہ پیغام بر کہتے ہیں اور اپنی شاعری کو پیغام بری قرار دیتے ہیں۔اس کے ذریعہ وہ مسلمانوں کو ایسے راستے پر گامزن دیکھنا چاہتے تھے جس پر گامزن ہوکر اپنے کھوئے ہوئے وقار اور عظمتِ رفتہ کو حاصل کرسکیں۔اس مضمون میں خوشدلؔ نے علامہ اقبال کے کلام پر قرآنی تعلیمات کے اثرات کا بخوبی جائزہ پیش کیا ہے۔

دوسرا اہم مضمون 'سہیلؔ غازی پوری: ایک معتبر نعت گو' ہے۔اس مضمون میں سہیلؔ غازی پوری کی نعتیہ شاعری میں پائی جانے والی خوبیوں کا بڑی سنجیدگی کے ساتھ بیان کیا ہے،اور انھیں ایک معتدل اور متوازن نعت گو شاعر قرار دیا ہے جن کی نعتیہ شاعری میں نہ مبالغہ آرائی ہے جو شرک کی حدوں تک پہنچے اور نہ تنقیص جو آپ کے شایانِ شان نہیں۔

کتاب کے پانچویں مضمون کا عنوان 'اردو فکشن کی آبرو سعادت حسن منٹو' ہے۔اس مضمون میں موصوف نے منٹو کی حقیقت نگاری کو کھلے دل سے سراہا ہے،اور انھیں ایک بے باک قلم کار قرار دیا ہے جس نے بڑی بے باکی کے ساتھ اپنے افسانوں میں زندگی کی حقیقی تصویریں پیش کی ہیں۔کیوں کہ منٹو نے احمد ندیم قاسمی کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ ''......میں وہی لکھتا رہوں گا جو میں دیکھتا اور سوچتا اور محسوس کرتا ہوں۔''

کتاب کا چھٹا مضمون 'اردو شعر و ادب کا باشعور فن کار: ڈاکٹر مظفر حنفی' ہے۔اس مضمون میں موصوف نے مظفر حنفی کی حیات اور علمی و ادبی کارناموں کا اجمالی تعارف پیش کیا ہے۔اس مضمون میں انھوں نے مظفر حنفی کو علم و ادب کا ایک خاموش خدمت گزار قرار دیا ہے جنھیں نہ کبھی ستائش کی تمنا رہی اور نہ ہی صلے کی پروا۔

ان کے علاوہ کتاب کے جن مضامین نے مجھے متاثر کیا ان میں 'ہزار رنگ علامہ ناوکؔ حمزہ پوری'، 'اقلیم حمد و نعت کا معتبر شاعر ابرارؔ کرت پوری'،'اردو غزل کا بالغ النظر شاعر: رفیق شاہین'،'اقلیم نعت کا سفیر: عقیلؔ ہاشمی'،'ہم عصر ادبی تشخص کا تقابلی مطالعہ' اور 'اسلم بدر کی شعری کائنات کا تنقیدی جائزہ' خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ان مضامین کے مطالعے سے خوشدلؔ کی تنقیدی بصیرت اور ان کے تنقیدی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔میں نے اس کتاب کے چند منتخب مضامین پر جو تعارفی تبصرے کیے ہیں وہ خوشدلؔ کے تنقیدی شعور کے لیے ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے مصداق ہیں۔تاہم مجھے یقین کامل ہے کہ اس کتاب کے مطالعے سے تنقید کے باب میں ان کے صحیح مقام و مرتبے کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ان کی تنقیدی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے علامہ ناوکؔ حمزہ پوری رقم طراز ہیں:

''ایسا لگتا ہے کہ خوشدلؔ حق گوئی اور بے باکی کے حوالے سے اپنی شناخت مستحکم کریں گے اور چند ایک کی نظر میں معتوب بھی ہوں گے۔خوشدلؔ کی نثر میں جو روانی اور زبان و بیان پر جو

گرفت دیکھی وہ مجھے متحیر بھی کرتی ہے اور فخر و انبساط سے دوچار بھی کرتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ایمان داری سے خوشدلؔ مطالعہ کرتے ہیں۔متن کے اعماق میں اتر کر بڑی سنجیدگی سے قلم اٹھاتے ہیں۔برجستہ نویسی کا میں ہی کیا ایک زمانہ ان کا قائل ہے۔اسکول ٹیچر ہونے کے باوجود آج عالم گیر سطح پر خوشدلؔ ایک جانا پہچانا چہرہ بن چکا ہے۔''(فلیپ کی تحریر از علامہ ناوک حمزہ پوری)

یہاں اس بات کا تذکرہ بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ شاعر ہیں اور ایک اچھے نعت گو شاعر ہیں،خوش قسمتی سے آواز بھی مترنم ہے۔جب نعت پڑھتے ہیں تو ایک سماں باندھ دیتے ہیں جس سے سننے والے پر ایک کیف و سرور کا عالم طاری ہوجاتا ہے۔لیکن جس طریقے سے صنف شاعری میں نعت گوئی ان کی پسندیدہ صنف ہے اسی طرح نعت کی تنقید بھی ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔تنقید میں وہ اعتدال و توازن کا دامن تھامے رہتے ہیں۔متن کی تہ میں اتر کر بڑی ایمان داری سے اپنی رائے قائم کرتے ہیں جو ایک تنقید نگار کے لیے پل صراط پر چلنے سے کم نہیں ہے۔حق گوئی اور بے باکی ان کی تنقیدی تحریروں کا لازمی جزو ہے ساتھ ہی زبان و بیان بھی صاف ستھری ہے جو تنقیدی تحریروں کی جان ہے۔البتہ کتاب میں پروف کی غلطیاں بھی راہ پاگئی ہیں۔خصوصاً فہرستِ مضامین اور اصل مضامین میں صفحات کی ترتیب میں بڑی الٹ پھیر ہے۔امید ہے کہ آئندہ اشاعت میں اس کا ازالہ کیا جائے گا۔

میں کہوں گا کہ ادب کے طالب علم کو جواہرات کی اس کان سے بقدر ظرف اپنا اپنا دامن بھر لینا چاہیے۔کتاب کی اشاعت پر مصنف کو تہ دل سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

○○○

نام کتاب	: نمودِ سبز (شعری مجموعہ)		
شاعر	: ظفر اقبال ظفرؔ		
صفحات	: ۲۴۰	قیمت	: ۳۰۰/روپے
سال اشاعت	: ۲۰۱۹ء	مطبع	: گلوری یس پرنٹرس،دہلی
ناشر	: عرشیہ پبلی کیشنز،دہلی۔۹۵		
تبصرہ نگار	: فیضان حیدر (معروفی)		

ظفر اقبال ظفرؔ کا شمار اردو کے ان خاموش خدمت گزاروں میں ہوتا ہے جو شاعری کے ساتھ افسانہ نویسی اور صحافت کے ذریعہ تقریباً پچاس سال سے بے لوث خدمات انجام دے رہے ہیں۔ان کا آبائی وطن قصبہ کڑا ضلع الہ آباد (موجودہ کوشامبی) ہے لیکن طویل مدت سے فتح پور میں مقیم ہیں۔ان کو اردو کے بڑے بڑے

ادیبوں اور شاعروں کی ہم نشینی کا شرف حاصل رہا ہے جن میں پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی اور پروفیسر مظفر حنفی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ ان کے اندر علمی و ادبی ذوق وشوق فطری طور پر موجود تھا لیکن ان اساطین ادب کی صحبت نے ان کے اس علمی و ادبی ذوق وشوق کو ایک نئی سمت دی جس پر وہ آج گامزن ہیں۔ ان کی تخلیقات ملک اور بیرون ملک کے مختلف رسائل وجرائد میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'نمود سبز' ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ البتہ اس کے شروع میں ایک حمد اور دو نعتیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ ابتدا میں پروفیسر حامدی کاشمیری نے 'غزل کی منفرد آواز' اور عشرت ظفر نے 'نمود سبز کے فکری افق' کے عنوان سے ظفر اقبال ظفرؔ کی شاعری پر اجمالی گفتگو کی ہے۔ 'اپنی بات' کے عنوان سے خود شاعر نے اپنے حالات اور ادبی زندگی کے سلسلے میں گفتگو کی ہے۔ اس سلسلے میں وہ خود لکھتے ہیں:

''کتابوں سے رشتہ، مشاہدہ کی روشنی، تجربات کی آنچ، حادثات کی تپش اور ادبی محفلوں میں شرکت نے میرے ذہن وادراک کو جلا بخشی اور فکر وشعور کو گہرائی و گیرائی عطا کی تو میرے اندر تخلیق کی باطنی قوت ابھرنے لگی اور بتدریج مختلف شکلیں اختیار کرتی گئی۔ جذبات واحساسات کی ایک دنیا میرے اندر آباد ہونے لگی۔ یہ دنیا کبھی افسانہ تو کبھی شاعری کی صورت میں مجھے تجربات وحوادث سے روشناس کراتی رہی اور میں انہی تجربات کو اپنی تخلیق کا محور ومرکز بناتا گیا۔'' (ص ۲۲)

پھر وہ آگے لکھتے ہیں:

''ادبی مشغلہ میرے لیے روح کی طمانیت، ذہنی آسودگی اور ایک مقدس فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔'' (ص ۲۳)

ظاہر ہے کہ اب وہ زندگی کے اس پڑاؤ میں ہیں جہاں فکریں پختہ ہوکر اپنی معراج کو پہنچ جاتی ہیں۔ ان کی شاعری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی غزلوں میں تغزل کے ساتھ تجربات ومشاہدات کی دنیا کی بے پایاں وسعت ہے۔ تجربات ومشاہدات ان کی شاعری کا ایک اہم عنصر قرار دیے جاسکتے ہیں جو مسائلِ کائنات، اجتماعی وانفرادی نظام حیات اور سماجی واخلاقی اقدار کی بھی پاس داری کرتے ہیں۔ درج ذیل اشعار میں وہ حیات وکائنات کے مسائل کو کتنے خوب صورت انداز میں بیان کرتے ہیں۔

سفر کا سلسلہ آخر کہاں تمام کروں — کہاں چراغ جلاؤں کہاں قیام کروں
منزلیں مجھ سے گریزاں ہیں سفر کیا کرتا — ہم سفر دھوپ تھی تنہا وہ شجر کیا کرتا
دیکھ اے وقت ذرا ایک نظر مڑ کے تو دیکھ — روند کر جس کو تو گزرا ہے مرا سر ہی تو ہے
انسانیت لہو میں نہائی ہوئی ہے آج — تھا مرثیہ لبوں پہ خود اپنے زوال کا
اے ظفرؔ کون سی بستی میں میں آپہنچا ہوں — موت ہی موت کا بازار نظر آتا ہے

ان اشعار میں سماج اور معاشرے کی جن سفاک حقیقتوں کو پیش کیا گیا ہے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان

کے نزدیک تغزل کا مفہوم محدود نہیں ہے بلکہ اس میں عشق وعاشقی، معاملہ بندی اور ہجر ووصال کے ساتھ مسائل حیات وکائنات کے لیے بھی گنجائش موجود ہے۔ وہ شعریت کو فقط ایک مخصوص قسم کی غزل گوئی قرار نہیں دیتے بلکہ حیات وکائنات کے مسائل کو بھی اس میں جگہ دیتے ہیں، لیکن اس کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں کہ وہ مسائل ذاتی اور انفرادی تجربات کی بھٹی میں پگھل کر شاعر کی شخصیت کا جزو بن جائیں۔ ان کا ماننا ہے کہ تخیل کو دل تک اتارنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے دماغ کی بھٹی سے گزرے، پھر بے ساختگی کے ساتھ شعر کے قالب میں ڈھل جائے۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کہنے پر مجبور ہوگئے:

''ظفر اقبال ظفرؔ کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی تلاش اور میدان شعر میں ان کی پامردی ہے۔ اس زمانے میں اچھے شعرا بھی تھوڑی محنت سے تھک کر میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ راہِ مضمونِ تازہ بند نہیں، لیکن مضمونِ تازہ کے ورود کے لیے راستہ ہموار اور کھلا رکھنا بڑی محنت، بڑا شوق اور سب سے بڑھ کر بڑی صلاحیت چاہتا ہے۔ ظفر اقبال ظفرؔ کا کلام میں اس وقت سے دیکھتا رہا ہوں جب وہ اطراف کے چھوٹے موٹے پرچوں میں چھپتے تھے۔ اپنے زمانے کے ایک بڑے اور نمودار شاعر کی ہم نامی کے باوجود اپنا چراغ جلائے رکھنا، یہ بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔'' (پشت کی تحریر)

ظفر اقبال ظفرؔ کے سلسلے میں شمس الرحمٰن فاروقی کی رائے بڑی مناسب اور متوازن معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے زیادہ تر اپنی شاعری میں سامنے کے موضوعات کو لیا ہے اور اپنے تخلیقی اوصاف سے تہ دار بنادیا ہے۔ اسے ہم ظفر اقبال ظفرؔ کی قادرالکلامی کا بیّن ثبوت بھی قرار دے سکتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں صحرا پس صحرا، تاب وتب، منزل مراد اور رقص شرر جیسی روایتی تراکیب کا استعمال تو کیا ہے لیکن اپنی تخلیقیت سے ان میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ یہی انفرادیت ان کو امتیازی شناخت عطا کرتی ہے۔

○○○

نام کتاب : ماہ نیم شب (شاعری کی کتاب)
مصنف/شاعر : مرغوب علی
صفحات : ۱۱۲ — قیمت : ۱۶۰/روپے
سال اشاعت : ۲۰۲۰ء — مطبع : روشن پرنٹرس، چوڑی والان، دہلی
ناشر : تخلیق کار پبلشرز، لکشمی نگر، دہلی۔ ۱۱۰۰۹۲
تبصرہ نگار : فیضان حیدر (معروفی)

'ماہ نیم شب' مشہور شاعر مرغوب علی کی غزلوں، نظموں، قطعات اور دوہوں کا مجموعہ ہے۔ ان کا تعلق

ضلع بجنور کے شہر نجیب آباد سے ہے۔ ۲۸؍جنوری ۱۹۵۲ء کو پیدا ہوئے اور حصول تعلیم کے بعد کاروبار میں مصروف ہو گئے، مگر علمی ذوق وشوق نے کبھی مطالعے سے بے خبر نہیں کیا۔ چنانچہ مشاہیر شعرا کے کلام کا بڑی دلجمعی اور انہماک کے ساتھ مطالعہ کرتے رہے۔ اب تک ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں ’آدھی رات کی شبنم‘ (شعری مجموعہ)، ’انتخاب کلیات ن۔ م راشد‘ اور ’فیض احمد فیض: احوال وافکار‘ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

زیر تبصرہ مجموعہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرغوب علی اس بات کے قائل ہیں کہ کائنات جلوۂ شوخ وشنگ ہونے کے ساتھ جائے عبرت بھی ہے۔ میری نظر میں ایک بہترین شاعر کے لیے ضروری ہے کہ علمی اور فنی استعداد کے ساتھ حساس بھی ہو، تا کہ وہ ان چیزوں کو بھی عام قارئین کے سامنے بہترین اسلوب میں پیش کر سکے جہاں تک ان کی نگاہیں پہنچنے سے قاصر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں ایسی تازہ اور نئی تصویریں دیکھنے کو مل جاتی ہیں جو بہترین شاعری کی روحِ رواں ہیں۔ وہ بہت ہی نرم اور لطیف لہجے میں اپنی بات اشعار کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ ’ماہ نیم شب‘ کی پہلی غزل کے یہ چند اشعار دیکھیے ۔

گھور اندھیرا لمبی چپ ہے میرا جی کچھ بولو تو
خوف سے چپکا لب سے لب ہے میرا جی کچھ بولو تو

آوازوں کا شور بہت ہے بنجاروں کی بستی میں
خاموشی ذلت کا سبب ہے میرا جی کچھ بولو تو

وقفہ وقفہ سے یاروں کے بجھنے کی خبریں آئیں
زندہ رہنا داو طلب ہے میرا جی کچھ بولو تو

تنہائی، یادوں کی شبنم، دور کہیں کوئی نوحہ خواں
اس پر چاندنی رات غضب ہے میرا جی کچھ بولو تو

اُن رستوں پر کیسی کیسی دھومیں مچتی رہتی تھیں
دور تلک سناٹا اب ہے میرا جی کچھ بولو تو

ہجرت کے موسم میں ہم سے کیا کیا پیچھے چھوٹ گیا
لیکن کوئی پوچھے کب ہے میرا جی کچھ بولو تو

ان اشعار سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ایک دردمند دل رکھتے ہیں، جو انھیں گردوپیش میں رونما ہونے والے واقعات وحادثات سے مقابلہ کرنے کی قوت اور حوصلہ بخشتا ہے۔ ساتھ ہی اس بات سے بھی بے خبر نہیں رکھتا کہ ہر حال میں راضی بہ رضا رہنا چاہیے۔ کیوں کہ وہ مناظر ابھی ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں جب زبانوں پر روک ٹوک نہیں تھی۔ ہم اپنی بات بے باکی کے ساتھ کہہ سکتے تھے۔ لیکن آج ہر طرف جبر واستبداد کا دور دورہ ہے، یہاں تک کہ لوگوں کو حق بات تک کہنے میں ڈر محسوس ہوتا ہے۔ ایک ایسا انجانا خوف جو دل ہی دل میں شاعر کو اس بات پر اکساتا ہے کہ ہمیں حق بات کہنے سے کبھی ڈرنا نہیں چاہیے بلکہ اگر سرِ دار بھی ہم سے سوال کیا جائے تو حق گوئی سے کام لینا چاہیے۔ یہی خودداری اور احساس ان کو دور حاضر کے دوسرے شعرا سے ممتاز کرتا ہے۔

’ماہ نیم شب‘ کے مطالعے کے وقت جن اشعار نے مجھ کو بہت زیادہ متاثر کیا ان میں سے چند یہ ہیں ۔

لہجے کی نرمیوں میں خزاں کا ملال تھا
ٹھنڈی ہوا سے درد جواں اور کچھ ہوا

یاد کے باغ میں جس روز نکل جاتا ہوں
جگنوؤں کا مری پلکوں پہ سماں رہتا ہے

وہ جو ہر سانس دھڑکتا تھا کبھی دل بن کے
کون سی رُت میں ہے اب جانے کہاں رہتا ہے

کل تھی شفاف منڈیروں پہ پرندوں کی بہار
آج ہر چھت پہ چراغوں کا دھواں رہتا ہے

بات کی نوک کو زخموں میں چبھا دیتا ہے
دور رہ کر بھی ہمہ وقت سزا دیتا ہے

شاخ پر اگتی ہے بے داغ کرامت اس کی
روز صبحوں کو نئی طرزِ ادا دیتا ہے

مذکورہ اشعار کے بغور مطالعے سے اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ ان کے نزدیک شاعری صرف لفظی بازیگری نہیں ہے بلکہ وہ الفاظ کے انتخاب وترتیب اور دروبست کے ساتھ معانی کی اہمیت کے بھی قائل ہیں۔ وہ شاعری کی خاردار وادیوں سے بحسن وخوبی گزر جاتے ہیں اور فنی تقاضوں کے ساتھ ساتھ حسن معانی کا بھی بھرپور خیال رکھتے ہیں۔

ان کی نظمیں بھی فکری اور فنی لحاظ سے قابل قدر ہیں۔ ان نظموں میں خیالات کا تسلسل ہمیں متاثر کیے بغیر نہیں رہنے دیتا۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے اس لیے اس کو غنیمت سمجھنا چاہیے اور اس سے خوب خوب استفادہ کرنا چاہیے۔ زمانے کی شکایت نہیں کرنی چاہیے کیوں کہ زمانہ اور وقت یکساں رہتے ہیں، زمانے کے انسان بدل جاتے ہیں جس کہ وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ بدل گیا ہے۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ جہاں ان کی شعری کائنات میں بلندئ تخیل موجود ہے وہیں شاعری کی فنی باریکیوں پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ زبان وبیان صاف، سادہ اور سلیس ہے۔ کتاب کی اشاعت پر مصنف کو تہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

○○○

نام کتاب : شاخِ نوا (مجموعۂ غزلیات)
شاعر : سید محمد نور الحسن نور نوابی عزیزی
صفحات : ۱۵۲ قیمت : ۲۰۰؍روپے
سال اشاعت : ۲۰۲۰ء مطبع : ندارد
ناشر : دبستان نوابیہ عزیزیہ، پبلی کیشنز، قاضی پور، فتح پور، یو۔ پی
تبصرہ نگار : فیضان حیدر (معروفی)

سید محمد نور الحسن نور نئی نسل کے خوش گو اور قادر الکلام شاعر ہیں جو اپنی گراں قدر تخلیقات سے شعر وادب

کے دامن کو مالا مال کر رہے ہیں۔ ان کی پیدائش ۲۴/جون ۱۹۸۲ء کو ایک علمی خاندان میں ہوئی۔ والد کا نام شیخ طریقت حضرت سید نواب علی شاہ ہے۔ ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد عربی و فارسی بورڈ (یو۔پی) سے منشی، عالم، کامل اور فاضل کی اسناد حاصل کیں، پھر عصری تعلیم کی طرف رجوع ہوئے۔ ابتدا ہی سے شعر و شاعری سے دلچسپی رہی۔ قدرت کی طرف سے ذوق سلیم اور شعر گوئی کا ملکہ تو عطا ہوا ہی تھا ساتھ ہی خوش قسمتی سے ان کے بڑے بھائی اور استاد شاعر سید محمد عزیز الحسن عزیزؔ نوابی کی صحبت بھی میسر آ گئی۔ چنانچہ اس سے ان کے شعری ملکہ میں حسن اور نکھار پیدا ہوتا گیا۔

انھوں نے نعت، منقبت اور غزل وغیرہ پر طبع آزمائی کی ہے، لیکن ان کی شاعری کا محبوب میدان غزل ہی رہا۔ انھیں اردو کے ساتھ عربی و فارسی پر بھی مکمل عبور حاصل ہے۔ جب وہ اشعار کہتے ہیں تو اساطین ادب کے بہترین نمونے ان کے پیش نظر رہتے ہیں۔ وہ اپنی شعری روایات سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں لیکن لکیر کے فقیر نہیں ہیں، بلکہ ان میں حیرت انگیز اضافات بھی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی شاعری کے لیے مضامین تلاش کر لیتے ہیں۔ ان کے خیال میں جو کچھ بھی آتا ہے اسے بے باکانہ انداز میں باندھ دیتے ہیں۔ جہاں ایک طرف ان کی غزلوں میں حسن و عشق کے معاملات، واردات عشق اور گل و بلبل کے تذکرے ہیں تو دوسری طرف محبوب حقیقی کے جلوے بھی نظر آتے ہیں۔ زیر تبصرہ مجموعے سے یہ اشعار دیکھیے۔

تصور کو ترے چھونے کی خواہش — یہ میں کیسی جسارت کر رہا ہوں
ترے کوچے میں سب کچھ بھول بیٹھا — بہت تھا زعم جس کو آگہی کا
خوشبوؤں سی ادا ادا اس کی — روشنی سی بکھیرتی آواز

اب ذرا عشق حقیقی کے جلوے بھی دیکھیے۔

کیا کر رہے ہو سرو و صنوبر کا تذکرہ — صدقات ہیں یہ اس کے قدِ بے مثال کے
سامنے جب ہو وہ گل رعنا — بس اسی دم یہ دم نکل جائے
فوراً صدا لگاتا ہوں میں تیری یاد کو — بے رنگ جب بھی کوئی تمنا دکھائی دے
روشن ہے میرے سامنے اے نورؔ اک چراغ — مجھ کو مہِ تمام بھی پھیکا دکھائی دے

وہ ایک مخصوص فضا کے پروردہ ہیں جو صالح اور پاکیزہ ہے۔ اس ماحول کا اثر ہے کہ ان کی غزلوں میں آداب غزل ہر جگہ نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ادب، تاریخ، معاش، مذہب اور تہذیب و ثقافت کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی حیات و کائنات کے اسرار و رموز کو بڑی بے باکی سے اشعار کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔

ان کی شاعری میں تصوف بھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ بسا اوقات وہ کنجِ وحدت

میں گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہیں تو کبھی ذاتِ احدیت کے مشاہدے میں مصروف و منہمک ہو کر اپنے باطن کے مطالعے میں ہمہ تن مصروف ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ دارِ فنا انھیں ہر پہلو سے دارِ جدال نظر آتا ہے اور دارِ بقا دارِ اماں۔ انھوں نے دنیا کی بے ثباتی اور دولت و ثروت کی بے وقعتی کی طرف اپنے اشعار میں لطیف اشارے کیے ہیں۔

سجادۂ غنا سے ہماری شناخت ہے — خواہاں نہیں ہیں ہم کسی جاہ و جلال کے
جس کے دامن میں محبت کا گہر آ جائے — وہ اکٹھا کبھی سرمایۂ دنیا نہ کرے
تاج شاہی جسے کہتے ہیں زمانے والے — ہم فقیروں کی وہ ٹھوکر میں پڑا رہتا ہے

ان کا ماننا ہے کہ جو شخص تابع عقل ہو وہ حقیقت کے اسرار و رموز تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا، بلکہ اسے چاہیے کہ عشق کی خاردار وادیوں سے گزرتے ہوئے جنوں کی منزل تک پہنچ جائے۔ یعنی ان کا اعتقاد ہے کہ عشق بہ ہر صورت عقل سے آگے کی منزل ہے، اور جب انسان عشق کی خاردار وادیوں میں گم ہو کر جنوں کی حدت تک پہنچ جاتا ہے تو اسے حق کا عرفان حاصل ہو جاتا ہے۔

بجز جنوں کے کسی کا ہے دیکھنا مشکل — وہاں خرد کی رسائی نہیں جہاں ہوں میں

ان کا خیال ہے کہ دل کو خواہشوں، مرادوں اور حسرتوں سے بے نیاز رکھا جائے تو وہ ذاتِ باری تعالیٰ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مشغول و منہمک رہے گا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے یہاں متصوفانہ انداز بیان اور وحدت الوجودی نقطۂ نظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ تصوف و عرفان کے ساتھ فلسفے کا بھی گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ ان کے یہاں بھی بہت سی فلسفیانہ اصطلاحات دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔

وادیِ ہُو کو کیا میں نے سلامِ آخر — مجھ سے ملنے جو مرے چاہنے والے آئے
وہی نغمہ جو گونجا تھا ازل میں — میں ہر لمحہ سماعت کر رہا ہوں

البتہ فکری طور پر ان کے یہاں موضوعات میں تنوع اور ہمہ گیری موجود نہیں اور نہ ہی کوئی مخصوص اور منفرد نظام فکر ہے۔ اس کے باوجود ان کے یہاں صنائع و بدائع کا خوب صورت استعمال موجود ہے۔ بعض اشعار تو سہلِ ممتنع قرار دیے جا سکتے ہیں۔ زبان و بیان صاف، سادہ اور شستہ ہے۔ لہجے میں برجستگی اور شستگی موجود ہے جو ان کے بہترین مستقبل کی غماز ہے۔

OOO

اردو اپنوں کی زبان، حقیقتوں کی ترجمان۔ پڑھیں، بولیں، سیکھیں اور فخر کریں۔